دولتِ عثمانیہ

جلد اوّل

مُرتبہ

ڈاکٹر محمد عزیر

دار المصنفین شبلی اکیڈمی شبلی روڈ اعظم گڈھ (ہند)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

سلسلۂ تاریخ اسلام

دولتِ عثمانیہ

جلد اوّل

از عثمان اوّل ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء تا مصطفیٰ رابع ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء

سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل

مرتبہ

ڈاکٹر محمد عزیر، پی، اے، ڈی

سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

دار المصنفین شبلی اکیڈمی، شبلی روڈ، اعظم گڑھ (ہند)

جملہ حقوق محفوظ

سلسلہ دار المصنفین نمبر ۹۵

نام کتاب : دعوت تفہیم جدید قرآن

نام مصنف : ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی

صفحات : ۳۳۹

سنہ اشاعت : طبع جدید ۲۰۰۹ء

مطبع : معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)

ناشر : دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)

قیمت : ۲۰۰/ روپے

ISBN : 978-93-80104-26-3

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. BOX NO. : 19
SHIBLI ROAD, AZAMGARH - 276 001 (U.P.)
e-mail : shibli_academy@rediffmail.com
Website : www.shibliacademy.org

باہتمام
عبدالمنان ہلالی

Islamic
University
Book No.

فہرست مضامین

دولت عثمانیہ جلد اول

مضمون	صفحہ
تاریخ دولت عثمانیہ از مولانا سید سلیمان ندوی ۱	۱
دیباچہ ۲ - ۴	۲
ترک ۵ - ۱۲	۵
ترک اسلام میں	۶
آل سلجوق	۹
سلاجقۂ روم	۱۰
ارطغرل ۱۳ - ۱۵	۱۳
پہلا معرکہ	۱۴
سکت بیا	۱۴
عثمان خاں اول ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء - ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء ۱۶ - ۲۵	۱۶
قراجہ حصار	۱۷
استقلال	۱۸
عثمان کے کارنامے	۱۹
فتح بروصہ اور عثمان کی وفات	۱۹
سلطنت	۲۰
عثمان کا اسلام	۲۰
مال خاتون	۲۳
ذاتی اوصاف	۲۴
پہلی مسجد	۲۵
اورخان ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء - ۷۶۱ھ/۱۳۵۹ء ۲۶ - ۳۸	۲۶
اصلاحات	۲۶
فوج	۲۷
ینی چری	۲۸
جنگی سپاہ اور بے ضابطہ پیادے	۲۹
تنخواہ دار اور جاگیردار سوار	۲۹
آقنجی	۳۰
عثمانی فوج کے مخصوص امتیازات	۳۰

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
پاشا	۳۰	جنگ کسووا	۴۸
مکیڈونیا اور تھریسیا کی فتح	۳۱	مراد کے کارنامے	۵۰
قراسی پر قبضہ	۳۲	بایزید اوّل یلدرم	
زمانۂ امن کے کارنامے	۳۲	۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء - ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء	
حکومت کی پالیسی	۳۳	۵۲ - ۷۲	۵۲
سلطنت بازنطینی	۳۳	سرویا سے صلح	۵۲
یورپ میں پہلا قدم	۳۵	شہنشاہ سے جدید صلح نامہ	۵۳
جان پالیولوگس	۳۶	اناطولیہ کی فتوحات	۵۳
سلیمان پاشا اور اورخان کی وفات	۳۷	قسطنطنیہ کا محاصرہ	۵۳
مراد اوّل		ولاچیا	۵۵
۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء - ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء		بلغاریا کی فتح	۵۵
۳۹ - ۵۱	۳۹	ویڈین اور سلسٹریا	۵۵
ایشیائے کوچک میں بغاوت	۳۰	کرمانیہ	۵۶
فتوحات تھریس	۴۰	جنوبی ترکی ریاستیں	۵۷
جنگ مارتیزا	۴۱	سلطان بایزید	۵۷
شہنشاہ کی ناکامی	۴۲	وقفہ عیش	۵۷
صاوجی کی بغاوت	۴۳	صلیبی اتحاد	۵۸
فتوحات بلغاریا مقدونیہ و سرویا	۴۴	ابتدائی فتوحات	۵۹
امن و اصلاحات کا زمانہ	۴۵	معرکۂ نکوپولس	۶۰
اناطولیہ میں سلطنت کی توسیع	۴۶	مزید فتوحات	۶۳
مسیحی حکومتوں کا اتحاد	۴۷	یونان کی فتح	۶۴

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
قسطنطنیہ کا محاصرہ	۶۴	ترکی ریاستوں کی اطاعت	۷۹
حالات کا انقلاب	۶۵	شہنشاہ سے صلح اور	
تیمور	۶۵	چند جدید مقبوضات	۷۹
سیواس	۶۷	سالونیکا کی فتح	۷۹
جنگ انگورہ	۶۷	سرویا کی فتح	۸۰
قیدی سلطان	۷۰	عیسائی حکومتوں میں ایک نئی تحریک	۸۰
بایزید کی موت	۷۰	بغراد	۸۱
سلطنت عثمانیہ کا ظاہری خاتمہ	۷۲	ہونیاڈے کی کامیابی	۸۱
محمد اوّل		صلیبی اتحاد	۸۲
۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء - ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء		ترکوں کی شکست	۸۳
۷۳ - ۷۶	۷۳	صلح نامہ زجیدین	۸۳
سلطنت کی حالت	۷۴	مراد کی تخت سے کنارہ کشی	۸۳
شہزادوں کی باہمی جنگ	۷۴	عیسائیوں کی معاہدہ شکنی	۸۴
محمد کی تخت نشینی	۷۵	جنگ وارنا	۸۶
ذاتی اوصاف	۷۶	اس جنگ کے نتائج	۸۸
معیار عظمت	۷۶	ینی چری کی بغاوت	۸۸
مراد ثانی		موریا	۸۹
۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء - ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء		کسووا کی دوسری جنگ	۹۰
۷۷ - ۹۳	۷۷	سکندر بگ	۹۰
مراد اور مصطفیٰ کی جنگ	۷۷	مراد کی وفات	۹۲
قسطنطنیہ کا محاصرہ	۷۸	اخلاق و اوصاف	۹۳

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
محمد فاتح		سرویا پر مکمل قبضہ	۱۱۱
۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء-۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء		بوسنیا کی فتح	۱۱۲
۹۴ - ۱۳۰	۹۴	موریا پر قبضہ	۱۱۳
معصوم بھائی کا قتل	۹۴	کرامانیہ	۱۱۴
شہنشاہ قسطنطنیہ سے آویزش	۹۴	طرابزون اور سینوپ	۱۱۵
قسطنطنیہ کی اہمیت	۹۵	یونانی مجمع الجزائر	۱۱۵
قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں	۹۶	کریمیا	۱۱۵
مدافعت کی تیاریاں	۹۸	ولاچیا	۱۱۶
مغربی یورپ کی سرد مہری	۹۹	البانیا اور ہرزیگووینیا	۱۱۸
محاصرہ	۱۰۰	وینس	۱۱۸
سقوط قسطنطنیہ	۱۰۲	روڈس کی ناکام مہم	۱۱۹
فاتح کا داخلہ	۱۰۳	اوٹرانتو کی فتح	۱۲۰
عیسائیوں کی مذہبی اور ملی آزادی	۱۰۵	فاتح کی وفات	۱۲۰
قسطنطنیہ کی جدید آبادی	۱۰۷	فوجی قابلیت	۱۲۰
دارالسلطنت	۱۰۷	علوم وفنون کی سرپرستی	۱۲۱
قسطنطنیہ کے سابق محاصرے	۱۰۷	اخلاق وسیرت	۱۲۳
جامع ایوب	۱۰۹	آئین سلطنت	۱۲۵
دیگر فتوحات	۱۰۹	ارکان حکومت	۱۲۵
یونان	۱۱۰	دیوان	۱۲۶
سرویا	۱۱۰	آغا	۱۲۶
محاصرۂ بلغراد	۱۱۰	سنجق بے	۱۲۶

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
عہد	۱۲۷	دابق کا فیصلہ	۱۴۹
مجموعۂ قانون	۱۳۰	شام کی فتح	۱۵۰
بایزید ثانی		حلب کا خیر مقدم	۱۵۱
۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء - ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء		دیگر فتوحات	۱۵۱
۱۳۱ - ۱۳۸	۱۳۱	طومان بے	۱۵۱
شہزادہ جم	۱۳۲	معرکۂ ردانیہ	۱۵۲
اوٹرانٹو	۱۳۵	قاہرہ میں قتل عام	۱۵۳
ہرزیگووینا	۱۳۶	قرط بے	۱۵۳
ہنگری	۱۳۶	طومان بے کا قتل	۱۵۶
بحری فتوحات	۱۳۶	مصر کا نظام حکومت	۱۵۶
مصر سے صلح	۱۳۶	خادم الحرمین الشریفین	۱۵۸
سلیم کی بغاوت اور تخت نشینی	۱۳۷	خلافت	۱۶۰
بایزید کی سیرت	۱۳۸	وینس	۱۶۱
سلیم اوّل		آچین سے معاہدہ	۱۶۱
۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء - ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء		روڈس پر حملہ کی تیاریاں	۱۶۳
۱۳۹ - ۱۶۲	۱۳۹	وفات	۱۶۴
بھائیوں کی بغاوت	۱۴۱	**سلیمان اعظم قانونی**	
ایران سے جنگ	۱۴۲	۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء - ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء	
ایرانیوں کی شکست	۱۴۴	۱۶۳ - ۲۰۲	۱۶۳
شام و مصر	۱۴۶	ذاتی اوصاف و اخلاق	۱۶۳
دنیائے اسلام کا انتشار	۱۴۶	بلغراد کی فتح	۱۶۵

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
جمہوریہ وینس کا باج گزار ہونا	۱۶۶	جربی رستے	۱۸۵
روڈس کی فتح	۱۶۶	سیدی علی	۱۸۵
مصر اور ینی چری کی بغاوت	۱۶۸	مالٹا	۱۸۶
ہنگری کی فتح	۱۶۸	ہنگری کی مہم اور سلیمان کی وفات	۱۸۷
ہنگری میں خانہ جنگی	۱۶۹	سلطنت عثمانیہ کی وسعت	۱۸۸
فرڈیننڈ کی شکست	۱۷۰	سلطنت کی انتظامی تقسیم	۱۸۹
ویانا کا محاصرہ	۱۷۰	آبادی	۱۹۰
آسٹریا کی فتح	۱۷۲	فوج	۱۹۱
ہنگری میں ترکی حکومت	۱۷۳	محاصل سلطنت	۱۹۲
سلیمان "صاحب قران"	۱۷۳	نظام جاگیری	۱۹۳
ایران کی مہم	۱۷۴	قانون رعایا	۱۹۴
بحری طاقت	۱۷۵	عام قوانین	۱۹۴
بحری قزاق	۱۷۶	تجارتی مراعات	۱۹۵
خیر الدین پاشا بحری	۱۷۶	علم کی سرپرستی	۱۹۵
فرانس کے ساتھ خصوصی مراعات	۱۷۸	صدقات	۱۹۶
جزائر ایجین پر قبضہ	۱۷۸	تعمیرات کا ذوق	۱۹۶
چارلس سے جنگ کا سلسلہ	۱۷۹	علمی اور شاعرانہ مذاق	۱۹۷
خیر الدین پاشا کی وفات	۱۸۰	عدل وانصاف	۱۹۷
طورغوث	۱۸۱	خون کے چند دھبے	۱۹۸
پیالے	۱۸۲	ابراہیم پاشا	۱۹۹
پرتگال سے بحری جنگ	۱۸۴	زوال سلطنت کی ابتدا	۲۰۰

مضمون	صفحہ
سلیم ثانی	
سن ۹۷۴ھ/ ۱۵۶۶ء - سن ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء	
۲۰۳ - ۲۰۹	۲۰۳
محمد صوقولی کی دو اہم تجویزیں	۲۰۳
تونس	۲۰۶
قبرص کی فتح	۲۰۶
مسیحی اتحاد	۲۰۷
جنگ لیپانٹو	۲۰۷
وینس سے صلح	۲۰۸
تونس کا الحاق	۲۰۹
مراد ثالث	
سن ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء - سن ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۵ء	
۲۱۰ - ۲۱۶	۲۱۰
امور مملکت میں حرم کا دخل	۲۱۰
جنگ ایران	۲۱۱
یورپین حکومتوں سے تجارتی اور سیاسی تعلقات	۲۱۲
محمد صوقولی کا قتل	۲۱۳
سلطنت کا انتہائی عروج	۲۱۳
سلطنت کا زوال	۲۱۴
فوجی بغاوت اور عام بدنظمی	۲۱۴

مضمون	صفحہ
ہنگری اور آسٹریا سے جنگ	۲۱۶
مراد کا انتقال	۲۱۶
محمد ثالث	
سن ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۵ء - سن ۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء	
۲۱۷ - ۲۲۳	۲۱۷
فوج کی شورش	۲۱۷
سلسلۂ جنگ	۲۱۸
فتح مبین	۲۲۱
فراری	۲۲۱
قرہ یازیجی	۲۲۲
ایران سے جنگ	۲۲۳
وفات	۲۲۳
احمد اوّل	
۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء - سن ۱۰۲۶ھ/ ۱۶۱۷ء	
۲۲۳ - ۲۲۷	۲۲۳
صلح نامہ ستیوا توروک	۲۲۵
ضعف سلطنت	۲۲۵
وفات	۲۲۷
مصطفیٰ اوّل و عثمان ثانی	
۱۰۲۶ھ/ ۱۶۱۷ء - سن ۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء	
۲۲۸ - ۲۳۱	۲۲۸

مضمون	صفحہ
عثمان ثانی	۲۲۵
بیبا برخانی - فیر	۲۳۱
مراد رابع	
۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء - ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء	
۲۳۲ - ۲۴۰	۲۳۲
سلطانہ والدہ	۲۳۲
فتح بغداد	۲۳۳
ایران پر چڑھائی	۲۳۴
ذرن شہید	۲۳۵
قہر انتقام	۲۳۶
شدت انتقام	۲۳۷
مفتی اعظم کا قتل	۲۳۸
اریوان کی فتح	۲۳۸
بغداد کی فتح	۲۳۸
ایران سے صلح	۲۳۹
وفات	۲۳۹
ذاتی اوصاف	۲۴۰
ابراہیم	
۱۰۴۹ھ/۱۶۴۰ء - ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء	
۲۴۱ - ۲۴۶	۲۴۱
ابراہیم کی معزولی	۲۴۳

مضمون	صفحہ
ابراہیم کا قتل	۲۴۳
ازف کی مہم	۲۴۳
روس سے آویزش	۲۴۴
کریٹ کی مہم	۲۴۵
محمد رابع	
۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء - ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء	
۲۴۷ - ۲۶۸	۲۴۷
محمد کوپریلی	۲۴۸
احمد کوپریلی	۲۵۰
آسٹریا سے جنگ	۲۵۲
جنگ سینٹ گوتھرڈ	۲۵۳
اس جنگ کی اہمیت	۲۵۴
صلح نامہ سوار	۲۵۴
کینڈیا کی فتح	۲۵۴
پولینڈ سے جنگ	۲۵۵
صلح نامہ بوزاکس	۲۵۶
تجدید جنگ	۲۵۷
صلح نامہ زراونہ	۲۵۷
احمد کوپریلی کی وفات	۲۵۷
قرہ مصطفیٰ	۲۵۸
اوتریں	۲۵۹

مضمون	صفحہ
ویانا کا دوسرا محاصرہ	۲۵۹
ترکوں کی شکست	۲۶۱
قرہ مصطفیٰ کا قتل	۲۶۲
شکست ویانا کا اثر	۲۶۲
مسیحی اتحاد	۲۶۳
مزید شکستیں	۲۶۳
سلطان کی معزولی	۲۶۳
الجزائر وتونس کی آزادی	۲۶۵
نظام ینی چری میں تبدیلی	۲۶۷
سلیمان ثانی ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء - ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء ۲۶۹ - ۲۷۵	۲۶۹
فوج کی سرکشی	۲۶۹
ہجوم مصائب	۲۷۰
مصطفیٰ کوپریلی	۲۷۱
عیسائی رعایا کے ساتھ	
مخصوص رعایتیں	۲۷۲
مقدونیا کی فتح	۲۷۳
مزید عثمانی فتوحات	۲۷۴
سلیمان کی وفات	۲۷۵
احمد ثانی ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء - ۱۱۰۶ھ/۱۷۰۳ء ۲۷۶ - ۲۷۷	۲۷۶
مصطفیٰ ثانی ۱۱۰۶ھ/۱۶۹۹ء - ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء ۲۷ - ۲۸۶	۲۷۸
جنگ کی تیاری	۲۷۹
ابتدائی فتوحات	۲۷۹
زنتا کی شکست	۲۷۹
حسین کوپریلی	۲۸۰
سقوط ازوف	۲۸۱
صلح نامہ کارلووٹز	۲۸۲
ملکی اصلاحات	۲۸۳
دالتابان پاشا	۲۸۴
مصطفیٰ کی معزولی	۲۸۵
احمد ثالث ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء - ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء ۲۸۷ - ۳۰۰	۲۸۷
روس سے جدید معاہدہ	۲۸۷
چارلس سے اعلان جنگ	۲۸۸

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
روس سے اعلان جنگ	۲۸۸	مشرقی تجویز	۳۱۲
زار کا جواب زار	۲۸۹	آسٹریا کی فیصلہ کن شکست	۳۱۳
صلح نامہ پرتھ	۲۹۰	صلح نامہ بلغراد	۳۱۳
بالطہ جی کا جرم	۲۹۱	سویڈن سے معاہدہ	۳۱۴
موریا کی فتح	۲۹۳	فرانس کے لیے مخصوص مراعات	۳۱۵
آسٹریا سے جنگ	۲۹۴	یورپین حکومتوں کی باہمی لڑائیاں	۳۱۵
بلغراد	۲۹۵	مختلف شورشیں	۳۱۶
معاہدہ پساروویچ	۲۹۶	ایک سیاسی غلطی	۳۱۶
جنگ ایران	۲۹۷	وہابی تحریک	۳۱۷
فوج کی بغاوت اور سلطان کی معزولی	۲۹۹	وفات	۳۱۷
پہلا مطبع	۳۰۰	**عثمان ثالث**	
[illegible]	۳۰۰	**۱۱۶۸ھ/ ۱۷۵۴ء - ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۷ء**	
محمود اوّل		۳۱۸	۳۱۸
۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۰ء - ۱۱۶۸ھ/ ۱۷۵۴ء		**مصطفیٰ ثالث**	
۳۰۱ - ۳۱۷	۳۰۱	**۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۷ء - ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء**	
جنگ ایران	۳۰۲	۳۱۹ - ۳۳۶	۳۱۹
روسی خطرہ	۳۰۳	راغب پاشا	۳۱۹
قضیۂ پولینڈ	۳۰۳	پرشیا سے اتحاد	۳۲۰
جنگ روس	۳۰۵	فریڈرک کا نقض عہد	۳۲۱
آسٹریا کا فریب	۳۰۹	کیتھرائن ثانیہ	۳۲۲
آسٹریا کی شکست	۳۱۰	اعلان جنگ	۳۲۳

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
آغاز جنگ	۳۲۳	وفات	۳۴۶
ابتدائی فتح	۳۲۳	**عبدالحمید اوّل**	
روس کی تیاریاں	۳۲۴		
امین پاشا کی نااہلی	۳۲۵	۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء - ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء	
موریا میں روس کی شکست	۳۲۶	۳۷۱ - ۳۴۷	۳۴۷
عثمانی جہازوں کی بربادی	۳۲۷	ترکوں کی شکست	۳۴۷
حسن کی حیرت انگیز کامیابی	۳۲۸	صلح نامہ کینارجی	۳۴۸
علی بیگ کی بغاوت	۳۲۹	صلح نامہ کینارجی کی اہمیت	۳۵۲
ترکوں کی مسلسل شکست	۳۲۹	بعض اصلاحات	۳۵۳
یورپ کی خدائی	۳۳۰	بغاوتوں کا استیصال	۳۵۴
فرانس	۳۳۱	کیتھرائن کے منصوبے	۳۵۵
انگلستان	۳۳۲	سلطنت عثمانیہ کی مجوزہ تقسیم	۳۵۷
پرشیا	۳۳۳	کریمیا پر روس کا قبضہ	۳۵۸
آسٹریا	۳۳۶	قسطنطنیہ کا راستہ	۳۶۳
تقسیم پولینڈ	۳۴۰	اعلان جنگ	۳۶۴
صلح کانفرنس	۳۴۱	انگلستان کا فریب	۳۶۵
بخارسٹ کی کانفرنس کی ناکامی	۳۴۲	ترکوں کی ابتدائی شکست	۳۶۵
محسن زادہ پاشا	۳۴۳	آسٹریا کا فریب	۳۶۶
معرکہ سلسٹریا	۳۴۴	جوزف کی مضحکہ خیز شکست	۳۶۸
روسی مظالم	۳۴۵	سقوط اوزاکوف	۳۶۹
روس سے شکست	۳۴۵	سلطان کی وفات	۳۷۱

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
سلیم ثالث		بحریہ	۳۸۹
۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء - ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء		اصلاحات	۳۸۹
۳۷۲ - ۴۱۹	۳۷۲	تعلیم	۳۹۰
جنگ کا سلسلہ	۳۷۳	فوج	۳۹۰
آسٹریا سے صلح	۳۷۴	بحریہ	۳۹۲
یونانیوں کی بغاوت	۳۷۴	نپولین	۳۹۳
سقوط اسمٰعیل	۳۷۵	مالٹا	۳۹۵
صلح کی گفتگو	۳۷۶	اسکندریہ	۳۹۶
انگلستان کی نئی پالیسی	۳۷۷	قاہرہ کی مہم	۳۹۸
صلح نامہ یاسی	۳۷۹	جنگ اہرام	۳۹۸
کیتھرائن کی موت	۳۷۹	جنگ نیل	۳۹۹
ملکی نظم ونسق	۳۸۰	قیام مصر	۳۹۹
پاشا	۳۸۰	علمی سرگرمیاں	۴۰۰
اعیان	۳۸۱	مصریوں سے میل جول	۴۰۰
باب عالی کا ضعف	۳۸۱	قاہرہ کی بغاوت	۴۰۱
رعایا کے مصائب	۳۸۲	اعلان جنگ	۴۰۱
نظام جاگیری کی ابتری	۳۸۴	شام	۴۰۲
مرکزی حکومت	۳۸۵	جنگ ابوقیر	۴۰۳
دیوان	۳۸۵	مصر پر عثمانی تسلط	۴۰۴
مخصوص مراعات	۳۸۶	فرانس سے صلح	۴۰۵
فوج	۳۸۶	اندرونی شورشیں	۴۰۵

مضمون	صفحہ
سرویا	۳۰۶
ینی چری کی قتل و غارت گری	۳۰۷
ینی چری کا استیصال	۳۰۸
سرویا کا مطالبۂ آزادی	۳۰۸
روس کی جنگی تیاریاں	۳۰۹
سرویا کی آزادی	۳۱۱
فرانس سے اتحاد	۳۱۲
روس سے اعلانِ جنگ	۳۱۲
برطانیہ کا الٹی میٹم	۳۱۳
مصر کی ناکام مہم	۳۱۵
روس سے جنگ کا سلسلہ	۳۱۶
سلیم کے خلاف سازش	۳۱۷
سلیم کی معزولی	۳۱۸
مصطفیٰ رابع ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء - ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء ۳۲۰ - ۳۲۴	۳۲۰
نپولین کی غداری	۳۲۱
حالاتِ آستانہ	۳۲۲
سلیم کا قتل	۳۲۳
مصطفیٰ کی معزولی	۳۲۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ دولتِ عثمانیہ

دار المصنفین نے تاریخ اسلام کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کی آخری کڑی تاریخ دولتِ عثمانیہ ہے، جس کو ہمارے رفیق مولوی محمد عزیر صاحب ایم، اے نے تقریباً سات برس کے محنت و مطالعہ کے بعد لکھا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کی یہ پہلی تاریخ ہو، جو اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اس سے پہلے ہماری زبان میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض یورپین مصنفوں کے تراجم اور خیالات تھے۔

اس تاریخ کی دوسری خصوصیت اس کی جامعیت ہے، یعنی یہ کہ ترکوں کی شروع سے موجودہ زمانہ کی پوری تاریخ ہے اور اس لحاظ سے بھی اس کی حیثیت اہم ہے۔

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کی مختلف جلدیں جیسے تیار ہوتی جائیں گی، چھپتی جائیں گی، چنانچہ اس کا پہلا حصہ چھپ چکا ہے، دوسرا زیر طبع ہے۔

تاریخ دولتِ عثمانیہ دو حصوں میں ختم ہوگی، پہلا حصہ آج شائع ہو رہا ہے اور دوسرا پریس میں جانے کو تیار ہے۔

سید سلیمان

(ناظم دار المصنفین)

۷/ شوال ۱۳۵۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

عثمانی ترک جن کا یہ نام کسی نسل یا قوم کی طرف نہیں بلکہ ان کے پہلے فرماں روا عثمان خان کی طرف منسوب ہے، ایشیائے کوچک میں پہلے خانہ بدوشوں کی حیثیت سے داخل ہوئے، پھر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ڈیڑھ سو برس کے اندر دنیا کی زبردست طاقتوں میں شمار کی جانے لگی، تین سو برس گزرنے نہ پائے تھے کہ عثمانی سلطنت وسعت اور طاقت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان سلطنت بن گئی، اس کے عروج کا دور مشرق میں سلطان سلیم اول اور مغرب میں سلیمان اعظم کی فتوحات پر ختم ہوتا ہے، جس کی حکومت ایشیا، یورپ اور افریقہ کے وسیع حصوں میں قائم تھی، اس عہد میں عثمانی ترک یک مرکزی یورپین طاقت تھے، ہنگری ان کے زیر نگیں تھا اور آسٹریا کے پایہ تخت ویانا کی دیواروں تک ان کی فوجیں پہنچ چکی تھیں، ان کی ہیبت سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھی۔

لیکن سلیمان اعظم کی زندگی ہی میں سلطنت کے اندر بعض کمزوریوں کے اسباب پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، جو اس کی وفات کے بعد روز بروز نمایاں ہوتے گئے، سلیمان کے بعد جتنے سلاطین تخت پر بیٹھے، ان میں سے معدودے چند کے علاوہ کسی میں سلطنت

شاہی فرماں روائی کی قابلیت جیسی چاہیے نہ تھی، چنانچہ جس طرح آہستہ آہستہ اس سلطنت کا عروج ہوا تھا، اسی آہستگی کے ساتھ اس کا زوال بھی شروع ہوا اور اس کے زوال کی مدت بھی اس کے عہد عروج کی طرح تین سو سال ہے، ان میں سے آخری ڈیڑھ سو برس میں سلطنت عثمانیہ اپنے سے کہیں زیادہ طاقت ور سلطنتوں کا مقابلہ کرتی رہی مگر اندرونی کمزوریوں کے باعث اسے پے در پے شکستیں اٹھائیں کہ بالآخر ۱۹۱۸ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

حال میں جمہوریہ ترکیہ نے اپنے چند سالہ قیام میں ان تمام کمزوریوں کو جو سلطنت عثمانیہ کی تباہی کا باعث ہوئی تھیں، دور کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں اس کی کامیابی تاریخ عالم کے حیرت انگیز کارناموں میں سے ہے، اس نے گذشتہ سلطنت کے کھنڈر پر ایک مستحکم قلعہ تعمیر کر دیا ہے جو ترکی قوم کے عزم و استقلال کی ایک زندہ مثال ہے یورپ کا "مرد بیمار" دم توڑنے کے بعد نہ صرف جی اٹھا بلکہ اس کے اندر صحت و شباب کی ساری قوتیں عود کر آئیں تا آنکہ بیسویں صدی کی عیسائی دنیا کو بھی اس معجزہ کا قائل ہونا پڑا۔

ذیل کے صفحات انہی واقعات کی تفصیل پر مشتمل ہیں، یہ سرگذشت بارہا بیان ہو چکی ہے، تاہم اپنے اندر کچھ ایسی کیفیت رکھتی ہے کہ تکرار سے جی نہیں گھبراتا، ترکوں نے اسلام کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، دفاع و جہاد کے فرض کو جس سرفروشی سے ادا کیا ہے، اس کا اعتراف جتنی بار بھی کیا جائے کم ہے، صرف یہی ایک چیز اس تالیف کے لیے معقول وجہ ہو سکتی ہے، جو عثمانی ترکوں کے کارناموں پر ترتیب دی جائے لیکن اگر اس کے علاوہ صحت روایات کا بھی حتی الامکان پورا پورا اہتمام کیا گیا ہو اور محض واقعات کے بیان کرنے پر قناعت نہ کی گئی ہو، بلکہ اسباب و علل کی تلاش بھی رہی ہو اور اس قوم کے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ عبرت کی نظر سے کیا گیا ہو تو مرتب کے لیے شاید کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔

ان صفحات کی ترتیب میں عثمانی ترکوں کی تاریخ سے متعلق انگریزی، عربی اور فارسی کی مستند ترین کتابوں نیز بعض منتخب ترکی اور فرانسیسی تاریخوں کے ترجموں سے مدد لی گئی ہے اور تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ حتی الامکان فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔

محمد عزیر (علی گڑھ)

۱۴/اگست ۱۹۳۹ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترک

ترک اول چھٹی صدی عیسوی میں روشنی میں آتے ہیں یہ ایک خانہ بدوش قوم تھی جو شرقی ایشیا اور وسط ایشیا میں گھومتی پھرتی تھی اور وقتاً فوقتاً مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کی آبادیوں پر حملہ آور ہو کر انہیں ویران کر دیتی تھی۔ چھٹی صدی عیسوی میں ان نے ایک زبردست سلطنت قائم کی۔ جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت کے بانی کا نام چینی تاریخوں میں "تومین" (Tumen) اور ترکی کتبوں میں "بومین" (Bumin) درج ہے۔ تومین ۵۵۲ء میں مر گیا۔ اس کے بھائی نے جس کا نام "استامی" (Istami) تھا مغرب میں فتوحات حاصل کیں۔ دونوں بھائی الگ الگ حکومتوں پر حکمران تھے۔ اہل چین ان حکومتوں کو شمالی ترکوں کی سلطنت اور مغربی ترکوں کی سلطنت کہتے تھے۔ پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) میں ان دونوں حکومتوں کو سلطنت چین کی اطاعت قبول کرنی پڑی لیکن ۶۳ھ (۶۸۲ء) میں شمالی ترکوں نے چین کی فرمانروائی سے آزاد ہو کر اپنی سابق خود مختاری پھر حاصل کر لی۔ "کتبات اورخون" جو منگولیا کے دریائے اورخون کے نام سے منسوب ہیں ترکی زبان کی قدیم ترین یادگار ہیں۔ ترکوں کی

اسی شمالی سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سلطنت ۱۲۱ھ (۷۳۹ء) تک قائم رہی، مغربی ترکوں میں "ترگیش" (Turgesh) کا قبیلہ سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس کے سرداروں نے پہلی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے آخر میں خاقان کا لقب اختیار کرلیا تھا لیکن ۱۲۱ھ (۷۳۹ء) میں عربوں نے نصر بن سیار کی قیادت میں ترگیش کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

ترک اسلام میں

ترکوں اور عربوں کے تعلقات پہلی صدی ہجری میں ولید اول کے عہد خلافت سے شروع ہوئے، اسی عہد میں قتیبہ بن مسلم نے بیکند، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا) فرغانہ، شاش (تاشقند) اور کاشغر کے ترکی علاقے فتح کر کے وہاں اسلامی حکومت قائم کی لیکن ان فتوحات کا اثر ترکوں کے قبول اسلام پر بہت کم پڑا اور وہ بدستور بت پرستی کرتے رہے، البتہ سمرقند میں قتیبہ کی بت شکنی نے بت پرستی کا خاتمہ بھی کر دیا، جب قتیبہ وہاں پہنچا تو اسے بہت سے بت خانے نظر آئے جن کی نسبت عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ ان کے ساتھ بے ادبی کرنے والا فوراً ہلاک ہو جائے گا، قتیبہ نے ان بت خانوں میں آگ لگا دی، مگر اس پر کچھ آنچ نہ آئی، یہ دیکھ کر بت پرستوں نے اسلام قبول کرلیا[1]۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے مختصر عہد خلافت ۹۹-۱۰۱ھ مطابق ۷۱۷-۷۲۰ء میں اشاعت اسلام کی خاص طور پر کوشش کی تو من جملہ اور ممالک کے انہوں نے ماوراء النہر کے (ترک) بادشاہوں کو بھی اسلام کی دعوت دی اور ان میں سے بعض اسلام لائے[2]، پھر عبداللہ ابن معمر الیشکری کو دعوت اسلام کے لیے ماوراء النہر بھیجا اور وہاں کے بعض قبیلے مسلمان ہو گئے، اس کے بعد خلیفہ ہشام کے عہد (۱۰۵-۱۲۵ھ مطابق ۷۲۴-۷۴۳ء) میں ابوصیداء کی تبلیغ سے ماوراء النہر کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے، سمرقند اور بخارا وغیرہ سے جو ترکستان کے علاقے تھے، جزیہ اور خراج کی رقمیں بیت المال میں

---

[1] دعوت اسلام (ٹی۔ آرنلڈ) مطبوعہ علی گڑھ، ص ۲۲۸ (The Preaching of Islam By T. W. Arnold)

[2] فتوح البلدان: بلاذری، مطبوعہ قاہرہ، ص ۴۲۲۔

تنی تھیں خراج کے سلسلہ میں ترکستان سے لونڈیاں اور غلام بھی بھیجے جاتے تھے، جو رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنے لگے، پھر بھی معتصم باللہ کی خلافت (۲۱۸-۲۲۷ھ مطابق ۸۳۳-۸۴۲ء) تک ترکوں میں اسلام کی اشاعت عام طور پر نہ ہو سکی۔ سب سے پہلے خلیفہ منصور (۱۵۸- ۱۳۶ھ مطابق ۷۷۵-۷۵۴ء) نے ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا تھا۔ امین کے عہد میں ان کی جماعت بہت قلیل تھی اور فوج اور حکومت میں صرف عربوں اور ایرانیوں کا اقتدار تھا۔ ہارون الرشید کے زمانہ خلافت میں اہل عرب اور اہل ایران کے درمیان جو حریفانہ کشاکش پیدا ہوئی اس نے امین کے زوال کے ساتھ عربوں کی قوت کا بھی خاتمہ کر دیا اور مامون کے عہد میں جس کی ماں ایرانی نسل تھی ایرانیوں کا زور بہت بڑھ گیا۔ اس کے بعد جب معتصم خلیفہ ہوا تو اس نے ایرانیوں کے اقتدار سے خائف ہو کر ترکوں سے مدد حاصل کرنی چاہی اور چونکہ اس کی ماں ترک تھی، اس لیے طبعاً ترکوں کی جانب میلان بھی تھا، چنانچہ اس نے ہزاروں ترک غلام خرید کر انہیں اسلامی تعلیم اور فوجی تربیت دی اور اب فوج میں ترکوں کی تعداد اور قوت تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی۔ گبن لکھتا ہے کہ "معتصم نے جو اس خطرناک مثال کا سب سے پہلا بانی ہے، پچاس ہزار سے زیادہ ترکوں کو دارالخلافت میں لا کر آباد کیا"[1] اس نے ان کے لیے طلاکار ریشمی لباس تجویز کیا اور زریں پٹکے وردی میں شامل کیے جس کی وجہ سے ترکی دستے دوسری فوجوں سے ممتاز معلوم ہوتے تھے، ہر سال ہزاروں ترک غلام پایہ تخت میں لائے جاتے تھے، ان میں سے کچھ محافظ شاہی دستہ میں شامل کیے جاتے تھے اور باقی فوج میں بھرتی ہوتے تھے، جو اپنی قابلیت میں زیادہ ممتاز ہوتے تھے وہ فوجوں کے سپہ سالار مقرر کیے جاتے تھے۔ جوں جوں ترکوں کی قوت فوج میں بڑھتی گئی عربی دستے کم ہوتے گئے۔ ترکوں کو چونکہ خلیفہ کی خاص سرپرستی حاصل تھی،

---

[1] تاریخ زوال [illegible] ۱۹۹۰ء (Decline and Fall of - The Roman Empire By E. Gibbon Vol IV, Fredrich Warne & Co_London, 1890

اس لیے وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور بغداد کی سڑکوں پر بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے تھے، جس سے اکثر عورتیں اور بچے ٹکرا کر زخمی ہو جاتے تھے اور بعض اوقات مر بھی جاتے تھے، اس لیے بغداد کے باشندے ان کے مظالم سے بہت جلد عاجز آ گئے، جب معتصم کے پاس ان کی شکایتیں کثرت سے پہنچنے لگیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ ترکوں کے لیے بغداد سے باہر ایک چھاؤنی بنائی جائے، اس غرض کے لیے اس نے سامرا کا مقام پسند کیا، جو بغداد سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، یہ مقام اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے اس کا نام بدل کر سرمن رای (جس نے دیکھا خوش ہوا) رکھ دیا، فوجی بارکوں کے علاوہ خلیفہ اور وزراء کے لیے بھی عالی شان محل تیار کیے گئے اور چوں کہ معتصم نے بغداد کا قیام ترک کر کے اپنی ترک سپاہ کے ساتھ سامرا میں رہنا شروع کر دیا تھا، اس لیے رعایا کے ہر طبقہ کے لوگ اس نئے شہر میں آ کر آباد ہونے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں سامرا ایک نہایت پررونق شہر بن گیا، وہ ۲۲۱ھ سے لے کر ۲۷۹ھ (۸۳۶ء تا ۸۹۲ء) تک سات خلفائے عباسیہ کا دار السلطنت رہا، جب معتضد تخت پر بیٹھا تو اس نے سامرا کو چھوڑ کر پھر بغداد کو پایہ تخت بنایا۔

معتصم کی ترک نوازی کی وجہ سے رفتہ رفتہ ترکی شہزادے اور امرا بھی ترکستان سے آ کر سامرا میں آباد ہونے لگے، جن میں بعض بت پرست اور بعض آتش پرست تھے اور بعض مسلمان ہو گئے تھے، دارالخلافت میں رہنے کے بعد غیر مسلم ترکوں میں بھی اسلام پھیلنے لگا اور اس تعلق سے ماوراء النہر کے ترکوں میں جو اپنے وطن میں مقیم تھے اسلام کی اشاعت ہونے لگی، ترک سرداروں کے اسلام قبول کر لینے سے ان کے قبیلے بھی مسلمان ہوتے گئے، چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں ترک بطون خاطر بکثرت اسلام میں داخل ہوئے، ۳۴۹ھ (۹۶۰ء) میں دو لاکھ ترک گھرانے (خیمے) مسلمان ہوئے۔ ابن اثیر[1] کا بیان ہے کہ ماوراء النہر کی ایک ترکی قوم کے دس ہزار گھرانے جو بلاساغون اور کاشغر کے نواح میں

---

[1] ابن اثیر جلد ۸ ص ۳۵۶، نیز دیکھیے تجارب الامم ابن مسکویہ جلد ۲ ص ۱۸۱

اسلامی علاقوں پر دھاوے مارا کرتے تھے، معتصم صفر ۲۲۷ھ (دسمبر ۸۴۱ء) میں اس دنیا سے گیا[1]۔

خلیفہ معتصم کے بعد ترکوں کا اقتدار فوج و حکومت میں روز بروز بڑھتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خلیفہ بغداد کا عزل و نصب تمام تر ان ہی کے ہاتھ میں آ گیا، نہ صرف تخت بلکہ خلیفہ کی زندگی بھی ان ہی کے رحم و کرم پر تھی۔ انھوں نے متعدد خلفاء کو ذلیل کر کے تخت سے اتارا اور بعضوں کو قتل بھی کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دولت عباسیہ کا زوال سلطنت کے ہر حصہ میں نمایاں ہونے لگا، مختلف صوبوں کے گورنروں نے پایۂ تخت سے آزاد ہو کر اپنی اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں، مثلاً ایرانی گورنروں نے خراسان میں طاہریہ، فارس میں صفاریہ، ماوراء النہر میں سامانیہ، آذربیجان میں ساجیہ اور جرجان میں زیاریہ کی جداگانہ حکومتیں قائم کر لیں، اسی طرح ترکوں نے مصر میں طولونیہ، ترکستان میں ایلکانیہ، پھر مصر میں اخشیدیہ اور افغانستان و ہند میں دولت غزنویہ کی بنیاد ڈالی، یہ تمام حکومتیں تیسری صدی کے وسط سے چوتھی صدی ہجری کے وسط تک قائم ہو گئیں، پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں ترکوں کے ایک گروہ نے خراسان میں دولت سلجوقیہ کی بنیاد رکھی۔

آل سلجوق | آل سلجوق کا مورث اعلیٰ دقاق تھا جو کاشغر کے ترکی قبائل کا ایک رئیس تھا، سلجوق، جس کے نام سے یہ خاندان مشہور ہے اسی کا لڑکا تھا، سلجوق اپنے غیر مسلم ترک فرماں روا کو چھوڑ کر بخارا کی اسلامی مملکت میں چلا آیا اور یہاں وہ اور اس کا پورا قبیلہ مسلمان ہو کر بخارا کے قریب مقام جند میں قیام پذیر ہوا، اس کے بعد اس نے غیر مسلم ترکوں پر فتوحات حاصل کر کے اپنی قوت بہت بڑھا لی۔

سلجوق نے اپنی وفات کے وقت تین لڑکے چھوڑے، ارسلان، میکائیل اور موسیٰ، دولت سلجوقیہ کے وارث میکائیل کے تین لڑکے ہوئے، بیغو، طغرل بیگ، جغری بیگ لیکن سلطنت کی فرماں روائی طغرل بیگ کو ملی، جس نے اپنے زور و قوت کا سکہ گردوپیش کے

---

[1] ابن اثیر جلد ۶ ص ۵۲۵ طبع بیروت۔

علاقوں پر حملہ کیا۔ محمود غزنوی نے سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہو کر ان سے جنگ شروع کر دی لیکن چند ہی ابتدائی فتوحات کے بعد اس کو اور اس کے لڑکے مسعود کو شکستیں اٹھانی پڑیں اور آل سلجوق تمام خراسان پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے جرجان، طبرستان اور خوارزم پر بھی قبضہ کر لیا اور پھر طغرل بیگ نے اصفہان، تبریز اور حلوان کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بغداد میں ترکوں اور آل بویہ کی باہمی مخاصمت سے سخت بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔ خلیفہ معتصم کے بعد دولت عباسیہ پر روز بروز ترکوں کا تسلط بڑھتا گیا لیکن چوتھی صدی ہجری سے آل بویہ نے اپنا اقتدار خلافت بغداد پر قائم کرنا شروع کیا جس سے ترکوں کی قوت پر ضرب پڑنے لگی۔ ان حریفوں کی کشمکش نے تمام سلطنت میں ہنگامہ برپا کر دیا اور بغداد کی حالت خصوصیت کے ساتھ بد سے بدتر ہونے لگی۔ مجبور ہو کر ترک سرداروں نیز خلیفہ قائم بامر اللہ نے طغرل بیگ سے اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے طلب کیا۔ چنانچہ طغرل بیگ رمضان ۴۴۷ھ (دسمبر ۱۰۵۵ء) میں بغداد میں داخل ہوا اور ملک رحیم کو گرفتار کر کے دولت آل بویہ کا خاتمہ کر دیا۔ اب بغداد میں آل سلجوق کا اثر قائم ہو گیا۔ خلیفہ نے "سلطان شرق و غرب" کے خطاب سے طغرل بیگ کی عزت افزائی کی۔ اس کے بعد طغرل بیگ نے عراق، موصل اور دیار بکر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ پھر الپ ارسلان کے دور حکومت میں ایشیائے کوچک اور شام بھی فتح ہو گیا اور ملک شاہ نے ۴۸۵ھ (۱۰۹۲ء) میں عدن اور یمن پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح سے پانچویں صدی سے ساتویں صدی ہجری تک خلیفہ بغداد کے ایشیائی مقبوضات کا بیشتر حصہ آل سلجوق کے زیر نگیں رہا۔

سلاجقۂ روم | اس خاندان کا بانی سلیمان بن قطلمش تھا۔ قطلمش طغرل بیگ کے امرا میں تھا لیکن بعد میں اس نے الپ ارسلان کے خلاف بغاوت کر کے خود مختاری حاصل کی اور بالآخر ۴۵۶ھ (۱۰۶۴ء) میں رے کے قریب جنگ میں مارا گیا۔ اس کا بیٹا سلیمان قسمت آزمائی کے لیے ایشیائے کوچک میں چلا آیا اور ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) میں نائیسیا پر

بازنطینی سلطنت کا ایک مشہور شہر تھا، قبضہ کر کے اسے اپنا پایۂ تخت بنایا اور ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی، ۴۷۷ھ (۱۰۸۴ء) میں اس نے انطاکیہ کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا لیکن پہلی جنگ صلیبی میں سلاجقۂ روم کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، ۴۹۰ھ (۱۰۹۷ء) میں نائسیا ان کے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا اور اسی کے ساتھ ایشیائے کوچک کے مغربی حصہ میں بھی ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس علاقہ پر بازنطینیوں کا قبضہ ہو گیا، اب صرف ایشیائے کوچک کا اندرونی حصہ ان کے پاس رہ گیا تھا لیکن وہاں بھی دانش مندیوں سے مقابلہ تھا، غرض چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں سلاجقۂ روم کی حالت بہت نازک نظر آتی تھی لیکن مسعود بن قلیج ارسلان نے اس گرتی ہوئی سلطنت کو سنبھالا اور قونیہ کو پایۂ تخت بنا کر ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ اس کے جانشین قلیج ارسلان ثانی نے اپنی فتوحات سے سلطنت میں اضافہ کیا اور دانش مندیوں کو مغلوب کر کے انہیں اپنا محکوم بنایا، ۵۷۸ھ (۱۱۸۲ء) میں قلیج ارسلان ثانی کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا چھوٹا بیٹا غیاث الدین کیخسرو اول تخت نشین ہوا، اس نے بازنطینیوں سے جنگ کر کے انطاکیہ کے بندرگاہ پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد اس کے جانشین عزالدین کیکاؤس اول نے سنوپ کو بھی فتح کر لیا، عزالدین کیکاؤس اور اس کے بعد علاء الدین کیقباد کا دور حکومت شان وشکوہ کے لحاظ سے سلاجقۂ روم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا لیکن غیاث الدین کیخسرو ثانی ہی کے عہد (۶۳۴ - ۶۴۳ھ مطابق ۱۲۴۶-۱۲۳۸ء) سے سلطنت کا زوال شروع ہو گیا جو پھر نہ رکا، اس دوران میں تاتاری طوفان ایشیائے کوچک کی سرحد تک پہنچ چکا تھا اور ارض روم اور سرحدی قلعوں پر تاتاریوں کا قبضہ ہو گیا تھا، آخرکار ۶۴۱ھ مطابق ۱۲۴۳ء میں کوزاداغ کی جنگ نے دولت سلجوقیہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور آل سلجوق کی آزادی ہمیشہ کے لیے ختم ہوئی، صلح کے بعد تاتاری چلے گئے لیکن ۶۴۳ھ (۱۲۴۵ء) میں کیخسرو ثانی کی وفات پر جب اس کے تینوں لڑکوں کی مشترکہ حکومت کی وجہ سے سلطنت میں بدنظمی پیدا ہوئی تو تاتاریوں نے پھر حملے شروع کر دیے، اس

درمیان میں ایک لڑکا مر گیا اور تخت کے دعوے دار بقیہ دو لڑکے عزالدین اور رکن الدین رہ گئے، ہلاکو نے سلطنت کو ان دونوں کے درمیان تقسیم کر دیا، مغربی صوبے عزالدین (کیکاؤس ثانی) کو اور مشرقی رکن الدین (قلیج ارسلان رابع) کو دیے لیکن حکومت دراصل تاتاریوں کی تھی اور سلاطین سلجوق کا عزل ونصب ان ہی کے ہاتھوں میں تھا، تاتاریوں کے تشدد سے عاجز آ کر امرائے سلطنت نے اہل مصر سے مدد کی درخواست کی اور مصریوں نے ایشیائے کوچک میں تاتاریوں کو شکست دے کر بھگا دیا لیکن ان کی واپسی کے بعد تاتاریوں نے پوری طرح انتقام لیا اور دولت سلجوقیہ کے رہے سہے اقتدار کو بھی خاک میں ملا دیا، سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر متعدد امراء نے مختلف صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم کر لیں ان میں بنو کرمان اور بنو اشرف اپنی قوت واثر کے اعتبار سے زیادہ ممتاز تھے تاتاریوں نے بارہا ان خودسر امیروں کو زیر کرنے کی کوشش کی مگر عارضی شکستوں کے بعد یہ اپنا اقتدار پھر قائم کر لیتے تھے اور ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے زوال پر انہوں نے مستقل حکومتیں قائم کر لیں، چنانچہ دولت سلجوقیہ کے خاتمہ کے قریب ایشیائے کوچک میں صاروخان، قرہ سی، ایدین، تکہ، حمید، کرمانیہ، کرمیان، قسطمونی اور منتشا کی خودسر حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔

ارطغرل

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کی ابتداء میں شاہان خوارزم کی قوت اوج شباب پر تھی، وہ ایران و خراسان اور شام و عراق میں آل سلجوق کے بیشتر مقبوضات پر قابض ہو چکے تھے اور ایشیا کی تمام اسلامی سلطنتوں کو فتح کر لینا چاہتے تھے لیکن عین اس وقت جب وہ اس حوصلہ کی تکمیل کے لیے تیار ہو رہے تھے، چنگیز خانی طوفان اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ اٹھا اور سلطنت خوارزم کو پاش پاش کر ڈالا، اس سلطنت کی تباہی کے بعد ترکی قبائل جنوب کی طرف بھاگے، ان میں بعض ایران اور شام میں پہنچے اور وہاں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں بہت کچھ اقتدار حاصل کیا اور ترکمانی مشہور ہوئے اور بعض جنوب کی طرف بڑھے اور مصر کے سلاطین مملوک سے معرکہ آرا ہوئے، جو خود ترکی النسل تھے لیکن مصر میں انہیں شکست ہوئی اور وہاں سے واپس ہو کر وہ ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں سے آملے، ان ہی ترکی قبائل میں جو چنگیز خاں کے حملہ کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر مارے مارے پھر رہے تھے، ارطغرل کا قبیلہ بھی تھا، یہ قبیلہ ترکان اوغوز کے قبیلہ کا ایک جزو تھا جو ارطغرل کے باپ سلیمان شاہ کی سرکردگی میں اپنے وطن خراسان کو چھوڑ کر مختلف ملکوں میں گھومتا ہوا شام کی طرف جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے سلیمان شاہ ڈوب کر ہلاک ہو گیا، قبیلہ کا بیشتر حصہ اس وقت منتشر ہو گیا لیکن جو لوگ رہ گئے وہ ارطغرل اور اس کے بھائی دوندار کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوئے اور

سلطان علاء الدین سلجوقی کی سلطنت میں داخل ہو گئے۔

پہلا معرکہ | یہ جماعت جو صرف چار سو بیس[1] گھرانوں پر مشتمل تھی، سلطان علاء الدین کے زیرِ سایہ پناہ لینے کے لیے پایۂ تخت قونیہ کی طرف جا رہی تھی کہ راستہ میں انگورہ کے قریب ارطغرل کو دو فوجیں مصروفِ جنگ نظر آئیں، وہ کسی فریق سے واقف نہ تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ ان میں سے ایک تعداد کے لحاظ سے کم زور اور دوسری قوی ہے، اپنے سواروں کے مختصر دستہ کے ساتھ جن کی مجموعی تعداد صرف چار سو چوالیس تھی، کم زور فریق کی حمایت کے لیے بڑھا اور اس جاں بازی سے حملہ آور ہوا کہ دشمن کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا، فتح حاصل کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ جس فریق کی اس نے یوں بروقت مدد کی تھی، وہ سلطان علاء الدین سلجوقی کی فوج تھی، جسے تاتاریوں کی ایک بڑی فوج نے گھیر رکھا تھا۔

سنگِ بنیاد | ارطغرل کے اس کارنامے کے صلہ میں سلطان علاء الدین نے اسے سغوت کا زرخیز علاقہ جو دریائے سقاریہ کے بائیں جانب بازنطینی سرحد کے قریب واقع تھا، جاگیر میں دے دیا گیا اور سغوت کا شہر بھی اسے دیا، اس علاقہ میں ارطغرل اور اس کے ساتھیوں نے، جو خراسان اور آرمینیا سے آئے تھے، بود و باش اختیار کی، علاء الدین نے ارطغرل کو اس جاگیر کا سپہ دار بھی مقرر کیا، چوں کہ ارطغرل کی جاگیر بازنطینی سرحد سے متصل واقع تھی، اس لیے بازنطینی قلعہ داروں سے اکثر جنگ کی نوبت آتی رہتی تھی، ارطغرل نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی شجاعت کا سکہ بٹھا دیا اور اس کی فتوحات کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے ترکی قبائل ایشیائے کوچک میں پہلے سے آباد تھے، اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے اور اس کی لڑائیوں میں شریک ہونے لگے، اس طرح اس کی قوت روز بروز بڑھتی گئی اور اس کا اقتدار گرد و پیش کے علاقوں میں قائم ہونے لگا۔

سلطان علاء الدین کے لیے ایک جاگیردار کا اس طرح قوت و اقتدار حاصل کر لینا

---

[1] ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے ص ۱۳ (The Turki Empire By Lord Eversley)

تشویش کا باعث ہوتے لیکن چنگیز کے حملے میں دولت سلجوقیہ اندرونی انتشار اور بیرونی حملوں کے سبب زوال کی آخری منزل میں تھی، گرچہ قونیہ میں سلاجقۂ روم کی قدیم شان و شوکت اب بھی نمایاں تھی تاہم حکومت کا دائرہ بہت محدود ہو گیا تھا، ایک طرف تاتاریوں نے شمالی اور مشرقی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا تو دوسری طرف مسیحیوں نے شمال اور مشرق کے قدیم بازنطینی صوبوں کے اکثر حصے واپس لے لیے تھے، وسطی اور جنوبی حصہ میں متعدد سلجوقی سرداروں نے خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں، سرحدی علاقوں میں جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، تاتاری حملوں کا خطرہ بھی دور نہیں ہوتا تھا، ایسی حالت میں ارطغرل جیسے دلیر سردار اور اس کی فتوحات سے علاء الدین کو بجائے تشویش کے ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور اس نے ارطغرل کو مزید انعامات عطا کیے، چنانچہ جب ینی شہر اور بروصہ کے درمیان ایک جنگ میں ارطغرل نے علاء الدین کے نائب کی حیثیت سے تاتاریوں اور بازنطینیوں کی ایک متحدہ فوج کو شکست دی تو سلطان نے اس کے صلہ میں اس شہر کو بھی اس کی جاگیر میں دے دیا اور پوری جاگیر کا نام سلطانونی (صدر سلطانی) رکھا، نیز ارطغرل کو اپنے مقدمۃ الجیش کا سپہ سالار مقرر کیا، اس وقت علاقہ میں بکثرت چراگاہیں اور زرخیز زمینوں کے علاوہ متعدد قلعے بھی تھے مثلاً قراجہ حصار، بلے جک، اینگی وغیرہ لیکن سلطانونی کے اکثر حصوں پر رومی امیروں کا قبضہ تھا اور اس جاگیر پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے ارطغرل اور اس کے بعد عثمان کو مدتوں جنگ کرنی پڑی، ہلال سلطان علاء الدین کے علم کا نشان تھا، ارطغرل نے بھی اس کے نائب کی حیثیت سے اسی نشان کو اختیار کیا جو آج تک ترکوں کی عظمت کا قومی نشان ہے۔[1]

۶۸۷ھ (۱۲۸۸ء) میں ارطغرل نے نوے سال کی عمر میں انتقال کیا اور سغوت کے قریب دفن ہوا۔

---

[1] تاریخ ترکان عثمانی از کریسی جلد اول ص ۲۵ History of The Ottoman Turks By Edward Creasy

عثمان خان اوّل

٦٨٧ھ تا ٧٢٦ھ مطابق ١٢٨٨ء تا ١٣٢٦ء

ارطغرل کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا عثمان اس کا جانشین ہوا، یہ دولت عثمانیہ کا بانی اور سلطنت عثمانیہ کا پہلا تاجدار ہے، ارطغرل نے اپنے زور قوت اور دولت سلجوقیہ کے تفرق و انتشار کے باوجود کبھی خود مختاری کا دعویٰ نہیں کیا اور گو سلجوقی امراء نے سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر متعدد خود سر حکومتیں قائم کر لی تھیں لیکن وہ خود آخر دم تک سلطان قونیہ کا وفادار اور جاگیردار بنا رہا، عثمان نے بھی یہی روش اختیار کی اور اپنی فتوحات سے سلطان کی شان و شوکت کو ایک حد تک محفوظ رکھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دولت سلجوقیہ دم توڑ رہی تھی اور ایشیائے کوچک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اس بنا پر اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع عثمان کو نہیں مل سکتا تھا لیکن اس نے اپنی توجہ زیادہ تر بازنطینی علاقوں کی طرف مبذول رکھی جس کے مختلف اسباب تھے، پہلی وجہ تو یہ تھی کہ خود اس کی جاگیر بازنطینی سرحد سے متصل واقع تھی اور بازنطینی سلطنت کی کمزوری روز بروز نمایاں ہوتی جا رہی تھی، یہ اسی کمزوری اور شہنشاہ قسطنطنیہ کی ایک سیاسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ کوہ اولمپس (Olympus) کے دروں کی حفاظت نہ ہو سکی اور ترک بتھینیا (Bithynia) کے میدانوں میں داخل ہو گئے، شہنشاہ پلیالوگس (Palaeologus)

نے عہد تک ان دروں کی حفاظت اس علاقے کے ردیف (ملیشیا) کے سپرد تھی اور وہ لوگ اس خدمت کے معاوضہ میں ٹیکسوں سے بری تھے لیکن اس کے بعد شہنشاہ نے اس رعایت کو منسوخ کر دیا اور دروں کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی، نیز خراج کی رقم سختی سے وصول کرنی شروع کی، نتیجہ یہ ہوا کہ دروں کی حفاظت میں غفلت ہونے لگی اور وہ جفاکش پہاڑی لوگ محض کسان ہو کر رہ گئے، جن میں نہ کوئی جوش باقی رہا اور نہ فوجی نظم و ترتیب، بازنطینی سلطنت جو کسی زمانہ میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں شمار کی جاتی تھی، فرقہ وارانہ جھگڑوں اور انتہائی بدنظمیوں میں مبتلا تھی، جس کے باعث اس میں کسی طاقتور حریف کے مقابلہ کی قوت باقی نہیں رہی تھی، ایشیائے کوچک میں اس کے سابق مقبوضات میں سے صرف چند شہر مثلاً بروصہ، ازنیا، نائکومیڈیا اور ان کے نواحی اضلاع باقی رہ گئے تھے، جو شمال مغرب میں واقع تھے، نیز باسفورس اور بحر مارمورا کے ساحلی خطے ابھی تک قسطنطنیہ کے زیر حکومت تھے، اناطولیہ کے بقیہ کے تمام علاقے جو پہلے بازنطینی سلطنت میں داخل تھے، اس کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے، عثمان کے لیے بازنطینی علاقوں کی طرف متوجہ ہونے کی دوسری وجہ اسلام کی تبلیغ تھی، تیسری وجہ بازنطینیوں سے برسرپیکار ہونے کی یہ تھی کہ عثمان کے لیے دوسری جانب قدم بڑھانے کی گنجائش نہ تھی، سلجوقی امراء جنہوں نے خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں، طاقت میں اس سے بڑھے ہوئے تھے۔

قراجہ حصار | لیکن ان ترغیبات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ عثمان نے با اقتدار ہونے کے ساتھ ہی حملے شروع کر دیے، اس کی لڑائیاں ابتداءً مدافعانہ تھیں، بازنطینی قلعہ دار دولت سلجوقیہ کے سرحدی علاقوں پر وقتاً فوقتاً حملہ آور ہوتے رہتے تھے، سلطان قونیہ کے ایک نائب کی حیثیت سے عثمان کو ان حملہ آوروں سے مقابلہ کے لیے آگے بڑھنا پڑا، پہلے ہی سال قراجہ حصار کا معرکہ پیش آیا، عثمان نے اس قلعہ کو فتح کر کے بازنطینیوں کو آئندہ کے لیے متنبہ

---

[1] گبن تاریخ زوال روما، جلد ۴، ص ۳۶۱۔

کر دیا، سلطان علاء الدین نے قراجہ حصار اور اس کے گرد و پیش کی تمام اراضی جو عثمان نے بزور شمشیر حاصل کی تھی، اسے جاگیر میں دے دی، نیز بک کے خطاب سے سرفراز کر کے اسے اپنا سکہ جاری کرنے اور اپنا نام جمعہ کے خطبہ میں شامل کرنے کی بھی اجازت دی، اس طرح لقب کے علاوہ بادشاہی کے تمام امتیازات عثمان کو حاصل ہو گئے۔

استقلال یہ کمی بھی چند سالوں کے بعد پوری ہوگئی، ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) میں تاتاریوں نے ایشیائے کوچک پر حملہ کیا اور اسی جنگ میں سلطان علاء الدین مارا گیا، بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا قاتل خود اس کا لڑکا غیاث الدین تھا، جس نے تخت سلطنت کی خاطر ایسا کیا،[1] بہر حال تاتاریوں نے غیاث الدین کو بھی قتل کر دیا اور ایشیائے کوچک میں دولت سلجوقیہ کا خاتمہ ہو گیا، اب عثمان بالکل آزاد اور خود مختار تھا اور آئندہ اس نے تمام فتوحات ایک خود مختار فرماں روا کی حیثیت سے حاصل کیں۔

سلجوقی امراء میں عثمان کا سب سے بڑا حریف امیر کرمانیہ تھا، چنانچہ ایشیائے کوچک کے ترکوں کی سرداری اور پورے ملک کی حکومت کے لیے فریقین کے درمیان عثمان کی زندگی ہی میں جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جو اس کے متعدد جانشینوں کے عہد تک جاری رہا، خود عثمان نے بھی امیر کرمانیہ کو کئی بار نیچا دکھایا لیکن سلطنت بازنطینی کے زرخیز مقبوضات زیادہ تر اس کی توجہ کا مرکز تھے اور اس کی زندگی کے آخری چھبیس سال کے کارناموں میں بازنطینی ہی شہروں اور قلعوں کی فتوحات نمایاں ہیں۔

عثمان کے کارنامے تاہم عثمان کا مقصد زندگی صرف فتوحات کا حاصل کرنا اور گرد و پیش کی ریاستوں کو اپنا مطیع بنانا نہ تھا، ۶۹۰ھ (۱۲۹۱ء) سے ۶۹۷ھ (۱۲۹۸ء) تک اس نے اپنی توجہ تمام تر حکومت کے انتظام و استحکام کی جانب مبذول رکھی، حکومت کے مختلف شعبے قائم کر کے حکام کا تقرر کیا اور رعایا کے فلاح و بہبود کے انتظامات میں مصروف رہا لیکن

---

[1] تاریخ دولت عثمانیہ، از محمد فرید بک، مطبوعہ مصر ۱۳۱۲ھ، ص ۴۱۔

دوسرے ترک سرداروں نے، جو عثمان کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف تھے، اس کی خاموشی کو ضعف پر محمول کیا اور بازنطینی قلعہ داروں سے اتحاد کر کے اس کے مقبوضات پر حملہ آور ہوئے، اس طرح جنگ کا جو سلسلہ ۶۹۷ھ (۱۲۹۸ء) میں چھڑا وہ ابتداءً عثمان کی طرف سے بالکل مدافعانہ تھا لیکن ان حملہ آوروں کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، عثمان نے ان سب کو شکست دی، نواح کے چھوٹے چھوٹے سرداروں کو مطیع کیا، بازنطینی قلعے یکے بعد دیگرے فتح کیے اور بالآخر ینی شہر پر قبضہ کر کے اسے اپنی مملکت کا پایۂ تخت بنایا، ۷۰۱ھ (۱۳۰۱ء) میں عثمان کو نائیکومیڈیا سے متصل قیون حصار کے مقام پر پہلی بار شہنشاہ قسطنطنیہ کی باقاعدہ فوج سے مقابلہ پیش آیا، جس میں اسے شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور چھ سال کے اندر اس کی فتوحات کا دائرہ بحر اسود کے ساحل تک پہنچ گیا، بازنطینی قلعے پے در پے مسخر ہوتے گئے اور بروصہ، نائسیا اور نائیکومیڈیا کے گرد فوجی چوکیوں کا ایک مضبوط حصار قائم ہو گیا، اس خطرہ کو دور کرنے کی غرض سے بازنطینیوں نے تاتاریوں کو عثمانی مقبوضات پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا، عثمان نے اپنے لڑکے اورخان کو حملہ آوروں کے مقابلہ میں بھیجا، تاتاریوں کو سخت شکست ہوئی اور بازنطینیوں کی امید کی یہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔

فتح بروصہ اور عثمان کی وفات | ۷۱۷ھ (۱۳۱۷ء) میں عثمان نے بروصہ کا محاصرہ کیا جو ایشیائے کوچک میں سلطنت بازنطینی کا ایک نہایت اہم شہر تھا، یہ محاصرہ تقریباً دس سال تک جاری رہا، بالآخر ۷۲۶ھ (۱۳۲۶ء) میں عاجز آ کر محصورین نے ہتھیار ڈال دیے اور شہر کو خالی کر دیا اور ترکی فوج اورخان کی سرکردگی میں فاتحانہ طور پر بروصہ میں داخل ہوئی، عثمان اس وقت سغوت میں بستر مرگ پر تھا لیکن وفات سے قبل اورخان یہ خوش خبری لے کر اس کے پاس پہنچ گیا، عثمان نے اورخان کی ہمت و شجاعت کی داد دے کر اسے اپنا جانشین مقرر کیا اور بلا تفریق تمام رعایا کے ساتھ یکساں عدل و انصاف اور بھلائی کرنے کی وصیت کی، پھر یہ ہدایت کی کہ اسے بروصہ میں دفن کیا جائے اور اس شہر کو عثمانی مملکت کا پایۂ تخت بنایا جائے، چنانچہ اس

وصیت کے مطابق اسے بروصہ میں دفن کیا گیا اور اس کی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

سلطنت | عثمان دولت عثمانیہ کا پہلا تاج دار ہے، اس بنا پر عموماً اس کے نام کے ساتھ سلطان کا لقب بھی شامل کر دیتے ہیں لیکن خود اس نے اور اس کے بعد اورخان اور مراد اول نے صرف "امیر" ہی کا لقب اختیار کیا، ارطغرل کی وفات پر اس کے مقبوضات کا دائرہ سغوت، اس کی شہر اور چند مواضعات پر ختم ہو جاتا تھا، عثمان نے اپنی اڑتیس سال کی حکومت میں اس دائرہ کو جنوب میں کوتاہیہ اور شمال میں بحر مارمورا اور بحر اسود کے ساحلوں تک وسیع کر دیا،[۱] اس کی قلمرو کا طول تقریباً ۱۲۰ میل اور عرض تقریباً ۶۰ میل تھا، آبادی صرف ترکوں پر مشتمل نہ تھی، بلکہ بیشتر علاقے چوں کہ سلطنت بازنطینی کے ایشیائی مقبوضات سے حاصل کردہ تھے، اس لیے آبادی میں ایک بڑی تعداد یونانی اور سلافی باشندوں کی بھی تھی، جو بخوشی مسلمان ہو کر ترکوں میں شامل ہو گئے تھے، ایورسلے لکھتا ہے کہ یہ عیسائی کسی جبر سے اسلام نہیں لائے کیوں کہ تاریخ میں نہ تو قیدیوں کے قتل عام کا کوئی ذکر ہے اور نہ بحیثیت غلام انہیں فروخت کرنے کا بلکہ ان کے اسلام لانے کی وجہ[۲] یہ ہوئی کہ قسطنطنیہ کے یونانیوں نے جو فطری طور پر ان کے محافظ تھے، انہیں چھوڑ دیا تھا، اسلام میں داخل ہونے کے بعد فاتح اور مفتوح کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہو گئے اور دونوں کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی، جو دوسری ترکی ریاستوں کے باشندوں سے بہت کچھ مختلف تھی اور اپنے کو "عثمانی" کہتی تھی۔

عثمان کا اسلام | اس موقع پر خود عثمان اور اس کے قبیلے کے اسلام لانے کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے، اب سے بیس بائیس سال قبل تک یہ امر عموماً مورخین کے نزدیک مسلم تھا کہ ارطغرل اور اس کے ساتھی ایشیائے کوچک میں داخل ہونے سے پہلے[۳] ہی مسلمان تھے لیکن

---

[۱] ترکی، جلد ۱، ص ۱۱

[۲] ترکی سلطنت، از لارڈ ایورسلے، ص ۱۵، مطبوعہ لندن ۱۹۲۴ء (The Turkish Empire By Lord Eversley)

[۳] ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے، ص ۱۹، مطبوعہ لندن ۱۹۲۴ء۔

۱۹۱۶ء میں مسٹر ہربرٹ گبنس نے اپنی مستند تالیف ''اساس سلطنت عثمانیہ''[1] کو شائع کر کے یہ تازہ تحقیق پیش کی کہ سغوت میں بود و باش اختیار کرنے کے وقت عثمان اور اس کے قبیلہ کے لوگ بت پرست تھے، مسٹر گبنس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

تیرہویں صدی عیسوی کے ابتدا میں خراسان اور ماوراء النہر کے دوسرے علاقوں کی جو قومیں ایشیائے کوچک کی سرحدوں پر نمودار ہوئیں ان کے اسلام لانے کا کوئی صریح ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا، ان سے پہلے کے ترک حملہ آور جب اس ملک میں داخل ہوئے تو وہ کئی پشتوں سے عربی اسلام کے زیر اثر رہتے آئے تھے، چنانچہ آل سلجوق بھی مسلمان ہی تھے لیکن بعد کے آنے والے ترک جن میں عثمان پیدا ہوا، کچھ بہت زیادہ اسلام کے زیر اثر نہیں رہے، خود عثمانیوں کے مؤرخ نشری کے بیان سے بھی صاف اشارہ ملتا ہے کہ عثمان کا مورث اعلیٰ سلیمان شاہ اور اس کے ساتھی جو اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور پچاس ہزار گھرانوں پر مشتمل تھے، غیر مسلم تھے، وہ کہتا ہے کہ ان میں سے کچھ شامی ترکمانوں کے آباء و اجداد تھے اور بقیہ ان تمام خانہ بدوش قوموں کے جو روم میں ادھر ادھر پھرا کرتی تھیں اور خود نشری کے زمانہ میں بھی موجود تھیں، بارہویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے سیاحوں کی بکثرت شہادتوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قومیں بت پرست تھیں، ان مختلف ترکی قبیلوں نے جو اسی زمانہ میں ایشیائے کوچک میں داخل ہوئے، جب عثمان کا قبیلہ وہاں آیا، ملک کے مغربی حصہ میں پہنچ کر اپنے آپ کو ایک اسلامی ماحول میں پایا، وہ تعداد میں تھوڑے تھے، ان کے لیے اس سے زیادہ قدرتی بات کوئی نہ تھی کہ اپنے سلجوقی اقرباء کا مذہب اختیار کر لیں، یہ اتنی قدرتی بات تھی کہ اس کے ذکر کی کوئی ضرورت سمجھی ہی نہیں گئی، عثمان اور اس کے قبیلہ کے اسلام لانے سے عثمانی قوم پیدا ہوئی کیوں کہ اسلام ہی نے ان مختلف قوموں کو جو ایشیائے کوچک کے شمال مغربی گوشہ میں آباد تھیں، متحد کر کے ایک قوم بنا دیا، یہ سابقہ قومیت کے خاتمہ کا نہیں بلکہ اس تبدیل

---

[1] The Foundation Of The Othman Empire By H. Adams Gibbns, New York, 1916

مذہب ہی کا نتیجہ تھا کہ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) کے بعد عثمان کی فاتحانہ سرگرمیاں شروع ہوئیں، حالانکہ اس سے سغوت کی زندگی کے پچاس سال ان سرگرمیوں سے خالی تھی، ارطغرل اور عثمان ایک دیہاتی سردار کی حیثیت سے سغوت میں سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے تمام حوصلے اپنے چھوٹے سے گاؤں ہی تک محدود تھے، ان کی اس زمانہ کی کسی جنگ یا فتح کا ذکر تاریخ میں موجود نہیں، ارطغرل کے ساتھ چار سو سپاہی تھے اور عثمان کے ہمراہ اس سے زیادہ سپاہیوں کے ہونے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، اس کے تعلقات اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بالکل صلح و دوستی کے تھے، نشری کا بیان ہے کہ اس ملک کے کافر و مسلم دونوں ارطغرل اور اس کے لڑکے کی عزت کرتے تھے، کافر و مسلم کا کوئی سوال ہی نہ تھا، پھر دفعۃً ہم عثمان کو اپنے پڑوسیوں پر حملہ آور ہوتے اور ان کے قلعوں کو فتح کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) سے ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) تک وہ اپنے مقبوضات کو وسیع کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی سرحد بازنطینی علاقوں سے مل جاتی ہے، اس کے سپاہیوں کی تعداد چار سو سے بڑھ کر چار ہزار تک پہنچ جاتی ہے، ہم ایک قوم کا ذکر سننے لگتے ہیں، جو ترک نہیں بلکہ اپنے سرداروں کے نام پر "عثمانی" کہلاتی ہے، اس سردار کا نام خود بھی اس کی قوم ہی کے نام کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، یہ لوگ یونانیوں (بازنطینیوں) اور تاتاریوں دونوں کے یکساں دشمن ہیں اور متعین طور پر اسلام سے وابستہ ہیں، ان میں ایک ایسا تبلیغی جوش ہے جو صرف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جنہوں نے حال ہی میں مذہب تبدیل کیا ہو، ان کی باہمی وحدت اور ایشیائے کوچک کے دوسرے ترکوں سے ان کا قطعی طور سے مختلف ہونا، چودھویں صدی کے ابتدائی ساٹھ سالوں میں اس قدر نمایاں ہو جاتا ہے کہ یورپ انہیں بحیثیت ایک قوم کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، ایشیائے کوچک کی دوسری جماعتوں کی بہ نسبت چونکہ یہی لوگ یورپ کے سامنے زیادہ آئے، اس لیے اہل یورپ نے انہیں محض "ترک" کہنا شروع کیا اور ان کو اناطولیہ کے تمام ترکوں کا نمائندہ سمجھنے لگے۔[1]

---

[1] اساس سلطنت عثمانیہ از ہربرٹ گبنس ص ۲۵-۳۵۔

پروفیسر گبنس نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، لکھتے ہیں: "اپنے پیش روؤں کی طرح جنہوں نے ایشیائے کوچک میں بود و باش اختیار کر لی تھی "عثمانلی" بھی ترک ہی تھے، البتہ ان کی بولی زبان سے مختلف تھی، ایک اور فرق یہ تھا کہ سلاجقہ تو صدیوں سے اسلام لا چکے تھے لیکن یہ نو وارد جو اپنے قدیم خانہ بدوشی کے مسلک پر قائم تھے، ان کے سردار طغرل کے بیٹے عثمان کی شادی کے متعلق جو روایت مشہور ہے اس سے ہمارا یہ قیاس حق بجانب ہے کہ انہوں نے ایشیائے کوچک کی اسلامی فضا میں داخل ہونے کے بعد اسلام قبول کیا۔"

مال خاتون | وہ روایت یہ ہے کہ اس شہر کے قریب اتروفی نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک متدین عالم اوہ بالی رہا کرتے تھے، عثمان اپنی نوعمری کے زمانہ میں ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا، ان کی ایک نہایت حسین لڑکی تھی جس کا نام مال خاتون تھا، ایک روز اتفاق سے عثمان کی نظر اس دوشیزہ پر پڑ گئی اور وہ دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا، اس نے نکاح کا پیغام دیا لیکن اوہ بالی چوں کہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اس لیے فرق مراتب کا لحاظ کر کے انہوں نے اس پیغام کو قبول نہیں کیا، دو سال تک عشق و محبت کا یہ سلسلہ جاری رہا اور عثمان نے اوہ بالی کے گھر کی آمد و رفت جاری رکھی، اس درمیان میں چند اور ترک سرداروں نے بھی، جو دولت اور وجاہت میں عثمان سے بڑھے ہوئے تھے، مال خاتون سے شادی کی خواہش کی لیکن اوہ بالی نے ان کو بھی صاف جواب دے دیا، آخر ایک رات جب عثمان اوہ بالی کے یہاں مقیم تھا، اس نے یہ عجیب و غریب خواب دیکھا کہ ایک چاند ہلال بن کر اوہ بالی کے سینہ سے نکلا اور رفتہ رفتہ بدر کامل بن کر اس کے سینہ میں اتر آیا، پھر اس کے پہلو سے ایک زبردست درخت نمودار ہوا جو بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحر و بر پر چھا گئیں، درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینوب بہہ رہے تھے اور چار بڑے

---

[1] [illegible] کی اسلامی خدمات از [illegible] جو [illegible] کی [illegible] کا [illegible] ترجمہ ہے۔

بڑے پہاڑ کوہ قاف، کوہ بلقان، کوہ طور اور کوہ اطلس اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے، دفعۃً ایک نہایت تیز ہوا چلی اور اس درخت کی پتیوں کا رخ جو شکل میں تلوار سے مشابہ تھیں، ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا، یہ شہر جو دو سمندروں اور دو براعظموں کے اتصال پر واقع تھا، مثل ایک انگوٹھی کے دکھائی دیتا تھا، جس میں دو نیلم اور دو زمرد جڑے ہوئے تھے، عثمان اس انگوٹھی کو پہننا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی، بیدار ہونے کے بعد اس نے یہ خواب اڈہ بالی سے بیان کیا، اڈہ بالی نے اس میں عثمان کے شاندار مستقبل کی تعبیر دیکھ کر نیز اسے ایک اشارۂ غیبی سمجھ کر مال خاتون کو اس کے نکاح میں دے دیا، اڈہ بالی ہی کی تلقین سے عثمان اور اس کے قبیلہ کے لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔

ذاتی اوصاف عثمان میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے جو ایک بانی سلطنت کے لیے ضروری ہیں، اس کی ہمت اور شجاعت غیر معمولی تھی، اسے قیادت کا ملکہ خداداد حاصل تھا، میدان جنگ میں اس کی بہادری سپاہیوں میں دلیری کی روح پھونک دیتی تھی اور انتظام حکومت میں اس کی دانشمندی رعایا کے دلوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی، اس کے عدل وانصاف کی شہرت تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، اس کی عدالت میں ترک وتاتار، مسلم وعیسائی سب برابر تھے، رعایا کی بہبودی اس کا نصب العین اور ملک کی خوش حالی اس کا مطمح نظر تھا، قرون اولیٰ کے مجاہدوں کی طرح اس کا طرز زندگی نہایت سادہ اور نمائش سے یکسر پاک تھا، دولت اس نے کبھی جمع نہیں کی، تمام مال غنیمت غریبوں اور یتیموں کا حصہ نکالنے کے بعد سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا تھا، ینی شہر میں اس کے رہنے کا جو مکان تھا، اس میں سونے، چاندی یا جواہرات کی قسم سے کوئی چیز بھی اس کے مرنے کے بعد نہیں ملی، صرف ایک کفتان، ایک سوتی عمامہ، لکڑی کا ایک چمچہ، ایک نمک دان، چند خالص عربی گھوڑے، زراعت کے لیے چند جوڑ بیل اور بھیڑوں کے کچھ گلے، علم اور اسلحہ کے علاوہ، بس یہی اس کی ساری کائنات تھی، وہ نہایت فیاض، نہایت رحم دل اور نہایت مہمان نواز تھا، ان خصوصیات کی وجہ سے اس کی ہر دل عزیزی

تھی۔ چنانچہ تخت نشینی کے موقع پر جب اس کی تلوار جو ابھی تک محفوظ ہے، اس کے جانشینوں کی کمر سے باندھی جاتی تھی تو ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کی جاتی تھی کہ "خدا اس میں بھی عثمان کی جیسی خوبیاں پیدا کر دے۔"

لیکن ان خوبیوں کے ساتھ عثمان کے دامن پر ایک بے گناہ کے خون کی چھینٹیں بھی نظر آتی ہیں۔ ۶۹۸ھ (۱۲۹۹ء) میں جب اس نے یونانیوں کے قلعہ کوہ پری حصار پر حملہ کا عزم کیا تو پہلے اپنے فوجی سرداروں کو بلا کر مشورہ طلب کیا، اس مجلس میں اس کا بوڑھا چچا دوندار بھی تھا، اس نے یونانیوں کی قوت کا اندازہ کر کے حملہ کرنے کے خلاف رائے دی، عثمان نے اس خوف سے کہ مبادا دوندار کے مشورہ سے دوسرے سرداروں کی ہمتیں بھی پست نہ ہو جائیں فوراً ایک تیر مار کر اسے ہلاک کر دیا، بوڑھے چچا کا یہ قتل آج خواہ کتنا ہی معیوب نظر آئے لیکن اس زمانہ کے لحاظ سے یہ ایک بالکل معمولی واقعہ تھا اور اگر نتیجے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی اہمیت اور بھی کم ہو جاتی ہے۔

پہلی مسجد عثمان نے اپنے ابتدائی عہد حکومت میں ایک مسجد اس شہر میں تعمیر کرائی جو سلطنت عثمانیہ کی پہلی مسجد ہے۔

اورخان

۷۲۶ھ تا ۷۶۰ھ مطابق ۱۳۲۶ء تا ۱۳۵۹ء

عثمان نے اپنی وفات کے وقت اپنے چھوٹے بیٹے اورخان کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا، اورخان کی عمر اس وقت ۴۲ سال کی تھی اور وہ فن سپہ گری میں عثمان کے زیر نگرانی مہارت اور کمال حاصل کر چکا تھا، اس کے بڑے لڑکے علاء الدین نے اپنا وقت علوم دینیہ کی تحصیل میں صرف کیا تھا، فن حرب سے اس کو مناسبت نہ تھی، تاہم عثمان کی وفات کے بعد اورخان نے سلطنت کا باہم تقسیم کر لینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن علاء الدین نے باپ کی وصیت نیز اپنی سکون پسند طبیعت کی بنا پر اس کو نامنظور کیا اور اورخان کے اصرار پر صرف انتظام مملکت کی ذمہ داری قبول کی، یعنی تخت سلطنت سے کنارہ کش ہونے کے باوجود بار سلطنت کا اٹھانا قبول کیا اور دولت عثمانیہ کے پہلے وزیر کی حیثیت سے آئین ملک کی ترتیب و تنظیم میں مشغول ہوا۔

اصلاحات علاء الدین نے تین چیزوں پر خاص طور سے توجہ کی، سکہ، لباس اور فوج۔ اگرچہ سلطان علاء الدین سلجوقی نے عثمان کو خطبہ کے علاوہ اپنے نام کا سکہ جاری کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی، تاہم عثمان نے صرف خطبہ ہی پر قناعت کی تھی اور اپنا سکہ جاری نہیں کیا تھا، اورخان کی تخت نشینی کے وقت تمام ایشیائے کوچک میں صرف سلجوقی سکے رائج تھے، اب

علاء الدین نے بادشاہت کے اس امتیاز کو بھی اختیار کیا اور اسلامی مملکت میں اورخان کے نام کے سکے جاری کیے۔ اب تک لوگوں کے لباس میں بھی کوئی خاص فرق و امتیاز نہ تھا، علاء الدین نے رعایا کے مختلف طبقوں کے لیے مختلف قسم کے لباس تجویز کر کے ان کے متعلق قوانین نافذ کیے، شہری اور دیہاتی، مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کا لباس الگ الگ مقرر کیا۔[1]

فوج لیکن علاء الدین کا سب سے بڑا کارنامہ وہ فوجی اصلاحات ہیں، جن سے دولت عثمانیہ کی طاقت دفعۃً بڑھ گئی اور جو تین سو برس تک اس کی حیرت انگیز فتوحات کی ضامن رہیں۔ ارطغرل اور عثمان کے زمانہ میں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی، بلکہ یہ دستور تھا کہ جب کوئی جنگ پیش آنے والی ہوتی تو پہلے سے اعلان کر دیا جاتا کہ جو شخص لڑائی میں شریک ہونا چاہے وہ فلاں روز فلاں مقام پر حاضر ہو جائے، چنانچہ رضا کار سوار مقررہ وقت اور مقررہ مقام پر جمع ہو جاتے تھے اور لڑائی ختم ہونے کے بعد واپس چلے جاتے تھے۔ انہیں کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ جو مال غنیمت ہاتھ آتا تھا، وہی ان کی خدمت کا معاوضہ ہوتا تھا۔ ان کی کوئی مخصوص وردی بھی نہیں تھی، ہاں یہ سپاہی اعلیٰ درجہ کے شہ سوار ہوتے تھے اور مضبوطی کے ساتھ صف قائم کر کے ایک دیوار کی طرح میدان جنگ میں آگے بڑھتے تھے۔ عثمان کے عہد تک تو اس طریقے سے کام چلتا رہا لیکن اس کے بعد سلطنت کی توسیع اور استحکام کے لیے یہ انتظام ناکافی ثابت ہوا اور ایک باقاعدہ اور مستقل فوج کی ضرورت محسوس ہونے لگی، چنانچہ علاء الدین نے تنخواہ دار پیادوں کی ایک فوج مرتب کی، جس کا نام "پیادے" تھا، یہ دس دس، سو سو اور ہزار ہزار کے دستوں میں تقسیم تھی۔ اس کی تنخواہیں اونچی تھیں لیکن اس کے قیام کو زیادہ روز نہ ہوئے تھے کہ ان میں اپنی قوت کا بے جا احساس پیدا ہو گیا اور ان کی سرکشی خود اورخان کے لیے تشویش کا باعث ہونے لگی، چنانچہ اورخان نے اس

---

[1] ترکی قدیم و جدید از سدرلینڈ مینزیز جلد اول ص ۵۷ (Turkey Old And New By Sutherland Menzies. London, Vol I, P 57

[2] کریسی جلد اول ص ۹۸۱ [3] ہربرٹ گبنس ص ۸۱

امر میں علاء الدین اور قرا خلیل سے (جو خاندان شاہی سے ازدواجی تعلق رکھتا تھا اور علاء الدین کے بعد وزیر سلطنت ہو کر خیر الدین پاشا کے نام سے مشہور ہوا) مشورہ کیا، قرا خلیل نے جو تجویز پیش کی، اس نے نہ صرف پیادوں کی طرف سے مطمئن کر دیا بلکہ آئندہ تین صدیوں کے لیے عثمانی فتوحات کی رفتار میں ایک سیلاب کی قوت و سرعت بھی پیدا کر دی۔

ینی چری وہ تجویز یہ تھی کہ عیسائی اسیران جنگ میں سے دس بارہ سال کے قوی اور ہونہار لڑکوں کی ایک تعداد منتخب کر کے اسلام میں داخل کی جائے اور پھر باقاعدہ فوجی تعلیم دے کر ان کی ایک مستقل فوج قائم کی جائے، اورخان کو یہ رائے پسند آئی اور اس نے ایک ہزار عیسائی لڑکوں کو منتخب کر کے انہیں فوجی تعلیم و تربیت دینی شروع کی، دوسرے سال ایک ہزار لڑکے اور چنے گئے اور یہ سلسلہ تین سو برس تک برابر جاری رہا، جب کبھی ہزار لڑکوں کی یہ سالانہ تعداد ان لڑکوں سے پوری نہ ہو سکتی جو اس سال کی جنگ میں قید ہوتے تو عیسائی رعایا کے لڑکوں سے کمی پوری کر لی جاتی لیکن سلطان محمد رابع کے عہد حکومت میں یہ نظام بدل گیا اور ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) سے خود ان ہی سپاہیوں اور ترکوں کے لڑکے اس فوج میں داخل کیے جانے لگے، اس فوج کا ترکی نام ینی چری (نئی فوج) ہے، جو عربی میں انکشاری ہو گیا ہے، اورخان نے جب اسے مرتب کیا تو نوعمر سپاہیوں کے پہلے دستہ کو حاجی بکطاش کی خدمت میں جو ملک میں اپنے زہد و اتقا کی وجہ سے مشہور تھے، لے گیا اور ان سے دعا کی خواہش کی، حاجی موصوف نے اس فوج کے لیے فتح و نصرت کی دعا کی اور اس کا نام ینی چری رکھا، سلطنت عثمانیہ کی ابتدائی تین صدیوں میں جو اس کے عروج و ترقی کا زمانہ تھا، ینی چری کی قوت شباب پر تھی اور سلطنت کی تمام فتوحات زیادہ تر اسی فوج کے زور بازو کی رہین منت تھیں، جو لڑکے اس فوج کے لیے منتخب کیے جاتے تھے، پہلے انہیں ایسے ماحول میں رکھا جاتا تھا کہ وہ خود بخود اسلام کی طرف مائل ہوتے جائیں، اسلام قبول کرنے کے بعد انہیں سلطان کی خاص نگرانی میں فن حرب کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی، ان کی فوجی تربیت میں حد

درجہ سختی برتی جاتی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہر قسم کے شدائد کو آسانی سے برداشت کر لیتے تھے، اپنے والدین، وطن اور مذہب سے چھوٹنے کے بعد ان کی تمام امیدیں سلطان کی اطاعت، دولت عثمانیہ کی خدمت اور اسلام کی حمایت سے وابستہ ہو جاتی تھیں اور یہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا، سلطان کو ان پر پورا اعتماد تھا اور وہ ہمیشہ ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتا رہتا تھا، ینی چری کے متعلق مزید حالات آگے آئیں گے۔

جاگیردار اور بے ضابطہ پیادے ینی چری کے بعد علاء الدین نے دوسری فوجوں کی تنظیم شروع کی، اب تک "پیادوں" کی مستقل فوج کو تنخواہیں دی جاتی تھیں لیکن اس خیال سے کہ ان کو مفتوحہ علاقوں کی حفاظت سے ایک خاص وابستگی پیدا ہو جائے، علاء الدین نے اب تنخواہ کے بجائے انہیں جاگیریں دے دیں اور فوجی خدمت کے علاوہ ان جاگیروں سے متصل سڑکوں کی مرمت بھی ان کے فرائض میں داخل کر دی، پیدل سپاہیوں کی ایک بے ضابطہ فوج بھی مرتب کی گئی، اس کو نہ تو ینی چری کی طرح تنخواہیں ملتی تھیں اور نہ "پیادوں" کی طرح جاگیریں، میدان جنگ میں سب سے آگے ان ہی کا دستہ ہوتا تھا اور دشمن کے پہلے حملہ کی باڑھ آگے بڑھ کر یہی روکتے تھے، جب ان سے مقابلہ کرنے میں غنیم کی قوت کمزور ہو جاتی یا ان کے میدان کے چھوڑ کر بھاگنے کی وجہ سے اسے اپنی فتح کا یقین ہونے لگتا، اس وقت دفعۃً ینی چری کی آہنی فوج اس کے سامنے نمودار ہوتی اور جنگ کا سارا نقشہ دیکھتے دیکھتے بدل جاتا، عموماً ان بے ضابطہ سپاہیوں ہی کی نعشوں پر سے گزر کر ینی چری آخری حملہ اور فتح کے لیے آگے بڑھتے تھے۔

تنخواہ دار اور جاگیردار سوار پیادوں کی طرح سواروں کی بھی دو قسمیں تھیں، باضابطہ اور بے ضابطہ، مستقل تنخواہ دار سوار چار دستوں میں تقسیم کیے گئے تھے، ان کی تعداد ابتداء میں دو ہزار چار سو تھی لیکن سلیمان اعظم کے عہد میں چار ہزار تک پہنچ گئی تھی، وہ سلطان کے داہنے اور بائیں چلا کرتے تھے اور جنگ میں اس کے محافظ دستہ کا کام دیتے تھے، شاہی

سواروں کے دستوں میں ایک دستہ "سپاہیوں" کا تھا۔ "سپاہی" کا لفظ عموماً سوار فوج کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن شاہی سواروں کا ایک خاص دستہ بھی اس نام سے موسوم تھا، تنخواہ دار سواروں کے علاوہ علاء الدین نے جاگیردار سواروں کی بھی ایک فوج مرتب کی، ان کی جاگیروں کو زعامت اور تیمار کہتے تھے۔

آقنجی | تنخواہ دار اور جاگیردار سواروں کے علاوہ بے ضابطہ سواروں کی بھی ایک فوج تھی جو آقنجی کہلاتے تھے، ان کو نہ تنخواہیں ملتی تھیں نہ جاگیریں، جنگ میں لوٹ مار کر جو کچھ حاصل کر لیتے وہی ان کا معاوضہ تھا، قدیم دستور کے موافق عثمانی فوجوں کی روانگی کے وقت یہ ایک بڑی تعداد میں بلائے جاتے تھے، یہ گویا مقدمۃ الجیش تھے اور باقاعدہ افواج کے لیے پہلے ہی سے راستہ صاف کر رکھتے تھے، دشمن کے دلوں میں ان کی دہشت بھی ینی چری اور سپاہیوں سے کم نہ تھی لیکن ان ہی کو سب سے زیادہ خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔

عثمانی فوج کے مخصوص امتیازات | علاء الدین نے اپنی فوجی اصلاحات سے ترکوں کی ایک باضابطہ اور مستقل فوج تیار کر دی جس کی نظیر ایک صدی تک یورپ میں پیدا نہ ہو سکی، چارلس ہفتم شاہ فرانس کے پندرہ فوجی دستے جو عہد جدید کی پہلی مستقل فوج سمجھی جاتی ہے اورخان کی مستقل اور تنخواہ دار سپاہ سے پورے سو برس بعد وجود میں آئے[1] مسٹر ہربرٹ گبنس نے عثمانیوں کے اس امتیاز سے جو عموماً تمام مورخین تسلیم کرتے آئے ہیں، انکار کیا ہے اور ایڈورڈ سوم شاہ انگلستان کی باقاعدہ پیدل فوج کا ذکر کیا ہے، جس نے ۱۳۴۶ء میں جنگ کریسی میں حصہ لیا تھا لیکن جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، ایڈورڈ نے ایک ایسی فوج مرتب کی تھی، جو صرف ضرورت کے وقت جنگ کے لیے طلب کی جاتی تھی[2] برخلاف اس کے اورخان کی فوج ایک مستقل فوج تھی جسے باقاعدہ تنخواہیں دی جاتی تھیں اور جو ہمہ وقت جنگ کے لیے مستعد و تیار رہتی تھی، چنانچہ یہ امر مسٹر گبنس کو بھی تسلیم ہے کہ فوج کی مستقل تنظیم اور

---

[1] کریسی: جلد ۱، ص ۲۸ [2] ہربرٹ گبنس، فٹ نوٹ ص ۸۲۔

سے ہمیشہ جنگ کے لیے تیار رکھنے کی اولیت عثمانیوں ہی کو حاصل ہے۔[1] علاء الدین کے فوجی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ بادشاہ اور فوج کے درمیان براہ راست تعلق پیدا ہو گیا اور درمیانی اشخاص کی ضرورت باقی نہیں رہی جن کی وساطت سے عثمان اور طغرل کے سپاہی فراہم ہوتے تھے۔ بے ضابطہ پیدل اور سوار فوجوں کے علاوہ جو صرف لڑائی کے موقعوں پر بلائی جاتی تھیں بقیہ تمام فوج تنخواہ دار یا جاگیر دار تھی اور سب کی کمان سلطان کے ہاتھ میں تھی۔ مسٹر گبنس نے ایک قدیم اور واقف کار سیاح بروکئے (Brcguiere) کا بیان نقل کیا ہے کہ عثمانیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ عیسائی فوجیں کب آ رہی ہیں اور کہاں ان سے مقابلہ کرنا مفید ہوگا، وجہ یہ تھی کہ عثمانی جنگ کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور ان کے چاؤش اور جاسوس صحیح رہنمائی کرتے تھے۔ سیاح مذکور لکھتا ہے: ''وہ (عثمانی) دفعۃً روانہ ہو سکتے ہیں اور سو عیسائی سپاہی بہ نسبت دس ہزار عثمانیوں کے زیادہ شور کریں گے، طبل بجتے ہی وہ فوراً کوچ کر دیتے ہیں اور جب تک حکم نہ ملے ہرگز اپنے قدم نہیں روکتے، ہلکے سلحہ سے مسلح ہونے کی وجہ سے وہ ایک رات میں اتنی مسافت طے کر لیتے ہیں جتنی ان کے عیسائی حریف تین دن میں طے کرتے ہیں۔[2]''

پاشا | علاء الدین پہلے عثمانی ترک ہے جسے پاشا کا خطاب ملا، اس کے بعد یہ خطاب اورخان کے سب سے بڑے لڑکے سلیمان کو دیا گیا، شروع میں پاشا کا خطاب عثمانی فرماں روا کے بڑے لڑکے کے لیے مخصوص تھا لیکن مراد اول کا بڑا لڑکا چونکہ باغی ہو گیا تھا اور بقیہ لڑکے اس وقت نابالغ تھے، اس لیے مراد نے یہ خطاب قرا خلیل کو دیا، اس کے بعد ولی عہد کی تخصیص جاتی رہی اور بڑے بڑے فوجی اور ملکی عہدے داروں کو بھی یہ خطاب دیا جانے لگا، اسی طرح وزارت کا عہدہ بھی علاء الدین کے بعد شاہی خاندان سے نکل گیا۔[3]

نائیکومیڈیا اور نائسیا کی فتح | اورخان نے اپنی حکومت کے پہلے ہی سال (۷۲۶ھ

---

[1] ہربرٹ گبنس، نوٹ ص ۱۸۲ [2] ہربرٹ گبنس، ص ۶۳ [3] ایضاً، ص ۷۲-۷۱۔

مطابق (۱۳۲۶ء) میں نائیکومیڈیا پر قبضہ کرلیا، بروصہ چند مہینے قبل فتح ہو چکا تھا، سلطنت بازنطینی کے ایشیائی مقبوضات میں اب صرف ایک ہی بڑا شہر نائسیا رہ گیا تھا، جو اپنی عظمت اور اہمیت کے اعتبار سے قسطنطنیہ سے دوسرے درجہ پر تھا، اورخان نے اس کا بھی محاصرہ شروع کیا اور ۷۳۰ھ (۱۳۳۰ء) میں اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، اورخان نے نائسیا کے باشندوں کو اجازت دے دی تھی کہ اگر چاہیں تو اپنا تمام مال واسباب لے کر کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں لیکن بروصہ کے باشندوں کی طرح یہ لوگ بھی بکثرت اسلام میں داخل ہوگئے اور اپنے وطن ہی میں مقیم رہے۔

قراسی پر قبضہ ۷۳۳ھ (۱۳۳۳ء) میں ترکی ریاست قراسی کے امیر نے انتقال کیا، اس کے بڑے لڑکے نے تخت پر قبضہ کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو قتل کرادیا، اورخان چھوٹے لڑکے کا طرف دار تھا، اس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے وہ قراسی پر حملہ آور ہوا، بڑا لڑکا شکست کھا کر بھاگا اور ۷۳۶ھ (۱۳۳۶ء) میں پوری ریاست پر اورخان کا قبضہ ہوگیا، اس کے بعد اورخان نے اناطولیہ کے شمالی مغربی گوشہ کی چند اور چھوٹی چھوٹی ترکی ریاستیں بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کرلیں، قراسی اور ان دوسری ترکی ریاستوں کی آبادی زیادہ تر ترکوں پر مشتمل تھی لیکن ساحلی علاقوں میں ایک خاصی تعداد یونانیوں کی بھی تھی، جنہوں نے بروصہ اور نائسیہ کے اکثر باشندوں کی طرح اسلام قبول کرلیا۔

زمانۂ امن کے کارنامے ان فتوحات کے بعد تقریباً بیس سال تک کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی، اورخان پوری توجہ کے ساتھ ملکی اور فوجی آئین کی تنظیم اور تکمیل میں مصروف رہا، اس نے تمام ملک میں امن وامان قائم کیا، مسجدیں، مدرسے اور رفاہ عام کی مختلف شاندار عمارتیں بنوائیں، بروصہ میں ایک نہایت عالی شان مسجد، ایک بڑا مدرسہ اور ایک شاہی اسپتال تعمیر کرایا، بڑے بڑے فضلا اور اہل کمال کو طلب کیا اور بروصہ کی شہرت اتنی پھیلی کہ ایرانی اور عربی طلبہ علومِ مشرقیہ کے قدیم مدرسوں سے آکر وہاں تعلیم

حاصل کرنے لگے[1]، نائسیا میں بھی ایک مسجد تعمیر کی اور اس کے متصل ایک مدرسہ قائم کیا، جو دولت عثمانیہ کا پہلا مدرسہ تھا اور بہت مشہور ہوا، اسی شہر میں اورخان نے غریبوں کے لیے پہلا لنگر خانہ بھی جاری کیا۔[2]

حکومت کی پالیسی جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے، خاندان عثمانی کے ابتدائی تاج داروں کی ایک بڑی خصوصیت، جس کا اثر سلطنت کے استحکام پر نمایاں طور سے پڑا، یہ تھی کہ جب وہ کسی ملک کو فتح کرتے تھے تو قبضہ کے بعد ہی اس کے اندرونی نظم و نسق میں مصروف ہو جاتے تھے، ان کا مقصد محض فتوحات حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ وہ مفتوحہ علاقوں کو اپنے آئین و ضوابط کے مطابق تنظیم دے کر مکمل طور پر سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس طرح بجائے اس کے کہ اپنی فتوحات سے مختلف صوبوں اور بے میل آبادیوں کو ایک غیر مرتب شکل میں اکٹھا کرتے، انہوں نے ایشیائے کوچک میں ایک مرتب اور پائیدار حکومت قائم کر لی، عہد قدیم و جدید کی دوسری مشرقی سلطنتوں کے مقابلہ میں دولت عثمانیہ کے زیادہ مدت تک قائم رہنے کی ایک بڑی وجہ اس کے ابتدائی فرماں رواؤں کی یہی پالیسی ہے اور چوں کہ اس پالیسی پر یورپ، شام اور مصر سے زیادہ ایشیائے کوچک کی فتوحات میں عمل کیا گیا، اس لیے وہیں عثمانیوں کی حکومت کو زیادہ استقلال بھی نصیب ہوا، اس میں شبہ نہیں کہ ایشیائے کوچک میں استقلال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں ترکوں کی آبادی کثرت سے پھیلی ہوئی تھی لیکن سلطنت کے استحکام میں فاتحین عثمانی کی اس دانش مندانہ پالیسی کو بھی کچھ کم دخل نہ تھا۔

سلطنت بازنطینی سلطنت کے اندرونی انتظامات سے فارغ ہو کر اورخان یورپ کی جانب متوجہ ہوا اور اس کی زندگی کے آخری چند سال سلطنت بازنطینی کے یورپین علاقوں میں قدم جمانے کی کوشش میں صرف ہوئے، یہ سلطنت آٹھویں صدی ہجری (چودھویں

---

[1] گبن، جلد ۳، ص ۳۸۰ [2] ترکی قدیم و جدید، از مسٹر لیس، ج ۱، ص ۵۹۔

صدی عیسوی) کے وسط میں نہایت کم زور ہو چکی تھی، اس کے مقبوضات جو صدیوں تک یورپ میں دریائے ڈینوب اور ایشیا میں اناطولیہ اور شام تک پھیلے ہوئے تھے، اب صرف تھریس، مقدونیا کے ایک جز جس میں سالونیکا شامل تھا اور یونان میں سوریا کے ایک بڑے حصہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے، ایشیائی مقبوضات تقریباً کل کے کل عثمانیوں کے قبضہ میں جا چکے تھے، یورپ میں بھی سرویا کا باقتدار فرماں روا اسٹیفن ڈوشن (Stephen Dushen) جزیرہ نمائے بلقان کے نصف سے زیادہ علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر کے سالونیکا اور اس کے بعد قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا حوصلہ کر رہا تھا، خانہ جنگیوں نے سلطنت کو اور بھی کم زور کر دیا تھا، ۷۳۹ھ (۱۳۳۸ء) میں شہنشاہ اینڈ رونیکس کے انتقال پر اس کا گرینڈ چانسلر کنٹا کوزین اس کے نابالغ لڑکے جان پلیولوگس کا ولی اور ملکہ اینا کے ساتھ اس کا مدار المہام مقرر ہوا، کنٹا کوزین نے اس پر قناعت نہ کر کے ۷۴۳ھ (۱۳۴۳ء) میں نیکونیکا میں اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا، ملکہ کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور اس نے اس کی مخالفت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں لڑائی چھڑ گئی اور دونوں نے اورخان سے مدد کی درخواست کی، اس سے پہلے بھی بعض ترکی امیروں نے تخت قسطنطنیہ کے مختلف دعوے داروں میں سے کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دیا تھا، کنٹا کوزین نے اورخان سے چھ ہزار عثمانی سپاہی مانگے اور اس حمایت کے عوض اپنی لڑکی تھیوڈورا کو اس کی شریک زندگی بنانے کے لیے پیش کیا، اورخان نے یہ شرط منظور کی اور ۷۴۶ھ (۱۳۴۵) میں چھ ہزار سپاہی کنٹا کوزین کی مدد کے لیے یورپ میں بھیجے، کنٹا کوزین نے ان سپاہیوں کی مدد سے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا، جو ملکہ کے قبضہ میں تھا، ایک سال کے محاصرہ کے بعد خود شہر کے بعض لوگوں کی غداری کی وجہ سے کنٹا کوزین فوج کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوا اور ملکہ کو مجبوراً صلح کے لیے راضی ہونا پڑا، صلح اس بات پر قرار پائی کہ کنٹا کوزین اور اس کی بیوی نیز ملکہ اینا اور شہزادہ جان پلیولوگس تخت نشین کر دیے جائیں، چنانچہ چاروں کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی، اس اتحاد کو اور زیادہ مضبوط

کرنے کے لیے کنٹاکوزین نے اپنی چھوٹی لڑکی کی شادی نوجوان شہنشاہ جان سے کردی اورخان کا نکاح بھی شہزادی تھیوڈورا سے ہوگیا، اورخان نے تھیوڈورا کو اس کے آبائی مذہب مسیحیت پر قائم رہنے کی اجازت دی۔

یورپ میں پہلا قدم صلح کے بعد اورخان کے چھ ہزار سپاہی جو اس نے کنٹاکوزین کی مدد کے لیے بھیجے تھے، واپس آگئے لیکن چند ہی سال کے بعد ان کی ضرورت پھر پیش آئی ۷۵۰ھ (۱۳۴۹ء) میں اسٹیفن ڈوشن شاہ سرویا نے سالونیکا پر حملہ کیا اور یقین تھا کہ اسے فتح کرنے کے بعد وہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے گا، اس نازک موقع پر کنٹاکوزین اور جان پلیولوگس دونوں نے اورخان سے مدد کی درخواست کی، اب کی بار اورخان نے بیس ہزار سپاہی روانہ کیے، ان کی مدد سے سالونیکا میں اسٹیفن کو شکست ہوئی اور قسطنطنیہ کی فتح کا حوصلہ جو اس کے دل میں بار بار پیدا ہوتا تھا، اب ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا، جنگ کے خاتمہ پر عثمانی سپاہی پھر واپس بلالیے گئے، مگر چار سال کے بعد اورخان کو اپنی فوجیں آبنائے باسفورس کے مغربی ساحل پر بھیجنے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا جو یورپ میں عثمانیوں کے قدم جمنے کا سبب ثابت ہوا، کنٹاکوزین تاج وتخت میں جان پلیولوگس اور ملکہ اینا کی شرکت کو زیادہ دنوں تک گوارانہ کرسکا اور ۷۵۴ھ (۱۳۵۳ء) میں اس نے حکومت کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینے چاہے، جان نے اس کی شدید مخالفت کی اور خانہ جنگی شروع ہوگئی، کنٹاکوزین نے حسب دستور سابق اورخان سے پھر مدد کی درخواست کی اور اس کے معاوضہ میں یورپین ساحل کا ایک قلعہ پیش کیا، اورخان نے اپنے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کی سرکردگی میں بیس ہزار سپاہی روانہ کیے، ان کی مدد سے کنٹاکوزین نے جان پلیولوگس کو شکست دے کر قسطنطنیہ کے تخت پر قبضہ کرلیا، سلیمان پاشا نے حسب معاہدہ قلعہ زمپ (Tzympe) پر قبضہ کرکے اس میں عثمانی دستے متعین کردیے، اس کے چند ہی دنوں بعد تھریس میں زلزلہ آیا جس سے بہتیرے شہروں کی شہر پناہیں منہدم ہوگئیں، ان ہی میں گیلی پولی بھی تھا، دو دردانیال کے

مغربی ساحل پر سب سے زیادہ اہم قلعہ تھا اور زنپ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھا، سلیمان پاشا نے اسے تائید غیبی خیال کیا اور گیلی پولی پر فوراً قبضہ کر لیا، قلعہ کے یونانی دستوں نے یہ سمجھا کہ خدا کی مرضی یوں ہی تھی، نیز وہ ترکوں کے دفعۃً پہنچ جانے سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ کوئی مزاحمت نہ کر سکے، اس درمیان میں کنٹا کوزین نے سلیمان پاشا سے دس ہزار دوکات کے عوض زنپ سے قبضہ اٹھا لینے کی خواہش کی اور سلیمان پاشا نے اسے منظور بھی کر لیا، مگر اس معاملہ کی تکمیل سے قبل ہی گیلی پولی کا واقعہ پیش آ گیا، جس کے بعد سلیمان پاشا نے زنپ کی واپسی سے بھی انکار کر دیا اور گیلی پولی کی شہر پناہ کو درست کر کے اس میں ترکی فوج کا ایک مضبوط دستہ متعین کر دیا، اس کے بعد اس نے تھریس کے چند اور مقامات بھی فتح کر لیے اور بہت سے ترکوں اور عربوں کو لا کر ان مقبوضات میں آباد کر دیا۔

گیلی پولی کی فتح سے ترکوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، ۷۵۵ھ (۱۳۵۴ء) میں انہوں نے پہلی بار فاتح کی حیثیت سے یورپ میں قدم رکھا اور مسیحی یورپ میں ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے ویانا کی دیواروں تک پھیل گئی، قرونِ اولیٰ کے مجاہدوں نے دینِ حق کے پیغام سے مغربی یورپ کو بہرہ اندوز کیا تھا اور اپنے علوم کی روشنی ان کے ظلمت کدہ میں پہنچائی تھی لیکن مشرقی یورپ پر ہنوز تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کی سرزمین ایک مشعل ہدایت کی منتظر تھی، یہ سعادت عثمانیوں کے ہاتھوں کے لیے مقدر ہو چکی تھی، عرب مجاہدوں نے جس فرض کی تکمیل یورپ کے مغربی حصہ میں کی تھی، ترک مجاہدوں نے اسے مشرق میں پورا کیا۔

جان پلیولوگس ان واقعات سے کنٹا کوزین کے خلاف قسطنطنیہ میں سخت برہمی پھیلی جس نے بغاوت اور انقلاب کی شکل اختیار کر لی، ہر شخص اس پر غداری وطن کا الزام عائد کرتا تھا اور اسی کو ترکوں کے یورپ میں لانے کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا، آخر رائے عامہ سے مجبور ہو کر اسے تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا، اس نے اپنی زندگی کے بقیہ تیس سال ایک

خانقاہوں میں گزار دیے اور اس مدت میں اپنے عہد کی ایک تاریخ لکھ ڈالی، اس کی ملکہ راہبہ بن گئی، قسطنطنیہ کے لوگوں نے جان پلیولوگس کو بلا کر تخت پر بٹھایا، اس نے پچاس سال تک حکومت کی لیکن اس طویل مدت میں سلطنت بازنطینی کی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی گئی اور ترکوں کا تسلط بڑھتا ہی گیا، انہوں نے قلعہ شورلو اور ڈیموتیکا کو فتح کرنے کے بعد پھر خالی کر دیا لیکن جنوبی تھریس پر ان کا مستقل قبضہ ہو گیا اور شہنشاہ جان کو مجبوراً اورخان سے صلح کر کے اس قبضہ کو تسلیم کرنا پڑا، اس کے بعد سلطنت بازنطینی گویا دولت عثمانیہ کی ایک باج گزار حکومت بن گئی۔

سلیمان شاہ اور اورخان کی وفات

۷۵۹ھ (۱۳۵۸ء) میں سلیمان پاشا شکار کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرا اور اس کے صدمے سے جانبر نہ ہو سکا، یہ شہزادہ فن سپہ گری و سپہ سالاری میں ممتاز اور خاندان عثمانی کے تمام اعلیٰ اوصاف کا حامل تھا، اورخان کو اس کی وفات کا سخت صدمہ ہوا اور دوسرے ہی سال اس کا بھی انتقال ہو گیا۔

اورخان نے اپنے تینتیس سال کے دور حکومت میں عثمانی مقبوضات کو بہت زیادہ وسعت دی، اس نے نہ صرف ایشیائے کوچک کے بقیہ بازنطینی علاقوں پر قبضہ کر لیا اور بعض ترکی ریاستیں مملکت عثمانیہ میں کر لیں، بلکہ یورپ میں داخل ہو کر تھریس کا ایک حصہ بھی فتح کر لیا، جو اس براعظم میں عثمانی فتوحات کا ایک شاندار مقدمہ تھا، جن فوجی اور ملکی آئین پر سلطنت عثمانیہ کی عظمت قائم ہوئی ان کا بنیادی پتھر اسی نے اپنے ہاتھوں سے رکھا، عثمان کی حیثیت ایک امیر سے زیادہ نہ تھی لیکن اورخان کے کارناموں نے اسے بادشاہی کا حقدار ثابت کر دیا۔

تاہم اس بادشاہی میں بھی درویشی کی شان بدستور قائم رہی اور اس وصف میں وہ عثمان ہی کا مثیل تھا، مسٹر لینس لکھتے ہیں کہ نائیسیا میں وہ غریبوں کو روٹی اور شوربا اپنے ہاتھوں سے تقسیم کرتا تھا، علوم و فنون کی سرپرستی آل عثمان کی ایک خاص خصوصیت تھی، اورخان کا یہ

امتیاز بھی بہت نمایاں تھا، بڑے بڑے مشہور علما اور مشائخ اس کی صحبت میں رہا کرتے تھے، ان ہی میں سے بعض کو وہ اپنے قائم کردہ مدرسوں میں مدرس مقرر کرتا مثلاً ملا داؤد قیصری اور تاج الدین کرد، جو یکے بعد دیگرے نائیسیا کے مدرسہ میں مدرس اول مقرر ہوئے، بروصہ کے علم و فضل کی شہرت اس وقت بھی قائم رہی، جب یہ دولت عثمانیہ کا پایہ تخت نہ رہ گیا اور مدتوں یہ شہر اہل فضل و کمال کا مرکز بنا رہا، یہیں عثمانیوں کے اولین شعراء نے اپنے کلام سنائے اور یہیں ان کے بڑے بڑے شیوخ وابدال کے مزارات پر آج بھی عقیدت کی پھول چڑھائے جاتے ہیں۔

مراد اوّل

۷۶۰ھ تا ۷۹۱ھ مطابق ۱۳۵۹ء تا ۱۳۸۹ء

اورخان کی وفات پر اس کا چھوٹا لڑکا مراد چالیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اس میں ملک گیری اور حکم رانی کی وہ تمام خصوصیات بدرجۂ غایت موجود تھیں جو آل عثمان کے ابتدائی فرماں رواؤں کا طرۂ امتیاز تھیں، اس کی غیر معمولی فوجی قابلیت نے بہت قلیل مدت میں یورپ کی متعدد مملکتوں کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا اور انتظامِ حکومت کے خداداد ملکہ نے ان مفتوحات کو سلطنت کا ایک مستقل جزو بنا دیا۔

اورخان نے اپنے عہد میں سلطنت کو بہت کچھ وسعت دی تھی لیکن اناطولیہ کی بعض ترکی ریاستیں رقبہ میں اب بھی اس سے بڑھی ہوئی تھیں، مراد کی تخت نشینی کے وقت سلطنت عثمانیہ ایشیائے کوچک کے شمالی مغربی حصہ اور یورپ میں زنپ، گیلی پولی اور تھریس کے بعض دیگر مقبوضات پر مشتمل تھیں۔ جہاں سلیمان پاشا نے ترکوں اور عربوں کی نوآبادیاں قائم کر دی تھیں، اس کا مجموعی رقبہ بیس ہزار مربع میل سے زیادہ نہ تھا اور آبادی بھی دس لاکھ سے کم ہی تھی[1]، مراد نے صرف تیس سال کی مدت میں سلطنت کا پانچ گنا بڑھا دیا۔

ایشیائے کوچک میں بغاوت | عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد مراد نے سب سے پہلے یورپ کی طرف بڑھنے کا قصد کیا لیکن امیر کرمانیہ نے اس قدیم بغاوت کی بنا پر جو

---

[1] ایورسلے ص ۱۳

اس کے خاندان اور آل عثمان کے درمیان چلی آتی تھی، ایشیائے کوچک میں مراد کے خلاف بغاوت کر دی، جسے فرو کرنے کے لیے مراد کو یورپ کا قصد ملتوی کرنا پڑا، اس نے فوراً موقع پر پہنچ کر بغاوت کا استیصال کیا، ادھر سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد وہ یورپ کی طرف متوجہ ہوا اور ۷۶۱ھ (۱۳۶۰ء) میں دردانیال کو عبور کر کے فتوحات کا وہ حیرت انگیز سلسلہ شروع کیا جو ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں صرف اس کی شہادت پر جنگ کسووا میں ختم ہوا۔

فتوحات تھریس | مراد کی تخت نشینی کے وقت سلطنت بازنطینی کی حالت نہایت ابتر تھی، اس کے تمام ایشیائی مقبوضات پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور یورپ میں قسطنطنیہ کے علاوہ صرف شمالی تھریس اور مقدونیا اور موریا کے کچھ حصے باقی رہ گئے تھے، باہمی عداوتوں کے باعث ابتداء میں کوئی عیسائی حکومت ترکوں کے مقابلہ میں اس کی مدد کے لیے آمادہ نہ ہوئی، یہ سلطنت بلاشبہ ایک مسیحی سلطنت تھی اور ترکوں کا حملہ مذہبی نقطۂ نظر سے نہایت خطرناک تھا، لیکن یورپ میں محاربات صلیبی کی قدیم روح تقریباً فنا ہو چکی تھی اور یونانی اور لاطینی کلیساؤں کی شدید مخاصمت نے اتحاد عمل کے لیے بہت کم گنجائش باقی رکھی تھی۔

ان حالات میں مراد نے دردانیال کو عبور کر کے ایک زبردست فوج کے ساتھ تھریس میں قدم رکھا اور سب سے پہلے قلعہ شورلو پر قبضہ کیا، جو قسطنطنیہ سے صرف پانچ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، اس کے بعد دوسرا قلعہ کرک کلیسے (Kirk Kilisse) فتح ہوا، پھر ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) میں اس کی بابا کے مقام پر بازنطینیوں کے ساتھ ایک سخت معرکہ پیش آیا جس میں مراد نے انہیں بری طرح شکست دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اورنہ نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور تقریباً تمام تھریس مراد کے قبضہ میں آ گیا، اس کے بعد عثمانی جنرل لالہ شاہین نے بلغاریا میں داخل ہو کر فلپو پولس کو فتح کر لیا جو کوہ بلقان کے جنوب میں سلطنت بازنطینی کا مقبوضہ تھا اور شہنشاہ قسطنطنیہ کو مجبور ہو کر مراد سے صلح کرنی پڑی، اس معاہدہ کیا کہ تھریس کے جو علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں انہیں دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے گا،

عثمانیوں کے آئندہ حملوں میں سرویا اور بلغاریا کو مدد نہ دے گا اور اناطولیہ کے ترکی امراء کے مقابلہ میں مراد کی اعانت کرے گا، اس کے بعد مراد بروصہ کو واپس گیا۔

جنگ مارٹیز یورپ میں مراد کا مقابلہ اس وقت تک صرف بازنطینیوں سے تھا اور دوسری مسیحی حکومتوں نے ترکوں کی مدافعت میں سلطنت بازنطینی کو مطلق مدد نہیں دی تھی، یہاں تک کہ یورپ میں بھی جس نے اس سے پیشتر محاربات صلیبی کی تحریک میں اس قدر نمایاں حصہ لیا تھا، مراد کی ان فتوحات پر کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہیں کیا بلکہ یونانی کلیساؤں کے پیروؤں کی تباہی کو اطمینان کی نظر سے دیکھتا رہا، مگر اب فلپو پولس کی فتح نے معاملہ کی صورت بالکل بدل دی، یہ شہر اگرچہ سلطنت بازنطینی کا مقبوضہ تھا، تاہم بلغاریا میں واقع تھا، اس کی فتح نے عثمانی فوجوں کے لیے بلغاریا کا راستہ کھول دیا، ترکوں کا یہ اقدام بالآخر کلیسائے روما کے زیر سایہ حکومتوں کے لیے بھی تردد کا باعث ہوا اور پوپ اربن پنجم (Pope Urban V) نے ہنگری، سرویا، بوسنیا اور ولاچیا کے فرماں رواؤں کو آمادہ کیا کہ ترکوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کے لیے اپنی فوجیں روانہ کریں، چنانچہ اتحادیوں نے ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) میں بیس ہزار فوج تھریس روانہ کی اور یہ اعلان کیا کہ وہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر چھوڑیں گے، مراد اس وقت اناطولیہ میں تھا، یہ خبر سن کر وہ فوراً یورپ کی طرف روانہ ہوا، مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی لالہ شاہین نے ایک مختصر فوج کے ساتھ، جو تعداد میں مسیحی لشکر کی نصف تھی، ان کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا اور روز رات کو جب کہ اتحادی فوجیں اورنہ سے قریب دریائے ماریزا کے ساحل پر اپنے خیموں کے اندر شراب و کباب کی سرمستیوں میں مبتلا تھیں، دفعۃً حملہ آور ہو کر تقریباً سب کو تہ تیغ کر دیا، جو لوگ لالہ شاہین کی تلوار سے بچ گئے انہوں نے دریا کو عبور کرنے کی کوشش میں ڈوب کر جان دی، یوں گویا پوری عیسائی فوج ہلاک ہوگئی، شاہ ہنگری جو موقع پر موجود تھا، بہ مشکل جان بچا کر بھاگ سکا۔

یہ پہلا معرکہ تھا جو عثمانیوں کو یورپ کی سلافی قوموں کے ساتھ پیش آیا، اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوہ بلقان کے جنوب کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا گیا، اس سے عیسائیوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا اور مراد نے یہ فیصلہ کرلیا کہ آئندہ اپنی سلطنت کو بجائے ایشیا کے یورپ میں وسعت دینے کی کوشش کرے گا، اسی غرض سے اس نے اب ڈیموٹیکا کو جو تھریس میں واقع تھا، پایہ تخت بنایا اور پھر تین سال کے بعد اورنہ کو دارالسلطنت قرار دیا، اس کی یہ حیثیت فتح قسطنطنیہ تک قائم رہی، اورنہ سے مراد نے بلقانی ریاستوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، جنگ ماریزا کے بعد مراد اور شہنشاہ قسطنطنیہ کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا جس کی رو سے شہنشاہ نے سلطان کا باج گزار ہونا منظور کیا اور آئندہ جنگوں میں عثمانی فوج کی حمایت میں اپنی فوج کا ایک دستہ بھیجنے کا وعدہ کیا۔

شہنشاہ کی ناکامی کچھ دنوں تک تو شہنشاہ قسطنطنیہ خاموشی کے ساتھ خراج ادا کرتا رہا لیکن پھر اسے اپنی محکومی ناقابل برداشت محسوس ہونے لگی، چنانچہ ۷۷۱ھ (۱۳۶۹ء) میں اس نے رومہ کا سفر کیا اور پوپ کی خدمت میں حاضر ہو کر یورپ کی مسیحی حکومتوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارنے کی درخواست پیش کی، اس نے پوپ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی ذلت گوارا کی، یونانی کلیسا کے ان تمام عقائد سے بیزاری ظاہر کی جو کلیسائے رومہ سے مختلف تھے اور مذہبی معاملات میں کلیسائے رومہ کی برتری بھی تسلیم کرلی، مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کا مقصد حاصل نہ ہوا اور مسیحی حکومتیں ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کے لیے آمادہ نہ ہوئیں، شہنشاہ ناکام و نامراد قسطنطنیہ کو واپس ہوا اور واپسی میں جب وہ وینس سے گزر رہا تھا تو وہاں کے بعض ساہوکاروں نے جن سے رومہ کے سفر کے لیے اس نے روپیہ قرض لیا تھا، اسے گرفتار کرلیا، اس کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ قرض ادا کر سکے، اس کا بڑا لڑکا اینڈرونیکس جسے وہ قسطنطنیہ میں اپنا جانشین بنا گیا تھا، حکومت کی لذت سے آشنا ہو کر باپ کی رہائی کا خواہش مند نہ تھا، اس لیے اس نے بھی قرض ادا کرنے کی

کوشش نہ کی لیکن چھوٹے لڑکے مینوئل نے اپنی املاک فروخت کر کے قرض کی رقم فراہم کی اور شہنشاہ کو آزاد کرایا۔ قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد شہنشاہ نے اینڈرونیکس کو حکومت کے تمام منصبوں سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ مینوئل کو مقرر کر کے اسے اپنے ساتھ تاج و تخت کا شریک بھی قرار دیا۔

صادوجی کی بغاوت | اینڈرونیکس کا لڑکا جس کا نام بھی اینڈرونیکس تھا، اپنے باپ کی اس حق تلفی پر سخت برافروختہ ہوا اور اس نے مراد کے سب سے چھوٹے لڑکے شہزادہ صادوجی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ دونوں مل کر شہنشاہ اور مراد کو تخت سے اتار دیں اور ان کی جگہ خود فرماں روا بن جائیں۔ مراد اس وقت ایشیائے کوچک میں تھا اور صادوجی اس وقت یورپ میں ترکی سپاہ کا افسر اعلیٰ تھا، اس نے مراد کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر فوراً بغاوت کا اعلان کر دیا، ادھر اینڈرونیکس نے بھی نوعمر بازنطینی امراء کی ایک جماعت اپنے ساتھ لے کر شہنشاہ کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کی، ان شہزادوں کی متحدہ بغاوت نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی، مراد اس خبر کو سنتے ہی یورپ پہنچا، شہنشاہ اینڈرونیکس کے جرم سے اپنی برأت پیش کی اور اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے پوری آمادگی ظاہر کی، اس نے مراد کی یہ تجویز بھی منظور کر لی کہ گرفتاری کے بعد دونوں شہزادے اپنی بینائی سے محروم کر دیے جائیں، صادوجی کی فوج نے اپنے سلطان کی زبان سے معافی کا وعدہ سن کر باغی شہزادہ کا ساتھ چھوڑ دیا، صادوجی، اینڈرونیکس اور نوجوان بازنطینی امراء گرفتار کر کے مراد کے سامنے لائے گئے، مراد نے پہلے صادوجی کی آنکھوں میں گرم سیسہ پلا کر اسے اندھا کر دیا اور پھر اسے قتل بھی کرا دیا، بازنطینی امراء دریائے مارٹیزا میں غرق کر دیے گئے، اینڈرونیکس شہنشاہ کے پاس بھیج دیا گیا، اس نے حسب وعدہ ان کی آنکھوں میں بھی سیسہ ڈلوا دیا لیکن اس طرح کہ خفیف سی بینائی باقی رہ گئی۔

ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کو ایک جدید معاہدہ کرنا پڑا، جس کی رو

سے اس نے دولت عثمانیہ کی باج گزاری اور سرتسلیم کی، عثمانی لشکر میں فوجی خدمت انجام دینے کا وعدہ کیا اور ضمانت کے طور پر اپنے لڑکے میخائل کو مراد کی خدمت میں بھیج دیا۔

فتوحات بلغاریا، مقدونیا و سرویا | اگرچہ بلغاریا نے جنگ ماریٹزا میں شرکت نہیں کی تھی تاہم تھریس کی فتح اور عیسائیوں کی شکست نے اس کو بھی نہایت اہم خطرات میں مبتلا کر دیا، خصوصاً اورنہ اور فلپو پولس پر قبضہ ہو جانے کے بعد بلغاریا اور مقدونیا کی راہ ترکوں کے لیے کھل گئی، ریاستہائے بلقان کے باہمی بغض و عناد نے ان کی قوتوں کو کمزور کر دیا تھا، اس لیے مراد کو شروع میں ان کی متحدہ طاقت سے مقابلہ پیش نہیں آیا، ۷۶۸ھ (۱۳۶۷ء) اور ۷۷۱ھ (۱۳۶۹ء) کے درمیان وہ بلغاریا میں بڑھتا چلا گیا اور کوہ روڈوپ تک وادی ماریٹزا پر قابض ہو گیا، سرویا اب تک بلغاریا کا شریک نہ تھا لیکن مراد کی ان فتوحات کے بعد اس نے بلغاریا سے مل کر ترکوں کا سدباب کرنا چاہا، ۷۷۳ھ (۱۳۷۱ء) میں لالہ شاہین نے صوفیا کے قریب سماکوف کے میدان میں بلغاری اور سروی افواج کا مقابلہ کیا اور ان کو سخت شکست دی، اس جنگ کے بعد کوہ بلقان تک بلغاریا کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، دوسرے سال لالہ شاہین اور عثمانی فوج کے دوسرے مشہور جنرل افرینوس نے مقدونیا پر حملہ کیا جو اسٹیفن ڈوشن کے زمانہ سے سرویا کا ایک صوبہ تھا اور کوالا، ڈراما اور سریز کے شہروں کو فتح کرتے ہوئے دریائے وردار کو عبور کر کے قدیم سرویا، البانیا اور بوسینا میں داخل ہوئے، لازار شاہ سرویا نے شکست کے بعد مراد کی اطاعت قبول کر لی، بلغاریا کے بادشاہ سیسمان نے بھی اپنی لڑکی حرم سلطانی میں پیش کر کے صلح کی درخواست کی، چنانچہ بلغاریا کا وہ حصہ جو کوہ بلقان کے شمال میں واقع تھا اور اس وقت تک سلطنت عثمانیہ میں شامل نہیں کیا گیا تھا، اس کی حکومت میں رہنے دیا، اس کے بعد ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) تک مراد اپنے ایشیائی مقبوضات کی توسیع و استحکام میں مصروف رہا، ۷۸۳ھ میں اس نے پھر سرویا کا رخ کیا اور عثمانی فوج نے دریائے وردار کو عبور کر کے موناستر پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد ۷۸۵ھ

(۱۳۸۵ء) میں صوفیہ فتح ہوا، شیشمان کو اپنی ملک اور خاندان کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر مراد سے رحم کی درخواست کرنی پڑی[1]، مراد نے سالانہ خراج قبول کر کے اسے بلغاریا کے تخت پر قابض رہنے کی اجازت دے دی، ۷۸۸ھ (۱۳۸۶ء) میں پچیس روز کے شدید محاصرہ اور سخت جنگ کے بعد نیش پر بھی جو سرویا کے قلب میں ایک نہایت مضبوط قلعہ تھا، نیز قسطنطین اعظم کے مولد ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا تھا، مراد کا قبضہ ہو گیا، سرویا کو اب مقاومت کا یارا نہ رہا، اس نے ہزار پونڈ نقرئی سالانہ خراج اور عثمانی لشکر کے لیے ہزار سوار دینے کا وعدہ کر کے صلح کر لی۔

امن و اصلاحات کا زمانہ | ۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) سے ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) تک کا زمانہ مراد کے دور حکومت میں امن کا زمانہ تھا، اس مدت میں اس نے کوئی جنگ نہیں چھیڑی اور اپنی توجہ زیادہ تر سلطنت کے انتظام و استحکام کی جانب مبذول رکھی، اس نے فوجی نظام میں اصلاحات جاری کیں اور جاگیری نظام کو مکمل کیا، مفتوحہ علاقوں میں جاگیریں قائم کر کے سپاہیوں کو دیں اور ہر جاگیردار کو جنگ کے موقعوں پر ایک یا ایک سے زیادہ مسلح سوار فراہم کرنے کا ذمہ دار بنایا، یہ فوجی جاگیریں چھوٹی اور بڑی دو قسموں کی تھیں، چھوٹی کو تیمار اور بڑی کو زعامت کہتے تھے[3]، اس نے شاہی زمینیں الگ کیں اور مسجدوں نیز دوسرے مذہبی اداروں کے لیے بہت سی زمینیں وقف کر دیں، مراد نے عیسائی رعایا کی ایک جماعت بھی ادنی فوجی خدمات کے لیے مرتب کی، اصطبل وغیرہ کی صفائی، خیموں کو نصب کرنا اور اکھاڑنا، سامان کی گاڑیوں کی دیکھ بھال اور اسی قسم کے دوسرے کام ان لوگوں کے فرائض میں داخل تھے، مراد ہی کے عہد میں سپاہیوں کے علم کے لیے سرخ رنگ تجویز ہوا، جو عثمانی فوجوں کا قومی رنگ ہو گیا۔

---

[1] بلقان از ولیم ملر سلسلہ "اسٹوری آف دی نیشنز" ص ۱۹۸ [2] ان کے متعلق تفصیلات آئندہ آئیں گی۔

[3] کریسی، جلد ا، ص ۳۸۔

اناطولیہ میں سلطنت کی توسیع لیکن امن کے زمانہ میں مراد توسیعِ سلطنت کی تدبیروں سے غافل نہ تھا، ۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) میں اس نے شہزادہ بایزید کا نکاح امیر کرمیان کی لڑکی سے کر دیا، عروس کو ریاست کرمیان کا بڑا حصہ اور قلعہ کوتاہیہ جو اپنے مقام کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا، جہیز میں ملا اور یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، شادی کی تقریب بروصہ میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی، اناطولیہ کی تمام ترکی ریاستوں کے نمائندے اور سلطان مصر کے سفیر شریک ہوئے، یہ لوگ اپنے ساتھ عرب کے صبا رفتار گھوڑے، یونان کی حسین کنیزیں اور اسکندریہ کے حیرت انگیز ریشمی کپڑے نذر کے طور پر لائے تھے، من جملہ اور تحائف کے سونے اور چاندی کے ظروف بھی تھے، جن میں طلائی اور نقرئی سکے بھرے ہوئے تھے، نیز پیالے اور طشت تھے جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے، یہ تمام چیزیں مراد نے اپنے مہمانوں میں تقسیم کر دیں لیکن جب عروس نے کرمیان کے قلعوں کی کنجیاں پیش کیں تو انہیں اپنے ہی پاس رکھا[1]، ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) میں مراد نے ریاست حمید کے امیر کو آمادہ کیا کہ اپنی ریاست کا ایک بڑا حصہ اس کے ہاتھ فروخت کر ڈالے، جس میں آق شہر کا ضلع بھی شامل تھا، ریاست حمید کا یہ علاقہ شامل کر لینے سے سلطنت عثمانیہ کی سرحد ریاست کرمانیہ سے بالکل متصل ہو گئی، کرمانیہ اور آل عثمان کی آویزش ابتدا سے چلی آتی تھی، اسے دور کرنے کے خیال سے مراد نے اپنی لڑکی نفیسہ کا عقد علاء الدین امیر کرمانیہ سے کر دیا، چنانچہ تقریباً دس سال یہ صلح قائم رہی لیکن ان میں سے ہر فریق اناطولیہ کے ترکوں کی سرداری کا دعوے دار تھا اور باوجود اس کے کہ ایشیائے کوچک کی متعدد ترکی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں، امیر کرمانیہ کی خود سری اور شورش انگیزی مراد کو اس کے ایشیائی مقبوضات کی طرف سے مطمئن نہیں ہونے دیتی تھی، چنانچہ ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور قونیہ میں علاء الدین کو بری طرح شکست ہوئی، مراد اگر

---

[1] ترکی از لین پول، سلسلۂ "اسٹوری آف دی نیشنس"، ص ۳۱۔

چاہتا تو علاء الدین کو قتل کر کے اس کی ریاست پر قابض ہو جاتا لیکن نفیسہ کی التجاؤں سے متاثر ہو کر اس نے علاء الدین کا قصور معاف کر دیا اور اس کی ریاست اسے پھر بخش دی، علاء الدین نے مراد کو اپنا آقا تسلیم کیا، اسی جنگ میں شہزادہ بایزید نے اپنے حملوں کی حیرت انگیز سرعت اور شدت کی بنا پر یلدرم (بجلی) کا لقب حاصل کیا تھا، اس کے بعد مراد بروصہ کو واپس گیا اور اب اس کی خواہش تھی کہ بقیہ عمر آرام اور یادِ الٰہی میں گزار دے، چنانچہ اسی وجہ سے اس نے ریاست تکہ پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنے سے انکار کر دیا اور جس فوجی افسر نے یہ تجویز پیش کی تھی اسے یہ جواب دیا کہ ”امیر تکہ بہت غریب اور کمزور ہے، مجھے اس سے جنگ کرنے میں شرم آنی چاہیے، شیر مکھیوں کا شکار نہیں کرتا“ لیکن بہت جلد اس بوڑھے شیر کو دوسرے شیروں کے مقابلہ کے لیے اپنی آرام گاہ سے نکلنا پڑا۔

مسیحی حکومتوں کا اتحاد

یورپ میں اس وقت ۷۹۰ھ (۱۳۸۸ء) تک تقریباً تمام قدیم تھریس اور جدید رومیلیا سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکا تھا، اس کے علاوہ بعض دوسری اہم فتوحات بھی حاصل ہو چکی تھیں، ان علاقوں میں ترک اور عرب نو آبادیاں قائم کر دی گئی تھیں اور وہاں کے اکثر باشندے دوسرے مقامات کو منتقل کر دیے گئے تھے، ان نو آبادیوں نے عیسائیوں میں ایک عام بے چینی پیدا کر دی، ینی چری کے لیے ہر سال ایک ہزار عیسائی لڑکوں کے مطالبہ سے اس بے چینی میں برہمی بھی شامل ہو گئی، ترکوں کے خلاف غصہ کا جذبہ پورے جوش کے ساتھ موجود تھا، اسے مشتعل کرنے کے لیے جس چنگاری کی ضرورت تھی وہ بھی جنگ قونیہ کے بعد ہاتھ آ گئی، اس جنگ میں عثمانی فوج کے ساتھ سرویا کے دو ہزار سپاہی بھی شریک تھے، جو سابق معاہدہ کی رو سے طلب کیے گئے تھے، کوچ سے پہلے ہی مراد نے فوج میں اعلان کرا دیا تھا کہ کرمانیہ کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد بھی ریاست کے عام باشندوں کی جان و مال کو ہرگز کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے اور جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا وہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا لیکن سروی سپاہیوں نے جو یورپ کے دستور کے

مطابق دشمن کے ملک میں پہنچ کر ہر قسم کی غارت گری کو بالکل جائز خیال کرتے تھے، اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور راستہ میں نہایت وحشیانہ طریقہ پر لوٹ مار شروع کر دی، مراد نے ان میں سے بہتوں کو سخت سزائیں دیں اور بعضوں کو قتل بھی کرا دیا، اس کا یہ فعل فوجی قوانین کی رو سے بالکل جائز تھا لیکن اہل سرویا کے لیے یہ سخت اشتعال کا باعث ہوا اور شاہ سرویا نے جس کی سلطنت اسٹیفن ڈوشن کے عہد میں بلغراد سے دریائے یارمزا اسٹک اور بحر اسود سے بحر ایڈریاٹک تک پھیلی ہوئی تھی، عیسائی حکومتوں کا ایک عظیم الشان اتحاد قائم کر کے ترکوں کے استیصال کا بیڑا اٹھایا، اس اتحاد میں سرویا، بوسنیا اور بلغاریا کی حکومتیں آگے ہوئیں، البانیا، ولاچیا اور ہنگری نے پوری قوت کے ساتھ شرکت کی، پولینڈ نے بھی اپنی فوج بھیجی، سلافی قوموں کا اتنا زبردست اتحاد اس سے پہلے کبھی قائم نہیں ہوا تھا، سرویا نے مغربی یورپ کی حکومتوں کو بھی شرکت کی دعوت دی لیکن وہ مختلف وجوہ سے ادھر متوجہ نہ ہو سکیں، محاربات صلیبی کا قدیم جوش فرو ہو چکا تھا اور ہنوز ارض مقدس کو ترکوں سے آزاد کرانے کا سوال پیدا نہ ہوا تھا، علاوہ بریں چودہویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ کی مغربی سلطنتوں کی اندرونی حالت اور ان کے حکمرانوں کی ذاتی کمزوریاں اس اتحاد کی شرکت سے مانع تھیں لیکن اس وقت تمام یورپ کے متحد نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب لاطینی کلیسا کا وہ شدید افتراق تھا جس نے کل مغربی سلطنتوں کو دو متخاصم جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک جماعت پاپائے روم کے زیر فرمان تھی اور دوسری اس کے حریف پوپ کی حلقہ بگوش تھی، جس نے اوینیاں (واقع فرانس) کو اپنے جدید کلیسا کا مرکز قرار دیا تھا۔

جنگ کسووا بہرحال سرویا نے مشرقی حکومتوں کے اتحاد سے جو قوت فراہم کر لی تھی، وہ بظاہر ترکوں کو یورپ سے نکال دینے کے لیے کافی تھی، مراد نے اس اجتماع کی خبر بروصہ میں سنی اور گو اس کی عمر ستر سال کی ہو چکی تھی، تاہم عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے فوراً روانہ ہو گیا، اتحادیوں نے مراد کے پہنچنے سے پہلے ہی بوسنیا میں ایک عثمانی فوج پر حملہ کیا اور من جملہ تیس

ہزار ترک سپاہیوں کے پندرہ ہزار کو تہ تیغ کر ڈالا، اس کے بعد فوراً ہی علی پاشا مراد کے حکم کے مطابق درہ دربند کی راہ سے کوہِ بلقان کو عبور کر کے بلغاریہ میں داخل ہوا اور شوملہ اور ترانو پر قبضہ کر کے دریائے ڈینوب کی طرف بڑھا، سلیمان شاہ نے بلغاریہ سے بھاگ کر نائیکوپولس میں پناہ لی لیکن بہت جلد اسے مراد سے معافی مانگ کر صلح کر لینی پڑی، شرائط صلح یہ تھے کہ سلسٹریا کا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا جائے گا اور بلغاریہ سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا، سیسمان کی علاحدگی کے باوجود شاہِ سرویا نے استقلال کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور سلیمان بھی چند ہی دنوں میں معاہدہ کو توڑ کر پھر سرویا سے مل گیا، اس نے سلسٹریا سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا اور ایک فوج سرویا کی مدد کے لیے روانہ کی، مراد نے علی پاشا کو اس کے مقابلہ میں بھیجا، سیسمان پھر نائیکوپولس میں پناہ گزیں ہوا اور یہ اہم قلعہ دوبارہ فتح ہوا، مراد نے اس مرتبہ بھی سیسمان کی جان بخشی کی لیکن اس کی بار بار کی غداری کی سزا میں بلغاریہ کا جنوبی حصہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا، لازار شاہ سرویا نے اپنے دوسرے حلیفوں کے ساتھ برابر ترکوں کا مقابلہ کرتا رہا، بالآخر اس نے تمام اتحادی افواج کو جمع کر کے ایک فیصلہ کن معرکہ کا تہیہ کیا اور اپنے لشکر کی کثرت و قوت پر اعتماد کر کے مراد کے پاس آخری جنگ کا پیغام بھیجا، چنانچہ ۱۵؍ جون ۱۳۸۹ء (۷۹۱ھ) کو کسووا کے میدان میں وہ آخری مقابلہ پیش آیا جس نے اتحادیوں کا شیرازہ پراگندہ کر کے سرویا کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، جنگ اختتام کے قریب تھی کہ میلوش کوبیلووچ (Miloshe Kobilovich) نامی ایک سروی امیر عثمانی لشکر کی طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور وہاں شاہ لازار کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے اس نے یہ بیان کیا کہ مجھے کچھ نہایت اہم باتیں سلطان سے کہنی ہیں، چنانچہ وہ مراد کی خدمت میں لایا گیا لیکن قدم بوسی کے وقت اٹھ کر دفعتہً اس نے مراد پر خنجر سے حملہ کیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر بھاگ جانے کی کوشش کی، سپاہیوں نے چشم زدن میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے مگر مراد کو زخم کاری پہنچ چکا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر کا مہمان اور ہے، اسی

حالت میں اس نے آخری حملہ کا حکم دیا، جس نے جنگ کا فیصلہ کر دیا، وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات پورے کر رہا تھا کہ لازار گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا، اس نے اس کے قتل کا حکم دیا اور کچھ دیر بعد خود بھی جاں بحق تسلیم ہوا، میلوش کے واقعہ کے بعد سے یہ قاعدہ ہو گیا کہ جب کوئی اجنبی شخص سلطان کے حضور میں لایا جاتا تو دو آدمی اس کے بازو پکڑے رہتے تاکہ وہ فریب نہ کر سکے، انیسویں صدی سے اس قاعدہ کی پابندی جاتی رہی، تاہم گذشتہ صدی میں بھی غیر ملکوں کے سفیروں کو سلطان کے بہت قریب جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی[1]۔

جنگ کسووا کے بعد پانچ سو برس تک اہل سرویا نے پھر کبھی متحد ہو کر ترکوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کی، بہتیرے بھاگ کر جبل اسود (مونٹی نیگرو) میں پناہ گزیں ہوئے اور وہاں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے برابر جنگ کرتے رہے، بہت سے بوسنیا اور ہنگری میں جا کر آباد ہو گئے لیکن بہ حیثیت ایک خود مختار حکومت کے سرویا کا خاتمہ ہو گیا، اگرچہ اس کے بعد بھی ستر سال تک سرویا کی عثمانی حکومت ملکی فرماں رواؤں کے ہاتھ میں رہی تاہم اس کی حیثیت محض ایک باج گذار مملکت کی تھی۔

مراد کے کارنامے مراد کا عہد حکومت تاریخ آل عثمان کے اہم ترین عہدوں میں ہے، اس نے تیس سال تک حکومت کی، ان میں سے چوبیس سال میدان جنگ میں صرف کیے اور ہر جنگ میں کامیاب رہا، مراد سے پہلے ترکوں کا مقابلہ یورپ کی قوموں میں سے صرف بازنطینیوں سے ہوا تھا، جن کی سلطنت اپنے زوال کے آخری منزلیں طے کر رہی تھی لیکن مراد کی ظفریاب فوجیں ان ملکوں میں بھی پھیل گئیں جو یورپ کی نہایت طاقتور سلافی قوموں کے زیر نگیں تھے اور بلغاریا، سرویا اور بوسنیا پر دولت عثمانیہ کا تسلط قائم ہو گیا، مراد ہی کے عہد میں اول بار آل عثمان اور اہل ہنگری کا مقابلہ پیش آیا، جس میں موخر الذکر کو سخت شکست اٹھانی پڑی، مراد کی فتوحات نے سلطنت عثمانیہ کے دائرہ اقتدار کو دریائے ڈینوب تک پہنچا دیا اور گو

---

[1] ترکی از لین پول، ص ۴۵۔

بعض ریاستوں مثلاً سرویا اور بوسنیہ سے محض خراج قبول کرنے پر قناعت کی گئی، مگر تھریس، مقدونیا اور جنوبی بلغاریہ کی ریاستیں مکمل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں۔

مسٹر گبنس لکھتے ہیں:

> ”تیس سال تک مراد نے عثمانیوں کی سیادت ایسے سیاسی تدبر کے ساتھ کی کہ اس عہد کا کوئی مدبر اس پر فوقیت نہ حاصل کر سکا۔ محض اس لیے کہ مراد کی بہ نسبت محمد ثانی اور سلیمان اعظم سے متعلق ہماری معلومات بہت زیادہ ہیں، مراد کا صحیح مقام کہ وہ خاندان عثمانی کا سب سے زیادہ ممتاز و کامیاب ماہر سیاست اور محارب تھا، کبھی پہچانا نہ جا سکا۔ جب ہم ان دشواریوں کا جن کا اس نے مقابلہ کیا، ان مسائل کا جنہیں اس نے حل کیا اور اس کے عہد حکومت کے نتائج کا موازنہ اس کے زیادہ پرشکوہ جانشینوں کے کارناموں سے کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اگر وہ ان سے بڑھ کر نہیں تو ان کے برابر ضرور ہے۔ جو تغیر اس نے اپنی مدت حیات کے اندر کر دیا، وہ تاریخ کے نہایت حیرت انگیز واقعات میں سے ہے۔ اس کی فتوحات کو پانچ صدیوں تک قائم رہنا تھا۔ ۱۸۷۸ء کے معاہدہ برلن تک ان میں سے بعض حال کی جنگ بلقان کے طوفان کے بعد بھی باقی رہ گئی ہیں۔“[1]

مراد نے مسیحی علاقے فتح کر کے ان میں اسلامی حکومت تو قائم کی لیکن عیسائیوں کو بہ جبر اسلام میں داخل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، برخلاف اس کے اس نے انہیں پوری مذہبی آزادی دے رکھی تھی، جس کی واضح شہادت اس خط میں محفوظ ہے جو ۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) میں یونانی کلیسا کے بطریق اعظم نے پوپ اربن ششم کو لکھا تھا، بطریق مذکور نے اقرار کیا ہے کہ مراد نے کلیسا کو کامل آزادی بخش دی تھی، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۷۶۱ھ (۱۳۶۰ء) اور ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) کے درمیان بطریق اعظم کے دفتر میں کوئی ایک شکایت بھی عثمانیوں کے ہاتھوں ارباب کلیسا کی بدسلوکی کی درج نہیں ملتی۔[2]

---

[1] ہربرٹ گبنس ص ۱۷۸۔ [2] ایضاً۔

بایزید اوّل یلدرم

۷۹۱ھ تا ۸۰۵ھ مطابق ۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء

مراد کی شہادت کے بعد ہی جنگ کسووا کا بھی خاتمہ ہو گیا، شہزادہ بایزید جب اتحادیوں کو پوری طرح شکست دینے کے بعد اپنے لشکر میں واپس آیا تو فوج کے تمام سرداروں نے اس کا خیر مقدم وارث تاج و تخت کی حیثیت سے کیا لیکن تخت نشین ہونے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ یعقوب کو جس نے اس جنگ میں شجاعت اور فوجی قابلیت کے اعلیٰ جوہر دکھائے تھے فوراً قتل کرا دیا، باپ کی لاش ابھی سرد بھی نہیں ہوئی تھی کہ الفتنة اشد من القتل کی آڑ پکڑ کر یعقوب کے وجود کو سلطنت کے لیے فتنہ قرار دیا گیا اور صادوجی کی بغاوت نظیر میں پیش کی گئی، تخت سلطنت کی خاطر آلِ عثمان میں یہ پہلا قتل تھا، جس نے آئندہ کے لیے مثال قائم کر دی۔

سرویا سے صلح اتحادیوں کی شکست کے بعد بھی سرویا نے کچھ دنوں تک جنگ جاری رکھی لیکن بالآخر اسے صلح کر لینی پڑی، بایزید نے سرویا کی خود مختاری قائم رکھی اور صرف اس کے باج گزار ہونے پر اکتفا کی، لازار کے جانشین شاہ اسٹیفن نے سالانہ خراج کے علاوہ پانچ ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ سلطان کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رکھنے کا معاہدہ کیا، نیز اپنی بہن شہزادی ڈسپینا کو بایزید کے نکاح میں دے دیا، اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سلطان کی تمام لڑائیوں میں وہ اپنی فوج لے کر خود شریک ہوا کرے گا، چنانچہ آخر وقت تک وہ اس

معاہدہ پر قائم رہا اور نائیکو پولس اور انگورہ کی معرکۃ الآرا جنگوں میں اسٹیفن بایزید کے دوش بدوش لڑتا رہا اور سروی افواج کی خدمات حد درجہ وقیع اور موثر ثابت ہوئیں۔

شہنشاہ سے جدید صلح نامہ سرویا سے صلح کرنے کے بعد بایزید قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوا اور اینڈرونیکس کو تخت پر بٹھانے کی دھمکی دے کر شہنشاہ پلیولوگس کو ایک جدید صلح نامہ پر مجبور کیا، جس نے بازنطینی سلطنت کی رہی سہی حیثیت بھی خاک میں ملا دی، جان اور اس کے لڑکے مینوئل نے جو تخت سلطنت میں اپنے باپ کا شریک تھا، معاہدہ کیا کہ تیس ہزار طلائی سکے بطور خراج ہر سال ادا کرتے رہیں گے اور بارہ ہزار کا ایک فوجی دستہ بایزید کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رکھیں گے، ایشیائے کوچک میں بازنطینی سلطنت کے مقبوضات میں سے اب صرف ایک قلعہ فلاڈلفیا باقی رہ گیا تھا، اس صلح نامہ میں وہ بھی بایزید کے نام لکھ دیا گیا لیکن اس قلعہ کے یونانی افسر نے شہنشاہ کے حکم کے باوجود قلعہ خالی کرنے سے انکار کر دیا، بایزید نے شہنشاہ کو مجبور کیا کہ وہ خود اپنی فوج کے ذریعہ سے قلعہ خالی کرا دے، چنانچہ دولت بازنطینیہ کے انتہائی زوال کا یہ عبرت ناک واقعہ بھی ظہور میں آیا کہ یونانی سپاہیوں نے فلاڈلفیا پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے بایزید کے حوالے کر دیا۔

اناطولیہ کی فتوحات ایشیائے کوچک کی اکثر ترکی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں، بایزید نے باقی ماندہ پر بھی قبضہ کر لینا چاہا اور سب سے پہلے ایدین کی طرف بڑھا، ایدین کو فتح کرنے کے بعد اس نے منتشا اور صارو خاں کا رخ کیا، ان ریاستوں کے امیروں نے بھاگ کر امیر قسطمونی کے پاس پناہ لی اور منتشا اور صارو خاں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں، ایدین، منتشا اور صارو خاں کی فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ عثمانی ترک بحر آچین کے ساحل تک پہنچ گئے، یہیں سے عثمانی بحری طاقت کی ابتدا ہوئی ہے، گو بایزید کے عہد میں اس کو ترقی نہ ہو سکی، ساٹھ[1] جہازوں کا پہلا عثمانی بیڑا ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) میں روانہ ہو کر جزیرہ کیوس (Chios) پر حملہ آور ہوا،

---

[1] ہربرٹ گبنس، ص ۱۸۶۔

اس کے بعد بایزید نے سمرنا پر حملہ کیا، یہ شہر یروشلم کے مبارزین سینٹ جان کا مقبوضہ تھا، بحری قوت کے ناکافی ہونے کی وجہ سے بایزید کو چند ہفتوں کے بعد سمرنا کا محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔ ریاست تکہ کے ایک حصہ پر مراد کے زمانہ میں قبضہ ہو چکا تھا، بایزید نے بقیہ علاقہ کو بھی اپنی حدود سلطنت میں لے لیا، اب صرف دو ریاستیں کرمانیہ اور قسطمونی سلطنت عثمانیہ میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، بایزید نے کرمانیہ پر بھی حملہ کیا، حالاں کہ کرمانیہ کے امیر علاء الدین سے اس کی بہن بیاہی ہوئی تھی اور پایہ تخت قونیہ کا محاصرہ کرلیا، علاء الدین نے کرمانیہ کا ایک ٹکڑا جس میں آق شہر بھی شامل تھا، بایزید کی نذر کر کے صلح کرلی۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ ان فتوحات کے بعد جن کا اکثر حصہ بغیر کسی جنگ کے ہاتھ آیا تھا، بایزید پھر دردانیال کو عبور کر کے اورنہ چلا گیا، اس درمیان میں جان پلیولوگس نے قسطنطنیہ کے تمین برج مسمار کرا دیے تھے اور وہ ان کے سامان سے نئے قلعے تعمیر کرنا چاہتا تھا، بایزید نے اس ارادہ سے شہنشاہ کو بہ جبر باز رکھا، چند ہی دنوں کے بعد جان کا انتقال ہو گیا، اس کا لڑکا مینوئل جو کچھ عرصہ سے بایزید کے دربار میں مامور تھا، شہنشاہ کے انتقال کی خبر سن کر چپکے سے بھاگ کر قسطنطنیہ پہنچا اور اپنے باپ کا جانشین ہوا، بایزید کو یہ بات ناگوار ہوئی اور اس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا، سات مہینہ تک محاصرہ جاری رہا، پھر چوں کہ بایزید کو بلغاریا میں جمنڈ شاہ ہنگری کے جارحانہ اقدام کو روکنے کے لیے فوجیں درکار تھیں، اس لیے اس نے دس سال کے لیے صلح کر کے محاصرہ اٹھا لیا، شرائط صلح بہت سخت تھے، سالانہ خراج کی رقم تیس ہزار طلائی کراون مقرر ہوئی، مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ میں ایک شرعی عدالت قائم کی گئی، جس میں بایزید نے ایک ترکی قاضی مقرر کیا اور کلیسائے مشرق کے اس مرکز میں ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کی گئی، جس کے میناروں سے توحید اسلامی کا اعلان ہونے لگا،[1] مسٹر گبن نے لکھا ہے کہ مینوئل نے شہر کے سات سو مکانات بھی مسلمانوں کو دے دیے اور غلطہ کا نصف

---

[1] گبن، جلد ۴، ص ۳۹۲۔

حصہ بایزید کے حوالہ کر دیا، جس میں اس نے چھ ہزار عثمانی فوج متعین کر دی، شہر کے باہر جو انگور کے باغ اور ترکاریوں کے کھیت تھے، ان کی پیداوار کا عشر بھی صلح نامہ کی رو سے عثمانی خزانہ کو دے دیا گیا، اسی وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو استنبول کہنا شروع کیا۔[1]

والاچیا اس کے بعد بایزید نے والاچیا کا رخ کیا اور اسے دولت عثمانیہ کا باج گزار بنا کر بوسنیا اور ہنگری کی طرف بڑھا، ابتدا میں ترکوں کو بوسنیا اور ہنگری کی متحدہ افواج سے شکست ہوئی اور نائیکوپولس کا مضبوط قلعہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا لیکن جمنڈ کی یہ کامیابی بالکل عارضی تھی اور چند ہی دنوں کے بعد اسے شکست کھا کر بھاگنا پڑا، نائیکوپولس پر پھر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔

بلغاریا کی فتح ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں بایزید نے اپنے سب سے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کو بلغاریا کی طرف روانہ کیا، بلغاریا کا جنوبی حصہ مراد اول کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکا تھا، بایزید نے شمالی حصہ پر بھی قبضہ کر لینا چاہا، شاہ سلیمان نے جم کر مقابلہ کیا لیکن تین ہفتے کے محاصرہ کے بعد پایہ تخت ترنوا فتح ہو گیا اور پورے ملک پر ترکوں کا تسلط ہو گیا، اب شمالی بلغاریا بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا، بلغاریا کا شاہی خاندان ختم ہو گیا، بلغاریا کا اسقف اعظم جلاوطن کر دیا گیا اور بلغاری کلیسا قسطنطنیہ کے یونانی کلیسا کے ماتحت بنا دیا گیا اور اس کی یہ محکومی ٹھیک پانچ سو برس تک قائم رہی، بلغاریا کے جن باشندوں نے اسلام قبول کر لیا، ان کی زمینیں ان ہی کے قبضہ میں چھوڑ دی گئیں، باقی سارا علاقہ فوجی جاگیروں کی شکل میں ترکوں کو دے دیا گیا۔

ویدین اور سلستریا نائیکوپولس پہلے ہی فتح ہو چکا تھا، بایزید نے ویدین اور سلستریا پر بھی قبضہ کر لیا، یہ تینوں قلعے ہنگری کی سرحد پر واقع تھے، ان کی فتح کے بعد ترکوں نے ہنگری کے سرحدی علاقہ میں چھوٹے چھوٹے حملے شروع کر دیے، بایزید اب ہنگری پر حملہ کرنے

---

[1] ہربرٹ گبنس ص ۱۹۶۔

کی تیاری کر رہا تھا کہ دفعۃً اسے ایشیائے کوچک کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔

کرمانیہ کرمانیہ اور آل عثمان کی عداوت بدستور چلی آتی تھی، مراد نے اپنی ایک لڑکی کا نکاح علاء الدین سے کر کے تعلقات کو خوش گوار بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اناطولیہ کے ترکوں کی سرداری اور آل سلجوق کی قائم مقامی کا حوصلہ امیر کرمانیہ کو چین نہیں لینے دیتا تھا، وہ ہر موقع پر دولت عثمانیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا، مراد کے عہد میں بھی وہ ایک سے زائد بار اپنی دشمنی کا ثبوت دے چکا تھا اور اب بایزید کے مقابلہ میں بھی اس نے اپنی وہی قدیم روش قائم رکھی، چنانچہ بایزید جب ہنگری کی فتح کی تیاری کر رہا تھا، علاء الدین نے اناطولیہ کے عثمانی علاقوں پر حملہ کر دیا، انگورہ اور بروصہ کے درمیان سخت معرکہ ہوا، جس میں عثمانی فوج کو بری طرح شکست ہوئی اور تیمورتاش پاشا جو سالار عسکر اور ایشیائے کوچک میں بایزید کا نائب سلطنت تھا، علاء الدین کے ہاتھ میں گرفتار ہوا، یہ خبر سن کر بایزید سرعت کے ساتھ اناطولیہ پہنچا اور آق چائی کے مقام پر کرمانی لشکر کو شکست دے کر علاء الدین اور اس کے دو لڑکوں محمد اور علی کو قید کر لیا، علاء الدین اور اس کے دونوں لڑکے تیمورتاش پاشا کی حراست میں رکھے گئے اور اس نے بایزید کی اجازت کے بغیر تینوں کو پھانسی دے دی، بایزید یہ معلوم کر کے بہت برہم اور رنجیدہ ہوا لیکن پھر اس مقولہ کو یاد کر کے خاموش ہو گیا کہ ''ایک امیر کی موت اتنی بری نہیں جتنا ایک صوبہ کا نقصان'' لارڈ ایورسلے نے اس ترکی مقولہ کو قرآن کریم کی ایک آیت قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس آیت کے بموجب بایزید نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کرمانیہ کی پوری ریاست پر قبضہ کر کے اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا جائے[1]، اسلام کی دشمنی میں اتنا سفید جھوٹ جو بیسویں صدی کے ایک انگریز مورخ کے قلم سے نکلا ہے، قرون وسطیٰ کے مسیحی مفتریوں کو بھی نہ سوجھا ہوگا، بہرحال کرمانیہ پر بایزید کا قبضہ ہو گیا اور ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کی قائم مقامی کے لیے اب آل عثمان کا کوئی حریف باقی نہ رہا۔

---

[1] لارڈ ایورسلے، ص ۴۸۔

بقیہ ترکی ریاستیں اس کے بعد ۷۹۲-۹۵ھ (۱۳۹۳-۹۲ء) میں بایزید نے سیواس، قسطمونی اور اماسیا میں اپنی فوجیں روانہ کیں اور ان علاقوں کو بھی فتح کر لیا۔ اب صرف ریاست قسطمونی سلطنت عثمانیہ میں شامل ہونے سے رہ گئی تھی، دوسری مفتوحہ ریاستوں کے امراء قسطمونی میں جا کر پناہ لیتے تھے، بایزید نے اسی امر کو بہانہ مخالفت قرار دے کر قسطمونی پر بھی حملہ کیا اور اناطولیہ کی اس آخری ترکی ریاست کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

سلطان بایزید ان فتوحات کے بعد امیر کا لقب جسے اب تک عثمانی فرماں روا اختیار کرتے آئے تھے، بایزید کو اپنی عظمت و شان کے مقابلے میں فروتر معلوم ہونے لگا، چنانچہ اس نے مصر کے عباسی خلیفہ کی اجازت سے سلطان کا لقب اختیار کر لیا، خلیفہ کو عملاً اگرچہ کوئی اقتدار حاصل نہ تھا، تاہم اسلامی دنیا میں اس کی مذہبی حکمرانی اب بھی تسلیم کی جاتی تھی اور بایزید جیسے بادشاہ کو بھی جو اپنی سطوت میں یورپ اور ایشیا کے بڑے سے بڑے فرماں رواؤں کا حریف تھا، سلطان کے لقب کو جائز قرار دینے کے لیے خلیفہ ہی کا فرمان حاصل کرنا پڑا۔

اس موقع پر لین پول عام مورخوں سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ آل عثمان میں بایزید پہلا شخص نہیں ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، بلکہ برٹش میوزیم اور دوسرے مقامات پر عثمانیوں کے جو سکے محفوظ ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اورخان اور مراد اول بھی اپنے سکوں پر سلطان کا لقب کندہ کراتے تھے، عثمان کے نام کا کوئی سکہ موجود نہیں، (کیوں کہ اگرچہ سلطان علاء الدین سلجوقی نے اسے اپنا سکہ جاری کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی، تاہم اس نے اس حق کو استعمال نہیں کیا) اور غالباً پہلا عثمانی سکہ اورخان کے عہد میں جاری ہوا، پس بایزید کے لیے سلطان کا لقب صرف اس بنا پر ایک نئی چیز ہو سکتا ہے کہ اس نے اس کے لیے خلیفہ اسلام کی اجازت بھی حاصل کر لی۔[1]

وقفہ عیش یورپ اور ایشیا ان عظیم الشان فتوحات کے بعد بایزید نے کچھ دنوں آرام

---

[1] لین پول ص ۵۰ فٹ نوٹ۔

کرنے کا قصد کیا اور ہمہ تن محل سرا کے عیش و نشاط میں محو ہو گیا، شہزادی ڈیسپنا کی ترغیب سے اس نے شراب بھی شروع کر دی تھی[1]، جسے اس وقت تک کسی عثمانی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا، شراب کو سرور عیش کے دیگر لوازم کا بھی متقاضی ہوا اور پھر تو اس سلسلہ کی کوئی برائی ایسی نہ تھی جو باقی رہی ہو لیکن جام و سبو کی یہ تمام سرمستیاں بایزید کے قوائے عمل کو مختل نہ کر سکیں اور جب اس نے سنا کہ یورپ نے ایک زبردست صلیبی اتحاد قائم کر کے سلطنت عثمانیہ کے استیصال کا بیڑا اٹھایا ہے، تو عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے کوئی خواب شیریں سے آسودہ ہو کر تازہ قوت کے ساتھ بیدار ہوتا ہے۔

صلیبی اتحاد

جنگ کسووا کے بعد سرویا کی تسخیر نے ہنگری کی آزادی کو سخت خطرہ میں ڈال دیا تھا، خصوصاً نکوپولس، ودین اور سلسٹریا کے فتح ہو جانے کے بعد ترکوں کے لیے ہنگری کا راستہ کھل گیا تھا، ان کے متواتر حملوں سے عاجز آ کر سجمنڈ شاہ ہنگری نے یورپ کی عیسائی سلطنتوں سے مدد کی درخواست کی، چوں کہ ہنگری کلیسائے روما سے وابستہ تھا، اس لیے پوپ نے بھی اس کی سرپرستی کی اور ترکوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی، اب تک ترکوں کے خلاف عیسائیوں کا جو اتحاد قائم ہوا تھا، اس میں مغربی یورپ کی حکومتوں نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا، اس مرتبہ سجمنڈ کی خاص کوشش یہ تھی کہ فرانس بھی اس کی مدد کے لیے اپنی فوجیں روانہ کرے، اتفاق سے اس زمانہ میں فرانس اور انگلستان کے درمیان جنگ موقوف تھی، جس کی وجہ سے فرانس کو اس اتحاد کی شرکت میں تامل نہ ہوا، فرانس اور برگنڈی کے پرجوش نوجوان بھی مشرقی یورپ کے میدانوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے کے لیے بے چین تھے، طے یہ پایا کہ ڈیوک آف برگنڈی کا لڑکا کونٹ ڈی نیورس (Count De Neuers) ایک فوج لے کر شاہ ہنگری کی مدد کے لیے روانہ ہو اور وہی فرانسیسی اور دوسرے سوار دستوں کا سالار عسکر مقرر کیا جائے، ان بہادروں کے پیش نظر صرف ہنگری

---

[1] نولس (Knolles) بحوالہ لین پول، ص ۴۹۔

کی مدد تھی، بلکہ منصوبے یہ تھے کہ ہنگری میں بایزید کی قوت کو توڑنے کے بعد قسطنطنیہ کی طرف بڑھیں اور پھر دردانیال کو عبور کر کے شام میں داخل ہوں، ارضِ مقدس پر قبضہ کریں اور یروشلم اور درگاہ شریف کو مسلمانوں کے ہاتھ سے آزاد کرائیں، غرض شہرت اور نام وری کے شوق میں مبارزین جوق در جوق اکٹھا ہونے لگے، شاہی خاندان اور فرانسیسی امراء کے ممتاز اشخاص جو فنِ سپہ گری میں خاص شہرت رکھتے تھے، اس مقدس مہم میں شریک ہوئے، یہ منتخب فوج ۷۹۸ھ (مارچ ۱۳۹۶ء) میں فرانس سے روانہ ہوئی، راستہ میں جرمنی سے گزرتے ہوئے جرمنی کے شاہی خاندان کے بعض افراد مثلاً فریڈریک، کاؤنٹ آف ہونزولرن (Count of Hohenzollern) اور روڈس کے مبارزین سینٹ جان کا افسرِ اعلیٰ بھی ایک مضبوط دستہ لے کر شامل ہو گیا، ان کے علاوہ سجمنڈ نے بویریا اور اسٹائریا کے سوار دستے بھی فراہم کر لیے تھے، مغربی یورپ کے مسیحی مجاہدوں کی مجموعی تعداد دس بارہ ہزار تھی اور وہ سب کے سب اپنی شجاعت کے نشہ میں اس قدر سرشار تھے کہ ان کا دعویٰ تھا کہ اگر آسمان بھی گرنے لگے تو وہ اپنے نیزوں کی نوک پر اس کو روک لیں گے، سجمنڈ نے اپنی مملکت سے جس قدر فوج ممکن تھی، فراہم کی اور امیر ولاچیا کو بھی اس صلیبی اتحاد میں شریک ہونے پر آمادہ کیا، حالاں کہ تھوڑے ہی دنوں پہلے ولاچیا اور دولت عثمانیہ میں صلح ہو چکی تھی اور امیر ولاچیا سالانہ خراج ادا کرنے کا معاہدہ کر کے اپنی خود مختاری برقرار رکھ سکا تھا، مسیحی فوجوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ تھی۔[1]

ابتدائی فتوحات | اتحادی فوجیں بودا واقع ہنگری میں اکٹھا اور وہاں سے کچھ ٹرانسلوینیا اور ولاچیا کی راہ سے اور کچھ سرویا کے راستہ سے عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ ہوئیں، چوں کہ سرویا کا بادشاہ بایزید کا حلیف تھا اور کامل وفاداری کے ساتھ اپنے معاہدہ پر قائم تھا، اس لیے ان مسیحی مجاہدوں نے سرویا کے باشندوں کے ساتھ بھی جو تمام تر عیسائی ہی تھے،

---

[1] گبن، جلد ۳، ص ۳۸۸۔

وحشیانہ قتل و غارت گری کا وہی سلوک کیا جو وہ ترکوں کے ساتھ کرتے، سب سے پہلے سجمنڈ نے ویدین پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے سسٹووا اور ارسووا پر قبضہ کرتا ہوا نائکوپولس کی طرف بڑھا، نائکوپولس پہنچ کر فوراً اس کا محاصرہ کر لیا، نائکوپولس کے کمانڈر یوغلان بے نے ہتھیار ڈال دینے سے انکار کر دیا اور محاصرہ کی انتہائی شدت کے باوجود حیرت انگیز شجاعت کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا، اسے یقین تھا کہ بایزید اس کی مدد کو ضرور پہنچے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بایزید جو اس درمیان میں اپنی بہترین فوج کے ساتھ روانہ ہو چکا تھا، برق سرعت کے ساتھ محاصرہ کے سولہویں دن نائکوپولس پہنچ گیا۔

مسیحی لشکر میں قمار بازی اور مے خواری کا ایک ہنگامہ برپا تھا، اس نشہ کو ابتدائی فتح کے جرأت نے اور بھی تیز کر دیا تھا، عیسائیوں خصوصاً فرانسیسیوں کو گمان بھی نہ تھا کہ بایزید اس قدر جلد آ پہنچے گا، وہ علانیہ کہتے تھے کہ اسے ان کے مقابلہ میں آبنائے باسفورس کے عبور کرنے کی بھی جرأت نہ ہوگی، وہ ترکی فوجوں کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے تھے اور انہیں اپنا حریف مقابل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کو اپنی کامیابی کا اس درجہ یقین تھا کہ انہوں نے یہ دریافت کرنے کی بھی مطلق فکر نہ کی کہ ترک آ تو نہیں رہے ہیں، ان مجاہدین صلیب کے ساتھ ان کی طوائفیں بھی آئی تھیں[1] جن کی عشوہ طرازیوں نے فوجی کیمپ کو نشاط محل بنا رکھا تھا۔

معرکۂ نائکوپولس | ۲۳ ذی قعدہ ۷۹۸ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۱۳۹۶ء کو کاؤنٹ ڈی نیورس اپنے فرانسیسی ساتھیوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً اسے یہ اطلاع ملی کہ ترکی فوج قریب آ گئی، سب کے سب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑائی کے لیے ہتھیار باندھنے لگے، وہ چاہتے تھے کہ بلا تاخیر ترکوں پر حملہ کر دیں، سجمنڈ عثمانیوں کے اصول جنگ سے واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ سب سے آگے بے قاعدہ اور غیر مرتب دستے ہوتے ہیں جو

---

[1] ایورسلے، ص ۴۹۔

دشمن کے پہلے حملے کا زور توڑنے کے لیے آگے رکھے جاتے ہیں، اصلی اور باقاعدہ فوج ان کے پیچھے ہوتی ہے، اسی بناء پر اس نے فرانسیسی فوج کو مشورہ دیا کہ ان بے قاعدہ سواروں پر حملہ کر کے اپنی قوت کو ضائع نہ کریں، بعض فرانسیسی کمانڈروں نے اس رائے سے اتفاق کیا لیکن دوسروں نے اس بدگمانی کی بناء پر کہ سجمنڈ پہلے خود حملہ کرنا چاہتا ہے، یہ گوارا نہیں کیا کہ فرانسیسی دستے ہنگری کی فوج سے پیچھے رہیں اور اس مشورہ کی مخالفت کی، فرانس کے نوعمر بہادروں نے بھی اس رائے کی پرجوش مخالفت کی اور اسی جوش میں ان ترک قیدیوں کو جو ان کے قبضہ میں تھے اور جنہوں نے امن کے وعدے پر ہتھیار ڈالے تھے، قتل کر ڈالا۔

بایزید نے عیسائی لشکر سے تھوڑے فاصلہ پر اپنی خاص فوج کو روک کر پہلے بے قاعدہ فوج دشمن کے مقابلہ میں روانہ کی اور ان کی مدد کے لیے ینی چری اور سواروں کا ایک دستہ آگے بڑھایا، فرانس کے نوعمر نائٹ ترکوں کے اصولِ جنگ سے بالکل ناواقف تھے، وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ عثمانیوں کی اصلی فوج بے قاعدہ فوج کے پیچھے ہوتی ہے، سجمنڈ نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر انہوں نے اس کی ایک نہ سنی اور پوری قوت کے ساتھ ترکوں کے مقدمۃ الجیش پر ٹوٹ پڑے، آسانی کے ساتھ اسے شکست دیتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور پھر ینی چری اور سواروں کی صفوں کو چیرتے ہوئے جنہیں بایزید نے پہلے روانہ کر دیا تھا، اسی جوش میں اتنی دور نکل گئے کہ باقی ماندہ اتحادی فوجوں سے ان کا تعلق تقریباً منقطع ہو گیا، دفعۃً انہیں بایزید کی چالیس ہزار بہترین فوج نظر آئی، جسے دیکھتے ہی ان کو اپنی شدید غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے فوراً واپس ہونے کی کوشش کی، مگر واپسی اب ان کے اختیار سے باہر تھی، آگے سلطان کی تازہ دم فوج تھی اور پیچھے سے دو ترکی دستے جنہیں وہ منتشر کر چکے تھے، دوبارہ جمع ہو کر ان کی طرف بڑھ رہے تھے، یہ دیکھ کر کہ اب جان بچانا کسی طرح ممکن نہیں، وہ مایوسانہ طور پر نہایت بے جگری سے لڑے اور ان چھ ہزار بہادروں میں سے تقریباً سب کے سب مارے گئے، جو بچ رہے وہ قید کر لیے گئے، صرف چند ایسے تھے جو بھاگ کر عیسائی لشکر میں پہنچ سکے، اس کے بعد

بایزید بجسمنڈ کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا، اسے دیکھتے ہی اتحادی فوجوں کے دونوں بازو فرار بھاگ کھڑے ہوئے، البتہ قلب لشکر نے جو ہنگری، بوہیمیا اور اسٹائریا کے دستوں پر مشتمل تھا اور جس کی کمان خود بجسمنڈ کے ہاتھ میں تھی، جم کر مقابلہ کیا لیکن یہ جنگ تین گھنٹے سے زیادہ قائم نہ رہ سکی، اتحادیوں کو بری طرح شکست ہوئی، ان کے ہزاروں سپاہی کام آئے اور دس ہزار گرفتار کر لیے گئے، بجسمنڈ چند سرداروں کے ساتھ بمشکل جان بچا کر بھاگا، اس جنگ میں اسٹیفن کی سروی فوج سے جو بایزید کی حمایت میں لڑ رہی تھی، عثمانی فوج کو بڑی مدد پہنچی۔

فتح کے بعد بایزید نے میدان جنگ کا معائنہ کیا، اس وقت اسے مقتول ترکوں کی تعداد کا اندازہ ہوا، نیز یہ معلوم کر کے کہ ابتدائے جنگ میں جن ترکوں نے مغلوب ہو کر جان بخشی کے وعدہ پر ہتھیار ڈال دیے تھے، انہیں بھی عیسائیوں نے نقض عہد کر کے قتل کر ڈالا، اس کا رنج وغصہ اور بھی زیادہ ہوا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ ان کے خون کا بدلہ عیسائی قیدیوں سے لے کر رہے گا، چنانچہ دوسرے روز صبح کو اس نے تمام عیسائی قیدیوں کو جن کی تعداد دس ہزار تھی، اپنے سامنے کھڑا کر کے ان کے قتل کا حکم دیا، قیدیوں میں کانٹ ڈی نیورس بھی تھا، بایزید نے اسے قتل سے مستثنیٰ کر دیا اور اسے اجازت دی کہ قیدیوں میں سے چوبیس عیسائی شرفا کو منتخب کر لے اور ان سب کی بھی جان بخشی کر دی، اس کے بعد قتل شروع ہوا جو چار بجے شام تک جاری رہا، جب ہزاروں قتل ہو چکے تو امرائے سلطنت کی درخواست پر بایزید نے جلادوں کو ہاتھ روکنے کا حکم دیا اور جو قیدی بچ رہے تھے ان میں سے ایک خمس سلطان کا حصہ علاحدہ کرنے کے بعد بقیہ ان مسلمان سپاہیوں کو تقسیم کر دیے، جنھوں نے ان کو جنگ میں گرفتار کیا تھا، کانٹ ڈی نیورس اور اس کے چوبیس ساتھی ایک سال تک زیر حراست رہے لیکن بایزید نے ان کی حیثیت کے مطابق انہیں عزت واحترام کے ساتھ رکھا، اور جب ان کا زرفدیہ فرانس سے آ گیا تو انہیں وطن جانے کی اجازت دے دی، رخصت کے وقت جب یہ لوگ بایزید کے لطف وعنایت اور حسن سلوک کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس

کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس نے جان کانٹ ڈی نیورس کو مخاطب کر کے یہ تقریر کی:

> ”جان! مجھے خوب معلوم ہے کہ تو اپنے ملک میں ایک بڑا سردار اور ایک طاقت ور رئیس کا لڑکا ہے، تو نوجوان ہے اور ابھی تیرے لیے امید کے بہت سے سال باقی ہیں، ممکن ہے کہ میدان جنگ میں تیری اس پہلی کوشش کی ناکامی پر لوگ تجھے قابل الزام ٹھہرائیں اور تو اس اتہام کو رفع کرنے اور اپنی شہرت و نیک نامی کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے ایک طاقت ور فوج اکٹھا کر کے میرے مقابلہ میں جنگ کے لیے آئے، اگر میں تجھ سے ڈرتا تو تجھ سے اور تیرے ساتھیوں سے تیرے ایمان اور عزت پر حلف لے لیتا کہ نہ تو اور نہ وہ کبھی میرے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائیں گے لیکن نہیں، میں ایسی حلف کا مطالبہ نہ کروں گا، برخلاف اس کے میں خوش ہوں گا، اگر تو اپنے ملک میں واپس پہنچ کر ایک فوج جمع کرے اور اسے لے کر یہاں آئے تو مجھے ہمیشہ میدان جنگ میں اپنے مقابلہ کے لیے تیار پائے گا، جو بات میں اس وقت کہہ رہا ہوں اسے تو جس شخص سے بھی چاہے نقل کر دینا کیوں کہ میں ہمیشہ جنگی کارناموں نیز اپنی فتوحات کی توسیع کے لیے تیار اور خواہش مند رہتا ہوں۔“[1]

کانٹ ڈی نیورس اور اس کے ساتھیوں میں سے صرف ایک نائٹ مارشل بوسیکا (Boucicaul) نے بایزید کی یہ دعوت قبول کی، وہ ۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں چند جہاز اور بارہ سو نائٹ اور پیدل فوج لے کر قسطنطنیہ پہنچا اور شہنشاہ کو شہر کی مدافعت میں مدد دی، اس کے علاوہ کسی اور کو بایزید کے مقابلہ میں آنے کی پھر کبھی ہمت نہ ہوئی۔

مزید فتوحات | جنگ نائیکوپولس کے بعد عثمانی فوجوں نے ولاچیا، اسٹائریا اور ہنگری پر حملے شروع کیے اور پیٹروارڈین کے شہر پر قبضہ کر لیا، ایک ترکی دستہ نے سرمیا پر یورش کی اور ساحل ڈینوب کے جو قلعے عیسائیوں نے لے لیے تھے ان کو دوبارہ حاصل کیا، بایزید خود بوڈا پر چڑھائی کی تیاری کر رہا تھا لیکن دفعتہً بیمار پڑ گیا اور ہنگری کی یہ مہم ملتوی کر دی گئی۔

---

[1] کریسی، جلد ا، ص ۴۸۔

یونان کی فتح اس کے بعد بایزید اورنہ کو واپس ہوا اور وہاں پہنچ کر مینوئل شہنشاہ قسطنطنیہ کو مجبور کیا کہ جان کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جائے، ۸۰۰ھ (۱۳۹۷ء) میں دو دفعہ یونان پر حملہ آور ہوا اور آسانی کے ساتھ تھسلی، فوسیس، ڈورلیس اور لوکریس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد اس کے دو جنرلوں یعقوب اور افرینوس نے خاکنائے کورنتھ کو طے کر کے جنوب کا رخ کیا اور تمام موریا کو فتح کر لیا، موریا کے تیس ہزار یونانی باشندے بایزید کے حکم سے ایشیائے کوچک میں منتقل کر دیے گئے اور ان کی جگہ ترکوں کی نو آبادیاں قائم کر دی گئیں، موریا پر تھیوڈور پلیولوگس شہنشاہ قسطنطنیہ کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا، اس نے بایزید کی سیادت قبول کر لی اور دولت عثمانیہ کا باج گزار بن گیا۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ یونان کی فتح کے بعد بایزید پھر اورنہ لوٹ آیا اور اب اس نے قسطنطنیہ پر فوراً قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا، اس سے قبل بھی وہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کر چکا تھا اور شہنشاہ کو اپنا پایہ تخت محفوظ رکھنے کے لیے بہت سخت شرائط پر دس سال کے لیے صلح کر لینی پڑی تھی لیکن اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے ہی یونان کی فتح سے فارغ ہو کر بایزید پھر قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے ایک خاص ایلچی کے ذریعہ سے شہنشاہ کے پاس یہ پیام بھیجا کہ وہ تاج و تخت سے دست بردار ہو جائے ورنہ شہر بزور شمشیر فتح کر لیا جائے گا اور اس وقت وہاں کے باشندے رحم و کرم کے مستحق نہ سمجھے جائیں گے، اس نے یہ بھی کہلایا کہ قسطنطنیہ کے معاوضہ میں شہنشاہ اپنے لیے کوئی دوسری حکومت پسند کر لے جو اسے دے دی جائے گی، قسطنطنیہ کے باشندے بایزید کی قوت سے واقف ہونے کی وجہ سے چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو جنگ کی نوبت نہ آنے دیں لیکن جان کو امید تھی کہ عیسائی حکومتیں قسطنطنیہ کی مخالفت میں اس کی مدد سے دریغ نہ کریں گی، اس لیے اس نے ایلچی کو یہ جواب دے کر رخصت کر دیا "اپنے آقا سے کہہ دو کہ باوجود اس کے کہ ہم ضعیف و ناتواں ہیں، ہم خدا کے سوا کسی دوسری طاقت سے نہیں ڈرتے، وہی کم زور کی حفاظت کرتا ہے اور طاقت ور کا

غرور توڑتا ہے، سلطان کو اختیار ہے، جو چاہے کرے" اس جواب کے بعد بایزید نے فوراً قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا، اسی محاصرہ کے دوران میں مارشل بوسیکا شہنشاہ کی مدد کے لیے فرانس سے آیا تھا۔

حالات کا انقلاب: لیکن عین اس وقت جب بایزید قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا، اس کے ایشیائی مقبوضات میں نہایت انقلاب انگیز حالات رونما ہو رہے تھے، جن سے مجبور ہو کر اسے محاصرہ اٹھا لینا پڑا، اب تک بارہ سال کی مدت حکومت میں جو مسلسل جنگوں پر مشتمل تھی، بایزید کو ہمیشہ کامیابی ہوتی گئی، اس نے ایشیائے کوچک کے بڑے حصے مقدونیہ، شمالی بلغاریا اور تھسلی کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اور سلطنت بازنطینی سرویا، ولاچیا، بوسنیا اور یونان کے بیشتر حصہ کو دولت عثمانیہ کا باج گزار بنا لیا تھا، نائکوپولس کے میدان میں اس نے یورپ کی متحدہ اور بہترین فوجوں کو نہایت سخت شکست دے کر صلیبی اتحاد کی قوت کو پاش پاش کر ڈالا تھا، اس وقت تک کسی جنگ میں اسے ناکامی نہیں ہوئی تھی لیکن آئندہ دو سالوں میں جو اس کی حکومت کے آخری سال تھے، اسے اتنی زبردست شکست اٹھانی پڑی کہ اس کی تمام فتوحات پر پانی پھر گیا اور کچھ دنوں کے لیے سلطنت عثمانیہ کی عظمت خاک میں مل گئی، خود بایزید کا خاتمہ بھی قید کی حالت اور بے کسی کے عالم میں ہوا، اس تباہی اور بربادی کا سبب وہ آویزش ہوئی جو بایزید اور تیمور کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔

تیمور: تیمور کی سلطنت دیوار چین سے لے کر ایشیائے کوچک کی سرحد تک اور بحر ارال سے دریائے گنگا اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی، اس کی زندگی کے ابتدائی سال اپنے ہمسایہ تاتاری امراء سے جنگ کرنے میں گزرے، پینتیس سال کی عمر میں اس نے سب کو زیر کر کے سمرقند کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اس کے بعد فتوحات کا وہ سلسلہ شروع کیا جس کی وسعت کے سامنے سکندر، سیزر، اٹیلا، چنگیز خاں، شارلیمین اور نپولین کی سلطنتیں حقیر معلوم ہوتی تھیں، اس نے پینتیس سال سے کم مدت میں ستائیس مملکتیں فتح کر لی تھیں اور نو شاہی

خاندانوں کو فنا کر دیا تھا، اس کی یہ حیرت انگیز جہاں گیری صرف ذاتی شجاعت اور اعلیٰ فوجی قابلیت کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اس کے تدبر اور ملکہ حکم رانی کو بھی اس میں بہت کچھ دخل تھا، اس کا مجموعۂ قوانین جسے اس نے فوج، عدالت اور مالیہ کے انتظام کے لیے مرتب کرایا تھا، اس کے تدبر اور صحیح غور و فکر کا ثبوت پیش کرتا ہے، اس کے جاسوس مختلف بھیسوں میں خصوصاً زائرین اور درویشوں کے لباس میں ہر طرف گھومتے رہتے تھے اور ان کی مکمل رپورٹیں احتیاط کے ساتھ دفتر میں درج کی جاتی تھیں، اس طرح تیمور کو اپنے دشمنوں کی قوت اور کمزوری کی صحیح اطلاع بہم پہنچتی رہتی تھی، اسے اپنے سپاہیوں پر اس قدر اقتدار حاصل تھا کہ وہ اس کے حکم پر نہ صرف بڑی سے بڑی سختی برداشت کرنے اور اپنی جانیں نثار کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے بلکہ عین فتح کے موقع پر اگر وہ حکم دیتا تو لوٹ مار سے بھی ہاتھ کھینچ لیتے اور مال غنیمت سے دست بردار ہو جانے میں مطلق پس و پیش نہ کرتے، اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس کا سلوک شریفانہ اور فیاضانہ تھا لیکن جو لوگ اس کی مخالفت کرتے انہیں سخت سزائیں دیتا، جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے:

> ”تیمور نے وحشت انگیزی کو بھی فتح کا ایک خاص ذریعہ بنا رکھا تھا اور جو سزائیں وہ پوری پوری آبادیوں کو دیتا ان سے اکثر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی فوری اشتعال کا نتیجہ نہ تھیں، بلکہ پہلے سے سمجھ بوجھ کر طے کر لی گئی تھیں۔“

جنگ نائکوپولس کے بعد بایزید کے بعض فوجی افسروں نے ایشیائے کوچک کے مشرق میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تھا، جس کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کی سرحد جارجیا تک پہنچ گئی تھی، ادھر تیمور کی حکومت اس سے پہلے ہی جارجیا اور بحر کاسپین کے دوسرے مغربی ممالک میں قائم ہو چکی تھی، دونوں سلطنتوں کے ہم سرحد ہو جانے کی وجہ سے ان کے درمیان جلد یا بدیر تصادم کا واقع ہونا ناگزیر تھا، تیمور کی سلطنت کے بعد بایزید ہی کی سلطنت اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت تھی، بایزید اپنی سابق فتوحات

کے نشہ میں اتنا سرشار تھا کہ اس نے تیمور کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کیا اور ایک ایسے فاتح کو برانگیختہ کر دیا جس کے نام کی دہشت سے بڑے بڑے بادشاہوں کے تخت متزلزل ہو جاتے تھے، سرحدی جھگڑوں کے علاوہ آویزش کے اور بھی اسباب تھے، مثلاً ایک دوسرے کے باج گزار رئیسوں کو حملہ کی دھمکی دینا اور ایک دوسرے کے باغیوں کو پناہ دینا، باغیوں سے مراد وہ امراء تھے جن کی ریاستوں پر بایزید نے قبضہ کر لیا تھا اور وہ بھاگ کر تیمور کے پاس پناہ گزیں ہوئے تھے، اسی طرح وہ امراء بھی باغی سمجھے جاتے تھے جن کی ریاستیں تیمور نے فتح کر لی تھیں اور جنہیں بایزید نے اپنے دربار میں پناہ دی تھی، یہ لوگ اپنی ریاستوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے تیمور اور بایزید کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، اسی سلسلہ میں دونوں کے درمیان نہایت تلخ خط و کتابت شروع ہوئی اور بالآخر نوبت جنگ کی آ گئی۔

سیواس | ۸۰۳ھ (۱۴۰۰ء) میں تیمور نے آرمینیا کی طرف سے عثمانی سرحد میں داخل ہو کر سیواس کا محاصرہ کر لیا جو چند سال پہلے بایزید کے قبضہ میں آیا تھا، اس شہر کی دیواریں نہایت مضبوط تھیں اور ترکی دستے نے بایزید کے سب سے بڑے لڑکے ارطغرل کی سرکردگی میں اس کی محافظت بھی ایسی جاں بازی کے ساتھ کی کہ تیمور کی سات آٹھ لاکھ فوج شروع میں کامیاب نہ ہو سکی لیکن آخر میں تیمور نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس کا جواب محصورین کے پاس نہ تھا، اس نے چھ ہزار مزدور لگا کر دیواروں کی بنیادیں کھدوانا شروع کر دیں اور اس درمیان میں شہتیروں کی تھونی لگا کر دیواروں کو گرنے سے روکے رکھا، جب کھدائی کا کام پورا ہو گیا اور بنیادوں کے اندر بڑی بڑی سرنگیں تیار ہو گئیں تو شہتیروں میں آگ لگوا دی اور تمام دیواریں دیکھتے دیکھتے ان ہی سرنگوں میں بیٹھ گئیں، حملہ آوروں کے لیے اب کوئی روک نہ تھی اور شہر پر فوراً قبضہ ہو گیا، تیمور نے سیواس کے اس محافظ دستے سے دل کھول کر انتقام لیا، ان میں سے چار ہزار آرمینیوں کو اس نے زندہ دفن کرا دیا اور ارطغرل اور بقیہ ترک سپاہیوں کو قتل کر دیا۔

بایزید اس وقت قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، سیواس کے مفتوح ہونے اور ارطغرل کے قتل کی خبر سن کر وہ فوراً وہاں سے روانہ ہوا اور تیمور کے مقابلہ کے لیے ایشیائے کوچک پہنچا لیکن تیمور اس درمیان میں شام اور مصر کی طرف روانہ ہو چکا تھا، دو سال کے بعد وہ پھر لوٹا اور سیواس پہنچنے کے بعد بایزید اور اس کے درمیان خط و کتابت دوبارہ شروع ہوئی جو پہلے سے بھی زیادہ تند اور تیز تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ فریقین نے ایک فیصلہ کن جنگ کا عزم کر لیا۔

جنگ انگورہ | بایزید ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ تیمور کے مقابلہ کے لیے سیواس کی طرف بڑھا لیکن تیمور کی کثیر فوج کے لیے جس کی تعداد و سات آٹھ لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہے، سیواس کا میدان تنگ تھا، اس لیے وہ بایزید کے پہنچنے سے پہلے ہی انگورہ کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچ کر فوراً انگورہ کا محاصرہ کر لیا، اسے یقین تھا کہ بایزید انگورہ کو بچانے کی ضرور کوشش کرے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور محاصرہ کی اطلاع پا کر بایزید نے بجائے سیواس جانے کے فی الفور انگورہ کی طرف کوچ کر دیا، وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ تیمور شہر کے شمال مغرب کی جانب جو فوجی نقطۂ نظر سے میدان کا بہترین حصہ ہے، اس کا انتظار کر رہا ہے، تیمور نے صرف یہی نہیں کیا کہ میدان کے اس حصہ پر قبضہ کر لیا بلکہ اس نے بایزید کے مقابلہ کے لیے دیگر تمام ضروری اور احتیاطی تدبیریں بھی کر لی تھیں، وہ بایزید کی قوت سے پوری طرح واقف تھا، اس لیے ہر ممکن طریقہ سے اسے کمزور کرنے کے ذرائع اختیار کر چکا تھا، بایزید کی فوج میں ایک بڑی تعداد تاتاریوں کی بھی تھی، تیمور کے خفیہ ایجنٹ بھیس بدل کر عثمانی لشکر میں جاتے تھے اور ان تاتاریوں کو اندر اندر بایزید کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کی عصبیت برانگیختہ ہو گئی اور وہ عین جنگ کی حالت میں لوٹ کر تیمور کی فوج سے جا ملے، بایزید کی جزری اور بخل کی وجہ سے فوج میں پہلے ہی سے بددلی پھیلی ہوئی تھی، جسے تیمور کے جاسوسوں کی ریشہ دوانیوں نے اور بھی تیز کر دیا تھا، عثمانی فوج کے افسروں نے یہ حالت دیکھ کر بایزید کو جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر اس نے مطلق

التفات نہ کیا اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں تیمور کی فوجی طاقت کا صحیح اندازہ بھی نہ کر سکا، اس نے یہ بھی نہ کیا کہ اس موقع پر فراخ دلی سے کام لے کر سپاہیوں کو انعام و اکرام سے خوش کرتا، برخلاف اس کے تیمور کے مقابلہ میں محض اپنی شانِ استغنا کا مظاہرہ کی غرض سے وہ انگورہ پہنچنے کے بعد ایک روز پوری فوج کو ساتھ لے کر شکار کے لیے روانہ ہو گیا، جس مقام پر یہ شکار طے پایا تھا وہاں پانی بہت کم تھا اور پانچ ہزار عثمانی سپاہی پیاس کی شدت سے مر گئے، جو باقی رہ گئے وہ بھی گرمی اور پیاس کی تکلیف سے بہت خستہ ہو رہے تھے۔

بایزید جب شکار سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی لشکر گاہ پر تیمور کا قبضہ ہے اور جس چشمہ سے عثمانی فوج پانی لے سکتی تھی، اس کا رخ بھی تاتاریوں نے پھیر دیا ہے، جس کی وجہ سے پانی بہت کم دست یاب ہو سکتا ہے، حالات کی نامساعدت میں اس واقعہ نے اور بھی اضافہ کیا، بایزید کے لیے اب بلا تاخیر جنگ شروع کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ چہار شنبہ ۱۷ ذی الحجہ ۸۰۴ھ (۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء) کو وہ فیصلہ کن معرکہ پیش آیا جس نے بقول گبن تیموری شہرت و عظمت کو حیات ابدی بخش دی اور بایزید کی ذلت و رسوائی کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا، لڑائی طلوع فجر سے قبل شروع ہو گئی تھی اور غروب آفتاب کے بعد تک جاری رہی، اس روز بایزید نے سپہ گری اور سپہ سالاری کے جوہر خوب خوب دکھائے، اس کی خاص فوج نے بھی غیر معمولی شجاعت سے کام لیا اور نہایت جان بازی کے ساتھ تاتاریوں کا مقابلہ کرتی رہی لیکن تیمور کی فوجی قابلیت اور اس کی فوج کی کثرت کے سامنے بایزید کی ساری کوششیں بے سود نظر آنے لگیں، علاوہ بریں سب سے زیادہ نقصان اسے خود اپنے سپاہیوں سے پہنچا، اس کی فوج کے تاتاری دستے پہلے ہی سے غداری کے لیے آمادہ تھے، وہ لڑائی شروع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد تیمور کی فوج سے جا ملے، اناطولیہ کی ترکی ریاستوں مثلاً ایدین، منتشا، صاروخان اور کرمیان کے دستے بھی جن کو بایزید نے بجبر اپنی فوج میں بھرتی کیا تھا، عین موقع پر غدار ثابت ہوئے اور سب

کے سب بھاگ کر اپنے اپنے امیروں کے علم کے نیچے پہنچ گئے، جو تیموری فوج میں بایزید کے فوج کے خلاف لڑ رہے تھے، البتہ اسٹیفن اپنے سروی دستوں کے ساتھ وفاداری اور جاں بازی کا حق ادا کرتا رہا لیکن لڑائی ختم ہونے سے پہلے ہی اسے بھی راہ فرار اختیار کرنی پڑی، اب صرف بایزید دس ہزار ینی چری کے ساتھ میدان میں باقی رہ گیا تھا، اس مختصر فوج نے سات آٹھ لاکھ تاتاریوں کے مقابلہ میں جیسی حیرت انگیز شجاعت کا ثبوت دیا، اس کی مثال خود ینی چری کی تاریخ میں کم نظر آتی ہے لیکن آخر کار گرمی اور پیاس کی شدت نے ان کے بازو کمزور کر دیے اور تاتاریوں کی کثرت غالب ہو کر رہی، بایزید کے بعض افسروں نے لڑائی کی حالت دیکھ کر چند گھنٹے پیشتر ہی اسے میدان جنگ چھوڑنے کی رائے دی تھی لیکن اس نے اس مشورہ کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا، اب جب کہ وقت نکل چکا تھا، بایزید نے بھاگنے کی کوشش کی مگر محمود خان چغتائی نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا، اس کے پانچ لڑکوں میں سے جو لڑائی میں شریک تھے، تین دشمن کی زد سے بچ کر نکل گئے، شہزادہ سلیمان نے یورپ کا رخ کیا، شہزادہ محمد نے اماسیہ پہنچ کر دم لیا اور شہزادہ عیسیٰ کرمانیہ کی طرف بھاگا، شہزادہ موسیٰ گرفتار ہوا، پانچویں لڑکے شہزادہ مصطفیٰ کا حشر معلوم نہ ہو سکا، ممکن ہے لڑائی میں مارا گیا ہو، بہر حال وہ ایسا غائب ہوا کہ کسی کو اس کا سراغ نہ ملا۔

قیدی سلطان آل تیمور کا مورخ شرف الدین علی بیان کرتا ہے کہ جب بایزید قیدی کی حیثیت سے دست بستہ تیمور کے سامنے لایا گیا تو تیمور نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اس کے ہاتھ کھلوا کر عزت و احترام کے ساتھ اپنے قریب بٹھایا، پھر اس کی حالت پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا کہ:

> ”اگرچہ احوال عالم تمام تر خداوند تعالیٰ کے ارادہ و قدرت کے مطابق پیش آتے ہیں اور کسی دوسرے کو حقیقتاً کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے تاہم انصاف اور حق یہ ہے کہ تم پر جو مصیبت آئی ہے، وہ خود تمہاری لائی ہوئی ہے، تم نے بارہا اپنے حد سے باہر قدم

> رکھنا اور بالآخر مجھے انتقام پر مجبور کر دیا، پھر بھی چوں کہ تم اس دیار میں کفار سے جہاد کر رہے تھے، میں نے بہت کچھ تحمل کیا اور ان حالات میں جو فرض ایک خیر اندیش مسلمان کا تھا، اسے بجا لایا، میری خواہش تھی کہ اگر تم فرماں برداری کی راہ اختیار کرو تو مال و لشکر کی جس قدر ضرورت تمہیں ہو اس سے تمہاری مدد کروں تاکہ تم اطمینان و قوت کے ساتھ جہاد میں مشغول رہ سکو اور دیارِ اسلام کے اطراف و اکناف سے بے دینوں کے شرک کی شوکت کو فنا کر دو ... لیکن تم نے سرکشی اور عناد اختیار کیا، حتیٰ کہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، سب جانتے ہیں کہ اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور یہ قوت و غلبہ جو خداوند تعالیٰ نے مجھ کو بخشا ہے تم کو حاصل ہوتا تو اس وقت مجھ پر اور میرے لشکر پر کیا گزرتی لیکن اس فتح کے شکرانے میں جو خدا کے فضل و عنایت سے مجھے حاصل ہوئی ہے، میں تمہارے اور تمہارے آدمیوں کے ساتھ بھلائی کے سوا کچھ نہ کروں گا، دل کو مطمئن رکھو[1]۔"

بایزید نے انفعال کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آئندہ کے لیے اطاعت کا وعدہ کیا، تیمور نے اسے خلعت شاہانہ پہنا کر مزید لطف و عنایت کی توقع دلائی، اس کی خواہش پر شہزادہ موسیٰ بھی جو قید میں تھا، آزاد کر کے اس کے پاس بھیج دیا گیا اور تیمور نے ان کے رہنے کے لیے اپنے خیمہ کے قریب ایک عالی شان خیمہ نصب کرایا اور بعض عالی مرتبت امراء کو ان کی خدمت میں مامور کیا، بروصہ سے جب حرم سلطانی لایا گیا تو تیمور نے شہزادی ڈسپینا اور اس کی لڑکی کو بھی بایزید کے پاس بھجوا دیا۔

بایزید کی موت لیکن یہ مراحم خسروانہ بایزید کے زخم دل کے لیے نمک کا کام دے رہے تھے اور شاہی خیمہ بھی اس کے لیے قید خانہ سے کم نہ تھا، اپنی سابق عظمت و سطوت کی یاد اسے کسی لمحہ چین نہیں لینے دیتی تھی، اضطراب یہاں تک بڑھا کہ اس نے آخرکار بھاگنے کا عزم کر لیا لیکن اس کی اس کوشش کی اطلاع تیمور کو ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ اب اس کی نگرانی سخت

---

[1] ظفر نامہ از مولانا شرف الدین علی یزدی، جلد دوم، ص ۳۳۹-۳۳۸، کلکتہ ۱۸۸۸ء۔

کے ساتھ کی جانے لگی، تاتاری لشکر جب ایک مقام سے دوسرے مقام کو کوچ کرتا تو تیمور بایزید کو بھی ساتھ لیتا جاتا لیکن تشہیر سے بچنے کے لیے بایزید ایک پالکی میں سفر کرتا تھا، جس پر پردہ پڑا رہتا تھا، اس پالکی میں لوہے کی جالی کا کام تھا، جس کی بنا پر مشہور ہو گیا کہ تیمور قیدی سلطان کو لوہے کے پنجرے میں بند رکھتا ہے اور جہاں جاتا ہے اپنے ساتھ اس پنجرے کو بھی لے جاتا ہے، بہرحال بایزید کے قلب و دماغ پر اپنی قید و رسوائی کا اس قدر جاں کاہ اثر پہلے ہی پڑ چکا تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک اسے برداشت نہ کر سکا اور صرف آٹھ مہینے بعد اس کی روح قفس عنصری اور قفس فولادی دونوں سے بیک وقت آزاد ہو گئی، تیمور کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اس فاتح کشورکشا کے لیے بھی جس نے لاکھوں انسانوں کو قتل کرا دیا اور دل میں تاثر کی خفیف سی لرزش بھی محسوس نہ کی، آل عثمان کے اتنے جلیل القدر سلطان کی یہ عبرت انگیز موت ایک دردناک واقعہ تھی، تیمور نے موسیٰ کو آزاد کر کے بایزید کی نعش شاہانہ احترام کے ساتھ بروصہ کو روانہ کی جہاں وہ سابق تاجداران عثمانی کے پہلو میں سپرد خاک کر دی گئی، خود تیمور بھی اس کے بعد دو ہی سال زندہ رہا۔

سلطنت عثمانیہ کا ظاہری خاتمہ جنگ انگورہ نے صرف بایزید کی زندگی کا خاتمہ نہیں کیا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ بھی نیست و نابود ہو گئی، تیمور نے ان تمام ترکی امیروں کو جن کی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئی تھیں، پھر ان کی حکومتوں پر برقرار کر دیا اور ایشیائے کوچک کا کوئی علاقہ آل عثمان کے ہاتھ میں باقی نہ رہا۔

محمد اوّل

۸۱۶ھ تا ۸۲۴ھ مطابق ۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۱ء

سلطنت کی حالت | بایزید کے انتقال کے وقت سلطنت عثمانیہ بظاہر فنا ہو چکی تھی، ایشیائے کوچک عثمانیوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا، اس کے کچھ حصے ترکی امیروں کے قبضہ میں واپس جا چکے تھے اور کچھ ابھی تک تاتاریوں کی قتل و غارت گری کی آماج گاہ بنے ہوئے تھے، یورپ میں بھی سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کی حالت امید افزا نہ تھی، بلغاریا، بوسنیا اور ولاچیا کی رعایا بغاوت کے لیے آمادہ تھی اور سلطنت بازنطینی اپنے مقبوضات کو واپس لینے کا حوصلہ کر رہی تھی لیکن پریشانی اور نا امیدی کے ان حالات میں بھی سلطنت عثمانیہ نے اپنی غیر معمولی قوت بقا کا ثبوت دیا اور دس بارہ سال کی قلیل مدت میں اس نے نہ صرف اپنے تمام قدیم مقبوضات واپس لیے بلکہ پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ رونما ہوئی۔

تیموری فوجوں نے ایشیائے کوچک کی غارت گری کے بعد دوسری سمت کا رخ کیا، ان کے واپس جانے کے بعد ایشیائے کوچک میں ان کا کوئی نشان باقی نہ رہا، میدان پھر عثمانیوں اور قدیم ترکی امیروں کی قوت آزمائی کے لیے خالی ہو گیا۔

شہزادوں کی باہمی جنگ | بایزید کے چھ لڑکوں میں سے پانچ اس کے ساتھ جنگ انگورہ میں شریک تھے، ان میں ایک مصطفیٰ نامی غالباً لڑائی میں مارا گیا تھا، دوسرا موسیٰ بایزید کے ساتھ گرفتار ہو گیا تھا، باقی تین جان بچا کر بھاگ گئے، ان میں سب سے بڑا لڑکا سلیمان

وزیر اعظم علی پاشا کو ساتھ لے کر اورنہ پہنچا اور بایزید کے انتقال کے بعد سلطنت عثمانیہ کے یورپی حصہ کا مالک بن بیٹھا اور اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، دوسرا لڑکا عیسیٰ بروصہ آیا اور اس نے وہاں بایزید کی جانشینی کا اعلان کر دیا، محمد سب سے چھوٹا لیکن سب سے لائق تھا، وہ ایشیائے کوچک کے شمال مشرق میں اماسیا کے چھوٹے سے علاقہ پر قابض ہو گیا، بایزید کے انتقال کے بعد ان تینوں میں سلطنت کے لیے کشمکش ہونے لگی، کچھ دنوں کے بعد چوتھا بھائی موسیٰ بھی جسے تیمور نے بایزید کی وفات پر رہا کر دیا تھا، تاج و تخت کے لیے قسمت آزمائی کرنے لگا۔

شروع میں محمد اور عیسیٰ کے درمیان جنگ چھڑی، محمد ایشیائی مقبوضات کو برابر برابر تقسیم کر لینا چاہتا تھا لیکن عیسیٰ پوری سلطنت کا دعوے دار تھا، جنگ میں عیسیٰ کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر سلیمان سے مدد طلب کرنے کے لیے یورپ پہنچا، سلیمان عیسیٰ کی حمایت میں فوج لے کر ایشیائے کوچک میں داخل ہوا، ابتدا میں محمد کو دشواری پیش آئی لیکن بالآخر اس نے موسیٰ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ یورپ میں داخل ہو کر سلیمان کے مقبوضات پر حملہ کر دے، یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور سلیمان عیسیٰ کو چھوڑ کر اپنے مقبوضات کی حفاظت کے لیے فوراً یورپ کی طرف روانہ ہوا، عیسیٰ کو شکست ہوئی اور وہ خدا جانے کہاں غائب ہو گیا اور پھر کہیں اس کا پتہ نہ چلا۔

یورپ میں سلیمان اور موسیٰ کے درمیان جنگ شروع ہوگئی، سلیمان کا برتاؤ اپنی فوج کے ساتھ بہت سخت تھا اور سپاہیوں میں اس کی طرف سے عام بیزاری پھیلی ہوئی تھی، اس کی سختی سے عاجز آ کر فوج باغی ہوگئی اور اسے قتل کر دیا، سلیمان کے قتل کے بعد موسیٰ اورنہ کے تخت کا مالک بن بیٹھا اور اس نے اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد موسیٰ نے قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاری شروع کی، شہنشاہ نے محمد سے مدد کی درخواست کی اور محمد اپنی ترکی فوج اور سرویا کے ایک دستے کے ساتھ شہنشاہ کی مدد کے لیے یورپ میں داخل ہوا، یہ بھی عجیب منظر تھا، ایک ترکی فوج موسیٰ کی سرکردگی میں قسطنطنیہ کا

محاصرہ کیے ہوئے تھی اور دوسری محمد کی قیادت میں قسطنطنیہ کی محافظت کر رہی تھی۔

آخر کار موسیٰ کو محاصرہ اٹھا کر پسپا ہونا پڑا، محمد نے اس کا تعاقب کیا، سرویا کی سرحد پر دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بہت قریب پہنچ گئیں اور جنگ کی نوبت آنے والی ہی تھی کہ موسیٰ کے فوجی سرداروں نے جو اس سے بہت نالاں تھے، بغاوت کا اعلان کر دیا اور پوری فوج محمد سے جا ملی، موسیٰ زخمی ہو کر بھاگا اور تلاش کے بعد اس کی نعش ایک دلدل میں پائی گئی۔

محمد کی تخت نشینی | تخت سلطنت کے لیے محمد کا کوئی حریف اب باقی نہیں رہا، اس کے سلطان ہونے کا اعلان کیا گیا اور ایشیا اور یورپ کی تمام رعایا نے اس کا خیر مقدم کیا، بہ حیثیت سلطان کے اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی لیکن اس مختصر مدت میں بھی اس نے غیر معمولی اہلیت کا ثبوت دیا، اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کے انتشار کا خاتمہ کیا بلکہ اپنی خداداد فوجی اور آئینی قابلیت سے دولت عثمانیہ کو ویسا ہی طاقت ور اور مستحکم بنا دیا جیسا کہ تیمور کے حملہ سے قبل وہ تھی، سلطنت کے استحکام کے لیے اس نے امن وصلح کو ضروری سمجھا اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر گرد و پیش کی تمام مملکتوں سے صلح کے معاہدے کیے، اس نے بازنطینی سلطنت کے چند مقبوضات شہنشاہ کو واپس کر دیے اور اس سے آخر وقت تک صلح قائم رکھی۔

لیکن کبھی کبھی اسے میدان جنگ میں آنے کے لیے بھی مجبور ہونا پڑا اور اس وقت اس نے ثابت کر دکھایا کہ تدبر اور نظم ونسق کی اہلیت کے علاوہ فوجی قابلیت میں بھی وہ اپنے کسی پیش رو سے کم نہیں ہے، کرمانیہ، کرمیان اور دوسری ترکی ریاستیں تیمور کے حملہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے آزاد ہو گئی تھیں، محمد نے ان سب کو تاتاریوں کی حمایت سے الگ کر کے دولت عثمانیہ کی فرماں روائی قبول کرنے اور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا، امیر کرمانیہ نے کئی بار بغاوت کی لیکن محمد نے ہر بار اسے شکست دے کر معاف کر دیا اور صرف اظہار اطاعت پر قناعت کر کے اس کی جان بخشی کی، اس نے درویشوں کے گروہ کو جس نے بہت زیادہ طاقت حاصل کر لی تھی اور آخر میں بغاوت کا اعلان کر دیا تھا، شکست دے کر اس فرقہ کا

استیصال کر دیا۔

ذاتی اوصاف محمد کے بلند اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کی شہادت دینے میں تمام مورخین متفق اللفظ ہیں، وہ بے حد کشادہ دل اور منصف مزاج تھا، اپنے وعدوں کو سخت پابندی سے پورا کرتا، اس کی عدالت میں ہر مذہب، ہر قوم اور ہر فرقہ برابر تھا، اس کی رعایا ہر جگہ خوش حال تھی، عیسائی رعایا کی بہبودی کا اسے خاص طور پر خیال رہتا تھا اور ان کے ساتھ وہ کسی قسم کی زیادتی کو روا نہ رکھتا تھا، اس نے ادب کی سرپرستی بڑی فیاضی سے کی اور اسی کے مختصر عہد حکومت میں شعر و شاعری کا مذاق عثمانیوں میں اول اول شروع ہوا۔

محمد نے اکتالیس سال کی عمر میں ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں وفات پائی اور بروصہ میں مسجد خضرا سے متصل جسے اس نے خود تعمیر کرایا تھا، دفن ہوا، یہ مسجد اسلامی طرز تعمیر اور سنگ تراشی کا بہترین نمونہ خیال کی جاتی ہے، محمد نے اس عظیم الشان مسجد کی تعمیر بھی مکمل کرائی جسے مراد اول نے بنوانا شروع کیا تھا لیکن بایزید کی بے توجہی کی وجہ سے نامکمل رہ گئی تھی، اس نے اپنی مسجد کے قریب ہی دو عمارتیں اور بنوائیں، ایک میں مدرسہ قائم کیا اور دوسری میں غریبوں کے لیے طعام خانہ۔

معیارِ عظمت اگرچہ دولت عثمانیہ کے اولین فرماں رواؤں میں صرف محمد ہی ایسا تھا جس کے عہد میں سلطنت کی توسیع نہیں ہوئی تاہم جنگ انگورہ کے بعد سلطنت عثمانیہ تباہی کی جس منزل پر پہنچ گئی تھی اور پھر گیارہ سال کی مسلسل خانہ جنگیوں سے جو مزید خطرات پیدا ہو گئے تھے، ان پر نظر رکھتے ہوئے محمد کا یہ کارنامہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں دکھائی دیتا کہ اس نے سلطنت کے کسی صوبے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور گو اس کے مختصر عہد حکومت میں ایشیائے کوچک کی ترکی ریاستوں پر پوری طرح قبضہ نہ ہو سکا پھر بھی اس نے ان سب کو زیر کر کے دولت عثمانیہ کے دامن سے وابستہ رکھا، اس کو بجا طور پر سلطنت کے بانیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

مراد ثانی

۸۲۴ھ تا ۸۵۵ھ مطابق ۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء

مراد اور مصطفیٰ کی جنگ سلطان محمد اول کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا مراد جو ایشیائے کوچک میں سلطان کا قائم مقام تھا، اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، محمد اول نے اپنے مختصر زمانہ حکومت میں تیموری حملہ کے تمام اثرات مٹا دیے تھے اور سلطنت کو گویا ازسرنو قائم کر کے مستقل و مستحکم بنا دیا تھا لیکن مراد کی نوعمری سے ان فرماں رواؤں کی ہمتیں بڑھ گئیں جن کو سلطان مرحوم نے اپنی قوت اور حکمت عملی سے سلطنت عثمانیہ کا حلیف و مطیع بنا لیا تھا، سب سے پہلے شہنشاہ قسطنطنیہ نے ان تمام احسانات کو فراموش کر کے جو محمد اول نے اس کے ساتھ کیے تھے، آل عثمان کے ساتھ اپنے قدیم بغض و عناد کی بنا پر مراد کی کم سنی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور مصطفیٰ نامی ایک شخص کو جو اپنے کو سلطان بایزید یلدرم کا لڑکا کہتا تھا اور تخت سلطنت کا دعوے دار تھا، مراد کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا، یہ وہی مصطفیٰ تھا جو سلطان محمد اول کے مقابلہ میں بھی آیا تھا اور بالآخر شکست کھا کر قسطنطنیہ میں پناہ گزین ہوا تھا اور جس کی نظر بندی کے معاوضہ میں شہنشاہ قسطنطنیہ سلطان سے ایک کثیر رقم ہر سال پاتا تھا، شہنشاہ نے اس معاہدہ کے ساتھ کہ بہ شرط کامیابی وہ گیلی پولی مع بحر اسود کے ساحل کے تمام بازنطینی شہر جو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے تھے، شہنشاہ کو واپس کر دے گا، مصطفیٰ کو رہا کر دیا اور اپنی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے روانہ کیا، مراد اس وقت ایشیائے کوچک میں تھا، اس نے مصطفیٰ

کے مقابلہ میں ایک فوج بایزید پاشا کی سرکردگی میں بھیجی لیکن یورپ میں ترکی افواج کا بیش تر حصہ مصطفیٰ کا طرف دار ہو گیا تھا، بایزید پاشا کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا، اس کے بعد مصطفیٰ شہنشاہ قسطنطنیہ کے فراہم کیے ہوئے جہازوں میں دردانیال کو عبور کر کے ایشیائے کوچک میں پہنچا، مراد نے بڑی لیاقت اور شجاعت سے اس کا مقابلہ کیا اور شکست دی، مصطفیٰ بھاگ کر گیلی پولی میں محصور ہو گیا۔ مراد نے گیلی پولی کو فتح کر کے مصطفیٰ کو گرفتار کر لیا اور اس کو سولی دے دی، اس طرح اس آخری فتنہ کا بھی خاتمہ ہو گیا جس کا سلسلہ بایزید یلدرم کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں کی باہمی آویزش اور قوت آزمائی سے شروع ہوا تھا۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ | مراد نے شہنشاہ کی اس غداری کے جواب میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کے محاصرہ کے لیے بیس ہزار فوج کے ساتھ پہنچ گیا، بازنطینیوں نے نہایت بہادری اور مذہبی جوش کے ساتھ ترکوں کا حملہ روکا، مراد نے اس محاصرہ میں جس غیر معمولی فوجی لیاقت کا ثبوت دیا، اس کی مثال اس عہد کی فوجی تاریخ میں شاذ و نادر ملتی ہے[1] قوی امید تھی کہ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہو کر رہے گا لیکن شہنشاہ نے ایسی تدبیر اختیار کی، جس سے مراد کو مجبوراً محاصرہ اٹھا کر اپنی سلطنت کی حفاظت کے لیے ایشیائے کوچک کا رخ کرنا پڑا، مراد کا ایک چھوٹا بھائی مصطفیٰ نامی تھا، قسطنطنیہ کے محاصرہ کے وقت وہ ایشیائے کوچک میں تھا، شہنشاہ نے کوشش کر کے اس کو مراد کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا، امیر کرمانیہ اور امیر کرمیان نے اس کی مدد کی اور مصطفیٰ نے ان کی مدد سے ایشیائے کوچک میں مراد کی ایک فوج کو شکست دے کر اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، یہ خبر سن کر مراد قسطنطنیہ کا محاصرہ چھوڑ کر فوراً ایشیائے کوچک پہنچا، مصطفیٰ کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ خود گرفتار کر لیا گیا، اس کے گرفتار کرنے والوں نے مراد کے علم و اجازت کے بغیر ہی وقت اس کو سولی پر چڑھا دیا۔

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۹۔

ترکی ریاستوں کی اطاعت اس فتنہ کو فرو کرنے کے بعد مراد ایشیائے کوچک کی ان ترکی ریاستوں کی طرف متوجہ ہوا، جو تیموری حملہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے بالکل آزاد ہو گئی تھیں اور اس کی بیخ کنی کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی تھیں، امیر کرمانیہ ان سب میں پیش پیش تھا، مراد کے خلاف مصطفیٰ کو کھڑا کرنے میں بھی زیادہ تر اسی کا ہاتھ تھا، اس کا یہ طرز عمل اس قدیم عناد پر مبنی تھا جو آلِ عثمان اور کرمانیہ کے درمیان ابتدا سے چلا آتا تھا، چنانچہ مراد نے اس کی سرکوبی کے لیے کرمانیہ پر حملہ کیا اور محمد بک کو قتل کر کے اس کے لڑکے ابراہیم کو وہاں کا امیر بنایا، اس نے کرمانیہ کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا، بلکہ صرف اس کے باج گزار ہونے پر قناعت کی، یہی معاملہ اس نے دوسری ریاستوں مثلاً کرمیان، قسطمونی، منتشا، صاردو خان اور حمید وغیرہ کے ساتھ بھی کیا اور ان سب کو سلطنت عثمانیہ کا مطیع اور باج گزار بنا لیا، اس طرح ایشیائے کوچک میں آلِ عثمان کا وہی اقتدار پھر قائم ہو گیا، جو جنگ انگورہ سے پہلے تھا، امیر قسطمونی باج گزار ہونے کے علاوہ اپنی نصف ریاست سے بھی سلطان کے حق میں دست بردار ہو گیا اور اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی، ۸۳۱ھ (۱۴۲۸ء) میں امیر کرمیان لاولد مر گیا، اس کی وصیت کے مطابق ریاست کرمیان سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئی۔

شہنشاہ سے صلح اور چند جدید مقبوضات ایشیائے کوچک میں امن و امان قائم کرنے کے بعد مراد ۸۲۷ھ (۱۴۲۴ء) میں یورپ کو واپس ہوا، اس درمیان میں شہنشاہ مینوئل کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا جان پلیو لوگس قسطنطنیہ کا فرماں روا تھا، مراد نے دوبارہ قسطنطنیہ کا محاصرہ نہیں کیا، بلکہ جان سے صلح کر لی، جان نے تیس ہزار دوکات سالانہ خراج دینے کا معاہدہ کیا اور زیمبریا اور درکوس کے سوا زیتون اور تمام دوسرے یونانی شہر جو دریائے استرانیا اور بحر اسود کے ساحل پر باقی رہ گئے تھے، سلطان کے حوالے کر دیے، یوں بازنطینی سلطنت کا خاتمہ چند دنوں کے لیے اور ملتوی ہو گیا۔

سالونیکا کی فتح سالونیکا بازنطینی سلطنت کا ایک مشہور اور نہایت اہم شہر تھا، گذشتہ

سو سال کے اندر یہ تین بار ترکوں کے قبضہ میں آیا لیکن کچھ دنوں کے بعد ہر بار یونانیوں نے اسے واپس لے لیا شہنشاہ جان کے دورِ حکومت میں اس کا حاکم شہنشاہ کا بھائی اینڈرونیکس تھا، اینڈرونیکس نے غداری کر کے اس شہر کو وینس کے ہاتھوں فروخت کر دیا، چوں کہ یہ مقدونیا کا ایک اہم شہر تھا اور اس سے قبل تین بار ترکوں کے قبضہ میں رہ چکا تھا، اس لیے مراد نے اس معاملۂ بیع کی مخالفت کی اور ۸۳۳ھ (۱۴۳۰ء) میں سالونیکا کو بہ زورِ شمشیر فتح کر کے مع اس کے ملحق علاقے کے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا۔

سرویا کی فتح | سالونیکا کی فتح کے بعد مراد اپنی سلطنت کی شمالی مغربی سرحد کی جانب متوجہ ہوا، ۸۳۰ھ (۱۴۲۰ء) میں اسٹیفن لازاریویچ شاہ سرویا کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ جارج برنکوویچ تخت نشین ہوا، اسٹیفن اس معاہدہ کے مطابق جو اس نے جنگ کسووا کے بعد بایزید یلدرم سے کیا تھا، ہمیشہ سلطنتِ عثمانیہ کا ایک وفادار حلیف رہا، اس نے اپنی بہن شہزادی ڈسپینا کو بایزید کے نکاح میں دے کر اس تعلق کو اور زیادہ مضبوط کر دیا تھا لیکن جارج کو مراد کے ساتھ کوئی ذاتی تعلق نہ تھا، اس نے تخت نشینی کے بعد سرویا میں ترکوں کے اقتدار کی مخالفت شروع کر دی، اس نے ترکوں کے خلاف ہنگری سے باہمی امداد کا معاہدہ کیا اور دریائے ڈینوب کے ساحل پر سمندریا میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا، مراد نے جارج کے معاندانہ ارادوں سے واقف ہو کر اس قلعہ کا مطالبہ کیا اور انکار پر جارج کے مقابلہ کے لیے بڑھا، سرویا کو شکست ہوئی اور پورے ملک پر ترکی افواج کا قبضہ ہو گیا، ۸۴۳ھ (۱۴۴۰ء) میں سرویا تمام تر ترکوں کے تسلط میں آ گیا[1]۔

عیسائی حکومتوں میں ایک نئی تحریک | ہنگری کو جنگ انگورہ کے بعد سلطنتِ عثمانیہ سے آزادی کا موقع مل گیا تھا اور وہ رفتہ رفتہ استحکام حاصل کرتا جاتا تھا، مراد کے ابتدائی دورِ حکومت میں وہ اتنی قوت حاصل کر چکا تھا کہ ترکی حملہ کی مدافعت کر سکے، سرویا پر ترکوں کا

---

[1] بلقان از ملر ص ۲۹۳۔

قبضہ ہو جانے کے بعد ہنگری کے سرحدی علاقوں میں دونوں سلطنتوں کے درمیان اکثر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، اہل بوسنیا بھی ترکوں کی قربت سے خائف تھے، البانیہ کو اپنی آزادی کی طرف سے خطرہ تھا اور ولاچیا جو سلطنت عثمانیہ کا باج گزار تھا، اپنی خودمختاری کے لیے بے تاب تھا، تاہم مراد کی تخت نشینی سے تقریباً بیس سال بعد تک ان مختلف عیسائی حکومتوں کے درمیان کوئی اتحاد قائم نہ ہو سکا اور ان میں سے ہر حکومت علاحدہ علاحدہ مراد سے جنگ اور صلح کرتی رہی لیکن جب ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ء) میں لاڈسلاس شاہ پولینڈ ہنگری کے تخت پر بیٹھا تو سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں کی قوت بہت کچھ بڑھ گئی اور ایک متحدہ مقابلہ کا حوصلہ ان میں پیدا ہوا، اس حوصلہ کا محرک حقیقتاً ایک فوجی سردار ہونیاڈے نامی تھا، جو حال ہی میں مغربی یورپ سے واپس آیا تھا اور جس کی غیر معمولی شجاعت کا شہرہ تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا، ہونیاڈے نے ہنگری پہنچ کر ترکوں کے مقابلہ کا بیڑا اٹھایا اور بیس سال تک برابر سلطنت عثمانیہ سے جنگ کرتا رہا۔

بلغراد ۸۴۶ھ (۱۴۴۲ء) میں مراد کو بلغراد کے حملے سے ناکام واپس ہونا پڑا، یہ دریائے ڈینوب کے ساحل پر سرویا کا ایک نہایت اہم شہر تھا لیکن ۸۳۰ھ (۱۴۲۷ء) سے ہنگری کا مقبوضہ تھا، ہنگری میں داخل ہونے کے لیے اس شہر کی فتح ناگزیر تھی، مراد نے اسی خیال سے اس کا محاصرہ کیا لیکن ہنگری کے عزم و استقلال کے مقابلہ میں آخرکار اسے شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔

ہونیاڈے کی کامیابی اسی زمانہ میں عثمانی جنرل مزید پاشا ٹرانسلوانیا میں ہرمان اسٹاٹ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، ہونیاڈے اس قلعہ کی مدد کے لیے بڑھا اور ایک مختصر فوج کے ساتھ ترکوں کے عظیم الشان لشکر کو شکست دی، اس معرکہ میں بیس ہزار ترک مارے گئے، ہونیاڈے نے مزید پاشا اور اس کے لڑکے کو اپنے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا، اس کی لہو کی پیاس کسی طرح بجھتی ہی نہ تھی، مقتولوں کی چیخ اور تڑپ میں اسے خاص لذت محسوس ہوتی تھی،

چنانچہ اس فتح کے بعد جب وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر دستر خوان پر بیٹھا تو اسی وقت ترک قیدیوں کو سامنے بلا کر سب کو نہایت بے دردی سے قتل کرا دیا، ہر فتح کے بعد جو دعوت ہوتی تھی اس میں مہمانوں کو یہ خونیں تماشا بھی ضرور دکھایا جاتا تھا، یہ ہونیاڈے اور ترکوں کا پہلا مقابلہ تھا، مراد نے اس شکست کی خبر سن کر اسی ہزار کی ایک دوسری فوج شہاب الدین پاشا کی سرکردگی میں روانہ کی، واز اگ سے مقابلہ ہوا اور ہونیاڈے نے عثمانی لشکر کو پھر شکست دی۔

صلیبی اتحاد ہونیاڈے کی شاندار کامیابی اور ترکوں کی پے در پے شکستوں سے یورپ کی تمام حکومتوں میں امید کی ایک لہر دوڑ گئی اور یورپ سے ترکوں کو نکال دینے کے لیے ایک زبردست عیسائی اتحاد قائم کر لیا گیا، شاہ لاڈسلاس جو اس وقت ہنگری اور پولینڈ دونوں مملکتوں کا فرماں روا تھا، اس تحریک کا روح رواں تھا، اس اتحاد میں ہنگری، پولینڈ، ولاچیا اور بوسنیا کی حکومتیں اپنی پوری قوت کے ساتھ شریک ہوئیں، سرویا بھی جو اسٹیفن کے عہد میں عثمانیوں کا نہایت وفادار حلیف تھا، اب اس کے جانشین جارج برنکووچ کی سرکردگی میں اتحادیوں کی صف میں شامل ہو گیا، فرانس اور جرمنی نے مبارزین کی ایک کثیر فوج بھیجی، اس کے علاوہ یورپ کے ہر ملک سے ایک بڑی تعداد سپاہیوں کی خود آ کر شریک ہوئی لیکن سب سے زیادہ جوش یورپ نے دکھایا، اس نے اپنے نمائندہ کارڈینل جولین سیزرائنی (Julian Cesurini) کو ایک مسلح فوج کے ساتھ روانہ کیا اور یورپ کے ہر حصہ سے اس جنگ کے لیے ایک کثیر رقم فراہم کر کے بھیجی، حقیقتاً یہ ایک صلیبی جنگ تھی، جو عیسائیت کے مذہبی جوش نے اسلام کے خلاف چھیڑی تھی، جمہوریہ وینس اور جمہوریہ جنوا نے بھی اپنے بحری بیڑوں سے مدد کی اور چوں کہ عثمانیوں کے پاس اس وقت تک کوئی بحری فوج نہ تھی، اس لیے خیال تھا کہ مراد کی خاص فوجیں ایشیائے کوچک سے جہاں وہ امیر کرمانیہ سے جنگ میں مصروف تھیں، یورپ میں منتقل نہ کی جا سکیں گی، اتحادی افواج بظاہر شاہ لاڈسلاس کے زیر کمان تھیں لیکن دراصل ان کا سردار ہونیاڈے تھا، جو اس وقت مسیحی دنیا کا سب سے بڑا جنرل خیال کیا جاتا تھا۔

ترکوں کی شکست مراد اس وقت کرمانیہ کی بغاوت کے سلسلہ میں ایشیائے کوچک میں تھا، اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر عیسائی لشکر نے ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) میں دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور نیش کے مقام پر عثمانی فوج کو شکست دی، اس کے بعد ہونیاڈے نے صوفیا پر قبضہ کر لیا اور پھر کوہ بلقان کو عبور کر کے فیلیوپولس پر حملہ کی تیاری شروع کی، کوہ بلقان کے دامن میں ترکوں نے ایک بار اور مقابلہ کیا لیکن اس مرتبہ بھی ان کو شکست ہوئی، عیسائیوں کے لیے میدان اب خالی تھا، مسلسل فتوحات سے ان کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں، مراد ایشیائے کوچک میں تھا اور پیہم شکستوں نے ترکی فوج کو بہت کچھ کمزور کر دیا تھا، بایں ہمہ ہونیاڈے نے اس مقصد کے خلاف جسے پیش نظر رکھ کر عیسائی حکومتوں کا یہ اتحاد قائم کیا گیا تھا، واپسی کا عزم کیا اور اپنی کامیابیوں کی داد لینے کے لیے پوری فوج کے ساتھ بوڈا کو واپس چلا گیا۔

صلح نامۂ زجیڈین مراد نے ہونیاڈے کا تعاقب کرنے کے بجائے اتحادیوں سے صلح کر لینا زیادہ مناسب خیال کیا، کارڈینل جولین صلح کا مخالف تھا لیکن طویل گفت و شنید کے بعد بالآخر ۲۶ ربیع الاول ۸۴۸ھ (۱۲ جولائی ۱۴۴۴ء) کو زجیڈین (Szegeddin) کے مقام پر ایک صلح نامہ مرتب ہوا، جس کی رو سے سرویا سلطنت عثمانیہ سے آزاد کر دیا گیا اور ولاچیا ہنگری کو دے دیا گیا، اس کے علاوہ مراد نے ساٹھ ہزار ڈوکات عثمانی جنرل محمد چلپی کا زرِ فدیہ ادا کیا، جو گذشتہ جنگ میں عیسائیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا، یہ صلح دس سال کے لیے کی گئی، اس پر پابند رہنے کے لیے لاڈسلاس نے انجیل اور مراد نے قرآن کو ہاتھ میں لے کر قسم کھائی۔

مراد کی تخت سے کنارہ کشی ایشیائے کوچک میں امن پہلے ہی قائم ہو چکا تھا، اس صلح نامہ سے یورپ کی جنگ کا بھی بظاہر خاتمہ ہو گیا اور مراد کو ایک گونہ اطمینان حاصل ہوا، بیس بائیس سال کی مسلسل لڑائیوں نے اس کو اب امور سلطنت کی طرف سے دل برداشتہ کر دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ بقیہ زندگی سکون کے ساتھ گزار دے، صلح نامۂ زجیڈین کے تکملہ کے بعد

جب وہ ایشیائے کوچک میں واپس گیا تو اسے اپنے بڑے لڑکے شہزادہ علاء الدین کی وفات کی خبر معلوم ہوئی، یہ شہزادہ نہایت لائق اور بہادر تھا، مراد کو اس کی وفات کا بے حد رنج ہوا اور اس نے سلطنت سے مستقل طور پر کنارہ کش ہو جانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ اپنے دوسرے لڑکے محمد کو جس کی عمر صرف چودہ سال تھی، تخت پر بٹھا کر وہ ریاست ایدین میں چلا گیا۔

عیسائیوں کی معاہدہ شکنی لیکن جس زندگی کی تلاش میں مراد نے تخت چھوڑ کر ایدین کی سکونت اختیار کی تھی وہ حاصل نہ ہو سکی، جوں ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ مراد سلطنت سے کنارہ کش ہو گیا ہے اور اس کی جگہ نوعمر اور ناتجربہ کار محمد تخت نشین ہے، عیسائیوں کے دلوں میں ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے کا حوصلہ ایک بار پھر پیدا ہوا، صلح نامۂ زجیڈین کی تحریر کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ہنگری کی مجلس قومی نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کا فیصلہ کر لیا، اس غداری کا اصل محرک کارڈینل جولین تھا جو پوپ کی پوری تائید کے ساتھ معاہدہ شکنی پر زور دے رہا تھا، شہنشاہ قسطنطنیہ بھی اس تحریک میں پیش پیش تھا، حالات تمام تر عیسائیوں کے لیے امید افزا تھے، سلطنت عثمانیہ کی زمام حکومت ایک نوعمر لڑکے کے ہاتھ میں تھی، ایشیائے کوچک میں امیر کرمانیہ نے پھر بغاوت شروع کر دی تھی اور عثمانی فوجیں اس کے فرو کرنے میں مصروف تھیں، دردانیال پر جنوا، وینس اور برگنڈی کے بحری بیڑوں کا قبضہ تھا، جن کی موجودگی میں ترکی افواج کا ایشیائے کوچک سے یورپ میں آنا محال تھا، پھر بھی لاڈسلاس شاہ ہنگری کو صلح نامہ کی خلاف ورزی کرنے میں تامل تھا لیکن کارڈینل جولین نے اپنے مذہبی اثر سے کام لے کر اس کو مجبور کر دیا اور بادشاہ کے ضمیر کو اس فتویٰ سے مطمئن کر دیا کہ غیر عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی نہیں کرنی چاہیے[1]، ہنگری کی مجلس قومی کے بعض ارکان کی مخالفت بھی اس فتویٰ سے دبا دی گئی اور جولین نے مجلس میں اعلان کیا کہ اس فتویٰ میں خود پوپ کی تائید بھی شامل ہے، اس نے مجلس کو مخاطب کر کے کہا:

---

[1] کریسی، جلد ا، ص ۱۰۸۔

> ''کیا تم اس موقع پر ان امیدوں کو توڑ دو گے جو لوگوں نے تمہارے ساتھ قائم کر رکھی ہیں اور اس خوش بختی سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے جو تمہیں نصیب ہوئی ہے؟ تمہارا عہد و پیمان تمہارے خدا اور تمہارے مسیحی بھائیوں کے ساتھ ہے اور وہ سابق معاہدہ اس ناعاقبت اندیشانہ اور مخالف مذہب عہد کو ساقط کر دیتا ہے جو مسیح کے دشمنوں سے بعد میں کیا ہو۔ دنیا میں اس کا نائب پاپائے روم ہے، جس کی اجازت کے بغیر تم نہ کوئی وعدہ کر سکتے ہو نہ وعدے کو پورا کر سکتے۔ اسی کی طرف سے میں تم کو دروغ حلفی سے بری الذمہ کرتا ہوں اور تمہاری فوج کو برکت دیتا ہوں، شہرت اور نجات کی راہ پر میرے پیچھے پیچھے چلو اور اگر اب بھی تمہیں کچھ پس و پیش ہے تو میں اس گناہ کا وبال اپنے سر لیتا ہوں۔''[1]

ابتداء میں ہونیاڈے نے بھی معاہدۂ زیجیڈین کی خلاف ورزی سے اختلاف کیا لیکن جب یہ وعدہ کیا گیا کہ بلغاریا کو ترکوں سے فتح کرنے کے بعد اسے وہاں کا بادشاہ بنا دیا جائے گا تو وہ راضی ہو گیا، البتہ اس نے یہ شرط کی کہ معاہدہ شکنی کا اعلان یکم ستمبر تک ملتوی کر دیا جائے، یہ شرط اس وجہ سے نہ تھی کہ اسے اب بھی کچھ تامل باقی تھا بلکہ اس خیال سے پیش کی گئی تھی کہ اس وقت تک اتحادی صلح نامہ سے پورا فائدہ اٹھا لیں اور ان تمام قلعوں اور علاقوں پر قابض ہو جائیں جنہیں ترک معاہدہ کے مطابق ریاست سرویا کے ساتھ خالی کر رہے تھے۔ شاہ سرویا کو اس کی سلطنت میں اضافہ کا لالچ دیا گیا اور وہ بھی معاہدہ شکن اتحادیوں کے ساتھ ہو گیا۔

لین پول لکھتا ہے کہ جس طریقے سے یہ غداری عمل میں لائی گئی اس سے زیادہ معیوب بات یورپ کے مورخوں اور ایک بڑے سپہ سالار کی شہرت کے لیے تصور میں بھی نہیں آسکتی، جس وقت عثمانی دستے مذکورۂ بالا قلعوں اور علاقوں سے نکل آئے اور اتحادیوں نے صلح نامہ سے پوری طرح فائدہ اٹھا لیا، شاہ لاڈیسلاس، کارڈینل جولین اور ہونیاڈے یکم ستمبر کو اپنی بڑی فوج کے ساتھ سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ ترک اس فریب سے

---

[1] کریسی جلد اول ص ۹۶۔

بالکل بے خبر تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد قلعے ان کے ہاتھ سے نکل گئے قلعوں کے ترکی دستے یا قتل کر دیے گئے یا چٹانوں سے ٹکرا کر ہلاک کر دیے گئے، بحر اسود کے ساحل پر پہنچ کر حملہ آوروں نے جنوب کا رخ کیا اور کئی اہم مقامات کو فتح کرتے ہوئے وارنا پہنچے اور اس مشہور شہر کا محاصرہ کر لیا، یہاں بھی ترک اس اچانک حملہ کے لیے بالکل تیار نہ تھے، مجبوراً انہیں ہتھیار ڈال دینے پڑے اور وارنا پر بھی عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔

جنگ وارنا اس درمیان میں دولت عثمانیہ کے بہی خواہوں نے ان واقعات کی خبر سن کر مراد سے گزارش کی کہ یہ وقت گوشہ عزلت سے نکل کر میدان جنگ میں آنے کا ہے، ورنہ شہزادہ محمد کی نو عمری اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر دشمن بڑھتے آئیں گے، چنانچہ مراد بہ عجلت تمام چالیس ہزار جنگ آزمودہ سپاہیوں کو لے کر اتحادیوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا، دردانیال پر عیسائی بیڑوں کا قبضہ تھا لیکن اس نے جنوا کے جہازوں کو فی سپاہی ایک دوکات کی شرح سے محصول ادا کر کے اپنی پوری فوج کو یورپ میں منتقل کر دیا، اتحادیوں کو مراد کی آمد کا گمان بھی نہ تھا کہ اچانک انہیں اس کے قریب پہنچنے کی اطلاع ملی، مراد نے وارنا سے چار میل کے فاصلہ پر اپنے خیمے نصب کر دیے اور جنگ کی تیاری کرنے لگا۔

ہونیاڈے کو سابق کامیابیوں کی بنا پر اپنی فتح کا پورا یقین تھا، چنانچہ اس نے مجلس حربی کے بعض اراکین کا یہ مشورہ بھی قبول نہ کیا کہ لشکر گاہ کے گرد ناکہ بندی کر کے مراد کے حملہ کا انتظار کرنا چاہیے بلکہ خود ہی مراد پر حملہ کرنے کے لیے پوری فوج کے ساتھ چل کھڑا ہوا، ۲۶؍ رجب ۸۴۸ھ مطابق ۱۰؍ نومبر ۱۴۴۴ء کو دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں، عیسائی فوج کے میمنہ و میسرہ میں ہنگری اور ولاچیا کے بہترین دستے تھے، ہنگری کے دستوں کے ساتھ کارڈینل جولین کی سرکردگی میں صلیبی مجاہدوں کی ایک خاص جماعت بھی تھی، لاڈسلاس شاہی دستہ اور ہنگری اور پولینڈ کے نوجوان امراء کو لے کر قلب لشکر کو قوت پہنچا رہا تھا، ہونیاڈے پوری فوج کا سپہ سالار اعظم تھا، ترکوں کی طرف پہلی

دو صفیں بے ضابطہ سوار اور پیدل فوجوں کی تھیں، داہنے بازو کی کمان رومیلیا کے بیلر بے کے ہاتھ میں اور بائیں بازو کی اناطولیہ کے بیلر بے کے ہاتھ میں تھی، ان صفوں کے پیچھے مرکز میں خود سلطان مراد کے زیر کمان ینی چری اور شاہی سوار دستے تھے، ایک اونچے نیزہ کے سرے پر صلح نامہ زجیڈین کی نقل فوجی نشان کی طرح ہوا میں لہرا رہی تھی اور بقول کریسی اس منتقم حقیقی کو پکار رہی تھی جو لوگوں کو نقض عہد کی سزا دیتا ہے، لڑائی شروع ہونے کے قریب ہی تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے عیسائیوں کے دلوں میں بدشگونی کا خطرہ پیدا ہو گیا، دفعۃً ہوا کا ایک سخت جھونکا آیا اور ان کے تمام علم سوائے بادشاہ کے علم کے زمین پر گر گئے۔

ابتدا میں عیسائیوں کا حملہ بہت کامیاب رہا، ترکوں کی پہلی دو صفوں کے قدم اکھڑ گئے اور فوج میں اتنا انتشار پیدا ہوا کہ مراد کو اپنی شکست کا یقین ہونے لگا، زندگی میں پہلی اور آخری بار صبر و استقلال کا سررشتہ ایک لمحہ کے لیے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے گھوڑا موڑ کر بھاگنے کا قصد کیا لیکن اناطولیہ کے بیلر بے نے جو قریب ہی تھا، بڑھ کر لگام پکڑ لی اور عرض کی کہ ابھی مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، مراد کو بھی تنبہ ہوا اور اس نے فوراً گھوڑا روک کر ینی چری کو ہمت دلانا شروع کی، دیکھتے دیکھتے جنگ کا نقشہ بدل گیا، ینی چری نے پے در پے اتنے سخت حملے کیے کہ عیسائی پسپا ہونے لگے، لاڈسلاس نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا لیکن اس کا گھوڑا زخمی ہو کر گرا اور بعض ینی چری سپاہیوں نے اسے گھیر کر گرفتار کر لیا، لاڈسلاس نے خواہش کی کہ اسے قید کر لیا جائے، مگر ترکوں میں عیسائیوں کی معاہدہ شکنی سے اس درجہ برہمی پھیلی ہوئی تھی کہ انہوں نے اس کی خواہش پر مطلق توجہ نہ کی، ایک پرانے ینی چری خواجہ خیری نے فوراً اس کا سر کاٹ کر ایک نیزے پر رکھا اور نیزے کو بلند کر کے عیسائیوں کی طرف بڑھا، امرائے ہنگری کے دل اس منظر کو دیکھتے ہی بیٹھ گئے اور وہ نہایت بدحواسی کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگے، ہونیاڈے نے تھوڑی دیر تک جم کر مقابلہ کیا اور اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ کم سے کم لاڈسلاس کا سر ترکوں سے چھین کر اپنے قبضہ میں کر لے، مگر اسے

کام یابی نہ ہوئی اور آخر کار وہ بھی بقیہ عیسائی دستوں کے ساتھ بمشکل جان لے کر بھاگا لیکن اس سے قبل اتحادی فوجوں کا دو ثلث حصہ قتل ہو چکا تھا، شاہ لاڈسلاس کے علاوہ مقتولین میں دو مشہور بشپ اور بعض نہایت ممتاز فوجی افسر بھی تھے لیکن سب سے زیادہ عبرت انگیز نعش کارڈینل جولین کی تھی، جو معاہدۂ زجیڈین کی شکست کا خاص محرک اور عیسائیوں کی ہلاکت کا اصلی سبب تھا، جس گناہ کو اپنے سر لے کر اس نے ہنگری کی قومی مجلس کو عثمانی مقبوضات پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا، اس کی نعش اس کے وبال کا ایک ایسا مرقع تھی جو مکافات عمل کے خدائی قانون کو فاتح و مفتوح دونوں کے سامنے مجسم شکل میں پیش کر رہا تھا۔

اس جنگ کے نتائج | جنگ وارنا کے بعد ہنگری پر ترکوں کا قبضہ تو فوراً نہ ہو سکا لیکن سرویا اور بوسنیا کی مملکتیں مکمل طور پر فتح کر لی گئیں، یہ دونوں جو یونانی کلیسا سے وابستہ تھیں دولت عثمانیہ کے زیر تسلط آنا بھی چاہتی تھیں کیوں کہ ہونیاڈے کی کام یابی کی صورت میں انہیں بہ جبر لاطینی کلیسا میں داخل کرنے کی دھمکی دی گئی تھی، سرویا کا مورخ رانکی (Ranke) نقل کرتا ہے کہ ایک بار جارج برینکووچ نے ہونیاڈے سے دریافت کیا کہ اسے کام یابی حاصل ہوئی تو مذہب کے متعلق اس کا رویہ کیا رہے گا، ہونیاڈے نے جواب دیا کہ میں سرویا کو رومن کیتھولک مذہب قبول کرنے پر مجبور کروں گا، اس کے بعد برینکووچ نے یہی سوال مراد سے کیا، اس نے جواب دیا کہ میں ہر مسجد کے پاس ایک گرجا بنوا دوں گا اور لوگوں کو پوری آزادی حاصل ہوگی کہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خواہ مسجد میں جا کر عبادت کریں خواہ گرجا میں، اسی طرح کلیسائے رومہ کی مذہبی تعدیوں نے بوسنیا کی تسخیر میں بھی ترکوں کی مدد کی اور آٹھ روز کے اندر بوسنیا کے ستر قلعوں نے عثمانی فوجوں کے لیے اپنے پھاٹک کھول دیے، بوسنیا کا شاہی خاندان مٹ گیا اور اس کے بہت سے ممتاز امراء اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔[1]

ینی چری کی بغاوت | اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد مراد نے تاج و تخت پھر شہزادہ محمد

---

[1] کریسی، جلد ا، ص ۱۱۲۔

کے حوالہ کیا اور ایدین کی پرکیف فضا میں علماء و مشائخ کی صحبتیں دوبارہ شروع ہوئیں لیکن اب کی بار بھی یہ عزلت پسندی راس نہ آئی، وارنا کی شکست نے عیسائیوں کی قوت کو بالکل توڑ دیا تھا اور سلطنت عثمانیہ کو اب کسی خارجی خطرہ کا خوف نہ تھا لیکن محمد کی کم سنی سے خود ینی چری نے فائدہ اٹھانا چاہا اور تنخواہ کے اضافہ کا مطالبہ پیش کیا، محمد کے انکار پر انہوں نے بغاوت کر دی اور ادرنہ میں قتل و غارت کا بازار ایسا گرم کیا کہ وزرائے سلطنت نے مجبور ہو کر مراد سے بمنت استدعا کی کہ زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر اس فتنہ کو فرو کرے، چنانچہ مراد کو بادل ناخواستہ ایدین کا سکون پرور ماحول پھر چھوڑنا پڑا، اس کے ادرنہ پہنچتے ہی باغیوں نے سر اطاعت خم کر دیا اور شہر میں امن قائم ہو گیا، دو بار کے تجربہ سے مراد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ محمد میں ابھی سلطنت کے سنبھالنے کی کافی قابلیت پیدا نہیں ہوئی، چنانچہ اس نے پھر تخت چھوڑنے کا قصد نہیں کیا، بلکہ بقیہ زندگی امور سلطنت کے سرانجام دینے میں گزار دی، بادشاہوں کے تخت سے دست بردار ہو جانے کی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں، ان میں سے بعض کا حالات سے مجبور ہو کر دوبارہ عنان سلطنت کو ہاتھ میں لینا بھی ثابت ہے لیکن دوسری بار تخت چھوڑ کر پھر سلطنت کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لینا ایک ایسا استثنائی واقعہ ہے جو صرف مراد ثانی کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کی کوئی نظیر تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی، گبن کے نزدیک مراد کی زندگی اور سیرت کا سب سے زیادہ مؤثر واقعہ یہی ہے کہ یہ فلسفی سلطان دنیاوی عظمت کی بے حقیقتی سے آگاہ ہو کر چالیس سال کی عمر میں دوبارہ تخت سے علاحدہ ہو گیا۔

موریا لیکن اب تخت پر آنے کے بعد مراد کی زندگی کے بقیہ چھ سال تقریباً تمام تر میدان جنگ ہی میں گزرے، سب سے پہلے اسے موریا کی طرف توجہ کرنی پڑی، جہاں شہنشاہ قسطنطنیہ کے دو بھائی قسطنطین اور طامس علاحدہ علاحدہ حصوں پر حکمراں تھے، قسطنطین نے اپنے مقبوضات کے تحفظ کے لیے خاکنائے کورنتھ کی قلعہ بندی کی اور ادھر سے اطمینان کر لینے کے بعد تھیبز (Thebes) کے شہر پر جو اس سرحد سے قریب سلطنت عثمانیہ کا مقبوضہ

تھا، دفعتاً حملہ کر کے قبضہ کر لیا، اس واقعہ کی اطلاع پا کر مراد فوراً موریا کی طرف روانہ ہوا، کورنتھ کا مضبوط قلعہ اس کی راہ میں کسی قدر حائل ہوا، مگر عثمانی توپوں کی گولہ باری کے سامنے وہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا، عثمانی فوج میں توپوں کے استعمال کا یہ پہلا موقع تھا،[1] کورنتھ کی فتح کے بعد موریا کا راستہ بالکل صاف ہو گیا اور قسطنطین اور طامس کے لیے اظہار اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا، انھوں نے خراج دینا منظور کیا اور موریا بھی دولت عثمانیہ کی باج گزار ریاستوں میں شامل کر لیا گیا۔

کسووا کی دوسری جنگ وارنا کی شکست کے بعد ہونیاڈے ترکوں سے انتقام لینے کی تیاریوں میں مصروف رہا، اس کے دامن شہرت پر وارنا کا داغ بہت ہی بدنما تھا، چنانچہ اس نے چار سال کے اندر اسی ہزار کی ایک زبردست فوج پھر جمع کر لی اور دریائے ڈینوب کو عبور کر کے سرویا میں داخل ہوا، یہاں ہنگری، سرویا اور بوسنیا کی فوجیں متحد ہو کر مراد کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئیں، سرویا اور بوسنیا نے جنگ وارنا کے بعد دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کر لی تھی، مگر ہونیاڈے کی کوششوں سے یہ دونوں حکومتیں اپنے معاہدہ سے منحرف ہو گئیں اور مکمل آزادی کی خواہش انھیں مراد کے بالمقابل میدان جنگ میں پھر کھینچ لائی، یہ قوت آزمائی کسووا کے اسی میدان میں ہوئی جہاں تقریباً ساٹھ سال پیش تر مراد اول نے سرویا کی طاقت ور سلطنت کو شکست دے کر اسے اپنا مطیع بنا لیا تھا، تین روز کی شدید جنگ کے بعد ۱۸؍ شعبان ۸۵۲ھ (۱۷؍ اکتوبر ۱۴۴۸ء) میں مراد نے ہونیاڈے کی متحدہ افواج کو بری طرح شکست دی، کسووا کی اس دوسری عظیم الشان جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرویا کی آزادی سلب کر لی گئی اور وہ چند سال بعد سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، مراد نے بوسنیا سے سالانہ خراج قبول کرنے پر اکتفا کیا۔

اسکندر بیگ اس درمیان میں البانیا میں ایک نیا فتنہ پیدا ہو گیا تھا، مراد کے ابتدائی عہد حکومت میں البانیا کی ایک ریاست کا امیر جان کستریو (John Castriot) دولت علیہ کا مطیع ہو

---

[1] تاریخ دولت عثمانیہ از فرید بک، ص ۵۷۔

گیا تھا، بطور ضمانت اس نے اپنے چار لڑکے مراد کی خدمت میں بھیج دیے تھے، ان میں سے تین تو بچپن ہی میں انتقال کر گئے، چوتھا لڑکا جارج کستریو زندہ رہا اور اس کی ہونہاری اور فراست نے بہت جلد سلطان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، مراد نے اپنی ذاتی نگرانی میں جارج کو اسلامی اور فوجی تعلیم دلوائی اور اس کی لیاقت اور شجاعت سے خوش ہو کر محض اٹھارہ سال کی عمر میں اسے ایک سنجق کا حاکم بنا دیا اور اسکندر بک کے لقب سے سرفراز فرمایا، جان کستریو کا جب انتقال ہوا تو مراد نے اس کی ریاست سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی، یہ بات اسکندر بک کو بہت ناگوار گزری لیکن اس نے ایک عرصہ تک اپنے اندرونی جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا، جب ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) میں ہونیاڈے کے مقابلہ میں عثمانی فوج کو شکست ہوئی تو اسکندر بک نے موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنے باپ کی ریاست پر قبضہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا، چنانچہ ایک روز وہ رئیس آفندی یعنی سلطان کے چیف سکریٹری کے خیمہ میں تنہا داخل ہوا اور اس کے گلے پر خنجر رکھ کر البانیا کے مضبوط شہر آق حصار (جس کا قدیم نام کرویا (Croia) تھا، کے ترک افسر کے نام ایک حکم نامہ لکھوا لیا کہ شہر اور اس کے ملحق علاقے بہ حیثیت گورنر کے اسکندر بک کو دے دیے جائیں، یہ تحریر حاصل کر لینے کے بعد اس نے رئیس آفندی کو فوراً قتل کر دیا اور اسی وقت البانیا کی طرف روانہ ہو گیا، آق حصار پہنچ کر اس فرمان کے ذریعہ سے وہ شہر پر قابض ہو گیا، اس کے بعد اس نے اپنے ارتداد کا اعلان کیا اور دین عیسوی کی حمایت اور البانیا کی آزادی کے لیے اپنی خدمات پیش کیں، البانیا کے مختلف جرگوں کے سردار اس کے علم کے نیچے جمع ہونے لگے، ان کی مدد سے اس نے متعدد قلعوں پر قبضہ کر لیا اور پھر ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے آبائی علاقوں میں داخل ہوا، اس کے بعد تمام قومی امراء نے اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا، تقریباً پچیس سال تک وہ ترکوں کا مقابلہ کرتا رہا، البانیا کے پیچ در پیچ پہاڑی دروں کی وجہ سے عثمانی فوجوں کو کھل کر لڑنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور متعدد کوششوں کے باوجود البانیا مراد کی حیات میں پوری طرح مسخر نہ ہو سکا۔

مراد کی وفات | ۵ محرم ۸۵۵ھ (۹ فروری ۱۴۵۱ء) کو مراد نے ادرنہ میں وفات پائی، تجہیز و تکفین قدیم پایہ تخت بروصہ میں ہوئی۔

اخلاق و اوصاف | مراد کے عدل و انصاف اور شریفانہ اوصاف کا اعتراف اس کے دشمنوں نے بھی کیا ہے، یونانی مورخین بھی اس کی فوجی قابلیت کے علاوہ اس کی اخلاقی عظمت کی شہادت دیتے ہیں اور اس بات میں ترک مورخین کے ہم نوا ہیں[1]، لارڈ ایورسلے جس کے تذکرہ سے آل عثمان کے محاسن کا اعتراف بہت شاذ ہوتا ہے، مراد کے عہد حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "اس کی حکومت پر نظر ڈالنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے توسیع سلطنت کے مقصد سے لڑائیاں لڑیں، تقریباً ہر جنگ کے لیے وہ مجبور کیا گیا، تین بار امیر کرمانیہ نے اس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، ہر بار مراد نے اس کو شکست دی اور کرمانیہ کو صرف ایک باج گزار ریاست بنا لینے پر قناعت کی اور اس کی آزادی کو فنا کر کے اسے سلطنت میں ضم کر لینے پر اصرار نہیں کیا، یہ دکھایا جا چکا ہے کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کا طرز عمل کس قدر غدارانہ تھا اور مراد اس کے مقبوضات کے دائرہ کو تنگ سے تنگ کر دینے میں کس درجہ حق بجانب تھا، اسی طرح سالونیکا پر بھی مراد کا حملہ، جب کہ وہ شہر جمہوریہ وینس کے ہاتھ میں تھا، بالکل حق بجانب تھا کیوں کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کو اسے فروخت کرنے اور یوں ایک غیر حکومت کو وہاں قدم جمانے کی جگہ دینے کا کوئی حق نہ تھا، شمالی سرحد پر جو لڑائیاں ہوئیں ان میں مراد کو اہل ہنگری اور ان کی حلیف مسیحی طاقتوں کے جارحانہ اقدام سے مجبور ہو کر میدان میں آنا پڑا[2]، تجادیوں نے تلوار سے فیصلہ چاہا اور فیصلہ ان کے خلاف ہوا۔"

گبن ایک ترک مورخ کا بیان نقل کرتا ہے:

> "سلطان مراد نے انچاس سال کی عمر پائی اور تیس سال چھ مہینے اور آٹھ روز حکومت

---

[1] کریسی جلد ۱، ص ۱۸ [2] ایورسلے ص ۱۰۱۔

کی، وہ ایک عادل اور شجاع فرماں روا تھا، نہایت کشادہ ذہن، مستقل مزاج، عالم، رحم دل، پابند مذہب اور فیاض تھا، وہ اہل علم اور ان تمام لوگوں سے جو کسی علم یا فن میں کمال رکھتے، محبت کرتا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا، وہ ایک نیک شہنشاہ اور ایک جلیل القدر سپہ سالار تھا، کسی شخص نے مراد سے زیادہ اس سے بڑی فتوحات نہیں حاصل کیں، اس کے عہد حکومت میں سپاہی ہمیشہ فتح یاب تھا اور شہری خوش حال اور مامون، جب وہ کسی ملک کو فتح کرتا تو سب سے پہلے وہاں مسجدیں اور کارواں سرائیں، ہسپتال اور مدرسے تعمیر کراتا، ہر سال وہ ایک ہزار طلائی سکے سادات کی نذر کرتا اور ڈھائی ہزار مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کے دین دار لوگوں کے لیے بھیجتا۔"

اس کے بعد گبن خود اپنی تحقیق لکھتا ہے:

"مراد کے عدل و انصاف اور بردباری کی تصدیق اس کے طرز عمل نیز خود عیسائیوں کی شہادت سے ہوتی ہے، جن کا خیال ہے کہ اس کے عہد کی خوش حالی اور اس کی پرسکون موت اس کے غیر معمولی اوصاف کا صلہ تھی، اپنی عمر اور فوجی قوت کے دور شباب میں بھی اس نے شاذ ہی کسی میدان جنگ میں قدم رکھا، جب تک پہلے دشمن کی طرف سے اس کو جنگ کے لیے کافی طور پر برانگیختہ نہ کیا گیا، دشمن کے مطیع ہو جانے کے بعد فاتح سلطان اپنے ہتھیار کو کھول کر رکھ دیتا تھا اور صلح ناموں کی پابندی میں اس کا عہد ناقابل شکست اور مستحکم تھا، حملہ کی ابتدا عموماً اہل ہنگری کی طرف سے ہوا کرتی تھی، اسکندر بیگ کے خلاف اس کو اشتعال خود اسکندر بیگ کی بغاوت کی وجہ سے پیدا ہوا اور کرمانیہ کے غدار امیر کو سلطان نے دو بار زیر کیا اور دونوں مرتبہ معاف کر دیا، قبل اس کے کہ وہ موریا پر چڑھائی کرے، تھیبز پر موریا کا فرماں روا اچانک حملہ کر چکا تھا، جہاں تک سالونیکا کی فتح کا تعلق ہے، بایزید کا پوتا اہل وینس کی تازہ خریداری کو زیر بحث لا سکتا تھا اور قسطنطنیہ کے پہلے محاصرہ کے بعد سلطان کو پھر کبھی پیلیولوگس کی مصیبت، غیر موجودگی یا زیادتوں کی بنا پر سلطنت بازنطینی کے بجھتے ہوئے چراغ کو گل کر دینے کی ترغیب نہیں ہوئی۔"[1]

---

[1] گبن، جلد ۳، ص ۲۶۰، ۲۶۱۔

محمد فاتح

۸۵۵ھ تا ۸۸۶ھ مطابق ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء

شہزادہ محمد ریاست ایدین میں تھا جب اسے مراد کی وفات کی اطلاع ملی، وہ فوراً ایک عربی گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ کہتا ہوا کہ "جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں، میرے ساتھ آئیں" دردانیال کی طرف روانہ ہو گیا اور اسے عبور کر کے ادرنہ پہنچا، تخت نشینی کے وقت ینی چری کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اسے انعامات تقسیم کرنے پڑے، جس سے آئندہ کے لیے ایک مثال قائم ہو گئی اور ینی چری میں اپنی اہمیت کا مزید احساس پیدا ہو گیا۔

معصوم بھائی کا قتل | زمام سلطنت کو ہاتھ میں لینے کے بعد محمد نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے شیر خوار بھائی کو جو سرویا کی شہزادی کے بطن سے تھا، آئندہ فتنہ کے خوف سے حوض میں غرق کرا دیا، معصوم بچہ کا یہ قتل عین اس وقت عمل میں آیا جب غریب و بے کس ماں سلطان کے حکم سے بالکل بے خبر اس کی تخت نشینی پر دربار میں تہنیت پیش کر رہی تھی۔

شہنشاہ قسطنطنیہ سے آویزش | محمد کی تخت نشینی سے تین سال قبل بازنطینی سلطنت کا آخری فرماں روا قسطنطین یازدہم قسطنطنیہ کے تخت پر بیٹھ چکا تھا، قسطنطین ایک بہادر شہزادہ تھا لیکن محمد کو برافروختہ کرنے میں اس نے اسی شدید غلطی کا اعادہ کیا جس کا خمیازہ اس کے پیش رو مینوئل کو مراد ثانی کے ہاتھوں بھگتنا پڑا تھا، سلطان بایزید یلدرم کا ایک پوتا اورخان نامی جو شہزادہ سلیمان کی اولاد سے تھا، قسطنطنیہ میں نظر بند تھا، اس کے مصارف سلطان کی

طرف سے ادا ہوتے تھے، قسطنطین نے اس رقم میں اضافہ کا مطالبہ کیا اور عدم منظوری کی صورت میں اورخان کو محمد کے مقابل کھڑا کر دینے کی دھمکی دی، اس نے اپنی غلط فہمی سے یہ خیال کیا کہ محمد اب بھی ویسا ہی ناتجربہ کار ہے جیسا کہ چھ سال قبل تھا، اسے معلوم نہ تھا کہ اس قلیل مدت میں نوعمر سلطان کی قوتیں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی پا چکی ہیں اور اکیس ہی سال کی عمر میں وہ ارادہ کی پختگی، فوجی قابلیت اور ملکی تنظیم و تدبیر میں اپنے پیش روؤں کا حریف بن چکا ہے، محمد اس وقت ایشیائے کوچک کی بعض شورشوں کے فرو کرنے میں مصروف تھا، اس نے بازنطینی سفراء کو نرمی سے جواب دے کر ٹال دیا لیکن وزیر اعظم خلیل پاشا نے قسطنطین کو اس احمقانہ مطالبہ کے خطرات سے متنبہ کیا اور سفراء سے کہا کہ ”تمہارا جنون قسطنطنیہ کو سلطان کے ہاتھوں میں دے کر رہے گا، یورپ میں اورخان کے سلطان ہونے کا اعلان کرو، اہل ہنگری کو اپنی مدد کے لیے بلاؤ، جو صوبے تم واپس لے سکتے ہو واپس لے لو لیکن بہت جلد تم کو بازنطینی سلطنت کا خاتمہ بھی نظر آ جائے گا۔“

قسطنطنیہ کی اہمیت اصل یہ ہے کہ ابتدا ہی سے محمد نے قسطنطنیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کا تہیہ کر لیا تھا، سینوپ اور طرابزون کے علاوہ قدیم بازنطینی سلطنت کے تمام ایشیائی علاقوں پر عثمانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا، یورپ میں بھی صرف قسطنطنیہ اور اس کے مضافات اس سلطنت میں باقی رہ گئے تھے، قیاصرہ کی وہ عظیم الشان سلطنت جو اپنی وسعت اور قوت کے لحاظ سے کبھی دنیا کی تمام سلطنتوں پر فوقیت رکھتی تھی، اب تباہی اور بربادی کی آخری حد تک پہنچ گئی تھی اور جہاں تک وسعت اور قوت کا تعلق تھا، گویا فنا ہو چکی تھی، تاہم اس حالت میں بھی قسطنطنیہ کا وجود بجائے خود نہایت اہم تھا اور قصر سلطنت کی یہ پہلی اور آخری اینٹ ہنوز اپنی جگہ قائم تھی، ترکوں نے جس وقت یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا، اسی وقت سے اس شہر کو فتح کر لینے کا حوصلہ ان کے دلوں میں راسخ ہوتا گیا، جوں جوں فتوحات کا دائرہ بڑھتا جاتا تھا، ان کے ارادہ میں قوت آتی جاتی تھی اور بالآخر اس کا پہلا عملی اظہار بایزید یلدرم

کے عہد میں ہوا، جب کہ اس نے آبنائے باسفورس کے مشرقی ساحل پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرانے کے بعد قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع کیا لیکن محاصرہ کو چند ہی روز گزرے تھے کہ تیموری حملہ نے بایزید کو اسے اٹھا لینے پر مجبور کیا اور جنگ انگورہ کے بعد کچھ دنوں کے لیے قسطنطنیہ محفوظ و مامون ہو گیا، مراد ثانی اگر چہ شہنشاہ قسطنطنیہ سے آویزش پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن خود شہنشاہ کی غداری نے اسے مجبور کیا کہ سلطنت عثمانیہ کی حفاظت کے خیال سے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے اس فتنہ کا استیصال کر دے، مگر سلطنت بازنطینی کے ایام حیات ابھی کچھ اور باقی تھے اور مراد کو بھی ایشیائے کوچک کی ایک بغاوت کے باعث محاصرہ اٹھا کر شہنشاہ کی اطاعت اور خراج قبول کرنے پر اکتفا کرنا پڑا، تاہم ترکوں کی نظریں اب بھی قسطنطنیہ پر لگی ہوئی تھیں، یہ شہر اپنے موقع کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کا قدرتی پایہ تخت تھا، بحر مورا کے دونوں ساحلوں پر عثمانیوں کی حکومت تھی لیکن جب تک قسطنطنیہ عیسائیوں کے قبضہ میں رہتا، سلطان کے ایشیائی اور یورپی صوبوں کا درمیانی تعلق بھی محفوظ نہیں ہو سکتا تھا، لہذا علاوہ اس عظمت و شان کے جو اس تباہی اور بربادی کی حالت میں بھی بازنطینی سلطنت کے پایہ تخت سے وابستہ تھی، خود اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے بھی قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا ناگزیر تھا، یہ مصالح بجائے خود محمد ثانی جیسے سلطان کو اس مہم پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھے، قسطنطین کی دھمکی نے اسے اور زیادہ برانگیختہ کر دیا اور اس نے اپنے دور حکومت کے سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔

قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں اس غرض سے کہ قسطنطنیہ کے محاصرہ کے دوران میں اسے کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہونا پڑے، اس نے پہلے ایشیائے کوچک کی شورشوں کو فرو کیا اور امیر کرمانیہ سے صلح کر کے اس کی لڑکی سے عقد کر لیا، اس کے بعد تین سال کے لیے ہونیاڈے سے بھی صلح کر لی، جس کی وجہ سے شمالی یورپ کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا، پھر اس نے ایک فوج موریا میں بھیج دی تا کہ شہنشاہ کے بھائی جو وہاں حکومت کرتے

تھے قسطنطنیہ کی مدد کرنے سے روک دیے جائیں، ان تدبیروں سے فارغ ہو کر اس نے آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل اور قسطنطنیہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کرانا شروع کیا، یہ قلعہ بایزید یلدرم کے بنوائے ہوئے قلعہ کے جو آبنائے باسفورس کے ایشیائی ساحل پر واقع تھا، بالکل مقابل تھا، قسطنطین نے اس قلعہ کی تعمیر کے خلاف احتجاج کیا لیکن بے سود، دوران تعمیر میں بعض ترکوں نے چند یونانی کاشتکاروں سے کچھ چھیڑ کی جس نے ایک چھوٹی سی لڑائی کی شکل اختیار کر لی اور اس میں فریقین کے چند سپاہی مارے گئے، قسطنطین سمجھ چکا تھا کہ یہ ساری تیاریاں دراصل قسطنطنیہ پر حملہ کے لیے ہو رہی ہیں، اس نے خوف زدہ ہو کر شہر کا پھاٹک بند کرا دیا اور ایک وفد کے ذریعہ سے محمد ثانی کی خدمت میں ترک سپاہیوں کے طرز عمل کی شکایت کی، محمد نے اس شکایت کا جواب اعلان جنگ سے دیا، اب سلطنت بازنطینی کی موت و زیست کا مسئلہ آخری فیصلہ کا منتظر تھا۔

جدید قلعہ ۸۵۶ھ (۱۴۵۲ء) کے موسم سرما سے قبل تیار ہو گیا، آبنائے باسفورس اب تمام تر ترکوں کے قبضہ میں تھی، کوئی جہاز بغیر ان کی اجازت کے اسے عبور نہیں کر سکتا تھا، اس قلعہ کی تعمیر کے بعد محمد جنگ کی دوسری تیاریوں میں مصروف ہوا، اس نے ادرنہ میں ڈیڑھ لاکھ فوج جمع کی لیکن قسطنطنیہ کی فتح کے لیے محض سپاہیوں کی تعداد کافی نہ تھی خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، یہ شہر مثلث نما تھا جس کے دو ضلعے پانی سے گھرے ہوئے تھے، شمال میں شاخ زریں اور جنوب میں بحر مورا تھا، بری فوجیں صرف تیسرے ضلعہ سے حملہ کر سکتی تھیں، جو مغرب کی جانب واقع تھا لیکن اس کی حفاظت یکے بعد دیگرے تین زبردست دیواریں کر رہی تھیں، جو توپوں کی ایجاد سے قبل ہر طرح کے حملہ سے محفوظ خیال کی جاتی تھیں، اندر کی دونوں دیواریں بہت موٹی تھیں اور ان پر ایک سو ستر فٹ کے فاصلہ سے مضبوط برج بنے ہوئے تھے، ان دیواروں کے درمیان ساٹھ فٹ کا فاصلہ تھا، باہر کی جانب دوسری اور تیسری دیوار کے بیچ میں سو فٹ چوڑی ایک خندق تھی، جو سو فٹ گہری تھی، یہ

دیواریں پانچویں صدی عیسوی میں شہنشاہ تھیوڈوسیس ثانی (Theodosius II) نے تعمیر کرائی تھیں اور اب تک اکیس محاصروں میں قسطنطنیہ کو دشمنوں کے قدموں سے محفوظ رکھ چکی تھیں، قسطنطنیہ کی فتح کے لیے ضروری تھا کہ ان دیواروں پر کامیابی کے ساتھ گولہ باری کی جائے، کچھ عرصہ سے ترکوں اور عیسائیوں نے جنگ میں توپوں کا استعمال شروع کر دیا تھا لیکن محمد نے مروجہ توپوں کو ناکافی خیال کرکے نہایت عظیم الشان توپیں ڈھلوائیں، جو اپنی جسامت اور طاقت کے لحاظ سے بے نظیر تھیں، اربان (Urban) نامی ایک عیسائی انجینیر نے، جو ہنگری کا رہنے والا تھا اور بازنطینیوں کی ملازمت سے علاحدہ ہو کر سلطان کی خدمت میں چلا آیا تھا، ایک نہایت زبردست توپ ڈھالی جس کے سنگی گولوں کا قطر ڈھائی فٹ تھا، اس کے علاوہ اس نے اور بھی توپیں بنائیں جو نسبتاً چھوٹی تھیں لیکن زیادہ تیزی کے ساتھ گولے برسا سکتی تھیں، محمد نے قسطنطنیہ کے محاصرہ کے لیے ایک سو اسی جہازوں کا ایک بیڑا بھی تیار کرلیا، وہ محاصرہ کی تیاریوں میں حد درجہ منہمک تھا اور اس کے لیے تمام سامان اپنی ذاتی نگرانی میں فراہم کر رہا تھا۔

مدافعت کی تیاریاں

ادھر قسطنطین بھی مدافعت کی تیاریوں میں اسی قدر مصروف تھا، اس نے شہر کی دیواروں کی مرمت کرائی اور جو کچھ رسد ممکن تھی، بہم پہنچائی، اس کے بعد اس نے مغربی یورپ کے فرماں رواؤں سے مدد کی درخواست اور پوپ کی پوری اعانت اور ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کلیسائے روما کے تمام مطالبات کو منظور کرکے یونانی کلیسا کو اس سے ملحق کر دیا، سینٹ صوفیہ میں پوپ کے نمائندہ کارڈینل اسیڈور (Cardinal Isidore) کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد ہوئی، جس میں شہنشاہ، اس کے درباری اور قسطنطنیہ کے تمام ملکی اور مذہبی عہدے دار شریک ہوئے اور کلیسائے قسطنطنیہ کو کلیسائے روما سے متحد کرنے کی تجویز کثرت رائے سے منظور کر لی گئی، اس فیصلہ نے یونانی پادریوں کو بہت برافروختہ کیا اور شہر کی آبادی کے بڑے حصہ نے اس سے اپنی بیزاری کا علانیہ اظہار کیا، دونوں

کلیساؤں کے درمیان جو قدیم عناد چلا آتا تھا، وہ اس نازک موقع پر بھی قائم رہا اور شہنشاہ کے اس فعل نے خود اس کی رعایا کی ایک کثیر تعداد کو اس سے برگشتہ کر دیا، گرانڈ ڈیوک نوٹاراس (Notaras) جو تمام افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اور قسطنطین کے بعد سلطنت کی سب سے بڑی شخصیت تھا، اس قدر برہم تھا کہ اس نے صاف لفظوں میں یہ کہا کہ کارڈینل کی ٹوپی کے مقابلہ میں قسطنطنیہ میں ترکوں کے عمامے دیکھنا مجھے زیادہ گوارا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ خود یونانیوں میں دو جماعتیں ہو گئیں، ایک جو کلیسائے رومہ کی طرف دار اور اس نازک وقت میں اس کی مدد کی خواستگار تھی، دوسری وہ جو اس حالت میں بھی کلیسائے رومہ سے اتحاد کرنے پر کسی طرح راضی نہ تھی، دوسری جماعت پہلی سے بڑی تھی، چنانچہ اس جماعت کے گرجاؤں نے شہنشاہ کو مالی مدد دینے سے انکار کر دیا اور اس میں سے جو لوگ جنگ میں شریک ہو سکتے تھے، ان کی ایک بہت قلیل تعداد نے شہر کی محافظت کے لیے آمادگی ظاہر کی، قسطنطنیہ کی آبادی باوجود بہت کچھ کم ہونے کے ایک لاکھ کے قریب تھی لیکن ترکو کے مقابلہ میں قسطنطین کی حمایت کے لیے صرف چھ ہزار یونانیوں نے اپنی خدمات پیش کیں[1]۔

مغربی یورپ کی سرد مہری قسطنطین نے مغربی یورپ سے مدد کی جو درخواست کی تھی، وہ بھی بہت ناکافی حد تک پوری ہوئی، پوپ میں آزمودہ کار سپاہیوں کی ایک تعداد اور کچھ مالی مدد کارڈینل اسیڈور کے ساتھ روانہ کی، اٹلی اور اسپین کے بعض شہروں نے جو قسطنطنیہ سے تجارتی کاروبار رکھتے تھے، چند فوجی دستے بھیجے، وینس اور اسپین کے صوبہ کٹالونیا اور اراگن نے کچھ مدد کی لیکن ان سب سے زیادہ قیمتی مدد اہل جنوا کی طرف سے آئی، مشہور جنوی کمانڈر جان جسٹینانی (John Giustinani) دو جنگی جہازوں اور سات سو منتخب بہادروں کے ساتھ محاصرہ شروع ہونے سے تھوڑی ہی مدت آپہنچا، یہ شخص اپنی شجاعت اور علمی فوجی قابلیت کے لحاظ سے تنہا ایک فوج کے برابر تھا، دورانِ محاصرہ میں اور خاص کر آخری حملہ کے

---

[1] کریسی، جلد ا، ص ۱۲۵۔

روز اس نے ایسی جاں بازی کا ثبوت دیا کہ خود محمد ثانی کی زبان سے بے اختیار اس کی تحسین نکل گئی اور اس نے کہا "کاش یہ شخص میرے فوجی سرداروں میں ہوتا" بہر حال مغربی یورپ سے مختلف حکومتوں نے جو فوج بھیجی تھی اس کی مجموعی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی، ان کو شامل کرنے کے بعد قسطنطین کی تمام فوج صرف نو ہزار تک پہنچی تھی، تعجب یہ ہے کہ قسطنطین کی درخواست کا کوئی اثر فرانس، جرمنی، ہنگری اور پولینڈ پر نہ ہوا اور سلطنتیں جو بار بار ایک عظیم الشان مسیحی اتحاد قائم کر کے ترکوں کو یورپ سے نکالنے کے لیے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھتی تھیں، قسطنطنیہ کے اس آخری لمحۂ حیات میں جب کہ ان ہی ترکوں کے ہاتھوں سلطنت بازنطینی کا خاتمہ ہو رہا تھا، کامل بے حسی اور بے پروائی کے ساتھ اپنے اپنے مقام سے اس منظر کو دیکھتی رہیں، بعض مورخین کا خیال ہے کہ قسطنطین کے معاملہ سے یورپ کو زیادہ دلچسپی نہ تھی مگر ہمارے نزدیک عیسائی سلطنتوں کے اس طرز عمل کا باعث کچھ اور ہی تھا، گذشتہ ۶۵ سال کے اندر ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے کی غرض سے انہوں نے چار مرتبہ مذہبی اتحاد کے ذریعہ اپنی تمام قوتوں کو یکجا کیا لیکن ہر بار انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی اور مسیحی اتحاد کا شیرازہ بندھ بندھ کر منتشر ہوتا گیا، کسووا (۱۳۸۹ء)، نائیکوپولس (۱۳۹۶ء) وارنا (۱۴۴۴ء) اور کسووا (۱۴۴۸ء) کی تباہ کن شکستیں اتنی تازہ تھیں کہ یورپ اس قسم کے کسی مزید تجربہ کے لیے تیار نہ تھا اور باوجود اس کے کہ قسطنطین نے اپنا اور اپنی سلطنت کا مذہب تبدیل کر کے کلیسائے روم کی اطاعت قبول کر لی اور وہ کر ڈالا جو صدیوں کی کوشش کے بعد بھی مغربی یورپ کی تمام قوتیں انجام نہ دے سکی تھیں، یورپ کے جمود میں کوئی محسوس حرکت پیدا نہ ہوئی اور قسطنطنیہ کی دیواروں کو آخر کار محمد فاتح کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

محاصرہ ۲۶ ربیع الاول ۸۵۷ھ (۶ اپریل ۱۴۵۳ء) کو محاصرہ شروع ہوا، دوران محاصرہ میں یونانیوں نے غیر متوقع شجاعت اور استقلال کا ثبوت دیا، جسٹینانی کی فوجی مہارت خاص طور پر نمایاں تھی اور وہ اپنی قابلیت کے جوہر دکھا کر بار بار سلطان سے خراج

تحسین وصول کر رہا تھا، بری فوج کے حملہ کا ابھی کوئی معمولی اثر بھی ظاہر نہ ہونے پایا تھا کہ وسط اپریل میں ایک مختصر سی بحری جنگ پیش آگئی، ایک یونانی اور چار جنوی جہاز اہل قسطنطنیہ کے لیے سامان رسد لا رہے تھے، بحر مامورا کو عبور کرنے کے بعد جب وہ آبنائے باسفورس میں بمشکل داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ ۱۴۰ عثمانی کشتیاں ان کی راہ میں حائل ہیں، جس وقت یہ جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچے ترکی بیڑے نے حملہ کر دیا لیکن جنوی جہاز عثمانی کشتیوں کے مقابلہ میں بہت اونچے اور طاقت ور تھے، انہوں نے عثمانی کشتیوں پر پتھر اور آگ برسانا شروع کر دیا جس سے ان میں انتشار پیدا ہو گیا اور یہ انتشار ان کی کثرت تعداد کی وجہ سے اور بھی بڑھ گیا، سلطان ساحل پر کھڑا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے بے اختیار اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا لیکن ترکی بیڑا اس وقت تک اس قدر منتشر ہو چکا تھا کہ عیسائی جہازوں کو نکل جانے کا راستہ مل گیا اور وہ اہل قسطنطنیہ کے نعرہ ہائے مسرت کے ساتھ بحفاظت بندرگاہ میں پہنچ گئے۔

جنوی جہازوں کی اس شاندار فتح کا اخلاقی اثر محصورین پر بہت اچھا پڑا، ان میں جرأت واستقلال کی ایک نئی روح پیدا ہو گئی، تاہم صرف اس روح کا پیدا ہو جانا ہی مدافعت کے لیے کافی نہ تھا، جنوی رسد کے بعد پھر کوئی رسد انہیں باہر سے نہ مل سکی، دوسری طرف محمد نے بھی اپنی پہلی بحری شکست کے بعد محاصرہ کی سختی کے لیے ایک زیادہ موثر تدبیر سوچی، اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ آبنائے باسفورس کے اس حصے میں جہاں پانی زیادہ گہرا تھا، ترکی بیڑا عیسائیوں کے طاقت ور جہازوں کے مقابلہ میں مشکل سے کام یاب ہو سکتا تھا، لہٰذا اس نے اپنی کشتیوں کی ایک بڑی تعداد بندرگاہ کے بالائی حصہ میں منتقل کر دینا چاہی، جہاں پانی تنگ اور چھچھلا تھا اور جس میں یونانی اور جنوی جہاز اپنے قد وقامت کی وجہ سے کام یاب نہیں ہو سکتے تھے، سمندر کے راستے سے بندرگاہ کے اس حصے تک پہنچنا ممکن نہ تھا، اس لیے محمد نے ایک ایسی صورت اختیار کی جو اس کی ذہانت اور آہنی عزم واستقلال کی ایک غیر فانی مثال ہے، باسفورس اور بندرگاہ

قسطنطنیہ کے درمیان پانچ میل کا فاصلہ ہے، اس نے اس درمیانی پہاڑی زمین پر لکڑی کے تختوں کی ایک سڑک بنوائی اور ان تختوں کو چربی سے خوب چکنا کروا دیا اور ایک رات کے اندر اسی کشتیاں بیلوں سے کھنچوا کر بندرگاہ کے اس حصہ میں پہنچا دیں، قسطنطنیہ کا یہ حصہ اب تک بالکل محفوظ تھا، ترکی کشتیوں کے پہنچ جانے سے اب یہ بھی حملہ کی زد میں آ گیا اور قسطنطین کو مجبوراً سپاہیوں کا ایک دستہ شہر کے دوسرے حصہ سے ہٹا کر اس حصہ میں متعین کرنا پڑا۔

اس درمیان میں شہر کی دوسری سمتوں میں برابر حملے ہو رہے تھے لیکن ان زبردست دیواروں پر جو ایک ہزار سال سے دشمنوں کا مقابلہ کر رہی تھیں، ہنوز ان حملوں کا کوئی اثر ظاہر نہ تھا، بالآخر سات ہفتوں کی متواتر گولہ باری کے بعد دیواروں میں تین مقامات پر شگاف نمودار ہوئے اور محمد کو آخری حملہ کی کامیابی کا یقین ہو گیا، ۵ر جمادی الاولی ۸۵۷ھ (۲۴ر مئی ۱۴۵۳ء) کو اس نے قسطنطین کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ شہر کو سپرد کر دے تو رعایا کی جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور موریا کی حکومت اسے دے دی جائے گی لیکن قسطنطین نے اسے منظور نہ کیا، اس کے بعد محمد نے فوج میں اعلان کرا دیا کہ ۲۰ر جمادی الاول (۲۹ر مئی) کو آخری حملہ ہو گا۔

سقوطِ قسطنطنیہ: ۲۰ر جمادی الاول ۸۵۷ھ (۲۹ر مئی ۱۴۵۳ء) کی رات ترکوں نے تسبیح و تہلیل میں گزاری اور فریضۂ فجر ادا کرنے کے بعد حملہ شروع ہوا، حملہ مختلف سمتوں میں ہو رہا تھا لیکن سب سے زیادہ زور اس حصہ پر تھا جو دروازہ سینٹ رومانس کے قریب تھا، وہاں کی دیوار ترکی توپوں کی گولہ باری سے بہت کچھ مجروح ہو چکی تھی، عثمانی اور یونانی سپاہیوں کی تعداد میں کوئی مناسبت نہ تھی لیکن دوپہر سے پہلے تک انتہائی کوشش اور فتح کی پوری امید کے باوجود عثمانی فوج کا ایک سپاہی بھی شہر میں داخل نہ ہو سکا، قسطنطین اور اس کے ساتھیوں نے اس روز حیرت انگیز شجاعت کا ثبوت دیا اور ترکوں کی باڑھ کو بے حد پامردی سے روکتے رہے لیکن محمد بھی عزم و استقلال کا مجسمہ تھا، وہ ابتدائی ناکامیوں سے متاثر نہ ہوا اور اب خود اپنے ینی

چری دستوں کو لے کر آگے بڑھا، یونانی اس وقت تک بالکل خستہ ہو چکے تھے، ان میں اس تازہ حملہ کی تاب نہ تھی، اسی درمیان میں جسٹینانی کو جو گویا مدافعت کی روح تھا، ایک کاری زخم لگا، جس سے وہ کچھ ایسا خائف ہوا کہ جنگ سے بالکل کنارہ کش ہو گیا، ایسے نازک وقت میں جب محمد اپنی پوری قوت کے ساتھ حملہ کر رہا تھا، جسٹینانی کا اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر چلا جانا گویا شہر کو دشمن کے سپرد کر دینا تھا، لیکن قسطنطین کے شدید اصرار کے باوجود وہ کچھ دیر بھی نہ ٹھہرا اور فوراً بندرگاہ میں چلا گیا، اس کے ہٹتے ہی عیسائیوں میں کم زوری کے آثار نمایاں ہونے لگے، قسطنطین نے خود موقع پر پہنچ کر کمان اپنے ہاتھ میں لی مگر ینی چری کا حملہ اتنا سخت تھا کہ شہنشاہ اور اس کے بہادر سپاہیوں کی جاں بازی زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکی، ینی چری کا سردار آغا حسن اپنے تیس ہم راہیوں کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا اور اگرچہ حسن اور اس کے اٹھارہ ساتھی فوراً مار کر گرا دیے گئے تاہم باقی کام یاب رہے اور اس کے بعد ہی ترکی دستے بھی یکے بعد دیگرے پہنچ گئے، یونانیوں کے لیے اب کوئی امید باقی نہ رہی، قسطنطین نے اپنی سرخ عبا جو قیاصرہ کی امتیازی پوشاک تھی، اتار کر پھینک دی اور ترکی فوج کے بڑھتے ہوئے طوفان میں گھس کر ایک جاں باز اور سرفروش سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا۔

فاتح کا داخلہ چند لمحوں کے اندر قسطنطنیہ ترکوں کے پے در پے دستوں سے بھر گیا، پہلے تو انہوں نے فتح کے ابتدائی جوش میں قتل عام شروع کر دیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب یہ جوش کسی قدر ٹھنڈا ہوا اور نیز یہ دیکھ کر کہ شہر والوں کی طرف سے مزاحمت نہیں ہوتی، انہوں نے اپنی تلواریں نیام میں کر لیں اور مال غنیمت کے حاصل کرنے میں مصروف ہو گئے، ظہر کے قریب سلطان محمد فاتح اپنے وزرا اور امرائے سلطنت کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، سینٹ صوفیا کے گرجے کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترا اور اس عالی شان معبد میں داخل ہو کر، جس میں گیارہ سو برس سے تین خداؤں کی پرستش ہوتی آئی تھی، خدائے واحد کی تسبیح و تقدیس کے لیے سر بسجدہ ہوا اور موذن کو حکم دیا کہ اللہ کے بندوں کو اس کی عبادت کے لیے آواز

دے، فتح کے دوسرے روز محمد نے شہر کا جائزہ لیا، جب قیاصرہ کے شاہی محل میں پہنچا اور اس کے ویران اور اجڑے ہوئے ایوانوں پر نظر پڑی تو بے اختیار اس کی زبان پر یہ شعر آ گیا۔

پردہ داری می کند بر قصر کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

قسطنطنیہ میں داخل ہونے کے بعد ترکوں نے جو کچھ کیا وہ تاریخ کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا، قرونِ وسطیٰ کے دستورِ جنگ میں مفتوحین کی جان و مال تمام تر فاتح کی ملک ہوتی تھی، جس پر اسے ہر طرح کا اختیار حاصل ہوتا تھا، یورپ کی سلطنتوں نے اس اختیار کے استعمال میں کبھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور ظلم و تعدی کی ایسی ہولناک مثالیں پیش کیں جو تخیل میں بھی بمشکل آ سکتی ہیں، جب کبھی انہوں نے مسلمانوں پر فتح پائی وہ سب کچھ کر ڈالا جو تاریخ مظالم کے روشن ترین کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے، اس کے مقابلہ میں ترکوں نے قسطنطنیہ میں داخل ہو کر جو کچھ کیا وہ حقیقۃً کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا، بلاشبہ شروع شروع میں جو بھی سامنے آیا اس کو قتل کر دیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور مدافعت کی قوت ان میں باقی نہیں رہی تو فوراً ہی اپنی تلواریں نیام میں کر لیں اور مال غنیمت کے جمع کرنے میں مصروف ہو گئے، یہ سلسلہ تین روز تک جاری رہا، چوتھے روز سلطان نے امن عام کا اعلان کیا اور سپاہیوں کے ہاتھ دفعۃً رک گئے، اس موقع پر ایورسلے لکھتا ہے:

> ''اگرچہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کیے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فتح قسطنطنیہ کے موقع پر ویسی نفرت انگیز بدمستیوں کا مظاہرہ ہوا جیسی ۱۲۰۴ء میں دیکھی گئی تھیں جب کہ محاربین صلیبی نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے ابتدائی چند گھنٹوں کے بعد اس موقع پر کوئی قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب رہا۔''[1]

---

[1] لارڈ ایورسلے ص ۸۸۔

عیسائیوں کی مذہبی اور ملی آزادی یکم جون ۱۴۵۳ء کو سلطان نے امن عام کا اعلان کیا اور ان تمام عیسائیوں کو جو قسطنطنیہ سے بھاگ گئے تھے، واپس آنے کی دعوت دی۔ اس نے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا اور انہیں آمادہ کیا کہ آ کر اپنے پیشوں اور کاروبار میں پھر بدستور مشغول ہو جائیں، اس کے بعد اس نے یونانی کلیسا کے بطریق کو از سرنو اس کے عہدہ پر مامور کیا اور کلیسا کی سرپرستی خود قبول کی، ایک خاص فرمان کے ذریعہ یونانی بطریق کی ذات محترم قرار دی گئی، وہ اور نیز اس کے کلیسا کے دوسرے عہدہ دار تمام ٹیکسوں سے بری کر دیے گئے، اسی فرمان کے ذریعہ یونانیوں کے نصف گرجے انہیں واپس کر دیے گئے اور ان کو اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دے دی گئی، اس فرمان میں سلطان نے انہیں اس امر کی بھی اجازت دی کہ وہ اپنے قومی معاملات اپنی ملی عدالتوں میں طے کر لیا کریں، ان عدالتوں کا صدر کلیسا کے بطریق جارج گنادیس (George Gennadius) کو مقرر کیا جو خود یونانیوں کا منتخب کردہ تھا، سلطان نے یونانیوں کے قانونِ نکاح اور قانونِ وراثت کو بدستور قائم رکھا اور ان کا نفاذ بطریق اور مذہبی عدالتوں کے سپرد کیا، پروفیسر آرنلڈ اپنی مشہور کتاب ''دعوتِ اسلام'' میں سلطان محمد فاتح کی اس رواداری کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور شہر میں امن ہونے کے بعد پہلا انتظام یہ کیا کہ وہ یونانی کلیسا کا حامی اور سرپرست بنا تاکہ عیسائی اس کی اطاعت قبول کریں، عیسائیوں پر سختی ہونے کی ممانعت کر دی اور ایک فرمان جاری کیا جس کے بموجب قسطنطنیہ کے نئے بطریق اور اس کے جانشینوں اور ماتحت اسقفوں کو قدیم اختیارات جو حکومت سابقہ میں ان کو حاصل تھے، دیے گئے اور جو ذریعے ان کی آمدنی کے تھے وہ بحال ہوئے اور جن قواعد سے وہ مستثنیٰ تھے ان سے بدستور مستثنیٰ کیے گئے، گنادیوس کو جو ترکوں کی فتح کے بعد قسطنطنیہ کا پہلا بطریق ہوا، سلطان نے اپنے ہاتھ سے وہ عصا عنایت فرمایا جو اس کے منصب کا نشان تھا اور ایک خریطہ میں جس میں ایک ہزار اشرفیاں تھیں اور ایک گھوڑا جس پر بہت تکلف کا سامان تھا،

> اس کو دیا اور اجازت دی کہ وہ اپنے قدیم سامان جلوس کے ساتھ شہر میں سوار ہو کر دورہ کرے۔ ترکوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ کلیسا کے سب سے بڑے افسر کی وہی عزت اور وقعت قائم رکھی جو اس کو عیسائی شہنشاہان روم کے وقت میں حاصل تھی بلکہ عدالت کے وسیع اختیارات بھی اس کو دیے۔ بطریق قسطنطنیہ کی، ایسے کل مقدمات کا جن میں فریقین مسیحی المذہب ہوں، فیصلہ کرتی تھی، جرمانہ کرنے اور مجرموں کو قید کی سزا دینے کے اختیارات جس کے لیے علاحدہ قید خانے بنے ہوئے تھے اور خاص صورتوں میں سزائے موت کے حکم دینے کا بھی اختیار اس کو حاصل تھا۔ وزرائے سلطنت اور ترکی حکام کو ہدایت تھی کہ اس عدالت کے فیصلوں کی تعمیل کریں۔ سابق کی عیسوی سلطنت نے رعایا کے مذہبی امور میں طرح طرح کی دست اندازیاں کی تھی لیکن ترکوں نے ان میں کچھ دخل نہیں دیا۔ بطریق اور اس کی مذہبی مجلس کو پورے اختیارات مذہب اور مذہبی انتظام کے بارہ میں حاصل ہوئے، بطریق مجاز تھا کہ مذہب مشوروں کی مجلس کو جب چاہے جمع کرے اور اس کے ذریعہ سے عیسوی فقہ اور اصول کے تمام مسائل کو بغیر سلطنت کی مداخلت کے طے کرے اور چوں کہ ایک حیثیت سے وہ سلطانی عہدہ دار بھی تھا، اس لیے اس کے اختیار میں تھا کہ مصیبت زدہ عیسائیوں کی حالت کی اصلاح اس طرح کرے کہ ناانصاف ترکی گورنروں کے کاموں سے سلطان کو اطلاع کر دے۔ یونانی اسقف جو اضلاع میں تھے، ان کی بھی بہت عزت تھی اور عدالت کے اختیارات ان کو اس قدر دیے گئے تھے کہ موجودہ زمانہ تک انہوں نے اپنے علاقوں میں عیسائیوں پر ترکی حاکموں کی طرح حکومت رکھی[1]۔"

لارڈ ایورسلے کو بھی تسلیم ہے کہ "محمد کی یہ عظیم الشان رواداری اس عہد کی مسیحی یورپین حکومت کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اہل اسپین نے ان مسلمان موروں کو جنہوں نے اپنے کو گرفتار کرنے والوں (عیسائیوں) کا مذہب اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان کے ملک سے نکالتے وقت اس کے نمونہ پر عمل نہیں کیا...... یونانیوں یا قسطنطنیہ کے

---

[1] دعوت اسلام از پروفیسر آرنلڈ (ترجمہ اردو)، ص ۲۵-۱۶۴۔

دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔"

قسطنطنیہ کی جدید آبادی عیسائیوں کو مذہبی آزادی کا پروانہ عطا کرنے کے بعد محمد قسطنطنیہ کو از سر نو آباد کرنے کی طرف متوجہ ہوا، عرصہ سے قسطنطنیہ کی آبادی برابر کم ہوتی جا رہی تھی، سلطان کی ترغیب اور حوصلہ افزائی سے شہر کے اکثر باشندے جو بھاگ گئے تھے، واپس آ گئے، سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں سے بھی بہت سے یونانی اور یہودی اور ترک خاندانوں کو منتقل کر کے قسطنطنیہ میں آباد کیا گیا، اس کے علاوہ دوسری فتوح کے بعد محمد نے مفتوحہ ممالک کے ہزاروں باشندوں کو وہاں لا کر بسایا، اس کے عہد حکومت کے خاتمہ پر قسطنطنیہ اپنے آخری یونانی فرماں رواؤں کے زمانہ سے بہت آباد اور خوش حال تھا، لیکن اب اس شہر کی خالص یونانی حیثیت فنا ہو چکی تھی اور یونانیوں کے ساتھ ترکی، البانی، بلغاری اور سروی عنصر بھی بکثرت اس کی آبادی میں شامل ہو گیا تھا۔

دارالسلطنت قسطنطنیہ کی فتح عثمان کے خواب کی تعبیر تھی، یہی شہر اس انگشتری کا نگینہ تھا، جسے عثمان اپنی انگلی میں پہننا چاہتا تھا، لیکن جو ازل سے محمد فاتح کے لیے مقدر ہو چکی تھی، محمد نے قسطنطنیہ کو سلطنت عثمانیہ کا پایہ تخت بنا لیا، کسی نے اس فتح مبین کی تاریخ "بلدۃ طیبہ" (۸۵۷ھ) سے نکالی جو قرآن پاک کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔

قسطنطنیہ کے سابق محاصرے قسطنطنیہ کی بنیاد بازنطیم (Byzantium) کے نام سے ۶۵۸ قبل مسیح میں پڑی تھی، اس وقت سے لے کر اس کی فتح تک انتیس بار اس شہر کا محاصرہ ہو چکا تھا، لیکن صرف آٹھ مرتبہ دشمن کی فوج اس کے اندر داخل ہو سکی، وان ہیمر (Von Hammer) نے اپنی مستند اور ضخیم تاریخ دولت عثمانیہ میں ان تمام محاصروں کا ذکر کیا ہے[1]، مسلمانوں نے بھی اس سے پہلے آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے یقین پر گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تھا، مسند امام حنبل کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "تم ضرور قسطنطنیہ فتح کرو گے اور

---

[1] ایجر سلے ص ۸۹ ترجمہ کریسی جلد ا ص ۲۰-۲۹ و فٹ نوٹ۔

فوج بھی خوب ہے اور اس کا امیر بھی خوب ہے"، نیز بخاری، مسلم اور مسند ابن حنبل میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا ہے" چنانچہ اس سعادت اور مغفرت کے حصول کے لیے سب سے پہلے حضرت امیر معاویہ ؓ نے ۴۸ھ (۶۶۸ء) میں ایک لشکر قسطنطنیہ کی فتح کے لیے روانہ کیا، اس مہم میں بہت سے صحابہ کرامؓ نے بھی شرکت فرمائی، مثلاً حضرت ابوایوب انصاری ؓ، حضرت ابن عباس ؓ، حضرت ابن عمر ؓ، حضرت ابن زبیر ؓ، حضرت عبادہ ؓ بن صامت، حضرت ابودرداء ؓ وغیرہ، بعض روایتوں میں ہے کہ اس لشکر کے سپہ سالار حضرت سفیان بن عوف ؓ تھے، بعض کے نزدیک اس کی قیادت یزید بن معاویہ ؓ کے ہاتھ میں تھی، محمد فرید بک نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے سب سے پہلے ۳۲ھ (۶۵۲ء) میں حضرت علی ؓ کے زمانہ خلافت اور امیر معاویہ ؓ کی سرکردگی میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا[1]، وان ہیمر نے بھی تصریح کی ہے کہ عربوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ پہلی مرتبہ ۳۲ھ (۶۵۲ء) میں کیا اور اس فوج کے سپہ سالار حضرت امیر معاویہ ؓ تھے لیکن اور تاریخوں سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی، بظاہر فرید بک کی روایت وان ہیمر ہی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے، وان ہیمر نے مسلمانوں کے دوسرے محاصرہ کی تاریخ ۴۷ھ (۶۶۷ء) درج کی ہے اور یزید بن معاویہ ؓ کو سالارِ عسکر لکھا ہے، فرید بک نے بھی یہی نقل کیا ہے لیکن وہ اسے حضرت علی ؓ کی خلافت کا زمانہ بتاتے ہیں، حالاں کہ آپ اس محاصرہ سے سات سال قبل ۴۰ھ میں شہید ہو چکے تھے، بہر حال تیسرا محاصرہ وان ہیمر اور فرید بک کی روایت کی رو سے ۵۲ھ (۶۷۲ء) میں ہوا، حضرت امیر معاویہ ؓ نے حضرت سفیان بن عوف ؓ کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا، اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ کے زمانہ خلافت میں مسلمہ نے ۹۷ھ (۷۱۵ء) میں قسطنطنیہ کا

---

[1] تاریخ دولت عثمانیہ، ص ۱۰۔

محاصرہ کیا، پھر پانچواں حملہ خلیفہ ہشام کے عہد میں سنہ ۱۲۱ھ (۷۳۹ء) میں ہوا، چھٹا مہدی عباسی کے زمانہ میں سنہ ۱۶۴ھ (۷۸۰ء) میں ہارون الرشید کے زیر قیادت ہوا اور ساتواں ہارون الرشید کے سپہ سالار عبدالملک نے ۱۸۲ھ (۷۹۸ء) میں کیا، عربوں کے بعد عثمانی ترکوں کی باری آئی اور سلطان بایزید یلدرم نے دو بار محاصرہ کیا اور اگر تیمور اور بایزید کے درمیان تصادم نہ ہو گیا ہوتا تو سنہ ۸۰۵ھ (۱۴۰۲ء) میں قسطنطنیہ کا ترکوں کے ہاتھ میں آ جانا بظاہر یقینی تھا، بایزید کی وفات کے بعد اس کے لڑکے شہزادہ موسیٰ نے یہ حوصلہ پورا کرنا چاہا لیکن شہزادہ محمد کی مصلحت بینی اور بھائیوں کی باہمی جنگ نے قسطنطنیہ کے لیے سپر کا کام دیا، آخری بار سلطان مراد ثانی نے سنہ ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کی فتح کا عزم کیا مگر وہ شہنشاہ کی ندامت اور اظہار اطاعت سے متاثر ہو گیا اور محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

غرض سلطان محمد ثانی سے پہلے مجاہدین اسلام گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کر چکے تھے لیکن کامیابی کا سہرا اسی فاتح کا منتظر تھا اور صحابہ کرامؓ کے مقدس خون نے جس چمن زار امید کی آب یاری کی تھی، اس کے پھولوں کا تاج اسی فیروز بخت کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

جامع ایوب رضی اللہ عنہ | فتح کے تیسرے روز حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار کا انکشاف ہوا، آپ نے ۴۸ھ کے محاصرہ کے دوران میں وفات پائی تھی اور قسطنطنیہ کی فصیل سے متصل دفن ہوئے تھے، سلطان نے وہاں ایک مسجد تعمیر کرائی، جس کا نام جامع ایوب ہے اور اس وقت سے یہ دستور ہو گیا تھا کہ تخت نشینی کے موقع پر ہر سلطان اسی مسجد میں جا کر عثمان اول کی تلوار حمائل کرتا تھا اور یہ تقریب رسم تاج پوشی کے قائم مقام سمجھی جاتی تھی۔

دیگر فتوحات | اگرچہ قسطنطنیہ کی فتح محمد کا سب سے زیادہ شاندار کارنامہ ہے اور اسی بنا پر وہ فاتح کے لقب سے مشہور ہوا، تاہم یہ اس کے سلسلۂ فتوحات کی محض پہلی کڑی تھی، اس کا تیس سالہ عہد حکومت تمام تر ملک گیری اور توسیع سلطنت ہی میں گزرا، یہ طویل مدت اس نے تقریباً مسلسل میدان جنگ میں صرف کی اور شاذ ہی کوئی مہم ایسی پیش آئی جس کے بعد

اس کے یورپی یا ایشیائی مقبوضات میں کوئی نیا علاقہ شامل نہ ہوا۔

یونان ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) میں محمد نے یونان کا رخ کیا، وہاں قسطنطین کے دو بھائی دمتریس اور طامس دولت عثمانیہ کے باج گزار کی حیثیت سے علاحدہ علاحدہ حصوں پر حکمراں تھے، انہوں نے سلطان کے پہنچنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ اس کی خدمت میں اپنے سفیر بھیج کر فرماں برداری کا عہد کیا اور بارہ ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا۔

سرویا اس کے بعد ۸۵۸ھ ہی میں محمد سرویا کی طرف متوجہ ہوا اور سب سے پہلے سمندریہ پر حملہ کیا جو شاہ سرویا جارج برنیکووچ کی قیام گاہ تھا، چند ہی دنوں میں عثمانی توپوں کی گولہ باری نے اس شہر کو کھنڈر بنا دیا اور جارج برنیکووچ کو بھاگنا پڑا، ہونیاڈے یہ خبر سن کر فوراً سرویا کی مدد کے لیے روانہ ہوا اور اس نے ترکوں کے مقدمۃ الجیش کو، جو فیروز بے کی سرکردگی میں تھا، شکست دی لیکن اہل سرویا اپنے ملک میں ہنگری کے اقتدار کو ناپسند کرتے تھے، کلیسائے روما کی مذہبی تعدیوں نے سرویا کے باشندوں کو اس قدر برگشتہ کر دیا تھا کہ وہ علانیہ مسلمان ترکوں کو کیتھولک عیسائیوں پر ترجیح دیتے تھے اور عثمانی تسلط کو ہنگری کے اقتدار سے بدرجہا بہتر خیال کرتے تھے، چنانچہ اسی وجہ سے برنیکووچ نے تیس ہزار دوکات سالانہ خراج کے وعدہ پر سلطان سے صلح کر لی۔

محاصرۂ بلغراد دوسرے سال محمد پھر سرویا میں داخل ہوا اور جنوب کی طرف سے بڑھتا ہوا بغیر کسی مزاحمت کے بلغراد تک پہنچ گیا، اس کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر اور تین سو توپیں تھیں، یہ مہم دراصل بلغراد کی فتح کے لیے تھی جو اگرچہ سرویا کی شمالی سرحد پر واقع تھا لیکن اس وقت ہنگری کے قبضہ میں تھا اور گویا ہنگری کا دروازہ تھا، اس کی فتح سے ہنگری کی فتح کا راستہ کھل جاتا اور پھر آسٹریا تک عثمانیوں کو روکنا مشکل ہو جاتا، محمد نے بلغراد پہنچ کر فوراً اس کا محاصرہ کر لیا، بری فوج کے علاوہ شہر کی شمالی سمت میں عثمانی بیڑا دریائے ڈینوب پر قابض تھا، قسطنطنیہ کی فتح نے سارے یورپ کو خوف زدہ کر دیا تھا، جب محمد نے بلغراد کا محاصرہ کیا تو یورپ کے

تمام ملکوں میں ایک ہل چل مچ گئی اور پوپ نے صلیبی جنگ کا اعلان کر کے اپنے نمائندہ جان کاپسٹران (John Capistran) کو ساٹھ ہزار پرجوش مسیحی مجاہدوں کے ساتھ ہنگری کی مدد کے لیے روانہ کیا، ہونیاڈے نے مدافعت میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، آٹھ روز کی گولہ باری کے بعد ۲۱/ جولائی ۱۴۵۶ء کو سلطان نے ایک عام حملہ کا حکم دیا اور ترک شہر کے ایک حصہ میں داخل ہو گئے لیکن ابھی وہ پوری طرح قابض نہ ہو سکے تھے کہ عیسائیوں کے ایک زبردست حملہ نے ان کو پیچھے ہٹا دیا اور پھر دوسرے حملہ میں عثمانی دستے بالکل منتشر ہو گئے، یہ حال دیکھ کر محمد خود دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا لیکن اس کی حیرت انگیز شجاعت اس روز ترکوں کے قدم کو نہ روک سکی اور اسے بھی زخمی ہو کر میدان جنگ چھوڑنا پڑا، اس معرکہ میں پچیس ہزار ترک کام آئے اور ان کے پورے توپ خانہ پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا، محاصرہ اٹھا لیا گیا اور بلغراد کی فتح جو ہنگری اور ویانا کے حملوں کا مقدمہ تھی، پچاس سال کے لیے ملتوی ہو گئی، ہونیاڈے اس جنگ میں اس قدر زخمی ہو گیا تھا کہ بیس ہی روز کے بعد مر گیا، سلطان کو جب اس کی وفات کی اطلاع ہوئی تو اس نے افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ یورپ کا سب سے بڑا سپہ سالار جاتا رہا، دو مہینے بعد جان کاپسٹران کا بھی، جس کی عمر ستر سال ہو چکی تھی، انتقال ہو گیا۔

سرویا پر مکمل قبضہ بلغراد کا محاصرہ اٹھا لینے کے بعد محمد ادرنہ کو واپس گیا اور جارج برنیووچ پھر سرویا پر قابض ہوا لیکن اس کی عمر نوے سے متجاوز ہو چکی تھی اور تھوڑے ہی دنوں بعد ۸۶۱ھ (۱۴۵۷ء) میں اس کا انتقال ہو گیا، سرویا کی آزادی بھی اس کے بعد ڈیڑھ ہی دو سال قائم رہی، ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) میں یہ ایک باقاعدہ طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، ہونیاڈے کی وفات کے بعد صدر اعظم محمود پاشا نے سرویا میں داخل ہو کر دو سال کے اندر پورے ملک کو فتح کر لیا، تاہم یہ ممکن تھا کہ سلطان پھر خراج قبول کر کے سرویا کی خود مختاری بدستور قائم رہنے دیتا لیکن جارج برنکووچ کے مرنے کے بعد جو خانہ جنگیاں شروع ہوئیں ان سے ملک کی آزادی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا، جارج نے حکومت کا انتظام مشترک طور پر اپنی بیوہ اور تین لڑکوں

کے سپرد کیا تھا، ان میں بہت جلد جھگڑے شروع ہو گئے، سب سے چھوٹے لڑکے لازار نے اپنی ماں کو زہر دے دیا اور بھائیوں کو حکومت سے نکال دیا، اب وہ سرویا کا تنہا فرماں روا تھا، اس نے بیس ہزار طلائی سکے سالانہ کے خراج کا وعدہ کر کے سلطان کی سرپرستی بھی حاصل کر لی لیکن دوسرے ہی سال اس کا انتقال ہو گیا، اب محمد نے یہ طے کر لیا کہ سرویا کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بنا لے، ہونیاڈے مر چکا تھا، اہل سرویا میں مزاحمت کی ہمت نہ تھی، پچھلے ستر سال کی لڑائیوں کے بعد وہ ہر دام پر امن و صلح کے لیے تیار تھے، لازار کی بیوہ ہیلینا نے اپنے ملک کی سیاسی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اسے کلیسائے رومہ سے وابستہ کر دینا چاہا لیکن سرویا والوں نے سخت مخالفت کی اور علانیہ کہہ دیا کہ وہ ترکوں کو رومن کیتھولک عیسائیوں پر ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ امرائے سرویا نے صدر اعظم محمود پاشا کے بھائی کو بلا کر اپنا سردار مقرر کیا اور جب ہیلینا نے اسے قید میں ڈال دیا تو انہوں نے سلطان سے مدد کی درخواست کی، سمندریا نے اپنے پھاٹک عثمانی فوجوں کے لیے کھول دیے، جس کی تقلید اور شہروں نے بھی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) میں سرویا کا وجود بحیثیت ایک مستقل مملکت کے فنا ہو گیا[1]۔

بوسنیا کی فتح کلیسائے رومہ کے مظالم سے بوسنیا کے باشندے اہل سرویا سے بھی زیادہ عاجز تھے، انہوں نے بھی ترکوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھا، صدیوں سے وہاں لاطینی اور یونانی کلیساؤں کے معرکے گرم تھے، جن سے پریشان ہو کر بہت سے لوگ ان دونوں مسلکوں سے علاحدہ ہو گئے تھے اور اپنی عافیت کے لیے ایک نیا مذہب اختیار کر لیا تھا، جو بدعت بوگول (Bogumil Heresy) کے نام سے مشہور ہے لیکن اب اس جدید فرقہ کے لوگوں پر دوہرے مظالم ہونے لگے، وہ کبھی یونانی کلیسا کی شدید تعدیوں کا شکار ہوتے اور کبھی لاطینی کلیسا کی، یہ مظالم دیکھ کر اکثر اہل بوسنیا کو اسلام ہی کے دامن رحمت میں پناہ نظر آئی[2]، محمود پاشا کی فوج شاہ بوسینا کی تنبیہ کے لیے، جس نے خراج دینا روک دیا تھا، فاتحانہ بڑھتی آ رہی

---

[1] بلقان از طر، ص ۲۹۶ [2] جزیرہ نمائے بلقان اور شرق ادنی، از شیول لی، مطبوعہ لندن ۱۹۲۱ء، ص ۲۰۳۔

تھی، بہت سے قلعوں نے ترکوں کا خیر مقدم کیا، بادشاہ میں جب مقابلہ کی طاقت نہ رہی تو اس نے جان بخشی کے وعدہ پر ہتھیار ڈال دیے، مگر محمد نے خلاف معاہدہ اس کو اور اس کے لڑکے کو قتل کرا دیا، یوں بوسنیا بھی ۸۶۷ھ (۱۴۶۲ء) میں سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بن گیا، اس نے نوجوانوں میں سے تیس ہزار ینی چری فوج کے لیے چن لیے گئے اور اس کے اکثر امرا مشرف باسلام ہوئے۔

موریا پر قبضہ | موریا میں خاندان پلیولوگس کی حکومت کا بھی بتدریج خاتمہ ہو رہا تھا، طامس اور دمتریس نے خراج کے وعدہ پر اپنی خود مختاری قائم کر رکھی تھی لیکن جب بلغراد کی مہم میں سلطان کو ناکامی ہوئی اور یورپ کے مذہبی جوش نے ترکوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو ایک لمحہ کے لیے روک دیا تو موریا کے فرماں رواؤں کو بھی دولت عثمانیہ کی سیادت کا بار محسوس ہونے لگا، پوپ نے بھی ان کے جذبات کو برانگیختہ کیا، چنانچہ جب پوپ کا جنگی بیڑا بحر انجین میں نمودار ہوا تو طامس نے ہمت کر کے خراج کی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا، اس سے قبل بھی تین سال سے باوجود متعدد تقاضوں کے سلطان کو موریا سے خراج کی کوئی رقم وصول نہیں ہوئی تھی لیکن ابھی تک علانیہ انکار کی نوبت نہیں آئی تھی، اسی لیے محمد نے کسی قسم کی سختی بھی نہیں کی تھی، اب یہ انکار گویا بغاوت کا اعلان تھا، چنانچہ وہ ۸۶۳ھ (۱۴۵۸ء) میں ایک بڑی فوج لے کر خود موریا آیا اور متعدد قلعوں کو فتح کرتا ہوا پتراس پہنچا جو طامس کا مستقر تھا، پتراس کے باشندے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے، قلعہ کے فوجی دستے نے بھی مزاحمت کی جرأت نہ کی، محمد نے پتراس کے باشندوں کے ساتھ بڑی فیاضی اور کشادہ دلی کا برتاؤ کیا، اس کے بعد کورنتھ فتح ہوا، کورنتھ کے باشندوں کے ساتھ بھی اس نے ویسی ہی مراعات کی اور انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا لیکن وہاں کے بہت سے لوگوں کو اس نے قسطنطنیہ اور اس کے مضافات میں لے جا کر آباد کیا، یہ لوگ کاریگر اور کاشت کار تھے، طامس اور دمتریس کو اب صلح کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، محمد نے ان کی درخواست قبول کی اور صلح نامہ کے

حملہ کے بعد وہ موریا سے چلا گیا لیکن اس کے جاتے ہی ان بھائیوں نے پھر شورش برپا کرنی شروع کی[1]، محمد کو مجبوراً لوٹنا پڑا، اب کی بار اس نے تہیہ کرلیا کہ موریا کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بنا کر رہے گا، دمتریس نے اپنے کو مسترا (Mystra) کے قلعہ میں بند کرلیا اور مدافعت کی کوشش کی مگر بہت جلد اسے ہتھیار ڈال کر قلعہ ترکوں کے سپرد کردینا پڑا، محمد نے اس کے اخراجات کے لیے تھریس کا ایک شہر اور اس کے قریب امبروس (Imbros) لمنوس (Lemnos) اور ساموتھریس (Samothrace) کے جزیرے دے کر اسے اور شہ بھیج دیا، مگر کچھ دنوں کے بعد یہ جاگیریں بھی ضبط کرلی گئیں اور محمد نے ان کے بجائے پچاس ہزار ایسپر (Asper) بطور پنشن کے مقرر کردیے[2] لیکن دمتریس نے آخر میں رہبانیت اختیار کرلی اور ۸۷۵ھ (۱۴۷۰ء) میں اس کا انتقال ہوا، دمتریس کے بعد محمد طامس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے علاقہ کے شہروں کو یکے بعد دیگرے فتح کرنا شروع کیا، طامس نے اپنے مقبوضات کو بچانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی اور اپنے خاندان کے ساتھ جہاز پر سوار ہوکر کارفو چلا گیا لیکن تین ہی مہینہ کے بعد اس نے کارفو کو بھی خیرباد کہا اور رومہ پہنچ کر پوپ کے دامن میں پناہ لی، وہیں ۸۷۰ھ (۱۲ مئی ۱۴۶۵ء) میں اس کا انتقال ہوگیا، محمد نے موریا کے تمام علاقوں کو فتح کرکے ان پر قبضہ کرلیا، ۸۶۴ھ (۱۴۶۰ء) میں موریا بھی سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ ہوگیا۔

کرمانیہ اسی زمانہ میں ایشیائے کوچک کے بعض حصوں پر بھی جو ابھی تک سلطنت عثمانیہ میں شامل نہ تھے، قبضہ کیا جارہا تھا، کرمانیہ اور دولت عثمانیہ کی عداوت قدیم سے چلی آرہی تھی، محمد کی تخت نشینی کے چند دنوں بعد کرمانیہ کے امیر ابراہیم نے خراج ادا کرنے کا معاہدہ کرکے سلطان سے صلح کرلی تھی اور وہ آخر دم تک اس معاہدہ پر قائم رہا، اس کے انتقال کے بعد اس کے لڑکوں میں ریاست کے لیے جنگ چھڑ گئی، محمد نے ان سب کو برطرف کرکے خود کرمانیہ پر قبضہ کرلیا اور اسے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مقالہ "موریا" ص ۵۷۳-۳۷۴ [2] گبن، جلد ۴، ص ۵۰۳-۵۰۵۔

طرابزون اور سینوپ | ایشیائے کوچک میں سینوپ اور طرابزون پر اب تک دولت عثمانیہ کا قبضہ نہ ہوا تھا، محمد نے پہلے سینوپ کے مضبوط شہر پر حملہ کیا، اسماعیل بیگ امیر سینوپ کی چار سو توپیں اور دس بارہ ہزار سپاہی تھے، وہ بھی مقابلہ نہ کرسکے اور اس نے شہر سلطان کے حوالہ کردیا، اس کے بعد محمد طرابزون کی طرف متوجہ ہوا، طرابزون کا شہر اور ملحق علاقے قدیم بزنطینی سلطنت کا جزو تھے، ۶۰۱ھ (۱۲۰۴ء) کے بعد سے جب کہ قسطنطنیہ پر محاربین صلیبی کا قبضہ ہوگیا تھا، طرابزون نے ایک جداگانہ مملکت کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) میں محمد نے اسے فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، اب ایشیائے کوچک کے تمام علاقے سلطنت عثمانیہ کے دائرے میں آگئے، بحر اسود کے ساحل پر جنوا کے جو مقبوضات تھے وہ بھی فتح کرلیے گئے۔

یونانی مجمع الجزائر | محمد نے یونانی مجمع الجزائر کے بہت سے جزیروں پر بھی جو وینس اور جنوا کے زیر حکومت تھے، حملہ کرکے انہیں فتح کرلیا، ان میں سے لسبوس (Lesbos) لمنوس (Lemnos) اور سیفالونیا (Cephalonia) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جزیرہ یوبیا (Uboea) کا بھی یہی حشر ہوا، یہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا، جس کے اور مقبوضات بھی جو موریا کے ساحل پر واقع تھے، سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیے گئے۔

کریمیا | قسطنطنیہ کے بعد محمد کا سب سے اہم کارنامہ کریمیا کی فتح تھی، جس کا سہرا دولت عثمانیہ کے مشہور سپہ سالار صدر اعظم احمد کدک پاشا کے سر ہے، کریمیا پر حملے کے دو خاص اسباب تھے، ایک سبب تو یہ تھا کہ اس زمانہ میں جنوا سے دولت علیہ کے تعلقات بہت خراب ہوگئے تھے اور کریمیا میں کافہ کا مضبوط شہر جنوا کے قبضہ میں تھا، دوسرا سبب یہ ہوا کہ خود خان کریمیا نے، جسے اس کے باغی بھائیوں نے تخت سے اتار دیا تھا، محمد سے مدد کی درخواست کی لیکن ان اسباب کے علاوہ کریمیا کا محل وقوع بھی قسطنطنیہ کے تخت نشینوں کے لیے حد درجہ اہم تھا اور محمد جیسے بیدار مغز سلطان کی نظر سے یہ امر پوشیدہ نہ تھا کہ عثمانی

مقبوضات کے تحفظ کے لیے کریمیا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینا کس حد تک ضروری ہے، چنانچہ ۸۸۰ھ (۱۴۷۵ء) میں احمد کدک نے جنگی بیڑے اور چالیس ہزار فوج کے ساتھ پہلے کافہ پر حملہ کیا، اس شہر نے جو اپنی دولت اور مضبوطی کے لحاظ سے قسطنطنیۂ کوچک کہلاتا تھا، چار روز میں ہتھیار ڈال دیے، بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا، چالیس ہزار باشندے قسطنطنیہ کو منتقل کر دیے گئے اور ڈیڑھ ہزار نوجوان جنوی امراء ینی چری فوج میں داخل کیے گئے، پھر سرعت کے ساتھ پورے ملک پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا اور کریمیا کی آزادی ختم ہو گئی، اس کے بعد تین سو برس تک کریمیا کے خان دولت عثمانیہ کے محکوم رہے۔

ولاچیا اسی زمانہ میں ولاچیا کے مظلوموں کی دردناک چیخیں قسطنطنیہ پہنچیں، جنگ کسووا (۱۳۸۹ء) کے بعد ولاچیا نے دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کر لی تھی، سلطان محمد ثانی کے وقت میں اس ریاست کا امیر ولاد چہارم (Vlad IV) تھا، اس نے سلطان کے خلاف بغاوت کر دی اور عثمانی تاجروں کو جو ولاچیا میں قیام پذیر تھے، سخت اذیتوں کے ساتھ قتل کرا دیا، اس کا دست عقوبت خود اپنے ملک والوں پر بھی دراز تھا، اس کے مظالم اس قدر بڑھ گئے تھے کہ وہ ''ڈراکول'' (Drakul) یعنی شیطان کے لقب سے مشہور تھا، اسے لوگوں کو قتل کرنے میں خاص لطف آتا تھا اور قتل کے عجیب و غریب طریقے ایجاد کرتا رہتا تھا لیکن سب سے زیادہ لطف اسے جسم میں میخیں ٹھونک کر قتل کرانے میں آتا تھا، اکثر کئی کئی سو آدمیوں کو ایک ساتھ اس طریقہ سے قتل کراتا اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں سے اس کی شیطانی روح کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی تھی، شیویل لکھتا ہے کہ اس کے ہم عصر بھی، جن میں سے کسی کا دامن مظالم کے دھبوں سے پاک نہ تھا، اس کی تعذیب کے انوکھے طریقوں سے ہیبت زدہ تھے اور اس کو ولاد دی امپیلر (Vlad The Impaler) (یعنی میخیں ٹھکوا کر قتل کرنے والا) کہتے تھے، غرض جب اس کے مظالم کی فریاد قسطنطنیہ پہنچی تو سلطان ایک زبردست فوج لے کر اس کی تنبیہ کے لیے روانہ ہوا لیکن قبل اس کے کہ وہ حملہ آور ہو، ولاد نے اس کی خدمت

میں ایک وفد بھیجا اور اس کی سیادت قبول کر کے دس ہزار ڈوکات سالانہ خراج ادا کرنے کا عہد کیا اور یہ درخواست کی کہ سلطان کی جانب سے اس معاہدہ کی از سر نو تصدیق کر دی جائے جو ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں بایزید یلدرم اور امیر ولاچیا کے درمیان ہوا تھا۔ محمد نے اسے منظور کیا اور واپس چلا آیا لیکن یہ معاہدہ ولاد کا محض ایک وقتی حیلہ تھا، وہ اس بہانہ سے سلطان کو ٹال کر ہنگری کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا، چنانچہ عثمانی فوجوں کے واپس ہوتے ہی اس نے ہنگری سے اتحاد کر کے پھر اپنی سابق معاندانہ روش اختیار کر لی۔ محمد کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے حالات کی تحقیق کے لیے اپنے نمائندے ولاچیا میں بھیجے، ولاد نے ان نمائندوں کو قتل کر دیا، اس کے بعد اس نے بلغاریا کے علاقوں میں جو دولت علیہ کے ماتحت تھے، لوٹ مار شروع کر دی اور بے حد مظالم کیے، وہ بلغاریا کے پچیس ہزار باشندوں کو بھی پکڑ لایا، یہ سن کر محمد نے پھر اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنے حدود سے متجاوز نہ ہو اور ان قیدیوں کو رہا کر دے، ولاد نے اس کے جواب میں سلطانی ایلچیوں کے سروں میں میخیں ٹھکوا کر انہیں فوراً ہلاک کر دیا، اب محمد کے لیے حملہ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، وہ ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ اس ظالم کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، ولاچیا کے شہر یکے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے، یہاں تک کہ پایہ تخت بخارست پر بھی عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا لیکن ولاد ہاتھ نہ آیا، اس نے بھاگ کر شاہ ہنگری کے یہاں پناہ لی۔ محمد جب بخارست پہنچا تو اس نے وہاں ان قیدیوں کی لاشیں دیکھیں جن کو ولاد بلغاریا سے پکڑ لایا تھا، ان لاشوں کی تعداد بیس ہزار تھی، ان میں بچے اور عورتیں بھی تھیں، بہر حال محمد نے ولاد کو معزول کر کے اس کے بھائی رادول (Radul) کو جو اس کا معتمد علیہ تھا، اور جس کی تربیت بھی سلطان ہی کے زیر نگرانی ہوئی تھی، ولاچیا کا امیر مقرر کیا اور ولاد نے خون کی جو نہر جاری کر رکھی تھی وہ کسی طرح ختم ہوئی، ولاچیا پھر سلطنت عثمانیہ کی ایک اطاعت گزار ریاست ہو گئی۔ محمد نے اسے مکمل طور پر اپنی سلطنت میں ضم کر لینے پر اصرار نہیں کیا بلکہ صرف اطاعت اور خراج پر قناعت کی۔

البانیا اور ہرزیگووینا البانیا ابھی تک زیر نہ ہوسکا تھا، اسکندر بیگ محمد فاتح کا مقابلہ بھی اسی طرح کرتا رہا جس طرح اس نے مراد ثانی کا کیا تھا۔ محمد چاہتا تھا کہ اگر اسکندر بیگ خراج دینا منظور کرلے تو لڑائی ختم کردی جائے مگر اس نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کردیا، عثمانی فوجیں البانیا پر مکمل قبضہ نہ پاسکیں اور آخر کار ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) میں سلطان نے اسکندر بیگ کو البانیا اور اپائرس کا فرماں روا تسلیم کرلیا۔ چھ سال کے بعد اسکندر بیگ کا انتقال ہوگیا، اب البانیا کی فتح میں کوئی دشواری باقی نہ رہ گئی تھی، محمد نے آسانی کے ساتھ اسے مسخر کرلیا اور البانیا اور اپائرس کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا، اس کے بعد ہرزیگووینا کا علاقہ بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کرلیا گیا۔

وینس البانیا کی فتح کے بعد اٹلی ترکوں کی زد میں آیا، جس طرح ہونیاڈے نے شمال میں عثمانی فوجوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو چند دنوں تک روک رکھا تھا، اسی طرح اسکندر بیگ بھی مغرب میں ان کی راہ روکے ہوئے کھڑا تھا، اس کے مرنے کے بعد ہی اٹلی کا راستہ کھل گیا اور وینس پر حملہ کا مسئلہ زیر غور آگیا، جمہوریہ وینس نے فتح قسطنطنیہ کے دوسرے ہی سال سلطان سے بمنت صلح کی درخواست کی تھی اور اس صلح نامہ کے ذریعہ محمد نے تقریباً وہ تمام تجارتی مراعات جو وینس کو بازنطینی شہنشاہوں کے عہد میں حاصل تھیں، اسے عطا کردی تھیں لیکن اسکندر بیگ کی کامیابیوں نے وینس کے اندر بھی دولت عثمانیہ کے مقابلہ کا حوصلہ پیدا کیا اور اس کی نیاز مندی جاتی رہی، وینس کو اپنی بحری طاقت کا غرور تھا، دوسری طرف سلطنت عثمانیہ کو بھی بلقانی ریاستوں پر کامل اقتدار رکھنے کے لیے بحر ایڈریاٹک اور بحر ایجین میں اپنے جنگی جہازوں کی تعداد بڑھانی ضروری تھی، البانیا کی تسخیر کے بعد بحر ایڈریاٹک کے تمام ساحلی علاقے اس کے قبضہ میں آگئے تھے اور اب وینس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ ناگزیر ہوگئی تھی، لڑائی ۸۶۸ھ (۱۴۶۳ء) میں شروع ہوئی اور سولہ سال تک جاری رہی، یکے بعد دیگرے وینس کے ساحلی مقبوضات ترکوں کے قبضہ میں آتے گئے، یہاں تک کہ

جزیرہ یوبیا (نگرو پونٹ) بھی جمہوریہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۸۸۲ھ (۱۴۷۷ء) میں ایک زبردست ترکی فوج فریولی (Friuli) کے علاقہ میں داخل ہوئی جو بحر ایڈریاٹک کی شمالی حد پر واقع تھا اور اس پر تسلط قائم کرنے کے بعد وینس کی طرف بڑھی۔ وینس نے مزاحمت کے لیے فوج روانہ کی لیکن عمر پاشا اسے شکست دیتا ہوا آگے بڑھ گیا اور دریائے پیاوے (Piave) کے ساحل تک کے تمام زرخیز علاقوں پر قابض ہو گیا۔ جمہوریہ کے لیے اب صلح کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، اگر اب بھی اسے کچھ تامل ہوتا تو اس کے بقیہ مقبوضات بھی نکل جاتے اور خود وینس کے شہر پر عثمانی علم نصب ہو جاتا۔ ۸۸۴ھ (۱۴۷۹ء) میں صلح نامہ پر دستخط ہو گئے، وینس نے سالانہ خراج ادا کرنے کا معاہدہ کیا اور سلطان نے اسے دوبارہ مشرق میں تجارت کرنے کی اجازت دی۔

روڈس کی ناکام مہم وینس کی بحری قوت ٹوٹ چکی تھی لیکن بحر ایجین میں روڈس کا جزیرہ عثمانی جہازوں کی راہ کا کانٹا تھا۔ اس جزیرہ پر ڈیڑھ سو برس سے یروشلم کے مبارزین سینٹ جان کی حکومت تھی جو آسانی کے ساتھ عثمانی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے۔ محمد نے روڈس کی فتح کو ضروری خیال کر کے ۸۸۵ھ (۱۴۸۰ء) میں مسیح پاشا کو اس مہم پر روانہ کیا۔ مسیح پاشا نے جزیرہ پر اتر کر متعدد مقامات فتح کیے اور پھر خود شہر روڈس کا محاصرہ کر لیا۔ عیسائی مدافعت کے لیے پوری طرح تیار تھے اور محاصرہ طول کھینچ گیا۔ بالآخر ۱۸ ربیع الاول ۸۸۵ھ (۲۸ جولائی ۱۴۸۰ء) کو ترکوں نے ایک عام حملہ کیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ عیسائی اپنی انتہائی شجاعت کے باوجود اسے روک نہ سکے اور بعض ترکوں نے دیواروں پر چڑھ کر ہلالی جھنڈا گاڑ دیا لیکن عین اس وقت جب وہ شہر میں داخل ہوا چاہتے تھے، مسیح پاشا کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ تمام مال غنیمت سلطان کے حق میں محفوظ سمجھا جائے گا۔ اس اعلان سے سپاہیوں میں سخت برہمی اور بیزاری پیدا ہو گئی اور جو ابھی تک باہر تھے، انہوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے، جو پہلے پہنچ چکے تھے، اندر جانے سے انکار کر دیا۔ عیسائیوں نے

عثمانی فوج کی یہ حالت دیکھ کر اپنی پوری قوت کے ساتھ جان توڑ حملہ کیا اور ان ترکوں کو جو شہر میں داخل ہو گئے تھے، شکست دے کر باہر نکال دیا، مسیح پاشا کو اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب کہ اس کی تلافی ناممکن تھی، اسے محاصرہ اٹھا لینا پڑا اور روڈس کی تسخیر نصف صدی کے لیے ملتوی ہو گئی۔

اوٹرانٹو کی فتح لیکن جس روز مسیح پاشا کو روڈس میں ہزیمت اٹھانی پڑی اسی روز احمد کدک پاشا فاتح کریمیا نے سرزمین اٹلی میں قدم رکھا جہاں اس وقت تک کوئی عثمانی سپاہی نہ پہنچا تھا، اٹلی کی فتح کے لیے اوٹرانٹو پر قبضہ کرنا ضروری تھا کیوں کہ یہ شہر اپنے موقع کے لحاظ سے گویا اٹلی کا دروازہ تھا، احمد پاشا نے فوراً خشکی اور سمندر دونوں جانب سے اس پر حملہ کیا، اہل شہر نے مدافعت میں بڑی سرگرمی دکھائی لیکن وہ صرف چند روز مقابلہ کر سکے اور ۴/ جمادی الثانی ۸۸۵ھ (۱۱/ اگست ۱۴۸۰ء) کو عثمانی فوج فاتحانہ اوٹرانٹو میں داخل ہو گئی۔

فاتح کی وفات اوٹرانٹو جیسے مضبوط شہر اور بندرگاہ پر قابض ہونے کے بعد محمد کے لیے اٹلی کی فتح کا راستہ کھل گیا، دوسرے سال وہ کسی جدید مہم کے لیے فوجیں اکٹھا کر رہا تھا اور خیال تھا کہ اوٹرانٹو کے بعد غالباً روما پر حملہ ہونے والا ہے لیکن دفعۃً ۴/ ربیع الاول ۸۸۶ھ مطابق ۳/ مئی ۱۴۸۱ء کو اکیاون سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا، فاتح کی موت سے یورپ کی جان میں جان آئی، تجہیز و تکفین اس مشہور مسجد میں ہوئی جسے اس نے قسطنطنیہ میں تعمیر کرایا تھا، وہ پہلا سلطان تھا جو اس نئے دارالسلطنت میں دفن ہوا۔

فوجی قابلیت سلطان محمد ثانی کا عہد حکومت شروع سے آخر تک میدان جنگ میں گزرا، کریمیا، روڈس اور اوٹرانٹو کی مہموں علاوہ ہر جنگ میں فوج کی کمان اسی کے ہاتھ میں تھی اور بلغراد کے علاوہ کسی معرکہ میں اسے شکست نہیں ہوئی، فاتح کا لقب اسے قسطنطنیہ کی فتح پر حاصل ہو گیا تھا لیکن اس کی ہر جنگ اس لقب کی تصدیق کرتی ہے، ایک سپہ سالار کی حیثیت سے وہ مراد ثانی پر بھی فوقیت لے گیا تھا، فوجی قابلیت میں اس کا کوئی افسر اس کا ہم

پلہ نہ تھا، حالاں کہ احمد کدک پاشا، محمود پاشا اور بعض دوسرے عثمانی سپہ سالاروں کا شمار اس وقت دنیا کے بہترین جنرلوں میں ہوتا تھا، وہ اپنے ارادوں کو بالکل راز میں رکھتا اور اس کے کسی کمانڈر کو بھی پہلے سے معلوم نہ ہوتا کہ حملہ کس سمت میں ہونے والا ہے، ایک بار جب کسی مہم کے لیے فوجیں جمع ہونے لگیں اور اس کے خاص افسروں میں سے ایک نے محمد سے پوچھا کہ دراصل کون سا شہر یا ملک پیش نظر ہے تو اس نے سختی سے جواب دیا کہ ''اگر میری داڑھی کے ایک بال کو بھی اس کی اطلاع ہو جائے تو میں اسے توڑ کر آگ میں ڈال دوں'' وہ جنگ کی کامیابی کے لیے رازداری اور سرعت عمل کو ضروری شرطیں خیال کرتا تھا اور اس نے ہمیشہ اسی اصول کی پابندی کی، جب وہ کسی حملہ کا عزم کر لیتا تو اسے پوری تیاری اور انتہائی شدت کے ساتھ انجام تک پہنچاتا، اسی وجہ سے عموماً اس کی مہمیں تھوڑے عرصہ میں سر ہو جاتی تھیں، البتہ وینس کے ساتھ لڑائیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ سولہ برس تک قائم رہا، اسی طرح البانیا کی فتح میں بھی کئی برس لگ گئے لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں۔

علوم وفنون کی سرپرستی[1] محمد کی عظمت فتوحات کی وسیع دائرہ میں محدود نہ تھی، اس کی خداداد قابلیت کے جوہر رزم و بزم دونوں جگہ یکساں طور پر نمایاں تھے، بہترین اساتذہ کے زیر نگرانی اس نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ علوم وفنون کی تحصیل کی تھی، اپنی مادری زبان کے علاوہ عربی، فارسی، عبرانی، لاطینی اور یونانی زبان پر بھی قدرت رکھتا تھا، دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ سے اسے پوری واقفیت تھی، وہ ایک بلند پایہ شاعر اور شعر و سخن کا بہت بڑا سرپرست بھی تھا، اس کے دربار سے تیس عثمانی شعرا کو وظیفے ملتے تھے اور وہ ہر سال گراں قدر تحائف خواجہ جہاں (ہندوستان) اور مولانا جامی (ایران) کی خدمت میں بھی بھیجا کرتا تھا، اس کی محفلیں علماء اور اہل کمال سے معمور رہا کرتی تھیں، اس نے قسطنطنیہ اور سلطنت کے دوسرے شہروں میں نہایت کثرت سے مسجدیں، اسپتال، مکاتب اور مدارس قائم کیے اور ان کے

---

[1] ''ترکی'' از لین پول، ص ۱۰۶۔

اخراجات کے لیے بڑی بڑی جائدادیں وقف کیں، اس کے تعلیمی نظام کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ آگے آتا ہے، اس کی علم دوستی کا اثر اس کے اعلیٰ عہدہ داروں پر بھی پڑا، چنانچہ محمود پاشا نے، جو شاعر بھی تھا، کئی مدرسے قائم کیے، مشرق و مغرب کے ناموروں کے کارنامے اس کے مطالعہ میں رہا کرتے تھے، گبن آخری بازنطینی مورخ فرانزا (Phranrza) کے حوالہ سے، جو محمد فاتح کا ہم عصر تھا اور فتح قسطنطنیہ میں گرفتار بھی ہو گیا تھا لکھتا ہے کہ سلطان سکندر، اغسطس، قسطنطین اور تھیوڈوسیس کے سوانح حیات اور کارنامے بڑے انہماک سے پڑھا کرتا تھا، اس کے حکم سے یونانی سوانح نگار پلوٹارک (Plutarch) کی مشہور و معروف تالیف، جو مشاہیر یونان وروما کے تذکروں پر مشتمل ہے، ترکی زبان میں ترجمہ کی گئی۔[1]

اخلاق وسیرت لیکن علم و مذہب کا جو اثر تہذیب نفس پر پڑنا چاہیے تھا، وہ کما حقہ ظاہر نہ ہوا اور محمد کی بے باک فطرت بعض اخلاقی پابندیوں سے عموماً آزاد رہی، وہی مغربی مورخین جو مراد ثانی کے مکارمِ اخلاق اور شریفانہ اوصاف کے مداح ہیں اور اس کے تیس سالہ عہد حکومت کے ایک واقعہ کو بھی قابل الزام نہیں ٹھہراتے محمد ثانی کی سنگ دلی، بے اعتمادی اور عیاشی کی داستان بے تکلف بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ خفیف سے اشتعال پر وہ قتل کا حکم دے دیتا تھا، یہاں تک کہ بڑے بڑے پاشاؤں اور وزیروں کو بھی اپنی جان کی طرف سے کبھی اطمینان نہیں رہتا تھا، چنانچہ اس کے عہد میں دو صدر اعظم بغیر کسی سابق تنبیہ یا اطلاع کے اس کے حکم سے دفعتاً قتل کر دیے گئے، لین پول کا بیان ہے کہ معاہدوں کے توڑنے میں وہ اہل ہنگری کا حریف تھا، شیویل کہتا ہے کہ اپنے عیسائی ہم عصروں کی طرح محمد اس مفید اصول کا قائل تھا کہ جو عہد کفار کے ساتھ باندھا جائے اس کی پابندی ضروری نہیں، دوسرے مغربی مورخین نے بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کیے ہیں اور ان کی تائید واقعات سے کی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جن معاصرین سے محمد کا سابقہ تھا، ان کا طرز عمل اس

---

[1] گبن، جلد ۴، ص ۲۷۵، فٹ نوٹ۔

باب میں کیا تھا، لارڈ ایورسلے محمد کی سنگ دلی اور نقض عہد کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد آخر میں لکھتا ہے:

> "محمد کے مظالم اور غداریوں پر ایک بلند معیار کے لحاظ سے رائے قائم کرنا شاید قرین انصاف نہیں ہے، اس کے دشمن یعنی ان ملکوں کے فرماں روا جن پر اس نے چڑھائی کی اور جنہیں اس نے فتح کیا، ان باتوں میں اکثر اس سے کم نہ تھے، اسکندر بک جس کو البانیا کی وطن پرستانہ مدافعت کے صلہ میں اپنے ملک کے اندر ایک ولی کی شہرت اور تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل ہوا، جب کبھی اسے موقع ملتا حد درجہ سفاک اور انتقام جو ثابت ہوتا، وہ جنگ کے قیدیوں کو عادتاً قتل کرا دیتا تھا، اس معاملہ میں موریا کے دونوں حکمراں بھی پیچھے نہ تھے، ولاچیا کا فرماں روا جس کا نام ولاد تھا تاریخ کے شدید ترین ظالم اور خوں خوار بدمعاشوں میں تھا، وہ امپیلر (Impaler) یعنی جسم میں میخیں ٹھونک کر ہلاک کرنے والا مشہور تھا، اسے ان قیدیوں اور دوسرے مظلوموں کی، جنہیں وہ اس ظالمانہ طریقہ سے قتل کراتا، مرتے وقت کی اذیت اور تڑپ دیکھنے میں خاص لطف آتا تھا، وہ اس غرض سے اس کی ضیافتوں کی رونق کے لیے محفوظ رکھے جاتے تھے، ایک بار جب کسی مہمان نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا کہ وہ ایسی موت سے مرنے والے کے جسم کی بو کیسے برداشت کرتا ہے تو اس نے اس مہمان کو فوراً سولی پر چڑھوا دیا اور حکم دیا کہ سولی کا کھمبا دوسروں سے زیادہ بلند رکھا جائے تاکہ جس بو کی مہمان نے شکایت کی ہے، اس کی تکلیف اسے نہ پہنچے[1]۔"

اشتعال یا انتقام کے موقع پر محمد ثانی نے جو کچھ بھی کیا ہو تاہم اس کی فطرت نرم اور لطیف جذبات سے محروم نہ تھی، قسطنطنیہ کی فتح کے روز اس نے جس رحم دلی اور رقیق القلبی کا ثبوت دیا، اس کی مثال اس کے کسی ہم عصر نے کبھی پیش نہ کی، ڈیوک نوٹاراس جو افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اعظم تھا، جب گرفتار کرکے اس کے سامنے لایا گیا تو محمد نے اسے نہ

---

[1] ایورسلے، ص ۹۵۔

صرف معاف کر دیا بلکہ اپنی سرپرستی کا بھی یقین دلایا، اس نے ڈیوک کے ساتھ یہاں تک نوازش کی کہ اس کی بیوی کی عیادت کے لیے گیا، جو علالت اور تازہ مصیبت کے غم سے پریشان تھی اور نہایت نرمی اور احترام کے ساتھ جس طرح کوئی لڑکا اپنی ماں کو سمجھائے، اسے تسلی و تشفی دی، ایسی ہی نرمی کا برتاؤ اس نے حکومت کے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ بھی کیا اور ان میں سے کئی ایک کا زر فدیہ اس نے خود ادا کیا، چند ہی دنوں میں اس کے عفو و کرم کا دامن تمام باشندگانِ شہر تک دراز ہو گیا۔[1]

مگر جلد ہی یہ دامن خون کے دھبوں سے داغ دار نظر آنے لگا، نوٹارس اور اس کے لڑکوں کے قتل کا واقعہ عیسائی مؤرخوں نے محمد کے نقض عہد، سنگ دلی اور نفس پرستی کی ایک بین مثال کے طور پر لکھا ہے اور دل کھول کر اسے برا بھلا کہا ہے لیکن گبن کی تحقیق نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے اور ایک بازنطینی مؤرخ کی حق گوئی سے بہتان کی یہ پوری عمارت جو بغض و عناد کی بنیاد پر قائم تھی، مسمار ہو گئی، عیسائی مؤرخین ڈیوک اور اس کے لڑکوں کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں اور قتل کا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ اس نے اپنے لڑکوں کو سلطان کے خلوتِ عیش میں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا لیکن واقعہ یہ تھا کہ یہ قتل ایک سازش کا نتیجہ تھا جو نوٹارس قسطنطنیہ کی رہائی کے لیے اٹلی سے کر رہا تھا، گبن لکھتا ہے کہ:

> "ایسی باغیانہ سازش قابل ستائش ہو سکتی ہے لیکن جو باغی دلیرانہ جرأت کرتا ہے، وہ اس کی پاداش میں اپنی جان کے حق سے بجا طور پر محروم ہو جاتا ہے اور اگر کوئی فاتح اپنے دشمنوں کو قتل کر دے، جن پر آئندہ وہ اعتبار نہیں کر سکتا تو ہمیں اس کو قابل الزام نہ قرار دینا چاہیے۔"[2]

محمد ثانی ایک مطلق العنان فرماں روا کی طرح حکومت کرنا چاہتا تھا اور کسی وزیر کی مداخلت کو گوارا نہ کرتا، عثمان سے لے کر مراد ثانی تک تمام سلاطین اپنے وزیروں اور سپہ سالاروں

---

[1] گبن، جلد ۴، ص ۵۰۱ [2] ایضاً، ص ۵۰۲۔

سے مشورہ لیا کرتے تھے اور انہیں شریک دسترخوان بھی کرتے تھے لیکن محمد نے اس دستور کو اٹھا دیا، وہ صرف احکام نافذ کرتا اور کسی کو محرم راز نہ بناتا، کھانا بھی وہ تنہا کھایا کرتا۔

آئین سلطنت ایک واضح قانون کی حیثیت سے سلطان محمد ثانی اپنے تمام پیش روؤں سے ممتاز نظر آتا ہے، اورخان کے عہد میں دولت عثمانیہ کے پہلے وزیر علاء الدین نے چند فوجی اصلاحات جاری کی تھیں...... جن کی تکمیل مراد اول کے زمانہ میں ہوئی لیکن نظام حکومت کے لیے کوئی دستور اس وقت تک مرتب نہ ہوا تھا، محمد ثانی پہلا سلطان ہے جس نے آئین سلطنت کو باضابطہ طور پر ترتیب دیا، اس کا ''قانون نامہ'' سلطنت عثمانیہ کا بنیادی دستور ہے۔

ارکان حکومت قانون نامہ میں سلطان کو ایک خیمہ سے تشبیہ دی گئی ہے، جو چار ستونوں پر قائم ہے، یعنی (۱) وزرائے سلطنت، (۲) قضاۃ عسکر، (۳) دفتر دار (خازن) اور (۴) نشانجی (معتمد سلطنت)، اس شاہی خیمہ کا بلند دروازہ باب عالی کے نام سے موسوم ہے، جس سے مراد حکومت عثمانیہ ہے۔

وزرا حکومت کے سب سے بڑے عہدہ دار تھے، محمد ثانی کے عہد میں ان کی مقررہ تعداد چار تھی، ان کو صدر وزیر اعظم، سلطنت کے تمام عہدے داروں کا افسر اعلیٰ تھا، اس کے پاس حکومت کی مہر رہا کرتی تھی، جو بلند ترین منصب کا نشان تھا، تفصیلات پر غور و بحث کرنے کے لیے اسے اپنے مکان پر بھی مجلس وزرا کے منعقد کرنے کا اختیار حاصل تھا، قضاۃ عسکر کا تقرر علماء کی جماعت سے ہوتا تھا، محمد کے زمانہ میں قاضی عسکر دو تھے، ایک یورپ کی تمام عثمانی عدالتوں کا صدر تھا، دوسرا ایشیا کی، علما ہی کی جماعت سے تین بڑے عہدہ دار مقرر کیے جاتے تھے، جن کا مرتبہ اس وقت قضاۃ عسکر کے بعد تھا۔

(۱) خواجہ جو سلطان اور شہزادوں کا اتالیق ہوتا تھا، (۲) مفتی اور (۳) قاضی قسطنطنیہ نشانجی کے سپرد سرکاری دستاویزوں کے تیار کرنے اور ان پر سلطان کا طغرا ثبت

کرنے کی خدمت تھی، یہ منصب بعد کو صرف تعظیمی رہ گیا، اس کے تمام متعلقہ فرائض بتدریج رئیس آفندی (چیف سکریٹری) کی طرف منتقل ہو گئے۔

دیوان | حکومت کی مجلس حل و عقد کا نام دیوان تھا، سلطان کی غیر موجودگی میں وزیر اعظم اس کا صدر ہوتا تھا، دوسرے وزراء اور قضاۃ عسکر اس کے داہنے بازو پر بیٹھتے تھے، دفتر دار اور نشانجی کی جگہیں بائیں جانب تھیں، ضرورت کے وقت دیوان کا خاص اجلاس وزیر اعظم کے مکان پر بھی ہوتا تھا۔

آغا : ان عمائدین سلطنت کے علاوہ بڑے بڑے آغا بھی تھے، جو سلطنت کے دست و بازو سمجھے جاتے تھے، ان کی دو قسمیں تھیں، خارجی آغا اور داخلی آغا، خارجی آغا کی جماعت سے وہ فوجی حکام منتخب ہوتے تھے جن کے سپرد صوبوں کی حکومت ہوتی تھی، داخلی آغا دربار کے عہدوں پر مامور ہوتے تھے، فوجی آغاؤں میں ینی چری کے آغا اور سپاہی اور دوسرے سوار دستوں کے آغا خاص طور پر ممتاز تھے، ینی چری کا آغا قسطنطنیہ کی پولیس کا افسر اعلیٰ بھی ہوتا تھا اور داخلی آغا قصر سلطانی کے اعلیٰ عہدہ دار ہوتے تھے، مثلاً قاپو آغا (گورے خواجہ سراؤں کا افسر)، قیزلر آغا (حبشی خواجہ سراؤں کا افسر)، بوستانجی باشی (باغبانوں کا افسر)، چاؤش باشی (حکومت کے قاصدوں کا افسر) وغیرہ، محکمۂ دیوانی کے بہت سے عہدوں پر بھی یہ داخلی آغا مقرر کیے جاتے۔

سنجق بے محمد فاتح کے عہد میں صوبوں کی حکومت بے اور بیلر بے کے سپرد ہوتی تھی، بے وہ پاشا کہے جاتے تھے، جن کے نیزوں کے سرے پر ایک گھوڑے کی دم باندھی جاتی تھی، یہ عثمانیوں کا فوجی نشان تھا، بیلر بے وہ پاشا تھے جن کے علم میں دو گھوڑوں کی دمیں ہوتی تھیں، یہ ان جاگیرداروں کے سردار تھے جن کو فوجی خدمات کے صلہ میں زمینیں دی گئی تھیں اور جن کے فرائض میں داخل تھا کہ جنگ کے موقعوں پر مسلح ہو کر حاضر ہو جایا کریں، یہ لوگ ایسے وقتوں میں اپنے اپنے سرداروں کے علم کے نیچے جمع ہو جاتے تھے، علم کو ترکی زبان میں

سنجق کہتے ہیں اور چوں کہ ہر علاقہ کا سنجق الگ تھا، اس لیے ان علاقوں کا نام بھی سنجق پڑ گیا اور ان کے سرداروں کو سنجق بے کہنے لگے، پاشا کا لقب جو عموماً صوبوں کے والیوں کو دیا جاتا تھا، حقیقۃً کسی حاکمانہ اختیار یا فوجی منصب کا نشان نہ تھا، بلکہ محض ایک اعزازی لقب تھا، ابتداءً عثمانیوں میں پاشا کے لقب کا استعمال صرف ان افسروں کے لیے نہیں ہوتا تھا جو فوج کی قیادت کرتے تھے یا جن کے ہاتھ میں صوبوں یا شہروں کی حکومت تھی، جن اول پانچ پاشاؤں کا ذکر عثمانی مصنفین نے کیا ہے، ان میں سے تین ادیب تھے[1]، رفتہ رفتہ یہ اعزازی لقب ان لوگوں کے لیے مخصوص ہو گیا جو سلطان کی طرف سے فوج کے کمانڈر اور علاقوں اور اہم شہروں کے حاکم مقرر کیے جاتے تھے، یہاں تک کہ لفظ پاشا لفظ گورنر کے تقریباً مترادف ہو گیا۔

محمد ثانی کے زمانہ میں چھتیس سنجق سلطنت عثمانیہ کے صرف یورپی علاقوں میں تھے، جن میں سے ہر ایک کے نیچے چار چار سو سوار جنگی ہوتے تھے، یورپ اور ایشیا میں سلطنت کے باضابطہ سواروں اور پیادوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، اس میں وہ سوار اور پیادے شامل نہ تھے، جو ہر جنگ کے موقع پر بطور خود اپنی خدمات پیش کرتے تھے اور جن کا معاوضہ صرف مال غنیمت تھا، سلطنت کی سالانہ آمدنی بیس لاکھ دوکات سے زیادہ تھی، آمدنی کی مدوں میں مال گزاری کے علاوہ محصول درآمد، معدنیات، جرمانے اور خراج کی رقمیں بھی شامل تھیں۔

علماء قانون نامہ کا نہایت اہم حصہ وہ ہے جس میں مذہب اور عدالت کے عہدہ داروں کا انتظام قائم کیا گیا ہے، چوں کہ قضاۃ عسکر کا تقرر علما کی جماعت سے ہوتا تھا اور وہ خیمہ سلطنت کے چار ستونوں میں سے ایک ستون تھے، اس لیے محمد ثانی نے اس جماعت کی تعلیم وتنظیم پر خاص توجہ کی، کریسی لکھتا ہے:

> ”محمد ثانی کے پیش رو خصوصاً اورخان کو اسکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے

---

[1] قانون نامہ بحوالہ کریسی، جلد ۱، ص ۱۹۰۔

> "کا بہت شوق تھا لیکن محمد ان سب سے بڑھ گیا تھا، اسی نے "سلسلہ علما" کو قائم کیا اور سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی تعلیم و ترقی کا ضابطہ مرتب کیا، فاتح قسطنطنیہ خوب جانتا تھا کہ ایک بڑی سلطنت کے پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے جواں مردی اور فوجی مہارت کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ضروری ہیں، محمد نے جو خود بھی علوم میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کے لیے بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا، وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ عدالت کا نظم و نسق جیسا کہ چاہیے درست رکھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ قاضیوں کا احترام قائم کیا جائے اور ان کا احترام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں بلکہ سلطنت کے اونچے اور باعزت عہدوں پر بھی مامور کیے جائیں، نیز افلاس کے وسوسوں اور پریشانیوں سے محفوظ کر دیے جائیں[1]۔"

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر محمد ثانی نے تعلیم کا جو نظام مرتب کیا وہ مذہبی اور علمی حیثیت کے علاوہ سیاسی حیثیت بھی رکھتا تھا، جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے:

> "پچھلے عہد میں تمام مدرسے محض مذہبی مدرسے ہوتے تھے، اگرچہ ان میں اور علوم بھی پڑھائے جاتے تھے لیکن ترکوں کا سررشتہ تعلیم پولیٹکل حیثیت رکھتا تھا، وہ سلطنت کے لیے لائق عہدہ دار پیدا کرتا تھا[2]۔"

علاوہ مکاتب کے جو ہر قصبہ کے ہر محلہ اور تقریباً تمام بڑے بڑے دیہاتوں میں کھول دیے گئے تھے، محمد نے کثرت سے اونچے درجہ کے مدرسے بھی قائم کیے اور ان پر جائدادیں وقف کیں، یہ مدرسے موجودہ زمانہ کے کالجوں کے برابر تھے، ان میں دس مضامین کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی، یعنی صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعیات، لسانیات، بلاغت، طرز تحریر، فن خطابت، اقلیدس اور ہیئت، جو طلبہ ان تمام مضامین میں پوری دست گاہ حاصل کر لیتے تھے ان کو دانش مند کی سند ملتی تھی، جو موجودہ یونیورسٹیوں کے ایم اے کی سند کے

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۱۷۰-۱۶۹ [2] "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" از مولانا شبلی نعمانی۔

برابر تھی، یہ سند کسی ابتدائی مدرسہ کی اعلیٰ مدرسی کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی لیکن علما کی جماعت کا رکن بننے کے لیے دانش مندی کی سند حاصل کرنے کے بعد فقہ اور اصول فقہ کا ایک طویل نصاب مکمل کرنا پڑتا تھا اور مختلف امتحانات پاس کرنے پڑتے تھے، اس جماعت میں وہی لوگ داخل کیے جاتے تھے، جو علوم کے بلند ترین مراتب پر فائز ہوتے اور ایسے لوگوں کو حکومت کی طرف سے بڑے بڑے عہدے اور منصب ملتے تھے اور انھیں خاص رعایتیں اور حقوق حاصل تھے، مدرسوں (کالجوں) کے اساتذہ جو مدرس کہے جاتے تھے، علما ہی کی جماعت سے مقرر ہوتے تھے اور اسی جماعت سے تمام حکام عدالت کا انتخاب بھی ہوتا تھا، مثلاً قصبوں اور دیہاتی علاقوں کے قاضی، ملا یعنی بڑے بڑے شہروں کے قاضی، استنبول آفندی یعنی قسطنطنیہ کا قاضی اور ناظر اعلیٰ، قضاۃ عسکر یعنی رومیلیا اور اناطولیہ کے قاضی القضاۃ اور مفتی، یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ علما کی جماعت کوئی مخصوص مذہبی جماعت نہ تھی، بلکہ ایک علمی جماعت تھی جس سے بڑے بڑے ملکی عہدہ دار، حکام فوج داری اور مدرسوں کے اساتذہ مقرر کیے جاتے تھے، خالص مذہبی جماعت جس میں مسجدوں کے امام، خطیب اور مبلغین شامل تھے، طبقہ علما کا محض ایک جز تھی، عام خیال یہ ہے کہ اس مذہبی گروہ کا اثر عثمانی ترکوں پر بہت زیادہ تھا اور اکثر مغربی مورخین نے بھی دولت عثمانیہ کے زوال کا ایک بڑا سبب علمائے مذہب ہی کو قرار دیا ہے جن کا جمود ترقی کی ہر راہ کا پتھر تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جماعت کا اثر بہت کم تھا، فان ہیمر لکھتا ہے:

> ”نام نہاد مذہبی گروہ یعنی مسجدوں کے اماموں، مؤذنوں اور خطیبوں کا اثر سلطنت عثمانیہ میں شاید ہر مملکت سے کم ہے، برخلاف اس کے معلمین کی جماعت کا اقتدار اور اہمیت اس قدر ہے کہ اس کی مثال چین کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی[1]۔“

کریسی جس کی تحقیق فان ہیمر کے علاوہ دوسرے قدیم ماخذوں پر بھی مبنی ہے،

---

[1] ”ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ“ جلد ۲۴، ص ۳۴۲۔

اس کی تائید کے ذیل میں لکھتا ہے:

"عثمانیوں کے شرف و افتخار کا یہ واقعہ بھی ضبطِ تحریر میں لانا چاہیے کہ ان میں مدرسین اور ان تمام اشخاص کا احترام جو خود علمی فضیلت میں ممتاز ہوں، یا اس کے حاصل کرنے میں دوسروں کی رہنمائی کا خاص ملکہ رکھتے ہوں، ہر عیسائی قوم سے زیادہ کیا جاتا ہے۔"[1]

خونیں قانون سلطان محمد ثانی نے حکومت کی ابتدا اپنے شیر خوار بھائی کے قتل سے کی تھی، جب اس نے اس قانون نامہ کو مرتب کرنا شروع کیا تو برادر کشی کو بھی سلطنت کے تخت نشین کے لیے ایک قانون بنا دیا اور یہ دفعہ دستورِ حکومت میں درج کر دی:

"میرے فقہا کی اکثریت نے یہ فتویٰ صادر کیا ہے کہ میرے جانشینوں میں سے جو تخت پر بیٹھیں وہ دنیا کے امن و امان کی غرض سے اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتے ہیں، ان کا فرض ہوگا کہ اس پر کاربند ہوں۔"[2]

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۱۷۲ [2] فان ہیمر بحوالہ کریسی، جلد ۱، ص ۱۸۲۔

بایزید ثانی

۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ مطابق ۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء

سلطان محمد ثانی نے اپنی وفات پر دو لڑکے چھوڑے، بڑا لڑکا شہزادہ بایزید اماسیا کا حاکم تھا اور چھوٹا شہزادہ جم (جمشید) کرمانیہ کا، بایزید کا میلانِ طبع زیادہ تر مذہب اور فلسفہ کی جانب تھا جس کی وجہ سے لوگ اسے صوفی کہتے تھے، وہ نہایت سادہ مزاج، حلیم، نرم خو اور پابندِ شرع تھا، شاعری سے بھی خاص ذوق رکھتا تھا لیکن ان خصوصیات کے باوجود سپاہیانہ شجاعت میں بھی کم نہ تھا اور میدانِ جنگ میں پہنچ کر یہ صوفی مجاہد بن جاتا تھا، شہزادہ جم میں زیادہ تر سلطان محمد کے اوصاف پائے جاتے تھے، وہ فنونِ حرب کا ماہر اور شجاعت میں اپنے باپ کا مماثل تھا، حکم رانی کا ملکہ اور ملک گیری کی اہلیت اسے خداداد حاصل تھی، اس کے ساتھ شاعری میں بھی اس کا پایہ بلند تھا۔

جس وقت سلطان محمد کے انتقال کی خبر قسطنطنیہ میں مشتہر ہوئی، ینی چری نے تمام شہر میں لوٹ مار شروع کر دی اور وزیر اعظم کو جس نے سلطان کی وفات کو مخفی رکھنے کی کوشش کی تھی، قتل کردا، چوں کہ وزیر اعظم کے متعلق معلوم تھا کہ وہ شہزادہ جم کا طرف دار ہے، اس لیے شہزادہ بایزید کے حامیوں نے بہ آسانی ینی چری کی حمایت حاصل کر لی، اس کے بعد باقی افواج نے بھی ینی چری کے تتبع میں بایزید کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، شہزادہ جم کو سلطان کی

وفات کی اطلاع دیر میں ہوئی، اس درمیان میں شہزادہ بایزید نے قسطنطنیہ پہنچ کر تخت پر قبضہ کرلیا، ینی چری نے اس کی حمایت کی لیکن تخت نشینی کے موقع پر اپنی تنخواہوں میں اضافہ اور بخشش کا مطالبہ بھی پیش کیا، اس رسم کی بنا سلطان محمد کی تقریب تاج پوشی میں پڑ چکی تھی، بایزید کو مجبوراً یہ مطالبہ پورا کرنا پڑا، اس کے بعد تین سو برس تک یہ دستور قائم رہا کہ ہر نئے سلطان کی تخت نشینی کے وقت ینی چری کو بڑی بڑی رقمیں بطور انعام کے دی جاتی تھیں، بقول کریسی یہ رسم جس قدر خزانہ شاہی کے لیے بار تھی اسی قدر سلاطین کے لیے باعث شرم تھی۔

شہزادہ جم | خاندان عثمانی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کا کوئی شہزادہ تاج وتخت سے کم پر کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا، اسی لیے کسی سلطان کے مرنے پر اس کے لڑکوں میں تخت سلطنت کے لیے جنگ کا شروع ہو جانا لازمی تھا، چنانچہ اس موقع پر بھی اگرچہ بایزید تخت پر قابض ہو چکا تھا اور تمام فوج اور امرائے دولت نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا، تاہم شہزادہ جم نے علم بغاوت بلند کر دیا اور جنگ چھڑ گئی، وہ جانتا تھا کہ اس کے والد نے جو خونی قانون دستور سلطنت میں داخل کر دیا ہے، اس کی وجہ سے اس کی جان ہر وقت خطرہ میں ہے، لہٰذا اطاعت قبول کرنے کے بعد بھی اسے بایزید کی طرف سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا، اعلان جنگ سے قبل اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم کر دی جائے، یورپ کے صوبے بایزید کی حکومت میں رہیں اور ایشیا کے صوبوں پر جم کی حکومت تسلیم کر لی جائے لیکن بایزید نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، اب لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ۲۰ رجون ۱۴۸۱ء کو احمد کدک پاشا نے جم کو شکست دی اور وہ بھاگ کر سلطان مصر کے دربار میں پناہ گزیں ہوا، دوسرے سال مصری فوجی مدد کے ساتھ وہ پھر واپس ہوا اور ایشیائے کوچک کے بعض ترکی سردار اس کی حمایت میں کھڑے ہوئے لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست کھا کر وطن چھوڑنا پڑا، اب کی بار وہ بجائے مصر کے روڈس پہنچا تا کہ وہاں سے مدد لے کر سلطنت عثمانیہ کے یورپین مقبوضات میں داخل ہو اور از سر نو قسمت آزمائی کرے، روڈس میں مبارزین یروشلم

کے قبضہ میں تھا، ان کا سردار ڈی، آبوسن (De Aubusson) ایک نہایت چالاک اور غدار شخص تھا، اس نے ایک طرف تو شہزادہ جم کو مدد دینے کا وعدہ کیا اور اس سے یہ معاہدہ کرایا کہ بہ صورت کامیابی وہ مبارزین روڈس کو بعض مخصوص اور اہم مراعات عطا کرے گا، اور دوسری طرف سلطان بایزید سے یہ طے کیا کہ پینتالیس ہزار دوکات سالانہ کے عوض وہ جم کو نظر بند رکھے گا، چنانچہ سات برس تک یہ بدنصیب شہزادہ روڈس اور پھر فرانس کے مختلف مقامات میں جو مبارزین روڈس کے قبضہ میں تھے، ظاہری احترام کے باوجود دراصل ایک قیدی کی طرح زندگی بسر کرتا رہا، تمام یورپ کو جم کے معاملہ سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور متعدد بادشاہوں نے شہزادہ کو حاصل کرنے کے لیے ڈی آبوسن سے مراسلت شروع کردی تھی، وہ چاہتے تھے کہ اسے بایزید کے مقابلہ میں کھڑا کرکے سلطنت عثمانیہ کو نقصان پہنچائیں لیکن ڈی آبوسن پینتالیس ہزار دوکات سالانہ کی رقم سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھا، وہ معاملہ کو عمداً طول دیتا رہا، اس درمیان میں اس نے شہزادہ جم کی ماں اور بیوی سے بھی جو اس وقت قاہرہ میں مقیم تھیں، خط و کتابت شروع کردی تھی اور انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر بیس ہزار دوکات ادا کردیے جائیں تو شہزادہ فوراً قاہرہ پہنچا دیا جائے گا، ڈی آبوسن کے وعدہ پر اعتماد کرکے ان خواتین نے یہ رقم اس کے پاس بھیج دی تھی، مگر مبارزین یروشلم کا یہ مقدس پیشوا ایفائے عہد کی پابندی سے بالاتر تھا، عیسائی مورخین بھی اس شرمناک فریب پر اظہار نفرت کرتے ہیں، بالآخر شاہ فرانس چارلس ہشتم نے جم کو ڈی آبوسن کے پنجہ سے رہا کرکے پوپ اینوسنٹ ہشتم (Pope Innocent VII) کے پاس روما بھیج دیا، یہاں بھی اس کی حیثیت حقیقۃً ایک قیدی ہی کی تھی، اگرچہ اینوسنٹ نے اس کے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کو اپنے محل میں عزت و احترام کے ساتھ رکھا، اب پوپ نے چالیس ہزار دوکات سالانہ کی رقم شہزادہ کی نگرانی کے صلہ میں بایزید سے وصول کرنا شروع کی، چند سال کے بعد اینوسنٹ مرگیا اور اس کا جانشین پوپ اسکندر بورجیا

(Pope Alexander Borgia) ہوا جو اپنے ہلاکت پاش جرائم کی وجہ سے عالم گیر شہرت کا مالک ہے، اسکندر بورجیا نے اپنا ایک سفیر سلطان بایزید کی خدمت میں بھیج کر شہزادہ جم کی نظر بندی سے متعلق سابق معاہدہ کی تجدید کی اور اس میں ایک اہم دفعہ کا اضافہ یہ کیا کہ اگر وہ سلطان کو شہزادہ کی طرف سے ہمیشہ کے لیے مطمئن کر دے تو بجائے چالیس ہزار دوکات سالانہ وصول کرنے کے تین لاکھ دوکات یک مشت کا مستحق ہوگا لیکن ابھی سلطان اور سفیر پوپ کے درمیان اس معاملہ پر گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ چارلس ہشتم نے اٹلی پر حملہ کر دیا اور ۳۱ دسمبر ۱۴۹۵ء کو رومہ میں فاتحانہ داخل ہوا، چند روز کے بعد شاہ چارلس اور پوپ اسکندر کے درمیان صلح کی گفتگو شروع ہوئی، جس کی ایک اہم شرط تھی کہ شہزادہ جم چارلس کے ساتھ فرانس جائے گا، اسکندر کو صلح کی خاطر یہ شرط منظور کرنی پڑی اور شہزادہ فرانسیسی فوج کے سپہ سالار کے ساتھ رومہ سے روانہ ہو گیا، اسکندر بورجیا کو اگرچہ چالیس ہزار دوکات سالانہ سے محروم ہو جانا پڑتا، مگر شہزادہ کے قتل سے تین لاکھ دوکات کی خطیر رقم کا حاصل کرنا اب بھی ممکن تھا اور وہ اس خونیں تدبیر میں کام یاب ہوا، قتل کے طریقہ میں ترک اور اطالوی مؤرخین کے بیانات باہم مختلف ہیں، اطالوی مؤرخین کی روایت ہے کہ اسکندر بورجیا نے شہزادہ کے ایک خدمت گار سے سازش کر کے ایک خاص قسم کا سفید زہر شکر میں ملا کر کھلا دیا، ترک مؤرخین کا بیان ہے کہ مصطفیٰ نامی ایک نائی نے بورجیا کی تحریک سے شہزادہ کا خط بناتے وقت زہر کے بجھے ہوئے استرہ سے ایک خفیف سا زخم لگا دیا، بہر حال تمام مؤرخین کو اس امر پر اتفاق ہے کہ شہزادہ جم کا قتل پوپ اسکندر بورجیا ہی کی تحریک سے عمل میں آیا[1]، زہر کا اثر فوراً ہی ظاہر نہ ہوا، بلکہ رفتہ رفتہ نمایاں ہوا، یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد فاتح قسطنطنیہ کا وہ جواں سال وجواں ہمت فرزند جس نے اپنی عمر کے ۳۶ سال بھی ہنوز پورے نہ کیے تھے اور جو تیرہ سال تک اسیری کی صعوبتیں برداشت کر چکا تھا، بیک وقت قید فرنگ وقید حیات دونوں سے آزاد

---

[1] کریسی جلد ۱، ص ۱۹۴۔

ہو گیا، آخر وقت تک اسے بیوی اور بچوں کے دیکھنے کی حسرت تھی، اس کی آخری دعا یہ تھی:

> "اے میرے رب! اگر دین حق کے دشمن یہ چاہتے ہیں کہ میری ذات کو آلہ کار بنا کر ان تجویزوں کو تقویت پہنچائیں جو انہوں نے مسلمانوں کی بربادی کے لیے سوچ رکھی ہیں تو آج کے بعد مجھے زندہ نہ رکھ، بلکہ فوراً میری روح کو اپنی طرف اٹھا لے۔"

سلطان بایزید نے اس کی نعش یورپ سے منگوالی اور اسے شاہی تزک و احتشام کے ساتھ بروصہ میں سپرد خاک کر دیا۔

شہزادہ جم کے ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے:

> "اس تمام غم ناک سرگذشت سے یہ حیرت انگیز نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیائے مسیحیت میں ایک بھی ایمان دار بادشاہ نہ تھا، جو قیدی پر ترس کھاتا اور نہ کوئی ایسا تھا جو گرینڈ ماسٹر (ڈی آبوسن) پوپ اور چارلس ہشتم کی غیر شریفانہ اور ضمیر فروشانہ سازشوں پر نفریں کرتا۔ ان میں سے ہر ایک غداری اور فضیحت کے انعام کے لیے دوسرے سے مسابقت کی کوشش کر رہا تھا، اپنے بھائی کو محفوظ نگرانی میں رکھنے کی خواہش کرنا بایزید کے لیے قابل معافی ہو سکتا ہے لیکن مسیحی کلیسا کے پیشوائے اعظم اور رہبانی نائٹوں کی جماعت کے سردار کی مدافعت میں کیا کہا جا سکتا ہے جنہوں نے کافری اشرفیوں کے لیے ایک بے کس و مجبور پناہ لینے والے کو دغا دی۔[1]"

اوٹرانٹو بایزید ثانی کا عہد حکومت فتوحات اور توسیع سلطنت کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، تخت نشینی کے بعد اس نے احمد کدک پاشا کو شہزادہ جم کی بغاوت فرو کرنے کے لیے اوٹرانٹو سے واپس بلا لیا اور اس کی جگہ خیر الدین پاشا کو مقرر کیا، خیر الدین پاشا کو حسب ضرورت مدد نہ پہنچ سکی، وہ بہت دنوں تک نہایت بہادری کے ساتھ دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرتا رہا، مگر بالآخر شہر ڈیوک آف کلبریا (Calabria) کو سپرد کر دینا پڑا، اوٹرانٹو کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد پھر کبھی ترکوں کا قدم اٹلی کے کسی حصہ میں نہ جم سکا۔

---

[1] "ترکی" از لین پول، ص ۱۵۰۔

ہرزیگووینا ہرزیگووینا اب تک ایک باج گزار حکومت تھی، بایزید نے اسے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔

ہنگری ہنگری سے کئی سال تک چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس سے کوئی خاص نتیجہ حاصل نہ ہوا اور آخر میں دونوں سلطنتوں میں صلح ہو گئی۔

بحری فتوحات البتہ جمہوریہ وینس سے جو لڑائی ۹۰۴ھ (۱۴۹۸ء) میں چھڑی وہ بہ اعتبار اپنے نتیجہ کے بہت زیادہ اہم تھی، ترکوں نے موریا میں وینس کے تین باقی ماندہ قلعوں یعنی موورانس (Mavarins) موڈن (Moden) اور کورن (Coran) کو بھی فتح کر لیا اور اس طرح یونان میں وینس کے اثر کا خاتمہ ہو گیا، ترکی بیڑا محمد فاتح کے عہد ہی میں بحر روم کی تمام بحری طاقتوں پر فوقیت حاصل کر چکا تھا، بایزید ثانی نے اس کو اور زیادہ فروغ دیا، چنانچہ ۹۰۵ھ (۱۴۹۹ء) میں مشہور ترکی امیر البحر کمال رئیس نے وینس کے بیڑے کو زبردست شکست دے کر لیپانٹو (Lepanto) کے بندرگاہ پر قبضہ کر لیا، دوسرے سال وینس، آسٹریا، اسپین اور پوپ کے بیڑوں نے متحدہ طور پر ترکی بیڑے پر حملہ کیا، باوجود اس کے کہ عثمانی جہازوں کی مجموعی تعداد اتحادی بیڑوں سے بہت کم تھی، کمال رئیس نے کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور پھر آگے بڑھ کر مسلمانان غرناطہ کی درخواست پر، جو عیسائیوں کے ظلم وستم سے عاجز آ چکے تھے، سواحل اسپین پر حملے کیے لیکن مظلومین غرناطہ کو ان حملوں سے کوئی فائدہ نہ پہنچا اور ان کو آخر کار اپنا وطن چھوڑ کر اسپین سے نکل جانا پڑا۔

مصر سے صلح ایشیا میں اب تک سلاطین عثمانی کو جن مخالفین سے سابقہ پڑا تھا وہ صرف ایشیائے کوچک کے امراء تھے، جنہوں نے دولت سلجوقیہ کی تباہی کے بعد خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں، یہ تمام ریاستیں محمد فاتح کے عہد تک مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئی تھیں اور سلطان کو اپنے ایشیائی مقبوضات کی طرف سے اطمینان حاصل ہو چکا تھا لیکن بایزید ثانی کے تخت پر آتے ہی عثمانیوں کو ایک نئے دشمن سے معاملہ کرنا پڑا، حکومت مصر یا اب تک سلطنت

عثمانیہ کے معاملات سے بالکل بے تعلق تھی شہزادہ جم نے پہلی بار اس کو عثمانی مقبوضات میں قدم رکھنے کی دعوت دی، اگرچہ اس مہم میں مصری فوج کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا تاہم سلطنت شامیہ سے قوت آزمائی کی جرأت پیدا ہو گئی اور مصریوں نے ایشیائے کوچک کے جنوبی مشرقی علاقوں پر دست درازیاں شروع کر دیں، دولت عثمانیہ اور مصر کے مملوک سلاطین کے درمیان پہلی جنگ ۸۹۰ھ (۱۴۸۵ء) میں شروع ہوئی، جس میں ترکوں کو سخت شکست ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرمانیہ نے بغاوت کر دی، عثمانی فوجیں اس بغاوت کے فرو کرنے میں تو کامیاب ہوئیں لیکن مصریوں کے مقابلہ میں انہیں پیچھے ہٹنا پڑا، بالآخر پانچ سال کے بعد اس جنگ کا سلسلہ ختم ہوا اور بایزید ثانی نے اپنے تین قلعے سلطان مصر و شام کی نذر کر کے صلح کر لی۔

سلیم کی بغاوت اور تخت نشینی | بایزید کا عہد حکومت جس طرح خانہ جنگی سے شروع ہوا تھا اسی طرح خانہ جنگی پر ختم بھی ہوا، اس کے تینوں لڑکے کرکود، احمد اور سلیم ایشیائے کوچک کے مختلف صوبوں کے حکمراں تھے، کرکود بڑا لڑکا تھا لیکن اس کا ذوق تمام تر علمی تھا، اس لیے بایزید احمد کو جسے وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن سلیم باوجود سب سے چھوٹا ہونے کے اپنی شجاعت اور فوجی قابلیت کی وجہ سے تمام فوج خصوصاً ینی چری میں نہایت محبوب تھا، یہ دیکھ کر بایزید اپنی عمر اور خرابی صحت کے باعث امور سلطنت پر کافی توجہ مبذول کرنے سے معذور ہے، سلیم کو خطرہ لاحق ہوا کہ ممکن ہے احمد بایزید کی حیات ہی میں تخت پر قابض ہو جائے، لہٰذا اس نے سلطان کی اجازت کے بغیر طرابزون سے قسطنطنیہ کی طرف کوچ کر دیا اور ایک منتخب فوج کے ساتھ ادرنہ پہنچ گیا، بایزید نے اس کو طرابزون واپس جانے کا حکم دیا لیکن سلیم جنگ پر آمادہ ہو گیا اور بایزید کو مجبوراً اس سے مقابلہ کرنا پڑا، اس جنگ میں سلیم کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر کریمیا پہنچا، کریمیا کا فرماں روا سلیم کا خسر تھا، اس نے سلیم کی مدد کی، کچھ دنوں کے بعد وہ پھر قسطنطنیہ لوٹا اور اب کی بار تمام فوج نے اس کا ساتھ دیا، بایزید نے ینی چری کے ایک وفد کو باریاب کیا اور ان سے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، انہوں نے

جواب دیا کہ ہمارا بادشاہ ضعیف العمر اور کمزور ہے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ سلیم تخت نشین ہو، یہ دیکھ کر کہ فوج قابو سے باہر ہو چکی ہے، بایزید نے اعلان کیا کہ میں اپنے لڑکے سلیم کے حق میں تخت سلطنت سے دست بردار ہوتا ہوں، خدا اس کو ایک خوش حال عہد حکومت عطا فرمائے، اس کے بعد وہ تخت سے اتر آیا، وہ چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام ایشیائے کوچک کے شہر ڈیموٹیکا میں گزار دے جو اس کی جائے پیدائش تھا لیکن موت نے اس کی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا اور قسطنطنیہ سے روانہ ہونے کے تین ہی روز بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

پہلا روسی سفیر | سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان اب تک سفارتی تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے، ۹۰۰ھ (۱۴۹۵ء) میں پہلا روسی سفیر مائیکل پلے شیف (Micneal Plestshiev) قسطنطنیہ آیا اور روسی تاجروں کے لیے تجارتی مراعات کا خواستگار ہوا، زار ایوان سوم (Ivan III) نے اسے سختی کے ساتھ ہدایت کر دی تھی کہ وہ نہ تو سلطان کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو، نہ سلطان کے علاوہ کسی وزیر سے سفارتی معاملات پر کوئی گفتگو کرے اور نہ یورپ یا ایشیا کی کسی مملکت کے سفیر کو اپنے آگے جگہ دے، اے ڈی لامارٹین (A De Lamartine) تاریخ ترکی میں لکھتا ہے کہ پلے شیف کی گستاخی اور بدتمیزی اس کے دربار کے تکبر سے بھی بڑھ گئی، جو قوم اس کی مہمان نوازی اور تواضع کر رہی تھی، اسی کے رسم و رواج کی اس نے تحقیر کی، وزیر اعظم نے اس کے استقبال کے لیے جو دعوت کی تھی، اس میں شریک ہونے سے اس نے انکار کر دیا اور دیوان کی طرف سے جو خلعت اور دوسرے تحائف اسے پیش کیے گئے تھے، انہیں واپس کر دیا، عثمانی رسم و رواج کی اس توہین پر مغربی حکومتوں کے سفیروں کو بھی غصہ آیا،[1] اگر یہ روسی سفیر محمد ثانی یا سلیم اول کے عہد میں آیا ہوتا تو اسے اپنی گستاخیوں کا نتیجہ معلوم ہو جاتا، بایزید نے اپنے غیر معمولی تحمل اور بردباری کی وجہ سے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ پلے شیف کو رخصت کر دیا اور اپنا کوئی سفیر دربار روس میں نہیں بھیجا۔

---

[1] ڈی لا مارٹین، بحوالہ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۲۳، ص ۳۲۷۔

سلیم اوّل

۹۱۸ھ تا ۹۲۶ھ مطابق ۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۰ء

جس وقت سلیم نے بایزید کو تخت سے اتار کر زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی وہ سینتالیس سال کی پختہ عمر کو پہنچ چکا تھا اور اس کی فوجی اور انتظامی قابلیت پوری طرح مسلم ہو چکی تھی، اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی لیکن اس قلیل مدت میں سلطنت عثمانیہ کی وسعت کو دو چند کر دیا، اس نے یورپین مقبوضات میں کوئی اضافہ نہیں کیا مگر ایشیا میں دیار بکر، کردستان، شام، مصر اور عرب کا ایک بڑا حصہ جس میں حرمین شریفین بھی داخل تھے، فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اس کی فتوحات کی وسعت، اعلیٰ فوجی قابلیت اور انتظام سلطنت کی غیر معمولی اہلیت نے اس کو سلاطین آل عثمان کی صف اول میں ایک ممتاز جگہ دی ہے، ان خصوصیات کے علاوہ علم و فضل میں بھی اس کا پایہ نہایت بلند تھا، وہ رات کو بہت کم سوتا اور زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا، اس کو تاریخ اور فارسی شاعری سے خاص دل چسپی تھی، فارسی زبان میں اس نے کچھ نظمیں خود بھی لکھیں، محمد فاتح کی طرح وہ بھی سیزر اور سکندر کے کارنامے نہایت شوق سے پڑھا کرتا تھا، اس کو حرم کی زندگی سے بہت کم دل چسپی تھی، دن میں سلطنت کے کاموں سے جو وقت بچتا، اس کا بیشتر حصہ وہ علما کی صحبت میں گزارتا، وہ اہل علم کو بڑے بڑے عہدوں پر بھی مامور کرتا، مثلاً جب کردستان کا

صوبہ فتح ہوا تو اس نے مورخ ادریس کو وہاں کا والی مقرر کیا لیکن علم کا شوق اور علما کی ہم نشینی اس کے مزاج میں نرمی پیدا نہ کرسکی، اس کی طبیعت حد درجہ اشتعال پذیر تھی، وہ کسی امر میں خفیف سی مخالفت بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا اور جو لوگ اس کی رائے سے ذرا بھی اختلاف کرنے کی جرأت کرتے، ان کو فوراً قتل کرا دیتا تھا، اس کے مختصر عہد حکومت میں سات وزیر اعظم اس کے حکم سے قتل ہوئے، ان کے علاوہ متعدد فوجی اور ملکی عہدہ داروں کو بھی اس کی ناخوشی کی پاداش میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا، جو لوگ وزیر اعظم کے عہدہ پر مقرر کیے جاتے تھے، ان کو اپنے انجام کا اتنا یقین ہوتا تھا کہ وہ اس ہلاکت آفریں ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھ کر چھوڑ جاتے تھے اور اکثر ان کی پیش بینی صحیح ثابت ہوتی تھی، چنانچہ ایک روز وزیر اعظم پیری پاشا نے سلیم سے عرض کیا کہ اے میرے بادشاہ! میں جانتا ہوں کہ جلد یا بدیر تجھے اس وفادار غلام کو قتل کرنے کا کوئی نہ کوئی حیلہ مل جائے گا، لہٰذا التجا ہے کہ قتل سے پہلے مجھے تھوڑی مہلت عطا فرمانا کہ میں اس دنیا سے متعلق اپنے کاروبار کا انتظام کرلوں اور تیرے حکم سے دوسری دنیا میں جانے کے لیے تیار ہو جاؤں، سلیم اس درخواست پر ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ میں کچھ دنوں سے تیرے قتل کی نسبت غور کررہا ہوں لیکن فی الحال تیرا کوئی جانشین مجھے نظر نہیں آتا، ورنہ تیری یہ درخواست میں بخوشی منظور کرلیتا، لیکن سلیم کی یہ سختی جو عموماً ظلم سے تعبیر کی جاتی ہے، ایک خاص اصول کے ماتحت تھی، وہ جو کچھ کرتا تھا، سلطنت کے لیے کرتا تھا، وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے باپ کے حلم ولینت نے حکومت کے تمام شعبوں میں بد نظمی پیدا کردی تھی، فوج میں خودسری آگئی تھی، وزراء اپنے فرائض کو بھولے ہوئے تھے، قاضیوں کے فیصلوں میں جانب داری کی جھلک نمایاں تھی، اس حالت کو سدھارنے کے لیے سختی ناگزیر تھی اور گو بعض اوقات سزا کی شدت جرم کی شدت سے بڑھ جاتی تھی، تاہم اس سخت گیری کا عام اثر نہایت مفید ثابت ہوا اور وہ تمام خرابیاں دور ہوگئیں جو حکومت کی بنیاد کو متزلزل کردینے کے لیے کافی تھیں، مورخین

نے سلیم کو ظالم لکھا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان مظالم کے باوجود وہ رعایا میں نہایت مقبول تھا، جو طرز عمل افراد کے لیے ظلم کا حکم رکھتا تھا، وہی رعایا کے حق میں رحمت بن گیا تھا۔

بھائیوں کی بغاوت سلیم نے جس وقت بایزید کو تخت سے اتار کر سلطنت پر قبضہ کیا تھا، اس کے دونوں بڑے بھائی کرکود اور احمد ایشیائے کوچک کے دو صوبوں کے حاکم تھے۔ ابتدا میں ان دونوں نے اطاعت کا اظہار کیا، سلیم ان کی طرف سے مطمئن نہ ہوا، اس کو تخت پر بیٹھے چند ہی روز گزرے تھے کہ شہزادہ احمد نے، جو اماسیا کا حاکم تھا، علم بغاوت بلند کر کے بروصہ پر قبضہ کر لیا، سلیم فوراً ایشیائے کوچک پہنچا، احمد بروصہ چھوڑ کر بھاگا اور اپنے دو لڑکوں کو شاہ اسماعیل کے پاس مدد حاصل کرنے کے لیے ایران روانہ کیا، سلیم نے گو بروصہ پر قبضہ کر لیا لیکن اس کی فوج کے بعض افسر شہزادہ احمد سے جا ملے اور لڑائی پھر چھڑ گئی، ابتدا میں احمد کو چند معمولی فتوحات حاصل ہوئیں لیکن بالآخر اسے اپنی جان لے کر بھاگنا پڑا، سلیم نے وزیر اعظم مصطفیٰ پاشا کو، جو احمد سے مل گیا تھا، پھانسی دے دی اور اس کے بعد اپنے پانچ بھتیجوں کو، جو بروصہ کے بعض امراء کے گھروں میں چھپے ہوئے تھے، گرفتار کر کے مروا ڈالا، یہ شہزادے اس کے مرحوم بھائیوں شہنشاہ شاہ عالم اور محمود (جو بایزید کی حیات ہی میں وفات پا چکے تھے) کی اولاد تھے۔

شہزادہ کرکود اس وقت تک اپنے علاقہ صاروخان میں خاموش بیٹھا تھا لیکن ان شہزادوں کے قتل کی خبر سن کر اس نے سمجھ لیا کہ اس کی باری بھی اب آیا چاہتی ہے، اس لیے وہ بھی اب اپنی جان کی حفاظت کا سامان کرنے لگا اور ینی چری کو اپنا طرف دار بنانے کی کوشش شروع کی، سلیم کو اس کی تیاریوں کی اطلاع ہو گئی، وہ نہایت خاموشی سے شکار کا بہانہ کر کے دس ہزار سواروں کے ساتھ کرکود کی حکومت میں داخل ہوا اور اسے گرفتار کر لینا چاہا، کرکود بھاگا لیکن جلد پکڑ لیا گیا، سلیم نے ستان نامی ایک افسر کو اس کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ مرنے کے لیے فوراً تیار ہو جاؤ، رات کا وقت تھا اور کرکود سو رہا تھا، ستان نے اس کو

بیدار کر کے سلیم کا حکم سنایا، کرکود نے صرف ایک گھنٹہ کی مہلت مانگی، اس فرصت میں اس نے اپنی بے کسی کی موت پر ایک منظوم خط سلیم کے نام لکھا، جس میں اس کی بے دردی کی شکایت کی، اس کے بعد اس نے اپنی گردن جلاد کے حوالے کر دی، سلیم یہ خط پڑھ کر، جو حقیقۃً ایک نہایت دردناک مرثیہ تھا، بہت رویا، اسے اس قدر صدمہ ہوا کہ تین روز تک خود بھی ماتم کرتا رہا اور تمام سلطنت میں بھی ماتم کا حکم دیا، جن ترکمانوں نے کرکود کے چھپنے کی جگہ کا پتہ بتایا تھا اور اب انعام کے لیے حاضر ہوئے تھے، سلیم نے ان سب کو قتل کرا دیا، اس درمیان میں احمد نے پھر ایک فوج اکٹھا کر کے سلیم کا مقابلہ کیا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوا لیکن ۱۷ صفر ۹۱۹ھ (۲۴ اپریل ۱۵۱۳ء) کی جنگ میں اسے شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا، اسے بھی گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا۔

ایران سے جنگ سلیم اب تخت سلطنت کی طرف سے مطمئن ہو گیا، وہ ایشیائے کوچک سے یورپ کو واپس ہوا اور یورپ کی مختلف حکومتوں سے صلح ناموں کی تجدید کر کے اپنی سلطنت کے مغربی حصہ کو ہر طرح کے بیرونی خطرات سے محفوظ کر لیا اور پھر مشرق کی جانب متوجہ ہوا، ایران کے تخت پر اس وقت شاہ اسماعیل صفوی متمکن تھا، جس نے چند سال قبل عراق، عرب، خراسان اور دیار بکر پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کا ایک فوجی افسر بغداد میں بھی داخل ہو گیا تھا، ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں فارستان اور آذربائیجان بھی سلطنت ایران میں شامل کر لیے گئے تھے، جو خلیج فارس سے بحر کاسپین اور فرات سے دریائے آمو تک پھیلی ہوئی تھی، اس طرح ایران کی سرحد سلطنت عثمانیہ کی سرحد سے مل گئی تھی، اتفاق یہ کہ دونوں سلطنتوں کے فرماں روا بھی شجاعت، عظمت اور ملک گیری کی ہوس میں ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے، ایسی صورت میں دونوں کا تصادم ناگزیر تھا، تصادم کے متعدد اسباب موجود تھے، سب سے بڑا سبب مذہب کا اختلاف تھا، شاہ اسماعیل ایک غالی شیعہ اور سلیم ایک متشدد سنی تھا، سلطنت عثمانیہ کے ایشیائی مقبوضات میں شیعوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، شاہ اسماعیل کے گماشتے اناطولیہ میں شیعیت

کی تلقین کرتے پھرتے تھے اور اندر اندر لوگوں کو سلیم کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، سلیم شیعیت کا سخت دشمن تھا اور اسے سلطنت کے لیے ایک بڑا فتنہ خیال کیا کرتا تھا، وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کی تخت نشینی سے ایک ہی سال قبل اسماعیل کے اعوان میں سے شاہ قلی نامی ایک شخص نے کس طرح تشیع کی تبلیغ کر کے اناطولیہ کے باشندوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا تھا اور اس فتنہ کے فرو کرنے میں کس قدر دشواری پیش آئی تھی، چنانچہ جب اسے اس قسم کا خطرہ پھر محسوس ہوا تو اس نے اپنی سلطنت سے شیعیت کا استیصال کر دینا چاہا اور جاسوسوں کے ذریعہ سے سلطنت کے تمام شیعوں کو شمار کرایا، ان کی تعداد ستر ہزار نکلی، پھر ایک روز دفعۃً ان میں سے چالیس ہزار کو قتل کرا دیا اور باقی تیس ہزار کو جن میں عورتیں اور بچے شامل تھے، قید میں ڈال دیا، اس واقعہ سے تمام ایران میں ایک آگ سی لگ گئی لیکن سلیم کی قوت و سطوت کے مقابلہ میں اس وقت شاہ اسماعیل کو اقدام کی جرأت نہ ہوئی، بہرحال ایران اور دولت عثمانیہ کی جنگ کا یہی ایک سبب نہ تھا، اس قتل عام سے قبل بھی دونوں سلطنتوں کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے، مثلاً شاہ یزید ثانی کے عہد میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں پیش آ چکی تھیں جن میں شاہ اسماعیل نے بعض ترک سرداروں کو جو ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقوں کے حاکم تھے شکست دی تھی، علاوہ بریں اس نے دولت عثمانیہ کے مقابلہ میں سلطان مصر سے اتحاد کر لیا تھا، وہ سلطنت عثمانیہ کی رفتار ترقی کو روکنا چاہتا تھا، ان میں سے ہر سبب سلیم جیسے تند مزاج سلطان کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھا لیکن جس چیز نے اس کو سب سے زیادہ برانگیختہ کیا وہ یہ تھی کہ شاہ اسماعیل نے مرحوم شہزادہ احمد کے لڑکے شہزادہ مراد کو پناہ دی اور اعلانیہ اس کی حمایت کر رہا تھا، نہ صرف یہ بلکہ سلیم کو تخت سے اتار کر مراد کو اس کی جگہ بیٹھانے کے لیے وہ اب فوجیں بھی جمع کر رہا تھا، سلیم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے ایران پر حملہ کا تہیہ کر لیا اور شاہ اسماعیل کو میدان جنگ میں مقابلہ کی دعوت دی۔

عثمانی فوجیں ینی شہر کے میدان میں جمع ہوئیں اور سلیم ۲۳ صفر ۹۲۰ھ (۲۰ اپریل

۱۵۱۴ء) کو ایک لاکھ چالیس ہزار فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ایران کے پایہ تخت تبریز کی طرف روانہ ہو گیا، ینی شہر سے تبریز کا فاصلہ ایک ہزار میل سے زیادہ تھا، راستہ بھی پہاڑی تھا اور درمیان میں کوئی سڑک نہ تھی، سب سے بڑی دشواری سامان رسد کی فراہمی کی تھی، جب سلیم ایران کی سرحد پر پہنچا تو شاہ اسماعیل نے بجائے مقابلہ کرنے کے تمام علاقے ویران کر دیے اور خود پایہ تخت کی طرف لوٹ گیا، اس سے سلیم کی مشکلات اور بڑھ گئیں، رسد کے ملنے میں سخت دشواری پیش آنے لگی، فوج میں جو اپنے طویل سفر سے بالکل خستہ ہو گئی تھی، بے دلی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور اس نے آگے بڑھنے میں تامل کیا لیکن سلیم کی مستقل مزاجی بدستور قائم رہی اور باوجود اس کے کہ رسد کی فراہمی روز بروز زیادہ دشوار ہوتی جاتی تھی، اس کے قدم نہ رکے، بالآخر فوج نے علانیہ طور پر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا، سلیم کے لیے یہ موقع نہایت نازک تھا، مگر اس کی غیر معمولی شجاعت نے فوج کو قابو سے باہر نہ ہونے دیا، وہ دلیری کے ساتھ ان کے سامنے گیا اور یوں کہنے لگا "کیا اسی طرح تم اپنے سلطان کی خدمت کرتے ہو؟ کیا تمہارا ادعائے وفا محض زبانی تھا؟ جو لوگ واپس جانا چاہتے ہیں وہ فوج سے علاحدہ ہو جائیں اور چلے جائیں لیکن میں نے تو اتنی دور کا سفر اس لیے نہیں کیا ہے کہ یہاں سے لوٹ جاؤں، تم میں سے جو بزدل ہیں وہ فوراً ان بہادروں سے علاحدہ ہو جائیں، جنھوں نے تیغ و تفنگ اور جسم و روح کے ساتھ ہماری مہم کے لیے اپنی جانیں وقف کر دی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دستہ قائم کر کے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور کسی ایک سپاہی کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ اپنا دستہ چھوڑ کر علاحدہ ہو جائے۔

ایرانیوں کی شکست عثمانی فوج جب تبریز کے قریب پہنچی تو شاہ اسماعیل کو مجبوراً مقابلہ کے لیے نکلنا پڑا، دونوں فوجیں ۲/ رجب ۹۲۰ھ (۲۳/ اگست ۱۵۱۴ء) کو وادی چالدیران میں صف آرا ہوئیں، ترکی لشکر کی تعداد جس نے بارہ سو میل کی سخت دشوار گزار راہ صرف ایک سو چھبیس روز کی قلیل مدت میں طے کی تھی، اب ایک لاکھ چالیس ہزار سے گھٹ کر ایک

۱ لاکھ بیس ہزار رہ گئی تھی، جس میں اسی ہزار سوار تھے، ایرانی فوج کی مجموعی تعداد اسی ہزار تھی، یہ سب سوار تھے اور اپنی شجاعت اور سپہ گری کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھے، عثمانی بالکل خستہ ہو رہے تھے، برخلاف اس کے ایرانی سوار تازہ دم تھے، جنگ کی ابتدا ایرانیوں کے موافق ہوئی، ایرانی سواروں کا جو دستہ شاہ اسماعیل کی سرکردگی میں تھا، اس نے اپنے مقابل ترکی دستہ کو پسپا کر دیا لیکن ترک فوراً ہی سنبھل گئے اور انہوں نے پلٹ کر نہایت دلیری سے مقابلہ کیا، اس درمیان میں عثمانی توپوں نے گولے برسانا شروع کر دیے، ایرانیوں کے پاس توپ خانے نہ تھے، وہ اس حملہ کی تاب نہ لا سکے اور پچیس ہزار لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگے، شاہ اسمٰعیل بھی زخمی ہو گیا تھا اور بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگ سکا۔

۱۴ رجب ۹۲۰ھ (۴ ستمبر ۱۵۱۴ء) کو سلیم تبریز میں فاتحانہ داخل ہوا، وہاں سے اس نے علاوہ شاہی خزانے کے ایک ہزار بہترین صناع اور کاریگر قسطنطنیہ روانہ کیے، قسطنطنیہ میں ان لوگوں کو رہنے کے لیے مکانات اور اپنے پیشوں کے جاری رکھنے کے لیے تمام ضروری سامان دیے گئے، تبریز میں آٹھ روز قیام کے بعد وہ شمال میں قرہ باغ کی طرف بڑھا، اس کا ارادہ تھا کہ موسم سرما آذربائیجان کے میدانوں میں گزارنے کے بعد بہار شروع ہونے پر پھر فتوحات کا سلسلہ شروع کرے لیکن فوج اب بالکل خستہ ہو چکی تھی اور آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ تھی، سلیم کو اندیشہ ہوا کہ سختی کرنے سے ممکن ہے بغاوت برپا ہو جائے، اس لیے مجبوراً وہ قسطنطنیہ کی طرف واپس ہوا، شاہ اسمٰعیل سے کوئی صلح نامہ نہ ہوا اور دونوں سلطنتوں کی جنگ کا سلسلہ کسی نہ کسی حد تک سلیم کی حیات تک قائم رہا لیکن چالدیران کی جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیار بکر اور کردستان کے صوبے مکمل طور پر فتح کر لیے گئے اور ایران سے نکل کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے، سلیم نے ان صوبوں کا حاکم مشہور مؤرخ ادریس کو مقرر کیا، سلیم کے لیے پورے ایران کو عثمانی مقبوضات میں داخل کر لینا دشوار نہ تھا لیکن کسی مصلحت سے اس نے ایسا کرنا مناسب نہ خیال کیا، جیسا کہ لین پول کا خیال ہے، شیعیت سے اسے اس درجہ نفرت تھی کہ

دشمن تھے اس نے ایران کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بجائے غیر آباد رکھنا ہی بہتر سمجھا۔ اسی تشدد کے تحت اس نے ایک فرمان نافذ کر کے ایران سے تجارت کرنا ممنوع قرار دیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ چند تاجروں نے اس فرمان کی خلاف ورزی کی ہے تو اس نے ان سب کے قتل کا حکم دے دیا۔ مفتی جمالی نے بمشکل اس سے یہ حکم منسوخ کرایا۔

شام و مصر | ایران کے بعد سلیم شام اور مصر کی طرف متوجہ ہوا، یہ ممالک ڈھائی سو برس سے سلاطین مملوک کے زیر حکومت تھے، سلیم کے زمانہ میں ان کا حکمراں قانصوہ غوری تھا، سلطان مصر کو حجاز کی فرمانروائی بھی حاصل تھی، دولت عثمانیہ اور سلطنت مصر کے تعلقات بایزید ثانی ہی کے وقت سے غیر خوشگوار تھے، جو لڑائیاں ان کے درمیان ہوئی تھیں ان میں عثمانیوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی تھی لیکن سلیم کی تخت نشینی کے بعد قانصوہ غوری کو معلوم ہو گیا کہ اب سلطنت عثمانیہ کی عنان حکومت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں ہے، جو بایزید ثانی سے بالکل مختلف ہے، یہی وجہ تھی کہ اس نے شاہ اسمٰعیل کی دعوت پر دولت عثمانیہ کے خلاف ایران سے اتحاد کر لیا تھا، کردستان اور دیار بکر کی فتح کے بعد عثمانی اور شامی مقبوضات ایک دوسرے سے بالکل قریب ہو گئے تھے، قانصوہ غوری نے ۹۲۲ھ (۱۵۱۶ء) میں ایک زبردست فوج شام کے علاقہ میں متعین کر دی تھی تاکہ افواج عثمانی کی نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہے، سنان پاشا نے جو ایشیائے کوچک کے جنوب مشرق میں ترکی لشکر کا سپہ سالار تھا، اس واقعہ کی اطلاع سلیم کو دی اور لکھ بھیجا کہ ایسی صورت میں سلطان کے حسب ہدایت وادی فرات کی طرف کوچ کرنا خطرہ سے خالی نہ ہوگا، سلیم نے قسطنطنیہ میں دیوان منعقد کر کے اس مسئلہ کو غور و بحث کے لیے پیش کیا۔

دنیائے اسلام کا انتشار | یہ مسئلہ محض سلطنت مملوکیہ اور دولت عثمانیہ کی قوت آزمائی کا نہ تھا بلکہ حقیقۃً اس کا تعلق دنیائے اسلام کے عام انتشار اور پراگندگی سے تھا، خلافت عباسیہ کے مصر میں منتقل ہونے کے بعد اسلام کی متحدہ سیاسی قوت پارہ پارہ ہو گئی تھی اور خلیفہ کا

اقتدار صرف مذہبی اور رسمی رہ گیا تھا، سلطان سلیم کے ابتدائے عہد میں دنیائے اسلام کے ضعف و انتشار کی جو حالت تھی، اس کا اندازہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مختصر رسالہ "خلافت عثمانیہ" کے حسب ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے:

> "نویں صدی کے اواخر میں دنیائے اسلام کے نقشہ پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس عظیم الشان جمہوریت کا قالب بے جان ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا، اس کے دل و دماغ (خلافت مصر) کی کمزوری اور ضعف کا یہ حال پہنچا ہے کہ دور دور کے اجزائے بدن کی تو کیا آس پاس کے اعضا کی قوت کا سہارا بھی نہیں رہے ہیں، بڑی بڑی سلطنتیں اور حکومتیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں، امارتوں اور ٹکڑیوں میں بٹ گئی ہیں، ہندوستان سے لے کر اسپین تک تم کو یہی کیفیت اور یہی نقشہ نظر آئے گا، ہندوستان کی طاقت سندھ، گجرات، مالوہ، احمد نگر، بیجاپور، برہان پور، بیدر، کشمیر، جون پور، بنگال، دہلی وغیرہ صوبہ دار حکومتوں میں منقسم ہوگئی ہے، ترکستان میں بخارا، بلخ، خوارزم، مرو اور کاشغر میں بیسیوں خان چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حکمراں ہیں، روس کا علاقہ کریمیا، قازان، استراخان میں بٹ گیا ہے، علاقہ قفقاز میں آذربائیجان، داغستان، گرجستان، سب بکھرے ہوئے اجزا ہیں، افغانستان و خراسان میں مختلف تیموری شہزادے اور ترکمانی امراء ادھر ادھر قسمت آزمائی کر رہے ہیں، عراق ایک مستقل حکومت ہے، مصر و شام میں مملوک سلطانوں کی سلطنت ہے، عرب چھوٹے چھوٹے شیوخ میں بٹا ہوا ہے، یہاں تک کہ یمن میں تو ایک ایک شہر کا الگ الگ امیر ہے، حجاز شرفا کے ایک خاندان کے ماتحت تھا، جو کبھی مصر کے زیر اثر بن جاتے تھے اور جب کبھی موقع ملتا تھا امام یمن سے ساز باز کر لیتے تھے، امام یمن اور سلطان مصر میں ایک سلسلہ جنگ برپا تھا، مصر کے پار سوڈان، طرابلس، تیونس، الجزائر، فاس کتنی ہی ریاستیں تھیں، اسپین کی ایک سلطنت کے غرناطہ، قرطبہ، طلیطلہ، شاطبہ، حمص، بطلیوس کتنے ہی ٹکڑے ہوگئے تھے، جن میں سے اب صرف ایک یا دو باقی تھے، غرض خانوادۂ اسلام کا ایک ایک گھر اجڑ گیا تھا اور جسد خلافت کا تار تار الگ ہو گیا تھا۔"

یہ تو دنیائے اسلام کے انتشار کا نقشہ تھا، اس انتشار سے جو نتائج پیدا ہوئے ان کی تصویر بھی مولانائے موصوف کے قلم نے کھینچ دی ہے:

"یورپ کے مسیحی سپاہیوں نے ایک ہی دفعہ اس پر چار گوشوں سے حملہ کیا، ۸۹۳ھ سے روس نے ایشیائے وسطی کے صحرائے اسلام پر اپنا حملہ شروع کیا، یہ قازان کی اسلامی ریاست تھی اور ایک طویل سلسلہ جنگ کے بعد ۹۹۳ھ میں اس کا خاتمہ ہو گیا، اس کے بعد استرخان اور کریمیا وغیرہ کی باری آئی، یہاں تک کہ اس کے ڈانڈے بحر اسود اور سرحد ایران سے آکر مل گئے، اسپین اور پرتگال ملک اندلس میں اسلام کا ۸۹۷ھ میں خاتمہ کر کے آگے کو بڑھے، اسپین نے دوستی کے پردہ میں تیونس اور الجزائر پر قبضہ کیا، پرتگال نے پورے افریقہ کو ناپ کر بحر عرب اور بحر ہند میں آکر اپنے ڈیرے ڈالے اور عرب اور ہندوستان کے اسلامی سواحل پر قتل و غارت گری کا آغاز کیا، دوسری طرف مراکش کے سواحل پر آکر وطاسی خاندان پر حملہ آور ہوئے، جو مغرب میں ایک نئی اسلامی حکومت کی بنیاد ڈال رہا تھا اور آسفی، ازمور اور معمورہ پر قبضہ کر لیا، صلیبی سپاہیوں کی چوتھی کمین گاہ بحر روم کے جزائر تھے، قبرص (سائپرس) روڈس، مالٹا اور وینس کے صلیبی دستے مصر و شام کی ناکہ بندی میں مصروف تھے، خصوصاً قبرص، روڈس اور مالٹا تو سینٹ جان کے صلیبی مجاہدین کے بڑے بڑے مستحکم قلعے تھے، جو دن رات صرف مسلمانوں کے خون کے پیاسے رہتے تھے، اور یہی ان کی زندگی کا مذہبی فرض تھا، یہ درحقیقت گذشتہ صلیبی سپاہیوں کی یادگار اور فلسطین کی مسیحی نوے سالہ حکومت کی شکست خوردہ فوج کی نسل تھے، یہ بحر روم کے دربان تھے، جن کے سامنے سے کوئی اسلامی جہاز مسلمان ملکوں کو روانہ نہیں ہو سکتا تھا، قبچاق، کریمیا اور روم کے مسلمان حج نہیں کر سکتے تھے، وینس کا بازار مسلمان عورتوں کی ناموس اور مسلمان مردوں کی آزادی کی خرید و فروخت کی بڑی منڈی بن گئی تھی، جو قیدی کسی حال میں اسلام سے پھرنا گوارا نہیں کرتے تھے، اگر مرد ہوتے وہ مصر لا کر بیچ ڈالے جاتے تھے، جہاں وہ مملوک سپاہیوں میں بھرتی کر لیے جاتے تھے، اور اگر

لڑکیاں ہوتیں تو وہ اٹلی کے امراء اور دولت مندوں کے عیش خانوں میں بھیج دی جاتی تھیں اور جب کبھی موقع ملتا وہ اسکندریہ تک دھاوا کرتے چلے آتے۔

اس سے زیادہ بدقسمتی یہ ہے کہ اسی زمانہ میں ۹۰۶ھ میں ایران و خراسان میں صفوی خاندان کا ظہور ہوا، جس نے تنگ نظری سے اسلام کے بجائے شیعیت کو اپنے سیاسی کارناموں کا مرکز قرار دیا، اہل سنت یا تو اس ملک سے جلاوطن ہونے پر مجبور ہوئے یا ہنگاموں میں قتل ہوئے یا وہ شیعہ بنا ڈالے گئے، اس سے بڑھ کر یہ کہ صفویوں نے سلطنت عثمانیہ کے باغی شہزادوں کو اپنے یہاں پناہ دی اور سلطان مصر سے ربط و قرابت کر کے سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک متحدہ حملہ کا سامان کیا، اس کا نتیجہ باہمی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں اور مجموعی حیثیت سے اسلام کی تباہی۔"

دیوان کا فیصلہ دنیائے اسلام کی یہ حالت سلیم سے پوشیدہ نہ تھی، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس ضعف و انتشار کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خلافت اور سلطنت دو علاحدہ علاحدہ شخصیتوں میں تقسیم کر دی گئی ہے، اسلام کے گذشتہ اقتدار کو از سر نو قائم کرنے کے لیے اس کے نزدیک ان دونوں شخصیتوں کو ایک ہی ہستی میں مدغم کر دینا نہایت ضروری تھا اور چونکہ دولت عثمانیہ سے زیادہ طاقتور اس وقت کوئی دوسری اسلامی سلطنت نہ تھی اور دفاع و جہاد کا فرض جو منصب خلافت کا پہلا مقصد ہے، ڈیڑھ سو برس سے وہی ادا کر رہی تھی، اس لیے دنیائے اسلام کی امامت کا حق دار بھی اس سے زیادہ کوئی دوسرا نہ تھا لیکن حجاز و مصر و شام پر، جو اسلامی دنیا کے اصلی عناصر تھے، مصر کے مملوک سلاطین کی حکومت تھی اور ان اجزا کو شامل کیے بغیر خلافت کا دائرۂ اقتدار مکمل نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ جب سلیم نے سنان پاشا کی تحریر دیوان کے سامنے پیش کی تو نہ صرف قانصوہ غوری کے معاندانہ روش پر غور کیا گیا جو اسمٰعیل سے ملا ہوا تھا اور جس نے ایران کی جنگ کے موقع پر سامان رسد کے قافلہ کو عثمانی لشکر میں جانے سے روک دیا تھا[1] بلکہ خلافت و امامت کے مسئلہ پر بھی مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں بہت دیر

---

[1] فتوحات اسلامیہ مفتی دحلان مکی، جلد ۲ ص ۱۴۲، مطبوعہ مصر ۱۳۲۰ھ۔

تک بحث ہوتی رہی، بالآخر یہ طے پایا کہ حرمین شریفین کی خدمت کا حق سلطان عثمانی سے زیادہ کسی دوسرے مسلمان حکمراں کو نہیں پہنچتا اور اس کے لیے جنگ ناگزیر ہے، رئیس آفندی محمد پاشا نے اس رائے کی موافقت میں ایک نہایت پرزور تقریر کی اور کہا کہ وہ دولت علیہ کا فرض ہے کہ اس حق کو بذریعہ فتح حاصل کرے، سلیم محمد پاشا کی تقریر سے اس قدر خوش ہوا کہ اسی وقت اس کو وزیر اعظم مقرر کر دیا، غرض دیوان نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے قانصوہ غوری سے اطاعت کا مطالبہ کرنا چاہیے اور اگر وہ انکار کرے تو لڑائی شروع کر دی جائے۔

شام کی فتح

قانصوہ غوری اس وقت حلب میں مقیم تھا، سلیم کے ایلچی جب یہ پیغام لے کر اس کے پاس پہنچے تو اس نے برافروختہ ہو کر ان کو قید میں ڈال دیا لیکن سلیم لڑائی کا عزم پہلے ہی کر چکا تھا، ایلچیوں کے روانہ کرنے کے فوراً ہی بعد وہ خود بھی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے شام کی طرف روانہ ہو گیا تھا، جب عثمانی لشکر شام کی سرحد میں داخل ہوا تو قانصوہ غوری کو اپنی غلطی کی اہمیت معلوم ہوئی، اس نے سلیم کے ایلچیوں کو فوراً رہا کر دیا اور صلح کی گفتگو شروع کی مگر سلیم صلح کے لیے قسطنطنیہ سے نہیں روانہ ہوا تھا، ۲۵/ رجب ۹۲۲ھ (۲۴/ اگست ۱۵۱۶ء) کو حلب کے قریب مرج وابق کے میدان میں پہلا معرکہ پیش آیا، جس نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، مملوک نہایت بہادری سے لڑے لیکن آپس کے اختلافات سے ان کی قوت پہلے ہی کمزور ہو گئی تھی، علاوہ بریں قانصوہ غوری کے دو فوجی سرداروں یعنی خیر بے اور غزالی نے لڑائی شروع ہونے سے قبل سلیم سے ساز باز کر لیا تھا، خیر بے حلب کا گورنر تھا اور غزالی فوج کا ایک بڑا افسر تھا، ان دونوں نے عین موقع پر غداری کی، جاباتوں کے دستوں کو لے کر جو چرکسی مملوکوں سے نیچے درجہ کے مملوک تھے اور چرکسوں سے حریفانہ رقابت رکھتے تھے، میدان جنگ سے بھاگ گئے، قانصوہ غوری کے پاس توپیں نہ تھیں، عثمانی توپوں کی گولہ باری نے مصری فوج کو جس کی قوت خیر بے اور غزالی کی غداری سے ٹوٹ چکی تھی، زیادہ دیر تک میدان جنگ میں ٹھہرنے نہ دیا، صرف ایک گھنٹہ کے اندر لڑائی ختم ہو گئی، بوڑھا سلطان قانصوہ غوری بھی یہ دیکھ

کہ کر اب مقابلہ بے سود ہے، بھاگا لیکن شاید اپنے ہی سپاہیوں کی بھیڑ میں دب کر مارا گیا۔

حلب کا خیر مقدم | سلیم فاتح کی حیثیت سے حلب میں داخل ہوا، خیر بے نے شہر کی کنجیاں پیش کیں، باشندگان شہر نے حاضر ہو کر وفاداری کا حلف لیا، مفتی وحزن تی لکھتے ہیں کہ حلب کے باشندے اپنے علما اور صلحا کے ساتھ سروں پر قرآن رکھے ہوئے سلطان کے استقبال کو آئے، فتح کی تہنیت پیش کی اور رحم و درگزر کے خواستگار ہوئے، سلیم ان سب سے مہربانی کے ساتھ پیش آیا، پھر جب وہ جامع مسجد میں گیا تو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، پہلے سلاطین مصر کے القاب میں ”خادم الحرمین الشریفین“ کا لقب شامل کیا جاتا تھا لیکن حلب کی فتح کے بعد جامع مسجد کا خطیب جب خطبہ دینے کھڑا ہوا تو سلطان سلیم خان کے نام کے ساتھ اس لقب کا اضافہ کیا، سلیم نے اسے آئندہ کامیابی کی بشارت خیال کیا اور اس قدر خوش ہوا کہ جو حلہ پہنے ہوئے تھا، اتار کر اسی وقت خطیب کو دے دیا۔[1]

دیگر فتوحات | حلب میں چند دنوں قیام کرنے کے بعد سلیم شام کے دوسرے شہروں کی فتح کے لیے روانہ ہوا، ہر شہر نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے دروازے کھول دیے اور وہاں کے لوگوں نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا، سلیم نے ان کے ساتھ بہت نرمی کا سلوک کیا، اور اپنے الطاف و اکرام سے انہیں بالکل مطمئن کر دیا، چنانچہ دمشق، بیت المقدس، حمص اور متعدد دوسرے شہر نہایت آسانی سے فتح ہو گئے اور ہر جگہ سلیم کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، دمشق میں اس نے شیخ محی الدین بن عربیؒ کے مزار پر ایک مقبرہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور وہاں کے فقرا کے لیے ایک مطبخ بھی قائم کیا اور اس کے اخراجات کے لیے کافی جائداد وقف کر دی۔[2]

طومان بے | شام کے اس آسانی سے فتح ہو جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ قانصوہ غوری کی وفات پر اس کے جانشین کے انتخاب کے لیے مملوکوں کے تمام بڑے بڑے فوجی سردار فورا

---

[1] فتوحات اسلامیہ جلد ۲، ص ۱۲۳

[2] الاعلام باعلام بیت اللہ والحرام برحاشیہ خلاصۃ الکلام، ص ۸۸، مطبوعہ مصر ۱۳۰۵ھ۔

قاہرہ روانہ ہو گئے اور میدان عثمانیوں کے لیے خالی ہو گیا، مملوکوں میں دستور یہ تھا کہ سلطان کا انتخاب چوبیس بلند پایہ امراء کیا کرتے تھے، جو فوج و حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور ہوتے تھے، چنانچہ اس موقع پر بھی یہ امراء قاہرہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے طومان بے کو جو اپنی حیرت انگیز شجاعت فوجی قابلیت اور شریفانہ اوصاف و خصائل کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز تھا، سلطان منتخب کیا، طومان بے کے انتخاب سے مملوکوں میں ایک تازہ روح پیدا ہو گئی۔

معرکہ ردانیہ شام کی فتح کے بعد سلیم نے مصر کی طرف کوچ کی تیاری کی، ادھر طومان بے بھی مدافعت کا سامان کر رہا تھا، سب سے پہلے اس نے ایک فوج غزہ روانہ کی تاکہ عثمانی لشکر کو مصر کی طرف بڑھنے سے روکے اور خود قاہرہ کے قریب مصری افواج کے بڑے حصہ کو جمع کرنا شروع کیا، غزہ میں مملوکوں اور عثمانیوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا، لیکن صدر اعظم سنان پاشا کی سپہ سالاری اور ترکی توپوں کی گولہ باری نے مملوکوں کے قدم اکھاڑ دیے، اس کے بعد مصری سرحد تک پھر کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور سلیم کی فوج نے دس روز کے اندر ریگستان کو عبور کر لیا، سلیم نے اس مہم کے لیے کئی ہزار اونٹ خرید لیے تھے، ان پر فوج کے لیے پانی کے مشکیزے لدے ہوئے تھے، مصری فوجیں قاہرہ سے تھوڑے فاصلہ پر ردانیہ میں خیمہ زن تھیں، وہیں ۲۹ ذی الحجہ ۹۲۲ھ (۲۲ جنوری ۱۵۱۷ء) کو مقابلہ ہوا، اس معرکہ میں بھی اگرچہ پہلی جنگوں کی طرح توپ خانوں کی وجہ سے میدان ترکوں کے ہی ہاتھ رہا تاہم مملوکوں نے جیسی غیر معمولی شجاعت اور جاں بازی کا ثبوت دیا، اس کی مثال تاریخ کے صفحات میں کم ملتی ہے، لڑائی کے شروع میں ہی سواروں کا ایک دستہ جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا، عثمانی فوج کے قلب پر جہاں سلطانی علم لہرا رہا تھا، حملہ آور ہوا، اس دستہ کی قیادت خود طومان بے اور اس کے دو بہترین افسر الان بے اور قرط بے کر رہے تھے، ان لوگوں نے قسم کھائی تھی کہ یا تو سلیم کو زندہ گرفتار کریں گے یا اسے قتل کر کے چھوڑیں گے، یہ قسم پوری ہو کر رہتی مگر حسن اتفاق سے اس وقت بجائے سلیم کے صدر اعظم سنان پاشا وہاں

چند خاص خاص فوجی افسروں کے حلقہ میں کھڑا ہوا تھا طومان بے اسی کو سلیم سمجھ کر ایک نیزہ ایسا مارا کہ سینہ کے پار ہوگیا، الان بے اور قرط بے نے بھی ایک ایک پاشا کو قتل کیا اور پھر گھوڑے موڑ کر یہ تینوں بہ حفاظت اپنی فوج میں واپس آ گئے، البتہ الان بے کو بندوق کی گولی سے ایک زخم لگ گیا تھا، یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے ہوگیا، طومان بے سمجھتا تھا کہ سلیم کے قتل کے بعد ترکوں کی ہمت چھوٹ جائے گی، دوسرے مملوکوں نے بھی اپنے سرداروں کی طرح سپہ گری اور جاں بازی کا حق ادا کر دیا لیکن ان کی بے مثل شجاعت وسرفروشی ترکی توپوں کے مقابلہ میں بے سود ثابت ہوئی، پچیس ہزار مملوک سواروں کی لاشیں تحفظ وطن کی قیمت نہ ادا کر سکیں اور طومان بے کو بالآخر اپنے بقیہ سواروں کے ساتھ میدان چھوڑنا پڑا۔

قاہرہ میں قتل عام جنگ رودانیہ کے ایک ہفتہ بعد عثمانی فوج کا ایک دستہ بلا مزاحمت قاہرہ میں داخل ہوا لیکن طومان بے نے آ کر دفعۃً اس پر چھاپا مارا اور پورے دستہ کو تہ تیغ کر دیا، اب سلیم نے اپنی بہترین فوجیں قاہرہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیں، شہر کے گرد باقاعدہ استحکامات نہ تھے لیکن مملوکوں نے گویا ہر سڑک کو میدان جنگ اور ہر مکان کو قلعہ بنا دیا تھا، عثمانیوں کو ہر ہر قدم پر مزاحمت کا سامنا تھا، تین دن تک نہایت سخت لڑائی ہوتی رہی، آخرکار خیر بے کے مشورے سے سلیم نے یہ اعلان کرا دیا کہ جو مملوک ہتھیار ڈال دیں گے ان کی جانیں بخش دی جائیں گی، اس اعلان پر اعتبار کر کے مملوکوں نے لڑائی موقوف کر دی اور ان میں سے آٹھ سو ممتاز آدمیوں نے اپنے کو سلیم کے حوالہ کر دیا، سلیم نے خلاف عہد ان سب کو قتل کرا دیا، اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ شہر کے تمام باشندے تہ تیغ کر دیے جائیں، کریسی کا بیان ہے کہ پچاس ہزار آدمی اس قتل عام میں مارے گئے۔

قرط بے قرط بے کچھ دنوں تک قاہرہ میں چھپا رہا لیکن پھر سلیم کے وعدوں پر اعتماد کر کے اس نے بھی اپنے کو پیش کر دیا، اس موقع پر سلیم اور قرط بے کے درمیان جو گفتگو ہوئی اسے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں، کریسی نے ان دونوں کی ملاقات کا حال اور ان کی گفتگو فان ہیمر کے

حوالے سے نقل کی ہے اور فان ہیمر من جملہ اور اسناد کے ایک ایسے شخص کی سند بھی پیش کی ہے جو طومان بے کے دربار کا ایک عہدہ دار تھا[1] قرط بے جب سلیم کے سامنے آیا تو وہ فوج کے تمام بڑے بڑے افسروں کے حلقہ میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا لیکن فاتح سلطان کی یہ شان اس بہادر مملوک کو مطلق متاثر نہ کر سکی، سلیم نے اس کے بے خوف چہرے پر نظر ڈالی اور پوچھا ”تو ایک نامور شہسوار تھا، تیری شجاعت اب کہاں ہے؟“ قرط بے نے جواب دیا کہ ”وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہے“ سلیم نے کہا ”کیا تجھے معلوم ہے کہ تو نے میری فوج کے ساتھ کیا کیا ہے؟“ ”مجھے خوب معلوم ہے“ یہ جواب بھی پہلے جواب کا سا مختصر اور مسکت تھا، اس کے بعد سلیم نے اس دلیرانہ حملہ پر اظہار تعجب کیا جو قرط بے نے ردانیہ کے میدان میں طومان بے اور الان بے کے ساتھ اس پر کرنا چاہا تھا اور جو سنان پاشا کے لیے اس قدر مہلک ثابت ہوا قرط بے اپنی خوش بیانی کے لیے بھی اسی قدر مشہور تھا جس قدر اپنی بہادری کے لیے، اس نے اس کو جواب میں مملوکوں کی شجاعت پر ایک پرزور تقریر کی، جس میں توپ اور بندوق کا ذکر نفرت اور حقارت کے ساتھ کیا کیوں کہ ان کا وار بہادرانہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بزدلانہ طریقہ پر مارتی ہیں، اس نے سلیم کو بتایا کہ بندوقیں مصر میں سب سے پہلے اشرف قانصوہ کے عہد میں لائی گئی تھیں، جب کہ مارسیش کے ایک شخص نے مملوکوں کو بندوق سے مسلح کر دینے کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی لیکن سلطان اور اس کے فوجی افسروں نے جنگ میں اس بدعت کے جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ ایک تو یہ حقیقی شجاعت کے شایانِ شان نہیں، دوسرے آنحضرت ﷺ کے طریقہ کے بھی خلاف ہے، قرط بے نے کہا کہ جب اس شخص سے انکار کیا گیا تو وہ چلا اٹھا اور کہنے لگا کہ تم میں سے کچھ لوگ اس وقت تک زندہ رہیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ سلطنت ان ہی گولیوں سے ختم ہو کر رہے گی، یہ بیان کر کے قرط بے نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا کہ افسوس وہ پیشین گوئی پوری ہوئی لیکن تمام قدرت اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھوں میں ہے، سلیم نے پوچھا کہ ”اگر تم

---

[1] کریسی، ج ۱، ص ۲۳۳، فٹ نوٹ۔

خدا پر بھروسہ رکھتے ہو تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم نے تمہیں شکست دی اور تمہارے قلعوں سے تم کو مار بھگایا اور خود تو اس وقت میرے سامنے ایک قیدی کی حیثیت سے کھڑا ہوا ہے۔" قرطبے نے جواب دیا کہ "خدا کی قسم ہمیں شکست اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ تم لڑائی میں ہم سے زیادہ بہادر یا ہم سے بہتر شہسوار تھے، بلکہ ہم اس لیے ہارے کہ یہی ہماری تقدیر میں تھا کیوں کہ ہر وہ شے جو بقا رکھتی ہے ایک روز ختم ہو کر رہے گی اور سلطنت کی مدت بھی محدود ہے، خلفائے اسلام کے وہ زبردست جانشین آج کہاں ہیں؟ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتیں اور سلطنتیں کہاں ہیں؟ اے آل عثمان! تمہارا وقت بھی آنے والا ہے اور تمہاری حکومت بھی اپنے وقت پر ختم ہو کر رہے گی، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے اے سلطان سلیم! میں تیرا قیدی نہیں ہوں بلکہ تیرے وعدہ اور عہد و پیمان کی بنا پر یہاں آزاد اور بے خطر کھڑا ہوا ہوں۔" اس کے بعد قرطبے خیر بے کی طرف متوجہ ہوا جو سلیم کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا اور اس پر نہایت سخت لعن و طعن کرنے کے بعد سلیم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ "اس غدار کا سر اڑا دے ورنہ کہیں تجھے بھی اپنے ساتھ جہنم میں گھسیٹ نہ لے جائے۔" اس پر سلیم نے غضبناک ہو کر کہا "میں نے سوچا تھا کہ تجھے آزاد کر دوں گا، بلکہ اپنے اعلیٰ فوجی عہدہ داروں میں بھی شامل کر لوں گا لیکن تو نے بے ادبی کے ساتھ گفتگو کی ہے اور میری موجودگی کا احترام ملحوظ نہیں رکھا ہے، جو شخص بادشاہوں کے حضور میں خلاف ادب طریقہ اختیار کرتا ہے وہ فضیحت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔" قرطبے نے دلیری کے ساتھ جواب دیا "خدا مجھے تیرا عہدہ دار ہونے سے بچائے۔" یہ سن کر سلیم کا غصہ ناقابل برداشت ہو گیا اور اس نے جلادوں کو طلب کیا، قرطبے نے سلیم سے کہا "تنہا میرے قتل سے تجھے کیا فائدہ پہنچے گا، جب کہ بہت سے بہادر خود تیرے سر کی فکر میں ہیں اور طومان بے اب بھی اپنی فتح یابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھتا ہے۔" سلیم نے جلادوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا، جلاد نے جوں ہی تلوار اٹھائی قرطبے نے ایک بار پھر خیر بے کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اے غدار! میرے خون آلود سر کو لے جا اور اپنی بیوی کی گود میں ڈال دے، خدا غدار کو اس کے فعل کا

ویسا ہی بدل دے'' یہ آخری الفاظ تھے جو اس بہادر مملوک کی زبان سے ادا ہوئے۔

طومان بے کا قتل قاہرہ کے مفتوح ہو جانے کے بعد بھی طومان بے مایوس نہیں ہوا تھا، چوں کہ مملوکوں کی بہت بڑی تعداد قتل ہو چکی تھی، اس لیے اس نے مملوک سلاطین کی سابق روایات کے برخلاف عربوں کو اپنی فوج میں داخل کیا اور چند دنوں تک کامیابی کے ساتھ عثمانی دستوں کا مقابلہ کرتا رہا، سلیم نے اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کر لو تو مصر کا تخت تمہارے لیے چھوڑ دیا جائے لیکن قاہرہ کے غدارانہ قتل عام اور قرط بے کے قتل سے نہ صرف سلیم کے وعدوں کا اعتبار اٹھ گیا تھا بلکہ مملوکوں کی آتش غضب بھڑک اٹھی تھی، چنانچہ جب سلیم کا ایلچی یہ پیغام لے کر طومان بے کے دربار میں پہنچا تو اس نے اسے اور اس کے تمام ہم راہیوں کو قتل کرا دیا، سلیم نے اس کے جواب میں تین ہزار مملوک قیدیوں کو تہ تیغ کرا دیا، ان واقعات سے یہ صاف ظاہر تھا کہ صلح کی کوئی امید نہیں، کچھ عرصہ تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، مگر بدقسمتی سے اسی زمانہ میں جب عثمانی فوج حملہ کر رہی تھی، خود عربوں اور مملوکوں میں باہم جھگڑے شروع ہو گئے، جس سے طومان بے کی قوت کو سخت نقصان پہنچا، آخر میں اس کی تمام فوج منتشر ہو گئی اور اسے بھاگ کر روپوش ہونا پڑا لیکن بعض ساتھیوں نے اس کے ساتھ دغا کی اور اسے عثمانیوں کے حوالہ کر دیا، سلیم کو جب کہ اس کی گرفتاری کی اطلاع ہوئی تو وہ جوش مسرت میں چلا اٹھا کہ ''الحمد للہ! مصر اب فتح ہوا'' بہرحال اس نے شروع میں طومان بے کے ساتھ مناسب عزت واحترام کا سلوک کیا لیکن چند دنوں کے بعد غزالی اور خیر بے نے طومان بے کے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کیے اور اسے یقین دلایا کہ طومان بے کو آزاد کرانے کے لیے ایک زبردست سازش کی جا رہی ہے، سلیم نے ان غداروں کے فریب میں آ کر طومان بے کو قتل کرا دیا، سلاطین مصر کے مملوکی سلسلہ کی یہ آخری کڑی تھی جو ۱۷ اپریل ۱۵۱۷ء کو ٹوٹ گئی۔

مصر کا نظام حکومت مصر فتح ہو گیا لیکن اس کے نظم ونسق کا مسئلہ بہت مشکل تھا، باوجود

اس کے کہ مملوکوں کی قوت ٹوٹ چکی تھی، سلیم کو ان کی طرف سے اطمینان نہ تھا اور چوں کہ مصر قسطنطنیہ سے بہت زیادہ فاصلہ پر واقع تھا، اس لیے مملوکوں کی بغاوت کا اندیشہ اور بھی زیادہ قوی تھا، اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے سلیم نے مصر کا دستور حکومت مرتب کرتے وقت جو چیز خاص طور پر پیش نظر رکھی وہ یہ تھی کہ حکومت ملک کے مختلف طبقوں میں اس طرح تقسیم کردی جائے کہ دولت عثمانیہ کے خلاف ان کے باہم متحد ہونے کا امکان کم سے کم رہ جائے، چنانچہ اسی غرض سے اس نے نہ تو مملوکوں کا بالکل قلع قمع کیا اور نہ ان کے سرداروں کو سرکیشیا سے نئے غلام بھرتی کرنے سے روکا، مملوک سلاطین کے عہد میں مصر و شام کی حکومت چوبیس اضلاع میں تقسیم تھی اور ہر ضلع پر ایک مملوک امیر حاکم تھا، سلیم نے اس نظام کو برقرار رکھا اور دونوں کو بارہ بارہ سنجقوں میں تقسیم کرکے ہر سنجق پر ایک مملوک سردار کو مقرر کیا، مرکزی حکومت کے لیے اس نے ایک مجلس مقرر کی جو دیوان کبیر کے نام سے موسوم تھی، اس کا صدر پورے ملک کا والی بنایا گیا، سلیم نے اس عہدہ پر خیر بے کو مقرر کیا لیکن چوں کہ وہ اپنے سابق آقا قانصوہ غوری کے ساتھ غداری کر چکا تھا، اس لیے سلیم نے اس کے بیویوں اور بچوں کو ضمانت کے طور پر یورپ بھیج دیا، اسی طرح غزالی شام کا والی مقرر ہوا، دیوان کبیر کے ارکان کو یہ اختیار دیا گیا کہ معقول اسباب کی بنا پر والی کے احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو اسے معزول کرکے دوسرا والی منتخب کر سکتے ہیں لیکن اس انتخاب کے لیے باب عالی کی منظوری لازمی قرار دی گئی، ان اختیارات کے عطا کرنے سے سلیم کا مقصد یہ تھا کہ کوئی والی اتنی قوت حاصل نہ کر سکے کہ آگے چل کر اس کے اندر خود مختاری کا حوصلہ پیدا ہو، والی کو قابو میں رکھنے کے لیے سلیم نے پانچ ہزار سواروں اور پانچ سو ینی چری سپاہیوں کی ایک مستقل فوج بھی قاہرہ میں متعین کردی اور آغا خیر الدین کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا، اسے خاص طور پر یہ حکم تھا کہ کسی حالت میں بھی قلعہ کے باہر نہ جائے، تقسیم اقتدار کے اسی اصول کے ماتحت سلیم نے اکثر عدالتی اور مذہبی عہدوں پر عرب شیوخ کو مامور کیا، جن

کا اثر مصری عربی نسل آبادی پر بہت زیادہ تھا، یہ لوگ مملوکوں سے زیادہ عثمانیوں کی جانب مائل تھے، محاصل کی تحصیل وصول کا کام عموماً قبطیوں اور یہودیوں کے سپرد کیا گیا۔

خادم الحرمین الشریفین مصر کی فتح کے بعد حجاز بھی جو اس وقت تک مملوک سلاطین کے زیر حکومت تھا، دولت عثمانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا لیکن شروع میں سلیم کو امید نہ تھی کہ حرمین شریفین کی خدمت کا شرف بغیر جنگ کے حاصل ہو سکے گا کیوں کہ حجاز کی حکومت سابق سلطان مصر کے عمال کے ہاتھوں میں تھی، چنانچہ ان عمال کو برطرف کرنے کے لیے اس نے ایک فوج حجاز میں بھیجنا چاہی لیکن قاضی صلاح الدین کے مشورہ سے جو ایک مشہور عالم تھے، اور جنہیں سلیم نے سلطان غوری کی قید سے رہا کیا تھا، اصل مقصد بغیر کسی جنگ کے حاصل ہو گیا، مفتی دحلان لکھتے ہیں کہ قاضی موصوف نے سلطان سلیم کے وزیر کو یہ مشورہ دیا کہ حجاز میں فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ شریف برکات بن حسن بن عجلان (جو اس وقت مکہ معظمہ کے امیر تھے) سلطان کی اطاعت کے لیے آمادہ ہیں اور ان کے اثر سے اہل حرمین اور باشندگان حجاز بھی سلطان کی بیعت کے لیے تیار ہو جائیں گے، اس لیے بجائے فوج کے شریف کے نام صرف ایک فرمان بھیج دینا کافی ہوگا، سلیم نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور امیر مصلح بیگ کی معرفت فرمان ہمایونی مع دو بیش قیمت خلعتوں کے ایک خود شریف برکات کے لیے اور دوسرا ان کے بیٹے ابو نمی کے لیے جو مکہ کی امارت میں اپنے باپ کا شریک تھا، بھیجا اور دونوں کو بدستور ان کے عہدوں پر قائم رکھا، حج کا زمانہ قریب تھا، اس لیے سلیم نے مصلح بیگ کے ساتھ محمل شریف کو بھی روانہ کیا، چنانچہ جب مصلح بیگ مکہ کے قریب پہنچا تو شریف برکات اپنے بیٹے اور دیگر معززین کو لے کر اس کے استقبال کے لیے نکلے، باپ بیٹوں نے خلعت سلطانی کو پہنا اور مکہ معظمہ واپس آ کر لوگوں سے سلطان کی بیعت لی اور سلیم کے نام کا خطبہ پڑھا، "خادم الحرمین الشریفین" کا لقب جو ایک مسلمان فرماں روا کے لیے سب

---

[1] فتوحات اسلامیہ، جلد ۲، ص ۱۲۵۔

سے زیادہ معزز لقب ہے، سلطان سلیم کے نام کے ساتھ شامل کیا گیا اور اس کا اعلان اس مقدس سرزمین میں ایسے وقت ہوا، جب تمام دنیا کے مسلمان حج کے لیے اکٹھا ہوئے تھے، حرمین شریفین کی خدمت کا شرف سلیم کے بعد اس کے جانشینوں کو چار سو برس تک حاصل رہا، اس طویل مدت میں انہوں نے باشندگان حجاز اور خصوصاً اہل حرمین کی خدمت کا حق جس طرح ادا کیا اس کی تفصیلات سے تاریخ کے صفحات پر ہیں اور اس کی یاد اب ان عربوں کو خون کے آنسو رلا رہی ہے جنہوں نے جنگ عمومی میں اپنی آزادی کی پیاس ترکوں کے خون سے بجھانی چاہی مگر طلسم فرنگ کے پیدا کردہ سراب سے حقیقی حریت کی موجیں آج تک نہ اٹھ سکیں۔

سلیم کو اہل حرمین کی خدمت کا موقع صرف تین سال کے لیے حاصل ہوا، اس قلیل مدت میں اس نے جو کچھ کیا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہو سکتا ہے، جو مفتی دحلان کی مستند تصنیف ”فتوحات اسلامیہ“ سے ماخوذ ہیں:

> ”سلاطین مملوک کی طرف سے شریف مکہ کو جو وظیفہ ملتا تھا، سلیم نے اس میں پانچ سو دینار کا اضافہ کر دیا، اس نے ایک دفتر قائم کیا جس میں حرم محترم کے مجاوروں کے نام لکھے گئے، ان میں سے ہر ایک کا وظیفہ سو دینار مقرر کیا گیا، جو مصر کے خزانہ سے ادا کیا جاتا تھا، اس نے تین آدمیوں کی ایک جماعت بھی مقرر کی جو روزانہ قرآن پاک کا ایک ختم پڑھتی تھی اور ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ بارہ دینار مقرر کی، سلاطین مصر ہر سال بدوؤں فقرائے مکہ کے لیے غلہ بھیجا کرتے تھے، سلیم نے اس دستور کو جاری رکھا اور حکم دیا کہ ہر سال سات ہزار اردب (کم و بیش من) غلہ اہل حرمین کے لیے بھیجا جائے، اس میں سے پانچ ہزار اردب مکہ معظمہ کے لیے اور دو ہزار اردب مدینہ منورہ کے لیے مقرر ہوا، مفتی دحلان لکھتے ہیں کہ سلیم کے بعد دوسرے سلاطین عثمانی غلہ کی مقدار میں اضافہ کرتے گئے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کے لیے بارہ ہزار اردب اور مدینہ منورہ کے لیے سات ہزار اردب غلہ آنے لگا، سلیم نے مکہ معظمہ میں مقام حنفی کو از سر نو تعمیر کرایا اور مدینہ منورہ میں امیر مصلح بیگ کو بھیج کر بہت سے رفاہی کام

انجام دیے، اس کی داد و دہش اور امور خیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں حرمین شریفین میں فارغ البالی پھیل گئی۔ شیخ قطبی جو مکہ کے ایک مشہور عالم اور سلیم کے معاصر تھے، بیان کرتے تھے کہ میں اپنے بچپن میں مطاف کو اکثر خالی پاتا تھا اور تنہا طواف کرتا تھا، بازار سعی کو بھی چاشت کے وقت تک سنسان دیکھتا تھا اور اکثر دیکھتا تھا کہ غلہ فروشوں کے قافلے آئے ہوئے ہیں، مگر خریدنے والے بہت کم ہیں لیکن اب دولت عثمانیہ کے عہد میں لوگوں کی کثرت ہے، رزق وسیع ہے، خوش الحالی اور فارغ البالی ہے اور لوگ اس سلطنت کے زیر سایہ امن و اطمینان میں ہیں اور اس کے انعام و اکرام کے دریا میں غوطے لگا رہے ہیں[1]۔"

خلافت غرض حرمین شریفین کی خدمت کا شرف جب سلیم کو حاصل ہو گیا تو آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے جو قاہرہ میں سلاطین مملوک کے زیر سایہ ظاہری شان و شوکت کے ساتھ مگر حقیقۃً بغیر کسی اختیار و اقتدار کے زندگی بسر کر رہا تھا، خلافت کے تمام حقوق و امتیازات بھی اسے تفویض کر دیے اور مقامات مقدسہ و حرمین شریفین کی کنجیاں، نیز بعض آثار نبویہ مثلاً آنحضرت ﷺ کی تلوار، علم اور چادر بطور سند خلافت اس کے حوالہ کر دیے، اس تاریخ سے سلاطین عثمانی خلیفہ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے اور خطبوں میں ان کا ذکر بحیثیت امیر المومنین کے ہونے لگا، اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت دنیائے اسلام کی خلافت کا حق بھی انہی کو پہنچتا تھا، کوئی دوسری اسلامی سلطنت طاقت اور وسعت میں دولت عثمانیہ کے برابر نہ تھی، یہی سلطنت تمام دوسری سلطنتوں سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی تھی اور قریباً ڈیڑھ صدی سے جہاد کا فرض ادا کرتی آ رہی تھی، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب سلطان سلیم کی خلافت کا اعلان کیا گیا تو دنیائے اسلام کے کسی گوشہ سے اس کی مخالفت نہیں ہوئی، اس منصب کے لیے سلاطین عثمانی کا حق اس قدر مسلم سمجھا گیا کہ سلیم کے عہد سے لے کر گذشتہ جنگ عمومی تک پوری چار صدیوں میں ایک مدعی خلافت بھی ان کے مقابلہ میں نہیں

---

[1] فتوحات اسلامیہ، جلد ۲، ص ۱۳۰-۱۲۹۔

اٹھا، بنو امیہ اور عباسیہ کے عہدوں میں خلافت کے بہت سے دعوے دار نظر آتے ہیں لیکن خلفائے عثمانیہ کی پوری تاریخ میں کسی ایک حریف کو بھی سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

منصب خلافت پر فائز ہو جانے سے سلطان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا، حکومت کے علاوہ اب اسے اپنی مسلمان رعایا کی مذہبی پیشوائی بھی حاصل ہو گئی اور اس دینی اقتدار کا دائرہ صرف سلطنت عثمانیہ کے مسلمان باشندوں تک محدود نہ رہا بلکہ اس کے اندر تمام دنیائے اسلام کے باشندے آ گئے، خواہ وہ کسی قوم یا ملک کے ہوں، علاوہ ایرانیوں اور بعض دوسری شیعی جماعتوں کے جو بمقابلہ اہل سنت والجماعۃ کے تعداد میں بہت کم ہیں۔

واپسی مصر اور حجاز کے ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر شعبان ۹۲۳ھ (ستمبر ۱۵۱۷ء) میں سلیم شام کی طرف واپس ہوا، ہزار اونٹ سونے اور چاندی سے لدے ہوئے ساتھ تھے، مال غنیمت کا زیادہ قیمتی حصہ جہازوں کے ذریعہ اس سے پہلے قسطنطنیہ بھیجا جا چکا تھا، انہی جہازوں پر قاہرہ کے بہترین صناع اور کاریگر بھی روانہ کیے گئے تھے، جو قسطنطنیہ لے جا کر آباد کیے گئے، ۲۰ رمضان ۹۲۳ھ کو سلیم دمشق پہنچا اور وہاں ۲۲ صفر ۹۲۴ھ تک قیام کیا، دمشق سے حلب گیا اور وہاں بھی دو مہینہ قیام کیا، اس مدت میں اس نے شام کی حکومت کے انتظامات کیے، ۱۷ رجب ۹۲۴ھ (۲۵ جولائی ۱۵۱۸ء) کو وہ قسطنطنیہ پہنچا، اس کو وہاں سے روانہ ہوئے صرف دو سال گزرے تھے، اس تھوڑی مدت میں اس نے شام، مصر اور حجاز کو فتح کر کے سلطنت مملوکیہ کا خاتمہ کر دیا اور سلطنت عثمانیہ کے رقبہ کو تقریباً دو چند کر دیا۔

اسپین سے معاہدہ سلیم جب قسطنطنیہ واپس آیا تو اسپین کا سفیر عیسائیوں کے لیے بیت المقدس کی زیارت کی اجازت حاصل کرنے کی غرض سے اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے معاوضہ میں وہ رقم جو پہلے سلاطین مصر کو دی جاتی تھی، دولت عثمانیہ کو ادا کرتے رہنے کا وعدہ کیا، سلیم نے اس درخواست کو منظور کر لیا مگر یہ تصریح کر دی کہ باضابطہ طور پر اس معاہدہ کا تکملہ ہونا چاہیے۔

روڈس پر حملہ کی تیاریاں اس کے بعد سلیم دولت عثمانیہ کی بحری طاقت کو ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوا، اس نے مختلف سائز کے ڈیڑھ سو نئے جہاز تعمیر کرائے، ان کے علاوہ سو جہاز اور بھی بنوائے اور حکم دیا کہ وہ کسی مہم پر روانہ ہونے کے لیے ہر وقت پوری طرح مسلح اور تیار رکھے جائیں، ساٹھ ہزار فوج بھی مع ایک بڑے توپ خانہ کے ایشیائے کوچک میں اکٹھا کی گئی، بعض لوگ خیال کرتے تھے کہ یہ تیاریاں ایران پر حملہ کی غرض سے کی جا رہی ہیں لیکن عام رائے یہ تھی کہ حملہ روڈس پر ہونے والا ہے، جہازوں، بندرگاہوں اور سلاح خانوں کی تعمیر سے اسی رائے کی تائید ہوتی تھی، سلیم نہایت انہماک کے ساتھ ان تیاریوں میں مصروف تھا اور اس مہم کو اس وقت تک ملتوی رکھنا چاہتا تھا، جب تک روڈس جیسے مضبوط قلعہ پر کامیابی کے ساتھ حملہ کرنے کے لیے کافی سامان فراہم نہ ہو جائے، چنانچہ ایک روز اس نے اپنے وزیروں کو بلا کر کہا کہ "تم روڈس کی فتح کے لیے مجھ سے عجلت کرانا چاہتے ہو، مگر تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایسی مہم کے لیے کتنے سامان کی ضرورت ہے، تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت کس قدر بارود تمہارے پاس موجود ہے؟" وزراء اس سوال کے جواب کے لیے تیار نہ تھے لیکن دوسرے روز انہوں نے آکر سلیم سے کہا کہ "ہمارے پاس چار مہینے کے محاصرہ کے لیے کافی سامان موجود ہے۔" سلیم یہ سن کر برافروختہ ہوا اور کہنے لگا کہ "چار ماہ کے سامان جنگ سے کیا ہوتا ہے جب کہ اس کی دو چند مقدار بھی کافی نہ ہوگی، کیا تم چاہتے ہو کہ سلطان محمد ثانی کی سی رسوائی مجھے بھی نصیب ہو، میں اس وقت تک لڑائی نہیں شروع کروں گا اور نہ ایسی ناکافی تیاریوں کے ساتھ روڈس کا سفر کروں گا، علاوہ بریں میرا خیال ہے کہ اب مجھے صرف ایک ہی سفر اختیار کرنا ہے یعنی سفر آخرت۔"

وفات اس کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا، وہ اورنہ کے لیے قسطنطنیہ سے روانہ ہوا، مزاج پہلے ہی سے ناساز تھا، مگر اطبا کی ممانعت کے باوجود اس نے گھوڑے کی سواری نہ چھوڑی، راستہ میں مرض کی شدت اتنی بڑھی کہ اسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اتر جانا پڑا اور وہیں ۹ر شوال ۹۲۶ھ (۲۲ر ستمبر ۱۵۲۰ء) کو اپنی حکومت کے نویں اور عمر کے چوّنویں سال میں اس کا انتقال ہو گیا۔

سلیمان اعظم قانونی

۹۲۶ھ تا ۹۷۴ھ مطابق ۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء

سلیمان اعظم کا عہد حکومت نہ صرف تاریخ عثمانیہ بلکہ تاریخ عالم کا ایک نہایت اہم دور ہے۔ مغربی یورپ کی سلطنتیں قرون وسطی کے خلفشار سے نکل کر عہد جدید کی معرکہ آرائیوں کے لیے تیار ہو رہی تھیں، سلطنت عثمانیہ اور ان کے درمیان چالیس سال سے کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی تھی، یورپ میں بایزید ثانی کی لڑائیاں چھوٹی چھوٹی مسیحی حکومتوں کے ساتھ محدود تھیں، سلیم کی توجہ تمام تر اسلامی سلطنتوں کی جانب مبذول رہی، اس مدت میں یورپ کی سلطنتوں نے بہت نمایاں طور پر ترقی کر لی تھی، اسپین سے موروں کا اخراج ہو چکا تھا اور وہاں کی مختلف مسیحی ریاستیں متحد ہو کر ایک فرماں روا کے زیر حکومت آ چکی تھیں، فرانس اپنی خانہ جنگیوں کو ختم کر کے دوسرے ملکوں کی فتوحات کے لیے نکل چکا تھا، انگلستان اور سلطنت آسٹریا میں بھی قوت و استحکام کی علامتیں ظاہر تھیں، من جملہ دیگر فنون کے فن حرب میں خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ ترقی ہو گئی تھی، باقاعدہ تنخواہ دار پیدل فوجیں بڑی تعداد میں رکھ لی گئی تھیں، آتشیں اسلحوں کا استعمال کثرت سے کیا جا رہا تھا، عیسائی سلطنتوں میں اپنی قوت کی ترقی کا احساس اور مسلمانوں سے تازہ مقابلہ کا حوصلہ شدت سے پیدا تھا، یورپ مذہبی جوش سے لبریز تھا اور باہمی عداوتوں کے باوجود تمام مسیحی سلطنتیں دولت عثمانیہ کے مقابلہ کے لیے آمادہ و مستعد تھیں، شہنشاہ چارلس پنجم جس کی وسیع سلطنت یورپ کے نصف سے زیادہ حصہ پر پھیلی

ہوئی تھی، خاص طور پر اس مسیحی اتحاد میں پیش پیش تھا، دولت عثمانیہ کے لیے چارلس اور اس کے معاونین سے قوت آزمائی کرنا آسان نہ تھا، خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایران کی وسیع سلطنت دشمنی پر آمادہ تھی اور شام ومصر میں ہر وقت بغاوت کا خطرہ تھا، تاہم وہ نہ صرف ان بیرونی اور اندرونی خطرات سے محفوظ رہی بلکہ سولہویں صدی کی پوری مدت میں اس کی قوت وسطوت میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور عیسائی سلطنتوں کے بہتیرے صوبے اس کے مقبوضات میں شامل ہوگئے، اس میں شبہ نہیں کہ سولہویں صدی میں ترکوں کی عظیم الشان کامیابی کا سبب ان کی زبردست فوجی قوت اور اپنی قومی عظمت کا احساس تھا لیکن اس کامیابی کا اصلی سبب یہ تھا کہ عنان سلطنت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں تھی جو دولت عثمانیہ کا سب سے بڑا تاج دار اور اس وقت تمام دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ تھا۔

ذاتی اوصاف واخلاق

سلطان سلیمان چھبیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، بایزید ثانی کے زمانہ میں جب اس کی عمر بہت کم تھی وہ مختلف صوبوں کا حاکم رہ چکا تھا، پھر جب سلیم نے ایران پر حملہ کیا تو سلیمان کو نائب سلطنت کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں چھوڑ گیا، اس کے بعد جنگ مصر کے دوران میں وہ ادرنہ کا حاکم تھا اور پھر سلیم کے عہد کے آخری دو سالوں میں ولایت صادرخان کا انتظام اسی کے سپرد تھا، چنانچہ جب سلیم کی وفات کے بعد وہ تخت پر آیا تو ایک کامیاب مدبر اور لائق فرماں روا کی شہرت حاصل کر چکا تھا، ذاتی عظمت میں وہ اپنے تمام پیش روؤں سے بڑھا ہوا تھا اور فتوحات اور وسعت سلطنت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت لے گیا، اس عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی انتہائی حد کمال تک پہنچ گئی، اس کی خانگی زندگی بالکل بے داغ تھی، وہ اپنے رحم وکرم کے لیے خاص طور پر مشہور تھا، انصاف اس کا مخصوص شیوہ تھا اور اس کی عدالت میں نسل، رنگ اور مذہب کی کوئی تفریق نہ تھی، رعایا کی فلاح وبہبود اس کا مطمح نظر تھا، چنانچہ جب وہ تخت نشین ہوا تو تمام رعایا نے اس نوجوان سلطان کا، جو اپنے اخلاق، شجاعت، انصاف، رحم دلی اور دانش مندی کی بنا پر حد درجہ ہر دل عزیز تھا، نہایت مسرت کے

ساتھ استقبال کیا، اپنی حکومت کے پہلے ہی سال میں اس نے انصاف اور رحم دلی کی ایسی مثالیں پیش کیں جس سے اس کے آئندہ طرز عمل سے متعلق نہایت خوش آئند توقعات قائم کی جانے لگیں، سلطان سلیم نے چھ سو مصریوں کو بہ جبر مصر سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا تھا، سلیمان نے ان سب کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دے دی، سلیم نے بعض تاجروں کا سامان تجارت ایران سے تجارت کرنے کی پاداش میں ضبط کر لیا تھا، سلیمان نے نقد روپیہ دے کر ان کے نقصان کی تلافی کر دی۔ اس کے حکم سے سلطنت کے بعض اعلیٰ حکام بددیانتی اور ظلم کے جرم میں گرفتار کیے گئے اور ان کو سخت سزائیں دی گئیں، ان واقعات کی خبریں تمام سلطنت میں پہنچیں اور رعایا کو اپنی جان و مال کی طرف سے اطمینان ہو گیا، سلیمان نے تمام صوبہ داروں کے پاس احکام بھیجے کہ رعایا کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی روا نہ رکھی جائے اور امیر و غریب، مسلم و غیر مسلم سب کے ساتھ یکساں طور پر انصاف کیا جائے۔ ان احکام کے نفاذ سے ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا، البتہ غزالی نے جسے سلطان سلیم نے مصری حکومت سے غداری کے صلہ میں شام کا حاکم بنایا تھا، سرکشی کا اظہار کیا اور خود مختار ہو جانا چاہا، سلیمان نے فوراً اس کی سرکوبی کے لیے ایک فوج روانہ کی، غزالی کو شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ اس کے قتل سے نہ صرف شام کا فتنہ فرو ہو گیا بلکہ شاہ اسماعیل کے معاندانہ ارادوں کا بھی خاتمہ ہو گیا، جس نے غزالی کی بغاوت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے شام کی سرحد پر اپنی فوجیں تیار کر رکھی تھیں۔

بلغراد کی فتح سلیم کے آخری دور حکومت میں سلطنت عثمانیہ اور سلطنت ہنگری کے درمیان آویزش پیدا ہو گئی تھی اور سرحدی علاقہ میں برابر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، اس خلش کو دور کرنے کے لیے سلیمان کو بلغراد اور زباکز (Szabacoz) کے سرحدی قلعوں کو فتح کر لینا ضروری ہو گیا، ان قلعوں کی فتح سرحد کے استحکام کے لیے بھی ضروری تھی اور یورپ میں مزید فتوحات حاصل کرنے کے لیے بھی، چنانچہ سلیمان نے ہنگری کے بادشاہ لوئی ثانی کے پاس اپنے سفیر بھیجے اور اس سے خراج کا مطالبہ کیا، لوئی نے اس مطالبہ

کے جواب میں عثمانی سفراء کو قتل کرا دیا[1]۔ سلیمان کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ فوراً ہنگری کی فتح کے لیے روانہ ہو گیا، اس کے فوجی سرداروں نے زابا کر اور دوسرے قلعوں کا محاصرہ کر کے قبضہ کر لیا، اس کے بعد سلیمان خود بلغراد کی طرف بڑھا اور اس شہر کے گرد جس نے محمد فاتح جیسے سلطان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا، اپنے خیمے نصب کر دیے، سات روز کی گولہ باری کے بعد ۲۵ رمضان ۹۲۷ھ (۲۹ اگست ۱۵۲۱ء) کو بلغراد فتح ہو گیا، فتح کے بعد نہ قلعہ کے فوجی دستہ کا قتل عام ہوا اور نہ شہر کے باشندے قتل کیے گئے[2]، سلیمان نے وہاں کے سب سے بڑے گرجا میں نماز ادا کی اور تثلیث کے اس عظیم الشان معبد کو خدائے واحد کی پرستش کے لیے مخصوص کر دیا، اس کے بعد اس نے بلغراد میں ایک ترکی دستہ متعین کیا، اور قلعہ کو از سر نو مضبوط اور مستحکم کر کے قسطنطنیہ واپس ہوا، بلغراد کے علاوہ سرحد کے دوسرے قلعوں پر بھی عثمانیوں نے قبضہ کر لیا اور ہنگری میں داخل ہونے کے تمام دروازے ان کے لیے کھل گئے، سلیمان اب ہنگری کے دارالسلطنت بودا کی طرف بڑھ سکتا تھا لیکن روڈس کی فتح اس کے نزدیک زیادہ ضروری تھی اور بلغراد کے بعد اس نے اسی جانب رخ کیا۔

جمہوریہ وینس کا باج گزار ہونا

بلغراد کی فتح کا ایک اثر یہ ہوا کہ جمہوریہ وینس نے از سر نو اپنے کو سلطنت عثمانیہ کا باج گزار تسلیم کر لیا اور جزائر قبرص (سائپرس) وزانطہ کا خراج دو چند کر دیا۔

روڈس کی فتح

روڈس کی فتح مختلف وجوہ سے ضروری تھی، بلغراد اور روڈس یہی دو معرکے تھے، جن میں سلطان محمد فاتح نے شکست کھائی تھی، بلغراد کی فتح نے سلطنت عثمانیہ کے دامن سے ایک شکست کا داغ تو دھو دیا، سلیمان کی عالی حوصلگی دوسرے دھبہ کے دھونے کے لیے بھی بے قرار تھی، علاوہ بریں روڈس کے جہاز بحر روم کے مشرقی حصہ میں اور مجمع الجزائر اور ناطولیہ کے ساحلوں پر لوٹ مار مچائے رہتے تھے[3]، روڈس کی فتح اس وجہ سے بھی ضروری تھی

---

[1] کیمبرج ماڈرن ہسٹری، جلد ۵، ص ۹۳ [2] ایورسلے، ص ۱۷ [3] کیمبرج ماڈرن ہسٹری، ج ۱، ص ۱۵۳۔

کہ قسطنطنیہ اور شام ومصر کے درمیان جو تعلقات اب قائم ہوگئے تھے ان میں مبارزین روڈس اپنے جہازوں کے ذریعہ رخنہ انداز ہوتے رہتے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر سلیمان نے اس جزیرہ پر قبضہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا اور تین سو جہازوں کا عثمانی بیڑا قسطنطنیہ سے روڈس کی جانب روانہ کیا، ساتھ ہی وہ خود بھی ایک لاکھ فوج لے کر ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کی طرف بڑھا، بحری اور بری فوجوں کے جمع ہونے کی جگہ خلیج مارمریس قرار پائی، جو روڈس کے محاذ میں واقع ہے، ۲۸/ جولائی ۱۵۲۲ء کو سلیمان روڈس کے ساحل پر اترا اور یکم اگست ۱۵۲۲ء کو محاصرہ شروع ہوا، جو تقریباً پانچ مہینہ تک جاری رہا، روڈس کے راہب مبارزوں نے نہایت شجاعت کے ساتھ مدافعت کی لیکن محاصرین کی قوت سے مجبور ہو کر بالآخر انہیں ۶/ صفر ۹۲۹ھ (۲۵/ دسمبر ۱۵۲۲ء) کو ہتھیار ڈال دینے پڑے، سلیمان نے ان کے ساتھ جو مراعات برتیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی شجاعت کا کس درجہ قدرداں تھا، اس نے مبارزین کو اجازت دے دی کہ بارہ روز کے اندر اپنے تمام اسلحوں اور سامانوں کو لے کر اپنے ہی جہازوں پر روڈس سے چلے جائیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو عثمانی جہازوں کو بھی کام میں لائیں، روڈس کے باشندوں کو سلطان کی رعایا بننے کے بعد پوری مذہبی آزادی دے دی گئی، سلطان نے صراحت کے ساتھ وعدہ کیا کہ ان کے کلیساؤں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، ان کے بچے والدین سے چھینے نہ جائیں گے اور پانچ سال تک ان سے کسی قسم کے ٹیکس یا محصول کا مطالبہ نہ ہوگا[1]، سلیمان نے اپنی فوجیں قلعہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہٹالیں تاکہ مبارزین امن وسکون کے ساتھ قلعہ سے نکل جائیں لیکن ینی چری باوجود سخت روک تھام کے بے قابو ہوگئے اور شہر میں داخل ہو کر تھوڑی دیر تک لوٹ مار کرتے رہے، تاہم اور تمام شرائط سلیمان کی طرف سے نہایت دیانت داری کے ساتھ پورے کیے گئے، مبارزین روڈس نے وہاں سے نکلنے کے بعد آٹھ سال تک جزیرہ کریٹ میں قیام کیا اور پھر مستقل طور پر جزیرہ مالٹا میں جاکر آباد ہوگئے۔

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۲۶۲۔

مصر اور ینی چری کی بغاوت بلغراد اور روڈس کی فتح کے بعد ہنگری، سسلی اور اٹلی کے راستے سلیمان کے لیے کھل گئے لیکن مصری بغاوت اور ایشیائے کوچک کی شورش کے باعث اسے پہلے مشرق کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور یورپین سلطنتوں کو دو سال کی مہلت مل گئی۔ احمد پاشا نے جو خیر بے کے انتقال کے بعد ۹۲۹ھ (۱۵۲۳ء) میں مصر کا حاکم مقرر ہوا تھا، علم بغاوت بلند کیا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سلیمان نے ایک فوج مصر روانہ کی، احمد پاشا کو شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلیمان نے صدر اعظم ابراہیم پاشا کو حکومت مصر کے انتظام و استحکام کے لیے مامور کیا اور خود سلطنت کے داخلی انتظامات کی طرف متوجہ ہوا۔ ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) کے اوائل سرما میں وہ شکار کی غرض سے قسطنطنیہ سے ادرنہ چلا گیا، روڈس کی فتح کو ڈیڑھ سال کی مدت گزر چکی تھی، اس درمیان میں کوئی دوسری جنگ پیش نہیں آئی تھی، ینی چری کو امن کا یہ زمانہ نہایت گراں گزر رہا تھا۔ چنانچہ سلیمان کی عدم موجودگی میں انھوں نے قسطنطنیہ میں بغاوت برپا کر دی اور وزرا اور دوسرے بڑے بڑے عہدہ داروں کے مکانات لوٹ لیے، یہ خبر سن کر سلیمان ادرنہ سے قسطنطنیہ کو لوٹا اور اس شورش کو فرو کرنے کی کوشش کی، اس نے باغیوں کے بعض سرداروں کو قتل کرا دیا، دو کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، اور پھر عام سپاہیوں کو انعام و اکرام دے کر بغاوت کا خاتمہ کیا۔

ہنگری کی فتح: وزیر اعظم ابراہیم پاشا اس وقت مصر میں تھا، سلیمان نے اسے واپس بلا لیا اور ہنگری کی مہم کی تیاری شروع کر دی، ینی چری کی بغاوت سے اس کو تجربہ ہو گیا تھا کہ سلطنت کے امن کے لیے اس فوج کو جنگ میں مصروف رکھنا ضروری ہے، بلغراد کی فتح کے بعد سے اگرچہ کوئی بڑی جنگ ہنگری کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی، تاہم چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ قائم تھا، علاوہ بریں فرانسس اول شاہ فرانس نے جسے شہنشاہ چارلس پنجم نے پیویا کی جنگ ۱۵۲۵ء میں شکست دے کر قید کر لیا تھا، سلیمان سے ہنگری پر حملہ کرنے کی بہ منت استدعا کی، تاکہ چارلس کو اپنی توجہ فرانس سے ہٹا کر ہنگری کی جانب مبذول کرنی پڑے،

جس کی سرحد سلطنت آسٹریا سے ملی ہوئی تھی، پھر اسی زمانہ میں شاہ ایران نے شہنشاہ چارلس اور شاہ ہنگری کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک جارحانہ اور مدافعانہ اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی، ان وجوہ سے سلیمان نے ہنگری پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا، ایک لاکھ فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ روانہ ہوا، قسطنطنیہ سے روانہ ہونے کے پانچ ماہ بعد ۲۰ ر ذی قعدہ ۹۳۲ھ (۲۸ ر اگست ۱۵۲۶ء) کو موہاکز کے میدان میں ہنگری کی فوج سے مقابلہ ہوا، عثمانی لشکر کو اپنی کثرت تعداد اور توپ خانوں کی بنا پر بہت کچھ فوقیت حاصل تھی، دو گھنٹے سے کم ہی میں جنگ اور ساتھ ہی ہنگری کی قسمت کا بھی فیصلہ ہوگیا، شاہ لوئی، اس کے آٹھ اسقف، اعیان ہنگری کی ایک بڑی تعداد اور چوبیس ہزار سپاہی مارے گئے، لوئی بھاگتا ہوا دریا میں ڈوب کر مرا، ۳۰ ر ذی الحجہ ۹۳۲ھ (۱۰ ر ستمبر ۱۵۲۶ء) کو سلیمان ہنگری کے پایہ تخت بودا میں پہنچا، باشندگان شہر نے ہتھیار ڈال کر دروازے کھول دیے، ہنگری کے جو امراء موہاکز کی تباہی سے بچ گئے تھے، انہوں نے سلیمان کی خدمت میں حاضر ہوکر اطاعت کا حلف لی، چوں کہ شاہ لوئی لاولد مرگیا تھا، اس لیے سلیمان کی تحریک سے ان امرائے ہنگری کے تخت کے لیے کاؤنٹ زاپولیا (Count Zapolya) کا انتخاب کیا، جو ٹرانسلوینیا کا امیر اور ہنگری کے اکابر میں تھا، اس کے چند دنوں کے بعد سلیمان کو اطلاع ملی کہ ایشیائے کوچک میں کچھ بغاوت کی صورتیں رونما ہورہی ہیں، چنانچہ وہ فوراً بودا سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوگیا، ہنگری کے بعض سرحدی قلعوں میں ترکی دستے متعین کردیے گئے۔

ہنگری میں خانہ جنگی ہنگری کے تخت کے لیے زاپولیا کا انتخاب خانہ جنگی کا باعث ثابت ہوا، آرک ڈیوک فرڈینڈ جو شہنشاہ چارلس پنجم کا بھائی تھا اور جسے چارلس نے آسٹریا کی آرچ ڈچی منتقل کردی تھی، ایک صلح نامہ کے رو سے جو چارلس اور سابق شاہ لوئی کے درمیان ہوچکا تھا، ہنگری کے تخت کا دعوے دار ہوا، دوسری طرف زاپولیا اور اس کے حامیوں نے اپنی موافقت میں ہنگری کا ایک قدیم قانون پیش کیا، جس کی رو سے ہنگری کے باشندے

کے علاوہ کوئی دوسرا شخص وہاں کا بادشاہ منتخب نہیں ہو سکتا تھا لیکن باوجود اس قانون کے مغربی ہنگری کے امرا نے فرڈیننڈ کو منتخب کر لیا، اس کے بعد جنگ ناگزیر ہو گئی۔ فرڈیننڈ کے ساتھ آسٹریا کی مدد شامل تھی، اس نے زاپولیا کو شکست دے کر ملک کے باہر بھگا دیا، زاپولیا نے پولینڈ میں پناہ لی اور وہاں سے سلطان کی خدمت میں مدد کی درخواست بھیجی، یہ سن کر فرڈیننڈ نے بھی اپنا ایک سفیر سلیمان کے دربار میں بھیجا اور نہ صرف ہنگری کے تخت کے لیے حمایت کی استدعا کی بلکہ بلغراد اور ہنگری کے دوسرے شہروں کی واپسی کا بھی جو سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکے تھے، مطالبہ کیا، سلیمان نے فرڈیننڈ کے مطالبہ سے برافروختہ ہو کر اس کے سفیر کو رخصت کر دیا اور زاپولیا کے سفیر کو اطمینان دلایا کہ وہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔

فرڈیننڈ کی شکست ۱۰ رمئی ۱۵۲۹ء کو سلیمان قسطنطنیہ سے روانہ ہوا اور ڈھائی لاکھ فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ہنگری میں داخل ہو کر ۳ رستمبر کو پایہ تخت بودا پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا، چھ روز میں بودا فتح ہو گیا اور زاپولیا دوبارہ تخت پر بٹھا دیا گیا، اس کے بعد سلیمان آسٹریا کے مشہور دارالسلطنت ویانا کی طرف بڑھا۔

ویانا کا محاصرہ آسٹریا کا شہنشاہ چارلس پنجم اس وقت یورپ کا سب سے بڑا فرماں روا تھا، وہ اسپین، نیدرلینڈ، سسلی اور جرمنی کی مملکتوں کا تنہا مالک تھا، محاصرہ ویانا کے وقت وہ اٹلی میں فرانسس اول، شاہ فرانس سے جنگ میں مصروف تھا، اس لیے ترکوں کے مقابلہ کے لیے کوئی فوج نہ بھیج سکا اور آسٹریا کو صرف اپنی ذاتی قوت پر بھروسہ کرنا پڑا، چنانچہ محاصرہ سے قبل ہر دس آدمیوں میں سے ایک آدمی فوج میں بھرتی کیا گیا، ہمسایہ ریاستوں نے فوجی دستوں سے مدد کی، پھر بھی یہ فوج ترکوں کے مقابلہ کے لیے بالکل ناکافی تھی، فرڈیننڈ نے مجلس سلطنت سے مدد کی درخواست کی، جس نے صرف بارہ ہزار پیدل اور چار ہزار سوار فوج بھیجنا منظور کیا، مجلس کو بمشکل یقین دلایا جا سکا کہ سلیمان ویانا کی طرف بڑھتا آرہا ہے، بہرحال جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ آسٹریا اتنی فوجیں جمع کرنے سے قاصر ہے، جو ترکوں

کو آگے بڑھنے سے روک سکیں، اس لیے عیسائیوں نے اب صرف دارالسلطنت کی حفاظت کی تیاریاں شروع کیں، فرڈینینڈ خود تو سلیمان کے خوف سے ویانا سے بھاگ گیا تھا لیکن خوش قسمتی سے چند جاں باز افسر اور اسپین اور جرمنی کے آزمودہ کار دستے محاصرہ کے مکمل ہونے سے قبل شہر میں پہنچ گئے تھے اور ان کی مدد حد درجہ اہم ثابت ہوئی، ویانا کے فوجی دستوں کا سپہ سالار کاؤنٹ ڈی سام (Count De Salm) تھا اور مدافعت کی اصلی نگرانی اسی کے ہاتھ میں تھی، ترکوں کے ویانا پہنچنے سے پہلے ہی تمام امکانی تیاریاں کر لی گئی تھیں، شہر کے استحکامات زیادہ تر بوسیدہ حالت میں تھے، فصیل بھی ایک ہی تھی جو بہ مشکل چھ فٹ موٹی تھی، چنانچہ وہ تمام مکانات جو فصیل سے بہت قریب واقع تھے، گرا کر زمین کے برابر کر دیے گئے، شہر کے اندر مٹی کی ایک نئی دمس تیار کی گئی، دریا کے ساحل پر خندق کھود کر لکڑی کے بڑے بڑے مضبوط لٹھوں سے باڑھ لگا دی گئی، آتش زدگی کے خیال سے چوبی کھپریلیں جن سے عام طور پر مکانات چھائے ہوئے تھے، شہر کے ہر مکان سے نکال لی گئیں، سڑک کی سنگی پٹریاں بھی اکھاڑ لی گئیں تاکہ دشمن کے گولوں اثر زائل ہو جائے، سامان رسد اور گھوڑوں کے لیے چارہ فراہم کرنے کی غرض سے متعدد ٹولیاں گردونواح میں بھیجی گئیں، پھر اس خطرہ سے کہ محاصرہ زیادہ دنوں تک قائم رہ جائے، ایسے تمام لوگوں کو جو مدافعت کے کام کے نہ تھے، بلکہ جن کی ذات پر فوجی نقطۂ نظر سے بیکار صرف ہو رہا تھا، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے اور پادری لوگوں کو شہر چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کیا گیا[1] اور جب ترک ویانا کے قریب پہنچ گئے تو نواح شہر کو بھی مسمار کر دیا گیا تاکہ محاصرین اس سے روک اور پناہ کا کام نہ لے سکیں، وہاں کے باشندوں کو ایسے وقت میں بے خانماں ہونا پڑا جب انہیں بھاگ جانے کا بھی موقع نہ تھا، ان میں اکثر ترکوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے۔

---

[1] ترک اور ویانا کے دو محاصرے از شمر بحوالہ لین پول ص ۱۸۴ Two Sieges Of Vienna By The Turks By Schimmer

۲۷ ستمبر کو سلیمان ویانا پہنچا اور محاصرہ شروع ہوا، کثرت بارش کی وجہ سے سڑکیں اس قدر خراب ہو گئی تھیں کہ ترکوں کو اپنی بڑی بڑی توپیں ہنگری میں چھوڑ دینی پڑی تھیں اور اب انہیں زیادہ تر سرنگیں کھود کر دیواروں کو گرانے کی کوشش کرنی پڑی لیکن محصورین بھی ہر مقام پر نگاہ رکھتے تھے اور ۹/ اکتوبر تک ترکوں کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں، بالآخر ۱۰/ اکتوبر سرنگ کے ذریعہ سے شہر پناہ میں ایک چوڑا رخنہ پیدا ہو گیا، جس کے بعد ترکوں نے فوراً پے در پے حملے کیے، مگر ہر بار انہیں پسپا ہونا پڑا اور وہ رخنہ پر کر دیا گیا، اسی طرح ۱۱/ اور ۱۲/ اکتوبر کو بھی ترکوں نے ان مقامات پر جہاں سرنگوں نے بڑے بڑے رخنے کر دیے تھے، سخت حملے کیے لیکن عیسائی ایسی جان بازی سے لڑے کہ ترک شہر کے اندر داخل نہ ہو سکے، سلیمان یہ حالت دیکھ دیکھ کر بہت پیچ و تاب کھا رہا تھا، ترک بھی موسم کی شدت، سامان رسد کی قلت اور سب سے بڑھ کر ان مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے روز بروز زیادہ دل شکستہ ہو رہے تھے، آخر کار یہ طے پایا کہ ۱۴/ اکتوبر (۲۰/ صفر ۹۳۶ھ) کو ایک آخری حملہ کیا جائے، سلیمان نے سپاہیوں کا دل بڑھانے کے لیے بہت فیاضی سے روپیہ تقسیم کیا اور وعدہ کیا کہ جو شخص سب سے پہلے دیوار پر چڑھ جائے گا اسے دولت سے مالا مال کر دیا جائے گا اور ایک بہت بڑا منصب عطا کیا جائے گا، چنانچہ ۹/ بجے صبح کو ینی چری اور عثمانی فوج کے بہترین دستے حملہ کے لیے بڑھے، صدر اعظم ابراہیم پاشا اور فوج کے تمام بڑے بڑے افسر بھی ساتھ تھے لیکن عیسائیوں کی سرفروشی نے ترکوں کے قدم شہر کے اندر نہ آنے دیے، حالانکہ سہ پہر میں عثمانی انجینیروں نے سرنگوں کے ذریعہ سے شہر پناہ کا ایک بڑا حصہ گرا دیا تھا، مغربی مورخین کا بیان ہے کہ ترکوں کی ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں، یہاں تک کہ ینی چری نے بھی دل برداشتہ ہو کر حملہ کرنے سے انکار کر دیا، برخلاف اس کے عیسائیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، آخر کار مایوس ہو کر سلیمان کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا اور اس نے فوج کو واپسی کا حکم دیا، ویانا کو اس کے مدافعین کی سرفروشی نے بچا لیا لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے محاصرہ کی

ناکامی میں موسم کی شدت، جس کے ایشائی ترک عادی نہ تھے اور ینی چری کی سرکشی کو بھی بہت زیادہ دخل تھا، وسط یورپ میں عثمانی فتوحات کی موج ویانا کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔

آسٹریا کی فتح

تین سال کے بعد سلیمان پھر ایک زبردست فوج کے ساتھ ہنگری پر حملہ آور ہوا اور وہاں سے ویانا کا رخ کیا۔ اب کی بار شہنشاہ چارلس نے آسٹریا کی فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لی لیکن قلعہ گنس (Guns) کی فتح میں جو راستہ میں واقع تھا، تین ہفتہ کی مدت صرف ہوگئی اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد سلیمان نے ویانا کی طرف بڑھنے کا ارادہ فسخ کیا، بجائے اس کے وہ آسٹریا کی طرف متوجہ ہوا اور اسے فتح کرتا ہوا قسطنطنیہ کو لوٹ گیا، چارلس نے بھی سلیمان سے مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور ویانا کے قریب اپنی فوجیں لیے ہوئے پڑا رہا۔

ہنگری میں ترکی حکومت

سلیمان کے قسطنطنیہ لوٹ جانے کے بعد بھی چند سالوں تک زاپولیا اور فرڈیننڈ میں لڑائی کا سلسلہ کم وبیش جاری رہا، بالآخر ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں ان دونوں کے درمیان ایک صلح نامہ ہوگیا، جس کے رو سے ہنگری کے دو حصے کر دیے گئے، مشرقی حصہ کا بادشاہ زاپولیا تسلیم کیا گیا اور مغربی حصہ فرڈیننڈ کی فرماں روائی میں دے دیا گیا، مگر دوسرے ہی سال زاپولیا کا انتقال ہو گیا اور اس کی بیوہ اور فرڈیننڈ کے درمیان جنگ پھر چھڑ گئی، فرڈیننڈ پورے ہنگری کا دعوے دار ہوا اور زاپولیا کی بیوہ نے اپنے بچہ کے لیے سلیمان سے مدد کی درخواست کی، چنانچہ ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) میں سلیمان پھر ہنگری میں داخل ہوا اور فرڈیننڈ کو شکست دے کر بودا اور دوسرے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا اور ان میں ترکی دستے متعین کر دیے، اگرچہ ساتھ ہی اس نے اس امر کا بھی اعلان کر دیا کہ زاپولیا کے بچہ کے بالغ ہونے کے بعد وہ اسے ٹرانسلوانیا اور ہنگری کے تخت پر بٹھا دے گا، بہر حال اس وقت سلیمان نے ہنگری کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور ان میں ترکی گورنر مقرر کر دیے، اس

جنگ میں عثمانیوں کو کہیں کہیں شکستیں بھی ہوئیں لیکن مجموعی طور پر سلیمان کی طاقت اتنی زیادہ تھی کہ ۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) میں شہنشاہ چارلس اور فرڈیننڈ نے صلح کی گفتگو شروع کر دی اور ۹۵۴ھ (۱۵۴۷ء) میں پانچ سال کے لیے صلح کر لی گئی اور صلح نامہ کی رو سے تقریباً تمام ہنگری اور ٹرانسلوانیا پر سلیمان کا قبضہ بدستور قائم رہا اور فرڈیننڈ نے باب عالی کو تیس ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا۔

سلیمان "صاحب قِران" | یہ صلح نامہ جس میں شہنشاہ چارلس پنجم، پوپ، جمہوریہ وینس اور شہنشاہ فرانس شریک تھے، اس بات کا ثبوت ہے کہ مسیحی یورپ نے سلیمان کا "صاحب قران" ہونا تسلیم کر لیا تھا، آسٹریا کو سلطنت عثمانیہ کے سامنے اس حد تک جھکنا پڑا کہ اس سے قبل صلح کے متعلق جو مراسلت ہوئی تھی اس میں فرڈیننڈ نے اپنے کو صدر اعظم ابراہیم پاشا کا بھائی لکھنا منظور کیا اور اس طرح اپنا مرتبہ ایک ترکی وزیر کے مرتبہ کے برابر قرار دیا، فرانسس اول نے بھی کئی بار نہایت ادب اور عاجزی کے ساتھ سلیمان سے مدد کی درخواست کی تھی اور سلیمان نے اس کی درخواست پر ہنگری اور جرمنی پر حملہ کر کے چارلس کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی فوجیں فرانس سے ہٹا لے، نیز فرانس کے دشمنوں پر حملہ کرنے کے لیے اس نے ایک جنگی بیڑہ بحرہ روم میں بھی روانہ کیا تھا[1]، یورپ کی خوش قسمتی تھی کہ اسی دوران میں سلیمان کو ایران کی جانب بھی متوجہ ہونا پڑا اور دولت عثمانیہ کی عسکری قوت دو محاذوں میں تقسیم ہو گئی،

فرڈیننڈ کا سفیر بوس بکیس (Busbequius) جو سلیمان کے دربار میں مامور تھا، لکھتا ہے:

> "ہمارے اور تباہی و بربادی کے درمیان اہل ایران ہی صرف ایک روک ہیں، ترک ہمیں ضرور آ دباتے مگر ایرانی انہیں روکے ہوئے ہیں، ایرانیوں کے ساتھ ترکوں کی اس جنگ سے ہمیں صرف مہلت مل گئی ہے، مخلصی اور نجات نہیں حاصل ہوئی ہے[2]۔"

ایران کی مہم | ۹۴۱ھ (۱۵۳۴ء) میں سلیمان ایران کی مہم پر روانہ ہوا، چند ماہ قبل اس نے

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۲۷۸
[2] ایضاً، ص ۲۷۶، فٹ نوٹ۔

ابراہیم پاشا کو ایک بڑی فوج کے ساتھ بھیج دیا تھا، ابراہیم سیدھا تبریز پہنچا اور اس پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کرلیا، تبریز ہی میں سلیمان بھی اس سے آکر مل گیا اور وہ دونوں وہاں سے موصل اور بغداد کی طرف روانہ ہوئے، راستہ اور موسم کی خرابی کی وجہ سے ترکی فوج کو بہت کچھ نقصان برداشت کرنا پڑا، بالآخر سلیمان بغداد پہنچا اور ۲۴ رجمادی الآخر ۹۴۱ھ (۳۱ دسمبر ۱۵۳۴ء) کو وہاں کے حاکم نے شہر اس کے حوالے کر دیا کیوں کہ شاہ طہماسپ نے ترکوں سے مقابلہ کرنے کی زحمت ہی نہیں گوارا کی، اس طرح موصل اور بغداد کے دو بڑے صوبے آسانی کے ساتھ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے، پھر ۹۵۵ھ (۱۵۴۸ء) ۹۶۰ھ (۱۵۵۳ء) اور ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) میں بھی سلیمان نے ایران پر حملے کیے اور ایران و وان کے مضبوط شہروں کے علاوہ آرمینیا، میسوپوٹامیا کے بعض بڑے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے، ایرانیوں نے متفرق طور پر ترکی فوج کا مقابلہ کیا اور ترکوں کو موسم کی سختی اور سامان رسد کی عدم فراہمی کے باعث کافی نقصان پہنچایا لیکن خود شاہ ایران کی طرف سے کوئی مدافعت نہیں ہوئی اور ترک اپنے مفتوحات پر بدستور قائم رہے، ان علاقوں کے علاوہ سلیمان نے اپنی بحری قوت کے زور سے عدن پر بھی مستقل قبضہ کرلیا اور سواحل عرب اور ایران نیز شمالی مغربی ہند پر اس کا اثر قائم ہوا۔

بحری طاقت بری قوت کے لحاظ سے ایشیا یا یورپ کی کوئی سلطنت دولت عثمانیہ کی ہمسر نہ تھی، بحری طاقت کے اعتبار سے بھی اس کی فوقیت تمام دوسری سلطنتوں پر مسلم تھی، اس وقت اسپین اور وینس کے بحری بیڑے سارے یورپ پر حاوی تھے لیکن ترکی بیڑے نے متعدد معرکوں میں ان کو شکست دی، بحری قوت کے اعتبار سے اسپین اور سلطنت عثمانیہ میں زیادہ فرق نہ تھا لیکن اسپین کے ساتھ وینس اور پوپ کے بیڑوں کے شامل ہونے کے بعد اتحادیوں کے بیڑے جہازوں کی کثرت تعداد اور سائز کے لحاظ سے ترکی بیڑے سے بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے، تاہم دو بڑے معرکوں میں جب کہ یہ زبردست اتحاد ان کے خلاف تھا، ترک کامیاب رہے اور سلیمان کے عہد حکومت میں برابر ترکی بیڑے کا اقتدار بحر روم

میں قائم رہا، جس کی وجہ سے سلیمان نے الجزائر، اردن اور طرابلس کے صوبے اور بحر ایجین کے متعدد جزیرے جو وینس کے قبضہ میں تھے، فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔

بحری قزاق سلیمان کے ابتدائی عہد میں شمالی افریقہ کے مسلمان فرماں روا اس قدر کمزور تھے کہ وہ ساحلی علاقوں کے علاوہ اپنی مملکت کے جنوبی حصوں پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتے تھے اور خود ساحل کے شہر بھی بحری قزاقوں کی آماج گاہ تھے، جن میں سے بعض ان فرماں رواؤں کی اطاعت برائے نام تسلیم کرتے تھے لیکن اکثر بطور خود بحر روم میں لوٹ مار مچاتے رہتے تھے، یہ بحری قزاق دس دس اور بیس بیس بحری جہازوں کے بیڑے بنا کر اپنے جری اور نہایت تجربہ کار سرداروں کی قیادت میں مال غنیمت کے لیے بحر روم میں پھرا کرتے تھے اور اسپین، اٹلی اور فرانس اور کبھی کبھی انگلینڈ اور آئرلینڈ کے ساحلوں پر بھی حملے کیا کرتے تھے۔

سلطان سلیم نے بحری قوت پر خاص توجہ کی تھی اور جہازوں کی تعداد اور سامان میں بہت کچھ اضافہ کیا تھا، سلیمان نے بھی اس کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھا اور بحری قوت کو پہلے سے بہت زیادہ ترقی دی لیکن اس کے بحری سردار بے خوفی اور مہارت فن میں بحری قزاقوں کے ہم پلہ نہ تھے، یہ دیکھ کر اس نے ان قزاقوں کو جو اپنی قابلیت اور تجربہ میں دوسروں سے ممتاز تھے، سلطنت عثمانیہ کی خدمت کے لیے مدعو کیا اور انہیں ان کے جہازوں اور آدمیوں کے ساتھ بلا کر ترکی بیڑے کے اعلیٰ منصب پر مقرر کیا۔

خیر الدین پاشا بحری ان میں سب سے پہلا اور اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے سب سے زیادہ مشہور بحری سردار خیر الدین باربروسہ (سرخ داڑھی والا) تھا، یہ شخص پہلے چند جہازوں کو ساتھ لے کر بحر روم کے تجارتی جہازوں پر چھاپا مارا کرتا تھا اور پھر ساحلی علاقوں پر حملہ آور ہونے لگا، چنانچہ اس نے بطور خود الجزائر پر حملہ کیا، شہر اور گرد و نواح کے علاقوں پر قبضہ کر لیا لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ اپنی خود مختار حکومت قائم نہ رکھ سکے گا، اس نے سلطان سلیم کی فرماں روائی قبول کر لی، یہ وہ زمانہ تھا جب اندلس کے مسلمانوں پر اسپین کی

عیسائی حکومت انتہائی مظالم کر رہی تھی، خیرالدین نے ان مظلوموں میں سے ستر ہزار کو اپنے جہازوں کے ذریعہ اندلس سے الجزائر پہنچا دیا، پھر جب سلیمان تخت پر آیا تو اس نے خیرالدین کو عثمانی بحریہ کا امیر اعظم مقرر کیا، چنانچہ ۹۴۱ھ (۱۵۳۴ء) میں اس نے شہنشاہ چارلس کے زبردست بیڑے پر حملہ کیا اور کورن، پیٹراس اور دوسرے ساحلی شہروں کو جن پر چارلس کے مشہور امیر البحر اینڈریا ڈوریا (Ardrea Doria) نے قبضہ کرلیا تھا، واپس لے کر سواحل اٹلی پر حملہ آور ہوا، اس کے بعد سلیمان کی تحریک سے اس نے تونس پر قبضہ کرکے اسے الجزائر کی ریاست میں شامل کرلیا، تونس کے حفصی سلطان حسن نے شہنشاہ چارلس سے فریاد کی، چارلس خود پانچ سو جہازوں کا بیڑا اور تیس ہزار فوج لے کر تونس پر حملہ آور ہوا، خیرالدین کو شکست ہوئی اور اسے تونس چھوڑنا پڑا، چارلس فاتحانہ طور پر شہر میں داخل ہوا اور گو وہاں کے باشندوں نے اجنبی حملے کے خلاف خیرالدین کو کسی طرح کی مدد نہ دی تھی، تاہم چارلس نے اپنے سپاہیوں کو شہر لوٹ لینے کی اجازت دے دی، اس واقعہ پر ایورسلے کا بیان ہے کہ مظالم اور غارت گری کا جو منظر پیش آیا وہ ناقابل یقین ہے، شہر کے تیس ہزار بے قصور باشندے قتل کر دیے گئے اور دس ہزار غلاموں کے طور پر فروخت کیے گئے، مسجدیں اور تمام خاص خاص عمارتیں جلا کر برباد کر دی گئیں،[1] مسجدیں گرجوں کی شکل میں تبدیل کر دی گئیں، کتب خانے برباد کر دیے گئے، اتنی کتابیں راستہ میں پڑی ہوئی تھیں کہ ان کے ڈھیروں کو روندے بغیر کوئی جامع مسجد تک پہنچ نہیں سکتا تھا، لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا، مسلمانوں کی جائدادیں اور مکانات چھین چھین کر عیسائیوں کو دیے جانے لگے،[2] بہرحال اس تمام قتل و غارت گری کا نتیجہ یہ ہوا کہ تونس سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل کر پھر سلطان حسن کے زیر حکومت آ گیا لیکن حسن کو سلطنت اسپین کی اطاعت قبول کرنی پڑی اور اس کی خودمختاری ک

---

[1] "ترکی کی سلطنت" از لارڈ ایورسلے، ص: ۲۵۔ [2] المونس فی اخبار افریقیہ و تونس از ابن ابی دینار، بحوالہ خلافت عثمانیہ از مولانا سید سلیمان ندوی۔

خاتمہ ہو گیا، اس کے بعد تونس پر ترکوں کا مستقل قبضہ ۹۸۲ھ (م ۱۵۷۴ء) تک نہ ہو سکا۔

فرانس کے ساتھ مخصوص مراعات ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں شہنشاہ چارلس اور فرانس اول میں پھر جنگ چھڑ گئی اور فرانس نے سلیمان سے مدد کی درخواست کی، اس درخواست کی بنا پر سلیمان اور فرانس کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کی سطوت واقتدار یورپ میں کس حد تک تسلیم کر لیا گیا تھا، فرانسیسی مصنف البین (Albin) اس معاہدہ کو ''رعایت'' سلطانی سے تعبیر کرتا ہے، سلیمان نے اہل فرانس کے لیے سلطنت عثمانیہ کے ہر حصہ میں وہ حقوق عام کر دیے جو ۱۵۲۸ء میں انہیں مصر میں عطا ہوئے تھے، فرانسیسیوں کو پانچ فیصدی محصول کے معاوضہ میں تمام ترکی بندرگاہوں سے تجارت کرنے کی اجازت دی گئی، کوئی غیر ملکی جہاز جس پر فرانس کا نشان نہ ہو سلطنت عثمانیہ کے زیر اثر سمندروں میں داخل ہونے کا مجاز نہ تھا، فرانسیسی تاجروں کے مقدمات دیوانی اور فوجداری دونوں صیغوں کے، خود ان ہی کے فیصلوں کے سپرد کر دیے گئے اور ترکی عہدہ داروں کو اس بات کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ وہ ان قونصلوں کے فیصلوں کی تعمیل کراتے رہیں گے، سلطنت عثمانیہ کے فرانسیسی باشندوں کو انتقال جائیداد کے متعلق وصیت کرنے کے مخصوص حقوق عطا کیے گئے، انہیں نہ صرف اپنے لیے کامل مذہبی آزادی بخشی گئی بلکہ مقامات مقدسہ کی نگہبانی بھی تفویض ہوئی اور اس طرح گویا سلطان کی تمام عیسائی رعایا کی حمایت کا حق انہیں حاصل ہو گیا، یورپ کے تمام فرماں رواؤں میں صرف فرانس کے بادشاہ کو سلطان نے بجائے بے کے بادشاہ کے لقب سے سرفراز کیا اور اس معاہدہ کے بعد اس کے ساتھ ہم سری کا برتاؤ روا رکھا۔[1]

جزائر الجین پر قبضہ چنانچہ ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں فرانس اور چارلس کے درمیان جو جنگ چھڑی اس میں معاہدہ مذکور کی بنا پر سلیمان نے فرانس کا ساتھ دیا، بحر روم میں خیر الدین پاشا کا اقتدار بدستور قائم تھا، اس نے جزیرہ مائنرکا پر حملہ کر کے وہاں سے بہت

---

[1] ''مسئلہ شرقیہ'' از جے آر، میریٹ ص ۹۳-۹۴ (The Eastemouistion By J R, Marriot)

کچھ مال غنیمت حاصل کیا اور کوران پر دوبارہ قبضہ کر لیا، ۹۴۳ھ (۱۵۳۷ء) میں سلیمان نے فرانس کی درخواست پر جمہوریہ وینس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جو چارلس کی مستقل حلیف تھی، خیر الدین پاشا نے سلیمان کی معیت میں جزیرہ کارفو پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا لیکن اہل وینس نے جاں بازی کے ساتھ مدافعت کی اور سلیمان کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا، تاہم خیر الدین نے موقع پا کر بحر ایجین کے تقریباً تمام جزائر پر جو وینس کے زیر حکومت تھے، قبضہ کر لیا اور یہ سب سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے۔ ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں یورپ اور فرڈیننڈ شاہ ہنگری نے چارلس اور جمہوریہ وینس سے مل کر ترکوں کے خلاف ایک ''اتحاد مقدس'' قائم کیا اور ستمبر ۱۵۳۸ء میں اتحادیوں کا زبردست بیڑا جو اپنے جہازوں کی تعداد اور قوت کے لحاظ سے ترکی بیڑے سے کہیں بڑھا ہوا تھا، شہنشاہ چارلس کے مشہور امیر البحر اندریا ڈوریا کی سرکردگی میں پریویسا (Prevesa) کے سامنے عثمانی بیڑے سے مقابل ہوا، ڈوریا کی شہرت اور اتحادی بیڑے کی مجموعی طاقت عیسائیوں کی فتح کی کافی ضمانت سمجھی جاتی تھی، مگر خیر الدین پاشا نے اتحادیوں کو زبردست شکست دے کر ان کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا، اسی دوران میں فرانس نے وینس کے مقام پر چارلس سے ایک عارضی صلح کر لی، پھر ۹۴۶ھ (۱۵۳۹ء) میں جمہوریہ وینس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور تین ماہ کے لیے ایک صلح نامہ مرتب کیا گیا لیکن دوسرے ہی سال مستقل طور پر صلح ہو گئی، جمہوریہ وینس نے تین لاکھ دوکات تاوان جنگ دینا منظور کیا اور وہ ساحل ڈلماشیا کے متعدد مقامات سلطان کے حوالہ کر کے بحر ایجین کے ان جزائر سے دست بردار ہو گئی جن پر خیر الدین نے قبضہ کر لیا تھا۔

چارلس سے جنگ کا سلسلہ | لیکن اس صلح کا کوئی اثر سلیمان اور چارلس کی جنگ پر نہ پڑا، الجزائر پر خیر الدین پاشا کا قبضہ چارلس کے اسپین اور اطالوی مقبوضات کے لیے ایک مستقل خطرہ کا باعث تھا، لہٰذا ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) میں چارلس نے الجزائر کو فتح کرنے کے لیے ایک بیڑا روانہ کیا، مگر یہ بیڑا اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا، دوسرے سال فرانس نے

صلح نامہ وینس کا (۱۵۳۸ء) کا خاتمہ کرکے چارلس سے پھر جنگ شروع کردی اور ترکی بیڑے کی مدد سے شہر وینس پر حملہ کیا اور اسے فتح کرلیا۔ فرانس نے اپنے حلیف کی مدد کا اعتراف کیا اور اس کے معاوضہ میں ٹولون کی بندرگاہ ترکوں کے حوالہ کردی۔ ۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) میں فرانس اور چارلس کے درمیان پھر صلح ہوگئی (صلح نامہ کریپی) لیکن سلیمان اور چارلس کی جنگ بحر روم اور ہنگری میں بدستور جاری رہی۔ فرانس اگرچہ دولت عثمانیہ کا حلیف تھا اور ۱۵۳۵ء کے معاہدہ کے بعد ہر جنگ میں سلیمان نے پوری وفاداری کے ساتھ فرانس کا ساتھ دیا تھا مگر فرانس کو جب بھی اپنا فائدہ نظر آیا اس نے سلیمان کی اجازت کے بغیر چارلس سے صلح کرلی، چنانچہ صلح نامہ وینس (۱۵۳۸ء) اور صلح نامہ کریپی (۱۵۴۴ء) کا تکملہ یعنی اس حالت میں ہوا جب سلیمان فرانس کے حلیف کی حیثیت سے چارلس سے جنگ میں مصروف تھا۔ فرانس کے اس طرز عمل کو میریٹ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں مناسب طریقہ پر واضح کردیا ہے، وہ لکھتا ہے:

> "فرانس اور خاندان ہیپس برگ (The Habsburgs) یعنی فرماں روایان آسٹریا و ہنگری کے درمیان جنگ کا سلسلہ بہت قلیل وقفہ کے ساتھ ۱۵۳۵ء سے ۱۵۵۹ء تک قائم رہا اور مکمل طور پر صلح تو ۱۵۹۸ء تک نہ ہوسکی، اس پوری مدت میں اور اس کے بعد بھی فرانس ترکوں کے وفادارانہ تعاون پر اعتماد کرسکتا تھا، اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ترکوں نے فرانسیسیوں کی بہ نسبت بہت زیادہ مستقل اور مسلسل طور پر اس اتحاد کے ساتھ وفاداری برتی، برخلاف اس کے موخر الذکر کے مقاصد کے لیے یہ اتحاد جب اور جتنے دنوں تک مفید ثابت ہوا، انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا لیکن جب ان کے ذاتی اغراض کا تقاضا یہ ہوا کہ ترکوں کے دشمنوں سے صلح کرلی جائے تو انہوں نے اس میں کوئی تامل نہیں کیا۔"[1]

خیر الدین پاشا کی وفات

۹۵۳ھ (۱۵۴۶ء) میں خیر الدین پاشا کا انتقال ہوگیا۔

---

[1] میریٹ، ص ۹۳۔

اس نے اپنی حیرت انگیز شجاعت اور قابلیت سے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات میں بہت کچھ اضافہ کیا بلکہ بحر روم، بحر احمر اور بحر ہند میں اس کی بحری قوت کو درجہ کمال تک پہنچا دیا، یہاں تک کہ یورپ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ طاقت ور شہنشاہ چارلس پنجم بھی تنہا ان کے مقابلہ کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، گو وہ محض ایک سپاہی تھا تاہم علوم وفنون کی سرپرستی کا شوق اسے اتنا زیادہ تھا کہ اس نے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ ایک کالج قائم کرنے میں صرف کر دیا۔

طورغوت خیر الدین پاشا کے علاوہ سلیمان کو اسی قسم کے دو اور بحری کپتانوں کی خدمات بھی حاصل ہو گئی تھیں، جن کی غیر معمولی شجاعت اور قابلیت کا سلسلہ بحر روم اور اس کے ساحلی علاقوں پر بیٹھا ہوا تھا، ان میں سے ایک طورغوت اور دوسرا پیالے تھا، طورغوت بھی ابتدا میں ایک بحری قزاق رہ چکا تھا، چنانچہ ایک بار اس نے تیس جہازوں کا بیڑا تیار کر کے جزیرہ کارسیکا پر حملہ کر دیا لیکن ڈوریا نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا اور زنجیروں میں ڈال دیا، آخر کار مہینوں کے بعد خیر الدین باربروسہ کی دھمکی سے کہ اگر طورغوت رہا نہ کیا گیا تو جنوا (ڈوریا کا وطن) برباد کر دیا جائے گا، ڈوریا نے اسے آزاد کیا، طورغوت اپنی مہارت فن اور شجاعت میں خیر الدین سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا، اٹلی اور اسپین کے ساحلی علاقے اس کے نام سے کانپتے تھے، عثمانی رعایا ہونے کے باوجود اس کو سلطان کے حلیفوں کے جہاز گرفتار کر لینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوتا، چنانچہ ایک بار اس نے وینس کے چند تجارتی جہاز گرفتار کر لیے اور جب سلیمان نے باز پرس کرنے کے لیے اس کو قسطنطنیہ میں طلب کیا تو اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور اپنے بیڑے کو لے کر مراکش چلا گیا اور وہاں کے سلطان کی ملازمت اختیار کر لی، پھر خیر الدین پاشا کی وفات کے بعد سلیمان نے معافی اور اعلیٰ منصب کا وعدہ کر کے اسے بلا لیا اور چند دنوں کے بعد طرابلس کی فتح کے لیے روانہ کیا، طرابلس اس وقت مبارزین مالٹا کا مقبوضہ تھا، طورغوت نے حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور سلطنت عثمانیہ میں شامل

کردیا، اس کے بعد وہ طرابلس کا حاکم مقرر رہا، ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) میں جب ترکوں نے مالٹا پر حملہ کیا تو وہ بھی اپنا بیڑا لے کر دولت عثمانیہ کی مدد کو آیا لیکن اسی معرکہ میں وہ مارا گیا۔

پیالے | پیالے بھی ایک مدت تک بحری قزاقی رہ چکا تھا، پھر اس نے سلیمان کی ملازمت اختیار کرلی اور رفتہ رفتہ عثمانی بیڑے کا امیر البحر مقرر ہوگیا، ۹۶۷ھ (۱۵۶۰ء) میں دو سو جہازوں کا ایک عظیم الشان عیسائی بیڑا طرابلس کو ترکوں سے واپس لینے کے لیے ڈوریا کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا تھا، پیالے اس کے مقابلہ کے لیے دردانیال سے نکلا اور عثمانی جزیرہ جربہ کے قریب جس پر عیسائیوں نے اپنی فوجیں اتار دی تھیں اور ایک قلعہ بھی تعمیر کرلیا تھا، ۱۴ مئی ۱۵۶۰ء کو ڈوریا کے بیڑے پر حملہ آور ہوکر اسے نہایت سخت شکست دی، عیسائیوں کے تقریباً پچاس جہاز برباد ہوگئے اور سات گرفتار کرلیے گئے، جزیرہ پر جو عیسائی فوجیں پہنچ چکی تھیں انہیں بھی قلعہ کا محاصرہ کرکے پیالے نے گرفتار کرلیا اور جربہ پر عثمانی علم پھر لہرانے لگا، اس کے بعد اس نے اردن کے صوبہ پر جو الجزائر کے مغرب میں واقع ہے، حملہ کرکے اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا، ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) میں جب مالٹا پر حملہ ہوا تو وہی عثمانی بیڑے کا امیر البحر تھا۔

پرتگال سے بحری جنگ | پندرھویں اور سولھویں صدی میں اسپین کے بعد جس ملک سے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا وہ پرتگال تھا، اندلس میں جب اسلامی حکومت قائم تھی تو پرتگال بھی اسی کے زیر سایہ تھا لیکن جب اس سرزمین میں مسلمانوں کا آفتاب اقبال غروب ہوا اور اسپین کی عیسائی حکومت نے اسلام کشی کا عمل شروع کیا تو پرتگال نے بھی اخوت دینی کا حق پوری طرح ادا کیا، تفصیل آگے آتی ہے، ہندوستان، چین، سیام، جاوا، سماترا، جزائر ہند، سیلون، ملیبار، ممباسہ، زنجبار، حبش، مصر و عرب وغیرہ مشرقی ممالک کی بحری تجارتیں عرب تاجروں کے ہاتھوں میں تھیں، ان کے جہاز بحر ہند، بحر عرب، خلیج فارس اور بحر احمر کے تجارتی راستوں پر قابض تھے، یہ لوگ چین، ہندوستان اور ایران وغیرہ سے مال لے جاکر مصر

پہنچاتے تھے اور وہاں سے وینس اور جنوا کے سوداگر اسے یورپ لے جاتے تھے، پھر اسی طریقہ سے یورپ کا مال عربوں کے جہازوں پر ہندوستان، ایران اور چین وغیرہ مشرقی ملکوں میں پہنچتا تھا، اس تجارت سے مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کو بہت فائدہ تھا لیکن جب واسکوڈی گاما نے راس امید کی راہ سے ہندوستان تک پہنچنے کا راستہ دریافت کیا تو پرتگال نے اس بات کی کوشش شروع کی کہ جس طرح ممکن ہو یہ تجارت عربوں کے ہاتھوں سے چھین لی جائے اور مشرقی ممالک سے تجارت کرنے کے لیے بجائے قدیم راستہ کے وہ جدید راستہ اختیار کیا جائے جس کو واسکوڈی گاما نے دریافت کیا تھا، اس مقصد کے حصول کے لیے پرتگیزوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس کی نوعیت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مستند رسالہ ''خلافت عثمانیہ'' سے واضح ہوتی ہے، مولانا فرماتے ہیں:

> ''اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عرب جہازوں پر تاخت شروع کی، عرب، حبش، ہندوستان اور فارس کے ساحلی مقامات پر حملے کیے اور نامسلموں کو مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں اور عربوں کے ہاتھ اپنا اسباب تجارت فروخت نہ کریں، ملیبار کے مسلمان تاجروں پر بڑی زیادتیاں کیں، یمن اور حجاز کے ساحلی شہروں پر قبضہ جمایا اور ہندوستان میں سندھ سے لے کر مدراس و گجرات و بمبئی تک بندرگاہوں پر دھاوے کیے، ساحلوں اور جزیروں میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، مسجدیں توڑ کر کلیسا بنائی جا رہی تھیں، کالی کٹ کے راجہ کو اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو عرب آنے جانے سے روک دے، کوچین ساحل ہند پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو قتل کیا اور مسجد کو کلیسا بنا لیا اور پھر رفتہ رفتہ عرب کے سواحل پر عدن، ہرمز، یریم وغیرہ کو اور ہندوستان کے سواحل میں سے گوا، جیول، ڈابل، دیپ، دمن، مہاہم وغیرہ کو تاخت و تاراج کیا، ۹۱۵ھ میں کالی کٹ پر حملہ کر کے شہر کو لوٹ لیا اور وہاں کی جامع مسجد کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، یہی حال انہوں نے عرب کے ساحلی مقامات کا کر دیا، حج کے بحری مسافران قزاقوں کے ہاتھوں سے بمشکل جاں بر ہو سکتے تھے، گوا کا مشہور بندرگاہ سلطنت بیجاپور سے

> چھین لیا اور سلطان گجرات کے تمام بندرگاہوں پر غارت گری شروع کر دی، جدہ اور عدن پر کئی حملے کیے، کبھی کامیابی ہوئی اور کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اتنا ہی ہے۔ پرتگالی یہ خواب دیکھنے لگے کہ جدہ پر قبضہ کر کے حجاز پر حملہ کیا جائے اور خاکم بدہن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو ویران اور حرمین محترمین کو منہدم کر کے اسلام کی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔"[1]

یہ حالات تھے جن کے دفعیہ کی ذمہ داری سلطان نے تخت پر آنے کے بعد بحیثیت خلیفۃ المسلمین کے محسوس کی اور پھر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی حتی الامکان پوری کوشش کی، چنانچہ ۹۴۱ھ (۱۵۳۵ء) میں اس نے ایک بیڑا رئیس سلیمان کی ماتحتی میں عدن کے محاصرہ کے لیے روانہ کیا، جس پر اس وقت پرتگیزوں کا قبضہ تھا، مگر اس مہم میں ترکوں کو شکست ہوئی، پھر بھی وہ دل شکستہ نہیں ہوئے اور بحر ہند میں برابر پرتگال کے جہازوں پر حملہ کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ گجرات کے ساحل تک پہنچ گئے، جہاں ان میں اور پرتگیزوں میں متعدد معرکے پیش آئے، اس کے بعد ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں ایک عظیم الشان ترکی بیڑا سلیمان پاشا والی مصر کی سرکردگی میں سویز اور عدن پر قبضہ کرتا ہوا گجرات کی طرف روانہ ہوا، دیپ پہنچنے کے بعد گجراتیوں سے مل کر اس نے پرتگیزوں پر حملے شروع کیے، سلیمان پاشا نے دیپ کا محاصرہ کر لیا اور اگر وہ استقلال کے ساتھ محاصرہ کو جاری رکھتا تو یہ بندرگاہ پرتگال کے قبضے سے ضرور نکل جاتی لیکن غالباً سلیمان پاشا کی خود رائی اور استبداد نے امرائے گجرات کو آزردہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے سامان رسد کا بھیجنا بند کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز دفعتہً ترکی بیڑے نے لنگر اٹھا کر کوچ کر دیا اور دیپ پر پرتگیزوں کا قبضہ بدستور قائم رہا، سلیمان کو جب یہ خبر پہنچی تو اسے بہت غصہ آیا، اس نے سلیمان پاشا کو اپنے دربار میں طلب کیا اور غضب ناک ہو کر کہنے لگا کہ "میں نے تم کو دیپ سے فرنگیوں کو نکالنے کے لیے اور وہاں کے بادشاہ کی مدد کے لیے بھیجا تھا، ہندوستان کے مسلمانوں پر حاکم بنا کر نہیں بھیجا تھا۔"[2]

---

[1] ان واقعات کی تفصیل و اسناد کے لیے رسالہ مذکورہ کے صفحات ۱۴۶ تا ۱۵۷ ملاحظہ فرمائیں۔ [2] خلافت عثمانیہ ص ۲۱۔

پیری رئیس ترکوں کی اس ناکامی سے پرتگیزوں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے کہ انہوں نے عدن پر دوبارہ قبضہ کر لیا، اس لیے ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں سلیمان نے مشہور ترکی امیر البحر پیری رئیس کے زیر قیادت ایک مضبوط بیڑا بحر ہند میں روانہ کیا، اس بیڑے نے پہلے عدن کو پرتگیزوں کے قبضہ سے چھڑایا، پھر وہ عرب کے ساحلی مقامات سے گزرتا ہوا مسقط پہنچا جہاں اس نے پرتگالی بیڑے کو غافل پا کر گرفتار کر لیا لیکن جب خلیج فارس کے ساحل پر پرتگیزوں کو شکست دے کر یہ ہرمز پہنچا تو وہاں ایک سخت معرکہ پیش آیا، جس میں دشمنوں کو فتح ہوئی اور پیری رئیس صرف دو جہازوں کو لے کر نکل سکا، بقیہ گرفتار ہو گئے، پیری رئیس ایک جغرافیہ داں کی حیثیت سے بھی اسی قدر مشہور ہے جس قدر ایک امیر البحر کی حیثیت سے، اس نے بحر الجین اور بحر روم پر دو کتابیں لکھی ہیں، جن میں ذاتی معلومات کی بنا پر ان سمندروں کے دھاروں، گرد و پیش کے علاقوں، بندرگاہوں اور ساحل پر اترنے کی مناسب جگہوں کے حالات بیان کیے ہیں۔

سیدی علی پیری رئیس کی شکست کی خبر سن کر سلیمان نے ایک دوسرے امیر البحر مراد بے کو روانہ کیا تاکہ عثمانی بیڑے کو آزاد کرائے، ہرمز کے سامنے پرتگالی بیڑے سے مقابلہ ہوا، جس میں ترکوں کو پھر شکست ہوئی اور ان کے جہازوں کا بڑا حصہ ڈوب گیا، اس کے بعد سلیمان نے اپنے مشہور امیر البحر سیدی علی کو اس مہم پر روانہ کیا، یکم شوال ۹۶۱ھ (۱۵۵۴ء) کو وہ بصرہ سے روانہ ہوا اور خلیج فارس کے کنارہ کنارہ ہوتا ہوا جب راس موسندام کے قریب پہنچا تو پرتگالی بیڑا سامنے نظر آیا، ایک سخت معرکہ کے بعد پرتگیزوں کو شکست ہوئی اور سیدی علی کے لیے آگے کا راستہ صاف ہو گیا، چنانچہ وہ کھلے سمندر میں داخل ہو کر مسقط کے سامنے نمودار ہوا، یہاں پرتگیزوں نے پھر مقابلہ کیا اور اس جنگ میں طرفین کو شدید نقصان پہنچا، رات کے وقت جب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دفعۃً ہوا اس قدر تیز ہوئی کہ سیدی علی کے جہاز بے قابو ہو گئے اور وہ بہہ کر بلوچستان کے ساحل پر نکل آیا، چند دنوں کے بعد اس نے پھر بحر احمر کا رخ کیا لیکن ایک ناگہانی طوفان اسے دوبارہ بحر ہند میں بہا لے گیا، سیدی علی نے سورت

کی بندرگاہ میں آکر جہازوں کو چھوڑ دیا اور خشکی کا راستہ اختیار کیا، وہ افغانستان، ایران اور عراق ہوتا ہوا قسطنطنیہ واپس آیا اور یہ مہم ناتمام ہی رہی، اس کے بعد سلیمان کے عہد میں پرتگیزوں سے کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں مگر کوئی بڑا مقابلہ پیش نہیں آیا۔

پیری رئیس نے گجرات سے قسطنطنیہ تک سیاحت کے حالات ایک سفرنامہ میں قلم بند کیے ہیں، وہ شاعر بھی تھا، اس نے ریاضیات اور فن جہازرانی پر بھی چند رسالے لکھے ہیں جو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، خصوصاً اس کی تصنیف "محیط" جو بحر ہند کی جہازرانی پر ہے، نہایت مستند خیال کی جاتی ہے، جرمن مؤرخ فان ہیمر کا بیان ہے کہ بحر ایجین اور بحر روم کے حالات پر جو کتابیں پیری رئیس نے لکھی ہیں، ان کے نسخے برلن اور ڈرسڈن کے شاہی کتب خانوں، نیز روم میں پوپ کے کتب خانہ اور بولونا میں سیدی علی کی "محیط" کا واحد معلوم نسخہ نیپلز میں ہے۔[1]

مالٹا مالٹا مبارزین سینٹ جان کا مقبوضہ تھا، جہاں روڈس سے نکلنے کے بعد انہوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، یہ اور اس کے قریب کا چھوٹا سا جزیرہ غوزا شہنشاہ چارلس نے انہیں دے دیا تھا، مالٹا میں آنے کے بعد انہوں نے اس کو نہایت مستحکم کرلیا تھا، مبارزین کے جہاز اسپین اور دوسری مخالف طاقتوں کے بیڑوں کے ساتھ مل کر عثمانی بیڑوں پر حملہ آور ہوتے تھے اور ترکوں سے ان کی جنگ برابر جاری رہتی تھی، یہ لوگ سلطنت عثمانیہ کے تجارتی جہازوں پر بھی حملہ آور ہوتے رہتے تھے اور بحر روم میں لوٹ مار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، مجبوراً سلیمان کو مالٹا پر حملہ کرنے کا تہیہ کرنا پڑا، حملہ کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مالٹا میں ایک کثیر تعداد مسلمان غلاموں کی موجود تھی، جو وہاں کے عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آگئے تھے، علاوہ بریں بحر روم میں یہ جزیرہ اپنے موقع کے لحاظ سے نہایت اہم تھا، چنانچہ یکم اپریل ۱۵۶۵ء کو سلیمان نے ۱۸۱ جہازوں کا ایک زبردست بیڑا تیس ہزار فوج کے ساتھ مصطفیٰ پاشا کی سرکردگی میں قسطنطنیہ سے روانہ کیا، ۱۹ رمئی کو یہ بیڑا مالٹا پہنچا اور دوسرے ہی روز حملہ شروع

---

[1] کریسی، ج ۱، ص ۲۸۸، فٹ نوٹ۔

ہو گیا، ۲۳ رجون ۱۵۶۵ء کو قلعہ سینٹ ایلمو (St. Elmo) فتح ہو گیا لیکن ترکوں کی انتہائی کوشش اور شدید نقصان کے باوجود سینٹ انجیلو (St. Angelo) اور سینٹ مائیکل (St. Micheal) کے قلعوں پر قبضہ نہ ہو سکا اور بالآخر چار ماہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۱ رستمبر ۱۵۶۵ء کو مصطفیٰ پاشا نے محاصرہ اٹھا لیا، اس محاصرہ میں پچیس ہزار ترک اور پانچ ہزار عیسائی مارے گئے۔

ہنگری کی مہم اور سلیمان کی وفات جس وقت محاصرہ اٹھا لینے کی خبر قسطنطنیہ پہنچی، سلیمان آسٹریا سے ایک نئی جنگ کی تیاری کر رہا تھا، وجہ یہ تھی کہ ہنگری کی حلیف جماعتوں میں پھر نزاع شروع ہو گئی تھی اور میکسی میلن ثانی (Maximilian-II) نے جو فرڈیننڈ کے انتقال کے بعد اس کا جانشین تھا، کانٹ زاپولیا کے لڑکے کو تخت سے محروم کر دینے کا عزم کر لیا تھا، چنانچہ اسی سلسلہ میں اس نے بعض اہم قلعوں پر قبضہ بھی کر لیا تھا، یہ معلوم کر کے سلیمان نے بذات خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا اور باوجود اس کے کہ اس کا سن ۷۶ سال کا ہو چکا تھا اور ضعف عمر اور علالت کے باعث وہ گھوڑے پر بیٹھ نہیں سکتا تھا، پالکی میں سوار ہو کر یکم مئی ۱۵۶۶ء کو فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے ہنگری کی طرف روانہ ہوا، اس میں شبہ نہیں کہ آسٹریا کی جنگ نے اس سال مبارزین مالٹا کو دوسرے حملہ سے محفوظ کر دیا جو یقیناً ان کے لیے مہلک ثابت ہوتا، ۲۷ رجون ۱۵۶۶ء کو سلیمان سلیمن کے مقام پر پہنچا اور وہاں نوجوان سجسمنڈ زاپولیا (Sigismund Zapolya) نے جو سلطنت عثمانیہ کے زیر سرپرستی ہنگری اور ٹرانسلوینیا کا بادشاہ تھا، اس کے سامنے نذر اطاعت پیش کی، آگے بڑھنے سے پہلے سلیمان اربرو (Erbru) اور زگیتھ (Szigeth) کے قلعوں کو فتح کر لینا چاہتا تھا، چنانچہ ۵ راگست ۱۵۶۶ء کو عثمانی فوجوں نے زگیتھ شہر کے گرد اپنے خیمے نصب کر دیے، پانچ روز میں شہر فتح ہو گیا لیکن وہاں کے حاکم زرینی (Zriny) اور اس کے باقی ماندہ ۲۳۰۰ آدمیوں نے قلعہ میں پناہ لی اور وہاں سیاہ علم نصب کر کے اس بات کی قسم کھائی کہ جب تک ایک سپاہی بھی زندہ رہے گا ہتھیار نہ ڈالیں گے، اگست اور ستمبر میں ترکوں نے اس قلعہ پر تین حملے کیے لیکن ہر بار انہیں پسپا ہونا پڑا،

بالآخر انہوں نے قلعہ کے سب سے بڑے برج کے نیچے سرنگ کھود کر بارود بچھا دیا اور ۵؍ستمبر ۱۵۶۶ء کو علی الصباح بارود میں آگ لگادی، پھر بھی چار روز کی مسلسل گولہ باری کے بعد ۸؍ستمبر کو یہ قلعہ فتح ہوا لیکن ۵؍ستمبر کی رات ہی کو سلیمان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی، صدر اعظم صوقوللی نے سلطان کی وفات کی خبر بالکل مخفی رکھی اور اسی کے نام سے تمام احکام جاری کرتا رہا، اس سے پوشیدہ طور پر شہزادہ سلیم کے پاس اس حادثہ کی اطلاع بھیج دی، اس درمیان میں عثمانی فوجیں جن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی متعدد مقامات فتح کرتی رہیں، صوقوللی نے سلیمان کی لاش پر مصالحہ لگا کر اسے خراب ہونے سے محفوظ کر دیا تھا اور کوچ کے وقت لاش کو پالکی میں رکھ کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتا تھا، اس نے لشکر میں یہ خبر مشہور کرا دی تھی کہ سلطان علالت کی وجہ سے باہر نکلنے سے معذور ہے، اس تدبیر سے اس نے سات ہفتہ تک اس کی وفات کو پوشیدہ رکھا اور بالآخر یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ قسطنطنیہ میں شہزادہ سلیم تخت پر بیٹھ چکا، اس نے ۲۴؍اکتوبر ۱۵۶۶ء کو تمام فوج کو جمع کر کے سلیمان کی وفات کا اعلان کر دیا۔

سلطنت عثمانیہ کی وسعت سلیمان کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی وسعت، قوت اور خوش حالی کے لحاظ سے حد کمال تک پہنچ گئی تھی، اس کے بعد جزائر سائپرس اور کریٹ کے علاوہ اس میں بہت کم اہم اور مستقل اضافے ہوئے، اس وسیع و عریض سلطنت کا رقبہ چالیس ہزار مربع میل سے زیادہ تھا، یہ بوڈا سے بصرہ تک اور بحر کاسپین سے بحر روم کے مغربی حصہ تک پھیلی ہوئی تھی اور یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک اس میں شامل تھے، شمال میں ازف کی دیواریں، روس کے مقابل سلطنت عثمانیہ کی سرحد کی حفاظت کرتی تھیں، جنوب میں عدن کی پہاڑی نے سلاطین کی حکومت عرب کے جنوبی ساحل پر مستحکم کر دی تھی، انہیں بحر ہند میں با اثر بنا دیا تھا اور بحر احمر پر کامل اختیار دے رکھا تھا، سلطان کا یہ فخر کوئی بے جا فخر نہ تھا کہ وہ بہت سی مملکتوں کا فرماں روا، تین براعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک ہے۔[1]

---

[1] فنلے (Finlay) بحوالہ میریٹ، ص ۹۹۔

سلطنت کی انتظامی تقسیم | سلیمان نے اس عظیم الشان سلطنت کو اکیس ولایتوں اور پھر ان ولایتوں کو ۲۵۰ سنجقوں میں تقسیم کر دیا تھا، ولایتیں حسب ذیل تھیں:

۱- رومیلیا، اس میں یورپ کے وہ تمام عثمانی مقبوضات شامل تھے، جو دریائے ڈینوب کے جنوب میں واقع تھے اور جن میں یونان، مقدونیا، تھریس، پائرس، ایلیریا، دماشیا اور میسیا کے صوبے بھی داخل تھے۔

۲- مجمع الجزائر، بحر روم، یہ ولایت قبودان پاشا (امیر البحر اعظم) کے سپرد تھی۔

۳- الجزائر اور اس کے علاقے۔

۴- طرابلس۔

۵- اوفن جس میں مغربی ہنگری کے مفتوحہ علاقے شامل تھے۔

۶- تمیسوار بشمول بنات، ٹرانسلوانیا، مشرقی ہنگری۔

۷- اناطولیہ عموماً اس سے تمام ایشیائے کوچک مراد لیتے ہیں لیکن یہاں اس سے ایشیائے کوچک کا صرف شمال مغربی حصہ مراد ہے۔

۸- کرمانیہ، ۹- روم جیسے ولایت سیواس اور بعض اوقات حکومت اماسیا بھی کہتے تھے۔

۱۰- سوالقدر، اس میں ملاتیا، سموسٹا اور البوستان کے شہر اور ملحق علاقے اور کوہ طور کے مشرقی درے شامل تھے۔

۱۱- طرابزون۔

۱۲- دیار بکر، ۱۳- وان، ان دو ولایتوں میں آرمینیا اور کردستان کے بیشتر حصے شامل تھے۔

۱۴- حلب، ۱۵- دمشق، ان دونوں میں شام اور فلسطین کی ولایتیں شامل تھیں۔

۱۶- مصر۔

۱۷- مکہ، مدینہ اور حجاز کے علاقے۔

۱۸- یمن و عدن، یہ ولایت جنوبی عرب، خلیج فارس کے ساحلی علاقے اور شمالی مغربی ہند تک پھیلی ہوئی تھیں۔

۱۹- بغداد، ۲۰- موصل، ۲۱- بصرہ، یہ تینوں ولایتیں ان فتوحات پر مشتمل تھیں جو سلیم اور سلیمان نے مسوپوٹامیا اور اس سے ملحق جنوبی علاقوں میں ایرانیوں سے حاصل کی تھیں۔

ان ولایتوں کے علاوہ ولاچیا، مولڈیویا، رگوسا اور کریمیا کی مملکتیں بھی سلیمان کی باج گذار تھیں، ولاچیا اور مولڈیویا سے خراج زیادہ مقدار میں آتا تھا اور کریمیا عثمانی افواج کے لیے بہادر تاتاریوں کے دستے مہیا کرتا تھا۔

آبادی | سلیمان اعظم کی وسیع سلطنت میں بیس مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے، ان میں سے عثمانی ترکوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ تھی، ان کا بیش تر حصہ (۴/۵) ایشیا اور خصوصاً ایشیائے کوچک میں آباد تھا، تیس لاکھ یونانی یورپین ترکی کے جنوبی حصہ میں آباد تھے اور دس لاکھ ایشیائے کوچک میں، آرمینی نسل کے لوگ جن کی تعداد بیس اور تیس لاکھ کے درمیان تھی، زیادہ تر ایشیا میں تھے، سب سے زیادہ تعداد سیلاوی نسل کے باشندوں کی تھی، بلغاریا، سرویا، بوسنیا، مونٹی نیگرو اور ہرزیگووینا میں کثرت تعداد انہی لوگوں کی تھی، مولڈیویا اور ولاچیا میں بھی ان کی تعداد زیادہ تھی اور ان میں سے کئی ہزار ٹرانسلوینیا اور البانیا میں بھی آباد تھے، ان کی مجموعی تعداد تخمیناً ۶۵ر لاکھ تھی، رومی نسل کے لوگ زیادہ تر ولاچیا اور مولڈیویا میں پائے جاتے تھے، ان کی تعداد چالیس لاکھ تھی، اہل البانیا جنہیں ترک ارناؤط (Skipetars) کہتے ہیں تقریباً پندرہ لاکھ تھے، تاتاریوں کی تعداد بھی تخمیناً پندرہ لاکھ تھی، عربی نسل کثرت سے شام، عرب، مصر اور شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی اور سلیمان کے عہد میں اس کا شمار تقریباً ساٹھ لاکھ تھا، مارونی، کالڈی اور دروزی نسل کے لوگ بھی مجموعی طور پر دس لاکھ کے اندر تھے، کردوں کی تعداد بھی غالباً اسی قدر تھی، دیار بکر اور ملحق علاقوں کے ترکمانوں کا شمار

ایک لاکھ تھا، ان کے علاوہ ترکی، ہنگری کے مکیار اور ٹرانسلوینیا کے جرمن نسل والے الجیریا اور دوسرے افریقی صوبوں کے بربر، مصر کے قبطی، یہود، سگانی (Tsigenes) مملوک اور وہ ہندوستانی جو ترکی گورنر عدن کے زیر حکومت تھے، یہ سب سلطان سلیمان اعظم کی عظیم الشان سلطنت میں آباد تھے، سلطنت کی مجموعی آبادی کا تخمینہ ساڑھے چار کروڑ سے پانچ کروڑ تک کیا جاتا ہے[1]۔

فوج سلیمان کی سلطنت کی وسعت کا ایک بڑا سبب اس کی فوجی قوت تھی، چھیالیس سال کی حکومت میں اس نے عثمانی فوجوں کی تعداد دو چند کر دی تھی، ینی چری کی تعداد اس نے بیس ہزار تک پہنچا دی، مستقل اور تنخواہ دار فوج کا شمار جس میں شاہی سوار اور دوسرے دستے شامل تھے، اڑتالیس ہزار تھا، سلیمان کی توجہ سب سے زیادہ ینی چری پر رہتی تھی کیوں کہ یہی فوج اکثر معرکوں میں فتوحات کی ضامن ہوتی، اس نے اس فوج کا ایک علاحدہ دستہ قائم کیا تھا، جس میں وہی سپاہی داخل کیے جاتے تھے، جو ایک طویل مدت کی خدمات کے بعد ضعیف ہو جاتے یا زخموں کے باعث کسی جنگ میں شریک ہونے کے قابل نہ رہ جاتے، سلیمان کی نظر میں ینی چری کی جو اہمیت اور قدر تھی، اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اعزازی طور پر وہ خود اس فوج میں داخل ہو گیا تھا اور جس روز تنخواہ تقسیم کی جاتی تھی، ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے خود بھی تنخواہ لینے کے لیے حاضر ہوتا تھا، یہ طریقہ اس کے جانشینوں نے بھی جاری رکھا، جو فوجیں سلطنت کے جاگیردار جمع کرتے تھے یا جو بے ضابطہ طور پر جنگ کے موقعوں پر خود جمع ہوتی تھیں، ان کا شمار دو لاکھ سے زیادہ تھا، ان کے علاوہ تین سو توپیں اور تین سو جہاز تھے۔

سولھویں صدی کی ابتدا سے یورپ کی مسیحی سلطنتوں کی فوجوں میں بہت کچھ اصلاح و ترقی ہونے لگی تھی لیکن عثمانی فوجیں اپنی تنظیم اور ساز و سامان میں مسیحی فوجوں سے

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۲۴-۳۲۰۔

بہت آگے تھیں، توپ خانوں کی تعداد اور قوت کے علاوہ قلعہ بندی اور قلعہ سازی اور فوجی انجینیرنگ کی تمام شاخوں میں ترک یورپ کی سلطنتوں پر بہت زیادہ فوقیت رکھتے تھے، کریسی لکھتا ہے کہ سلیمان اپنی فوجوں کے جسمانی آرام اور اخلاقی نگرانی پر جس قدر توجہ رکھتا تھا اس کو اس بے پروائی سے کوئی مناسبت نہ تھی جو اس کے حریفوں کے لشکر میں بدنصیب سپاہیوں کے ساتھ برتی جاتی تھی۔[1]

محاصل سلطنت محاصل سلطنت کے لحاظ سے سلیمان کو اپنے تمام ہم عصر فرماں رواؤں پر فوقیت حاصل تھی، اس کے عہد میں خالصہ کی آمدنی پچاس لاکھ دوکات تھی، عشر، جزیہ، محصول درآمد برآمد اور دوسرے مستقل محصولوں کی آمدنی ملا کر یہ رقم ستر اور اسی لاکھ دوکات تک پہنچ جاتی تھی، رعایا پر محصول کا بار ہلکا تھا اور صرف دو موقعوں پر ایک بار جب وہ بلغراد اور روڈس کے محاصرہ کی تیاری کر رہا تھا اور دوسری مرتبہ جب اسے جنگ موہاکز کے لیے سامان فراہم کرنا تھا، سلیمان کو ایک زائد محصول لگانا پڑا، جس میں اس کی تمام رعایا بلا امتیاز مذہب وحیثیت شریک کی گئی لیکن دونوں مرتبہ محصول کی رقم قلیل تھی اور ان موقعوں کے علاوہ پھر بھی کسی زائد محصول کی ضرورت پیش نہیں آئی جنگوں کے اخراجات مال غنیمت سے پورے ہوتے رہتے تھے، ان اخراجات کے علاوہ ہر فتح سے کافی رقم سلطان کو بھی ملتی تھی، ہنگری، ٹرانسلوینیا، گوسا، مولڈیویا اور ولاچیا سے خراج آتا تھا، آمدنی کا ایک ذریعہ ان اعلیٰ حکام سلطنت کا ضبط کردہ سامان اور جائیدادیں بھی تھیں جو کسی جرم میں سلطان کے حکم سے قتل کر دیے جاتے تھے۔

نظام جاگیری سلیمان نے ترکی نظام جاگیری کی تنظیم خاص توجہ کے ساتھ کی اور ان بدعنوانیوں کو دور کیا جو اس نظام میں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں، اس نے قانون بنا دیا کہ کوئی تیمار (چھوٹی جاگیر) ایک خاص حد سے نیچے قائم نہ رکھی جائے، متعدد چھوٹی جاگیروں کو ملا کر

---

[1] کریسی، ج ا، ص ۳۴۴۔

ایک زعامت (بڑی جاگیر) بنا لینے کی اجازت تھی لیکن کوئی زعامت تقسیم کر کے تیمار نہیں بنائی جاسکتی تھی، علاوہ اس صورت کے کہ کسی زعامت کا جاگیردار جنگ میں قتل ہو گیا ہو اور اس نے ایک سے زیادہ لڑکے چھوڑے ہوں، سلطان کی اجازت سے متعدد اشخاص مل کر کسی جاگیر کو اپنی مشترکہ کاشت میں رکھ سکتے تھے لیکن جاگیر اس وقت بھی ایک جاگیر شمار کی جاتی تھی، جاگیر کی کوئی تقسیم جس کے لیے باب عالی سے خاص طور پر اجازت حاصل نہ کر لی گئی ہو سخت سزا کی مستوجب ہوتی، ان قوانین سے ان برائیوں کا انسداد ہو گیا جو جاگیروں کے ٹکڑے کر دینے سے مسیحی یورپ کے نظام جاگیری میں پھیلی ہوئی تھی جاگیردار کو وصیت نامہ یا کسی دوسرے ذریعہ سے جاگیر کے انتقال کا اختیار نہ تھا، اگر کوئی دوسرا جاگیردار اولاد نرینہ چھوڑے بغیر مر جاتا تو اس کی جاگیر سلطان کے قبضہ میں چلی جاتی، سلیمان سے پہلے وزرا اور صوبے کے حاکموں کو اجازت تھی کہ وہ اس قسم کی جاگیریں دوسرے اشخاص کو دے دیں لیکن سلیمان نے اس اختیار کو صرف چھوٹی جاگیروں تک محدود کر دیا، سلطان کے علاوہ کوئی دوسرا کسی ایسی رعایت کو دینے کا اختیار نہ رکھتا تھا، جو سابق جاگیردار کی وفات پر سلطان کے قبضہ میں آ چکی ہو، اگر کوئی شخص کسی چھوٹی جاگیر (تیمار) کو سلطان کے علاوہ کسی اور سے بھی پاتا تب بھی اس کے جاگیری فرائض تمام تر سلطان ہی سے متعلق ہوتے اور جاگیر کے عطا کرنے والے کو اس شخص پر کسی قسم کا جاگیری حق حاصل نہ ہوتا، "سپاہی" اس نظام جاگیری میں صرف اپنے سلطان کا تابع تھا۔

سلیمان کے عہد میں بڑی جاگیروں (زعامت) کی تعداد ۳۱۹۲ر اور چھوٹی جاگیروں (تیمار) کی ۵۰۱۶۰ر تھی، سپاہی (یعنی فوجی جاگیردار) کا فرض صرف یہ نہ تھا وہ جنگ کے موقع پر فوجی خدمت کے لیے خود حاضر ہو بلکہ اگر اس کی جاگیر کی قیمت ایک متعین رقم سے زیادہ ہوتی تو اس زیادتی کی مناسبت سے ایک ایک سے زیادہ مسلح سواروں کو بھی اپنے ساتھ حاضر کرنا پڑتا، سلیمان کے عہد میں فوجی جاگیرداروں کی مجموعی تعداد ڈیڑھ لاکھ سوار تھی، یہ سوار

میسر ہے اور سنجق بے کی طلب پر متعین مقامات پر جمع ہو کر عثمانی فوجوں میں شامل ہو جاتے اور بغیر کسی تنخواہ کے جنگ میں شریک رہتے، مستقل تنخواہ دار فوج کا شمار اڑتالیس ہزار تھا، ان کے علاوہ تاتاری سواروں کے متعدد دستے تھے جنہیں خان کریمیا ایک نائب حاکم کی حیثیت سے ہر جنگ کے موقع پر بھیجتا، نیز بے ضابطہ سواروں اور پیادوں کا انبوہ کثیر تھا، جو بطور خود آ کر ترکی لشکر میں شامل ہو جاتا اور جسے مال غنیمت کے سوا اور کچھ نہ ملتا۔[1]

"قانون رعایا" سلیمان نے اپنی غیر مسلم رعایا کے لیے جو قوانین وضع کیے تھے، وہ اس کی رواداری، روشن خیالی اور تدبر کی ایک نمایاں مثال ہیں، اس نے لگان اور دیگر خدمات کو جو رعایا پر جاگیردار کی طرف سے عائد ہوتی تھیں تصریح کے ساتھ "قانون رعایا" میں درج کرا دیا تاکہ جاگیردار اپنے حق سے زیادہ مطالبہ نہ کر سکے؛ "قانون رعایا" کی رو سے مزروعہ زمین کی ملکیت کاشت کار کو حاصل ہوتی تھی اور اس کے معاوضہ میں اسے لگان اور بعض محصول ادا کرنے ہوتے تھے اور اپنے جاگیردار کے لیے چند متعین خدمات انجام دینی ہوتی تھیں، سلطنت عثمانیہ کی غیر مسلم رعایا اور مسیحی یورپ کے زرعی غلاموں (Serfs) کی حالتوں کے فرق کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ سرحدی عیسائی ممالک کے باشندے بھاگ بھاگ کر سلطنت عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جور و تعدی پر ترکوں کی زیر حکومت کو ترجیح دیتے تھے، کریسی سلیمان کے ایک ہم عصر مصنف کا قول نقل کرتا ہے:

> "میں نے گروہ در گروہ ہنگری کی دہقانوں کو اپنے جھونپڑوں میں آگ لگا کر اور اپنے بیوی بچوں، مویشی اور سامان کاشت کو لے کر ترکی علاقوں میں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا ہے، جہاں وہ جانتے تھے کہ عشر کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کا محصول یا تکلیف دہ بار عائد نہ کیا جائے گا۔"

عام قوانین قانون فوج داری، قانون پولیس اور دیگر عام قوانین پر بھی سلیمان نے خاص توجہ کی اور ان سب میں مناسب ترمیم و اصلاح کی، اس کے زیر نگرانی ملا ابراہیم حلبی

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۳۲۸-۳۲۹۔

نے جو مجموعہ قوانین تیار کیا تھا، اس میں سلطنت عثمانیہ کے متعلق تمام ضروری قوانین درج ہیں، پہلے بہت سے جرائم کے لیے نہایت سخت سزائیں مقرر تھیں مثلاً قتل کر دینا اور اعضا کا کاٹ ڈالنا، سلیمان نے ان سزاؤں کی سختی میں تخفیف کر دی، اس نے مختلف اشیا کی قیمتیں اور اجرت کی شرحیں بھی مقرر کر دیں، اہتمام رکھنے والوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اپنے شر کی تلافی کریں، جھوٹی شہادت دینے والوں، جعل بنانے والوں اور کھوٹے سکے چلانے والوں کی سزا یہ مقرر ہوئی کہ ان کا داہنا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے، گیارہ فیصدی سے زیادہ سود لینا خلاف قانون ٹھہرایا گیا، مسلسل تین وقتوں کی نماز یا ایک روزہ قضا کرنے والے کے لیے جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی، بار برداری کے جانوروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے کی تاکید کی گئی۔[1]

تجارتی مراعات سلیمان کا عہد حکومت غیر ملکی تاجروں سے حسن سلوک کے لیے خاص طور پر ممتاز تھا، موجودہ جمہوریہ ترکی کے قیام تک سلطنت عثمانیہ میں وہ تجارتی معاہدے جاری تھے جو سلاطین نے غیر ملکی تاجروں کے ساتھ کر رکھے تھے اور جن کی رو سے حکومت عثمانیہ نہ صرف ان تاجروں کے جان و مال اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ذمہ دار ہو جاتی تھی بلکہ ان کے مقدمات کے لیے ان ہی کے ہم قوم افراد کی عدالتیں بھی قائم کر دیتی، ان تجارتی معاہدہ (Capitulations) میں سب سے پہلا معاہدہ سلیمان ہی نے ۱۵۳۵ء میں فرانس کے ساتھ کیا تھا، کریسی لکھتا ہے کہ غیر ملکی سامان تجارت پر ایک حد درجہ ہلکا محصول درآمد و برآمد لگایا گیا تھا، محصول تاجرین (Proficuir Duties) کا گراں بار اور تکلیف دہ رواج عثمانیوں میں بالکل مفقود رہا ہے۔[2]

علم کی سرپرستی علم کی اشاعت اور علما کی قدردانی سلاطین آل عثمان کا ایک مخصوص امتیاز تھا، سلیمان اس وصف میں بھی بہت نمایاں تھا، اس نے بہت سے مدرسے اور دارالعلوم

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۲۲۱-۲۲۲ [2] ایضاً، ص ۲۲۳۔

بنوانے اور علما کی تعلیمی تنظیم اور ان کے منصب میں بہت سی اصلاحیں کیں، وہ علما کی قدر و منزلت میں اپنے تمام پیش روؤں سے آگے بڑھ گیا اور ان کے لیے سلطنت کے قانون میں بعض ایسی مخصوص رعایتیں کر دیں جو کسی اور جماعت کے لیے نہیں کی گئیں، مثلاً اس نے علما کی پوری جماعت کو ہر طرح کے محصول سے بری کر دیا اور ان کی جائداد کے لیے یہ قانون بنا دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی ضبط نہ کی جائے گی۔

سلیمان نے مکہ معظمہ میں چاروں مذہب کے لیے چار مدرسے قائم کیے، ان کی بنیاد ۹۷۲ھ (۱۵۶۴ء) میں رکھی گئی، عمارت کی تکمیل سلیم خان ثانی کے عہد میں ہوئی، اس نے مدرسین اور طلبہ کے لیے شام کے اوقاف سے وظائف مقرر کیے۔

صدقات سلیمان نے صدقۂ رومیہ کی مقدار جو اس کے آباء و اجداد کے زمانہ سے حرمین شریفین کے لیے آتا تھا، بہت بڑھا دی اور اپنے خاص خزانہ سے بہت سی رقمیں اضافہ کیں، غلہ کا صدقہ سلیم اول کے وقت سے جاری ہوا تھا، سلیمان نے علاوہ مخصوص اوقاف کے انبار خاص سے بھی غلہ بھیجنا شروع کیا، اس نے مصر کے چند گاؤں بیت المال سے خرید کر ان کے غلہ کو اہل حرمین کے لیے وقف کر دیا، شروع میں مدینہ منورہ کے لیے ڈیڑھ ہزار اردب غلہ بھیجا جاتا تھا مگر کچھ دنوں کے بعد سلیمان نے دو ہزار اردب مدینہ منورہ کے لیے اور تین ہزار مکہ معظمہ کے لیے مقرر کر دیا، اس کے علاوہ مصر میں اہل ذمہ سے جو رقم لی جاتی تھی، سلیمان نے اسے خزانہ عامرہ سے نکال کر حرمین شریفین اور مصر کے علما و مشائخ کو دینا شروع کی، خزانہ شاہی اور سلطان کے جیب خاص سے جو رقمیں ان صدقات کے لیے نکالی جاتی تھیں وہ علاحدہ تھیں[1]۔

تعمیرات کا ذوق سلیمان کو تعمیرات کا بھی خاص ذوق تھا، اس نے قسطنطنیہ، بغداد، قونیہ، دمشق اور دوسرے شہروں میں نہایت خوب صورت اور عالی شان عمارتیں بنوائیں،

---

[1] الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام، ص ۳۲۳-۳۲۴۔

متعدد مسجدیں خود تعمیر کرائیں اور بہتیری مسجدوں کو ازسر نو درست کرایا، ان کے علاوہ قسطنطنیہ میں ایک بہت بڑی نہر بنوائی اور مکہ معظمہ کی پرانی نہروں کی مرمت کرائی، سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اسپتال اور پل تعمیر کرائے۔

علمی اور شاعرانہ مذاق سلیمان علم وفضل کا نہایت قدر دان تھا اور خود بھی علمی اور شاعرانہ مذاق رکھتا تھا، اس کی تصانیف ترکی لٹریچر میں بلند پایہ خیال کی جاتی ہیں، یہی حیثیت اس کے شاعرانہ کلام کی بھی ہے، دوران جنگ میں وہ روزمرہ کے واقعات قلم بند کرتا جاتا تھا اور اس کے یہ روزنامچے اپنے اندر نہایت قیمتی تاریخی مواد رکھتے ہیں، ان روزنامچوں سے اس کے احساس فرض اور اس کی جفاکشی کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سلطنت کے تمام ملکی اور فوجی معاملات پر کس درجہ توجہ رکھتا تھا۔

عدل وانصاف سلیمان کی عظمت، اس کے بری اور بحری فتوحات اور توسیع سلطنت ہی میں نمایاں نہ تھی بلکہ سلطنت کے ہر شعبہ میں اس کی غیر معمولی شخصیت کا اثر پایا جاتا تھا، اس کے عدالت میں ہر طبقہ اور ہر جماعت کے لوگ برابر تھے اور سب کے ساتھ یکساں انصاف کیا جاتا تھا، صوبوں کے گورنر یا دوسرے اعلیٰ حکام جو بے انصافی یا ظلم کا ارتکاب کرتے فوراً برطرف کر دیے جاتے اور اکثر انہیں اپنے جرائم کے پاداش میں قتل کی سزا ملتی، سلیمان کو عدل وانصاف کا اس قدر خیال تھا کہ تخت سلطنت پر آتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بعض حکام کو جو اپنے فرائض کی ادائگی میں بدعنوانیاں کرتے تھے، برخاست کر دیا، اس امر میں وہ کسی شخص کی رعایت نہ کرتا، خواہ وہ شخص اس سے کیسا ہی قریبی تعلق رکھتا ہو، چنانچہ فرہاد پاشا کو جو اس کا داماد تھا، سلیمان نے ظلم اور رشوت ستانی کے جرم میں ایک صوبہ کی حکومت سے معزول کر دیا، فرہاد پاشا کی بیوی اور سلیمان کی ماں نے بڑی التجاؤں کے بعد اس کو دوبارہ مقرر کرایا لیکن جب اس نے اپنی سابق بدعنوانیاں پھر شروع کر دیں تو سلیمان نے اسے دوبارہ معزول کیا اور اب کی بار اس کو قتل کرا دیا۔

خون کے چند دھبے سلیمان کی خانگی زندگی بالکل بے داغ تھی، وہ اپنی طبعی شرافت اور رحم دلی کے لیے مشہور تھا لیکن خون کے چند بدنما دھبوں نے اس کے دامن کو بھی داغ دار بنا دیا، اس کا سب سے بڑا لڑکا مصطفیٰ ایک نہایت لائق اور ہونہار شہزادہ تھا، سلیمان نے اس کو ایک صوبہ کا حاکم بنا دیا تھا، جہاں اس کی غیر معمولی قابلیت کے جوہر نمایاں ہو چکے تھے۔ اس میں سلیمان کے تمام اعلیٰ اوصاف پائے جاتے تھے، وہ فوج کا محبوب اور اپنے ملک کا مایہ امید تھا لیکن یہی ہر دل عزیزی اس کی ہلاکت کا باعث ثابت ہوئی، سلطانہ خرم جو ایک روسی خاتون تھی، سلیمان کی سب سے زیادہ محبوب حرم تھی اور اس کے مزاج میں حد درجہ دخیل ہو گئی تھی، وہ اپنے لڑکے سلیم کے لیے تخت کو محفوظ کر لینا چاہتی تھی لیکن سلیم علاوہ اس کے کہ شہزادہ مصطفیٰ سے عمر میں چھوٹا تھا، نہایت نالائق اور عیش پسند بھی تھا اور مصطفیٰ کے مقابلہ میں اسے تخت پر بٹھانے کا خیال بھی کسی کو نہیں آ سکتا تھا، خرم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی، اس لیے اس نے سلیم کے لیے راستہ صاف کرنے کی کوشش کی اور مصطفیٰ کے خلاف سلیمان کے کان بھرنا شروع کیے، اس نے سلیمان کو یقین دلایا کہ مصطفیٰ اس کی حیات میں تخت پر قبضہ کرنے کی در پردہ کوشش کر رہا ہے اور چوں کہ تمام فوج اس پر جان دیتی ہے، اس لیے بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے، جس طرح سلطان سلیم اول نے سلطان بایزید ثانی کو معزول کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا تھا، سلیمان خرم کے بیانات سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے مصطفیٰ کو اپنی صفائی میں ایک حرف بھی کہنے کا موقع نہ دیا اور ۱۵۵۳ء میں جب ایران کی دوسری لڑائی کے لیے وہ لشکر کے ساتھ کوچ میں تھا، مصطفیٰ کو اپنے خیمہ میں طلب کر کے فوراً گلا گھونٹ کر مروا ڈالا، دوسرا لڑکا بایزید بھی خرم کے محبوب فرزند سلیم ہی کی خاطر قتل کیا گیا لیکن اس کے قتل کا سبب ایک حد تک معقول تھا، مصطفیٰ کے قتل کے بعد اس کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی جان بھی زیادہ دنوں تک سلامت نہ رہ سکے گی، اس کے بعض مشیروں نے سازش کر کے اسے قسمت آزمائی کے

لیے آمادہ کیا اور ۱۵۶۱ء میں اس نے سلیم کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا لیکن سلیم کے ساتھ سلیمان کی قوت بھی شامل تھی اور بایزید کو شکست کھا کر ایران میں پناہ لینی پڑی، شاہ طہماسپ نے نہایت احترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور بالتصریح وعدہ کیا کہ اسے اس کے دشمنوں کے ہاتھ میں نہ دے گا لیکن سلیمان نے جنگ کی دھمکی دے کر اور چار لاکھ اشرفیوں کا وعدہ کر کے طہماسپ کو مجبور کیا کہ وہ بایزید اور اس کے چاروں بیٹوں کو سلیم کے سفیروں کے حوالے کر دے، اس سفیر نے بایزید اور اس کے سب بیٹوں کو فوراً قتل کرا دیا، بایزید کے قتل کے بعد اب تنہا سلیم ہی تخت کا وارث رہ گیا۔

ابراہیم پاشا خون کے جن چھینٹوں سے سلیمان کا دامن داغ دار نظر آتا ہے، ان میں سے ایک اس کے وزیر ابراہیم کا خون بھی ہے، ابراہیم نسلاً یونانی تھا، لڑکپن میں گرفتار ہو کر وہ فروخت ہو گیا تھا، مغنیسیا کی ایک مسلمان دولت مند بیوہ نے اسے خریدا اور اس کی ذہانت کا اندازہ کر کے اعلیٰ تعلیم دلوائی، ایک بار سلیمان اس صوبہ میں گیا اور وہاں اس کی نظر ابراہیم پر پڑی، ابراہیم فن موسیقی کا ماہر تھا، اس کے اس کمال کا اثر سلیمان پر خاص طور سے پڑا اور وہ اسے اپنے ساتھ قسطنطنیہ لیتا آیا، وہاں پہنچ کر وہ اپنی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے روز بہ روز سلیمان کی نظر میں زیادہ محبوب ہوتا گیا، یہاں تک کہ سلیمان نے اپنی بہن کا عقد اس سے کر دیا اور ۱۵۲۳ء میں اسے سلطنت عثمانیہ کا وزیر اعظم مقرر کیا، سلیمان ابراہیم پر حد درجہ اعتماد رکھتا اور اس سے بے حد محبت کرتا، دونوں ساتھ ہی کھانا کھاتے، تمام امور سلطنت دونوں کے باہمی مشورہ سے طے پاتے، جن معرکوں میں سلیمان کسی معذوری کی وجہ سے خود شرکت نہ کر سکتا، ان میں ابراہیم کو سرعسکر بنا کر بھیجتا، تیرہ سال تک سلیمان کے اعتماد کی یہی کیفیت رہی لیکن پھر اس کے دل میں ابراہیم کی طرف سے شکوک پیدا ہونے لگے جو ابراہیم کی بے احتیاطی سے بڑھتے گئے، چوں کہ سلیمان نے اس کو سلطنت کے تمام اختیارات دے رکھے تھے، اس لیے ابراہیم اپنے کو سلطان کا ہم پلہ خیال کرنے لگا اور یہی خیال اس کے لیے مہلک ثابت ہوا، اس کی خود

اختیاری یہاں تک ترقی کر گئی کہ آخر میں اس نے اپنے نام کے ساتھ سلطان کا لقب بھی شامل کر لیا، یہ دیکھ کر سلیمان کے وہ شکوک جو خرم نے ابراہیم کے خلاف اس کے دل میں پیدا کر دیئے تھے، یقین کی حد تک پہنچ گئے، خرم وزیر اعظم کے عہدہ پر اپنے داماد رستم پاشا کو مقرر کرانا چاہتی تھی، خرم کی تدبیر کارگر ہوئی اور ۱۵۳۶ء میں ایک روز جب ابراہیم حسب دستور کھانا کھانے کے لیے محل شاہی میں داخل ہوا تو پھر اس میں سے زندہ نہیں نکلا اور دوسرے روز محل میں اس کی لاش پائی گئی، ابراہیم کی تمام جائیداد اور دولت ضبط کر لی گئی۔

زوال سلطنت کی ابتدا: سلیمان نے اپنے طویل عہد حکومت میں سلطنت عثمانیہ کی عظمت کو حد کمال تک پہنچا دیا تھا، اس کے بعد ہی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا، گو چند سالوں تک زوال کے آثار نمایاں نہ ہوئے، ایک ترک مورخ قوچی بے نے ۱۶۲۳ء میں سلطنت عثمانیہ کے زوال پر ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ زوال کی بنیاد سلیمان کے عہد ہی میں پڑ چکی تھی، وہ زوال سلطنت کو حسب ذیل اسباب کا نتیجہ قرار دیتا ہے:

۱- پہلے دستور یہ تھا کہ دیوان کی ہر مجلس میں سلطان خود موجود رہتا تھا اور وزرائے سلطنت سے خود مشورے کرتا تھا، سلیمان نے اس دستور کو موقوف کر دیا، وہ بجائے دیوان میں بیٹھنے کے اس سے متصل ایک علاحدہ کمرے میں بیٹھنے لگا اور وہیں سے مجلس کی تمام کارروائیوں کو سنا کرتا تھا، اس کے جانشینوں نے دوسرے کمرے میں بیٹھنا بھی موقوف کر دیا، اس طرح سلاطین کی مطلق العنانی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور وزرا کے مشوروں کا اثر کم ہونے لگا، جب تک سلیمان جیسا مدبر اور عالی دماغ سلطان تخت پر تھا، اس تبدیلی کی خرابی ظاہر نہ ہوئی لیکن اس کے بعد اس کے مضر اثرات نمایاں ہونے لگے، وزرائے سلطنت کے بجائے خواتین حرم یا دوسرے غیر ذمہ دار اور خود غرض اشخاص امور سلطنت میں مشورے دینے لگے، سلطان کے فیصلے اکثر انہی مشوروں سے متاثر ہوتے تھے۔

۲۔ سلیمان نے ایک جدت یہ بھی کی کہ بعض ایسے اشخاص کو جنھوں نے بتدریج ضروری مدارج طے نہیں کیے تھے، محض اپنی مردم شماری کی بنا پر اعلیٰ عہدوں پر مقرر کر دیا، اس کی سب سے پہلی اور سب سے نمایاں مثال ابراہیم کا واقعہ ہے، سلیمان ابراہیم کی لیاقت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے چند سال کے اندر ہی اسے سلطنت عثمانیہ کی وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر مقرر کر دیا، ابراہیم کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ اسی طرح اونچی اونچی جگہوں پر مقرر کیے گئے، اس میں شبہ نہیں کہ سلیمان کو مردم شناسی کا خاص ملکہ حاصل تھا اور اس نے اپنے انتخاب میں شاید ہی کبھی غلطی کی لیکن اس کے جانشینوں نے جن کو یہ خداداد ملکہ حاصل نہ تھا، اس جدت پر عمل کر کے بیشتر ایسے اشخاص کا انتخاب کیا جو کسی طرح ان عہدوں کے اہل نہ تھے اور جن کا تقرر محض سلطان کے حسن ظن یا حرم کے اثر سے ہوا تھا۔

۳۔ زوال سلطنت کا تیسرا سبب رشوت ستانی تھی، جس کی بنیاد رستم پاشا نے ڈالی، یہ شخص سلیمان کا داماد تھا اور پندرہ سال تک وزیر اعظم رہا، وہ شاہی خزانہ کے لیے روپیہ حاصل کرنا خوب جانتا تھا، سلطنت کے انتظامی عہدوں پر جو لوگ مقرر کیے جاتے رستم پاشا ان کے تقرر کے موقع پر ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا، سلیمان کے عہد میں یہ رقمیں ہر عہدہ کی تنخواہ کی مناسبت سے ایک متعین مقدار میں مقرر تھیں لیکن یہ جدت صرف انتظامی عہدوں تک محدود تھی اور بحری اور فوجی ملازمتوں میں داخل نہیں کی گئی تھی، سلیمان کے بعد رقم کی متعین مقدار بھی اٹھا دی گئی اور انتظامی عہدوں کی قید بھی باقی نہ رہی، بڑی بڑی رقمیں وصول کی جانے لگیں اور فوجی اور بحری عہدوں پر وہی اشخاص مقرر کیے جانے لگے جو اپنے تقرر کے وقت کثیر رقمیں پیش کرتے، گویا تمام ملازمتیں نیلام ہونے لگیں، ان کثیر رقموں کی ادائیگی کے لیے صوبہ کے حاکم سے لے کر ادنیٰ عہدہ دار تک سب ہر طرح کے جا و بے جا طریقے استعمال کرتے تھے۔

۴۔ سلیمان کی عادت یہ تھی کہ جن وزرا سے خوش ہوتا ان پر بے انتہا انعام و اکرام

کرتا اور خواہ وہ کسی قدر زر و مال جمع کر لیں ان سے تعرض نہ کرتا، چنانچہ ابراہیم جو تیرہ سال تک اور رستم پاشا جو پندرہ سال تک سلطنت کے وزیر اعظم رہے، ان دونوں نے بے انتہا دولت جمع کی، انہوں نے ایک ایسی شاہ خرچ اور شاہانہ زندگی کا نمونہ قائم کر دیا جس کی اتباع دوسرے وزراء اور اعلیٰ عہدہ دار بھی کرنے لگے، رستم پاشا نے اپنی وفات پر جو جائیداد چھوڑی اس کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے، اناطولیہ اور روملیا میں ۸۱۵/مزروعہ زمینیں، ۴۷۶/پن چکیاں، ۱۷۰۰/غلام، ۲۹۰۰/زرہ بکتر، ۸۰۰۰/عمامے، ۷۶۰/تیغے، ۱۱۰۰/جلدیں قرآن پاک کی، ۵۰۰۰/دوسری کتابیں اور بیس لاکھ دوکات۔

ان اسباب کے علاوہ زوال سلطنت کا ایک اور قوی سبب بھی سلیمان کے عہد میں پیدا ہو چلا تھا یعنی امور سلطنت میں خواتین حرم کی مداخلت، یہ مداخلت سلیمان کے جانشینوں کے زمانہ حکومت میں روز بروز بڑھتی گئی، سلیمان کے عہد میں ابراہیم کا زوال و قتل، شہزادہ مصطفیٰ کا قتل اور شہزادہ بایزید کی بغاوت اور قتل، یہ سب حرم ہی کی سازشوں کا نتیجہ تھے۔

سلیم ثانی

۹۷۴ھ تا ۹۸۲ھ مطابق ۱۵۶۶ء تا ۱۵۷۴ء

سلیمان اعظم کے بعد عنان سلطنت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں آئی جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا، سلیمان نے سلطنت عثمانیہ کو ہر حیثیت سے پایہ کمال تک پہنچا دیا تھا، جس سلطنت کی بنیاد تیرہویں صدی عیسوی میں عثمان خان نے رکھی تھی، اس کا تکمیلی پتھر سولہویں صدی میں سلیمان کے ہاتھ سے رکھا گیا، تین سو برس کی مدت میں یہ سلطنت جو ابتداءً ان طوائف کی چند جاگیروں پر مشتمل تھی، مکہ معظمہ سے بوڈاپسٹ اور بغداد سے الجزائر تک پھیل گئی لیکن سلیمان کی وفات کے بعد زوال شروع ہو گیا اور یہ عظیم الشان سلطنت اپنی قوت میں روز بروز گھٹتی گئی، اس زوال کے اسباب خارجی اور داخلی دونوں تھے، پندرہویں صدی سے یورپ کی مسیحی سلطنتوں میں نمایاں ترقی ظاہر ہونے لگی تھی، روس کی سلطنت جو پہلے اپنے دور وحشت کی منزلیں طے کر رہی تھی، سولہویں صدی سے مہذب اور طاقت ور سلطنتوں میں شمار کی جانے لگی، دولت عثمانیہ کی ہمسایہ سلطنت ہونے کی وجہ سے ان دونوں کا تصادم ناگزیر تھا اور سولہویں صدی کے بعد یورپ کی جن حکومتوں نے سلطنت عثمانیہ پر حملے شروع کر دیئے ان میں روس سب سے آگے تھا لیکن مسیحی سلطنتوں کا کوئی اتحاد سلطنت عثمانیہ کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا، اگر خود نظام سلطنت میں اندرونی طور پر فساد پیدا نہ ہو گیا ہوتا اور زوال کے اسباب خود سلطان اور امرائے دولت کے ہاتھوں فراہم نہ ہو گئے ہوتے، انحطاط کی بنیاد سلیمان ہی کے عہد میں پڑ

بچی تھی لیکن اس کی غیر معمولی اور عظیم الشان شخصیت نے ان خرابیوں کو ظاہر نہ ہونے دیا، جو اس کے جانشینوں کے عہد میں سرعت کے ساتھ بڑھتی گئیں، سلیمان کے بعد جتنے سلاطین تخت نشین ہوئے ان میں سے بہ استثنائے چند کوئی بھی اتنی وسیع سلطنت کی جو تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی اور جس میں تقریباً دو درجن مختلف نسلیں اور قومیں آباد تھیں، فرماں روائی کا اہل نہ تھا، نااہلوں کی اس طویل فہرست میں سب سے پہلا نام سلیم ثانی کا نظر آتا ہے، جس نے اپنے مختصر دور حکومت کو بادہ پرستی اور عیش کوشی کی نذر کر دیا اور امور سلطنت سے منہ موڑ کر اپنا تمام وقت عیش و عشرت میں ضائع کر دیا، یہ پہلا عثمانی تاج دار تھا جو میدان جنگ میں جانے سے گریز کرتا تھا اور جس میں انتظام سلطنت کی مطلق اہلیت نہ تھی۔

لیکن سلیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی سلطنت کا زوال نمایاں نہیں ہونے لگا، جو سلطنت تین سو برس کی تدریجی ترقی کے بعد سلیمان اعظم کے زمانہ میں اپنے کمال عروج تک پہنچی تھی، اس میں دفعۃً انحطاط کا نمودار ہو جانا ممکن نہ تھا، سلیمان کی وفات کے بعد بھی تمام ملکی اور فوجی انتظامات چند سالوں تک استحکام کے ساتھ بدستور قائم رہے اور متعدد وزرا و عہدہ داران سلطنت جو سلیمان اعظم کے تربیت یافتہ تھے، بدستور سلطنت کی خدمت کرتے رہے، جب تک یہ وزرا اور ملکی و فوجی حکام زندہ رہے، سلطنت کا زوال ظاہر نہ ہو سکا، بلکہ تقریباً بارہ سال تک حدود سلطنت میں اضافہ ہی ہوتا گیا، عہد آخر کے ان وزرا میں محمد صوقوللی ہی سلطنت کا حقیقی فرماں روا تھا۔

محمد صوقوللی کی دو اہم تجویزیں محمد صوقوللی کے پیش نظر دو اہم تجویزیں تھیں، وہ خاکنائے سویز میں ایک نہر کھود کر بحر احمر اور بحر ہند کو ملا دینا چاہتا تھا، تاکہ ترکی بیڑا ان دونوں سمندروں میں آسانی کے ساتھ داخل ہو سکے، دوسری تجویز دریائے ڈان اور دریائے والگا کو ایک نہر کے ذریعہ سے ملا دینے کی تھی، یہ دونوں دریا روس سے نکل کر دور تک متوازی خطوط میں بہتے آتے ہیں اور ایک مقام پر ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہو جاتے ہیں

کہ درمیانی فاصلہ صرف تیس میل رہ جاتا ہے، وہاں پہنچ کر پھر وہ علاحدہ ہو جاتے ہیں اور ایک بحر ازف میں جا کر شامل ہو جاتا ہے اور دوسرا بحر کاسپین میں، ان دریاؤں کو ایک نہر کے ذریعہ سے اس مقام پر ملا دینے سے جہاں درمیانی فاصلہ صرف تیس میل رہ جاتا ہے، ترکی جہازوں کے لیے دریائے ڈان اور دریائے والگا سے گزر کر بحر کاسپین میں پہنچ جانا اور وہاں سے صوبہ تبریز پر حملہ آور ہونا جو سلطنت ایران کا مقبوضہ تھا، بہت آسان ہو جاتا، علاوہ بریں اس تجویز کی کامیابی سے تجارتی فائدے بھی بہت کچھ حاصل ہو سکتے تھے لیکن اس مقصد کا پورا ہونا اسی وقت ممکن تھا جب استراخان پر قبضہ کر لیا جاتا، یہ شہر مملکت روس کے قبضہ میں تھا جس کی وسعت وقوت چند سالوں سے برابر ترقی کر رہی تھی۔

۹۷۶ھ (۱۵۶۸ء) میں صوقوللی نے پچیس ہزار ینی چری اور سپاہیوں کو ازف روانہ کیا، وہاں کریمیا کے تیس ہزار تاتاری بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور یہ متحدہ فوج استراخان پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھی، جو دریائے والگا کے دہانے پر واقع تھا، یہاں پہلی بار روسیوں اور ترکوں کا مقابلہ ہوا، ترکی فوج استراخان پر قبضہ نہ کر سکی اور تاتاریوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی، عثمانی فوجیں مجبوراً ازف کی طرف واپس ہوئیں لیکن قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے ان کا بیشتر حصہ بحر اسود میں ایک طوفان سے ضائع ہو گیا اور صرف سات ہزار سپاہی بہ خیریت واپس پہنچ سکے، اس ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈان اور والگا کو ملا دینے کی تجویز منسوخ کر دی گئی، روس میں ابھی اتنی قوت نہ تھی کہ وہ خود سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہوتا، زار آئیوان (Czar Ivan) نے ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں اپنا ایک سفیر باب عالی میں بھیجا اور استراخان کے حملہ کی شکایت کی، نیز دونوں سلطنتوں کے درمیان امن و اتحاد قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ ایک صلح نامہ مرتب کیا گیا اور تقریباً ایک صدی تک روس اور سلطنت عثمانیہ میں پھر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

خاکنائے سوئز کی تجویز بھی ایک نامعلوم مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی، کیوں کہ

یمن میں بغاوت چھڑ گئی تھی اور سنان پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج وہاں روانہ کرنی پڑی۔ سنان پاشا اس بغاوت کے فرو کرنے میں کام یاب ہوا اور یمن اور عرب کے دوسرے حصے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے۔

تونس | یمن کی دوبارہ فتح کے بعد صوقوللی نے تونس کو اسپینیوں کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) میں اولوج پاشا کو الجزائر کا حاکم بنا کر اس کی سرکردگی میں ایک ترکی بیڑا روانہ کیا، اولوج پاشا نے اسپینیوں کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا لیکن اسپینی فوج قلعہ میں محصور ہو گئی اور ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) تک اس پر قابض رہی۔

قبرص کی فتح | ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں سلیم نے قبرص پر حملہ کرنے کا قصد کیا، یہ جزیرہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا، جو سلطنت عثمانیہ کی حلیف تھی، صوقوللی نے اس تجویز کی مخالفت کی لیکن قرہ مصطفیٰ پاشا کے اصرار اور خود سلیم کی خواہش نے اس کی مخالفت کو بے اثر رکھا اور ایک حلیف کے مقبوضہ پر حملہ کرنے کے لیے مفتی اعظم نے علت جواز پیش کی کہ قبرص اس سے قبل ایک اسلامی حکومت (مصر) کے زیر نگیں رہ چکا تھا، چنانچہ ۱۵۷۰ء میں مصطفیٰ پاشا نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ قبرص پر چڑھائی کی، سات ہفتے کے محاصرہ کے بعد اس کا پایہ تخت نکوسیا (Nicosia) فتح ہو گیا، پھر مصطفیٰ پاشا نے اس جزیرہ کے سب سے مضبوط قلعہ فاماگوستا (Famagosta) کا بھی محاصرہ کیا اور ایک طویل مدت کے بعد اگست ۱۵۷۱ء میں محصورین نے ہتھیار ڈال دیے، قلعہ کی سپردگی کے وقت مصطفیٰ پاشا نے قبرص کے سپہ سالار براگاڈینو (Bragadino) کے سامنے نہایت نرم شرائط پیش کیے، اس نے عیسائی فوج اور وہاں کے عیسائی باشندوں کی جان و مال اور مذہب کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وعدہ کیا کہ یہ فوج ترکی جہازوں پر جزیرہ کریٹ پہنچا دی جائے گی اور وہاں آزاد کر دی جائے گی لیکن عین اس وقت کہ یہ جہاز روانگی کی تیاری کر رہے تھے، مصطفیٰ پاشا اور براگاڈینو میں بعض گذشتہ واقعات کے متعلق تکرار ہو گئی اور یہ بات یہاں تک بڑھی کہ مصطفیٰ پاشا نے غصہ میں آ کر

تمام عیسائی فوج کے قتل کا حکم دے دیا اور اس کے ایک ہفتہ کے بعد براگاڈنیو کی زندہ کھال نکلوالی، فارماگوستا پر قبضہ پا جانے کے بعد ترکوں نے پورے جزیرہ کو فتح کر لیا لیکن اس فتح میں ان کے تقریباً پچاس ہزار آدمی کام آئے۔ تین سو برس تک قبرص سلطنت عثمانیہ کے زیر تسلط رہا، ۱۸۷۸ء میں باب عالی نے اسے گورنمنٹ برطانیہ کے حوالے کر دیا۔

مسیحی اتحاد قبرص کے حملہ سے یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں نہایت تشویش پیدا ہوئی اور یورپ نے ترکوں کی بحری طاقت کا سدباب کرنے کے لیے بحر روم کی عیسائی حکومتوں کا ایک اتحاد قائم کیا، جس کے خاص ارکان اسپین، وینس اور مبارزین مالٹا تھے اور اس متحدہ بحری بیڑے کا سالار اعظم ڈان جان (Don John) کو مقرر کیا جو شہنشاہ چارلس پنجم کا ناجائز لڑکا اور باوجود اپنی نوعمری کے اس عہد کا نہایت ممتاز کمانڈر تھا، اتحادی بیڑا ستمبر ۱۵۷۱ء کو مسینا (Messina) میں جمع ہوا لیکن قبرص اس وقت تک فتح ہو چکا تھا، ترکی بیڑا جو اپنے جہازوں کی کثرت تعداد میں عیسائی بیڑے سے بڑھا ہوا تھا، خلیج لیپانٹو (Lepanto) میں لنگر انداز ہوا، امیر البحر علی پاشا ایک نوعمر سردار تھا، اس کو بحری جنگ کا زیادہ تجربہ نہ تھا، اولوج پاشا جس کی عمر کے ۴۴ سال بحری جنگوں میں صرف ہو چکے تھے، اس بیڑے کا نائب امیر تھا، اس نے اتحادیوں پر فوراً حملہ کرنے سے اس بنا پر اختلاف کیا کہ تیاری جیسی چاہیے ابھی مکمل نہ ہو سکی تھی لیکن علی پاشا کو بلا توقف حملہ کر دینے پر اصرار تھا، اولوج پاشا کو خاموش ہو جانا پڑا۔

جنگ لیپانٹو ۷/ اکتوبر ۱۵۷۱ء کو خلیج لیپانٹو کے دہانہ کے قریب دونوں بیڑوں کا مقابلہ ہوا، جنگ صرف چند گھنٹوں تک قائم رہی، مگر فریقین کو شدید نقصانات برداشت کرنے پڑے، دونوں بیڑے ایک دوسرے سے اس قدر قریب آگئے تھے کہ تلوار کی لڑائی ہونے لگی جس میں امیر البحر علی پاشا مارا گیا، عیسائیوں نے اس کا سر کاٹ کر جہاز کے مستول پر لٹکا دیا، یہ دیکھ کر ترکوں کے قدم اکھڑ گئے اور اولوج پاشا کی کوشش کے باوجود انہیں بری طرح شکست ہوئی، اولعج پاشا بمشکل چالیس جہازوں کو لے کر سلامتی کے ساتھ وہاں سے نکل

سکا، باقی پورا ترکی بیڑا جس کے جہازوں کی تعداد ۲۴۶ تھی، عیسائیوں کے قبضہ میں آ گیا، ان میں سے کچھ غرق بھی کر دیے گئے، اس جنگ میں تیس ہزار ترک کام آئے اور پندرہ ہزار عیسائی غلام آزاد ہوئے۔

خیال تھا کہ اتحادی اپنی عظیم الشان کامیابی سے فائدہ اٹھا کر آگے قدم بڑھائیں گے لیکن اس فتح سے وہ کچھ ایسا مطمئن ہوئے کہ فوراً اپنے اپنے ملک کو روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر خوشیاں منانے لگے۔

برخلاف اس کے ترکوں نے فوراً اس نقصان کی تلافی شروع کر دی، سلیم نے بھی جو عموماً عیش و عشرت میں سرشار رہتا تھا، اپنی جیب خاص سے ایک کثیر رقم عطا کی اور اپنے محل کے باغ کا ایک حصہ نئے جہازوں کی تعمیر کے لیے دے دیا، چنانچہ ۱۴۸ جہازوں کی تعمیر فوراً شروع کر دی گئی اور چند مہینوں میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ یہ نیا بیڑا تیار ہو گیا، ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) میں اتحادی بیڑا پھر بحر روم کے مشرقی حصہ میں جمع ہوا، اولوج پاشا اپنے نئے بیڑے کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لیے نکلا لیکن چونکہ اس کے جہاز رانوں کو ہنوز کافی تجربہ نہ تھا، اس لیے اس نے خود حملہ کرنا مناسب نہیں خیال کیا اور اتحادیوں کی پیش قدمی کا انتظار کرتا رہا، اتحادی ترکوں کی اس خلاف توقع تیاری سے بظاہر اس قدر مرعوب ہوئے کہ ان کی طرف سے بھی کوئی حملہ نہ ہوا اور اولوج پاشا اپنے پورے بیڑے کے ساتھ واپس آ گیا۔

وینس سے صلح | ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں وینس نے باب عالی سے صلح کی گفتگو شروع کی اور حسب ذیل معاہدہ مرتب ہوا، وینس نے نہ صرف قبرص کی فتح اور اس پر سلطنت عثمانیہ کا قبضہ تسلیم کر لیا بلکہ اس کے حاصل کرنے میں جو اخراجات دولت علیہ کو برداشت کرنے پڑے تھے اور جن کا تخمینہ تین لاکھ ڈوکات تھا، ان کی ادائگی بھی منظور کی، جزیرہ زانطہ کے لیے جمہوریہ وینس اب تک پانچ سو ڈوکات خراج ادا کرتی تھی، اس معاہدہ کی رو سے خراج کی مقدار ڈیڑھ ہزار ڈوکات مقرر ہو گئی، البتہ قبرص کا خراج جو آٹھ ہزار ڈوکات سالانہ آتا

کرتا تھا وہ اب موقوف کر دیا گیا، ڈلماشیا اور البانیا میں فریقین کے جو مقبوضات جنگ لیپانٹو سے قبل تھے وہی برقرار رکھے گئے۔

تونس کا الحاق | وینس اور سلطنت عثمانیہ کی صلح کے بعد ڈان جان یک اسپینی بیڑے کے ساتھ تونس پر حملہ آور ہوا اور چوں کہ قلعہ پر اسپین کا قبضہ جاری تھا، اس لیے آسانی کے ساتھ شہر کو فتح کر لیا، اس نے تونس میں ایک جدید قلعہ تعمیر کرایا اور اسپینی سپاہیوں کا ایک طاقت ور دستہ وہاں چھوڑ کر خود واپس چلا گیا، اس واقعہ کی خبر جب قسطنطنیہ پہنچی تو صدر اعظم صوقولی نے اولوج پاشا کو ایک زبردست بیڑے کے ساتھ روانہ کیا، اولوج پاشا نے اسپینیوں کا قلع قمع کر کے شہر، قلعہ اور تونس کے پورے صوبے پر قبضہ کر لیا اور اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر دیا۔

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں سلیم کا انتقال ہو گیا۔

مراد ثالث

۹۸۲ھ تا ۱۰۰۳ھ مطابق ۱۵۷۴ء تا ۱۵۹۵ء

سلیم کے انتقال کی خبر سن کر اس کا بڑا لڑکا مراد جو حکومت مغنیسیا پر مامور تھا، ۲۱ دسمبر ۱۵۷۴ء کو قسطنطنیہ پہنچا اور ۲۸ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ محمد فاتح کے قائم کردہ دستور کے مطابق اس نے زمامِ سلطنت کو ہاتھ میں لیتے ہی اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کرا دیا، اور اس کے بعد سب سے پہلا فرمان شراب کی ممانعت میں صادر کیا، جس کا رواج سابق سلطان کے عہد میں بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

امورِ مملکت میں حرم کا دخل مراد ثالث کے عہد کے ابتدائی چند برس صوقولی پاشا کی صدارت کے تھے، پھر بھی سلطان پر حرم کا اثر روز بہ روز زیادہ ہوتا جا رہا تھا، حرم کی چار خاتونوں کا اثر خصوصیت کے ساتھ اس پر بہت زیادہ تھا اور امورِ سلطنت کا انصرام حقیقۃً ان ہی خواتین کی منشا کے مطابق ہوتا تھا، ان میں سے ایک سلطانہ والدہ نور بانو تھی، دوسری مراد کی محبوب سلطانہ صفیہ تھی، جو وینس کے مشہور اور سربرآوردہ خاندان بفو (Baffo) کی رئیس زادی تھی اور اپنے حسنِ صورت اور ذکاوتِ طبع کے باعث مراد پر صد درجہ حاوی تھی، صفیہ کی سلطنت کی جنگ و صلح میں خاص دخل تھا، چنانچہ باوجود اس کے کہ وینس نے ایک سے زائد بار سلطان کو برانگیختہ کیا، محض صفیہ کی کوششوں سے جنگ کی نوبت نہ آئی، تیسری ایک ہنگری کی خاتون تھی، جس نے کچھ دنوں کے لیے صفیہ کی محبوبیت کو زائل کر دیا تھا اور مراد کی توجہ کا مرکز

بنی رہی، چوتھی خاتون جان فدا حرم سلطانی کی خاص مہتمم تھی اور وہ بھی اپنی لیاقت اور سلیقہ شعاری کی وجہ سے مراد کے مزاج میں بہت کچھ دخیل تھی، یہی چار خواتین سلطان کی خاص مشیر کار اور انتظام حکومت کی حقیقی نگراں تھیں۔

جنگ ایران تاہم سلیمان اعظم کے تربیت یافتہ فوجی اور بحری افسروں میں سے اب بھی کچھ باقی رہ گئے تھے اور مراد ثالث کے عہد میں جو لڑائیاں پیش آئیں ان میں عثمانی فوجوں کو اہم اور نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں اور دولت علیہ کے مقبوضات میں قیمتی اضافے ہوئے، اس عہد کی سب سے بڑی جنگ ایران کی جنگ تھی، جس کا سلسلہ ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) سے ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ء) تک قائم رہا، ۱۵۷۶ء میں شاہ طہماسپ کا انتقال ہوگیا اور اس کی وفات پر تخت سلطنت کے لیے ایران میں جو اندرونی خلفشار برپا ہوا اس سے دولت عثمانیہ نے فائدہ اٹھانا چاہا اور لالہ مصطفیٰ پاشا عثمانی فوجوں کے ساتھ جارجیا پر حملہ آور ہوا جو ایران کی حلیف مملکت تھی اور اس کے پایہ تخت تفلس کو فتح کرکے پورے جارجیا پر قبضہ کرلیا، جارجیا کو چار حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصہ پر ایک ترکی افسر مقرر کردیا گیا، عثمان پاشا شروان کا حاکم تھا، چار ایرانی فوجوں نے بیک وقت جارجیا پر حملہ کیا اور اسے ترکوں کے قبضہ سے چھڑا لینا چاہا، عثمان پاشا نے شہزادہ حمزہ کی فوج کو شکست دی لیکن جب سلطنت ایران کی سب سے بڑی فوج نے حملہ کیا تو اسے شروان چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا اور وہ دربند چلا گیا، سائمن لورسب (Simon Luarset) سابق امیر جارجیا نے اپنے قدیم پایہ تخت تفلس کا محاصرہ کرلیا مگر ترک محصورین نے نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، یہاں تک کہ حسن پاشا جو محمد صوقوللی پاشا کا لڑکا تھا کمک لے کر پہنچ گیا اور سائمن کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا، اس کے بعد ۱۵۸۳ء میں عثمان پاشا نے داغستان پر حملہ کیا اور اس پر پوری طرح قبضہ کرکے اس نے عین موسم سرما میں کوہ قاف کو عبور کیا اور کافہ پہنچ گیا، وہ محمد گرائی خان کریمیا کو تخت سے معزول کرنا چاہتا تھا، کیونکہ خان نے عثمانی افواج کو مدد دینے سے انکار کردیا تھا، محمد گرائی

نے یہ اطلاع پا کر علم بغاوت بلند کیا اور چالیس ہزار سواروں کو لے کر کافہ میں عثمان پاشا کا محاصرہ کر لیا، سلطان نے محمد کرائی کے بھائی اسلام کرائی کو کریمیا کے تخت پر بٹھا دینے کا وعدہ کیا اور اس کے معاوضہ میں فوجی مدد چاہی، چنانچہ اسلام کرائی اپنے بھائی خان کریمیا کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور محمد کرائی ۱۵۸۴ء میں قتل کر دیا گیا، عثمان پاشا اس باغی کا سر لے کر قسطنطنیہ پہنچا جہاں اس کا نہایت شان دار استقبال ہوا اور سلطان نے اپنی خاص تلوار اور اپنے عمامہ کے بیش بہا جواہرات اسے عطا کیے، اس کے بعد عثمان پاشا ایک لاکھ ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ تبریز کی طرف بڑھا، شہزادہ حمزہ مرزا نے عثمانی مقدمۃ الجیش کو شکست دی لیکن ایرانی ترکوں کی کثرت تعداد کا مقابلہ نہ کر سکے اور بالآخر شکست کھا کر انہیں تبریز خالی کر دینا پڑا، عثمان پاشا صحت کی خرابی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اس کے بعد چھ سال تک مسلسل ایرانی اور عثمانی فوجوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں، اسی درمیان میں عثمان پاشا کا انتقال ہو گیا، ۱۵۹۰ء میں دولت عثمانیہ اور سلطنت ایران کے درمیان صلح ہو گئی، جس کے رو سے جارجیا، شروان، داورستان، شہر تبریز اور آذربیجان کا ایک حصہ مراد ثالث کی سلطنت میں شامل ہو گیا، صلح نامہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ آئندہ اہل ایران خلفائے ثلاثہ کے خلاف تبرا کرنے سے باز رہیں گے۔

یورپین حکومتوں سے تجارتی اور سیاسی تعلقات

مراد کے عہد حکومت میں دولت علیہ اور یورپ کی سلطنتوں کے درمیان صلح کے تعلقات عموماً قائم رہے، علاوہ متفرق چھیڑ چھاڑ کے جو ہنگری کی سرحد پر ترکی پاشاؤں اور عیسائی قلعہ داروں میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی، دوسری یورپین حکومتوں سے سلطنت عثمانیہ کے تعلقات دوستانہ رہے، البتہ مراد کی وفات سے دو سال قبل آسٹریا سے جنگ کی نوبت آ گئی، مراد کے عہد میں خصوصاً صدر اعظم صوقولی پاشا کے مشورہ سے مغربی یورپ کی بیشتر حکومتوں سے تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم ہوئے، انگلستان نے جواب تک سلطنت عثمانیہ کے لیے ایک نا آشنا حکومت تھی، اول

اول ۱۵۷۹ء میں اپنے تین تاجروں ولیم ہیر بون (William Harebone)، ایڈورڈ ایلس (Edward Ellis) اور رچرڈ اسٹیپل (Richard Stapel) کو قسطنطنیہ بھیجا، انہوں نے باب عالی سے انگلستان کے لیے وہی تجارتی مراعات حاصل کیے جو یورپ کی دوسری قوموں کو حاصل تھے، ۱۵۸۳ء میں ملکہ الزبیتھ نے ولیم ہیر بون کو اپنا سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا اور سلطان سے یہ درخواست کی کہ وہ انگلستان سے متحد ہو کر اسپین کے عیسائی فرماں روا فلپ ثانی پر حملہ آور ہو جو سلطنت عثمانیہ اور حکومت انگلستان دونوں کا یکساں دشمن تھا۔

محمد صوقوللی کا قتل | اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مراد کے عہد حکومت کے ابتدائی چار سالوں میں عنان سلطنت صدر اعظم محمد صوقوللی پاشا کے ہاتھوں میں تھی لیکن مراد کے بعض دوسرے درباریوں مثلاً شمسی پاشا، اویس، خواجہ سعد الدین مورخ اور خواجہ سرا غضنفر آغا کا اثر شروع ہی سے بڑھتا گیا، یہ سب محمد صوقوللی کے مخالف تھے، بدقسمتی سے مراد پر حرم کا اثر بھی بہت زیادہ تھا، چنانچہ شمسی پاشا وغیرہ اور حرم کی سازش سے صدر اعظم کا اقتدار روز بہ روز کم ہوتا گیا، پہلے اس کے معتمد عہدہ داروں کو پایہ تخت سے علاحدہ کیا گیا اور پھر سازش کی تکمیل کے بعد خود محمد پاشا کو ۱۱ اکتوبر ۱۵۷۹ء کو قتل کر دیا گیا۔

سلطنت کا انتہائی عروج | لارڈ ایورسلے کی رائے ہے کہ سلطنت عثمانیہ اپنے کمال عروج کو سلیمان اعظم کے عہد حکومت کے آخری سال میں نہیں بلکہ صدر اعظم محمد پاشا صوقوللی کے عہد وزارت کے آخری سال میں پہنچی کیوں کہ سلیمان کے بعد بھی اس بارہ سال کی مدت میں جب صوقوللی عملاً سلطنت کا فرماں روا تھا، دولت عثمانیہ نے اہم فتوحات حاصل کیں، جن میں جزیرہ قبرص، صوبہ تونس، مملکت جارجیا اور سلطنت ایران کے زرخیز صوبے اور یمن شامل تھے، یہی فتوحات سلطنت عثمانیہ کی آخری فتوحات تھیں، ان کے بعد صرف کریٹ ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸ء) میں فتح ہوا، ورنہ اور ہر طرف زوال کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوئے اور عثمانی مقبوضات پر رفتہ رفتہ ہمسایہ حکومتوں کا حملہ اور قبضہ ہونے لگا۔

صوقولی پاشا کے قتل کے وقت سلطنت عثمانیہ شمال میں وسط ہنگری سے لے کر جنوب میں خلیج فارس اور سوڈان تک اور پھر مشرق میں بحر کاسپین اور سرحد ایران سے لے کر مغرب میں افریقہ کے صوبہ اوران تک پھیلی ہوئی تھی، اس میں مراکش کے سوا بحر روم کا تقریباً تمام جنوبی ساحل اور بحر اسود اور بحر احمر کے تمام ساحل شامل تھے، بحر لیفین کے تمام جزیرے علاوہ کریٹ کے ان کے زیر نگیں تھے، ان ممالک میں بیس مختلف نسل کے لوگ آباد تھے، جن کی تعداد کا تخمینہ تین کروڑ سے زیادہ ہے[1]۔

سلطنت کا زوال صوقولی کے قتل کے بعد ہی سلطنت میں بدنظمی کا دور شروع ہو گیا، یکے بعد دیگرے دس وزرا صدر اعظم کے عہدہ پر مقرر کیے گئے، سنان پاشا تین بار اس عہدہ پر مامور ہوا، عثمان پاشا داغستان سے واپس ہونے پر ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں صدر اعظم مقرر ہوا لیکن آٹھ ہی مہینے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا، صدر اعظم کی ان تبدیلیوں میں حرم کو بہت کچھ دخل تھا اور وہی وزرا اس عہدہ کا حوصلہ کر سکتے تھے جنہیں حرم کی سرپرستی حاصل تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور صرف وہ امیدوار مقرر کیے جانے لگے جو بڑی بڑی رقمیں پیش کرتے تھے، رشوت ستانی کی اس مہلک وبا سے حکومت کا کوئی شعبہ محفوظ نہ رہ سکا، یہاں تک کہ فوجی، عدالتی اور انتظامی عہدوں میں بھی امیدوار کی ذاتی قابلیت کے بجائے اس کی پیش کردہ رقم کی سفارش قبول کی جانے لگی، خود سلطان کو بھی اپنے ذاتی مصارف کے لیے روپیہ کی زیادہ ضرورت رہا کرتی تھی اور آخر میں اس نے بھی ایسی رقموں میں اپنا حصہ لگانا شروع کیا، یہیں سے سلطنت میں وہ اندرونی اختلال نمایاں ہونے لگا جس نے اس کی بنیادوں کو بالکل ہلا دیا۔

فوج کی بغاوت اور عام بدنظمی ان خرابی کے اثرات فوج میں بھی ظاہر ہونے شروع ہوئے، جس کا سبب صرف یہی نہ تھا کہ نا اہل اشخاص بڑے بڑے فوجی عہدوں پر مقرر کیے

---

[1] ترکی سلطنت، لارڈ ایورسلے، ص ۱۳۶۔

جانے لگے بلکہ فوج کے نظام جاگیری میں بھی سخت بے عنوانیاں ہونے لگیں اور جو جاگیریں محض فوجی خدمات کے معاوضہ میں دی جاتی تھیں ان کی خرید وفروخت شروع ہوگئی، ان حالات کے ساتھ ساتھ فوج بھی بے قابو ہونے لگی اور آخر کار ۱۵۸۹ء میں ینی چری نے علانیہ علم بغاوت بلند کر دیا اور قصر سلطانی کے سامنے جمع ہو کر محمد پاشا بیلر بے، رومیلیا کے سر کا مطالبہ کیا، ان کو محمد پاشا سے یہ شکایت تھی کہ اس کی تحریک سے فوج کی تنخواہ میں ایسے سکے تقسیم کیے گئے تھے جن میں چاندی بہت کم تھی، مراد کو ان کی دھمکی سے دبنا پڑا اور اس نے حکم دے دیا کہ محمد پاشا کا سر کاٹ کر ینی چری کے حوالہ کر دیا جائے، مراد کے اس طرح دب جانے سے ینی چری کو اپنی قوت کا اندازہ ہوگیا اور چار ہی سال کے اندر انہوں نے دوبارہ بغاوت کی اور سلطان کو مجبور کیا کہ وہ موجودہ صدر اعظم کو معزول کر کے دوسرا صدر اعظم مقرر کر دے، ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) میں انہوں نے پھر مراد کو مجبور کر کے مولڈیویا کی باج گزار مملکت کے تخت پر اس امیدوار کو بٹھایا جس نے رشوت کے ذریعہ سے ان کی حمایت حاصل کر لی تھی، خود قسطنطنیہ میں ینی چری اور سپاہی فوجوں میں باہمی جنگ ہوگئی، صوبوں کی حالت مرکزی حکومت کی بدنظمی کی وجہ سے حد درجہ خراب تھی، رشوت کا بازار اپنے لازمی نتائج کے ساتھ وہاں بھی گرم تھا اور جو حکام رشوت کے ذریعہ سے مقرر ہوئے تھے وہ اپنی رقم کی تلافی اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے رعایا پر مظالم کر رہے تھے، ۱۵۸۹ء سے ۱۵۹۲ء تک ہر قسم کی بدنظمی اور بدامنی سلطنت میں برپا رہی، مصر کی ردیف (ملیشیا) اپنے صوبہ دار سے باغی ہوگئی، تبریز کی فوج نے بغاوت کر دی اور قسطنطنیہ کا تبدیل شدہ سکہ لینے سے انکار کر دیا، بودا کے فوجی دستے نے جس کی تنخواہ چھ مہینے سے باقی تھی، اپنے پاشا کو قتل کر دیا، ایران میں ایک شخص شاہ طہماسپ کا لڑکا بن کر تخت کا دعوے دار ہوا لیکن ارض روم کے والی نے اسے گرفتار کر لیا، لبنان (شام) کا دروزی فرقہ وہاں کے حکام کی سخت گیریوں سے عاجز آکر باغی ہوگیا، اس فتنہ کے فرو کرنے کے لیے مراد نے ابراہیم پاشا کو شام بھیجا جس نے دروزیوں کو شکست دے کر ان کو قابو میں کیا۔

ہنگری اور آسٹریا سے جنگ سب سے زیادہ انتشار ینی چری کی خودسری سے پیدا ہو رہا تھا، اتفاق سے اسی زمانہ میں ہنگری اور آسٹریا سے جنگ چھڑ گئی اور ینی چری کو سلطنت کے باہر بھیجنے کا موقع ہاتھ آ گیا، ابتدا میں عثمانیوں کو کامیابی ہوئی مگر سیسک کے محاصرہ میں حسن پاشا والی بوسینیا کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا اور وہ دریا عبور کرتے ہوئے ڈوب کر ہلاک ہو گیا، یہ خبر سن کر سنان پاشا فوراً ادھر روانہ ہوا، اسی درمیان میں بودا کے پاشا کو آسٹریا کی فوجوں سے شکست ہوئی اور چند عثمانی قلعوں پر آسٹریا کا قبضہ ہو گیا، تاہم فریقین کی فتوحات کے پلے اب تک تقریباً برابر تھے لیکن ۱۵۹۴ء میں مولڈیویا، ولاچیا اور ٹرانسلوینیا نے بغاوت کر کے آسٹریا سے اتحاد کر لیا اور اپنی مملکتوں کے تمام مسلمان باشندوں کو قتل کر ڈالا، ابھی آسٹریا کی جنگ جاری ہی تھی کہ ایران سے بھی پھر لڑائی چھڑ گئی جس میں ابتداءً عثمانی فوجوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

مراد کا انتقال اسی اثنا میں ۱۶؍ جنوری ۱۵۹۵ء کو مراد کا انتقال ہو گیا، وہ فطرتاً بہت نیک اور صلح جو تھا، اس کی تخت نشینی کے وقت سلطنت عثمانیہ جس پایۂ کمال کو پہنچ چکی تھی مراد میں اگرچہ اسے برقرار رکھنے کی صلاحیت نہ تھی اور حرم کی دخل اندازی سے نظام سلطنت میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں تاہم ان خرابیوں کی ذمہ دار تنہا اس کی ذات قرار نہیں دی جا سکتی، سلطنت کا انحطاط خود سلیمان کے وقت سے شروع ہو گیا تھا اور گو صوقوللی پاشا کے تدبر واقتدار نے اسے سلیم کے عہد میں نمایاں نہ ہونے دیا تاہم دبی ہوئی چنگاریاں اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی تھیں اور مراد کے عہد میں ان کا بھڑک اٹھنا گزیر تھا۔

مراد ایک صوفی مشرب سلطان تھا، اس کو تصوف سے خاص شغف تھا، اکثر سلاطین عثمانیہ کی طرح وہ بھی شاعر تھا اور مرادی تخلص کرتا تھا، تصوف میں اس کی ایک مشہور تصنیف "فتوحات الصیام" ہے[1]۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۳ ص ۱۳۷۔

محمد ثالث

۱۰۰۳ھ تا ۱۰۱۲ھ مطابق ۱۵۹۵ء تا ۱۶۰۳ء

سلطان مراد کی وفات کے وقت اس کا سب سے بڑا لڑکا محمد ایشیائے کوچک میں صوبہ مغنیسیا کا حاکم تھا، اس کی ماں سلطانہ صفیہ نے مراد کی وفات کو مخفی رکھا، یہاں تک کہ محمد قسطنطنیہ پہنچ گیا، ایسا کرنا اس لیے ضروری خیال کیا گیا کہ مراد کے دوسرے لڑکے تخت سلطنت کے دعوے دار نہ بن سکیں لیکن اس تحفظ کی ضرورت آئندہ پھر کبھی پیش نہ آئی، کیوں کہ سلاطین آل عثمان میں محمد ثالث آخری سلطان تھا، جسے شہزادگی کے زمانہ میں کسی صوبہ کی حکومت سپرد کی گئی تھی، اس کے بعد تمام شہزادے محل کے ایک خاص حصہ میں نظر بند رکھے جانے لگے اور سلطنت کا کوئی عہدہ انھیں سپرد نہ کیا جاتا، انھیں صرف اسی وقت آزادی نصیب ہوتی جب تخت نشینی کے لیے اعیان سلطنت ان کو محل سے باہر لاتے، اس جدید نظام کا سبب یہ خطرہ تھا کہ مبادا شہزادے سلطان وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں لیکن اس کا جو اثر فرماں روایان سلطنت کی سیرت اور اہلیت پر پڑتا تھا وہ ملکی حکمرانی کے لیے نہایت درجہ مضر تھا۔

فوج کی شورش | محمد ثالث نے تخت نشین ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بھائیوں کو فوراً قتل کرا دیا، اس طرف سے مطمئن ہو کر تخت نشینی کے آٹھویں روز وہ جامع صوفیہ میں جلوس کے ساتھ نماز ادا کرنے گیا اور فوج کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اتنی کثیر مقدار میں انعامات اور بخششیں تقسیم کیں کہ اس سے پہلے کسی سلطان نے نہ کی تھیں، پھر وہ ہنگری

میں کمک بھیجنے کی تیاری کرنے لگا لیکن اس تیاری کے دوران ہی میں فوج کے دو دستوں نے جو سلطانی بخشش سے مطمئن نہ تھے اور مزید انعامات کے خواہش مند تھے، صدر اعظم فرہاد پاشا کو گھیر کر اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے سخت لہجہ میں اصرار کرنا شروع کیا، فرہاد پاشا نے انہیں سرحد پر جانے کا حکم دیا اور وعدہ کیا کہ ان کے مطالبات وہیں پورے کیے جائیں گے، اس پر انہوں نے اور زیادہ برہمی ظاہر کی اور فرہاد پاشا کو دھمکانے لگے، فرہاد پاشا نے ان کی یہ خودسری دیکھ کر کہا "کیا تم نہیں جانتے کہ جو لوگ اپنے سرداروں کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں وہ کافر ہیں اور ان کی بیویاں مطلقہ ہیں" اس طنز پر وہ نہایت برافروختہ ہوئے اور مفتی اعظم کے پاس پہنچ کر فرہاد پاشا کے خلاف ایک فتویٰ چاہا، مفتی اعظم نے انہیں یہ سمجھا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی کہ فرہاد پاشا کے کہنے سے نہ وہ کافر ہو سکتے اور نہ ان کی بیویاں مطلقہ لیکن ان کو مفتی اعظم کے جواب سے تشفی نہ ہوئی اور انہوں نے علانیہ بغاوت کر دی۔ سپاہیوں (قسطنطنیہ کے سوار دستوں) نے بھی ان کی حمایت کی اور سب نے مل کر فرہاد پاشا کے قتل کے لیے غل مچانا شروع کیا، اس شورش میں حکومت کے بہت سے اعلیٰ عہدہ دار جنہوں نے باغیوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی، زخمی ہوئے، بالآخر ینی چری دستوں کو باغیوں کی سرکوبی کے لیے آمادہ کیا گیا اور یہ بغاوت کسی طرح فرو ہوئی۔

سلسلۂ جنگ اس درمیان میں سرحد کی جنگ برابر جاری تھی اور ہنگری اور ولاچیا میں عثمانی فوجوں کو متعدد شکستیں بھی ہوئیں، یہ حالت دیکھ کر مدبرین سلطنت نے محمد کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ خود دشمنوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو، کیوں کہ عیسائی جس تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، اسے روکنے کی اس سے زیادہ امید افزا کوئی دوسری صورت نہ تھی، محمد کو قسطنطنیہ چھوڑنا منظور نہ تھا اور سلطانہ صفیہ نے بھی جو اب سلطانہ والدہ تھی اس کو میدان جنگ سے باز رکھنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، محمد ثالث ایک کم زور دل و دماغ کا آدمی تھا، سلطنت کے تمام امور میں سلطانہ صفیہ ہی کو زیادہ دخل تھا اور محمد پر اس کا حد سے

زیادہ اثر تھا وہ خوب سمجھتی تھی کہ قسطنطنیہ سے باہر ہونے کے بعد محمد اس کے قابو سے نکل جائے گا، اس لیے اس نے ہر ممکن کوشش سے اس کو روکنا چاہا لیکن جنگ کی حالت روز بروز زیادہ انتشار انگیز ہوتی جاتی تھی، ۱۵۹۳ء میں ولاچیا اور ٹرانسلوانیا کی حمایت میں آسٹریا اور ہنگری نے بھی باب عالی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا، ان کی فوجیں شہنشاہ میکس میلین اور ہنگری کے مشہور جنرل کاؤنٹ فلفی (Count Filfy) کے زیر کمان تیزی سے عثمانی سرحد کی جانب بڑھ رہی تھیں، انہوں نے دریائے ڈینوب تک پہنچنے سے پہلے گران، پست، بخارسٹ اور دوسرے متعدد قلعوں کو جن پر ترکوں کا قبضہ تھا، فتح کر لیا، اس کے بعد انہوں نے ڈینوب کو عبور کر کے وارنا، سیلسٹریا، رسچک اور اکرمان پر قبضہ کر لیا، عثمانی فوجوں کو ان شکستوں کی خبر جس وقت قسطنطنیہ پہنچی تمام شہر میں تہلکہ پڑ گیا اور ہر شخص نے اسی پر اصرار کرنا شروع کیا کہ سلطان کو فوج لے کر خود سرحد کی طرف روانہ ہونا چاہیے تا کہ جو شکستیں ترکوں کو ہو چکی تھیں ان کی تلافی ہو جائے اور جن مقامات پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا ہے وہ واپس لے لیے جائیں، مشہور مورخ خواجہ سعد الدین جو محمد کا استاد تھا اور جس کا محمد نہایت احترام کرتا تھا، اس نے بھی بے حد اصرار کے ساتھ اسی پر زور دیا، آخر میں ینی چری نے بھی یہ دھمکی دی کہ جب تک سلطان خود ان کی قیادت نہ کرے گا وہ دشمن کے مقابلہ کے لیے نہ بڑھیں گے، محمد نے مفتی اعظم کو بلا کر مشورہ طلب کیا، مفتی اعظم نے اس کے جواب میں اس عہد کے مشہور شاعر علی چلپی کی ایک نظم اس کے ہاتھ میں رکھ دی، اس نظم میں سلطنت کی زبوں حالی اور موجودہ جنگ کی تباہ کاری نہایت واضح اور موثر الفاظ میں بیان کی گئی تھی، ان تمام باتوں کا اثر بالآخر محمد پر بھی پڑا اور اس نے سلطانہ صفیہ کی شدید مخالفت کے باوجود سرحد پر جانے کا عزم کر لیا۔

جون ۱۵۹۶ء میں سلطان محمد نہایت تزک واحتشام کے ساتھ سرحد کی طرف روانہ ہوا، اس مہم میں علم نبوی ﷺ پہلی بار نکالا گیا تھا، جس کی وجہ سے فوج میں بے انتہا جوش تھا،

مورخ سعد الدین سلطان کے ہم رکاب تھا فوج کی کمان صدر اعظم ابراہیم پاشا، حسن صوقوللی پاشا اور سیکالا پاشا کے ہاتھ میں تھی، جوں ہی ترکی فوج سرحد پر پہنچی، آسٹریا اور ہنگری کی فوجیں بلا مقابلہ پسپا ہو گئیں اور بلغاریا کے تمام مفتوحہ علاقوں کو خالی کر دیا، سلطان نے ایرلا کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد آسٹریا اور ہنگری کی فوجیں ٹرانسلوانیا سے کمک حاصل کر کے پھر آگے بڑھیں لیکن ایرلا اس وقت تک فتح ہو چکا تھا ۲۴/ اکتوبر ۱۵۹۶ء کو فریقین کی فوجی سیرسٹیز (Cerestes) کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں اور پھر تین دن تک اس ہنگامہ خیز جنگ کا سلسلہ قائم رہا، جس میں ابتداء ترکوں کو شکست ہوئی لیکن آخر میں جنگ کے خاتمہ کے قریب انہوں نے عیسائیوں کی طاقت کو پاش پاش کر دیا۔

پہلے روز ترکی فوج کا ایک دستہ جو جعفر پاشا کی کمان میں تھا نہایت جان بازی کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا لیکن غنیم کی کثرت تعداد سے مغلوب ہو کر ایک ہزار ینی چری اور ایک سو سپاہی اور تینتالیس توپوں کے نقصان کے ساتھ اسے پسپا ہونا پڑا، اس ابتدائی شکست کے بعد سلطان نے فوجی افسروں کو جمع کر کے مشورہ کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ جنگ فی الحال موقوف کر دی جائے اور فوج کو واپسی کا حکم دے دیا جائے، مورخ سعد الدین نے اس رائے کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ "یہ بات نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی گئی کہ عثمانیوں کے کسی بادشاہ نے انتہائی اور ناگزیر مجبوری کے بغیر دشمن کو پیٹھ دکھائی ہو" بعض سرداروں نے یہ مشورہ دیا کہ سلطان کی حفاظت کے خیال سے فوج کی کمان حسن صوقوللی پاشا کے ہاتھ میں دے دی جائے، سعد الدین نے اس کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ "یہ معاملہ پاشاؤں کا نہیں ہے، یہاں خود سلطان کی ذاتی موجودگی قطعی طور پر ضروری ہے" چنانچہ محض سعد الدین کے عزم و استقلال کی وجہ سے آخر میں یہ طے پایا کہ جنگ جاری رکھی جائے اور سلطان ہی اس کی قیادت کا فرض انجام دے۔

فتح مبین دوسرے روز بھی ترکوں کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی، لیکن تیسرے روز ۲۶/ اکتوبر ۱۵۹۶ء کو دونوں فریق نے پوری تیاری کے ساتھ حملہ کیا اور یہی حملہ فیصلہ کن ثابت ہوا، شروع میں عیسائیوں نے مکمل طور پر غلبہ پایا، انھوں نے ترکوں اور تاتاریوں کو میدان سے بھگا کر ان کی تمام توپوں پر قبضہ کرلیا، سلطان نے یہ دیکھ کر کہ اب کوئی امید باقی نہیں رہی، بھاگنے کا قصد کیا لیکن سعد الدین نے اس موقع پر بھی ثابت قدمی دکھائی اور قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت کر کے سلطان کو سمجھایا کہ صبر ہی سے فتح حاصل ہوتی ہے اور رنج کے بعد خوشی کا آنا ضروری ہے، عین اس وقت جب کہ عیسائی دستے فاتحانہ جوش و خروش میں لوٹ مار میں مصروف تھے، سیکالا پاشا جو اب تک بالکل خاموش کھڑا ہوا تھا، دفعۃً اپنے سواروں کے انبوہ کے ساتھ بجلی کی طرف غنیم پر ٹوٹ پڑا اور اس بے جگری سے انہیں قتل کرنا شروع کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی میدان میں ٹھہر نہ سکے اور انتہائی سراسیمگی کی حالت میں جان بچانے کے لیے بھاگے لیکن باوجود اس کوشش کے ان کے پچاس ہزار سپاہی دلدل میں پھنس کر اور ترکوں کی تلواروں سے ہلاک ہوگئے، ان کی پچانوے توپیں اور آرچ ڈیوک میکسی میلین (Maximilion) کا جو عیسائی فوجوں کا سپہ سالار اعظم تھا، تمام زر و جواہر اور فوجی سامان ترکوں کے قبضہ میں آگیا، ترکوں کی یہ فتح اپنی عظمت اور اہمیت کے اعتبار سے تاریخ آل عثمان کی نمایاں ترین فتوحات میں تھی۔

اس غیر متوقع فتح کے بعد جس کا سہرا حقیقۃً سعد الدین پاشا اور سیکالا پاشا کے سر تھا، سلطان محمد بڑے فخر و مسرت کے ساتھ قسطنطنیہ کو واپس ہوا اور پھر اپنی عیش و عشرت کی زندگی میں مصروف ہوگیا، ہنگری کے ساتھ جنگ کا سلسلہ کم و بیش برابر جاری رہا، یہاں تک کہ اس کے جانشین سلطان احمد اول کے عہد میں صلح نامہ ستواتوروک (Sitvatoroh) کے ذریعہ اس کا خاتمہ ہوا۔

فراری قسطنطنیہ پہنچ کر سلطان محمد نے فوراً ہی سیکالا پاشا کو اس کی شجاعت اور کامیابی

کے صلہ میں صدر اعظم مقرر کیا لیکن یہ انتخاب نتائج کے اعتبار سے نہایت افسوس ناک ثابت ہوا اور چند ہی دنوں کے بعد سیکالا پاشا اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا، ایک فوجی افسر کی حیثیت سے اس کی بے مثل شجاعت اور جاں بازی مسلم تھی تاہم انتظام سلطنت کے لیے جس تدبر اور مصلحت بینی کی ضرورت تھی، اس سے وہ بڑی حد تک محروم تھا، جنگ سیریز کے موقع پر جب عیسائیوں نے غلبہ پایا تو عثمانی فوج کے بیش تر دستوں کے قدم اکھڑ گئے تھے، سیکالا پاشا کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان بھاگنے والوں کی تعداد تیس ہزار تھی، جن میں زیادہ تر ایشیا کے جاگیری دستے تھے، اس نے ان سب کو ''فراری'' کے لقب سے موسوم کر کے ان کی تنخواہیں روک دیں اور ان کی جاگیریں ضبط کر لیں، بہتیروں کو اس نے علانیہ قتل کرا دیا، ایک بڑی تعداد ایشیائے کوچک کو واپس چلی گئی اور سیکالا پاشا اور سلطنت کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کرنے لگی، چنانچہ ایشیائے کوچک میں تھوڑے ہی دنوں کے بعد جو بغاوت برپا ہوئی اور جس کا سلسلہ کئی سال تک قائم رہا، اس میں نمایاں حصہ ان ہی ''فراریوں'' کا تھا۔

قرہ یازیجی سلطان محمد کے بقیہ عہد حکومت میں فوج کی خودسری اور صوبہ داروں کی تعدی اور سخت گیری روز بروز زیادہ ہوتی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے خلاف ایک عام بیزاری پھیل گئی اور ہر طرف بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے، چنانچہ ۱۵۹۹ء میں ایشیائے کوچک کے فوجی جاگیرداروں کا ایک سردار عبدالحمید جو ''قرہ یازیجی'' کے لقب سے مشہور تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور سلطان کے خلاف عام بغاوت برپا کر کے خود ایک خود مختار فرماں روا بن جانا چاہا، اس نے کردوں، ترکمانوں اور جنگ سیرسٹیز کے ''فراریوں'' کی ایک فوج تیار کی اور اپنے بھائی ولی حسن بغدادی کی مدد سے عثمانی لشکر کو متعدد شکستیں دیں، اس کے بعد حسن صوقوللی پاشا باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، اس نے عبدالحمید کو شکست دے کر بھگا دیا، عبدالحمید کو لڑائی میں ایک کاری زخم لگا

تھا جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکا لیکن مرنے سے پہلے اس نے اپنے بھائی ولی حسن کو اپنی موت کا بدلہ لینے پر مامور کر دیا تھا، چنانچہ ولی حسن نے جنگ جاری رکھی اور بالآخر حسن پاشا کو قتل کر دیا، اس کی طاقت روز بروز بڑھتی گئی، یہاں تک کہ سلطان کو ۱۶۰۳ء میں مجبوراً اس سے صلح کرنی پڑی، سلطان نے اسے بوسینا کا حاکم مقرر کر دیا، جس کے معاوضہ میں ولی حسن نے آئندہ مطیع اور وفادار رہنے کا عہد کیا۔

ایران سے جنگ اس بغاوت کے دوران ہی میں شاہ عباس نے اپنے قدیم دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ۱۶۰۳ء میں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیا اور گذشتہ عہد میں جو صوبے سلطنت ایران سے نکل کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے تھے، انہیں واپس لے لیا۔

وفات جون ۱۶۰۳ء میں سلطان محمد نے اپنے سب سے بڑے لڑکے محمود کو جس کی شجاعت اور لیاقت کے جوہر ابتدا ہی سے نمایاں تھے اور جس نے باغیوں کو سر کرنے کے لیے ایشیائے کوچک کی سپہ سالاری کی درخواست سلطان سے کی تھی، محض اس شبہ کی بنا پر قتل کرا دیا کہ وہ اس بہانہ سے خود تخت سلطنت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، اس شبہ کو کسی درویش کی پیشین گوئی سے کہ جلد ایک نیا سلطان تخت پر بیٹھے گا اور بھی تقویت پہنچی، سلطان نے اس پیشین گوئی کے خوف سے محمود کو تو قتل کرا دیا لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۲۲/ اکتوبر سن ۱۶۰۳ء کو وہ خود بھی ختم ہو گیا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک درویش نے اس سے کہا تھا کہ پچپن روز کے اندر اس پر کوئی سخت مصیبت آنے والی ہے، اس پیشین گوئی کا اثر یہ ہوا کہ وہ روز بہ روز مغموم اور ضعیف ہوتا گیا، یہاں تک کہ ٹھیک پچپنویں روز اس کا انتقال ہو گیا۔

احمد اوّل

۱۰۱۲ھ تا ۱۰۲۶ھ مطابق ۱۶۰۳ء تا ۱۶۱۷ء

سلطان محمد ثالث کے بعد اس کا بڑا لڑکا احمد اول چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، ابتداءً اس نے انتظام سلطنت میں جس قوت اور استقلال کا ثبوت دیا، اس سے توقع کی جاتی تھی کہ اس کا عہد حکومت کے پچھلے عہد کے مقابلہ میں زیادہ کام یاب اور شان دار ثابت ہوگا، مثلاً جب صدر اعظم نے جو ہنگری کی جدید مہم پر مامور کیا گیا تھا، ایک کثیر رقم کا مطالبہ کیا اور اس کے پورا نہ ہونے تک آگے قدم بڑھانے سے انکار کر دیا تو احمد نے اس کے مطالبہ کے جواب میں صرف یہ پیغام بھیجا کہ ”اگر تم کو اپنا سر عزیز ہے تو فوراً روانہ ہو جاؤ“ صدر اعظم کو اس حکم کی تعمیل بے چوں وچرا کرنی پڑی، سلطان سلیم ثانی کے زمانہ سے حرم کو امور سلطنت میں بہت کچھ دخل حاصل تھا اور مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں عنان حکومت زیادہ تر خواتین حرم ہی کے ہاتھ میں تھی، جن میں سب سے زیادہ اثر سلطانہ صفیہ کا تھا، جو مراد ثالث کی محبوب سلطانہ اور محمد ثالث کی والدہ تھی، سلطان احمد نے باوجود نو عمری کے سلطانہ صفیہ اور اس کے معتمد اشخاص کو سلطنت کے معاملات میں دخل دینے سے یک قلم روک دیا، یہ اقدام بالکل خلاف توقع اور بہت کچھ امید افزا تھا، اس کے بعد اس نے سیکالا پاشا کو ایران کی طرف روانہ کیا لیکن شاہ عباس کے مقابلہ میں اس کو شکست ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۶۰۵ء میں سیکالا پاشا کا انتقال ہو گیا، صدر اعظم لالہ مصطفیٰ نے جو ہنگری

کی مہم پر روانہ کیا گیا تھا، بوبوا کو عیسائیوں کے ہاتھ سے چھڑا لیا، مگر موسم کی خرابی اور ینی چری کے آغاؤں کی کم ہمتی کے باعث اسے مجبوراً پست اور گران کا محاصرہ اٹھا لینا پڑا، بہرحال چند ہی روز کے بعد اس نے گران کو فتح کر لیا۔

صلح نامۂ سیتوا توروک ۱۱ر نومبر ۱۶۰۶ء کو صلح نامہ سیتوا توروک پر دستخط ہوئے، اس کے رو سے فریقین کے مقبوضات میں کوئی اہم تبدیلی واقع نہیں ہوئی، گران، ایرلا اور گراڈ سکا (Gradiscka) کے قلعے عثمانیوں کے قبضہ میں رہے اور راآب اور کوموورن پر آسٹریا کا قبضہ قائم رہا، ٹرانسلوینیا بھی اس صلح نامہ میں بطور ایک فریق کے شریک کیا گیا اور یہ صوبہ ایک حد تک سلطنت عثمانیہ کی محکومی سے آزاد ہو گیا، تیس ہزار دوکات سالانہ کی رقم جو آسٹریا بطور خراج دولت عثمانیہ کو ادا کرتا تھا، موقوف کر دی گئی اور اس کے معاوضہ میں باب عالی نے دولاکھ دوکات یک مشت قبول کر لیے لیکن اس صلح نامہ کی اصلی اہمیت وہ تبدیلی ہے، جو اس کے بعد دولت عثمانیہ اور یورپ کی عیسائی حکومتوں کے سفارتی تعلقات میں واقع ہوئی، اب تک عیسائی حکومتوں سے جو صلح نامے ہوتے تھے، ان کی عبارت سے ظاہر ہوتا تھا کہ صلح سلطان کی طرف سے عطا کی جارہی ہے لیکن سیتوا توروک کے صلح نامہ میں باب عالی نے بین الاقوامی قانون کے اصول و آداب کا لحاظ رکھا، نیز شاہ آسٹریا حکمران ''ویانا'' کے بجائے ''شہنشاہ'' لکھنا منظور کیا، اب تک سلطان کی طرف سے جو سفراء ویانا بھیجے جاتے تھے، وہ باب عالی کے ادنیٰ ملازمین میں سے منتخب کیے جاتے تھے، اس صلح نامہ کے بعد یہ طے پایا کہ سفراء کم از کم سنجق بے کے مرتبہ کے ہوں گے۔

ضعف سلطنت اس صلح نامہ نے واضح کر دیا کہ دولت عثمانیہ کے عروج کا دور ختم ہو چکا اور اب وہ زوال و انحطاط کی جانب مائل ہو گئی ہے، سترھویں صدی کا ابتدائی زمانہ اس کے لیے نہایت خطرناک تھا، سلاطین عموماً کم زور تھے اور غنیم (سلطنت آسٹریا) روز بروز زیادہ طاقت حاصل کرتا جاتا تھا لیکن ۱۶۱۸ء میں جرمنی میں وہ عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑ گئی جس

کا سلسلہ تین سال تک قائم رہا اور جس نے سلطنت آسٹریا کو ترکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے بوہیمیا، ہنگری، ڈنمارک، سویڈن اور فرانس سے معرکہ آرائی میں مصروف رکھا، سلطنت اسپین بھی دولت عثمانیہ کی ایک بہت بڑی دشمن تھی لیکن فلپ ثانی کی وفات (۱۵۹۸ء) کے بعد یہ سلطنت نہایت تیزی کے ساتھ گرنے لگی اور سترہویں صدی کی ابتدا میں اس قابل نہ تھی کہ اپنے سابق حریف کے ساتھ قوت آزمائی کر سکے، فرانس اور انگلستان دولت عثمانیہ سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، علاوہ بریں وہ سترہویں صدی کے نصف اول اپنے خانگی جھگڑوں میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں دوسری جانب توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ تھی، روس خانہ جنگیوں اور بغاوتوں سے پریشان تھا اور اس زمانہ میں جب سلطنت عثمانیہ کی کمزوری بہت نمایاں تھی، خود ان بغاوتوں کے فرو کرنے اور اہل سویڈن و پولینڈ سے اپنے بعض صوبے واپس لینے کی کوششوں میں مشغول و منہمک تھا، غرض سترہویں صدی کے ابتدائی تیس سالوں میں جو سلطنت عثمانیہ کے لیے نہایت نازک اور تشویشناک دور تھا، یورپ کی کوئی بڑی حکومت اس قابل نہ تھی کہ ترکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا سکے، اس زمانہ میں ترکوں کے خاص دشمن پولینڈ اور وینس تھے، پولینڈ اپنے خانگی انتشار کے باعث کوئی نمایاں فتح حاصل نہ کر سکا اور وینس بھی اس قابل نہ تھی کہ تنہا سلطنت عثمانیہ کا مقابلہ کر سکے، علاوہ بریں تمام ظاہری نمائش کے باوجود اس کی قوت خود روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی، سترہویں صدی کے نصف اول میں ایران سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا دشمن تھا، تاہم اس سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ اس کی فوجیں مغرب کی جانب اس حد تک بڑھ آئیں گی کہ سلطنت کے اصلی مقبوضات خطرہ میں پڑ جائیں۔

صلح نامہ سیتوا توروک کے بعد سلطان احمد اول نے گیارہ سال حکومت کی، اس مدت میں صدر اعظم مراد پاشا نے ایشیائے کوچک کی بغاوت فرو کرنے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی لیکن ایران سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا، جس میں زیادہ تر ترکوں

کا ہی نقصان ہوا۔ ۱۶۱۳ء میں قزاقوں نے سینوپ پر جو ایشیائے کوچک کا ایک نہایت دولت مند شہر اور بحر اسود کا بہت مضبوط بندرگاہ تھا، حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کر ڈالا، ترکی بیڑا موقع سے دور تھا اور شہر کی بربادی کے بعد بھی حملہ آوروں سے انتقام نہ لے سکا۔

وفات | ۲۳/ ذیقعدہ ۱۰۲۶ھ (۲۲/ نومبر ۱۶۱۷ء) کو سلطان احمد اول نے اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

مصطفیٰ اوّل و عثمان ثانی

۱۰۲۶ھ تا ۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۱۷ء تا ۱۶۲۳ء

سلطان احمد اول نے اپنی وفات کے وقت سات لڑکے چھوڑے جن میں سے تین تخت نشین ہوئے لیکن اس کا پہلا جانشین اس کا بھائی مصطفیٰ تھا، اب تک چودہ پشتوں سے سلطنت عثمانیہ کی وراثت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی تھی، یہ پہلا اتفاق تھا کہ بیٹے کے بجائے سلطان سابق کا بھائی تخت نشین ہوا، فان ہمیر کی روایت کے مطابق[1] خاندان کے سب سے بڑے فرد کو تخت نشین کرنے کا دستور دولت عثمانیہ نے آل چنگیز سے لیا تھا لیکن جب سے سلاطین نے محمد فاتح کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کرنا شروع کیا اور تاج و تخت کی حفاظت کے لیے بھائیوں کا قتل ضروری خیال کیا جانے لگا، اس وقت سے سلطنت کا وارث بھائی کے بجائے بڑا لڑکا ہوتا تھا، احمد اول نے چوں کہ اپنے بھائی مصطفیٰ کو قتل نہیں کرایا تھا اور صرف اس کی قید ہی پر اکتفا کیا تھا، اس لیے قانون آل عثمان کی رو سے مصطفیٰ تخت سلطنت پر بٹھایا گیا لیکن مصطفیٰ کی سادہ لوحی اور نااہلیت تین ہی مہینے میں اس درجہ واضح اور نمایاں ہوگئی کہ اراکین سلطنت نے ۱۶؍ فروری ۱۶۱۸ء کو اسے معزول کر کے سلطان احمد کے چودہ سالہ فرزند شہزادہ عثمان کو تخت پر بٹھا دیا، فوج سے خطرہ تھا مگر اس نے بھی اپنے مالی فائدہ کو پیش نظر رکھ کر اس تجویز سے بہ خندہ پیشانی اتفاق کیا اور نئے سلطان کی تخت

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۲۴۸۔

نشینی کے موقع پر حسب دستور قدیم جدید انعامات کا مطالبہ کیا، جس کی وجہ سے صرف تین ماہ کے اندر خزانہ کو ساٹھ لاکھ دوکات کا بار پھر برداشت کرنا پڑا۔

عثمان ثانی سلطان عثمان ثانی کا مختصر عہد حکومت خود اس کے اور سلطنت کے لیے نہایت نامبارک ثابت ہوا، ترکوں کو مسلسل شکستوں سے مجبور ہو کر ایران سے صلح کرنی پڑی (۱۶۱۸ء) اور وہ تمام فتوحات جو مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں حاصل ہوئی تھیں، ایرانیوں کو واپس کر دی گئیں، سلطنت عثمانیہ کی مشرقی سرحد پھر اسی خط پر پہنچ گئی جس پر سلطان سلیم ثانی کے زمانہ میں تھی، ادھر سے فارغ ہو کر عثمان سلطنت کے اندرونی دشمنوں یعنی ینی چری و سپاہی دستوں کی جانب متوجہ ہوا، جن کی خودسری اور سرکشی سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ تھی، خصوصاً ینی چری کا تمرد سلطان اور رعایا دونوں کے لیے یکساں طور پر تشویش ناک تھا، ۱۶۲۱ء میں عثمان نے پولینڈ سے جنگ چھیڑ دی جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس کی فوج کی قوت بھی کچھ کم زور ہو جائے، یہ مقصد ایک حد تک پورا تو ہوا اور سلطانی فوجوں کو جزوی کامیابی کے بعد کافی نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا لیکن اس جنگ کے نتیجہ سے عثمان کے خلاف ایک عام برگشتگی پیدا ہوگئی، بجائے اس کے کہ وہ رعایا کو اپنا موافق بنانے کی کوشش کرتا، اس نے قوانین و ضوابط میں نامناسب تبدیلیاں اور سختیاں نافذ کر کے اور زعمائے سلطنت کو اپنے برتاؤ سے ناخوش کر کے ہر طبقہ کے لوگوں کو بے زار کر دیا، ۱۶۲۲ء میں اس نے سفر حج کا ارادہ ظاہر کیا لیکن یہ پوشیدہ نہ تھا کہ اس کا اصلی مقصد دمشق پہنچ کر کردوں اور دوسرے سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کرنا ہے جسے جدید طرز پر منظم کر کے وہ ینی چری اور سپاہی کی بیخ کنی کے لیے قسطنطنیہ لانا چاہتا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا تو سلطنت کی بیشتری خرابیاں دور ہو جاتیں لیکن اس قسم کی مہم کے لیے جیسی رازداری اور قوت عمل کی ضرورت تھی، عثمان اس سے خالی تھا، ینی چری کو اس کے اصلی مقصد کا علم ہو گیا اور انہوں نے برافروختہ ہو کر سلطان کو اس سفر سے روک دیا اور پھر موجودہ وزیروں کے قتل کا مطالبہ کیا،

عثمان کے پاس نہ کوئی ایسی فوج تھی جو ینی چری کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرتی اور نہ رعایا میں کوئی طبقہ اس کا ہمدرد تھا، جس سے وہ مدد طلب کر سکتا، خود سابق سلطان مصطفیٰ کی والدہ بھی باغیوں کی طرف دار تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اگر یہ بغاوت فرو ہوگئی تو عثمان اپنی ذات کو محفوظ کرنے کی غرض سے اپنے تمام اعزہ کو جس میں مصطفیٰ سب سے پہلے تھا، قتل کرا دے گا، فوج کے مطالبات بڑھتے ہی گئے اور باغیوں نے وزراء سے گزر کر خود سلطان کی ذات پر حملہ شروع کیا، چنانچہ انہوں نے عثمان کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور مصطفیٰ کو رہا کر کے دوبارہ تخت سلطنت پر بیٹھایا، داؤد پاشا جس کو اس بغاوت میں بہت زیادہ دخل تھا، صدر اعظم کے عہدہ پر متمکن ہوا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ مبادا کوئی انقلاب پھر پیش آئے، لہذا اس خطرہ کو ہمیشہ کے لیے رفع کرنے کی غرض سے وہ اپنے تین ساتھیوں کو لے کر عثمان کے قید خانہ میں داخل ہوا اور نہایت بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ اسے پھانسی دے کر ختم کر دیا۔

عثمان کا خون تھوڑے ہی دنوں کے بعد رنگ لایا اور خود ینی چری میں قاتلوں کے خلاف برہمی پیدا ہوئی، مصطفیٰ نے بھی اس حادثہ پر رنج وغم کا اظہار کیا اور قاتلوں کی سزا کا حکم نافذ کیا، تاہم حکومت میں جو انتشار پیدا ہو چکا تھا وہ بدستور قائم رہا اور مصطفیٰ کی نااہلی میں ذرا بھی فرق ظاہر نہ ہوا، اس کی ماں سلطانہ والدہ اصلی فرماں روا تھی، سلطنت کے اعلیٰ عہدوں کے لیے ہر امیدوار رشوت کے ذریعہ سے ینی چری اور ''سپاہی'' فوجوں کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا، قسطنطنیہ میں بدامنی اور شورش یہاں تک بڑھی کہ خود فوج پر بھی اس کا اثر پڑا اور اس نے عاجز آ کر وزرائے سلطنت کی یہ خواہش منظور کر لی کہ مصطفیٰ کی معزولی کے بعد نئے سلطان کی تخت نشینی کے موقع پر وہ اپنے دستوری انعامات کا مطالبہ نہ کرے گی، چنانچہ اگست ۱۶۲۳ء میں مصطفیٰ دوسری مرتبہ معزول کیا گیا اور سلطان عثمان کا بھائی شہزادہ مراد جس کی عمر صرف بارہ سال تھی، تخت پر بیٹھایا گیا۔

مصطفیٰ کے دوسرے دور حکومت کا قیام ایک سال سے کچھ ہی زائد رہا لیکن یہ قلیل

مدت میں بھی سلطنت کے لیے نہایت مضرت رساں ثابت ہوئی، اسی دوران میں ایران سے جنگ پھر چھڑ گئی تھی اور بغداد و بصرہ دونوں سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل گئے، اباظا پاشا والی ارض روم مقتول سلطان کے خون کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور تمام ایشیائے کوچک میں بغاوت برپا کر دی، وہ ینی چری کا خاص طور پر دشمن تھا اور اس نے اس خود سر فوج کو بھی عاجز کر دیا، اس عام خانفشار اور بدنظمی میں سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا، رعایا کا حال حد درجہ خراب تھا، وہ ہر طرح کی سختیوں اور تباہیوں کی شکار تھی، مرکزی حکومت بالکل کمزور ہو گئی تھی اور رشوت ستانی کا اثر سلطنت کے ہر شعبہ میں نمایاں تھا، اگر اس وقت یورپ کی کوئی مضبوط طاقت حملہ کر دیتی تو سلطنت عثمانیہ کے لیے اس کا مقابلہ دشوار ہو جاتا لیکن یورپ کی حکومتیں خود باہمی جنگ اور خانگی انتشار میں مبتلا تھیں اور ان میں دولت عثمانیہ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی قوت نہ تھی۔

پہلا برطانوی سفیر: ۱۶۲۲ء میں سرطامس رو برطانیہ کے سب سے پہلے سفیر کی حیثیت سے باب عالی میں آیا، یہ شاہ جیمس اول کا فرستادہ تھا اور اس کی سفارت کا خاص مقصد ان بحری قزاقوں کے خلاف احتجاج کرنا تھا، جو الجزائر اور تونس کے برطانوی جہازوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے، وہ پانچ سال تک قسطنطنیہ میں مقیم رہا اور کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوا، اس نے اپنے دوران قیام میں سلطنت عثمانیہ کے اختلال و زوال سے متعلق واقعات اور حالات قلم بند کیے ہیں، ان سے مبالغہ کا حصہ نکال دینے کے بعد بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سترہویں صدی کے ابتدائی دور میں سلطنت کی زبوں حالی کس حد کو پہنچ گئی تھی۔

مراد رابع

۱۰۳۲ھ تا ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۲۳ء تا ۱۶۴۰ء

سلطان مراد رابع صرف بارہ سال کی عمر میں ۱۰/ ستمبر ۱۶۲۳ء کو تخت نشین ہوا لیکن اس نو عمری میں بھی اس نے جس قوت ارادی کا اظہار کیا اس سے وزراء کو اندازہ ہو گیا کہ عنان حکومت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں آئی ہے جو سلطنت کی تمام بد نظمیوں کو اپنی سطوت و جبروت سے دور کر دے گا، ترک مؤرخ اولیا کا بیان ہے کہ:

> "تخت نشینی کے بعد جب سلطان مراد خزانہ میں داخل ہوا تو میرا باپ درویش محمد اس کے ساتھ تھا، خزانہ میں طلائی اور نقرئی ظروف میں سے کچھ بھی باقی نہ تھے، صرف چند ہزار پیاستر[1] اور الماریوں میں چند مونگے اور چینی کے برتن رہ گئے تھے، بادشاہ نے سجدہ کیا اور پھر کہا کہ ان شاء اللہ میں اس خزانہ کو ان ہی لوگوں کی جائیداد سے پر کر دوں گا جنہوں نے اسے لوٹا ہے[2]۔"

سلطانہ والدہ | مراد کی نوعمری کے باعث سلطنت کا انتظام ابتداءً اس کی والدہ سلطانہ ماہ پیکر کے ہاتھ میں تھا، جو نہایت دانش مند اور مدبر خاتون تھی، سلطانہ والدہ کی قابلیت اس وقت سلطنت کے لیے بے حد اہم اور مفید ثابت ہوئی، خطرات اور تباہیوں کے بادل ہر طرف گھرے ہوئے تھے، سلطنت کے ہر حصہ سے تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں، سرحد پر ایرانی

---

[1] چھوٹے نقرئی سکے [2] کریسی، ج ۱، ص ۴۰۲۔

فوجیں فتح یاب تھیں، باظا پاشا اپنی بغاوت میں کام یاب ہو کر ایشیائے کوچک کا حاکم بنا ہوا تھا، لبنان کے لوگ علانیہ باغی ہو گئے تھے، مصر اور دوسرے صوبوں کے والی بھی اپنی فرماں برداری میں متزلزل تھے، الجزائر، تونس اور طرابلس کی حکومتیں خود مختار ہو چکی تھیں اور بہ اختیار خود یورپ کی حکومتوں سے معاہدے کر رہی تھیں، روسی قزاقوں کے حملے اور ان کی تباہ کاریاں نہ صرف بحر اسود کے ساحل پر جاری تھیں بلکہ انہوں نے باسفورس میں داخل ہو کر قسطنطنیہ کے ملحق علاقہ میں بھی لوٹ مار شروع کر دی تھی، خود پایہ تخت میں خزانہ خالی تھا، سلح خانہ کا سامان تقریباً ختم ہو چکا تھا، رعایا فاقہ کشی میں مبتلا تھی اور فوج کی سرکشی اور بے راہ روی حد کو پہنچ چکی تھی، ان حالات کے باوجود جب کہ بدامنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور خود مراد کی زندگی خطرہ سے خالی نہ تھی، سلطانہ والدہ نے اپنے تدبر اور اعلیٰ قابلیت سے سلطنت کو نہ صرف سنبھالے رکھا بلکہ رفتہ رفتہ فوج اور وزراء پر کچھ قابو بھی حاصل کر لیا، یہاں تک کہ مراد نے تخت نشینی کے نویں سال زمام حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور پھر وہ تمام خرابیاں جو سلطنت کو تباہ و برباد کر رہی تھیں، نہایت سرعت کے ساتھ دور ہونے لگیں۔

فتنۂ بغداد مراد کی کم سنی کے زمانہ میں عباس صفوی شاہ ایران کو اپنی سلطنت کے وسیع کرنے کا موقع مل گیا، بکیر آغا نے جو بغداد کا کوتوال تھا، وہاں کے والی کو قتل کر کے شہر پر خود قبضہ کر لیا، دولت علیہ نے اس کے مقابلہ میں حافظ پاشا کو روانہ کیا اور اس نے بغداد کا محاصرہ کر لیا، بکیر آغا نے شاہ عباس کو دعوت دی اور لکھا کہ اگر آپ مجھے یہاں کا والی مقرر کر دیں تو میں شہر آپ کے حوالے کر دوں، شاہ عباس نے یہ شرط منظور کر لی اور فوراً فوج لے کر روانہ ہوا، اس درمیان میں بکیر آغا نے حافظ پاشا سے بھی یہی گفتگو کی اور حافظ پاشا نے بھی اس کی یہ شرط منظور کر لی، چنانچہ اس معاہدہ کے مطابق ترکی فوجیں بغداد میں داخل ہو گئیں، اس کے بعد شاہ عباس نے بغداد پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا، تین ماہ تک محاصرہ جاری رہا، بکیر آغا نے پھر وہی پہلی شرط شاہ عباس کے سامنے پیش کی اور شاہ عباس کی منظوری حاصل کرنے کے بعد

ترکوں سے غداری کر کے ایرانی لشکر کو شہر کے اندر داخل کرا دیا، ۱۶۲۳ء میں شاہ عباس نے بغداد پر قبضہ کر لینے کے بعد بکیر آغا کو اس غداری کے صلہ میں قتل کرا دیا۔ (فریڈیک، ص ۱۲۵)

صدر اعظم کمانکش علی پاشا کے مخالفوں نے بغداد کی شکست کی ذمہ داری اسی کے سر عائد کی اور مراد کو مجبور کر کے اسے قتل کرا دیا، اس کے بعد چرکس محمد پاشا صدر اعظم مقرر ہوا لیکن وہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد مر گیا، ۱۶۲۴ء میں یہ عہدہ حافظ احمد پاشا کو تفویض ہوا، اسی سال اس نے بغداد پر فوج کشی کر کے اس کا محاصرہ کر لیا، جو بہت دنوں تک قائم رہا لیکن محصورین کے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور ینی چری نے گھبرا کر محاصرہ جاری رکھنے سے انکار کر دیا، مجبوراً حافظ پاشا محاصرہ اٹھا کر دیار بکر چلا آیا، یہاں پہنچ کر ینی چری نے پھر بغاوت کی، جس کی وجہ سے حافظ پاشا معزول کر دیا گیا اور خلیل پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، خلیل پاشا نے اباظا پاشا کو مطیع بنانے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ ناکام رہا اور اس کے مخالفوں نے دوسرے ہی سال اسے بھی معزول کرا دیا، اس کی جگہ خسرو پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، اس نے ارض روم پر فوج کشی کر کے اباظا پاشا کو مطیع کیا اور ۱۶۲۸ء میں اسے بوسنیا کا والی مقرر کیا، اس درمیان میں قسطنطنیہ کی شورش برابر بڑھتی رہی، دار السلطنت پر تمام تر سرکش ینی چری اور سپاہی فوجوں کا قبضہ تھا، عہدہ داروں کا تقرر اور معزولی ان ہی کی مرضی پر تھی اور وزرائے سلطنت میں سے جو وزرا بھی ان کی مخالفت کرتا قتل کر دیا جاتا۔

ایران پر چڑھائی ۱۶۲۸ء میں شاہ عباس صفوی نے وفات پائی اور اس کا نو عمر لڑکا شاہ مرزا تخت نشین ہوا، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خسرو پاشا نے ایران پر فوج کشی کی اور ۱۶۳۰ء میں ہمدان میں داخل ہو گیا، ہمدان فتح کرنے کے بعد وہ بغداد کی طرف بڑھا، درمیان میں کئی بار ایرانیوں نے مقابلہ کیا لیکن خسرو پاشا نے ہر مرتبہ انہیں شکست دی، بغداد پہنچ کر اس نے شہر کا محاصرہ کر لیا، مگر تھوڑے دنوں کے بعد فوج نے لڑنے سے انکار کر دیا اور اسے نومبر ۱۶۳۰ء میں محاصرہ اٹھا کر مجبوراً واپس آنا پڑا، محاصرہ اٹھا لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خسرو پاشا

معزول کر دیا گیا اور حافظ پاشا دوبارہ صدر اعظم مقرر ہوا۔

خونِ شہید | یوں تو ینی چری اور سپاہی فوجوں کی خود سری بارہا بغاوت کے مناظر پیش کر چکی تھی لیکن فروری ۱۶۳۲ء میں انہوں نے جس سرکشی کا ثبوت دیا وہ مراد کے لیے جس نے اسی سال انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لیا تھا، ایک نہایت تلخ تجربہ تھا، ان باغیوں نے بغداد کی مہم سے ناکام لوٹنے کے بعد رجب پاشا کے بھڑکانے سے ایک روز قصر سلطانی کے سامنے جمع ہو کر صدر اعظم حافظ پاشا، مفتی اعظم یحییٰ، دفتر دار مصطفیٰ اور سلطان کے چند دوسرے معتمد عہدہ داروں کے قتل کا مطالبہ نہایت گستاخی اور اصرار کے ساتھ پیش کیا، مراد نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے، بلکہ انہوں نے اسے یہ دھمکی دی کہ اگر وہ ان کے مطالبات منظور نہ کرے گا تو اس کا نتیجہ خود اس کے حق میں بہت برا ہوگا، آخر کار مراد نے نہایت مجبور ہو کر حافظ پاشا کو بلایا اور اس سے باغیوں کے مطالبہ کا ذکر کیا، حافظ پاشا نے جواب دیا ''میرے بادشاہ! حافظ جیسے ایک ہزار غلاموں کی جان تجھ پر نثار، میری استدعا صرف یہ ہے کہ تو مجھے اپنے ہاتھ سے قتل نہ کر، بلکہ ان ہی لوگوں کے سپرد کر دے تاکہ مجھے شہادت حاصل ہو اور میرے خون کا وبال ان کے سروں پر آئے''

اس کے بعد **بسم اللہ الرحمن الرحیم لاحول ولاقوۃ الّا باللہ العلی العظیم انا للہ وانا الیہ راجعون** کہتا ہوا نہایت دلیری کے ساتھ وہ باغیوں کی طرف بڑھا، مراد اس منظر کو دیکھ کر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا، وزرائے سلطنت بھی جو اس موقع پر موجود تھے، اشک بار آنکھوں سے اس خونیں تماشا کو دیکھ رہے تھے، جوں ہی حافظ پاشا آگے بڑھا، باغی خوں خوار درندوں کی طرح اس پر جھپٹے، حافظ پاشا نے پہلے حملہ آور کو ایک ہی وار میں ختم کر دیا، یہ دیکھ کر بقیہ سپاہی اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے خنجروں سے ہلاک کر ڈالا، ایک ینی چری سپاہی نے اس کے سینہ پر چڑھ کر اس کا سر کاٹ ڈالا، جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو لیے تو مراد نے کہا ''خدا کی مرضی پوری ہو لیکن اے خوں خوار انسانو! جو وقت اس نے مقرر کر دیا ہے، اس

وقت ضرور تم سے اس کا انتقام لیا جائے گا، تمہیں نہ خدا کا خوف ہے نہ رسول ﷺ کی شریعت کا احترام" لیکن باغیوں پر اس وقت اس دھمکی کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

فکر انتقام: دو مہینے کے اندر بہت سے دوسرے بے گناہ باغیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، خود مراد کی معزولی کے مسئلہ پر بھی فوج میں علانیہ گفتگو ہوتی تھی اور مراد کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ اس کے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہیں، یا تو وہ اپنے عزل و قتل کے لیے تیار ہو جائے یا پھر باغیوں کی بیخ کنی کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے، خوش قسمتی سے فوج میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو اپنے ساتھیوں کی سرکشی اور بے راہ روی سے نہایت بے زار تھے، ان لوگوں نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی حمایت کا وعدہ کیا، چنانچہ خفیہ طور پر ایک دلیر اور جان باز دستہ جس پر ہر حال میں اعتماد کیا جا سکتا تھا، رفتہ رفتہ تیار کر لیا گیا، ینی چری اور سپاہی دستہ کا باہمی افتراق وحسد بھی سلطان کے مقصد میں بہت کچھ معین ہوا اور اس نے ان کی نزاع سے کافی فائدہ اٹھایا، اس نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اس شورش کے اصلی بانی رجب پاشا کو دفعۃً خفیہ طور پر قتل کرا دیا، اس کے بعد پھر وہ باغیوں کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوا، ۲۹ مئی ۱۶۳۲ء کو اس نے ایک دیوان عام منعقد کیا جس میں مفتی اعظم، وزرائے سلطنت، اکابر علما اور وہ فوجی سردار جنہوں نے باغیوں کے خلاف سلطان کی اطاعت کا حلف لیا تھا، حاضر تھے، سواروں کے چھ دستے بھی جن کی وفاداری پر اعتماد کیا جا سکتا تھا، مستعد کھڑے تھے، مراد نے پہلے ینی چری دستوں کو اپنے سامنے بلا کر ان کی وفاداری پر اطمینان ظاہر کیا اور کہا کہ مجھے امید ہے تم باغیوں کو سزا دینے میں میرا ساتھ دو گے، ینی چری دستوں نے با آواز بلند اعلان کیا کہ بادشاہ کے دشمن ہمارے دشمن ہیں اور قرآن پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ ہم سلطنت کی کامل اطاعت کریں گے، اس کے بعد مراد "سپاہیوں" کے وفد کی طرف متوجہ ہوا، جو ینی چری فوج کے اس جوش کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے، اس نے ان کی سرکشی پر ملامت کی، "سپاہیوں" نے ادب کے ساتھ معذرت پیش کی کہ گو سلطان کی شکایتیں بجا ہیں تاہم وہ خود

ذاتی طور پر دولت عثمانیہ کے مطیع اور وفادار ہیں، البتہ اپنے ماتحتوں کی اطاعت پر قابو نہیں رکھتے مراد نے جواب دیا کہ اگر تم وفادار ہو تو وہی حلف لو جو تمہارے بھائی ینی چری دستوں نے ابھی لیا ہے اور اپنے دستوں سے باغیوں کے سرداروں کو گرفتار کر کے میرے حوالے کردو" سپاہی افسروں نے خوف زدہ ہو کر اطاعت کا حلف لے لیا، اس کے بعد مراد نے قضاۃ سلطنت کو مخاطب کر کے ان کے فیصلوں کی جانب داری پر انہیں ملامت کی، جس پر ایشیا کے ایک عربی افضل قاضی نے کھڑے ہو کر نہایت بے خوفی کے ساتھ عرض کیا "میرے بادشاہ! ان تمام باتوں کا علاج صرف تلوار کی دھار ہے" اس قاضی کا یہ اعلان لکھ لیا گیا اور پھر سلطان، وزرائے سلطنت، مفتی اعظم اور تمام حاضرین نے متفقہ طور پر ایک محضر پر اپنے دستخط کیے، جس کا مضمون یہ تھا کہ وہ بدامنی اور شورش کو دور کرنے کی حتی الوسع پوری کوشش کریں گے۔

شدتِ انتقام مراد نے اسی روز سے اپنی آزاد حکومت شروع کر دی، باغیوں کے تمام سردار اور وہ سب لوگ جن کو مراد اس بغاوت میں شریک سمجھتا تھا، قتل کر دیے گئے، قسطنطنیہ کے علاوہ صوبوں میں بھی باغیوں کا استیصال یوں ہی کیا جانے لگا اور مہینوں تک قتل و خوں ریزی کا سلسلہ جاری رہا، خفیف سے شبہ پر بھی بڑے بڑے عہدہ دار فوراً قتل کر دیے جاتے، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر سلطنت کے ہر شعبہ کی تمام خرابیاں دور ہو گئیں اور فوج کی سرکشی کا خاتمہ ہو گیا، سلطنت کے طول و عرض میں امن و امان قائم ہو گیا اور عدل و انصاف کی حکومت نظر آنے لگی۔

ایشیائے کوچک کی بغاوت ۱۶۲۳ء ہی میں فرو ہو چکی تھی اور مراد نے اباظہ پاشا کی جان بخشی کر کے اسے بوسنیا کا والی مقرر کر دیا تھا لیکن ینی چری کو مطیع کرنے کے بعد اس نے اباظہ پاشا کو قسطنطنیہ بلا کر اس فوج کا حاکم بنا دیا، کچھ دنوں تک تو اباظہ پاشا مراد کے حسب اطمینان کام کرتا رہا لیکن پھر اپنی کسی بات سے اس کو ناخوش کر دیا جس کی پاداش میں قتل کر دیا گیا (۱۶۳۴ء)۔

مفتی اعظم کا قتل

۱۶۳۳ء میں مراد ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا لیکن وہ نائیکومیڈیا سے تھوڑی ہی دور آگے بڑھا تھا کہ اس نے وہاں کے قاضی کو کسی جرم میں قتل کرا دیا، اس قتل سے دارالسلطنت کے علماء کی جماعت میں بڑی برہمی پیدا ہوئی اور اس جماعت کے سرداروں نے مراد کے خلاف کہنا شروع کیا، سلطانہ والدہ نے اس کی اطلاع مراد کو دی، وہ فوراً قسطنطنیہ واپس ہوا اور آتے ہی مفتی اعظم کو قتل کرا دیا، تاریخ آل عثمان میں سلطان کے حکم سے کسی مفتی اعظم کے قتل کی یہ پہلی اور آخری مثال ہے، اس قتل کے بعد علماء کی شورش بالکل فرو ہوگئی۔

اریوان کی فتح

۱۶۳۵ء میں مراد پھر اپنی مہم پر روانہ ہوا، اس مرتبہ اس کا مقصد صرف ایشیائی صوبوں کا معائنہ کرنا نہ تھا بلکہ ان مقامات کو فتح کرنا بھی مقصود تھا جو پہلے عثمانی مقبوضات میں شامل تھے، چنانچہ اسی سال اس نے اریوان فتح کرلیا، یہ شہر پہلے سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں رہ چکا تھا۔

بغداد کی فتح

۱۶۳۸ء میں مراد اپنے عہد کی آخری اور سب سے بڑی مہم پر روانہ ہوا، بغداد پندرہ سال سے ایرانیوں کے قبضہ میں تھا اور باوجود کئی محاصروں کے ترک اسے واپس لینے میں کامیاب نہ ہوسکے تھے، اسے اول اول سلطان سلیمان اعظم نے فتح کرکے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا تھا لیکن مراد کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال جب کہ بغاوتوں اور بدنظمیوں کے باعث سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا تھا، شاہ عباس صفوی نے بکیر آغا کی غداری سے فائدہ اٹھا کر اس پر قبضہ کرلیا تھا، اب ۱۶۳۸ء میں مراد اس سابق مقبوضہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوا، ۱۵؍ نومبر ۱۶۳۸ء کو عثمانی فوجوں نے بغداد پہنچ کر شہر کا محاصرہ کرلیا، محصورین جن کی تعداد تیس ہزار تھی، نہایت دلیری اور جاں بازی سے مقابلہ کرتے رہے لیکن ترکوں کی تعداد، ان کی فوجی تنظیم اور سب سے بڑھ کر خود مراد کی غیر معمولی شجاعت تمام مدافعت پر غالب آئی، دوران محاصرہ میں مراد معمولی سپاہیوں کے دوش بدوش کھائیوں میں کام کرتا تھا

اور ان کی ہمت قائم رکھنے کے لیے وہ ہر کام میں ان کا شریک رہتا تھا، جب ایرانیوں نے دیکھا کہ وہ کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکیں گے تو ایک روز انہوں نے اپنے سب سے بڑے پہلوان اور بہادر کو باہر نکال کر ترکوں کو چیلنج دیا کہ وہ بھی دست بہ دست لڑائی کے لیے اپنی فوج کے سب سے بڑے بہادر کو آگے بڑھائیں، یہ چیلنج سن کر مراد خود اس ایرانی پہلوان کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا اور دیر تک شمشیر زنی کے جوہر دکھا کر ایک تیغہ ایسا مارا کہ ایرانی کا سر کٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا، مراد اپنی جسمانی قوت اور حربی قابلیت کے لحاظ سے تمام عثمانی لشکر میں کوئی حریف نہیں رکھتا تھا، بہر حال ۲۲ر دسمبر ۱۶۳۸ء کو ترکی توپوں نے فصیل شہر میں آٹھ سو گز چوڑا ایک رخنہ پیدا کر دیا اور اس وقت سے دونوں فوجوں کا اصل مقابلہ شروع ہوا ترک شہر میں داخل ہونے کے لیے دوڑے لیکن ایرانیوں نے اپنی قابل داد جاں بازی سے دو روز تک انہیں اندر قدم رکھنے سے روکے رکھا، بالآخر (۲۵ر دسمبر ۱۶۳۸ء) تیسرے روز صدر اعظم طیار محمد پاشا فوج لے کر آگے بڑھا اور گو وہ خود گولی کھا کر گرا تاہم ترک گولیوں کی باڑھ سے بے خوف ہو کر لڑتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے، بارہ سو سواروں کا ایک دستہ بغداد کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر مراد فروری ۱۶۳۹ء میں قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا اور ۱۰ر جون ۱۶۳۹ء کو نہایت شان وشوکت کے ساتھ دار السلطنت میں داخل ہوا قسطنطنیہ اس سے قبل سلاطین عثمانیہ کی اسی فاتحانہ واپسی بارہا دیکھ چکا تھا لیکن سلطان مراد رابع کا یہ داخلہ اس قسم کا آخری داخلہ تھا، اس کے بعد پھر کوئی سلطان فتوحات حاصل کر کے پایہ تخت میں نہیں آیا۔

ایران سے صلح ۱۵ر ستمبر ۱۶۳۹ء کو ایران اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوا، جس کی رو سے اریوان ایرانیوں کو واپس کر دیا گیا لیکن بغداد اور اس کے ملحق علاقہ پر عثمانیوں کا قبضہ باقی رہا۔

وفات ۹ر فروری ۱۶۴۰ء کو مراد نے اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پائی، بغداد سے واپس آنے کے بعد سب سے پہلے اس نے سلطنت کی بحری قوت کو جو بہت کچھ کمزور ہو گئی

تھی، درست کرنے کی کوشش کی اور البانیا اور اس کے قریبی اضلاع میں بغاوت کی جو شورش اس کی ایشیائی مہم کے زمانہ میں پیدا ہوگئی تھی، اسے دور کیا، لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی آئندہ جنگ وینس سے ہوگی اور اس نے اس جنگ کے لیے تیاریاں شروع بھی کر دی تھیں لیکن اسی دوران میں وہ بخار میں مبتلا ہوگیا جس سے جاں بر نہ ہو سکا، موت سے پہلے اس نے اپنے بھائی ابراہیم کے قتل کا حکم دیا، ابراہیم مراد کے بعد سلطنت کا تنہا وارث تھا، سلطانہ والدہ نے اس کی حکم کی تعمیل نہ ہونے دی اور مراد کے پاس کہلا بھیجا کہ ابراہیم اس کی خواہش کے مطابق قتل کر دیا گیا، مراد اس وقت حالت نزع میں تھا، قتل کی اطلاع پا کر وہ مسکرایا اور پھر فوراً ہی ختم ہوگیا۔

ذاتی اوصاف: سلطان مراد رابع آل عثمان کا آخری جنگجو اور فاتح فرماں روا تھا، اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی اور صرف اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پا گیا لیکن اس قلیل مدت اور نوعمری میں اس نے سلطنت عثمانیہ کو، جس کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا تھا اور جو فوج کی بغاوت، صوبے داروں کے تمرد اور ہر شعبہ کے انتشار کے باعث تباہی اور بربادی سے بالکل قریب پہنچ گئی تھی، تمام خرابیوں اور فسادات سے پاک کر کے از سر نو ایک تازہ زندگی بخش دی، وہ حد درجہ متشدد اور سخت گیر تھا لیکن اس کا تشدد اور اس کی سخت گیری سلطنت کی بقا کے لیے ضروری تھی، اس کا احتساب بعض اوقات ظلم کی حد تک پہنچ جاتا تھا اور سیکڑوں بے گناہ محض شبہ کی بنا پر اس کے حکم سے قتل کر دیے گئے لیکن ایسی حالت میں کہ تمام سلطنت میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک حکومت کا کوئی شعبہ فساد سے پاک نہ تھا، ان بے گناہوں کا خون بھی بہر حال مفید ہی ثابت ہوا، یہ اسی سختی کا نتیجہ تھا کہ فوج کی باغیانہ سرکشی یک قلم موقوف ہوگئی، عدالتوں میں انصاف ہونے لگا، رعایا کو لگان وصول کرنے والوں کی تعدی کی شکایت باقی نہ رہی اور ملک میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک امن عام اور خوش حالی ہی کے مناظر نظر آنے لگے۔

ابراہیم

۱۰۴۹ھ تا ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۰ء تا ۱۶۴۸ء

سلطان مراد رابع کے بعد اس کا بھائی ابراہیم جو سلطنت عثمانیہ کا تنہا وارث رہ گیا تھا، تخت نشین ہوا، تھوڑے ہی دنوں میں اس نے مراد کے تمام کارناموں پر پانی پھیر دیا، آٹھ سال تک محل میں قید رہنے کی وجہ سے حکومت کی جو تھوڑی بہت اہلیت اس میں پہلے تھی، وہ بھی جاتی رہی اور تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو صرف عیش پرستی کی نذر کر دیا، قتل وخوں ریزی میں وہ بھی مراد ہی کی طرح بے باک تھا لیکن مراد نے اپنے سامنے مفادِ سلطنت کا جو مقصد رکھا تھا، ابراہیم کے تشدد کو اس سے دور کا تعلق بھی نہ تھا، اس کی سخت گیری تمام تر اپنے ذاتی اغراض کے لیے تھی، اس نے وہ تمام خزانہ جو مراد نے حسن تدبیر کا کفایت شعاری سے جمع کیا تھا، حرم کے تعیشات پر صرف کر ڈالا، وہ تمام برائیاں جو سلطنت کو برباد کر رہی تھیں اور جن کا استیصال مراد نے اپنی حکومت کا واحد مقصد قرار دیا تھا، ابراہیم کے عہد میں از سرِ نو پیدا ہو گئیں اور نہایت سرعت کے ساتھ بڑھنے لگیں، امور سلطنت میں حرم کا دخل پھر شروع ہو گیا، کچھ دنوں تک تو صدر اعظم قرہ مصطفیٰ نے ابراہیم کو سنبھالنے کی کوشش کی اور مالیات کا انتظام درست رکھنا چاہا لیکن سلطنت کے لیے اس کی خیر خواہی خود اس کے حق میں مہلک ثابت ہوئی اور اس کے مخالفوں نے حرم سلطانی کے ساتھ سازش کر کے ابراہیم کو اس کے قتل پر آمادہ کر دیا، قرہ مصطفیٰ کے قتل کے بعد اس کے جانشین سلطان

زادہ پاشا نے ابراہیم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے ہر فعل کو سراہنا شروع کیا اور اسے یقین دلایا کہ چوں کہ وہ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہے، اس کا ہر قول و فعل حقیقۃً الہام ربانی کے مطابق ہوتا ہے، ابراہیم اب پہلے سے بھی زیادہ آزاد ہو گیا، مراد کا جمع کیا ہوا خزانہ جب اس کی ضروریات عیش پوری نہ کر سکا تو اس نے سلطنت کے تمام بڑے بڑے عہدوں کو جن میں فوجی عہدے بھی شامل تھے، فروخت کرنا شروع کیا اور ان عہدوں پر وہی امیدوار مقرر کیے جانے لگے جو بڑی سے بڑی رقم پیش کر سکتے تھے، قدیم محصولوں کے علاوہ متعدد جدید محصول بھی عائد کیے گئے جن میں سے بعضوں کے نام ہی سے ان کی مضحکہ خیز ضرورت ظاہر ہوتی ہے، ابراہیم کو خوش بو خصوصاً عنبر کا بہت شوق تھا، اس شوق کو پورا کرنے کے لیے اس نے ایک ''عنبر ٹیکس'' نافذ کیا، اسی طرح اسے سمور کا بھی بہت شوق تھا اور اس کے لیے بھی اس نے ایک خاص ٹیکس جاری کیا جس کا نام ''سمور ٹیکس'' تھا، اس نے سلطنت کے تمام والیوں اور بڑے بڑے عہدہ داروں کے نام جاری کیے کہ ایک متعین تعداد سمور کی فراہم کر کے قسطنطنیہ روانہ کی جائے، یہ مطالبہ قاضیوں اور فوجی افسروں سے بھی کیا گیا، ان جدید محصولوں سے تمام سلطنت میں ایک عام برہمی پیدا ہو گئی، حرم کے اخراجات اور تعیشات کے لیے جب یہ رقمیں بھی ناکافی ثابت ہوئیں تو ابراہیم نے مختلف حیلوں سے بعض بڑے بڑے آدمیوں کی موروثی جائدادوں کو ضبط کر کے فروخت کر ڈالا، رعایا کے صبر و تحمل کا پیمانہ اب لب ریز ہو رہا تھا اور وہ بغاوت کے لیے بالکل آمادہ تھی، ابراہیم نے اپنی بے راہ روی سے ہر طبقہ کو بے زار کر دیا تھا، فوج، علماء کی جماعت اور پایہ تخت کا ہر طبقہ بغاوت کے لیے تیار تھا، چنانچہ ابراہیم کو معزول کرنے کے لیے ایک جماعت نے، جسے اکابر علماء کی حمایت حاصل تھی، کوشش شروع کی، اس سازش کے بانیوں میں ینی چری کے سردار پیش پیش تھے، باغیوں نے ابراہیم کے خلاف حسب ذیل فرد جرم قائم کی:

''بادشاہ نے اپنے جبر و تعدی سے عالم عثمانی کو تباہ کر دیا ہے، عنان سلطنت

عورتوں کے ہاتھوں میں ہے، خزانہ ان کے اخراجات پورا کرنے سے قاصر ہے، رعایا برباد ہوگئی ہے، کفار کی فوجیں سرحدی شہروں کا محاصرہ کر رہی ہیں، ان کے بحری بیڑے دردانیال کو روکے ہوئے ہیں۔"

ابراہیم کی معزولی غرض متفقہ طور پر ابراہیم کو تخت سے اتارنے کا فیصلہ کرلیا گیا، سلطانہ والدہ نے اس کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن بالآخر اسے بھی باغیوں کا مطالبہ منظور کرنا پڑا، چنانچہ ۱۸/رجب ۱۰۵۸ھ (۸/اگست ۱۶۴۸ء) کو فوجی سرداروں اور دارالسلطنت کے تمام بڑے بڑے عہدہ داروں نے شہزادہ محمد کو جس کی عمر اس وقت صرف سات سال کی تھی، تخت پر بٹھا کر اطاعت کا حلف لیا اور ابراہیم کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔

ابراہیم کا قتل ابراہیم کو قید میں صرف دس روز گزرے تھے کہ "سپاہی" فوج میں اس کی حمایت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور اسے معزول کرنے والوں کو اندیشہ ہوا کہ وہ پھر تخت پر بٹھا دیا جائے گا، اس خطرہ کو ہمیشہ کے لیے رفع کرنے کی غرض سے انہوں نے مفتی اعظم سے یہ استفتاء کیا: کیا ایسے فرماں روا کو معزول اور قتل کرنا جائز ہے جو سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ان لوگوں کو مقرر نہیں کرتا جو ان کے اہل ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو مقرر کرتا ہے جو ان عہدوں کو قیمتاً خریدتے ہیں، مفتی اعظم نے صرف ایک لفظ "ہاں" میں اس فتویٰ کا جواب دیا اور اس کے بعد ابراہیم فوراً قتل کر دیا گیا۔

ازف کی مہم ابراہیم کا مختصر عہد حکومت اندرونی اختلال کے باوجود بیرونی فتوحات کے لحاظ سے اہمیت سے خالی نہ تھا، اس عہد میں دو معرکے پیش آئے اور دونوں میں آخر کار دولت عثمانیہ کو فتح حاصل ہوئی، ان میں ایک ازف کی مہم تھی اور دوسری جزیرہ کریٹ کی۔ ازف کا شہر جو بحر ازف پر واقع ہے اور تجارتی اور حربی دونوں حیثیتوں سے بہت کچھ اہمیت رکھتا ہے، ابراہیم کی تخت نشینی سے چار سال قبل روسی قزاقوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا، ابراہیم کے پہلے صدر اعظم قرہ مصطفیٰ نے یہ دیکھ کر کہ بحر اسود کے شمالی حصہ میں ترکی قوت کو برقرار رکھنے

کی کس قدر ضرورت ہے، ۱۶۴۱ء میں ازف واں قزاقوں سے واپس لینے کے لیے ایک فوجی بیڑا روانہ کیا، قزاقوں نے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ترکوں کو مجبوراً واپس ہونا پڑا، دوسرے سال پھر ایک فوج روانہ کی گئی، جس کے ساتھ خان کریمیا، جو دولت علیہ کا باج گزار تھا، ایک لاکھ تاتاریوں کو لے کر شامل ہو گیا، قزاق اس زبردست فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور شہر چھوڑنے پر مجبور ہوئے لیکن روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے اس میں آگ لگا دی، ترکوں نے اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ از سر نو تعمیر کیا اور قلعہ بند کر کے اسلام پاشا کی ماتحتی میں چھبیس ہزار کا ایک دستہ متعین کر دیا۔

روس سے آویزش: قزاق برابر ترکی علاقوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، جس کے جواب میں تاتاری بھی روسی علاقوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے، چوں کہ قزاق سلطنت روس کی رعایا سمجھے جاتے تھے، اس لیے ان کے اس طرز عمل سے دولت علیہ اور روس کے درمیان اکثر شکایتیں پیدا ہوتی رہتی تھیں، زار روس ان قزاقوں کے فعل سے اپنی بریت ظاہر کرتا تھا، چنانچہ اس نے ایک خط سلطان کو لکھ کر یہی معذرت پیش کی کہ قزاق اس کے قابو سے باہر ہو گئے ہیں اور اپنے جرائم کی سزا سے بچنے کے لیے اتنے دور دراز مقامات میں چلے گئے ہیں کہ حکومت روس کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، مگر اس کو دولت علیہ سے یہ گلہ تھا کہ وہ روس کے خلاف تاتاریوں کی حمایت کرتی ہے، آخر کار سلطان نے وعدہ کیا کہ اگر زار ان قزاقوں کو قابو میں رکھے گا اور خراج کی رقم حسب دستور قدیم خان کریمیا کو ادا کرتا رہے گا تو ترکی فوج روس کے خلاف تاتاریوں کی حمایت نہ کرے گی لیکن زار اور سلطان کے اس معاہدہ کا کوئی خاص اثر ان کی رعایا پر نہ پڑا اور ابراہیم کے عہد میں قزاقوں اور تاتاریوں کی سرحدی جنگ کا سلسلہ برابر قائم رہا، ۱۶۴۶ء میں تاتاری ان قزاقوں اور روس کے صوبوں میں دور تک بھگا لے گئے اور وہاں سے تین ہزار قیدی گرفتار کر لائے، زار نے اس کے جواب میں ازف پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کی لیکن اس فوج کو کئی بار شکست ہوئی اور موسیٰ

پاشا نے چار سو قیدی اور آٹھ سو روسیوں کے سر مال غنیمت کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیے۔

اسلام گرائی، خان کریمیا روسیوں کا سخت دشمن تھا، اوائل ۱۶۴۸ء میں پولینڈ اور روس کے علاقوں پر حملہ کر کے ان ملکوں کی چالیس ہزار رعایا کو گرفتار کر لایا، پولینڈ اور روس نے اپنے سفراء باب عالی میں بھیجے اور خان کریمیا کے اس فعل کا تدارک چاہا، ابراہیم نے اپنے دو افسروں کو خان کے پاس بھیجا اور اس کو لکھا کہ ان مسیحی قیدیوں کو قسطنطنیہ روانہ کر دو تا کہ وہ سفراء کے حوالہ کر دیے جائیں، خان نے سلطان کا خط پڑھ کر خفگی سے جواب دیا، میں اور یہاں کے سب لوگ سلطان کے خادم ہیں لیکن اہل روس محض ظاہری طور پر صلح کے خواستگار ہیں، وہ صرف ہماری فتوحات سے دب کر صلح چاہتے ہیں، اگر ہم انہیں مہلت دیے دیتے ہیں تو وہ اناطولیہ کے ساحلوں کو تاراج کر ڈالیں گے، میں ایک سے زائد بار دیوان عالی سے عرض کر چکا ہوں کہ قریبی علاقہ میں دو مضبوط مقامات ایسے تھے جن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی لیکن جن پر قبضہ کر لینا ہمارے لیے دانش مندی کی بات ہوتی، مگر اب روسیوں نے ان مقامات پر قبضہ کر لیا ہے اور انہوں نے وہاں بیس سے زیادہ فوجی چوکیاں بنا لی ہیں، اگر ہم اس سال بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو وہ اکرمان پر بھی قبضہ کر لیں گے اور پھر تمام مولڈیویا کو فتح کر لیں گے" یہ جواب دے کر اس نے سلطان کے قاصدوں کو قسطنطنیہ واپس کر دیا۔

کریٹ کی مہم ۱۶۴۵ء میں ابراہیم نے ایک فوج کریٹ کی فتح کے لیے روانہ کی، یہ جزیرہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا، وینس اور دولت عثمانیہ کے درمیان اس وقت کوئی جنگ نہ تھی، کریٹ پر حملہ کرنے کا سبب یہ ہوا کہ مالٹا کے چند بحری قزاقوں نے ترکی تجارتی جہازوں کے ایک بیڑے کو جو قسطنطنیہ سے مصر جا رہا تھا، گرفتار کر لیا اور اسے لے کر کریٹ کے شمالی ساحل پر لنگر انداز ہوئے، ابراہیم اس واقعہ کی خبر پا کر نہایت برہم ہوا اور اس نے پہلے مالٹا ہی پر حملہ کرنا چاہا لیکن اس کے افسروں نے سمجھایا کہ مالٹا کی مہم جسے سلیمان اعظم

جیسا طاقتور سلطان بھی سر نہ کر سکا، آسان نہ ہوگی، اس لیے مالٹا کے بجائے کریٹ پر حملہ کرنا زیادہ مناسب ہے، کریٹ چوں کہ بحر یونان کے مدخل کے قریب نیز قسطنطنیہ اور مغربی ولایتوں (تونس والجزائر وغیرہ) کے راستہ پر واقع تھا، اس لیے اپنے موقع کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کے لیے بہ نسبت مالٹا کے زیادہ موزوں بھی تھا، پھر چوں کے مالٹ کے بحری قزاق عثمانی جہازوں کو گرفتار کر کے کریٹ ہی کے بندرگاہوں میں لنگر انداز ہوئے تھے، اس لیے جمہوریہ وینس کی گوشمالی بھی ضروری تھی، چنانچہ ایک جنگی بیڑا ۳۰/ اپریل ۱۶۴۵ء کو دردانیال سے روانہ ہوا، اعلان مالٹا پر حملہ کرنے کا ہوا لیکن امیر البحر کو خفیہ ہدایتیں کریٹ کے متعلق دی گئیں، ۲۴/ جون کو یہ بیڑا کریٹ کے مغربی بندرگاہ کانیا (Canea) میں پہنچ گیا، جمہوریہ وینس کو سلطان کے اصلی ارادہ کی اطلاع پہلے سے ہو چکی تھی، اس لیے کریٹ کے تمام قلعے مدافعت کے لیے تیار تھے، جزیرہ کی مقامی فوجیں اکٹھا کر لی گئی تھیں اور وینس سے کمک بھی آ گئی تھی، پھر بھی ساحل کی حفاظت کے لیے یہ فوجیں ناکافی ثابت ہوئیں اور ترکوں نے آسانی کے ساتھ کانیا پر قبضہ کر لیا، دوسرے سال انہوں نے ریٹنو (Retino) کو بھی لے لیا، ان دونوں شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد عثمانی فوج جزیرہ میں داخل ہوئی اور پھر ۱۶۴۸ء میں کریٹ کے پایہ تخت کینڈیا (Candia) کا محاصرہ شروع ہوا جو تقریباً اکیس سال تک جاری رہا، اہل وینس نے کینڈیا کے بچانے کی حتی المقدور پوری کوشش کی، انتقاماً انہوں نے لیمناس (Lemnos) اور ٹینڈاس (Tenedos) کے جزیروں پر جو عثمانی مقبوضات تھے، قبضہ کر لیا اور قسطنطنیہ کے ساحلی علاقوں پر کئی بار چھاپے مارے لیکن ان تمام تدبیروں کے باوجود وہ ترکوں کو کینڈیا کے محاصرہ سے ہٹا نہ سکے اور سلطان محمد رابع کے دور میں یہ شہر فتح ہو گیا اور کریٹ کا جزیرہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

محمد رابع

۱۰۵۸ھ تا ۱۰۹۹ھ مطابق ۱۶۴۸ء تا ۱۶۸۷ء

تخت نشینی کے وقت محمد رابع کی عمر صرف سات سال کی تھی، اس نے انتالیس سال حکومت کی، ابتدائی آٹھ سال سلطنت کے لیے ہر طرح کے اندرونی اور بیرونی خطرات سے پر تھے، سلطان کی نوعمری کے زمانہ میں عنان حکومت حرم کے ہاتھ میں تھی، اس سے بڑھ کر بد قسمتی یہ تھی کہ خود حرم میں دو جماعتیں ایک دوسرے کی حریف تھیں، ایک کی سردار سابق سلطان ابراہیم کی والدہ تھی، دوسری کی سیادت سلطان وقت کی والدہ کو حاصل تھی، سلطنت کا شیرازہ ان حریفوں کی کشمکش سے پراگندہ ہو رہا تھا، فوج میں دونوں جماعتوں کے حامی موجود تھے اور قسطنطنیہ کی سڑکوں پر اکثر بدامنی اور کشت و خون کے مناظر پیش آتے رہتے تھے، سلطنت کے مختلف صوبوں میں بھی تقریباً یہی حالت تھی، بغاوت اور سرکشی کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، ۱۶۴۹ء میں ایک شخص قاطرجی اوغلی نے ایشیائے کوچک میں علم بغاوت بلند کیا، کورجی نبی نامی ایک دوسرا باغی بھی اس کے ساتھ ہو گیا اور دونوں نے مل کر احمد پاشا والی اناطولیہ کو شکست دے دی، اس کے بعد وہ قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئے، لیکن اثنائے راہ میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے سے علاحدہ ہو گئے، عثمانی فوج نے کورجی نبی کو شکست دے کر اسے قتل کر دیا، قاطرجی اوغلی نے بھی شکست کھائی لیکن سلطان نے اسے معاف کر کے کرمانیہ کا والی بنا دیا اور یہ بغاوت ختم ہوئی، تاہم سلطنت

کے اور حصوں میں جو شورش پیدا ہوگئی تھی وہ بدستور جاری رہی، پایہ تخت میں یہ صورت بہت زیادہ نمایاں تھی، آخر کار حرم کی سازشیں سابق سلطانہ والدہ کے قتل پر ختم ہوئیں۔

آسٹریا کے لیے حکومت عثمانیہ کی یہ پراگندگی نہایت مفید تھی اور وہ اس کے اختلال سے فائدہ اٹھا کر بآسانی ہنگری کو واپس لے سکتی تھی لیکن جنگ سی سالہ نے اس کو اتنا زیادہ چور کر دیا تھا کہ وہ اس اقدام کی جرأت نہ کر سکی، البتہ جمہوریہ وینس سے جنگ کا سلسلہ جس کا آغاز کریٹ کے حملہ سے ہوا تھا، برابر جاری رہا اور جمہوریہ کے ایک جنگی بیڑے نے دردانیال کے قریب ایک عثمانی بیڑے کو شکست دے کر جزائر لیمناس اور ٹینیڈاس پر قبضہ کر لیا، اس نے دردانیال کے دہانے کی ناکہ بندی بھی کر دی جس کی وجہ سے قسطنطنیہ کے سامان رسد کا راستہ بند ہو گیا، دار السلطنت میں سخت گرانی پھیل گئی، ان بیرونی حملوں کے علاوہ سلطنت کے اندرونی حصہ میں ہر طرح کی بے امنی اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، خوش قسمتی سے عین اس وقت جب کہ دولت علیہ ایک نہایت نازک دور سے گزر رہی تھی اور بظاہر اس کی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی، سلطانہ والدہ نے صدر اعظم کے عہدہ پر ایک ایسے شخص کو مقرر کیا جس نے پانچ ہی سال کے اندر تمام فوجی اور ملکی شعبوں کی کامل اصلاح کر کے سلطنت کو نہ صرف تباہی سے بچا لیا بلکہ اس میں از سر نو وہ طاقت وسطوت بھی پیدا کر دی جسے سلطان مراد رابع کے بعد دولت علیہ تقریباً تمام تر کھو چکی تھی۔

محمد کوپریلی صدر اعظم محمد کوپریلی کا آبائی وطن البانیا تھا، مگر اس کا دادا اماسیا واقع ایشیائے کوچک کے ایک چھوٹے سے گاؤں کوپری میں آکر آباد ہو گیا تھا، محمد کو ابتدائی تعلیم بھی نصیب نہ ہوئی اور ابھی وہ لڑکا ہی تھا کہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے اسے گھر سے نکلنا پڑا، حسن اتفاق سے اس کو سلطان کے مطبخ میں نوکری مل گئی، وہاں اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے اس نے بہت جلد ترقی کر لی اور کچھ عرصہ کے بعد شاہی مطبخ کا باورچی ہو گیا لیکن حکومت کے بعض اہل نظر نے اس نوجوان کی قابلیت کا اندازہ کر کے اسے باورچی خانہ سے نکالا اور

زیادہ معزز خدمات اس کے سپرد کیں، ہر جگہ اس نے اپنی غیر معمولی لیاقت کا ثبوت دیا، چنانچہ آخر میں وہ یکے بعد دیگرے دمشق، طرابلس اور یروشلم کا والی مقرر ہوا اور ان میں سے ہر صوبہ میں اس نے ایک عادل، مضبوط اور نرم دل حاکم کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، پھر جب سلطان محمد رابع کی تخت نشینی کے بعد سلطنت کے ہر حصہ اور حکومت کے ہر شعبہ میں شورش اور ابتری بڑھنے لگی تو صدارت عظمیٰ کی ذمہ داریوں کو تفویض کرنے کے لیے سلطانہ والدہ کی نظر انتخاب بھی محمد کوپریلی ہی پر پڑی، چنانچہ ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۶ء) میں محمد کوپریلی نے دولت عثمانیہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی، اس وقت اس کی عمر ستر سال کی تھی، چوں کہ وہ بوڑھا اور لکھنے پڑھنے سے بالکل نابلد تھا، اس لیے علماء اور اعیان سلطنت نے اس کے تقرر کے خلاف احتجاج کیا لیکن دمشق، طرابلس اور یروشلم کی ولایت کے زمانہ میں کوپریلی نے اپنی قابلیت کا جو ثبوت دیا تھا وہ سلطانہ والدہ کے انتخاب کی پرزور تائید کر رہا تھا، تاہم اس جلیل القدر عہدہ کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے پہلے محمد کوپریلی نے سلطانہ والدہ سے جو نوعمر سلطان کی نمائندہ تھی، چند شرطیں بہ حلف منظور کرا لیں، پہلی شرط یہ تھی کہ سلطان اس کی تمام کارروائیوں کو جو وہ بہ حیثیت صدر اعظم عمل میں لائے گا، بغیر کسی بحث کے منظور کر لیا کرے گا، دوسری شرط یہ تھی کہ اسے تمام عہدوں کے تقرر اور امتیازات کے عطا کرنے میں پورا اختیار حاصل ہوگا، تیسری شرط یہ تھی کہ سلطان کو اس پر کامل اعتماد رہے گا اور اس کے خلاف ہر شکایت کو وہ فوراً مسترد کر دے گا۔

ان غیر محدود اختیارات کے ساتھ محمد کوپریلی نے سلطنت کی اصلاح کا کام شروع کیا اور ہر شعبہ کی خرابیوں کو اس سختی کے ساتھ دور کیا جو مراد رابع کے طریق اصلاح کی نمایاں خصوصیت تھی، غیر متدین عہدہ دار، غیر منصف قضاۃ، فوج کے سرکش سردار و سپاہی سب کے سب فوراً قتل کر دیے گئے، یہی حشر ان لوگوں کا ہوا جو کوپریلی کے خلاف سازش کرتے ہوئے پائے گئے یا جن پر اس سازش کا شبہ بھی ہوا، قسطنطنیہ میں درویشوں کی ایک جماعت

نے شورش برپا کر رکھی تھی، کوپریلی نے ان سب کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا۔ ان میں سے ایک درویش نے جس کا اثر عوام پر بہت زیادہ تھا، کوپریلی کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا چاہا، اس نے اسے پھانسی پر لٹکا دیا، اسی طرح اس نے کلیسائے یونان کے بطریق اعظم کو بھی جو درپردہ امیر ولاچیا کو بغاوت کے لیے ابھارنا چاہتا تھا، گرفتار کر کے سولی دے دی، اس کی باریک بیں نگاہ سے کوئی بے عنوانی اور کسی سازش کی خفیہ سے خفیہ تیاری بھی چھپی نہ رہتی، اس کے جاسوس سلطنت کے بعید ترین حصوں میں بھی نہایت سرگرمی سے کام کرتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے اس کی ہیبت صوبے داروں اور فوج کے بڑے بڑے عہدہ داروں سے لے کر حکومت کے ادنٰی ملازموں تک کے دلوں میں یکساں طور پر بیٹھی ہوئی تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی پنج سالہ صدارت میں چھتیس ہزار آدمی اس کے حکم سے قتل کیے گئے، باب عالی کے خاص جلاد ذوالفقار کا بیان ہے کہ خود اس کے ہاتھ سے چار ہزار سے زیادہ آدمی پھانسی پا کر باسفورس میں پھینک دیے گئے۔

محمد کوپریلی کا یہ تشدد بادی النظر میں نہایت ظالمانہ معلوم ہوتا ہے لیکن سلطنت میں جو شورش اور بغاوت پھیلی ہوئی تھی اس کا تدارک تشدد کے بغیر ممکن ہی نہ تھا، یہ اسی سختی کا نتیجہ تھا کہ صرف پانچ سال کی مدت میں ہر طرف امن وامان اور عدل وانصاف دکھائی دینے لگا، تمام شورشیں دیکھتے دیکھتے فرو ہو گئیں، فوج کی سرکشی جاتی رہی اور سلطنت کے ہر شعبہ کا نظام درست ہو گیا۔

محمد کوپریلی نے نہ صرف سلطنت کے اندرونی نظم ونسق کو درست کیا بلکہ بیرونی حملوں کو بھی روکا، اس نے عثمانی بیڑے کو از سر نو تعمیر کرایا، جس کی وجہ سے بحر الجین میں دولت علیہ کی سطوت پھر قائم ہو گئی، اس نے وینس کے جہازوں کو شکست دے کر جزائر لیمناس وٹینیڈاس واپس لے لیے اور کینڈیا کا محاصرہ جو محمد رابع کے ابتدائی عہد میں فوج کی سرکشی کے باعث کسی حد تک کمزور ہو گیا تھا، پھر پوری شدت کے ساتھ جاری کرایا۔

۱۰۷۲ھ (۱۶۶۱ء) میں محمد کوپریلی نے وفات پائی، انتقال سے پہلے اس نے سلطان اور سلطانہ والدہ سے اپنے لڑکے احمد کوپریلی کو اپنا جانشین نامزد کرالیا تھا، مرتے وقت بھی وہ سلطنت کی بہبودی سے غافل نہ تھا، چنانچہ اس نے سلطان سے مندرجہ ذیل چار نصیحتوں پر خاص طور سے کاربند رہنے کی تاکید کی:

۱- عورتوں کا مشورہ کبھی نہ سنا جائے ۲- کسی رعیت کو حد سے زیادہ دولت مند ہونے دیا جائے ۳- سلطنت کا خزانہ ہمیشہ پر رکھا جائے ۴- سلطان خود ہمیشہ گھوڑے کی پیٹھ پر رہے اور فوج کو ہمیشہ حرکت میں رکھے۔

احمد کوپریلی محمد کوپریلی کی وفات کے وقت سلطان محمد رابع بیس سال کا ہو چکا تھا اور اب وہ عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا لیکن اسے شکار کا بے حد شوق تھا اور اسی میں اپنا تمام وقت صرف کرتا تھا، اس نے سلطنت کا سارا انتظام نئے صدر اعظم احمد کوپریلی کے سپرد کر دیا تھا اور اس پر پورا اعتماد رکھتا تھا، ۱۶۶۱ء سے لے کر اپنی وفات (۱۶۷۶ء) تک احمد کوپریلی ہی دراصل سلطنت عثمانیہ کا فرماں روا تھا، وہ اپنی لیاقت، اپنے تدبر اور اپنی عظمت کے لحاظ سے دولت عثمانیہ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ ممتاز صدر اعظم خیال کیا جاتا ہے، تمام عثمانی اور مسیحی مورخین کو اس کی حیرت انگیز قابلیت پر اتفاق ہے، تقرر کے وقت اس کی عمر صرف چھبیس سال کی تھی، محمد کوپریلی نے اسے بہترین تعلیم دلوائی تھی اور انتظام سلطنت کی تعلیم خود اپنی نگرانی میں دی تھی، نیز ایک صوبہ کی ولایت پر مامور کر کے صدارت عظمیٰ کی ذمہ داریوں کے لیے بھی اسے پہلے سے تیار کر دیا تھا، ذاتی خوبیوں کے لحاظ سے بھی احمد کوپریلی نہایت ممدوح تھا، اس کی خوش خلقی اور منکسر مزاجی خاص طور پر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی، وہ شرعی احکام کی پابندی نہایت سختی سے کرتا اور اس کی زندگی اسلامی زندگی کا ایک قابل تقلید نمونہ تھی، جس کا اثر اس کے ہم عصر وزیروں اور عہدہ داروں پر بھی پڑا، اس کے ان ہی محاسن کی بنا پر ترک اسے فاضل احمد کہتے تھے۔

احمد کوپریلی بھی اپنے والد کی طرح ایک مضبوط قوت ارادی اور پختہ عزم رکھتا تھا تاہم اس میں وہ تشدد نہ تھا، جو محمد کوپریلی کی وزارت کی خصوصیت تھی، احمد فطرتاً زیادہ حلیم اور نرم دل تھا، تقرر کے بعد ایک سال تک تو اس نے سختی جاری رکھی لیکن پھر اس کی ضرورت باقی نہیں رہی اور سلطنت کا انتظام بغیر کسی سختی کے ہوتا رہا، اسے رعایا کا بہت زیادہ خیال تھا، ان کی بہبودی کے لیے اس نے وہ سب کچھ کیا جو اس کے امکان میں تھا، خصوصاً اس نے محصولوں کا بار بہت ہلکا کردیا، سپاہی جاگیرداروں کی سخت گیری اور پاشاؤں نیز مقامی عہدہ داروں کے مظالم سے رعایا بہت پریشان تھی، احمد نے ان مصیبتوں سے بھی اسے نجات دلائی، کچھ عرصہ سے مسیحی کلیساؤں کی تعمیر پر پابندی عائد کردی گئی تھی، احمد نے ان رکاوٹوں کو بالکل دور کردیا، باوجود اس کے کہ اسے مختلف ملکوں سے جنگ کرنی پڑی، اس نے خزانہ کو ہمیشہ پر رکھا، اس کی غیر معمولی قابلیت کا اندازہ فوجی مہمات سے زیادہ اس کے ملکی انتظامات سے ہوتا ہے، اس کی حربی لیاقت بھی اعلیٰ درجہ کی تھی اور اس نے متعدد اہم فتوحات سے سلطنت کو وسعت دی تاہم اسے دو بار سخت شکست اٹھانی پڑی، جس سے دولت علیہ کی عظمت کو سخت صدمہ پہنچا، پہلی اہم شکست آسٹریا کے مقابلہ میں پیش آئی اور دوسری پولینڈ کے مقابلہ میں۔

آسٹریا سے جنگ ۱۶۶۳ء میں آسٹریا سے لڑائی چھڑ گئی، یہ جنگ ان مناقشات کا نتیجہ تھی جو ڈیڑھ صدی سے ہنگری اور ٹرانسلوینیا میں جاری تھے، دو سال پیشتر سے آسٹریہ اور دولت عثمانیہ کے حامیوں کے درمیان صوبوں میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہو رہی تھیں، جن میں دونوں سلطنتوں کے فوجی افسر جو سرحدی علاقوں پر متعین تھے حصہ لیتے رہے، ۱۶۶۳ء میں احمد کوپریلی ایک زبردست فوج لے کر آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ ہوا، اس نے بلغراد پہنچ کر دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور پھر شمال میں نوہزل کی طرف بڑھا، یہ قلعہ یورپ کے مستحکم ترین قلعوں میں تھا اور آسٹریا کو اس کی مضبوطی پر پورا بھروسہ تھا لیکن پانچ ہفتے کے محاصرہ کے بعد ۲۵ صفر ۱۰۷۴ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۱۶۶۳ء کو محصورین نے ہتھیار ڈال کر قلعہ عثمانیوں

کے سپرد کر دیا، نوہزل کی فتح کے بعد احمد کوپریلی نے متعدد دوسرے قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا، اس کے بعد موسم سرما گزارنے کے لیے وہ بلغراد واپس گیا۔

دوسرے سال مئی میں وہ پھر نوہزل آیا اور وہاں سے دریائے مور کو عبور کرکے ۷؍جولائی ۱۶۶۴ء کو قلعہ سرینوار فتح کر لیا، ۲۶؍جولائی کو وہ کومورن (Komorn) پہنچا جو ہنگری اور آسٹریا کی سرحد پر دریائے راب کے لب ساحل واقع تھا، اگر وہ اس دریا کو عبور کر لیتا تو ویانا کا راستہ صاف ہو جاتا لیکن آسٹریا اور ہنگری کی فوجیں اس کی راہ میں حائل تھیں، آسٹریا کی مدد کے لیے کانٹ کولینی (Count Coligny) کی سرکردگی میں فرانس کے مبارزین بھی آ گئے تھے، مسیحی فوج کا سپہ سالار کانٹ مونٹے کوکولی (Count Montecucoli) تھا جو اپنے وقت کا نہایت ممتاز جنرل تھا، عیسائیوں کی تعداد عثمانیوں سے بہت کم تھی لیکن جنگ سیرسٹیز (۱۵۹۶ء) کے بعد سے جب کہ عثمانیوں نے آسٹریا کو بری طرح شکست دی تھی، آسٹریا اور ہنگری کی فوجوں نے اپنی تنظیم اور اسلحوں میں بہت زیادہ ترقی کر لی تھی، برخلاف اس کے عثمانیوں کے فوجی نظام میں اندرونی کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں اور وہ اسلحوں کی ترقی میں عیسائی حکومتوں کا ساتھ نہ دے سکے تھے، جنگ سی سالہ کے دوران میں فن حرب میں بعض اہم اصلاحیں ہو گئی تھیں، جس سے عثمانی فوجیں ناآشنا تھیں، اس لحاظ سے اگرچہ مسیحی فوج کی تعداد عثمانی فوج سے بہت کم تھی تاہم فنی حیثیت سے وہ اپنے مقابل پر فوقیت رکھتی تھی۔

جنگ سینٹ گاتھرڈ ۸؍محرم ۱۰۷۵ھ (یکم اگست ۱۶۶۴ء) کو دونوں فوجیں خانقاہ سینٹ گاتھرڈ (St. Gotthard) کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، عثمانیوں کو اپنی کثرت تعداد کے باوجود شکست ہوئی اور ان کے دس ہزار آدمی مارے گئے، آسٹریا کی فوجوں کو بھی اتنا کافی نقصان پہنچا کہ وہ ترکوں کا تعاقب نہ کر سکیں اور احمد کوپریلی اپنی بقیہ فوج کو آسانی کے ساتھ واپس لے آیا۔

اس جنگ کی اہمیت یہ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ پہلی زبردست شکست تھی جو عثمانیوں کو آسٹریا کے ہاتھوں پہنچی، جنگ موہاکز (۱۵۲۶ء) کے بعد سے اس وقت تک آسٹریا کی فوجوں پر عثمانیوں کی فوقیت مسلم تھی، جنگ سینٹ گاتھرڈ نے دولت علیہ کی اس دیرینہ فوقیت کو صدمہ پہنچایا اور یورپ کو پہلی بار معلوم ہوا کہ عثمانیوں کی فوجی قوت مائل بہ انحطاط ہے، ترک سپاہیوں کی ذاتی شجاعت میں اب بھی کوئی فرق نہ تھا لیکن ان کے اسلحے اور جنگ کے طریقے اس وقت بھی وہی تھے جو سلیمان اعظم کے عہد میں رائج تھے، فن حرب میں وہ یورپ کی ترقی یافتہ فوجوں سے پیچھے پڑ گئے تھے، یہی ان کی شکست کا اصلی سبب تھا۔

صلح نامۂ واسوار سینٹ گاتھرڈ کی شکست کے بعد جو صلح نامہ بیس سال کے لیے واسوار میں مرتب ہوا، اس کی دفعات بہ حیثیت مجموعی دولت علیہ کے موافق تھیں اور وہ دراصل صلح نامہ سیلواتورک کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھیں، اس صلح نامہ کی رو سے طے پایا کہ اہل آسٹریا اور ترک دونوں ٹرانسلوینیا کو خالی کر دیں اور اپافی (Apafy) کو جس کی حمایت باب عالی نے کی تھی، وہاں کا فرماں روا بنایا جائے اور وہ سلطان کو خراج ادا کرتا رہے، یعنی ٹرانسلوینیا پر سلطان کی سیادت تسلیم کر لی گئی، سیرینوار اور نوہزل کے قلعوں پر تو ترکوں کا قبضہ قائم رکھا گیا، ہنگری کی اسات ولایتوں میں سے تین آسٹریا کو دے دی گئیں اور چار سلطنت عثمانیہ میں شامل کر دی گئیں، اس کے علاوہ شہنشاہ آسٹریا نے دو لاکھ فلورن تاوان جنگ سلطان کو ادا کرنا منظور کیا[1]، یہ صلح نامہ دولت علیہ کے لیے ہر طرح قابل اطمینان تھا، احمد کوپریلی نے میدان جنگ میں زبردست شکست کھانے کے بعد بھی سلطنت کے مقبوضات میں اضافہ کر دیا تھا۔

کینڈیا کی فتح ۱۶۶۹ء میں احمد کوپریلی کینڈیا کی مہم پر روانہ ہوا، جس کا محاصرہ بیس سال

---

[1] میریٹ، ص ۱۱۶۔

سے جاری تھا، اہل وینس موروسینی (Morosini) کی قیادت میں جو بعد میں فاتح موریا کے لقب سے مشہور ہوا، نہایت جاں بازی کے ساتھ کینڈیا کی مدافعت کر رہے تھے، احمد کوپریلی کے پہنچ جانے کے بعد محاصرہ کی شدت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی لیکن اسی کے ساتھ محصورین کا جوش و استقلال بھی بڑھتا گیا، تاہم جب انہوں نے یہ دیکھا کہ زیادہ دنوں تک مقابلہ نہ کرسکیں گے تو ایک بہت بڑی رقم احمد کوپریلی کے سامنے پیش کر کے درخواست کی کہ وہ محاصرہ اٹھا کر واپس چلا جائے، صدر اعظم نے جواب دیا "ہم لوگ روپیہ کا کاروبار نہیں کرتے، ہم کینڈیا کو فتح کرنے کی غرض سے جنگ کر رہے ہیں اور کسی قیمت پر اسے نہ چھوڑیں گے" چنانچہ محاصرہ اسی سختی کے ساتھ جاری رہا، ۱۶۶۹ء میں ایک فرانسیسی جنگی بیڑا جس میں چھ ہزار سپاہی اور فرانس کے طبقہ امراء کے بہترین مبارزین تھے، کینڈیا کی مدد کے لیے پہنچا، اس کے بعد ہی پوپ اور مبارزین مالٹا کی کمک بھی آگئی، اس متحدہ بیڑے نے جس میں ستر جہاز تھے، عثمانیوں پر سمندری جانب سے گولے برسانا شروع کیے اور محصورین سامنے سے گولہ باری کرتے رہے لیکن اس دوطرفہ حملہ کے باوجود احمد کوپریلی نے کوئی قدم پیچھے نہ ہٹایا، آخرکار مجبور ہو کر موروسینی نے ۶ ستمبر ۱۶۶۹ء کو باعزت شرائط کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے اور یہ محاصرہ جو تقریباً اکیس سال سے جاری تھا، ختم ہوا، کریٹ کے پورے جزیرہ پر ترکوں کا قبضہ ہوگیا، چند دنوں کے بعد جمہوریہ وینس اور دولت عثمانیہ کے درمیان ایک صلح نامہ ہوگیا، جس کی رو سے وینس نے کریٹ کا سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا جانا تسلیم کرلیا، البتہ ساحل کے تین چھوٹے بندرگاہوں پر تجارتی اغراض کے لیے وینس کا قبضہ باقی رکھا گیا، فتح کے بعد احمد کوپریلی کئی ماہ تک کینڈیا میں مقیم رہا اور وہاں کی حکومت کا نظم و نسق درست کر کے قسطنطنیہ واپس آیا۔

پولینڈ سے جنگ احمد کوپریلی کی تیسری مہم خاص توجہ کی مستحق ہے، کیوں کہ اس سے اس نزاع کی ابتدا ہوتی ہے جس کا سلسلہ دولت عثمانیہ اور روس کے درمیان مدت تک قائم رہا،

۱۶۷۰ء میں اوکرین کے قزاقوں نے جو پولینڈ کی رعایا تھے، حکومت سے بعض حقوق کا مطالبہ کیا، یہ مطالبہ نامنظور کر دیا گیا اور ان کو زیر کرنے کے لیے حکومت پولینڈ نے ایک فوج جنرل سوبیسکی (Sobieski) کی سرکردگی میں اوکرین روانہ کی، قزاقوں نے اپنے سردار ڈوریسینکو (Doreacensko) کے علم کے نیچے اس فوج کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن آخر کار انہوں نے محسوس کیا کہ دولت عثمانیہ کی مدد کے بغیر وہ کامیاب نہ ہو سکیں گے، چنانچہ ڈوریسینکو ۱۶۷۲ء میں قسطنطنیہ آیا اور اپنی قوم کی طرف سے باب عالی میں نذر اطاعت پیش کر کے سرپرستی کی استدعا کی، سلطان نے اس کی درخواست قبول کی اور اوکرین کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ قرار دے کر اسے وہاں کا ہتمن بے مقرر کر دیا، ساتھ ہی خان کریمیا کو حکم بھیجا کہ قزاقوں کی مدد کرے اور چھ ہزار کا ایک ترکی دستہ بھی ان کی مدد کے لیے اوکرین روانہ کیا، باب عالی کی ان کارروائیوں کے خلاف پولینڈ نے احتجاج کیا، زار روس نے بھی سلطان کو دھمکی دی کہ اگر اس نے قزاقوں کی مدد کی تو روس پولینڈ کی حمایت کرے گا، صدر اعظم نے اس دھمکی کی پرواہ نہ کی اور پولینڈ اور روس دونوں کو یہ جواب دیا کہ اوکرین کی نسبت باب عالی کا فیصلہ اپنی جگہ پر قائم رہے گا، احمد کوپریلی نے خود اپنی قلم سے ایک خط سفیر پولینڈ کو لکھا جس میں اوکرین کے قزاقوں کی مظلومیت دکھا کر یہ جتایا کہ جب انہوں نے دولت عثمانیہ کے دامن میں پناہ لے لی تو ان کی حمایت کرنا باب عالی پر فرض ہو گیا، غرض ۱۶۷۲ء میں پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس کا سلسلہ چار سال تک قائم رہا۔

صلح نامۂ بوزاکس اس مہم پر احمد کوپریلی کے ساتھ سلطان محمد رابع خود بھی روانہ ہوا، وہ فوج لے کر پوڈولیا میں داخل ہوا، جو پولینڈ کا ایک صوبہ تھا، احمد کوپریلی نے پوڈولیا کے پایۂ تخت کمینیک (Kaminiec) کا محاصرہ کر لیا، اس قلعہ کی تسخیر اس وقت تک ناممکن خیال کی جاتی تھی لیکن صرف نو روز کے محاصرہ کے بعد ۲۶/اگست ۱۶۷۲ء کو ترکوں نے اسے فتح کر لیا، ۹/ستمبر کو دوسرا مشہور اور مضبوط شہر لمبرگ (Lemberg) بھی فتح ہو گیا، ان فتوحات کے بعد

مائیکل شاہ پولینڈ نے صلح کی درخواست کی اور صلح نامہ بوزاکس (Bucsacs) پر دستخط کر کے پوڈولیا اور اوکرین کے صوبے سلطنت عثمانیہ کے حوالے کر دیے اور دو لاکھ بیس ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا، صلح کے بعد محمد رابع ایک فاتح کی حیثیت سے ادرنہ کو واپس ہوا۔

تجدید جنگ لیکن یہ صلح بالکل عارضی ثابت ہوئی، سوبیسکی اور پولینڈ کے دوسرے امراء نے اسے یک قلم مسترد کر دیا اور از سر نو جنگ کی تیاریاں کرنے لگے، چنانچہ ۱۶۷۳ء میں احمد کوپریلی پولینڈ کی سرکوبی اور زار روس کی تنبیہ کے لیے جس نے گزشتہ جنگ میں پولینڈ کو مدد پہنچائی تھی، پھر روانہ ہوا لیکن ۱۱ نومبر ۱۶۷۳ء کو سوبیسکی نے دفعۃً ترکی لشکر پر جو خوزیم (Khoczim) کے قریب خیمہ زن تھا، چھاپا مارا اور کوپریلی کو سخت شکست دی، ولاچیا اور مولڈیویا کے فرماں رواؤں نے عین وقت پر غداری کی اور اپنے اپنے دستے لے کر سوبیسکی کی فوج سے مل گئے، دوسرے سال باب عالی نے پھر ایک فوج اوکرین کی مہم پر بھیجی لیکن سوبیسکی کے مقابلہ میں جس کی حمایت سلطنت روس اب علانیہ طور پر کر رہی تھی، اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی اور پولینڈ اور روس کی متحدہ فوج کے سامنے اسے پسپا ہونا پڑا، ۱۶۷۴ء میں شاہ مائیکل کی وفات پر سوبیسکی پولینڈ کے تخت پر بیٹھایا گیا اور دوسرے ہی سال اس نے لمبرگ میں ترکوں کو ایک اور زبردست شکست دی، مگر اس شکست کے باوجود ترکوں کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور بالآخر سوبیسکی کو زرانہ (Zurawna) میں شکست دے کر انہوں نے پوڈولیا کے پورے صوبے پر قبضہ کر لیا۔

صلح نامۂ زرانہ اب سوبیسکی کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی، صلح نامۂ زرانہ ۲۷ ر اکتوبر ۱۶۷۶ء) میں کمینک اور پوڈولیا پر ترکوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا اور تمام اوکرین علاوہ چند مقامات کے سلطنت عثمانیہ کے زیر سیادت آ گیا۔

احمد کوپریلی کی وفات اس صلح کے تین ہی روز بعد احمد کوپریلی نے وفات پائی، اگرچہ اسے آسٹریا اور پولینڈ کے مقابلہ میں سینٹ گاتھرڈ اور خوزیم میں فاش شکستیں ہوئی تھیں،

تاہم اس نے خوش انتظامی اور حسن تدبیر سے ان کی پوری تلافی کر دی اور پوڈولیا، کریٹ، نوہزل اور سیرنورا (ہنگری) کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر کے اس کی وسعت میں اہم اضافے کر دیے، ان بیرونی فتوحات کے علاوہ اس نے سلطنت کی اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کو بھی ختم کر دیا، جہاں تک سلطنت کے حسن انتظام، عدل وانصاف نیز مالی اور فوجی قوت کا تعلق ہے، کسی وزیر نے اس سے زیادہ کارنامے نہیں دکھائے اور یہ سب کچھ اس نے بغیر کسی ظلم وتشدد کے کیا، اس نے رعایا کے تمام طبقوں کی سرپرستی کی اور ہر مذہب وملت کے پیرووں کے ساتھ یکساں طور پر عدل وانصاف برتا، عہد وپیمان کی پابندی اس کا ایک مخصوص وصف تھا، وہ علوم وفنون کا بہت بڑا مربی تھا، اپنی بے نظیر لیاقت اور کارگزاریوں کے لحاظ سے وہ سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا وزیر خیال کیا جاتا ہے۔

قرہ مصطفیٰ

احمد کوپریلی کی وفات پر توقع کی جاتی تھی کہ سلطان اس کے بھائی مصطفیٰ کوپریلی کو، جو مختلف صوبوں کا حاکم رہ چکا تھا اور جس میں احمد کے بہتیرے اوصاف پائے جاتے تھے، صدر اعظم مقرر کرے گا، لیکن اس توقع کے خلاف اس نے اپنے داماد قرہ مصطفیٰ کو اس عہدہ پر مامور کیا، یہ انتخاب سلطنت کے لیے حد درجہ مضرت رساں ثابت ہوا، قرہ مصطفیٰ کا نصب العین تمام تر اپنی ذاتی ترقی تھا، اس میں وہ اہلیت مطلق نہ تھی جو دولت عثمانیہ کے وزیر اعظم میں ہونی چاہیے تھی، بایں ہمہ اس کے حب جاہ اور ہوس عظمت کی کوئی انتہا نہ تھی، دولت کا وہ بے حد حریص تھا، چنانچہ سلطنت کے بڑے بڑے عہدے اور امتیازات معمولی قیمتوں پر فروخت کر دیتا تھا، اس طرح اس نے بہت زیادہ دولت جمع کر لی، تھوڑے ہی دنوں میں اس کی سختیوں کی وجہ سے رعایا پریشان ہو گئی، اسی ہوس عظمت کے ماتحت جو اس کے مزاج کی نمایاں خصوصیت تھی، وہ آسٹریا پر حملہ کر کے ویانا کی فتح کا حوصلہ رکھتا تھا، کیوں کہ ویانا کی فتح کے بعد وہ اپنے لیے دریائے ڈینوب اور دریائے رہائن کے درمیانی علاقوں کی فرماں روائی حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن آسٹریا کی طرف بڑھنے سے پہلے روس سے

جنگ چھڑ گئی جس میں قرہ مصطفیٰ کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

اوکرین قرہ مصطفیٰ کی سختیوں کی وجہ سے اوکرین کے قزاق بہت عاجز آ گئے تھے، یہاں تک کہ مجبور ہو کر انہوں نے فروری ۱۶۷۷ء میں علم بغاوت بلند کر دیا، روس نے ان کی حمایت کی، یہ اطلاع پا کر قرہ مصطفیٰ ایک فوج لے کر اوکرین میں داخل ہوا، وہاں اسے باغیوں کے علاوہ روس اور پولینڈ کی فوجوں سے بھی مقابلہ پیش آیا اور اس کو شکست ہوئی، دوسرے سال تازہ فوجوں کے ساتھ وہ پھر لوٹا اور ۲۱ اگست ۱۶۷۸ء کو اس نے قلعہ چیزرائم (Cehzrym) فتح کر لیا، تین سال تک مختلف معرکے پیش آئے جس میں کبھی ایک فریق کو فتح ہوئی، کبھی دوسرے کو، بالآخر ۱۶۸۱ء سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان صلح ہو گئی اور باب عالی اوکرین سے دست بردار ہو گیا، پانچ سال بعد روس اور پولینڈ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے پورے اوکرین پر روس کی سیادت تسلیم کر لی گئی۔

ویانا کا دوسرا محاصرہ ۱۶۸۲ء میں قرہ مصطفیٰ کو آسٹریا پر حملہ کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا، ہنگری کا جو حصہ آسٹریا کے زیر حکومت تھا، اس نے شہنشاہ لیوپولڈ کی مذہبی تعدیوں سے عاجز آ کر بغاوت کر دی، باغیوں کے سردار توکولی (Tokoly) نے آسٹریا سے آزادی کا اعلان کر کے اپنے کو ہنگری کا فرماں روا قرار دیا اور سلطان کی سیادت قبول کر لی[1]، قرہ مصطفیٰ کے لیے یہ موقع نہایت غنیمت تھا، اس نے ایک بہت بڑی فوج جس کا تخمینہ دو لاکھ پچھتر ہزار کیا جاتا ہے، ادرنہ میں جمع کی، اور ۱۶۸۳ء کے اوائل میں ویانا کے قصد سے روانہ ہو گیا، راستہ میں اسے کوئی مزاحمت پیش نہیں آئی اور وہ آسانی کے ساتھ ویانا پہنچ گیا، شہنشاہ لیوپولڈ کے پاس اس زبردست فوج سے مقابلہ کے لیے کوئی سامان نہ تھا، اس کے سپاہیوں کی تعداد پینتیس ہزار سے زیادہ نہ تھی، جن میں سے گیارہ ہزار ویانا کے اندر متعین تھے، اس نے سوبیسکی سے مدد کی درخواست کی، پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ میں حال ہی میں ایک صلح نامہ ہو چکا تھا لیکن

---

[1] میریٹ، ص ۲۳۔

سوبیسکی نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور شہنشاہ کی مدد کے لیے پچاس ہزار سپاہیوں کو بھیجنے کا وعدہ کرلیا، لیکن سوبیسکی کی فوج ویانا سے زیادہ فاصلہ پر تھی اور آٹھ ہفتے سے قبل نہیں پہنچ سکتی تھی، اس میں شبہ نہیں کہ اگر قرہ مصطفیٰ پوری مستعدی سے کام لیتا اور دوران محاصرہ میں پوری قوت سے حملہ کرتا تو ویانا پولینڈ کی کمک آنے سے پیشتر ہی فتح ہو جاتا لیکن اسے اپنی طاقت اور غنیم کی کمزوری پر حد سے زیادہ بھروسہ تھا اور وہ یقین رکھتا تھا کہ دنیا کی طاقت ویانا کو اس کے پنجے سے چھڑا نہیں سکتی۔

غرض ویانا کا دوسرا محاصرہ ۱۵؍جولائی ۱۶۸۳ء کو شروع ہوا، شہنشاہ لیوپولڈ اپنے خاندان کے ساتھ بھاگ کر بویریا چلا گیا تھا لیکن محصورین نے کاؤنٹ اشارمبرگ (Stahremberg) کی سرکردگی میں نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، شہر کے بیس ہزار باشندے بھی سپاہیوں کے دستے کے ساتھ شامل ہو گئے، انہوں نے بھی فوج کے ساتھ جاں بازی کے جوہر دکھائے، تاہم ترکی توپ خانوں نے شہر کی دیواروں کو کئی مقام پر بالکل مسمار کردیا، اگر قرہ مصطفیٰ ایک عام حملہ کا حکم دے دیتا تو شہر کے فتح ہو جانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن اس کے حرص وہوس نے یہ نادر موقع کھو دیا، وہ اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ اہل شہر محاصرہ سے عاجز آ کر آخر میں خود ہتھیار ڈال دیں گے اور پھر شہر کی تمام دولت پر وہ تنہا قبضہ کرلے گا، جو ایک عام حملہ کی کامیابی میں ممکن نہ تھا کیوں کہ اس وقت مال غنیمت تمام فوج کا حق ہو جاتا، اسی توقع اور ہوس نے آخری حملہ کو ملتوی رکھا، اس درمیان میں سوبیسکی تیزی کے ساتھ ویانا کی جانب کوچ کرتا رہا اور آخر کار شہزادہ چارلس آف لورین (Charles of Loraine) سے آملا جو آسٹریا کی شاہی فوج کا سپہ سالار تھا اور ویانا سے کچھ فاصلہ پر اس کا انتظار کررہا تھا، دونوں سپہ سالاروں نے متحد ہو کر ٹولم (Talm) کے مقام پر دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور پھر وہ نہایت دشوار گزار راستہ سے ہو کر ترکی لشکر کے عقب پر پہنچ گئے، قرہ مصطفیٰ آسانی کے ساتھ سوبیسکی اور شہزادہ چارلس کو دریا عبور کرنے یا اس دشوار گزار راستہ کے طے

کرنے سے روک سکتا تھا لیکن اپنی طاقت پر حد سے بڑھے ہوئے اعتماد نے اس کو غافل رکھا اور وہ اس وقت متنبہ ہوا جب غنیم اس کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔

ترکوں کی شکست سوبیسکی کو عثمانی لشکر کی ترتیب دیکھ کر اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ اس نے قرہ مصطفیٰ کی نسبت حقارت کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا کہ "اس شخص نے لشکر کی ترتیب غلط طریقہ پر دی ہے، وہ جنگ کے متعلق کچھ نہیں جانتا، ہم ضرور اسے شکست دیں گے" پھر اس نے اپنی فوج کو مخاطب کر کے بتایا کہ ویانا تمام مسیحی یورپ کا قلب ہے، جس کی مدافعت ایک مقدس فرض ہے، ویانا کو ترکوں سے چھڑا لینا حقیقۃً سارے یورپ کو محفوظ کر لینا ہے۔ فوج کے دینی جوش کو برانگیختہ کرنے کے بعد اس نے حملہ کا حکم دیا، حملہ اس قدر شدید تھا کہ عثمانی لشکر اس کی تاب نہ لا سکا، حملہ کی شدت سوبیسکی کی موجودگی کے باعث اور زیادہ محسوس ہو رہی تھی، اس کی فاتحانہ شہرت کا غلغلہ تمام یورپ میں پھیلا ہوا تھا، سب سے پہلے تاتاریوں کے قدم اکھڑے، ان کے بھاگنے سے ترکی فوج کے دوسرے دستوں پر بھی اثر پڑا اور پوری فوج میں انتشار پیدا ہو گیا، قرہ مصطفیٰ نے ینی چری کو شہر کے سامنے خندقوں میں چھوڑ دیا تھا اور بقیہ فوج کے ساتھ سوبیسکی اور شہزادہ چارلس کے متحدہ حملہ کا مقابلہ کر رہا تھا، جو اس کے عقب سے ہوا تھا، تاتاریوں کے پسپا ہو جانے کے بعد سوبیسکی نے ترکی لشکر کے قلب پر حملہ کر دیا، عثمانی فوج باوجود اپنی کثرت کے اس حملہ کا مقابلہ نہ کر سکی اور اس کے قدم اکھڑ گئے، عیسائیوں نے ترکوں کے تمام خیموں اور سامانوں پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد وہ ینی چری دستوں کی طرف بڑھے، جن پر اب دونوں طرف سے حملہ ہونے لگا، پشت سے سوبیسکی کی فوج حملہ کر رہی تھی اور سامنے سے آسٹریا کی شاہی فوج گولیاں برسا رہی تھی، ینی چری اپنی بے مثل جاں بازی کے ساتھ ان حملوں کا مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا ایک ایک فرد داد شجاعت دیتا ہوا مارا گیا، سوبیسکی کی فتح اب مکمل ہو گئی، تین سو توپیں، نو ہزار گولہ بارود کی گاڑیاں اور پچیس ہزار خیمے مال غنیمت میں ہاتھ آئے۔

قرہ مصطفیٰ کا قتل قرہ مصطفیٰ سوبیسکی کے تعاقب سے بچ کر بودا پہنچا اور وہاں عثمانی فوج کے چند بڑے بڑے افسروں کو اس شکست کا ذمہ دار قرار دے کر جو تمام تر اس کی نااہلیت اور حرص وہوس کا نتیجہ تھی، قتل کرا دیا، اس کے بعد وہ موسم سرما گزارنے کے لیے بلغراد چلا گیا، وہاں سلطان کے حکم سے وہ خود قتل کر دیا گیا اور اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔

شکست ویانا کا اثر ویانا کا یہ دوسرا محاصرہ جس میں ترکوں کو ایسی زبردست شکست ہوئی پہلے محاصرہ سے جو ۱۵۲۹ء میں سلیمان اعظم کی سرکردگی میں ہوا تھا، بہت کچھ مختلف تھا، سلیمان سامان رسد اور اسلحوں کی عدم فراہمی کی وجہ سے محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور ہو گیا تھا، غنیم کو میدان جنگ میں اس سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور وہ اپنی پوری فوج کے ساتھ قسطنطنیہ واپس آ گیا، برخلاف اس کے قرہ مصطفیٰ نے ایک ایسی فوج سے جو ترکی لشکر سے تعداد میں بہت کم تھی، میدان جنگ میں شکست کھائی اور اس کے ہزاروں سپاہی ہلاک ہو گئے، اس شکست کا اثر دولت عثمانیہ کی عظمت پر بہت برا پڑا، دنیا کو معلوم ہو گیا کہ عثمانی فتوحات کا دور اب ختم ہو گیا اور وسط یورپ کی سلطنتیں جو دو سو برس سے مستقل طور پر ترکی حملوں سے خائف چلی آتی تھیں، اب ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو گئیں۔

مسیحی اتحاد ویانا میں ترکوں کی شکست سے تمام یورپ میں شادیانے بجنے لگے اور ان عیسائی حکومتوں نے جو سلطنت عثمانیہ کی مغربی سرحدوں پر واقع تھیں یک وقت اس پر حملہ کر دیا، یورپ نے ترکوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ کا اعلان کیا اور اس کے لیے عیسائی حکومتوں کا ایک مقدس اتحاد ۱۶۸۴ء میں قائم کیا جس میں آسٹریا، پولینڈ، وینس اور مالٹا شریک ہوئے اور ۱۶۸۶ء میں روس بھی شامل ہو گیا۔

مزید شکستیں جدید صدر اعظم ابراہیم پاشا نے ان حملہ آوروں کے مقابلہ کی حتی المقدور پوری کوشش کی لیکن ویانا کی شکست میں عثمانی فوجوں اور خصوصاً توپ خانوں کا جو نقصان ہوا تھا، اس کی تلافی فوراً ممکن نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا کی شاہی فوجوں نے جن میں پولینڈ اور

جرمنی کے مختلف صوبوں کی فوجیں بھی شامل ہو گئی تھیں، شہزادہ چارلس کی سرکردگی میں گران، نوہزل، اوفن اور زیجیڈین جیسے اہم اور مضبوط مقامات پر قبضہ کر لیا اور پھر بلغراد کے علاوہ ہنگری کے ان تمام قلعوں کو فتح کر لیا جن پر ترک قابض تھے، کروشیا کا صوبہ بھی جو ڈیڑھ سو برس سے سلطنت عثمانیہ کا مقبوضہ تھا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

ادھر وینس نے بوسنیا اور البانیا پر حملہ کر دیا اور موروسینی جمہوریہ کی فوجیں لے کر موریا میں داخل ہوا، ورکون، نوارینو، کورنتھ، ایتھنز اور دوسرے اہم شہروں پر قبضہ کر لیا، تقریباً پورا یونان وینس کے قبضہ میں آ گیا، یونانیوں نے اس حملہ کی مدافعت میں ترکوں کو کسی قسم کی مدد نہیں دی لیکن جمہوریہ کی فتح کے بعد انہیں معلوم ہو گیا کہ اہل وینس کی حکومت ترکوں کے مقابلہ میں کتنی زیادہ سخت اور ظالمانہ ہے، لارڈ ایورسلے نے بھی با دل ناخواستہ اس کا اعتراف کیا ہے[1]۔

۱۸ رجون ۱۶۸۶ء کو آسٹریا کی فوجوں نے شہزادہ چارلس کے زیر قیادت بودا کا محاصرہ کر لیا، صدر اعظم سلیمان پاشا نے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن تازہ کمک پہنچنے سے قبل شہر فتح ہو گیا، عبدی پاشا اور ترکی دستہ جو قلعہ کی مدافعت کر رہا تھا، نہایت جاں بازی کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا، یہ شہر ایک سو پینتالیس سال سے ترکوں کے قبضہ میں تھا اور اس مدت میں اس نے چھ محاصروں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا لیکن ۱۳ رشوال ۱۰۹۷ھ مطابق ۲ رستمبر ۱۶۸۶ء کو یہ ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور پھر کبھی سلطنت عثمانیہ کے قبضہ میں نہ آیا۔

۳ رشوال ۱۰۹۸ھ (۱۲ راگست ۱۶۸۷ء) کو موہاکز کا معرکہ پیش آیا، ایک سو ساٹھ برس پہلے اسی مقام پر سلطان سلیمان اعظم نے اہل ہنگری کو زبردست شکست دے کر ان کے نصف ملک پر قبضہ کر لیا تھا، اس مرتبہ ویسی ہی شکست ترکوں کو اٹھانی پڑی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلاوونیا اور کروشیا کے علاقے مستقل طور پر سلطنت آسٹریا میں شامل کر لیے گئے، بانی امیر

---

[1] ایورسلے ص ۱۸۱

ٹرانسلوینیا نے جو دولت عثمانیہ کا باج گزار تھا، اب آسٹریا کی سیادت قبول کر لی۔

سلطان کی معزولی ان پیہم شکستوں کی وجہ سے عثمانی فوج میں سخت برہمی پھیلی ہوئی تھی، اس کے افسروں نے متفقہ طور پر سیاوش پاشا کو اپنا سپہ سالار اعظم منتخب کیا اور صدر اعظم سلیمان پاشا کے قتل کا مطالبہ پیش کیا، سلطان نے فوج کی برہمی اور بغاوت کے آثار دیکھ کر یہ مطالبہ منظور کر لیا اور سلیمان پاشا کی جگہ سیاوش پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، سلیمان پاشا سلطان کے حکم سے قتل کر دیا گیا، امید تھی کہ اس مطالبہ کے پورا ہونے کے بعد فوج مطمئن ہو جائے گی اور قسطنطنیہ کا رخ نہ کرے گی لیکن اورنہ پہنچنے کے بعد وہ دار السلطنت کی طرف روانہ ہوئی اور وہاں آ کر خود سلطان کی معزولی کا مطالبہ کرنے لگی، سلطنت کے بڑے بڑے عہدہ داروں نے بھی جو قسطنطنیہ میں موجود تھے، متفقہ طور پر اس مطالبہ میں فوج کا ساتھ دیا، چنانچہ مصطفیٰ کوپریلی نے جو اس وقت قائم مقام صدر اعظم تھا، علماء کی ایک مجلس منعقد کر کے سلطان کے عزل کی نسبت استفتا کیا، تمام علماء نے بغیر کسی اختلاف کے معزولی کا فتویٰ دیا، ساتھ انہوں نے اس کے بھائی سلیمان کو اس کا جانشین منتخب کیا، چنانچہ ۲؍محرم ۱۰۹۹ھ مطابق ۸؍نومبر ۱۶۸۷ء کو محمد رابع تخت سے اتار کر محل کے اس حصہ میں نظر بند کر دیا گیا جہاں اب تک اس نے سلیمان کو نظر بند کر رکھا تھا اور سلیمان کو وہاں سے لا کر تخت پر بٹھایا گیا، پانچ سال بعد ۸؍ربیع الثانی ۱۱۰۳ھ مطابق ۷؍دسمبر ۱۶۹۱ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

سلطان محمد رابع کو شکار سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ اسی میں گزارتا تھا، اس نے سلطنت کا سارا انتظام صدر اعظم کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا تھا، سلطنت کی خوش قسمتی سے ۱۶۷۶ء تک عنان حکومت ایسے وزیروں کے ہاتھ میں تھی جو سلطان کے تمام تر اعتماد کے مستحق تھے، محمد کوپریلی اور اس کے بعد احمد کوپریلی نے دولت علیہ کی جو عظیم الشان خدمتیں انجام دیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں لیکن احمد کوپریلی کی وفات پر قرہ مصطفیٰ کے تقرر نے وہ تمام خرابیاں از سر نو پیدا کر دیں جن کو دور کرنا اس کے ممتاز پیش رووں

کا خاص مقصد تھا قرہ مصطفی کی نااہلیت اور پھر اس کی غیر معمولی حرص و ہوس مزید تباہیوں کا باعث ہوئی، جس کا پیش خیمہ ویانا کی زبردست شکست تھی، اس شکست نے تقریباً تمام یورپ کو بیک وقت سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر دیا، قرہ مصطفی کے جانشین ابراہیم پاشا اور سلیمان پاشا نے مدافعت کی انتہائی کوششیں کیں لیکن ویانا کی شکست نے سلطنت کی قوت کو توڑ دیا تھا اور تقریباً تمام معرکوں میں ترکوں کے قدم اکھڑتے ہی گئے، ان پے در پے ہزیمتوں سے فوج میں بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے، پہلے تو اس نے صدر اعظم سلیمان پاشا ہی کو ذمہ دار قرار دے کر قتل کر دینا چاہا لیکن اس کے قتل کے بعد بھی اس کا غصہ فرو نہ ہوا اور اس نے خود سلطان کی معزولی پر اصرار شروع کیا، گو محمد رابع براہ راست ان شکستوں کا ذمہ دار نہ تھا لیکن قرہ مصطفی جیسے نالائق وزیر کا تقرر صرف اسی کے انتخاب سے عمل میں آیا تھا اور یہی تقرر سلطنت کی تمام خرابیوں اور تباہ کاریوں کا سبب ثابت ہوا۔

الجزائر و تونس کی آزادی سلطان محمد رابع کے عہد میں دولت عثمانیہ کو ایک شدید صدمہ یہ بھی پہنچا کہ الجزائر اور تونس کی حکومتیں آزاد ہو گئیں، ان حکومتوں کی آزادی کے لیے کسی خاص سنہ کی تعیین نہیں کی جا سکتی لیکن مؤرخین کو اس پر اتفاق ہے کہ یہ آزادی سترہویں صدی کے وسط میں حاصل ہوئی، اس کے اسباب اس صدی کے ابتدا ہی میں پیدا ہو گئے تھے، جب کہ حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کا تقرر ذاتی لیاقت اور تجربہ کے بجائے سفارش اور رشوت کی بنا پر کیا جانے لگا تھا اور سلطنت کے دوسرے صوبوں کے حکام کی طرح الجزائر اور تونس کے صوبہ داروں نے بھی بڑی بڑی قیمتیں ادا کر کے اپنے عہدے حاصل کرنا شروع کر دیے تھے، کچھ دنوں کے بعد الجزائر اور تونس کے مقامی فوجی دستوں نے اپنے سردار خود ہی منتخب کرنا شروع کیے، ابتداءً تو یہ انتخاب منظوری کے لیے سلطان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا وہ یا تو منتخب شدہ امیدوار کو مقرر کر دیتا تھا یا اس کے بجائے کسی دوسرے کا تقرر کر دیتا تھا، یہ شکل بھی تھوڑے ہی دنوں قائم رہی اور پھر اس انتخاب کو سلطان

کے سامنے پیش کرنے کا رواج بھی جاتا رہا، رفتہ رفتہ ان فوجی سرداروں نے جو ڈے کہلاتے تھے، حکومت کی اصلی قوت اپنے ہاتھوں میں لے لی اور بالآخر ان پاشاؤں کو برطرف کر دیا جو برائے نام صوبہ دار بنا کر قسطنطنیہ سے بھیجے جاتے تھے، اس طرح ان دونوں صوبوں نے خودمختاری حاصل کر لی، کبھی کبھی وہ باب عالی کی مدد اپنے جنگی بیڑے سے کرتے رہتے تھے لیکن دولت عثمانیہ کے محکوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ اسلامی اخوت کی بنا پر، دونوں حکومتوں کے پاس جنگی جہازوں کے مضبوط بیڑے تھے جو بحر روم میں چکر لگاتے رہتے تھے اور وہاں سے نکل کر بحر اٹلانٹک کے علاقوں پر چھاپا مارا کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ آئس لینڈ اور اسکینڈی نیویا بھی پہنچ جاتے تھے، آئرلینڈ پر تو ان کے حملے اکثر ہوتے رہتے تھے، سلطنت عثمانیہ سے ان حکومتوں کی آزادی کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ دوسری سلطنتیں باب عالی سے جنگ کا اعلان کیے بغیر الجزائر اور تونس کے بحری جہازوں پر حملے کرتی رہتی تھیں اور ان حملوں سے ان کے اور دولت علیہ کے باہمی تعلقات پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑتا تھا، چنانچہ ۱۶۱۶ء میں ایک فرانسیسی بیڑے نے امیر البحر بولو (Beaulieu) کی سرکردگی میں الجزائر کے بیڑے پر حملہ کر کے اس کے بہت سے جہازوں کو غرق کر دیا، اسی طرح ۱۶۲۰ء میں انگریز امیر البحر سر رچرڈ مانسل نے الجزائر پر حملہ کیا کیوں کہ گذشتہ پانچ سال کے اندر الجزائر کے جہازوں نے چار سو انگریزی تجارتی جہازوں کو گرفتار کر لیا تھا لیکن اس حملہ سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، ۱۶۵۵ء میں ایک دوسرے انگریزی بیڑے نے جو امیر البحر بلیک کی قیادت میں تھا، تونس پر گولے برسا کر اس کے جہازوں کی ایک بڑی تعداد جلا ڈالی، اس کے بعد بلیک الجزائر کی طرف بڑھا، وہاں کے ڈے نے بغیر کسی جنگ کے تمام انگریزی قیدیوں کو رہا کر دیا، ان دونوں صورتوں میں انگلستان اور دولت علیہ کے درمیان کسی جنگ کا اعلان نہیں ہوا اور نہ سلطان نے انگلستان کے اس فعل پر کوئی شکایت کی۔

۱۶۶۳ء میں انگلستان، الجزائر اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوا

جس کی رو سے انگلستان کو یہ حق دیا گیا کہ اگر الجزائر کی طرف سے معاہدہ شکنی ہو تو انگلستان اس سے انتقام لے سکتا ہے، مگر اس سے انگلستان اور دولت علیہ کے تعلقات میں کوئی کشیدگی پیدا نہ ہوگی، چنانچہ اس عہد نامہ کے مطابق انگلستان کو بارہا الجزائر پر حملہ کرنے کا اتفاق ہوا لیکن یہ حملے بیشتر بے سود ثابت ہوئے۔

غرض سلطنت عثمانیہ سے الجزائر اور تونس کی آزادی ۱۶۵۰ء کے قریب عمل میں آئی، الجزائر نے تقریباً دو سو برس تک اپنی خود مختاری قائم رکھی لیکن ۱۸۳۰ء میں فرانس نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، تونس کی آزادی نصف صدی سے زائد تک قائم رہی، ۱۸۸۱ء میں یہ حکومت بھی سلطنت فرانس میں شامل کر لی گئی۔

نظام ینی چری میں تبدیلی سلطان محمد رابع کے عہد میں ینی چری کے نظام میں ایک اہم ترمیم کی تکمیل ہوئی، ابتداءً یہ فوج تمام تر ان نوجوانوں پر مشتمل ہوتی تھی جو ہر سال سلطنت کی عیسائی رعایا میں سے منتخب کیے جاتے تھے لیکن سلطان مراد رابع کے وقت سے عیسائی لڑکوں کی قید اٹھا دی گئی، چوں کہ یہ فوج تمام افواج عثمانی میں سب سے زیادہ معزز خیال کی جاتی تھی اور اس کے سپاہیوں کو بہت سے ملکی اور فوجی فوائد حاصل تھے، اس لیے ترکی النسل اور مسلمان امیدوار بھی نہایت شوق کے ساتھ اس میں داخل ہونے کے خواستگار ہوئے۔ چنانچہ قدیم دستور میں پہلے یہ ترمیم کی گئی کہ ینی چری سپاہیوں کے بچوں کو بھی اس میں داخلہ کا حق دیا گیا تھوڑے ہی دنوں کے بعد دوسرے مسلمان امیدوار بھی لیے جانے لگے اور عیسائی رعایا سے ہر سال جو مطالبہ ہوا کرتا تھا، اس میں بہت کچھ تخفیف ہوگئی لیکن ۱۶۷۵ء سے، جو صدر اعظم احمد کوپریلی کی وزارت کا آخری سال تھا، عیسائی لڑکوں کا داخلہ بالکل بند کر دیا گیا، اس ترمیم کے مکمل ہو جانے پر ینی چری کی تعداد میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوگیا، ینی چری سپاہیوں کے بڑے بڑے دستے سلطنت کے خاص خاص شہروں میں متعین کر دیے گئے، جہاں وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ مختلف کاروبار میں مشغول ہو گئے اور

صرف جنگ کے موقعوں پر سلطنت کی دوسری فوجوں کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے، ان کی خاص راہبانہ اور فوجی زندگی کا خاتمہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔

شکار سے حد درجہ شغف ہونے کے باوجود علوم وفنون کی سرپرستی میں سلطان محمد رابع اپنے پیش روؤں سے پیچھے نہ تھا، اسے علماء کی صحبت سے خاص دلچسپی تھی، مؤرخین کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کرتا تھا، وہ انہیں اپنے دربار میں مامور رکھتا اور ان کی کتابوں کی تصحیح خود اپنے قلم سے کرتا تھا۔

سلیمان ثانی

۱۰۹۹ھ تا ۱۱۰۳ھ مطابق ۱۶۸۷ء تا ۱۶۹۱ء

فوج کی سرکشی سلطان سلیمان ثانی بچپن سے محل میں نظر بند رہنے کے بعد پینتالیس سال کی عمر میں تخت سلطنت پر آیا، اس طویل نظر بندی کے باوجود اس نے اپنے پیش رو سے کہیں زیادہ تدبر اور بیدار مغزی کا ثبوت دیا اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس کی تخت نشینی چند سال قبل عمل میں آئی ہوتی تو سلطنت کو ان تباہیوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو محمد رابع کے عہد کے آخری سالوں میں اس پر ہر طرف سے نازل ہوگئی تھیں، دولت عثمانیہ کو جو صدمہ گذشتہ عہد میں پہنچ چکا تھا، اس کی تلافی فوراً ممکن نہ تھی، خصوصاً اس صورت میں کہ فوج باغی ہو رہی تھی اور پایہ تخت کے علاوہ مختلف صوبوں میں بھی سرکشی اور بغاوت کے آثار نمایاں تھے، سلیمان پاشا کا قتل اور محمد رابع کا عزل فوج ہی کی بغاوت کا نتیجہ تھا، سلیمان ثانی نے فوج کی برہمی دور کرنے اور اسے قابو میں لانے کی غرض سے تخت نشینی کے موقع پر بہت کچھ انعام و اکرام تقسیم کیا اور اس کی سرکشی پر کوئی مواخذہ نہ کیا لیکن چند ہی روز کے بعد وہ پھر باغی ہوگئی اور قسطنطنیہ میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا، متعدد وزرا محض ان باغیوں کی خواہش پر علاحدہ کر دیے گئے، آخر میں انہوں نے صدر اعظم سیاوش پاشا کے محل پر بھی حملہ کیا اور اسے قتل کر کے حرم میں داخل ہوگئے اور اس کی بیوی (جو سلطان محمد رابع کی بیٹی تھی) اور بہن اور دوسری خواتین کے ساتھ نہایت گستاخی کے ساتھ پیش آئے، باغیوں کے ساتھ قسطنطنیہ

کے تمام بدمعاش اور اوباش بھی شریک ہو گئے تھے، جن میں عیسائی، یہودی اور مسلمان سب ہی شامل تھے، یہاں تک کہ ان کی شورش اور لوٹ مار نے شہر کے عام باشندوں کو بھی عاجز کر دیا، آخر کار علماء کے ابھارنے پر عوام اور خود ینی چری فوج کے وہ دستے جو محض فوری جوش سے متاثر ہو کر اس ہنگامہ میں شریک ہو گئے تھے، باغیوں کی سرکوبی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور بہ مشکل ان کو قابو میں لائے اور ان کے سرداروں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا، مفتی اعظم اور تین دوسرے بڑے علماء جو اس شورش میں کسی حد تک ینی چری باغیوں کے زیر اثر تھے، اپنے عہدوں سے برطرف کر دیے گئے اور ان کی جگہ زیادہ متدین اور قابل اعتبار اشخاص مقرر کیے گئے، اس طرح پایہ تخت میں تھوڑا بہت امن قائم ہو گیا، لیکن بغاوت کا خطرہ قطعی طور پر زائل نہ ہوا اور صوبوں میں شورش و سرکشی کے مظاہرے عرصہ تک جاری رہے تاہم جون ۱۶۸۸ء میں امن و امان اس حد تک قائم ہو گیا تھا کہ سلطان نے ایک فوج مرتب کر کے ہنگری کی سرحد پر روانہ کی۔

ہجوم مصائب آسٹریا کو دولت عثمانیہ کے اس اختلال و انتشار سے فائدہ اٹھانے کا کافی موقع مل گیا تھا، اس عرصہ میں اس کی تین فوجیں شہزادہ چارلس آف لورین (Charles of Lorraine) شہزادہ لوئی آف بیڈین (Louis of Baden) اور شہزادہ یوجین آف سوائے (Eugene of Savoy) کی سرکردگی میں جو اپنے وقت میں یورپ کے ممتاز ترین جنرل تھے، سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں کی طرف بڑھتی رہیں، ۱۴/ دسمبر ۱۶۸۷ء کو انہوں نے قلعہ ایرلا واقع ہنگری کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا، اس کے بعد بلغراد کا راستہ کھل گیا اور انہوں نے اس کا محاصرہ شروع کیا، صرف تین ہفتہ کی گولہ باری کے بعد بلغراد کے ترک کمانڈر کی غداری سے یہ صد درجہ اہم شہر جو ہنگری کا دروازہ تھا، ۳۰/ اگست ۱۶۸۸ء کو دولت عثمانیہ کے ہاتھ سے آسانی کے ساتھ نکل گیا، شہزادہ لوئی نے تقریباً اسی زمانہ میں بوسنیا پر حملہ کر کے اس کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، ادھر ڈلماشیا بغاوت کر کے عثمانی حکومت سے آزاد

ہوگیا، اس کے بعد آسٹریا کی فوجوں نے نیش اور وڈین پر بھی قبضہ کرلیا اور ۱۶۸۹ء میں ہنگری کے صرف دو قلعوں تمیسوار اور وارآڑدین پر ترکوں کا قبضہ باقی رہ گیا، سرویا اور بوسنیا کے بیشتر علاقے ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

سلطنت کے جنوبی حصہ میں بھی غنیم کی فتوحات کا یہی حال تھا، موروسینی نے تمام موریا فتح کرکے اس میں وینس کی حکومت قائم کردی تھی، البتہ پولینڈ اور روس کے مقابلہ میں ترک اور ان کے حلیف تاتار کامیاب تھے، ۱۶۸۸ء میں کریمیا کی تاتاری فوج نے ایک پولش فوج کو شکست دے کر پولینڈ کے ایک بڑے حصہ کو تاراج کر ڈالا، دوسرے سال روس بھی دولت علیہ کے خلاف اتحادیوں سے مل گیا اور ایک فوج کریمیا پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی لیکن ترکوں نے روسی فوج کو مار کر بھگایا، ترکی فتوحات کا دائرہ وہیں تک پہنچ کر ختم ہوگیا، باقی ہر طرف شکستوں ہی کا سامنا تھا اور سلطنت عثمانیہ کے قدیم مقبوضات پر دشمنوں کا قبضہ دکھائی دے رہا تھا، صوبہ جات بلقان پر آسٹریا کی فوجیں حملہ آور ہو رہی تھیں، سرویا اور بوسنیا کے بہترین حصے آسٹریا کے زیر حکومت آچکے تھے، تمام یونان اور البانیا پر جمہوریہ وینس کے نمائندہ موروسینی کا قبضہ تھا، علاوہ بریں دولت عثمانیہ کا بحری بیڑا وینس، پوپ، مبارزین مالٹا اور ڈیوک آف ٹسکنی (Duke of Tuscony) کے متحدہ بیڑوں سے شکست کھا کر بہت کچھ کمزور ہو چکا تھا۔

مصطفیٰ کوپریلی

مصائب کا یہ ہجوم دیکھ کر سلطان نے نومبر ۱۶۸۹ء میں ایک دیوان ادرنہ میں منعقد کیا اور موجودہ صورت حال کی نسبت ارکان مجلس سے مشورہ کیا، سب نے بالاتفاق یہی رائے دی کہ کوپریلی زادہ مصطفیٰ پاشا صدر اعظم مقرر کیا جائے، چنانچہ احمد کوپریلی کے انتقال کے تیرہ سال بعد جو دولت علیہ کے لیے ہر طرح کی خرابی اور بربادی کا زمانہ تھا، خاندان کوپریلی کا یہ تیسرا فرد سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لیے طلب کیا گیا۔

تقرر کے وقت مصطفیٰ کوپریلی کی عمر باون سال کی تھی، محمد اور احمد کوپریلی کے

دورانِ وزارت میں وہ مختلف ذمہ دار عہدوں پر کام کر چکا تھا، عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے اس نے تمام مشاہیر سلطنت کو مدعو کر کے ایک دیوان منعقد کیا اور ان کے سامنے دولت علیہ کی زبوں حالی کا صحیح صحیح نقشہ پیش کیا، اس نے بتایا کہ اگر ہمارا یہی حال رہا تو آئندہ معرکہ میں غنیم قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے نظر آئے گا، اس کے بعد وہ حکومت کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا اور بعض ایسے محصول جو اس کے پیش روؤں نے غیر ضروری طور پر عائد کر رکھے تھے، جن سے رعایا نہایت پریشان تھی، موقوف کر دیے اور بجائے ان کے امرائے دولت اور اعیان حکومت سے جنہوں نے رعایا پر سختی کر کے خوب دولت جمع کی تھی بڑی بڑی رقمیں وصول کیں اور سلطنت کا خزانہ پر کر دیا، اس نے خود اپنے تمام نقرئی ظروف خزانہ عامرہ میں منتقل کر دیے اور اس کے دستر خوان پر صرف تانبے کے برتن نظر آتے تھے، اس طرح فوج کی فوری ضروریات کے لیے سرمایہ جمع ہو گیا، اس کے بعد اس نے فوج کے لیے نئے سپاہی بھرتی کرنا شروع کیے اور ان تمام آزمودہ کار سپاہیوں اور افسروں کو جو گزشتہ جنگوں کے بعد برطرف کر دیے گئے تھے یا پنشن پا رہے تھے دوبارہ طلب کر کے اس نئی فوج کے ہر دستہ میں تقسیم کر دیا تاکہ نئے سپاہی ان کے تجربہ سے فائدہ اٹھا سکیں، اس نے سلطنت کے اہم صوبوں میں ایسے گورنر مقرر کیے جن پر اسے پورا اعتماد تھا، ترکی بحریہ کی اصلاح اور مضبوطی کے لیے بھی جو گزشتہ معرکوں میں بہت کمزور ہو گیا تھا، اس نے مختلف تدبیریں اختیار کیں اور لائق افسروں کو مقرر کیا، اس نے بہت سی تجارتی پابندیاں بھی جو نامناسب اور غیر ضروری تھیں، اٹھا دیں۔

عیسائی رعایا کے ساتھ مخصوص رعایتیں مصطفیٰ کوپریلی کو تمام رعایا کی فلاح و بہبود کا بے حد خیال تھا اور وہ سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کرتا تھا، اس کی عدالت میں مذہب و ملت اور رنگ و نسل کی کوئی تمیز نہ تھی، اس عموم میں سلطنت کی عیسائی رعایا کو ایک خاص خصوص حاصل تھا، مصطفیٰ پاشا ان کے ساتھ خاص رعایتیں کرتا تھا، وہ دیکھتا تھا کہ

جو مسیحی حکومتیں ترکی پر حملہ آور ہو رہی ہیں انہیں دولت عثمانیہ کی عیسائی رعایا سے بہت کچھ مدد مل رہی ہے، چنانچہ البانیا کی عیسائی رعایا وینس کی فوجوں میں شامل ہو رہی تھی اور سرویا کے باشندے شہنشاہ آسٹریا کی مدد کے لیے تیار تھے، یونان میں موروسینی کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے عیسائیوں نے حملہ آوروں کا استقبال کیا اور ان کے لیے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں، ان واقعات کو دیکھ کر مصطفیٰ پاشا نے عیسائیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی خاص طور پر کوشش کی، چنانچہ اس نے اپنے تقرر کے بعد فوراً ہی تمام پاشاؤں کے نام احکام جاری کیے کہ عیسائی رعایا پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے اور ان کو پوری مذہبی آزادی عطا کی جائے، ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس نے سخت سزائیں دینا شروع کیں، عیسائی رعایا پر مختلف محصول عائد تھے، اس نے جزیہ کے علاوہ تمام محصول معاف کر دیے، جزیہ کی بھی آمدنی کے لحاظ سے تین قسمیں کر دیں، طبقۂ امراء پر چار دوکات فی شخص مقرر کیے، متوسط درجہ کے لوگوں پر دو دوکات اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں پر ایک دوکات پہلے عیسائی رعایا کو صرف اپنے قدیم کنیسوں کی مرمت کا حق حاصل تھا وہ کوئی نیا کنیسہ تعمیر نہیں کر سکتے تھے، مصطفیٰ پاشا نے یہ پابندی اٹھا دی اور انہیں جدید کنیسوں کی تعمیر کا حق بھی دے دیا، چنانچہ اس کے دور وزارت میں بہت سے نئے کنیسے تعمیر کیے گئے، ان تمام رعایتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی رعایا میں دولت علیہ کے ساتھ ایک عام ہمدردی پیدا ہو گئی، خصوصاً ان عیسائیوں میں جو کلیسائے یونان کے پیرو تھے کیوں کہ مغرب کی عیسائی حکومت جو کلیسائے رومہ کی متبع تھیں ان پر قابو پانے کے بعد نہایت ظالمانہ برتاؤ کرتی تھیں اور انہیں بہ جبر اپنے مذہب کا پیرو بنانا چاہتی تھیں، چنانچہ یونان کے عیسائیوں کو موروسینی کی حکومت کا ایسا ہی تلخ تجربہ ہوا اور انہوں نے ان کی تعدیوں سے عاجز آ کر بغاوت کر دی، مصطفیٰ کوپریلی نے لائبریس (Liberuez) نامی ایک یونانی کو جو سات سال سے ترکوں کی قید میں تھا، آزاد کر کے ایک ترکی فوج کے ساتھ موریا روانہ کیا، باغیوں نے اس

فوج کی مدد سے اہل وینس کو اپنے ملک سے نکال کر باہر کیا اور پھر بہ طیب خاطر دولت علیہ کی حمایت میں آگئے، کیوں کہ یہاں کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی تھی۔

مصطفیٰ کوپریلی کا طرز زندگی نہایت سادہ تھا اور نمود و نمائش سے اسے بالطبع نفرت تھی، ضروری باتوں کے علاوہ وہ گفتگو نہ کرتا تھا، اس کے متعلق مشہور تھا کہ نہ اس نے کبھی کوئی جرم کیا اور نہ کوئی غیر ضروری لفظ استعمال کیا، لڑائیوں میں دوسرے سپاہیوں کے ساتھ وہ عام طور پر پیدل ہی کوچ کرتا تھا، اس کا خیمہ اپنی سادگی اور بے تکلفی میں ممتاز رہتا تھا، مطالعہ سے خاص ذوق تھا اور اس سے کبھی نہ تھکتا تھا[۱] کہ دوران جنگ میں بھی جب وہ اپنے خیمہ میں واپس آتا تو کتابیں دیکھا کرتا تھا، اس کے اوصاف حمیدہ کی بنا پر لوگ اسے ”کوپریلی صالح“ کے لقب سے پکارتے تھے۔

مقدونیا کی فتح | مصطفیٰ کوپریلی کے تقرر کے وقت آسٹریا کی فوجیں مقدونیا تک پہنچ گئی تھیں اور وہاں کے عیسائی باشندے اپنے بطریق کی قیادت میں ان کو مدد پہنچا رہے تھے، ایک عیسائی سردار کارپوس (Karpos) نے آسٹریا کی سرپرستی میں آزادی کا اعلان کرکے کرال (Karal) کا قدیم لقب بھی اختیار کرلیا تھا، چنانچہ اب سلطنت عثمانیہ کے یورپین مقبوضات کے قلب پر حملہ شروع ہو گیا تھا۔ ان حالات میں کوپریلی نے ایک مجلس جنگ منعقد کی، جس میں سلیم گرائی خان کریمیا اور ہنگرین سردار تکلی بھی حاضر تھا اور مجلس کا فیصلہ حاصل کرنے کے بعد خالد پاشا سر عسکر موریا کی سرکردگی اور سلیم گرائی کی معیت میں ایک فوج مقدونیہ کو روانہ کی، ترکی اور تتاری فوجوں نے جرمنی، آسٹریا اور البانیا کی متحدہ فوجوں کو دو معرکوں میں شکست دی اور کارپوس کو گرفتار کرکے قتل کردیا، مقدونیا اور اس کے نواح کے وہ تمام اہم مقامات جن پر آسٹریائی فوجوں نے قبضہ کرلیا تھا، ترکوں نے واپس لے لیے۔

مزید عثمانی فتوحات | مقدونیا کی فتوحات کے بعد کوپریلی نے دوسرے حصوں کے

---

[۱] فریڈیک، ص ۱۳۹۔

تحفظ کا سامان شروع کیا اور اگست ۱۶۹۰ء میں ایک زبردست فوج کے ساتھ بلغاریا اور سرویا سے ہوتا ہوا آسٹرین فوجوں سے مقابلہ کے لیے بڑھا صوفیہ اور نیش کے درمیان ڈراگومن کے مقام پر دو روز تک سخت معرکہ رہا، جس میں بالآخر آسٹرین فوجوں کو سخت شکست ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں، اس کے بعد مصطفی کوپریلی نے نیش کا محاصرہ کر لیا اور صرف تین ہفتہ میں اسے فتح کر لیا، ادھر ٹرانسلوینیا میں ٹیکلی نے جسے ترکوں کی حمایت حاصل تھی تخت پر قبضہ کر کے دولت عثمانیہ کی سیادت کا اعلان کر دیا، نیش کو فتح کرنے کے بعد کوپریلی سمندریہ کی طرف بڑھا اور چار ہی روز میں اسے بھی فتح کر کے ودین پر دوبارہ قبضہ کر لیا، ودین کی فتح کے بعد اس نے بلغراد کا محاصرہ کیا اور محاصرہ کے بارہویں روز عثمانی لشکر قلعہ میں داخل ہو گیا، اس اہم شہر میں ایک فوجی دستہ متعین کرنے کے بعد اور سرویا سے آسٹرین فوجوں کو نکال کر مصطفی کوپریلی فاتح کی حیثیت سے قسطنطنیہ کو واپس ہوا اور دارالسلطنت میں اس کا استقبال بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا۔

سلیمان کی وفات: ۱۰ مئی ۱۶۹۱ء کو مصطفی کوپریلی ایک تازہ لشکر کے ساتھ پھر آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ ہوا لیکن اس جنگ کے ختم ہونے سے قبل ہی سلطان سلیمان ثانی کا انتقال ہو گیا۔

احمد ثانی

۱۱۰۲ھ تا ۱۱۰۶ھ مطابق ۱۶۹۱ء تا ۱۶۹۵ء

سلطان سلیمان ثانی کی وفات پر اس کا بھائی احمد ثانی ۱۳/ جولائی ۱۶۹۱ء کو تخت نشین ہوا، اس نے مصطفیٰ کوپریلی کو صدر اعظم کے عہدہ پر برقرار رکھا اور سلطنت کے تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں چھوڑ دیے، کوپریلی نے عثمانی فوجیں بلغراد میں جمع کیں اور وہاں سے آسٹریا کی شاہی فوجوں کے مقابلہ کے لیے دریائے ڈینوب کے دائیں ساحل سے ہوتا ہوا شمال کی طرف بڑھا، ۱۹/ اگست ۱۶۹۱ء کو سلانکیمان (Salankeman) کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، ساتھ ہی عیسائی اور ترکی بیڑوں میں بھی دریائے ڈینوب میں چھڑ گئی، ترکی بیڑے نے عیسائی بیڑے کو شکست دی لیکن اس فتح سے ترک فائدہ نہ اٹھا سکے کیوں کہ بری جنگ میں انہیں سخت ہزیمت ہوئی، مصطفیٰ کوپریلی نے اپنے آزمودہ کار رفقاء کے مشورہ کے خلاف کمک کا انتظار کیے بغیر آسٹرین فوج پر حملہ کر دیا، جب اس نے دیکھا کہ ترکوں کے قدم اکھڑ رہے ہیں تو خود تلوار لے کر عیسائی فوج کے قلب میں گھس گیا اور تیغ زنی کے جوہر دکھاتا ہوا مارا گیا، عثمانی فوجیں اس کی شہادت کے بعد میدان جنگ میں ٹھہر نہ سکیں اور بھاگ کھڑی ہوئیں، اس کے بعد آسٹریا کی ایک فوج نے ٹرانسلوینیا پر حملہ کیا اور تکلیلی کو وہاں سے نکال کر اس علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

احمد ثانی کی بقیہ مدت سلطنت میں جنگ کا سلسلہ کم و بیش برابر جاری رہا لیکن یہ

تمام لڑائیاں چھوٹی چھوٹی تھیں اور ان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، البتہ جمہوریہ وینس سے جو لڑائی ہوئی اس نے جزیرہ ساقز سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل گیا، ان شکستوں اور اندرونی بغاوتوں کے علاوہ اس عہد میں وبا اور قحط کے بھی کئی حملے ہوئے، سمرنا میں ایک بڑا زلزلہ آیا جس سے بہت نقصان پہنچا اور پھر ستمبر ۱۶۹۳ء میں خود قسطنطنیہ میں ایک زبردست آگ لگی جو اس زلزلہ سے بہت زیادہ بربادکن ثابت ہوئی۔

۲۲؍ جمادی الثانی ۱۱۰۶ھ (۶؍ فروری ۱۶۹۵ء) کو احمد ثانی نے انتقال کیا۔

مصطفیٰ ثانی

۱۱۰۶ھ تا ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۶۹۵ء تا ۱۷۰۳ء

احمد ثانی کی وفات پر معزول سلطان محمد رابع کا لڑکا شہزادہ مصطفیٰ تخت نشین ہوا، یہ نہایت شجاع اور اولوالعزم فرماں روا تھا، تخت نشینی کے تیسرے ہی روز اس نے ایک ''خط شریف'' جاری کیا جس میں سلطنت کے افسوس ناک حالات بیان کر کے انہیں اپنے پیش روؤں کی غفلت اور عیش پسندی کا نتیجہ قرار دیا اور ان کی اصلاح کے لیے پوری آمادگی اور مستعدی ظاہر کی، اس وقت آسٹریا، روس، وینس اور پولینڈ سے لڑائی کا سلسلہ کم وبیش جاری تھا، مگر سب سے زیادہ خطرہ آسٹریا کی طرف سے تھا، چنانچہ مصطفیٰ نے دیوان منعقد کر کے اعیان حکومت سے یہ دریافت کیا کہ غنیم کے مقابلہ میں فوجوں کا روانہ کر دینا کافی ہوگا یا اسے خود بھی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں جانا چاہیے، تین دن تک غور و مشورہ کرنے کے بعد دیوان اس فیصلہ پر پہنچا کہ میدان جنگ میں سلطان کا جانا نہ صرف اس کی ذات کو خطرہ میں ڈالنا ہے بلکہ اس سے لشکر کے اخراجات میں بھی بہت اضافہ ہو جائے گا، چنانچہ دیوان نے متفقہ طور پر یہ گذارش کی کہ ذات سلطانی کو جنگ کے خطرات میں ڈالنا مناسب نہیں، فوج کی کمان صدر اعظم کو سپرد کر دینا کافی ہوگا لیکن سلطان نے اس معروضہ کا صرف اس قدر جواب دیا کہ ''مجھے فوج کے ساتھ جانے پر اصرار ہے'' چنانچہ اس عزم کے مطابق ۱۶۹۵ء کے موسم گرما میں وہ بلغراد سے تمیسوار کو روانہ ہوا اور راستہ میں متعدد اہم قلعے جو

آسٹریا کے قبضہ میں جا چکے تھے، دوبارہ فتح کر لیے، ۲۲ ستمبر ۱۶۹۵ء کو آسٹریا کی فوج جو ویٹرانی (Veterani) کے زیر کمان تھی، لیوگوس کے قریب مقابلہ ہوا، سلطان کو شاندار فتح ہوئی اور ویٹرانی اور اس کی نصف فوج ماری گئی۔

جنگ کی تیاری | موسم سرما میں جنگ ملتوی ہوگئی، اس فرصت میں مصطفیٰ اپنے وزراء کی مدد سے مالیات کی درستی اور فوج کے اضافہ و تنظیم میں ہمہ تن مصروف رہا، اس نے تمباکو، حبشی خواجہ سرا اور دیگر تعیشات پر بڑے بڑے ٹیکس عائد کیے، اکثر عمائدین سلطنت نے بھی وقت کی ضرورت اور سلطان کے جوش سے متاثر ہو کر سلطنت کی مدد میں سرگرمی دکھائی اور آئندہ جنگ کے لیے فوجیں اٹھائیں، جن کے مصارف انہوں نے خود برداشت کیے، مصطفیٰ نے قسطنطنیہ وادرنہ کے شاہی باغبانوں (بوستانجی) میں سے تین ہزار پیدل سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کی، جسے اس موقع پر اس نے تین رسالوں میں تقسیم کر کے خاص اہتمام سے تعلیم دلوائی۔

ابتدائی فتوحات | ۱۶۹۶ء میں مصطفیٰ ایک زبردست فوج کے ساتھ پھر آگے بڑھا اور تیمسوار کے قریب آسٹرین فوج کو جو ڈیوک ڈی ساکس (Duke Desaxe) کی سرکردگی میں تھی، شکست دے کر تیمسوار کو غنیم کے محاصرہ سے چھڑا لیا، اس کے بعد ہنگری کے ان قلعوں کو جو ابھی دولت عثمانیہ کے قبضہ میں تھے، مزید فوجی دستوں سے مستحکم کر کے ادرنہ واپس آ گیا، ان فتوحات سے ترکوں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور ان میں ایک تازہ جوش پیدا ہو گیا، عثمانی فوجوں نے جو ایک عرصہ سے مدافعانہ جنگ میں پسپا ہوتی آ رہی تھیں، اب فاتحانہ طور پر دشمن کے مقابلہ میں بڑھنا شروع کیا اور توقع کی جانے لگی کہ مصطفیٰ ثانی کے مبارک عہد میں پچھلے عہدوں کی تلافی ہو جائے گی لیکن دوسرے سال ۱۶۹۷ء میں آسٹریا کے ساتھ جو معرکہ پیش آیا اس نے تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا اور سلطنت عثمانیہ کی ہیبت بالآخر یورپ کے دل سے نکل گئی۔

زنتا کی شکست | ۱۶۹۷ء میں مصطفیٰ ایک تازہ فوج کے ساتھ بلغراد سے روانہ ہو کر

ہنگری میں داخل ہوا اور شمال میں دریائے تھائیس کی طرف بڑھا، آسٹریا کی فوجیں اس وقت شہزادہ یوجین (Eugene) کے زیر کمان تھیں، جو اپنے عہد کا سب سے زیادہ مشہور جنرل تھا، ۱۱ر ستمبر کو دونوں فوجوں کا مقابلہ لب ساحل زنتا (Zenta) کے مقام پر ہوا، ترکوں نے وہاں ایک پل بنالیا تھا اور سلطان اپنے سواروں اور توپ خانہ کے بڑے حصہ کے ساتھ دریا کو عبور کرکے اس کے دوسرے کنارہ پر پہنچ چکا تھا لیکن پیدل سپاہی ابھی اسی کنارہ پر تھے، شہزادہ یوجین دفعۃً ان کے سر پر آپہنچا اور ان سپاہیوں پر جو اس وقت تک دریا عبور نہ کرسکے تھے حملہ کردیا، بدقسمتی سے ترکی فوج کے مختلف دستے اس وقت باہمی جھگڑوں میں مبتلا تھے، افسروں میں بھی اختلافات تھے اور ان میں سے بعض صدر اعظم الماس محمد پاشا سے بغض و عداوت رکھتے تھے، میدان جنگ ہی میں ینی چری کی ایک بڑی تعداد نے بغاوت کردی اور خود اپنے افسروں کو قتل کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ترک شہزادہ یوجین کے حملہ کی تاب نہ لاسکے اور انہیں بری طرح شکست ہوئی، ان کے چھبیس ہزار آدمی میدان جنگ میں مارے گئے اور دس ہزار دریا عبور کرنے کی کوشش میں غرق ہو کر ہلاک ہوگئے، ان کے علاوہ صدر اعظم، چار وزیر اور بہت سے فوجی افسر کام آئے، سلطان جو دریا کے دوسرے کنارہ سے اس جنگ کو دیکھ رہا تھا، بھاگ کر تمیسوار پہنچا اور وہاں سے بلغراد ہوتا ہوا قسطنطنیہ واپس آگیا، اس کے بعد اس کی بقیہ فوج بھی بلغراد سے ہو کر واپس چلی آئی، اس کے بعد شہزادہ یوجین دریائے ڈینوب کو عبور کرکے بوسنیا میں داخل ہوا اور اس کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا، زنتا کی شکست ترکوں کی فوجی طاقت کے زوال کا ایک ایسا اعلان تھی جس کی آواز یورپ کے دور دراز گوشوں میں بھی جاپہنچی اور مغربی سلطنتیں اب اپنے کو عثمانی حملوں سے بالکل محفوظ خیال کرنے لگیں۔

حسین کوپریلی جنگ زنتا کے چھ روز بعد سلطان مصطفیٰ ثانی پھر خاندان کوپریلی کی طرف متوجہ ہوا اور سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لیے اسی خاندان کے ایک فرد حسین

کوپریلی کو صدر اعظم مقرر کیا، حسین کوپریلی صدر اعظم محمد کوپریلی کا بھتیجا تھا اور اس میں انتظامِ سلطنت کا وہ غیر معمولی ملکہ جو کوپریلی خاندان کا نمایاں امتیاز تھا، بہت زیادہ پایا جاتا تھا، محاصرہ وینا کی ناکامی تک حسین کوپریلی ایک آزاد مزاج نوجوان تھا اور محض عیش و عشرت سے سروکار رکھتا تھا لیکن ویانا کی عبرت ناک شکست کے بعد اس نے اپنے قومی فرض کو محسوس کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو استعداد عطا فرمائی تھی اسے دولت علیہ کی خدمت کے لیے وقف کردیا، صدر اعظم کے عہدہ پر فائز ہونے سے پیشتر وہ مختلف اعلیٰ عہدوں پر کام کر چکا تھا، اور اپنی لیاقت واہلیت کا ثبوت دے چکا تھا، ۱۶۹۷ء میں صدر اعظم مقرر ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے سلطنت کی فوجی قوت کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں مالیات کی طرف خاص توجہ کی، گذشتہ جنگ میں خزانہ پر بہت زیادہ بار پڑ چکا تھا، اس کی تلافی کے لیے اس نے مختلف تدبیریں اختیار کیں، مثلاً پہلے کافی پر محصول لگایا، پھر حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدہ داروں پر ایک قسم کا انکم ٹیکس عائد کیا اور آخر میں جائداد موقوفہ کی آمدنی سے بھی دولت علیہ کی شدید ضروریات کے لیے ایک بڑی رقم حاصل کی، اس طرح اس نے کافی سرمایہ فراہم کر کے سلطنت کے یورپین صوبوں کی حفاظت کے لیے پچاس ہزار پیادوں اور اڑتالیس ہزار سواروں کی ایک فوج تیار کر لی، اس کے علاوہ اس نے ایک بیڑا بحر اسود میں بھیجا اور دوسرا بحر روم میں لیکن دراصل تمام تیاریاں اس نے مدافعت کے لیے کی تھیں اور ان سے کوئی جارحانہ اقدام مقصود نہ تھا کیوں کہ وہ سلطنت کی کمزوری سے خوب واقف تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر جنگ پھر شروع ہوگئی تو اس کا نتیجہ سلطنت کے حق میں مزید تباہیوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا، بہر حال ان تیاریوں کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ آسٹریا کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور ترکی فوج کے سپہ سالار روان طبان پاشا نے شہزادہ یوجین کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا یہاں تک کہ اس نے بوسنیا کو خالی کردیا۔

سقوطِ ازف اس درمیان میں وینس سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس کی فوجیں

ڈلماشیا میں آگے بڑھتی جا رہی تھیں، یونان میں اہلِ وینس کے قدم خاکنائے کورنتھ سے آگے پہنچ چکے تھے، اگرچہ نگروپونٹ پر وہ قبضہ نہ کر سکے اور ترکی امیر البحر نے ان کے بیڑوں کو دوبارہ شکست دے کر جزیرہ کیوس (Chios) کو واپس لے لیا، پولینڈ سے گو اس وقت کوئی جنگ نہ تھی لیکن خان کریمیا کے حملے کو ابھی دو ہی سال گزرے تھے اور اہلِ پولینڈ دولت علیہ کے خلاف ہر ممکن موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن سب سے بڑا خطرہ روس کا تھا، پیٹر اعظم اپنی وسیع سلطنت کو روز بروز زیادہ طاقت ور بنا رہا تھا، اس نے آسٹروی اور فرانسیسی فوجوں کے نمونہ پر ایک مضبوط فوج تیار کر لی تھی لیکن اصلی زور وہ بحری طاقت پر دے رہا تھا، کیوں کہ وہ بحر اسود میں اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا، اسی مقصد کے لیے وہ دولت عثمانیہ کے خلاف پوری قوت سے جنگ کرنا چاہتا تھا، سب سے پہلے اس نے ازف پر قبضہ کرنا چاہا اور ۱۶۹۵ء میں ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا، یہ محاصرہ ناکام رہا اور تیس ہزار سپاہیوں کی لاشیں میدان میں چھوڑ کر اسے پسپا ہونا پڑا لیکن دوسرے سال اس نے پھر تازہ فوجوں کے ساتھ شہر کا محاصرہ کیا اور اس کے بحری بیڑے نے ترکی بیڑے کو شکست دی، اب کی بار محاصرہ کامیاب رہا اور ۲۸ر جولائی ۱۶۹۶ء کو ازف نے ہتھیار ڈال دیے۔

صلح نامۂ کالووٹز غرض زنتا کی شکست کے وقت دولت علیہ ہر طرف سے دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اور حسین کوپریلی کے حسنِ انتظام کے باوجود اس میں بیک وقت تمام دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی، حسین کوپریلی اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھا، چنانچہ جب سفیر برطانیہ لارڈ پیجیٹ (Lord Paget) نے برطانیہ اور ہالینڈ کی وساطت سے صلح کی تحریک شروع اور شرطِ صلح یہ قرار دی کہ ہر فریق کا قبضہ اس کی فتوحات پر قائم رکھا جائے تو حسین کوپریلی نے ایک دیوان منعقد کر کے اس مسئلہ کو ارکانِ حکومت کے مشورہ کے لیے پیش کیا، ذاتی طور پر وہ صلح کا حامی تھا اور اسی کی تحریک سے دیوان نے بھی برطانیہ اور ہالینڈ کی وساطت منظور کی مگر صلح کا مذکورۂ بالا اصول سلطان مصطفیٰ کے لیے کسی طرح قابل

قبول نہ تھا اور اس نے اس کی منظوری چند اہم ترمیمات پر مشروط کر دی، بالآخر یہ طے پایا کہ صلح کا مسئلہ ایک کانگریس کے سپرد کر دیا جائے، جس میں دولت عثمانیہ، آسٹریا، روس، پولینڈ، وینس، برطانیہ اور ہالینڈ کے نمائندے شریک ہوں، اس کانگریس کے لیے کارلووٹز کے مقام تجویز ہوا، جو پیٹروارڈین کے قریب واقع تھا، ابتداءً روس کانگریس کی شرکت سے انکار کرتا رہا، کیوں کہ اور وہ ازف کے علاوہ اور مقامات پر بھی قبضہ کرنے کا خواہش مند تھا اور یہ لارڈ ہیجٹ کے پیش کردہ اصول کی بناء پر ممکن نہ تھا لیکن دوسری سلطنتوں نے مجبور کر کے اسے بھی کانگریس میں شریک کیا، بہتر روز کے بحث و مباحثہ کے بعد فی الجملہ لارڈ ہیجٹ کے اصول کے مطابق ایک صلح نامہ ۲۴ رجب ۱۱۱۰ھ (۲۶ جنوری ۱۶۹۹ء) کو مرتب کیا گیا، جو صلح نامۂ کارلووٹز (Carlowitz) کے نام سے مشہور ہے، اس کے رو سے آسٹریا کا قبضہ ٹرانسلوینیا، سلاوونیا اور ہنگری کے ان تمام علاقوں پر جو دریائے مروش کے شمال اور دریائے تھیس کے مغرب میں واقع تھے قائم رکھا گیا، اب ہنگری میں عثمانیوں کے سابق مقبوضات میں سے صرف ایک ثلث پر ان کی حکومت باقی رہ گئی، آئندہ کے لیے وہ خراج بھی موقوف کر دیا گیا، جو شہنشاہ آسٹریا، ہنگری اور ٹرانسلوینیا کی طرف سے سلطان کی خدمت میں پیش کرتا تھا، وینس کا قبضہ موریا اور البانیا پر باقی رکھا گیا لیکن آبنائے کورنتھ کے شمال میں جو مقامات اس نے فتح کیے تھے، وہ لارڈ ہیجٹ کے اصول کے باوجود دولت عثمانیہ کو واپس دل دیے گئے، البتہ جزیرہ زنط کا خراج اسے معاف کر دیا گیا، پولینڈ کو پوڈولیا اور کامینک واپس مل گئے، روس کا قبضہ شہر ازف اور بحر ازف کے شمالی علاقوں پر قائم رکھا گیا، پیٹر اعظم کو اس سے سیری نہ ہوئی اور اس نے صرف دو سال کے لیے اس صلح نامہ پر دستخط کیے، دوسری حکومتوں نے پچیس سال کے لیے صلح کا معاہدہ کیا۔

صلح نامۂ کارلووٹز کی نسبت کریسی آل عثمان کے مشہور جرمن مورخ فان ہیمر کی رائے نقل کرتا ہے کہ یہ صلح نامہ نہ صرف اس وجہ سے یادگار رہے گا کہ اس نے اہم ملکی

تبدیلیوں کو برقرار رکھا اور نہ محض اس وجہ سے کہ اس کے بعد ہی سلطنت عثمانیہ کی فاتحانہ طاقت کا رعب دلوں سے زائل ہو گیا، بلکہ اس وجہ سے بھی یادگار رہے گا کہ اس موقع پر باب عالی اور روس نے پہلی بار ایک عام یورپین کانگریس میں شرکت کی اور اس کانگریس میں برطانیہ اور ہالینڈ کے نمائندوں کو داخل کر کے جب کہ ان دونوں میں سے کوئی حکومت بھی جنگ میں شریک نہ تھی، سلطان اور زار روس دونوں نے اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ مفاد عامہ کے لیے یورپ کی حکومتیں دوسری سلطنتوں کے باہمی نزاعات میں دخل دے سکتی ہے۔

ملکی اصلاحات صلح نامہ کارلووٹز کے تکملہ کے بعد حسین کوپریلی نے سلطنت کے اندرونی معاملات کی جانب توجہ کی، گذشتہ جنگ کے آخری سالوں میں کریمیا، مصر اور عرب میں بغاوت شروع ہو گئی تھی، ایران کی سرحد پر بھی بہت شورش تھی، حسین کوپریلی نے ان تمام بغاوتوں کا استیصال کر کے سلطنت کے ہر حصہ میں امن وامان قائم کیا، اس کے بعد اس نے حکومت کے ہر شعبہ کی اصلاح شروع کی، چنانچہ فوج، بحریہ، مالیات، مدارس وجوامع، اوقاف، تمام شعبوں میں اصلاحات جاری کیں، بحریہ کے لیے اس نے ایک جدید "قانون نامہ" مرتب کیا، کوپریلی کو عیسائی رعایا کی بہبودی کا خاص طور پر خیال رہتا تھا اور وہ ان کے ساتھ بڑی رعایتیں کرتا تھا، چنانچہ اس نے بوسینا اور سربات کے عیسائیوں کا ایک سال کا جزیہ معاف کر دیا اور رومیلیا کے عیسائی رعایا کے ذمہ جو محصول باقی تھا، اسے بھی چھوڑ دیا، اس نے مسجدیں، مدرسے، بازار اور چھاؤنیاں سلطنت کے ہر حصہ میں بہت کثرت سے تعمیر کرائیں لیکن ان تمام خدمات کے باوجود بعض دشمنوں نے اس کے خلاف سلطان کے کان بھرنا شروع کیے، یہ دیکھ کر حسین کوپریلی نے ستمبر ۱۷۰۲ء میں اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا، چند ہی دنوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

دال طبان پاشا حسین کوپریلی کی وفات پر سلطان نے دال طبان پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، وہ ایک جنگ جو سپاہی تھا اور جنگ کے علاوہ کسی اور بات سے دلچسپی نہ رکھتا تھا،

اس نے معاہدہ کارلووٹز کو چاک کرڈالنا چاہا لیکن رعایا اور فوج دونوں اس کی پالیسی کو سلطنت کے لیے مضر خیال کرتے تھے اور دونوں نے مل کر سلطان سے اس کی معزولی کی درخواست کی، مفتی فیض اللہ بھی جو ابتداءً اس کا طرف دار تھا، بعد میں سخت مخالف ہوگیا اور اسی کی کوشش سے دال طبان پاشا معزول کر دیا گیا۔

مصطفیٰ کی معزولی

دال طبان پاشا کے بعد رامی محمد پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، وہ حسین کوپریلی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے ان مفاسد کی اصلاح شروع کی جو کوپریلی کے بعد پھر سلطنت میں رونما ہونے لگے تھے، اس سلسلہ میں بہت سے لوگ جن کو نقصان پہنچ رہا تھا، اس کے مخالف ہوگئے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے، چوں کہ وہ کوئی ممتاز فوجی افسر نہ تھا، اس لیے ینی چری بھی اس سے خوش نہ تھے اور بعض مفسدوں کے ابھارنے پر انہوں نے سلطان سے اس کی معزولی کا مطالبہ کیا، اس مطالبہ نے جنوری سنہ ۱۷۰۳ء میں بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور قسطنطنیہ ینی چری کی شورشوں کا مرکز بن گیا، فوج نے رامی محمد پاشا کے علاوہ مفتی فیض اللہ کی معزولی کا بھی مطالبہ کیا، سلطان اس وقت ادرنہ میں تھا، اس نے مفتی فیض اللہ کو تو معزول کر دیا لیکن رامی محمد پاشا کا معاملہ اپنے قسطنطنیہ پہنچنے تک ملتوی رکھا، باغیوں نے اب خود سلطان کے عزل کی تحریک کی اور علماء سے اس کے متعلق فتویٰ حاصل کر لیا، سلطان نے اپنا خاص ینی چری دستہ باغیوں کے مقابلہ میں روانہ کیا لیکن دستہ بھی ان ہی میں شامل ہوگیا، یہ دیکھ کر مصطفیٰ ۲ ربیع الاول ۱۱۱۵ھ (۱۵/ اگست ۱۷۰۳ء) کو تخت سے اتر آیا اور باغیوں نے اس کے بھائی احمد کو تخت پر بٹھایا، اسی سال ۲۲/ شعبان (۳۱/ دسمبر ۱۷۰۳ء) کو مصطفیٰ کا انتقال ہوگیا۔

سلطان مصطفیٰ ثانی ایک دانش مند اور بیدار مغز سلطان تھا، ابتدائے عہد میں اس نے بڑی ہمت اور شجاعت کا ثبوت دیا اور متعدد اہم فتوحات حاصل کیں لیکن زنتا کی شکست کے بعد سلطان کی فوجی قوت اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ آسٹریا سے کامیاب مقابلہ کرنا ممکن نہ

تھا، ایسی حالت میں صلح کے لیے راضی ہو جانا مصلحتِ وقت کے عین مطابق تھا، بعض یورپین مؤرخین مصطفیٰ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ معاہدہ کارلووٹز کے بعد اس کی جنگی سرگرمیاں بالکل موقوف ہو گئیں اور وہ عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا لیکن واقع یہ ہے کہ سلطنت میں جنگ کی طاقت نہ تھی، علاوہ بریں ہر طرف بغاوت برپا تھی، جس کا استیصال نہایت ضروری تھا، نیز حکومت کے تمام شعبے اصلاح کے محتاج تھے، مصطفیٰ نے ان ہی امور کی طرف اپنی توجہ رکھی اور صدر اعظم حسین کوپریلی کی مدد سے ان ہی کا تکملہ کیا، جب وہ ان اصلاحات سے فارغ ہوا تو دال طبان پاشا اور رامی محمد پاشا کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے اور ان کے بعد ہی فوج نے خود اس کی معزولی کا فیصلہ کیا، ان حالات میں اس نے جو کچھ سلطنت کے لیے کیا اس سے زیادہ ممکن بھی نہ تھا۔

احمد ثالث

۱۱۱۵ھ تا ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۰۳ء تا ۱۷۳۰ء

سلطان احمد ثالث کی تخت نشینی ینی چری کی بغاوت کا نتیجہ تھی، اس لیے تخت پر آنے کے بعد اس نے بہت کچھ انعام و اکرام دے کر باغیوں کو راضی کیا اور ان کے مطالبہ پر مفتی فیض اللہ آفندی کے قتل کی اجازت دے دی۔ مفتی موصوف کا جرم یہ تھا کہ وہ اس فوج کی خود سری کے مخالف تھے لیکن یہ خون جلد رنگ لایا اور سلطان نے قابو پانے کے بعد ینی چری سے پورا قصاص لیا اور ان کے بہت سے افسروں کو قتل کرا دیا، اس نے احمد پاشا صدر اعظم کو جو باغیوں کا منتخب کردہ تھا، معزول کر دیا اور اس عہدہ پر اپنے بہنوئی و داماد حسن پاشا کو مامور کیا لیکن سازشوں نے حسن پاشا کی صدارت کو بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہنے دیا اور وہ بھی معزول کر دیا گیا، اس کے بعد متعدد اشخاص صدر اعظم مقرر ہوئے اور تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد علاحدہ کر دیے گئے، چنانچہ اس عہد کے ابتدائی پندرہ سالوں میں بارہ صدر اعظم یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹر اعظم کی خارجی پالیسی کی طرف جیسی توجہ کرنی چاہیے تھی، دولت علیہ نہ کر سکی اور روس کی طاقت بڑھتی ہی چلی گئی۔

روس سے جدید معاہدہ | ۱۷۰۰ء میں روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان جو معاہدہ تھا، پیٹر اس پر دیانت داری کے ساتھ قائم نہ تھا، وہ اپنی مملکت کے جنوبی صوبوں میں جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا، احمد ثالث نے تخت نشینی کے بعد پیٹر کو اس امر کی شکایت لکھ بھیجی لیکن

سلطنت کے اندرونی اختلال کی وجہ سے جو ینی چری کی سرکشی کے باعث شروع میں پیدا ہوگیا تھا، وہ کسی جنگی مظاہرہ کے لیے تیار نہ تھا، روس بھی سویڈن سے قوت آزمائی کر رہا تھا اور دولت عثمانیہ سے کوئی نئی جنگ چھیڑ دینا اس کی مصلحت کے بھی خلاف تھا، چنانچہ ۱۷۰۵ء میں دونوں سلطنتوں میں ایک جدید معاہدہ ہوا اور جنگ کچھ دنوں کے لیے پھر ملتوی ہوگئی، تاہم دولت علیہ روس کی نقل و حرکت سے غافل نہ تھی اور بحر اسود کے ساحل پر پیٹر جو نئے قلعے تعمیر کرا رہا تھا، ان کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

چارلس پیٹر کی زیادہ تر توجہ فی الحال سویڈن کی جانب تھی، جس کا فرماں روا چارلس دوازدہم نہایت بہادری کے ساتھ روس کی پوری طاقت کا مقابلہ کر رہا تھا، ترکوں کو چارلس کے ساتھ بہت ہمدردی تھی لیکن روس کے ساتھ جو معاہدہ ہو چکا تھا اس کی وجہ سے وہ چارلس کی مدد کرنے سے معذور تھے، ۸؍ جولائی ۱۷۰۹ء کو پلٹوا (Paltowa) کے مقام پر چارلس کو سخت شکست ہوئی اور اس نے بھاگ کے سلطنت عثمانیہ کے حدود میں پناہ لی، سلطان احمد ثالث نے اس کا استقبال شاہانہ احترام کے ساتھ کیا لیکن اس کی حمایت میں پیٹر سے جنگ شروع کردینے پر تیار نہ ہوا، البتہ جب پیٹر نے یہ خواہش کی کہ چارلس کو پناہ نہ دی جائے تو سلطان نے صاف جواب دے دیا کہ آئین شرافت کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور پیٹر کی دھمکیوں کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔

روس سے اعلانِ جنگ پلٹوا کے معرکہ کے بعد پیٹر نے لیوونیا (Livonia) کو فتح کیا جس سے بحر بالٹک میں داخل ہونے کی راہ کھل گئی، اس کے بعد وہ دولت علیہ کی طرف متوجہ ہوا اور بحر اسود میں دخل حاصل کرنے کے لیے کریمیا پر حملہ کی تیاری کرنے لگا، ازف کے قلعہ اور بحر ازف کے شمالی مشرقی ساحل پر اس کا قبضہ پہلے سے تھا، اس نے تگنروگ (Taganrog) اور دوسرے قلعوں کو جن سے کریمیا پر زد پڑتی تھی، مستحکم کرلیا، سلطان پیٹر کی ان جنگی تیاریوں کو دیکھ رہا تھا، دونوں سلطنتوں کے تعلقات چارلس کے قیام کی وجہ سے اور

زیادہ کشیدہ ہوگئے تھے، وہ برابر سلطان کو روس سے جنگ کرنے کے لیے ابھار رہا تھا، سلطان پر ابتدا میں اس ترغیبوں کا اثر نہ پڑا لیکن جب خان کریمیا نے آستانہ میں حاضر ہو کر ان تمام خطرات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا جو پیٹر کی تیاریوں نے پیدا کر دیے تھے تو بالآخر مجبور ہو کر اس نے ۲۸؍ نومبر ۱۷۱۰ء کو روس سے جنگ کا اعلان کر دیا، ۲۵؍ فروری ۱۷۱۱ء کو پیٹر کی طرف سے بھی ماسکو کے سب سے بڑے کلیسا میں ترکوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا گیا، اس نے اس جنگ کو ایک مذہبی جنگ قرار دیا جس کا مقصد یورپ سے ترکوں کو نکال دینا تھا، روسی علم کے ایک جانب صلیب کی تصویر بنی ہوئی تھی اور دوسری جانب یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "خدا اور مسیحیت کے لیے"۔

مئی ۱۷۱۱ء میں صدر اعظم بلطہ جی محمد پاشا عثمانی فوجوں کے ساتھ مولڈیویا کی طرف روانہ ہوا، جس کا امیر دولت علیہ سے غداری کر کے پیٹر سے مل گیا تھا اور پیٹر اس کی مدد سے بلقان کی سلافی قوموں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف ابھار رہا تھا،[1] چنانچہ پیٹر بھی اپنی فوج لے کر مولڈیویا میں داخل ہوا، روسی فوجوں کی تعداد عثمانی فوجوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی، تاہم پیٹر اپنے جوش میں آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ دریائے پرتھ کو عبور کر کے اس کے ساحل پر خیمے نصب کر دیے، وہاں پہنچ کر اسے اپنی غلطی معلوم ہوئی، کیوں کہ اس کے ایک بازو پر دریائے پرتھ اور دوسرے پر ایک وسیع دلدل تھا اور سامنے کی پہاڑیوں پر بلطہ جی محمد پاشا اپنی فوجوں کے ساتھ قابض تھا، روسی فوجیں عثمانی توپوں کی زد میں آ چکی تھیں، جن سے بچ کر دریا کو عبور کرنا ممکن نہ تھا۔

زار کا حال زار پیٹر کو اپنے سپاہیوں کی ہلاکت اور اپنی گرفتاری کا پورا یقین تھا، اس موقع پر اس نے جو خط روسی سینٹ (مجلس قومی) کے نام ماسکو روانہ کیا تھا، اس سے اس کی بے چارگی اور مایوسی کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتا ہے:

---

[1] سوانح پیٹر اعظم، از اسٹیفن گرہم، مطبوعہ لندن، ۱۹۲۹ء، ص ۱۹۸۔

> "میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ جھوٹی خبر سے فریب کھا کر اور اپنی کسی غلطی کے بغیر میں اپنے کو اس حالت میں پاتا ہوں کہ ترکی فوج نے مجھے خود میرے لشکر میں بند کر رکھا ہے، ہمارے سامانِ رسد کی فراہمی منقطع کر دی گئی ہے اور ہمیں ہر لمحہ ہلاک یا قید ہو جانے کا خطرہ ہے، بجز اس کے کہ خدا کسی غیر متوقع طریقہ پر ہماری مدد کرے۔ اگر میں ترکوں کے ہاتھ گرفتار ہو جاؤں تو پھر تم مجھے اپنا زار اور فرماں روا نہ سمجھنا اور نہ میرے کسی حکم کی پروا کرنا جو میری طرف سے تمہارے پاس پہنچایا جائے، خواہ تم میرے خط کو پہچان ہی کیوں نہ لو بلکہ خود میری آمد کے منتظر رہنا، اگر میں ہلاک ہو جاؤں اور تمہیں میری وفات کی تصدیق شدہ اطلاع ملے تو اس وقت تم میرا جانشین اس شخص کو منتخب کر لینا جو تم میں سب سے زیادہ اہل ہو"[1]۔

صلح نامۂ پرتھ پیٹر اور اس کی فوج کی حالت ایسی ہی تھی، روسی تمام تر ترکوں کے رحم و کرم پر تھے، اگر ترک چاہتے تو انہیں قتل کر ڈالتے یا گرفتار کر لیتے۔ ایسے نازک وقت میں جب خود پیٹر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور وہ مایوس ہو کر اپنے خیمہ میں پڑا ہوا تھا، اس کی بیوی کیتھرائن نے کمالِ ذکاوت اور دانش مندی سے ایک ایسی راہ نکالی جس سے پیٹر اور اس کی فوج کو سلامتی کے ساتھ روس واپس چلے جانے کا موقع مل گیا، اس نے اپنے تمام زیورات اور جو کچھ نقد لشکر میں جمع ہو سکا سب اکٹھا کر کے صدرِ اعظم کے نائب کے پاس عثمانی لشکر میں بھیجا اور درخواست کی کہ صلح کی گفتگو کے لیے جنگ چند دنوں تک ملتوی کر دی جائے۔ نائب کی سفارش سے صدرِ اعظم بالطہ جی محمد پاشا اس گفتگو کے لیے راضی ہو گیا، پیٹر کے حریف چارلس دوازدہم کا نمائندہ کاؤنٹ پونیاٹوسکی (Count Poniatowski) اور خانِ کریمیا عثمانی لشکر میں موجود تھے اور دونوں نے ایسے نادر موقع پر جب کہ پیٹر ان کی مٹھی میں آ چکا تھا، صلح کی نہایت شدید مخالفت کی لیکن صدرِ اعظم نے ان کی مخالفت کے باوجود ایسے شرائط پر صلح کر لی جو اس کی دانست میں سلطنتِ عثمانیہ کے لیے نہایت مفید تھے، چنانچہ

---

[1] لارڈ ایورسلے، ص ۱۹۳۔

۲۱ رجولائی ۱۷۱۱ء کو صلح نامہ مرتب ہو گیا، صلح نامہ میں دفعات کو درج کرنے سے پہلے یہ الفاظ لکھے گئے ''اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فتح مند اسلامی فوج نے زار روس کو اس کی تمام فوجوں کے ساتھ دریائے پرتھ کے قریب گھیر لیا ہے اور زار روس نے صلح کی درخواست کی ہے اور اسی کی درخواست پر مندرجہ ذیل دفعات مرتب اور منظور کی جاتی ہیں:

۱- زار روس نے قلعہ ازف اور اس کے ملحق علاقوں سے اپنا قبضہ اٹھالینا منظور کیا اور ان کو اسی حالت میں سلطنت عثمانیہ کے حوالہ کر دینے کا وعدہ کیا جس حالت میں اس نے ان پر قبضہ کیا تھا۔

۲- زار روس نے منظور کیا کہ اس کا نیا شہر تگنروگ جو بحر ازف پر واقع تھا، نیز اس علاقہ کے بعض دوسرے قلعے جو اس نے تعمیر کرائے تھے، سب مسمار کر دیے جائیں اور پھر کبھی تعمیر نہ ہوں، علاوہ بریں کمنسکی (Kermienrki) میں اس نے جو توپیں اور فوجی سامان اکٹھا کیے تھے، وہ سب باب عالی کو دے دیے جائیں۔

۳- زار نے معاہدہ کیا کہ آئندہ وہ اہل پولینڈ اور ان قزاقوں کے معاملات میں جو پولینڈ یا خان کریمیا کے محکوم ہیں، دخل نہ دے گا اور ان کے علاقوں سے روسی فوجیں ہٹا لے گا۔

۴- چوتھی دفعہ میں تجارت کو آزاد قرار دیا گیا لیکن یہ شرط رکھی گئی کہ آئندہ کوئی روسی سفیر قسطنطنیہ میں مقیم نہ ہوگا، کریسی لکھتا ہے کہ اس شرط کی وجہ غالباً وہ سازشیں تھیں جو روس یونانیوں اور دولت عثمانیہ کی دوسری عیسائی رعایا سے کرتا رہتا تھا۔

۵- اہل روس ان مسلمانوں کو آزاد کر دیں جن کو انہوں نے دوران جنگ میں یا جنگ سے قبل گرفتار کر لیا ہے۔

۶- شاہ چارلس کو روس سے ہو کر اپنے ملک سویڈن جانے کی اجازت دی گئی اور زار نے معاہدہ کیا کہ راستہ میں اس سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے گی، اس دفعہ میں

اس امر کی بھی سفارش کی گئی کہ روس اور سویڈن باہم صلح کر لیں۔

۷- باب عالی کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ آئندہ وہ اہل روس کو کوئی نقصان نہ پہنچائے گا اور اسی طرح اہل روس کی طرف سے معاہدہ ہوا کہ وہ سلطان کی رعایا اور ماتحتوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں گے[1]۔

جب اس صلح نامہ کی خبر قسطنطنیہ پہنچی اور معلوم ہوا کہ پیٹر اس طرح قبضہ میں آ کر صاف نکل گیا تو سلطان سخت برہم ہوا، بلطہ جی محمد پاشا کو واپسی پر صدارت کے عہدے سے علاحدہ کر دیا گیا اور اس نے نائب عثمان اور رئیس آفندی عمر کو جن کے متعلق خیال تھا کہ یہ صلح ان ہی کی کوششوں سے عمل میں آئی ہے، سلطان نے قتل کرا دیا، اس نے صلح نامہ کے منظور کرنے سے بھی انکار کر دیا اور روس سے پھر جنگ کی تیاری شروع کر دی لیکن بعض وزرائے سلطنت اور زیادہ تر سفیر برطانیہ سر سٹن (Sir R. Sulton) کے مشورہ سے سلطان جنگ سے باز رہا اور دو سال بعد زار روس کے ساتھ ایک دوسرا صلح نامہ مرتب کیا گیا جس میں بلطہ جی محمد پاشا کے صلح نامہ کی تمام دفعات شامل تھیں۔

بلطہ جی کا جرم | اکثر مورخین نے بلطہ جی کے صلح نامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس پر بددیانتی کا الزام عائد کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس نے کیتھرائن کی رشوت قبول کر کے دولت علیہ کے مفاد کو نظر انداز کر دیا اور زار روس اور اس کی پوری فوج پر قابو پانے کے بعد ان کو یوں ہاتھ سے نکل جانے دیا، لارڈ ایورسلے نے صدر اعظم کی مدافعت میں جو باتیں پیش کی ہیں ان سے یہ الزام دور ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ جو شخص صدارت عظمیٰ کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہو اور اسے دولت پیدا کرنے کے لیے بڑے سے بڑے مواقع حاصل ہوں وہ کیتھرائن کی پیش کردہ نہایت حقیر رقم کے لیے اپنی ذات اور اپنے ملک کو فروخت کر دینے پر آمادہ ہو گیا ہو، یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ زارینہ نے وہ تحائف

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۱۲۳-۱۲۲۔

صدر اعظم کے نائب کی خدمت میں بھیجے ہوں، تاکہ وہ سفارش کر کے صلح کی گفتگو کی اجازت حاصل کر لے۔ بلطہ جی نے جن شرائط پر صلح کی ان سے بہتر شرائط اس کے خیال میں ممکن نہ تھے، یہ صحیح ہے کہ وہ زار روس اور اس کی فوج کو گرفتار اور ہلاک کر سکتا تھا لیکن اس سے روسیوں میں نہایت سخت اشتعال پیدا ہو جاتا اور وہ انتقام کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ سلطان نے عثمان اور رئیس آفندی کو توقتل کرا دیا لیکن بلطہ جی محمد پاشا کو جس کی دستخط سے صلح نامہ کا نفاذ ہوا تھا بصرف معزول کر دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے بلطہ جی کو پہلے ہی سے صلح کے اختیارات دے رکھے تھے، بظاہر سلطان کا قصد علاقہ ازوف سے آگے بڑھ کر سلطنت روس میں اپنے مقبوضات کا دائرہ بڑھانے کا نہ تھا، پھر جنگ کو جاری رکھنے میں ان سے بہتر کن شرائط پر صلح ہو سکتی تھی؟

بعض مورخین کا خیال ہے کہ بلطہ جی محمد پاشا نے جن شرائط پر صلح کی تھی وہ روس کے لیے اس درجہ باعث ننگ تھے کہ اس عار کو دور کرنے کے لیے روس کی طرف سے جنگ کا پھر چھیڑا جانا لازمی اور ناگزیر تھا لیکن خود پیٹر کا خیال اس سے مختلف تھا، رہائی کے بعد اس نے نئی جنگ کے لیے کوئی آمادگی ظاہر نہیں کی، برخلاف اس کے معاہدہ پرتھ کے دو سال بعد اس نے دولت عثمانیہ کے ساتھ ایک دوسرا معاہدہ بھی کیا جس کی دفعات روس کے لیے ویسی ہی سخت تھیں، اس نے اپنے عہد کی بقیہ مدت میں کوئی معاہدہ شکنی نہ کی بلکہ چند سالوں کے بعد سلطنت ایران کے ایک بڑے حصہ کی تقسیم کے لیے دولت علیہ کے ساتھ ایک نئے معاہدہ میں شریک ہو گیا، پچیس سال تک روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان پھر کوئی جنگ پیش نہیں آئی۔[1]

موریا کی فتح ۱۷۱۵ء میں صدر اعظم داماد علی پاشا نے موریا پر حملہ کیا جو معاہدہ کارلووٹز کی رو سے سلطنت عثمانیہ سے چھین کر جمہوریہ وینس کو دے دیا گیا تھا، معاہدہ مذکور کے وقت

---

[1] ایورسلے ص ۱۵۶-۱۵۵۔

دولت علیہ اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ وہ اس قدیم مقبوضہ کے تحفظ سے بالکل معذور تھی لیکن اب جب کہ اس کی طاقت بہت کچھ بڑھ چکی تھی اور خیال تھا کہ سلطنت آسٹریا جس کی حمایت سے جمہوریہ وینس موریا پر قبضہ پانے میں کامیاب ہوئی تھی، اس جنگ میں دخل نہ دے گی، موریا کو واپس لے لینے کا موقع بہت اچھا تھا، معاہدہ کارلووٹز میں جمہوریہ وینس بھی شریک تھی، اس لیے باب عالی بغیر کسی معقول عذر کے اس پر حملہ نہیں کر سکتا تھا، اتفاق سے نقض عہد خود وینس کی طرف سے پیش آیا، اس نے مونٹی نیگرو کے باشندوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کرنے میں مدد پہنچائی، داماد علی پاشا کے لیے جو اپنی جنگ جوئی اور شجاعت میں مشہور تھا اور کافی ہوا اور وہ فوج جو روس کی جنگ کے لیے تیار کی گئی تھی، موریا کے محاذ پر بھیج دی گئی، جنگ کی ابتدا محاصرہ کورنتھ سے ہوئی، تین ہفتہ کی مدافعت کے بعد ۷ر جولائی ۱۷۱۵ء کو کورنتھ نے ہتھیار ڈال دیے، اس کے بعد عثمانی فوج دو حصوں میں تقسیم ہو کر پورے دریا میں پھیل گئی اور جمہوریہ وینس کے تمام قلعوں کو مثلاً موڈن، کورن اور ریتو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا، صرف ایک سو ایک روز کی جنگ میں سارا موریا فتح ہو گیا، وہاں کے یونانی باشندوں نے اہل وینس کو بالکل مدد نہ دی، برخلاف اس کے انھوں نے اپنے سابق آقاؤں کے ظلم و تعدی سے بچنے کے لیے ترکوں کا استقبال کیا۔[1]

آسٹریا سے جنگ داماد علی پاشا کا قصد تھا کہ موریا کی فتح کے بعد کارفو اور بحر یونان کے دوسرے جزیروں پر بھی جو وینس کے زیر حکومت تھے، قبضہ کر لے، مگر اس موقع پر چارلس ششم شہنشاہ آسٹریا درمیان میں آگیا اور اوائل ۱۷۱۶ء میں اس نے دولت علیہ کے خلاف جمہوریہ وینس سے اتحاد کر لیا، چارلس کا یہ فعل باب عالی کے لیے سخت اشتعال کا باعث ہوا اور صدر اعظم داماد علی پاشا نے اسے معاہدۂ کارلووٹز کی خلاف ورزی قرار دے کر دیوان سلطنت میں جنگ کی تجویز پیش کی، آسٹریا کے مقابلہ میں سابق شکستوں کی یاد ہنوز

---

[1] ایورسلے، ص ۱۵۷۔

اتنی تازہ تھی کہ اس مسئلہ پر بہت زیادہ بحث ومباحثہ ہوا لیکن بالآخر مفتی اعظم نے صدر اعظم کی تجویز کے موافق رائے دی اور آسٹریا کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا گیا، داماد علی پاشا ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ روانہ ہو کر بلغراد پہنچا، بلغراد سے پوری فوج پیٹر وارڈین کی طرف روانہ ہوئی اور وہیں ۱۰/ اگست ۱۷۱۶ء کو آسٹریا کی فوج سے مقابلہ ہوا، جس کا امیر عسکر مشہور سپہ سالار شہزادہ یوجین تھا، ابتدا میں عثمانیوں کو نمایاں کامیابی ہوئی لیکن شہزادہ یوجین کے مخصوص دستہ نے جو اس وقت تک محفوظ رکھا گیا تھا، دفعۃً حملہ آور ہو کر جنگ کا نقشہ بدل دیا اور ترکوں کے قدم اکھڑ گئے، داماد پاشا نے یہ دیکھ کر اپنے سرداروں کی ایک جماعت ساتھ لی اور جہاں لڑائی گھمسان ہو رہی تھی ٹوٹ پڑا لیکن اس کی حیرت انگیز شجاعت اور جاں بازی فوج کے اکھڑے ہوئے قدم کو نہ روک سکی اور وہ خود ایک کاری زخم کھا کر گر گیا، اس کے ساتھی اسے اٹھا کر کارلووٹز لے گئے جو پیٹر وارڈین سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھا لیکن وہ اس زخم سے جاں بر نہ ہو سکا اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔

داماد پاشا کے زخمی ہونے کے بعد ترکوں کی ہمت پست ہو گئی اور وہ میدان چھوڑ کر بلغراد کی طرف بھاگے، یوجین نے ان کے خیموں پر قبضہ کر لیا، مال غنیمت میں ایک سو چالیس توپیں بھی ہاتھ آئیں۔

اس کے بعد یوجین نے تیمسوار کا رخ کیا، جو ہنگری میں ترکوں کا آخری اہم قلعہ تھا، چنانچہ پیٹر وارڈین کی لڑائی کے بیس روز بعد اس نے تیمسوار کا محاصرہ کر لیا، پانچ ہفتے کے محاصرہ کے بعد ۲۵ نومبر ۱۷۱۶ء کو قلعہ نے ہتھیار ڈال دیے، اس سال آسٹریا سے پھر کوئی جنگ نہیں ہوئی، اس درمیان میں وینس سے بھی لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، چوں کہ عثمانی فوجوں کا بڑا حصہ آسٹریا سے جنگ کرنے میں مصروف تھا، اس لیے وینس کے مقابلہ میں زیادہ کامیابی نہ ہو سکی اور کارفو کا محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔

بلغراد | دوسرے سال ۱۷۱۷ء میں صدر اعظم خلیل پاشا کے زیر قیادت ایک دوسری

زبردست فوج آسٹریا کے مقابلہ میں قسطنطنیہ سے روانہ ہوئی، شہزادہ یوجین نے آگے بڑھ کر بلغراد کا محاصرہ کرلیا، تین ہفتہ کے بعد عثمانی فوجیں نمودار ہوئیں اور اس نے خود محاصرہ کرنے والوں کو گھیر لیا، یوجین کے لیے یہ وقت نہایت نازک تھا، بلغراد کا محصور عثمانی دستہ اس کے سامنے تھا اور خلیل پاشا کی پوری فوج اس کے پشت پر تھی، اس میں شبہ نہیں کہ اگر خلیل پاشا فوراً ہی حملہ کردیتا تو کامیابی یقینی تھی لیکن اس نے تاخیر سے کام لیا اور آسٹریا کی فوج کے گرد ایک حصار قائم کرنے کی کوشش کی، یوجین سمجھتا تھا کہ اگر یہ حصار قائم ہوگیا تو سامان رسد کا فراہم ہونا محال ہوجائے گا اور پھر اس کے لیے کچھ عرصہ کے بعد ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہ جائے گا، اس خطرہ کو پیش نظر رکھ کر اس نے غیر معمولی جرأت سے کام لیا اور ۱۶/ اگست ۱۷۱۷ء کو خلیل پاشا کی فوج پر دفعۃً خود حملہ کردیا، خلیل پاشا اس غیر متوقع اور اچانک حملہ کے لیے تیار نہ تھا، عثمانیوں کے پیر اکھڑ گئے اور اپنی کثرت کے باوجود انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی، ان کے بیس ہزار سپاہی مقتول اور زخمی ہوئے، ایک سو تیس توپیں اور آلات حرب کا ایک نہایت وافر ذخیرہ دشمنوں کے ہاتھ آیا، دوسرے روز بلغراد اور اس کے فوجی دستہ نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور قلعہ یوجین کے حوالہ کردیا۔

بلغراد کی فتح کے بعد آسٹریا کی فوجیں آگے بڑھ کر سرویا اور مغربی ولاچیا کے بڑے حصہ پر قابض ہوگئیں، انہوں نے سرویا کے باشندوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی مگر بارہ ہزار سے زیادہ آدمیوں نے ان کا ساتھ نہ دیا کیوں کہ سرویا کے لوگ ترکی حکومت کے مقابلہ میں آسٹریا کی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے[1]، اسی وجہ سے دریائے ڈینوب کے جنوبی علاقوں پر آسٹریا کا یہ قبضہ عارضی ثابت ہوا، بائیس سال کے بعد عثمانیوں نے بلغراد کو پھر فتح کرلیا اور آسٹریا والوں کو سرویا سے نکال باہر کیا۔

معاہدۂ پساروویچ | بلغراد کی شکست کی سزا میں خلیل پاشا صدارت کے عہدہ سے علاحدہ

---

[1] ایورسلے ص ۲۰۰۔

کر دیا گیا اور اس کی جگہ ابراہیم پاشا جو سلطان کا داماد تھا صدر اعظم مقرر ہوا، وہ ارکان سلطنت کی اس جماعت کا ہم نوا تھا جو آسٹریا سے انتقام لینے کی خواہاں تھی لیکن انگلستان اور ہالینڈ کے سفیروں نے پھر مصالحت کی گفتگو شروع کر دی اور اس اصول پر صلح کرا دینی چاہی کہ ہر فریق اپنی موجودہ فتوحات پر قابض رہے، یہ شرط آسٹریا کے لیے تو مفید تھی لیکن دولت علیہ کے لیے سخت نقصان دہ تھی، بہر حال کچھ تامل کے بعد سلطان آخر میں راضی ہو گیا اور صلح نامہ مرتب کرنے کی کارروائی شروع ہوئی، سرویا کے ایک چھوٹے سے گاؤں پسارووچ (Pussarowitch) میں ایک کانگریس منعقد کی گئی اور وہاں ۲۲ رشعبان ۱۱۳۰ھ مطابق ۲۱ رجولائی ۱۷۱۸ء کو ایک معاہدہ مرتب ہوا جو "معاہدۂ پسارووچ" کے نام سے مشہور ہے۔

اس معاہدہ کی رو سے آسٹریا کو نہ صرف تمیسوار اور اس کا علاقہ مل گیا اور اس طرح ہنگری کا وہ حصہ بھی جو معاہدۂ کارلووٹز کے بعد سلطنت عثمانیہ کے زیر حکومت رہ گیا تھا، اس کے قبضہ میں آ گیا، بلکہ ولاچیا اور سرویا کا ایک بڑا حصہ، بوسنیا کے بعض علاقے، نیز بلغراد، سمندریا، رمنک اور بہت سے دوسرے شہر اس کے ہاتھ آئے، لیکن جمہوریہ وینس کو جس کی حمایت میں آسٹریا نے ہتھیار اٹھائے تھے، پورا موریا دولت عثمانیہ کے حوالے کر دینا پڑا اور اگرچہ ڈلماشیا کے چند چھوٹے قلعوں پر اس کا قبضہ باقی رکھا گیا، تاہم اسے ساحل ایڈریاٹک کے بعض غیر مفتوحہ علاقوں سے دست بردار ہو جانا پڑا تاکہ سلطنت عثمانیہ اور جمہوریہ رگوسا کے تعلقات میں روک نہ پیدا ہو اور دولت علیہ وینس کے دست برد سے رگوسا کا تحفظ کر سکے، کارفو اور بحر یونان کے دوسرے جزیروں پر وینس کا قبضہ قائم رہا، سلطنت عثمانیہ کی طرف سے اس بات کا معاہدہ کیا گیا کہ الجزائر، تونس، طرابلس اور رگوسا کے بحری ڈاکوؤں کا سدباب کر دیا جائے گا اور ہنگری کے باغیوں کو آسٹریا کی جدید سرحد کے قریب رہنے کی ممانعت کر دی جائے گی۔

جنگ ایران | ۱۷۲۰ء میں روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان "دائمی صلح" کے لیے ایک

معاہدہ مرتب ہوا، جہاں تک روس کا تعلق ہے یہ معاہدہ اس اتحاد کا نتیجہ تھا جو اس کے بعض سابق حلیفوں نے اس وقت اس کے خلاف قائم کر لیا تھا اور جس کی شرکت کی دعوت آسٹریا اور انگلستان کے سفیروں نے باب عالی کو بھی دی تھی، پیٹر نے اتحاد کے آئندہ خطرات کا اندازہ کر کے باب عالی کو اس سے علاحدہ رکھنے کی کوشش کی اور صلح نامہ مذکور کے ذریعہ بظاہر ہمیشہ کے لیے اسے اپنا حلیف بنا لینا چاہا، لیکن یہ "دائمی صلح" دو ہی سال کے بعد معرض خطر میں آ گئی اور قریب تھا کہ دونوں فریق سلطنت ایران کے بعض حصوں کی تقسیم پر باہم دست و گریباں ہو جائیں، شاہ عباس صفوی کی وفات کے بعد ہی دولت ایران کا زوال شروع ہو گیا اور اس کی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی گئی، اس کی ہمسایہ حکومتیں موقع کی منتظر تھیں، چنانچہ ۱۷۲۲ء میں افغانی سردار امیر محمود نے پچاس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایران پر حملہ کر دیا اور بہ آسانی اصفہان پر قابض ہو گیا، شاہ حسین کے لڑکے طہماسپ نے تخت و تاج کی واپسی کے لیے زار روس اور باب عالی سے مدد کی درخواست کی، پیٹر نے بحر کاسپین اور بحر اسود کے ساحلی علاقوں کے معاوضہ میں مدد کا وعدہ کیا اور ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے ایک فوج بھی روانہ کر دی، پیٹر کا یہ اقدام باب عالی کے لیے تشویش اور برہمی کا باعث ہوا اور قریب تھا کہ دونوں سلطنتوں میں جنگ چھڑ جائے لیکن سفیر فرانس کی وساطت سے جنگ کی نوبت نہ آئی اور ۱۷۲۳ء میں دونوں کے درمیان ایک صلح نامہ ہو گیا جس کے رو سے شمالی ایران کا ایک بڑا حصہ فریقین نے باہم تقسیم کر لیا، باب عالی کو جارجیا، اریوان، تبریز اور باکو کے صوبے دیے گئے اور روس نے شروان اور بحر کاسپین کے بعض ساحلی علاقوں کو اپنے لیے منتخب کیا، روس ان علاقوں پر صلح نامہ کی رو سے پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا، دولت علیہ کو اپنے حصہ پر قبضہ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کرنی پڑی، ایرانیوں نے مقابلہ کیا لیکن ترک مدائن، اریوان، تبریز اور بعض دوسرے علاقوں کو یکے بعد دیگرے فتح کرتے گئے اور شاہ طہماسپ کو مجبوراً صلح کرنی پڑی، تھوڑے دنوں کے بعد امیر

محمود نے شاہ طہماسپ کو شکست دے کر ایران کے تخت پر پھر قبضہ کر لیا اور سلطنت عثمانیہ کی مخالفت سے بچنے کے لیے مذکورۂ بالا صوبوں پر باب عالی کی سیادت تسلیم کر لی، ۱۷۲۵ء میں امیر محمود کا انتقال ہو گیا اور اس کا ایک عزیز شاہ اشرف تخت نشین ہوا، ۱۲ اکتوبر ۱۷۲۷ء کو شاہ اشرف اور باب عالی کے درمیان ایک جدید صلح نامہ ہوا لیکن اسی سال ایک ایرانی سردار نادر قلی خان نے شاہ طہماسپ کی حمایت میں اصفہان پر چڑھائی کی اور متعدد معرکوں میں افغان کو شکست دی، شاہ اشرف قتل ہوا اور شاہ طہماسپ پھر تخت پر بیٹھا، طہماسپ نے تخت پر آتے ہی باب عالی سے ایرانی صوبوں کی واپسی کا مطالبہ کیا اور سلطان کے انکار پر نادر خان کی سرکردگی میں سلطنت عثمانیہ کے مقابلہ میں فوجیں روانہ کیں، نادر خان کے میدان میں آتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا اور عثمانی فوجوں کے قدم اکھڑنے لگے، قسطنطنیہ میں خبر پہنچی کہ ایرانی فوج سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہو رہی ہے، اس خبر سے دفعۃً پایۂ تخت میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور ینی چری کے ایک دستہ نے پطرونا خلیل کی سیادت میں علم بغاوت بلند کر دیا، تھوڑے ہی عرصہ میں یہ وبا تمام فوج میں پھیل گئی۔

فوج کی بغاوت اور سلطان کی معزولی | فوج کی بغاوت کا ظاہری سبب تو وہ شکست تھی جو نادر خان کے مقابلہ میں عثمانیوں کو ہوئی لیکن ممکن ہے کہ باب عالی کی امن پسندانہ پالیسی بھی ینی چری کی جنگجو طبیعت کے لیے ناقابل برداشت رہی ہو، اگرچہ بعض سرحدی علاقوں میں وقتاً فوقتاً شورشیں ہوتی رہیں، تاہم صدر اعظم ابراہیم پاشا کی وزارت کا دور جو ۱۷۱۸ء سے ۱۷۳۰ء تک قائم رہا، سلطنت کے لیے غیر معمولی طور پر امن و سکون کا زمانہ تھا، شاید یہی امن پسندی ابراہیم پاشا کے قتل اور پھر سلطان کے عزل کا باعث ہوئی، باغیوں نے ابراہیم پاشا، قپودان پاشا (امیر البحر) اور مفتی اعظم کے خلاف یہ الزام قائم کیا کہ یہ لوگ مجوسیوں سے صلح کرنا چاہتے ہیں اور اس جرم کی بنا پر سلطان سے ان کے قتل کا مطالبہ کیا، سلطان نے خود اپنی جان کو خطرہ سے خالی نہ دیکھ کر صدر اعظم اور قپودان پاشا کو قتل کرا دیا، البتہ مفتی اعظم کے

قتل سے انکار کر دیا لیکن اب باغیوں کی جرأت اور بڑھ گئی اور انہوں نے سلطان کو بھی تخت چھوڑنے پر مجبور کیا، احمد ثالث اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پا کر خاموشی کے ساتھ تخت سے دست بردار ہو گیا اور اپنے بھتیجے محمود کو محل سے بلا کر اپنی جگہ بٹھا دیا، اس کے بعد وہ محل کے اس حصہ میں چلا گیا جہاں محمود اب تک نظر بند تھا اور وہیں چند سال کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

سلطان احمد ثالث نے ستائیس سال حکومت کی، اس طویل مدت میں سلطنت عثمانیہ کو آسٹریا، روس، وینس اور ایران سے متعدد معرکے پیش آئے لیکن معاہدہ پسارووچ کے رو سے مقبوضات کا جو حصہ ہاتھوں سے نکل گیا تھا، ازف اور موریا کی واپسی اور ایرانی فتوحات نے نہ صرف ان کی تلافی کر دی بلکہ بہ حیثیت مجموعی سلطنت کے رقبہ میں اضافہ کر دیا، باوجود متعدد جنگوں کے خزانہ آخر وقت تک پُر تھا، حالاں کہ نہ کوئی غیر معمولی ٹیکس جاری کیا گیا اور نہ رعایا کو جبر وتشدد کی شکایت ہوئی۔

پہلا مطبع احمد خود بھی صاحب علم تھا اور علوم وفنون کی سرپرستی شاہانہ طریقہ پر کرتا تھا، چنانچہ اسی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں مطبعوں کا رواج ہوا اور پہلا مطبع قسطنطنیہ میں قائم کیا گیا لیکن مفتی اعظم نے مطبعوں کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی تھی کہ قرآن مجید طبع نہ کیا جائے۔

ولاچیا اور مولڈیویا کے یونانی حکام اسی عہد میں ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتوں میں بھی ایک خاص تبدیلی عمل میں آئی، اب تک ان ریاستوں کی حکومت وہیں کے کسی ممتاز امیر کے سپرد کر دی جاتی تھی لیکن چوں کہ ۱۷۱۱ء میں مولڈیویا کے امیر نے دولت عثمانیہ سے غداری کر کے پیٹر اعظم کا ساتھ دیا تھا اور پیٹر کی حمایت میں سمانی قوموں کو بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا تھا، اس لیے باب عالی نے اس کے بعد سے ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتوں پر ان دولت مند یونانی امراء کو مقرر کرنا شروع کیا جو قسطنطنیہ کے ایک خاص حصہ فنار میں رہا کرتے تھے مگر یہ نظام دولت علیہ کے حق میں بہت مضر ثابت ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلطان محمود اول کے عہد میں اس کے نقصانات ظاہر ہونے لگے۔

محمود اوّل

۱۱۴۳ھ تا ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۳۰ء تا ۱۷۵۴ء

احمد ثالث کے تخت سے کنارہ کش ہو جانے کے بعد باغیوں اور اعیان سلطنت نے سلطان مصطفیٰ ثانی کے لڑکے محمود کو تخت پر بٹھایا لیکن چند ہفتوں تک محمود صرف نام کا سلطان تھا اور اصل حکومت باغیوں کے سردار پٹرونا خلیل کے ہاتھ میں تھی، اس نے سلطنت کے بہت سے اعلیٰ عہدہ داروں کو برطرف کرا دیا اور ان کی جگہ اپنی جماعت کے آدمیوں کو مقرر کرایا، ایک یونانی یوپر ینا کی (Yanaki) نے گزشتہ بغاوت میں اسے کچھ روپے قرض دیے تھے، اس احسان کے معاوضہ میں اس نے دیوان کو مجبور کر کے اسے مولڈیویا کا حاکم مقرر کرایا لیکن بالآخر پٹرونا خلیل اور اس کے ساتھیوں کی دست درازیاں ناقابل برداشت ہو گئیں اور سلطان کے وفادار افسروں نے ان سرکشوں کے استیصال کا عزم کر لیا، ینی چری اور دوسرے فوجی دستوں نے بھی جو سلطان احمد ثالث کے معزول کرنے میں شریک تھے، پٹرونا خلیل کی مخالفت پر آمادگی ظاہر کی اور اس شرط کے ساتھ کہ ان سے ان کی گزشتہ سرکشی اور بغاوت کے متعلق باز پرس نہ کی جائے گی. سلطان محمود کی حمایت کا وعدہ کر لیا، چنانچہ ایک روز پٹرونا خلیل اور اس کے اکیس ساتھی دیوان میں بلائے گئے اور وہیں سلطان کے سامنے انہیں قتل کر دیا گیا، تین روز کے اندر ان کا دوست ینا کی اور اس کے سات ہزار ساتھی بھی قتل کر دیے گئے اور اس طرح تقریباً دو ماہ کی شورش کے بعد یہ بغاوت فرو ہوئی۔

جنگ ایران پایہ تخت میں امن قائم ہونے کے بعد ایران سے جنگ چھڑ گئی اور عثمانی فوج شاہ طہماسپ کی فوج پر متعدد معرکوں میں غالب آئی، یہ دیکھ کر طہماسپ نے صلح کی درخواست کی اور ۱۰؍ جنوری ۱۷۳۲ء کو دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوا، جس کے رو سے تبریز، اردھان، ہمدان اور لورستان، ایران کو واپس کر دیے گئے اور سلطنت عثمانیہ نے داغستان، جارجیا، تاخ شیوان، ایوان اور تفلیس کے علاقے پائے لیکن یہ صلح عارضی ثابت ہوئی، نادر خان نے جو شاہ طہماسپ کی طرف سے سیستان، آذربیجان، مازندران اور خراسان کا حاکم تھا، اس کی شدید مخالفت کی، اس نے اپنی فوج کے ساتھ اصفہان پر چڑھائی کی اور شاہ طہماسپ کو تخت سے اتار کر اس کے لڑکے عباس ثالث کو تخت پر بٹھایا اور عباس کی نابالغی کے زمانہ تک اپنے کو اس کا مدار المہام قرار دیا، مدار المہام کی حیثیت سے اس نے پہلا کام یہ کیا کہ صلح نامہ کو مسترد کر دیا، پھر وہ عثمانی علاقہ کی طرف بڑھا اور بغداد کا محاصرہ کر لیا، صدر اعظم عثمان پاشا بغداد کی مدد کے لیے روانہ ہوا، ۹؍ جولائی ۱۷۳۳ء کو دریائے دجلہ کے کنارے سخت معرکہ ہوا، جس میں نادر خان کو نہایت کاری زخم آیا اور اس کے ساتھی اسے میدان جنگ سے اٹھا لے گئے، بغداد ایرانیوں کے محاصرہ سے آزاد ہو گیا، اسی سال عثمان پاشا ایرانیوں کے مقابلہ کے لیے پھر آگے بڑھا اور انہیں شکست دی لیکن تیسرے معرکہ میں جو کرکوک کے قریب نادر خان سے پیش آیا تھا، ترکوں کو فاش شکست ہوئی اور خود عثمان پاشا ایک جاں باز سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا، عثمان پاشا کے بعد ترکوں نے نادر خان کے مقابلہ میں متعدد بار شکست کھائی، بالآخر دولت عثمانیہ کی طرف سے صلح کی گفتگو شروع ہوئی، اس درمیان میں یکم دسمبر ۱۷۳۵ء کو نادر خان نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور عباس ثالث کو تخت سے برطرف کر کے خود ایران کا بادشاہ بن بیٹھا، نامہ و پیام کے ایک طویل سلسلہ کے بعد شرائط صلح طے ہو گئے اور ۱۷؍ اکتوبر ۱۷۳۶ء کو فریقین نے صلح نامہ پر دستخط کر دیے، دونوں سلطنتوں کے حدود وہی قرار پائے جو ۱۶۳۹ء

میں سلطان مراد رابع کے معاہدہ میں قائم کیے گئے تھے، ان حدود کے ماوراء باب عالی نے تمام مفتوحہ علاقے سلطنت ایران کو واپس کر دیے۔

روسی خطرہ دولت عثمانیہ نے ایران کے ساتھ صلح کرنے میں صرف اس وجہ سے عجلت کی تھی کہ روس کی فوجیں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں، روس نے دولت علیہ اور ایران کی جنگ کو اپنے مفاد کے موافق سمجھ کر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور بجائے اس کے کہ بحر کاسپین کے ان ایرانی علاقوں پر قبضہ رکھنے کی کوشش کرتا جو پیٹر اعظم اور سلطان احمد ثالث کے معاہدہ کے مطابق ۱۷۲۳ء میں اسے حاصل ہوئے تھے، اپنی پوری توجہ عثمانی علاقوں کی جانب مبذول کرنی چاہی جن کا حصول اسے نسبتاً زیادہ آسان نظر آتا تھا، اسی غرض سے اس نے ۱۷۳۵ء میں نادر خان سے صلح کر لی اور بحر کاسپین کے وہ تمام علاقے جو معاہدۂ مذکورہ کے رو سے اسے حاصل ہوئے تھے، سلطنت ایران کو واپس کر دیے۔

دولت عثمانیہ کے خلاف روس کا جارحانہ اقدام حقیقۃً اس ناعاقبت اندیشانہ طرز عمل کا نتیجہ تھا جو وزرائے سلطنت نے مغربی حکومتوں سے متعلق اختیار کر رکھا تھا، وہ حتی الوسع دوسری حکومتوں کی آویزش سے بچنا چاہتے تھے لیکن تاریخ کے اس سبق سے چشم پوشی کر رہے تھے کہ جو سلطنت دشمنوں سے گھری رہنے کے باوجود ان سے کنارہ کش رہنا چاہتی ہے، وہ آخر کار اس وقت میدان جنگ میں آنے پر مجبور ہوتی ہے جب کامیابی کے اکثر مواقع ہاتھ سے نکل چکے ہیں، سلطنت عثمانیہ کے وزراء روس اور آسٹریا کی دشمنی سے بے خبر نہ تھے مگر وہ اپنی طرف سے تصادم پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ جب پولینڈ کی جنگ جانشینی میں باب عالی کو گذشتہ معاہدوں کی بنا پر جائز طور پر مداخلت کا حق حاصل ہوا تب بھی غیر جانب داری کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

قبضۂ پولینڈ پولینڈ تقریباً ایک صدی سے خلفشار اور بدامنی کا شکار ہو رہا تھا اور روس، آسٹریا اور پرشیا کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں، پیٹر اعظم کی خارجی سیاست کے دو نہایت

اہم جزو تھے، پولینڈ اور دولت عثمانیہ وہ ان دونوں کو فتح کر کے روس کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت بنا دینا چاہتا تھا لیکن جہاں تک سلطنت عثمانیہ کا تعلق تھا، یہ ایک ایسا نصب العین تھا جس کی حقیقت خود اس کے ذہن میں خواب سے زیادہ نہ تھی، چنانچہ واقعہ پرتھ نے اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور ترکوں کے محاصرہ سے زندہ اور سلامت نکل آنا ہی اسے اپنی سب سے بڑی کامیابی نظر آئی، تاہم وہ آخر وقت تک اپنے مقصد کے حصول کے لیے تیاریاں کرتا رہا اور اگر ۱۷۲۵ء میں وہ وفات نہ پا گیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ معاہدہ پرتھ کی تنسیخ کے لیے زور آزمائی کرتا، پھر بھی اس نے اپنے جانشینوں کے لیے جو وصیت نامہ چھوڑا، اس میں دولت عثمانیہ اور پولینڈ کی نسبت خصوصیت کے ساتھ تاکید درج کی اور اس کے بعد اس کے تمام جانشینوں نے اس وصیت کی تکمیل کو سلطنت کا اہم ترین مقصد قرار دیا، پولینڈ اپنے اندرونی اختلال اور کمزوریوں کی وجہ سے روس سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا تھا، خصوصاً جب کہ آسٹریا اور پرشیا بھی اس کے خلاف روس سے متحد ہو گئے تھے، یہ اتحاد ۱۷۳۲ء میں ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعہ عمل میں آیا تھا، جو حقیقۃً روس، آسٹریا اور پرشیا کے درمیان پولینڈ کی تقسیم کا دیباچہ تھا۔

۱۷۳۳ء میں پولینڈ کے فرماں روا آگسٹ ثانی کا انتقال ہو گیا، یہ شخص روس کے زیر اثر تھا اور روس اور آسٹریا نے اسی کے لڑکے آگسٹ ثالث کو تخت پر بیٹھانا چاہا لیکن اہل پولینڈ نے مخالفت کی اور ایک ملکی رئیس اسٹانسلاس کو منتخب کر لیا، اسٹانسلاس کو فرانس کی حمایت حاصل تھی، کیوں کہ وہ شاہ لوئی پانزدہم کا خسر بھی تھا، علاوہ بریں فرانس کی سیاسی مصلحت اس امر کی مقتضی بھی تھی کہ پولینڈ کو روس اور آسٹریا کی دست برد سے محفوظ رکھا جائے، کیوں کہ پولینڈ کی کمزوری سے آسٹریا کو قوت پہنچنے کا اندیشہ تھا اور آسٹریا کی دشمنی لوئی چہاردہم کے عہد سے فرانس کی سیاست کا ایک ضروری عنصر تھی، اسی بنا پر اسٹانسلاس کے انتخاب کے بعد جب روسی اور آسٹروی فوجیں پولینڈ میں داخل ہوئیں اور اسٹانسلاس کو

مجبوراً تخت چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو فرانس نے آسٹریا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور فرانسیسی سفیر مقیم قسطنطنیہ نے باب عالی سے درخواست کی کہ اس حق صریح کی مدافعت کی غرض سے جو پولینڈ کو اپنے فرماں روا کے انتخاب میں حاصل ہے، نیز اس ضمانت کی بنا پر جو فاکزن (Faksen) اور قسطنطنیہ کے سابق معاہدوں کے رو سے دولت علیہ کو پولینڈ کی آزادی اور استقلال کی نسبت سپرد کی گئی ہے، آسٹریا اور روس کی اس بے جا مداخلت کے خلاف احتجاج کے طور پر اس جنگ میں فرانس کا ساتھ دے، سفیر فرانس نے پولینڈ کا استقلال قائم رکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ پولینڈ روس اور دولت علیہ کے درمیان بطور ایک آہنی دیوار کے ہے اور اسی سلسلہ میں اس نے دولت علیہ سے متعلق روس کی سیاست کو بھی واضح طور پر بیان کیا لیکن وزرائے سلطنت نے اس کی تمام حجتوں کو نظر انداز کر دیا اور بشیر آغا کے زیر اثر جو سلطان محمود اول کا معتمد خاص اور حقیقتاً سلطنت کے تمام حل و عقد کا ذمہ دار تھا، عدم مداخلت کے اصول پر بدستور قائم رہے۔

جنگ روس اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ روس نے پولینڈ کی جنگ جانشینی سے فارغ ہو کر خود سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات پر حملہ کر دیا، پیٹر اعظم کی تدبیر یہ تھی کہ ترکی پر پولینڈ کی راہ سے حملہ کیا جائے، اب چوں کہ پولینڈ روس کے زیر اثر آچکا تھا اور باب عالی نے اس اقتدار کو روکنے کی کوئی سعی نہیں کی تھی، اس لیے روسی حملہ کا سد باب ناممکن تھا، روس واقعہ پرتھ کا داغ ذلت مٹانے کے لیے بیتاب تھا، اس کے جاسوس پیٹر اعظم کے زمانہ ہی میں بلغاریا، سرویا اور رومانیا میں پہنچ گئے تھے اور عیسائی رعایا کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھار رہے تھے۔

دولت علیہ سے اعلان جنگ کے لیے کسی عذر کی تلاش زیادہ دشوار نہ تھی، جنگ کا فیصلہ اسی وقت ہو گیا تھا جب روس کی عنان حکومت ۱۷۳۰ء میں ملکہ این کے ہاتھ میں آئی، پانچ سال کی تاخیر صرف مناسب موقع کے انتظار میں گوارا کی گئی، چنانچہ ۱۷۳۵ء میں جب عثمانی فوجیں ایران میں مصروف پیکار تھیں اور تاتاری دستے ان کی کمک کے لیے کوہ قاف

کے علاقوں سے گزر رہے تھے تو روس نے اس نزاع کی بنا پر جو کوہِ قاف کے شمالی صوبوں سے متعلق دولت علیہ سے چلی آرہی تھی، ان دستوں کی مزاحمت کی اور تاتاری علاقوں پر حملہ کر دیا، باب عالی نے روس کے اس طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کیا، روس نے اس کے جواب میں تاتاری قبائل کی شکایتوں کا دفتر کھول دیا، نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ مئی ۱۷۳۶ء میں قسطنطنیہ میں خبر پہنچی کہ زارینہ اینی کی فوج نے مارشل میونخ (Munich) کی قیادت میں ازف کے قریب دو قلعوں پر قبضہ کر کے خود ازف کا محاصرہ بھی کر لیا ہے، مجبوراً دولت علیہ نے ۲۸؍ مئی ۱۷۳۶ء کو روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

روسی فوج کے سپہ سالارِ اعظم مارشل میونخ نے یہ جنگ نہایت بلند حوصلوں کے ساتھ شروع کی تھی، وہ قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس نے زارینہ سے وعدہ کیا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر رہے گا، قسطنطنیہ کی راہ میں پہلا سنگِ گراں کریمیا تھا، اس کو ہٹا کے بحر اسود پر روسی اقتدار کا قائم کر لینا اس مہم کا پہلا مرحلہ تھا، چنانچہ مارشل میونخ چون ہزار سپاہیوں کے ساتھ کریمیا کی طرف بڑھا اور پیریکوپ (Perekop) کے قلعہ بند شہر کو فتح کرتا ہوا جو برِ اعظم اور کریمیا کی درمیانی خاکنائے پر واقع تھا، کریمیا میں داخل ہو گیا اور پہنچتے ہی قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا، اس زمانہ میں کریمیا نہایت دولت مند ملک تھا، ترکی کے ساتھ اس کی تجارت بہت بڑھی ہوئی تھی، چنانچہ کوسلوف (Koslof) سے جو کریمیا کے مغربی ساحل کی خاص بندرگاہ تھی ہر سال دو لاکھ مویشی اور بکثرت غلہ استنبول بھیجا جاتا تھا، مشرقی ساحل کا شہر کافہ غلاموں کی تجارت کی غالباً دنیا میں سب سے بڑی منڈی تھی۔[1]

شہر کوسلوف اپنی تجارت اور دولت کے لحاظ سے تمام کریمیا میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، ۱۷؍ جون ۱۷۳۶ء کو روسیوں نے اسے فتح کر کے لوٹ لیا، وہاں سے میونخ باغچہ سرائے کی طرف بڑھا جو خوانینِ کریمیا کی قدیم جائے سکونت تھی، باغچہ سرائے کا تاتاری دستہ

---

[1] کیمبرج ماڈرن ہسٹری، ج ۶، ص ۳۰۵۔

صرف تھوڑی دیر مقابلہ کر کے پسپا ہو گیا، کریسی لکھتا ہے کہ تب میونخ نے اپنے روسی اور قزاق سپاہیوں کو اس شہر کے سامنے لا کر کھڑا کیا، جس کی مدافعت کرنے والا کوئی باقی نہ رہ گیا تھا، پھر اپنی فوج کے ایک چوتھائی حصہ کو چند مقررہ گھنٹوں کے لیے بھیجنا شروع کیا تا کہ شہر کے اندر جا کر لوٹ مار کرے، اس وحشیانہ اور ظالمانہ کام کی تکمیل پوری طرح کی گئی، دو ہزار مکانات اور تمام پبلک عمارتیں برباد ہو گئیں، خوانین کا وسیع محل، وہ عالی شان کتب خانہ جسے سلیم گرائی نے قائم کیا تھا اور وہ جسے کریمیا کے جیسوئیٹ (Jesuit) مشن نے قائم کیا تھا، سب جل کر خاک سیاہ ہو گئے، اس کے بعد روسیوں نے سمفروپلس (Simpherolis) پر حملہ کیا جو باغچہ سرائے کے شمالی مشرق میں واقع تھا، اس کے باشندے اور اس کی دولت سپاہیوں کی درندگی اور لوٹ مار کے حوالہ کر دی گئی اور اس کی عمارتیں شعلوں کی نذر کر دی گئیں، کریمیا کی تمام مہم میں میونخ کی فوج نے سفاکی و درندگی، سبعیت و بربریت کی انتہا کر دی، روسیوں نے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ذرا بھی رحم نہیں کیا، جہاں روسی فوجوں کی مطلق مزاحمت نہیں کی گئی، وہاں بھی انہوں نے شہروں اور قصبوں میں آگ لگا دی اور باشندوں کو تہ تیغ کر ڈالا، قدیم یادگاریں بے رحمی کے ساتھ مٹا دی گئیں، کتب خانے اور مدرسے شعلوں کی نذر کر دیے گئے اور قومی عمارتیں اور عبادت گاہیں قصداً اور عمداً برباد کر ڈالی گئیں، پوری مہم (جو بغیر کسی اعلان جنگ کے شروع کر دی گئی تھیں) خالص سیتھین درندگی کی روح کے ساتھ ترتیب اور انجام دی گئی۔[1]

اس درمیان میں اور سمتوں میں بھی روس کی دوسری فوجیں بڑھتی جا رہی تھیں، چنانچہ تھوڑے دنوں کے محاصرہ کے بعد جنرل لاسکی نے ازف کو فتح کر لیا اور کلبرن (Kilbum) کے تاتاری دستہ نے جنرل لیونتو (Leonlieu) کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، بقول کریسی "جنگ کے پہلے سال میں روس کا فریب اور اس کی طاقت تقریباً ہر جگہ کامیاب رہی" البتہ نومبر ۱۷۳۶ء میں جب میونخ کی فوجیں موسم سرما کی شدت سے بچنے کے لیے

---

[1] [illegible] ص ۱۸۱،۱۸۰۔

کریمیا سے نکل آئی تھیں تو فتح گرائی جدید خان کریمیا یوکرین پر حملہ آور ہوا اور وہاں کے روسی دستے کو شکست دے کر تیس ہزار روسی قیدیوں کے ساتھ کریمیا لوٹ آیا۔

آسٹریا کا فریب دولت علیہ اب جنگ کو ختم کر دینا چاہتی تھی اور اس نے فرانس، سویڈن اور آسٹریا کے سفیروں کے ذریعہ روس سے صلح کی متعدد بار کوششیں کیں، روس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ سلطنت عثمانیہ کی موجودہ مشکلات سے فائدہ اٹھانے کے لیے آسٹریا خود بھی بیتاب ہے، اس نے صلح کے بجائے جنوری ۱۷۳۷ء میں آسٹریا سے ایک خفیہ معاہدہ کر لیا جس کی اہم ترین دفعہ یہ تھی کہ دونوں سلطنتیں متحد ہو کر ترکی پر حملہ آور ہوں گی، مگر چونکہ آسٹریا اپنے ارادہ سے باب عالی کو بے خبر رکھنا چاہتا تھا اور خوب تیار ہو کر اسی طرح اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا جس طرح بغیر کسی اعلان جنگ کے روس نے ازف اور کریمیا پر چڑھائی کی تھی، اس لیے باب عالی کی خواہش پر اس نے بظاہر روس سے صلح کرانے کی کوشش کی اور ۱۷۳۷ء کے اوائل میں بمقام نیمی روف (Nemirof) ایک مجلس منعقد کی، جہاں روس اور آسٹریا کے سفیروں نے دولت عثمانیہ کے وکلاء سے صلح کی گفتگو شروع کی، جس کا سلسلہ نومبر ۱۷۳۷ء تک قائم رہا لیکن باب عالی کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی اور صلح نہ ہو سکی، روس اور آسٹریا کی طرف سے صلح کے جو شرائط پیش کیے گئے وہ اس درجہ سخت تھے کہ دولت علیہ کے لیے ان کا تسلیم کرنا قطعاً محال تھا، روس کے مطالبات یہ تھے کہ وہ تمام سابق صلح نامے جو باب عالی اور اس کے درمیان ہو چکے ہیں، منسوخ قرار دیے جائیں، کریمیا، کیوبان اور وہ تمام علاقے جن میں تاتاری قبائل آباد ہیں، اس کے حوالے کر دیے جائیں، ولاچیا اور مولڈیویا کا استقلال تسلیم کر کے انہیں روس کی حفاظت اور سیادت میں دے دیا جائے، باب عالی فرمان روائے روس کے لیے "شہنشاہ" کا لقب تسلیم کرے اور روسی جہازوں کو بحر اسود، باسفورس اور دردانیال سے ہو کر بحر روم میں آنے جانے کی آزادی دے دی جائے، مذکورہ بالا مطالبات کے علاوہ روس نے ایک کروڑ چالیس لاکھ

روبل کا مطالبہ بھی پیش کیا، آسٹریا نے اپنے لیے بوسنیا اور سرویا کے سارے علاقوں کو صلح کی قیمت قرار دی، عثمانی وکلاء نے ان اہانت آمیز شرائط کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور صلح کی یہ مجلس ایک طویل نشست کے بعد ناکام ہو کر برخاست ہو گئی۔

لیکن ناکامی صرف اسی حد تک تھی جہاں تک ترکوں کا تعلق تھا، روس اور آسٹریا کی کامیابی میں کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے ان کا مقصد ترکوں کو صلح کے فریب میں مبتلا رکھ کر آئندہ مہم کے لیے خفیہ طور پر تیار ہونا تھا اور وہ پوری طرح حاصل ہو گیا، چنانچہ صلح کی گفتگو ہنوز جاری ہی تھی کہ روس اور آسٹریا دونوں نے سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں پر حملہ کر دیا، ۱۷۳۷ء کے اوائل میں مارشل میونخ نے ستر ہزار سپاہ کے ساتھ اوکزاکوف (Oczakoff) پر حملہ کر دیا، جو بحر اسود کے شمالی ساحل پر ایک نہایت اہم عثمانی قلعہ تھا اور جنرل لاسکی چالیس ہزار روسیوں کو لے کر کریمیا میں داخل ہوا اور میونخ کی قائم کردہ مثال کے مطابق قتل و غارت گری شروع کر دی، اوکزاکوف کے ترکی دستے نے، جو بیس ہزار آزمودہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھا، نہایت جاں بازی کے ساتھ مدافعت کی لیکن بدقسمتی سے محاصرہ کے چند ہی دنوں بعد قلعہ کے سب سے بڑے بارود خانہ میں آگ لگ گئی، جس سے چھ ہزار ترک سپاہی ہلاک ہو گئے، سرعسکر اس واقعہ سے گھبرا گیا، خصوصاً یہ دیکھ کر قلعہ کے اندر شعلے زیادہ تیز ہو رہے ہیں اور ان سے مزید نقصان کا اندیشہ ہے اور باہر روسی فوج تازہ حملہ کے لیے تیار ہو رہی ہے، اس نے صلح کا سفید علم بلند کر کے اس شرط کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے کہ وہ اور اس کی سپاہ فوجی قیدی خیال کی جائے گی لیکن روسیوں نے اس شرط کی قطعاً پروا نہ کی اور قلعہ میں داخل ہو کر بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا، بالآخر مارشل میونخ کو سرعسکر اور اس کے سپاہیوں کی حفاظت کے لیے روسی فوج کا ایک دستہ قلعہ میں روانہ کرنا پڑا لیکن اس وقت تک عثمانی دستہ کا ایک بہت بڑا حصہ قتل ہو چکا تھا اور صرف تین ہزار ترک سرعسکر کے ساتھ میونخ کے لشکر میں زندہ پہنچ سکے، روسی فوج کو بھی اس معرکہ میں بہت زیادہ نقصان پہنچا، چنانچہ اوکزاکوف میں ایک مضبوط دستہ متعین کرنے کے

بعد میونخ یوکرین کو لوٹ آیا اور اس سال کسی دوسری مہم پر روانہ ہونے کی ہمت نہیں کی، جنرل لاسکی ۲۳ر جولائی ۱۷۳۷ء کو کریمیا میں داخل ہو گیا تھا قرہ سو بازار کے قریب تاتاریوں کو شکست دے کر اس نے تمام ملک میں قتل و خوں ریزی کا بازار گرم کر دیا اور ایک ماہ کی قتل و غارت گری اور آتش زنی کے بعد جب بہیمیت اور بربریت کی پیاس کسی قدر کم ہوئی تو اگست میں واپس چلا گیا، کریسی کا بیان ہے کہ روسی فخر کرتے تھے کہ اس مختصر سے حملہ میں انہوں نے چھ ہزار مکانات، اڑتیس مسجدیں، دو گرجے اور پچاس چکیاں جلا ڈالیں۔

آسٹریا کی شکست اسی سال (۱۷۳۷ء) میں آسٹریا نے بھی جس کے وکلاء نیمی روف کی کانگریس میں ترکوں کو صلح کی گفتگو میں مصروف رکھے ہوئے تھے، بغیر کسی اعلان جنگ کے دفعۃً نِش پر حملہ کر دیا اور جولائی ۱۷۳۷ء میں ایک فوج فیلڈ مارشل سکنڈروف (Seckendrof) کی سرکردگی میں سرویا کو روانہ کی اور دوسری بوسنیا میں بھیجی، نِش پر قبضہ پانے کے بعد سکنڈروف نے اپنی فوج کا ایک حصہ ودین کی فتح کے لیے روانہ کیا لیکن عثمانیوں کو اس شہر کے استحکام کا موقع مل گیا تھا، اس لیے آسٹروی فوجیں جن پر شہزادہ یوجین کی سابق فتوحات کا نشہ ہنوز طاری تھا، پے درپے حملوں کے باوجود اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکیں، اس شکست کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ آسٹریا کے جنرل آپس ہی میں جھگڑنے لگے اور پھر ان کی باہمی مخالفتوں سے فوج میں جو کمزوری رونما ہونے لگی تھی، اس میں وبا اور سامان رسد کی قلت نے اور اضافہ کر دیا، برخلاف اس کے ترک صدر اعظم زیر سیادت حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، ان کی فطری دلیری فرانس کے مشہور ماہر حرب بونیوال (Bouneval) کی معیت و مشورہ سے جو مسلمان ہو کر عثمانی فوجوں کے نظام و تربیت کا نگراں مقرر ہو گیا تھا اور زیادہ مؤثر ہو گئی، سیکنڈروف نے شکست کھا کر اپنی بقیہ فوجوں کے ساتھ ہنگری کا رخ کیا، ترکوں نے نِش کو واپس لے لیا اور آسٹروی علاقہ کے متعدد حصوں میں داخل ہو گئے، بوسنیا کی مہم کا نتیجہ بھی ایسا ہی رہا، وہاں کے مسلمان باشندوں نے بہادری کے ساتھ آسٹریا کی فوجوں کا

مقابلہ کیا اور آخرکار انہیں بوسنیا سے نکال باہر کیا۔

دوسرے سال شہنشاہ آسٹریا نے نئے جنرلوں کی سرکردگی میں تازہ فوجیں روانہ کیں اور پھر ترکوں کی طرف سے بھی ایک نیا صدر اعظم یغان محمد پاشا ان کے مقابلہ میں بڑھا اور پیش قدمی کر کے میڈیا پر قبضہ کر لیا، جو ہنگری کے علاقہ میں تھا، اور پھر آگے بڑھ کر دریائے ڈینوب کے ساحل پر اورسوا (Orsova) کے اہم قلعہ کا محاصرہ کر لیا، میڈیا سے قریب کورینا کے مقام پر آسٹروی فوجوں کو ایک لڑائی میں عارضی کامیابی نصیب ہوئی، (۴؍جولائی ۱۷۳۸ء) لیکن فوراً ہی صدر اعظم تازہ فوجوں کے ساتھ پہنچ گیا اور غنیم کو بھگا کر سمندریا پر قبضہ کر لیا، ۱۵؍اگست ۱۷۳۸ء کو اورسوا نے بھی ہتھیار ڈال دیے، آسٹروی فوجیں بھاگ کر بلغراد میں پناہ گزیں ہو گئیں۔

روس کے مقابلہ میں ترکوں کی یہ کامیابی کوئی شاندار نہ تھی، تاہم ۱۷۳۸ء میں انہوں نے روسیوں کو بحر اسود کے ساحل پر آگے بڑھنے سے روکے رکھا، مارشل میونخ نے دریائے نیپر اور دریائے بوگ کو عبور کر کے چند ترکی اور تاتاری دستوں کو شکست دی لیکن جب بندر کے محاصرہ کی غرض سے دریائے نیسٹر تک پہنچا تو وہاں اس کا سامنا ایک مضبوط عثمانی لشکر سے ہوا، جو بندرگاہ کی راہ میں حائل تھا اور جس پر غلبہ پانا اس کے لیے ناممکن ثابت ہوا، متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں جن میں سے ایک میں ساسی گرائی نے بیس ہزار تاتاری اور اسی قدر عثمانی سپاہ کی مدد سے روسیوں کو سخت شکست دی، میدان جنگ میں روسی فوج کو جو نقصان پہنچا، اس سے زیادہ نقصان وبا اور سامان رسد کی قلت نے پہنچایا اور میونخ کے لیے اپنی بقیہ سپاہ کے ساتھ یوکرین لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، اسی سال جنرل لاسکی نے تیس پینتیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ کریمیا پر پھر حملہ کیا، یہ تیسرا حملہ تھا، پہلے دو حملوں میں چونکہ روسیوں نے ملک کو حتی الامکان پوری طرح تباہ کر دیا تھا، اس لیے جنرل لاسکی کو سامان رسد کی فراہمی میں سخت دشواریاں پیش آئیں اور اسے مجبوراً بہت جلد کریمیا سے نکل جانا پڑا۔

مشرقی تجویز ۱۷۳۰ء کے موسم سرما میں فرانس کی وساطت سے صلح کی گفتگو پھر چھیڑی گئی، دولت علیہ جنگ ختم کرنے کی غرض سے بہت کچھ نقصان برداشت کرنے پر تیار تھی لیکن روس کا نمونخ کسی طرح صلح کی اجازت نہ دیتا تھا اور اس نے ایسے شرائط پیش کیے جن کا قبول کرنا دولت علیہ کے لیے قطعاً محال تھا، زارنیہ اور روس کی وزارت حرب پر مارشل میونخ کا اثر بہت زیادہ تھا اور میونخ ہی کی مخالفت نے صلح کی تمام کوششوں کو ناکام کر دیا، اس نے زارنیہ کو یقین دلایا کہ یورپ میں سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا جو تعداد میں اپنے مسلمان حکمرانوں سے کئی گنا زیادہ ہے، ترکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہے اور اس کی نگاہیں زارنیہ روس کی طرف لگی ہوئی ہیں، جسے وہ اپنا جائز فرماں روا تسلیم کرتی ہے، اس نے اس بات پر زور دیا کہ عیسائی رعایا کے جوش سے فائدہ اٹھانے اور قسطنطنیہ کی طرف بڑھنے کا بس یہی موقع ہے کہ ابھی روسی فتوحات کا اثر رعایا کے دلوں پر تازہ ہے، بہت ممکن ہے کہ ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آئے، زارنیہ نے میونخ کی اس "مشرقی تجویز" (Oriental Project) کو منظور کیا اور اس کی ہدایت کے مطابق سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں میں اپنے جاسوس روانہ کیے تاکہ عیسائی رعایا کو دولت علیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں۔

۱۷۳۹ء میں میونخ نے جنگ کا سلسلہ پھر شروع کیا اور مولڈیویا کی سرحد میں داخل ہونے کے لیے اس نے پوڈولیا کی راہ اختیار کی جو اس وقت مملکت پولینڈ کا ایک صوبہ تھا، پولینڈ اس جنگ میں کسی فریق کا شریک نہ تھا لیکن میونخ اس طرح پوڈولیا میں داخل ہوا جیسے کسی دشمن کے ملک میں داخل ہوتے ہیں، راستہ میں روسی فوجوں نے جی بھر کے لوٹ مار کی اور یوں اس صوبہ کو ویران کرتے ہوئے مولڈیویا کی سرحد کو عبور کر کے خوزیم کے مقام پر ایک ترکی لشکر کو شکست دی، اس کے بعد میونخ یاسی کی طرف بڑھا جو مولڈیویا کا پایہ تخت تھا اور اس پر قبضہ کر لیا، پھر اس نے بندر کا رخ کیا اور چاہتا تھا کہ بندر اور اس علاقہ کے دوسرے قلعوں کو فتح کرتا ہوا جنوب کی طرف یورپین ترکی قلب میں داخل ہونے کی کوشش

کرے لیکن اثنائے راہ میں اسے اپنے حلیف آسٹریا کی تباہ کن شکست کی اطلاع ملی اور معلوم ہوا کہ آسٹریا نے بہت دب کر سلطنت عثمانیہ سے صلح کر لی ہے۔

آسٹریا کی فیصلہ کن شکست واقعہ یہ تھا کہ اسی درمیان میں آسٹریا کی فوجوں نے پھر سرویا پر حملہ شروع کر دیا تھا والیس (Wallis) اور نایپرگ (Neiperg) آسٹریا کے دو نئے اور مشہور جنرلوں نے ایک زبردست فوج کے ساتھ پیٹر وارڈین سے نکل کر جنوب کا رخ کیا، ادھر صدر اعظم الحاج محمد پاشا تقریباً دو لاکھ سپاہ لے کر ان کے مقابلہ کے لیے آ رہا تھا، سمندریا اور پیٹر وارڈین کے درمیان کروٹزکا (Krolzka) کے مقام پر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا، آسٹریا کو سخت شکست ہوئی اور اس کی فوجوں نے بھاگ کر بلغراد میں پناہ لی، عثمانیوں نے تعاقب کیا اور بلغراد پر گولہ باری شروع کر دی۔

صلح نامۂ بلغراد والیس اور نایپرگ کا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا، ان کی ہمت چھوٹ گئی اور بقول ایورسلے وہ صلح کے لیے ویسے ہی بے چین تھے جیسے اس مہم کی ابتدا میں لاف زن اور آمادۂ جنگ نظر آتے تھے، بالآخر سفیر فرانس ولینوف (Villeneuve) کی وساطت سے شرائط صلح طے ہو گئے اور آسٹریا نے اپنے حلیف روس سے مشورہ کا انتظار بھی نہیں کیا، اس نے بلغراد اور بوسنیا، سرویا اور والاچیا کے تمام علاقے جو صلح نامۂ پساروویچ کے وقت اسے دیے گئے تھے، دولت علیہ کو واپس کر دیے، اس صلح نامہ پر یکم ستمبر ۱۷۳۹ء کو فریقین کے دستخط ہو گئے، آسٹریا کی طرف سے ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ دولت علیہ روس کے ساتھ بھی صلح کر لے، چنانچہ مارشل میونخ کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی، میونخ کو آسٹریا کی شکست اور بلغراد کے صلح نامہ کا حال معلوم کر کے سخت غصہ آیا لیکن اب اس کے لیے بھی صلح کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیوں کہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ الحاج محمد پاشا کی عظیم الشان فوج کا مقابلہ آسٹریا کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، زارینہ کو بھی مجبوراً صلح کے لیے آمادہ ہونا پڑا اور میونخ کے تمام منصوبے جو اس نے قسطنطنیہ کی فتح کی نسبت باندھ رکھے تھے، دفعۃً خاک میں مل گئے، روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جو

شرائط صلح ۱۸ ستمبر ۱۷۳۹ء مطابق ۱۴ جمادی الآخر ۱۱۵۲ھ میں طے ہوئے ان کی رو سے مولڈیویا اور کریمیا کی تمام فتوحات اور شہر اوکزاکوف سے روس دست بردار ہو گیا، نیز اس نے معاہدہ کیا کہ شہر ازف مسمار کر دیا جائے گا، ازف کا علاقہ دونوں سلطنتوں کے درمیان حد فاصل قرار پایا، صلح نامہ کی تیسری دفعہ میں یہ شرط خاص طور پر رکھی گئی کہ بحر ازف یا بحر اسود میں روس کا کوئی بیڑا رہنے نہ پائے گا اور نہ وہ ان سمندروں کے ساحل پر کوئی جہاز تعمیر کر سکے گا، بحر ازف اور بحر اسود میں روس کی جنگی یا تجارتی جہازوں کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیا گیا اور تجارتی اغراض کے لیے صرف جہازوں کے استعمال کی اجازت دی گئی۔

صلح نامۂ بلغراد دولت علیہ کے لیے ایک عظیم الشان کامیابی تھی، اس نے معاہدہ پساروویچ کی اہانت کا داغ دھو دیا اور آسٹریا اور روس کو ترکوں کے عزم شجاعت سے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی، یورپین مؤرخین اس صلح نامہ کو فرانس کی حکمت عملی کی ایک نمایاں کامیابی قرار دیتے ہیں اور اس کی تکمیل کا سہرا ولینوف کے سر باندھتے ہیں، بلاشبہ ولینوف کی وساطت سے کام لیا گیا لیکن اس سے پہلے بھی دوران جنگ میں اس نے کئی بار صلح کی کوشش کی تھی، مگر ہر کوشش بے سود اور ناکام ثابت ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ اصل حکمت عملی قوت کی ہے، دنیا نے ہمیشہ سے صرف اسی حکمت عملی کو تسلیم کیا ہے اور تاریخ کا ہر صفحہ اسی کی کارفرمائی کا شاہد ہے، بلغراد کا صلح نامہ صرف کروٹزکی فیصلہ کن جنگ کا نتیجہ تھا، ورنہ دنیا کی کوئی طاقت آسٹریا اور روس کو ان شرائط کے منظور کرنے پر راضی نہیں کر سکتی تھی۔

سویڈن سے معاہدہ ولینوف کو رسوخ باب عالی میں حاصل تھا، اسے کام میں لا کر اس نے ۱۷۴۰ء میں دولت عثمانیہ اور سویڈن کے درمیان بھی ایک معاہدہ کرا دیا، جس کے رو سے فریقین روس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کے پابند ہو گئے، فرانس کی خارجی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ پولینڈ میں روس کے اثر کو قائم ہونے سے روکا جائے، چنانچہ اس معاہدہ کی غرض بھی یہی تھی لیکن چند ہی سالوں کے بعد جب روس، پرشیا اور آسٹریا نے متحد

ہوکر پولینڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تو نہ فرانس کو مدافعت کی جرأت ہوئی اور نہ دولت علیہ اس غارت گری کو روک سکی۔

فرانس کے لیے مخصوص مراعات ولینوف کی کوشش سے فرانس کو جو مخصوص فائدہ پہنچا وہ یہ تھا کہ باب عالی نے ۱۶۷۳ء کے معاہدہ کی تجدید کر کے ان تمام حقوق کا تحفظ کر دیا جو فرانسیسی تاجروں کے لیے سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھے، نیز ۱۷؍ ستمبر ۱۷۴۰ء کے معاہدہ کے ذریعہ بعض جدید حقوق کے اضافہ کے ساتھ قدیم حقوق میں بھی فرانس کے حسب خواہ ترمیم کر دی، سلطان نے محمد سعید کو اپنا خاص سفیر بنا کر شاہ فرانس کے پاس روانہ کیا تا کہ وہ سلطان کی طرف سے تجارتی مراعات کو پیش کرے، شاہ فرانس نے سلطان کے شایان شان اعزاز کے ساتھ سفیر کا استقبال کیا اور اس کی واپسی پر دو جنگی جہاز اور کچھ فرانسیسی توپچی سلطان کی خدمت میں بھیجے تا کہ عثمانی فوجوں میں وہ جدید طریقے جاری کریں جنھیں فرانس کے ممتاز ماہر فن حرب لوفوا نے فرانسیسی فوجوں میں رائج کیا تھا۔

یورپین حکومتوں کی باہمی لڑائیاں صلح نامۂ بلغراد کے بعد تقریباً تیس سال تک سلطنت عثمانیہ اور اس کی ہم سایہ سلطنتوں کے درمیان کوئی جنگ پیش نہیں آئی، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ باب عالی موقع پانے کے باوجود جارحانہ اقدام سے اجتناب کرتا رہا لیکن بڑا سبب یہ تھا کہ آسٹریا اور روس جو اس کی سب سے بڑی دشمن سلطنتیں تھیں، خود اپنے جھگڑوں میں مبتلا تھیں اور انھیں متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کی فرصت نہ تھی، ۱۷۴۰ء میں آسٹریا کے شہنشاہ چارلس ششم کا انتقال ہو گیا اور اس کی لڑکی میریا تھریسا (Maria Theresa) تخت پر بیٹھی لیکن آسٹریا کی تقریباً تمام ہم سایہ عیسائی مملکتوں نے میریا کی مخالفت کی اور فرانس کی سرکردگی میں آٹھ سال تک اس جنگ کو جاری رکھا جو آسٹریا جنگ جانشینی (War of Austrian Succession) کے نام سے موسوم ہے اور جو بالآخر صلح نامۂ ایلا شپل (۱۷۴۸ء) کے تکملہ پر میریا کے حق میں ختم ہوئی، اسی طرح ۱۷۵۶ء سے ۱۷۶۳ء تک "جنگ ہفت سالہ" کا

سلسلہ قائم رہا جس نے یورپ کی سلطنتوں کو باہمی نزاعات میں مصروف رکھا، دولت علیہ نے ان میں سے کسی جنگ میں بھی حصہ نہیں لیا، حالاں کہ اپنے قدیم دشمن آسٹریا کی پریشان حالی سے فائدہ اٹھا کر ہنگری کے سابق عثمانی مقبوضات کو واپس لے لینے کا یہ بہت اچھا موقع تھا، برخلاف اس کے وہ نہایت دیانت داری کے ساتھ معاہدہ بلغراد کی پابندی پر قائم رہی، یورپ کے قانون سیاست کے رو سے اس کی یہ خاموشی انتہائی غیر دانش مندی پر مبنی تھی لیکن جو قانون سیاست سے بلند تر اصول یعنی اخلاق کا پابند ہے، وہ اسی خاموشی کا متقاضی تھا، باب عالی نے نہ صرف ان جنگوں کی شرکت سے اجتناب کیا بلکہ اپنے اثر سے محاربین میں صلح کرانے کی بھی امکانی کوشش کی، دشمن کی کم زوری سے فائدہ نہ اٹھانے میں دولت علیہ نے جس بلندی اخلاق کا ثبوت دیا، اس کا اعتراف یورپین مورخین بھی کرتے ہیں۔

مختلف شورشیں جہاں تک یورپ کی سلطنتوں کا تعلق تھا، ۱۷۶۸ء تک دولت عثمانیہ سے کوئی جنگ نہیں ہوئی لیکن ۱۷۴۳ء میں ایران سے پھر لڑائی چھڑ گئی، جو تین سال تک جاری رہنے کے بعد ۱۷۴۶ء میں تقریباً ان ہی شرائط پر ختم ہوئی جن پر سلطان مراد رابع کے عہد میں ایران اور باب عالی کے درمیان صلح نامہ ہوا تھا، اس جنگ کے علاوہ سلطنت کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً مقامی پاشاؤں کی بغاوتیں بھی برپا ہوتی رہیں جن سے کامل امن وسکون قائم نہ ہو سکا، دور دراز صوبوں کے والی کبھی کبھی مطلق العنان ہو جاتے تھے اور حکومت کو بعض اوقات ان کی سرکشی سے چشم پوشی کرنی پڑتی تھی، بغاوت کا سب سے زیادہ اثر مصر کے صوبہ میں تھا، جو بتدریج دولت علیہ کے قبضہ واقتدار سے نکلا جا رہا تھا۔

ایک سیاسی غلطی ولاچیا اور مولڈیویا کے صوبوں میں بعض ترکی خاندانوں کو مخصوص امتیازات حاصل تھے جن میں سب سے زیادہ اہم امتیاز وہاں کی زمینوں کا لگان وصول کر کے باب عالی میں پیش کرتا تھا، چوں کہ سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوت وقتاً فوقتاً رونما ہوتی رہتی تھی، اس لیے ان خاندانوں کی سرکشی کے اندیشہ سے باب عالی نے دو

امتیازات ان سے لے کر قسطنطنیہ کے دولت مند تاجروں کو دے دیے، ان میں زیادہ تر یونانی تاجر تھے، جنھوں نے اپنی دولت کے معاوضہ میں بڑے بڑے القاب حاصل کر لیے تھے، ولاچیا اور مولداویہ کے شریف ترک خاندانوں کی جگہ پر یہی دولت مند تاجر سرکاری مال گزاری وصول کرنے کے لیے مقرر کیے گئے، ان لوگوں نے رعایا کے ساتھ نہایت سختی اور تشدد کا برتاؤ کیا اور ترک شرفا پر بڑے مظالم کیے، یہاں تک کہ قدیم ترک خاندان یکے بعد دیگرے ختم ہوتے گئے اور ان کے بجائے تاجروں کے نئے خاندان قائم ہو گئے، ان کی سختی اور تشدد کا سب سے زیادہ مضر نتیجہ یہ ہوا کہ عام رعایا برگشتہ ہو کر روس کی طرف مائل ہو گئی۔[1]

وہابی تحریک سلطنت کی مختلف شورشوں میں ایک نہایت اہم شورش وہابی تحریک کی تھی، جس کا آغاز اسی عہد میں شیخ عبد الوہاب نجدی نے کیا تھا، اس تحریک میں ابن سعود امیر نجد کی حمایت سے بہت کچھ قوت آگئی تھی اور باب عالی کو اس کے فرو کرنے میں خاصی کاوش کرنی پڑی لیکن سلطان محمود کے عہد میں اس کا اثر بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی گیا اور اس کے جانشینوں کی کوششیں بھی اس کے استیصال میں ناکام رہیں تا آں کہ سلطان محمود ثانی کے عہد میں محمد علی پاشا والی مصر نے اس فرقہ کی سیاسی قوت کو توڑ کر اس کے آخری امیر کو گرفتار کر لیا اور اسے ۱۸۱۹ء میں قسطنطنیہ روانہ کر دیا جہاں وہ قتل کر دیا گیا۔

وفات ۲۷ صفر ۱۱۶۸ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۷۵۴ء کو سلطان محمود اول نے وفات پائی۔ اس کو تعمیرات سے بہت دل چسپی تھی، اس نے قسطنطنیہ نیز مختلف صوبوں میں متعدد عظیم الشان عمارتیں بنوائیں ''جامع نور عثمانی'' کی تعمیر اسی نے شروع کی تھی، اس نے چار کتب خانے بھی پایہ تخت میں قائم کیے، وہ اپنے عدل و حلم اور تمام رعایا کے ساتھ یکساں انصاف کرنے میں خاص طور پر مشہور تھا۔

---

[1] کریزی ص ۱۸۱۔

عثمان ثالث

۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۱ھ مطابق ۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۷ء

سلطان محمود خاں اول کی وفات پر اس کا بھائی عثمان خاں ثالث تخت نشین ہوا، اس نے صرف تین سال حکومت کی اور اپنے مختصر عہد میں سلطان محمود ہی کے سیاسی اصولوں کا پابند رہا، چنانچہ ہم سایہ حکومتوں سے کوئی آویزش نہیں ہوئی، آسٹریا کی جنگ جانشینی کے بعد ۱۷۵۶ء میں "جنگ ہفت سالہ" شروع ہوگئی، جس نے یورپین حکومتوں کو دو مخالف جماعتوں میں تقسیم کر کے سات سال تک وسط یورپ کو میدان کارزار بنائے رکھا، دولت عثمانیہ کے لیے یہ دوسرا نادر موقع تھا، جب وہ دشمنوں کی باہمی جنگ سے فائدہ اٹھا سکتی تھی، مگر عثمان ثالث اس جنگ میں اخلاق وشرافت کے اسی اصول پر قائم رہا، جس کی مثال محمود اول نے آسٹریا کی جنگ جانشینی کے موقع پر پیش کی تھی، سلطنت کے اندرونی نظم ونسق میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، اس عہد میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔

۱۶ صفر ۱۱۷۱ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۷۵۷ء کو سلطان عثمان ثالث نے وفات پائی۔

مصطفیٰ ثالث

۱۱۷۱ھ تا ۱۱۸۷ھ مطابق ۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۳ء

عثمان ثالث کے بعد مصطفیٰ ثالث تخت پر آیا، یہ سلطان احمد ثالث کا لڑکا تھا، تخت نشینی کے وقت اس کی عمر پچاس سال کی تھی اور یہ طویل مدت امور سلطنت سے علاحدہ محل کے ایک حصہ میں بسر ہوئی تھی، تاہم فطری اہلیت نے تجربہ کی کمی بہت کچھ پوری کر دی تھی اور اگر روس سے جنگ نہ چھڑ گئی ہوتی تو کوئی شبہ نہیں کہ اس کی فرض شناسی اور تدبر سے سلطنت کو بہت فائدہ پہنچتا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ مصطفیٰ نام کے جتنے سلطان ہوئے ان سب کے عہد میں سلطنت عثمانیہ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور اس کے مقبوضات کے اہم حصے دشمنوں کے ہاتھوں میں چلے گئے، تاہم مصطفیٰ ثالث کے عہد کے ابتدائی چھ سال جب انصرام حکومت صدر اعظم راغب پاشا کے ہاتھ میں تھا، دولت علیہ کی خوش حالی اور ترقی کے سال تھے۔

راغب پاشا راغب پاشا سلطان محمود اول کے آخری دور میں صدر اعظم رہ چکا تھا، اپنی غیر معمولی لیاقت، تدبر اور حسن انتظام کے لحاظ سے وہ صدر اعظم صوقوللی پاشا اور وزرائے کوپریلی کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے، اپنی وفات تک اس نے دولت علیہ کو دوسری سلطنتوں کی آویزش سے محفوظ رکھا اور قیام امن کے ساتھ پوری توجہ سلطنت کی فلاح و بہبود پر صرف کرتا رہا، اس نے سلطنت کے مختلف صیغوں کی اصلاح کی، اوقاف کی نگرانی کا خاص طور پر اہتمام کیا، شفاخانے بنوائے اور اپنی جیب خاص سے ایک کتب خانہ مرتب کیا، گرانی اور

قحط کے سدباب کے لیے اس نے اندرون ملک میں ذرائع حمل ونقل کو آسان بنادینے کی ایک ایسی تجویز اختیار کی جس کی تکمیل نہایت درجہ مفید ثابت ہوتی لیکن اسے پورا کرنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوگیا، وہ تجویز یہ تھی کہ خلیج نائیکومیڈیا کے مشرقی سرے سے ایک نہر نکال کر جھیل سبنجا (Sabandja) میں ملادی جائے اور دوسری نہر جھیل سبنجا سے نکال کر دریائے سقاریہ میں ملادی جائے، جو بحر اسود میں گرتا ہے، اس طرح باسفورس سے گزرے بغیر خلیج نائیکومیڈیا سے بحر اسود تک آمد ورفت ہوجاتی، ان دو بڑی نہروں سے چھوٹی چھوٹی نہروں کا سلسلہ قائم کردیا جاتا جن سے ملک کے ایک حصہ کی چیزیں دوسرے حصوں تک بہت آسانی کے ساتھ منتقل کی جاسکتی تھیں، تجارتی فائدہ کے علاوہ سبنجا میں ترکی بحریہ کا بھی ایک محفوظ اور مضبوط مرکز قائم کیا جاسکتا تھا، یہ تجویز کوئی نئی نہیں تھی، مصطفیٰ ثالث سے قبل سلیمان اعظم، مراد ثالث اور محمد رابع نے بھی اس کو عملاً شروع کردیا تھا لیکن تکملہ کسی سے بھی نہ ہوسکا، کریسی کا بیان ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے قیام سے پہلے بھی دوبار بتھنیا کے فرماں رواؤں نے اور ایک بار شہنشاہ ٹریجن (Trajan) نے اسی تجویز کو اختیار کیا تھا، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے فوائد کے احساس کے باوجود اس کی تکمیل کسی نے بھی نہ کی، حالاں کہ نہ فاصلہ زیادہ تھا اور نہ زمین ایسی تھی جس کی کھدائی دشوار ہوتی۔

پرشا سے اتحاد راغب پاشا کی خارجی سیاست اہم ترین مقصد یہ تھا کہ دولت عثمانیہ کو روس اور آسٹریا کی دشمنی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے دوسری عیسائی مملکتوں سے اتحاد قائم کیا جائے، آسٹریا کی جنگ جانشینی اور پھر جنگ ہفت سالہ کے بعد پرشا کا شمار یورپ کی نہایت طاقت ور مملکتوں میں ہونے لگا تھا اور اس کے فرماں روا فریڈرک ثانی سے روس اور آسٹریا دونوں صددرجہ بغض وعناد رکھتے تھے، راغب پاشا نے اسی بنا پر پرشا کی دوستی کو بہت ضروری خیال کیا اور اس کے لیے شروع ہی سے کوشش کرتا رہا، بالآخر ۱۷۶۱ء میں باب عالی اور پرشا کے درمیان ایک معاہدۂ اتحاد مرتب ہوگیا اور فریڈرک ثانی کے سفیر نے قسطنطنیہ

میں اس پر دستخط کر دیے، فریڈرک کو دولت عثمانیہ سے اتحاد کرنے میں روس اور آسٹریا کی دشمنی سے قطع نظر اس وجہ سے بھی تامل نہ ہو کہ اس کے برعکس صورت اختیار کرنے میں اسے کوئی خاص فائدہ نظر نہ آتا تھا، کیوں کہ اس کا ملک ہر طرف عیسائی مملکتوں سے گھرا ہوا تھا اور اگر سلطنت عثمانیہ کا کوئی علاقہ نکل بھی جاتا تو اس سے پرشا کی مملکت میں اضافہ ہونے کا امکان نہ تھا، اسی قسم کا اتحاد سویڈن، نیپلز اور ڈنمارک سے بھی پہلے ہی قائم کر لیا گیا تھا، راغب پاشا چاہتا تھا کہ پرشا سے دوستی کا جو معاہدہ ہوا ہے، اسے مستحکم کرنے کے لیے اس شرط کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ فریقین جارحانہ اور مدافعانہ جنگوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہیں گے لیکن اس مسئلہ میں گفتگو کرنے کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ۱۷۶۳ء میں راغب پاشا کا انتقال ہو گیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

فریڈرک کا نقض عہد: راغب پاشا کی وفات کے بعد سلطان نے انتظام حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لیا، وہ ایک نہایت جفاکش اور لائق فرماں روا تھا اور سلطنت کی فلاح و بہبود کا دل سے خواہاں تھا لیکن اپنے وزیروں اور فوج کے بڑے بڑے افسروں کے انتخاب میں اکثر غلطی کر جاتا جو سلطنت کے لیے مضر ثابت ہوتی، اتفاق یہ ہے کہ اس کے ہم عصر فرماں رواؤں میں دو ایسے تھے جو اپنی غیر معمولی لیاقت اور طاقت کے اعتبار سے یورپ کے عظیم ترین فرماں رواؤں میں شمار کیے جاتے تھے، یعنی کیتھرائن ثانیہ جس نے ۱۷۶۲ء میں اپنے شوہر زار کو قتل کرا کے روس کے تخت پر قبضہ کر لیا تھا اور فریڈرک ثانی جو اپنے کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں فریڈرک اعظم کے نام سے مشہور ہے، یہ صحیح ہے کہ فریڈرک اور باب عالی کے درمیان دوستی کا ایک معاہدہ ہو چکا تھا لیکن یہ معاہدہ اسی وقت تک قائم رہا جب تک اس کی پابندی فریڈرک کی ہوس و خود غرضی کے لیے روک نہ بنی، جوں ہی اس نے محسوس کیا کہ پرشا کے اغراض اس معاہدہ کے مسترد کر دینے ہی سے پورے ہو سکتے ہیں، اس نے بلا تامل اسے توڑ کر دولت عثمانیہ کے دشمنوں سے رشتۂ اخوت جوڑ لیا۔

کیتھرائن ثانیہ | کیتھرائن ثانیہ ایک فوجی بغاوت کے بعد تخت پر آئی تھی، جن فوجی سرداروں نے اس کے شوہر زار روس کو قتل کر کے اسے تخت پر بٹھایا تھا، وہ مزید قتل وغارت گری کے لیے بیتاب تھے اور ان کی نگاہیں ہر کمزور مملکت کی طرف اٹھتی تھیں جس پر روس کی دست اندازی آسانی سے ممکن تھی، اس مقصد کے لیے انھوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ پہلے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے اندرون ملک میں خانہ جنگی شروع کرا دیتے اور پھر کمزور جماعت کی حمایت کے بہانہ سے دخل اندازی کرنے لگتے اور جب خود ان ہی کی پیدا کی ہوئی بدامنی ان کی کوششوں سے ترقی کر جاتی تو قیام امن کے دعوے کے ساتھ روسی فوجیں اس ملک میں داخل کر کے اس پر قبضہ کر لیتے، کیتھرائن کے عہد کے ابتدائی سالوں میں یہ تدبیر خصوصیت کے ساتھ پولینڈ میں عمل میں لائی گئی، پرشا بھی اس غارت گری میں روس کا شریک ہو گیا، فریڈرک ثانی کو روس اور آسٹریا کے خلاف دولت عثمانیہ کے اتحاد کی خواہش باقی نہ رہی، بلکہ اس نے ۱۷۶۴ء میں کیتھرائن کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا، جس کے رو سے فریقین پابند ہو گئے کہ ایک دوسرے کے مقبوضات کا تحفظ کریں گے اور عہد کیا کہ اگر کسی فریق پر حملہ ہو گیا تو دوسرا فریق دس ہزار پیدل اور ایک ہزار سواروں سے اس کی مدد کرے گا لیکن اگر روس پر ترکوں نے حملہ کیا یا پرشا پر فرانسیسیوں نے تو مدد بجائے فوج کے نقد کی شکل میں ہو گی، اس معاہدہ کی ایک خفیہ دفعہ بھی تھی جس کا تعلق پولینڈ سے تھا اور اس کے تکملہ کے چند ہی روز بعد دونوں حکومتوں کے درمیان پولینڈ کی تقسیم کی نسبت ایک تازہ معاہدہ بھی ہو گیا، جس میں میریا تھریسیا بھی شریک کی گئی، روس اور پرشائی فوجوں نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا اور کیتھرائن کے ایک سابق آشنا اسٹانسلاس پونیاٹوسکی (Stanislans Poinalowski) کو جبر پولینڈ کے تخت پر بٹھایا گیا، حالاں کہ پولینڈ کے باشندے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرنے پر کسی طرح راضی نہ تھے، روسی جنرل ریپنن (Repnin) نے وارسا میں ڈکٹیٹر کی حیثیت اختیار کر لی، باب عالی نے روس اور پرشا کی اس ظالمانہ کارروائی کے خلاف سخت احتجاج کیا، مگر ان

سلطنتوں نے مطلق پرواہ نہ کی، برخلاف اس کے روس نے اپنے طرزِ عمل سے ظاہر کر دیا کہ وہ باب عالی کو جنگ پر مجبور کر دینا چاہتا ہے، اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے کریمیا، موریا، مونٹی نگرو اور جارجیا کے علاقوں میں دولت علیہ کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کی، اس کے علاوہ جب پولینڈ کے وطن پرستوں کے حدود میں پناہ گزیں ہوئی تو روسی جنرل ویسمین (Wessmann) نے بلطہ تک اس کا تعاقب کیا، جو بسرابیا کی سرحد پر خان کریمیا کے علاقہ میں واقع تھا اور شہر پر گولہ باری کر کے اسے برباد کر دیا۔

اعلانِ جنگ روس کی مذکورہ بالا کارروائیوں سے مجبور ہو کر سلطان نے ۶؍ اکتوبر ۱۷۶۸ء کو قسطنطنیہ میں ایک دیوان منعقد کیا اور اراکین سلطنت سے اس باب میں مشورہ کیا، سب نے بالاتفاق روس کی دراز دستوں کی بنا پر جنگ کی رائے دی اور پولینڈ کے ساتھ اس کے طرزِ عمل کو معاہدۂ بلغراد کی خلاف ورزی قرار دے کر جنگ کو ضروری قرار دیا، البتہ صدرِ اعظم محسن زادہ پاشا تنہا شخص تھا جس نے اس رائے کی مخالفت کی، اصول کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے کہ دولت علیہ اس وقت جنگ کے لیے کافی طور پر تیار نہ تھی اور پوری تیاری کے بغیر لڑائی چھیڑ دینا کسی طرح مناسب نہ تھا، اس مخالفت کی بنا پر جو بعد کے واقعات سے بالکل حق بجانب ثابت ہوئی، وہ صدارت کے عہدہ سے برطرف کر دیئے گیا اور اس کی جگہ امین محمد پاشا جو سلطان کا داماد تھا، صدرِ اعظم مقرر ہوا، دیوان کے فیصلہ کے مطابق ۶؍ اکتوبر ۱۷۶۸ء کو اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔

آغازِ جنگ اعلانِ جنگ میں عجلت کی گئی، موسم سرما میں ایشیا کی فوجوں کو منتقل کرنا بہت دشوار تھا اور اسی وجہ سے ۱۷۶۹ء کے موسم بہار تک عثمانی فوجیں اکٹھا نہ ہو سکیں لیکن یہ تاخیر روس کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی، اس نے سلطنت عثمانیہ کے شمالی علاقوں پر حملہ شروع کر دیا، اعلانِ جنگ کے وقت ترکی قلعوں کی حالت بھی قابل اطمینان نہ تھی، نہ ان کی قلعہ بندی مستحکم تھی اور نہ سامان رسد کافی مقدار میں جمع تھا، موسم سرما میں باب عالی نے ہرگی کو

پورا کرنے کی کوشش کی، مگر وقت تنگ تھا، موسم بہار میں باقاعدہ جنگ شروع ہونے تک بھی پوری تیاری نہ ہو سکی۔

ابتدائی فتح بہرحال جنگ کے ابتدائی دور میں کریم گرائی، خان کریمیا نے روسیوں کو عاجز کر دیا، جنوری ۱۷۶۹ء میں اس نے بلطہ میں ایک لاکھ تاتاری سپاہیوں کا ایک زبردست لشکر تیار کر کے دریائے بوگ کو عبور کیا اور دو ہفتہ تک روس کے جنوبی علاقوں کو تاخت و تاراج کرتا رہا، اس مہم میں بیرون دی توت (Baron de Tott) مشہور فرانسیسی ماہر حرب بھی اس کے ساتھ تھا، جسے شاہ فرانس نے عثمانی فوجوں کی تنظیم و تربیت کے لیے باب عالی میں بھیجا تھا، جنوبی روس کی لشکر کشی کے بعد کریم گرائی کریمیا کو واپس آ گیا اور ایک ہی ماہ کے اندر اس کا انتقال ہو گیا، لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے یونانی طبیب نے اسے زہر دے دیا، یہ طبیب امیر ولاچیا کا آدمی تھا، اس کی وفات پر سلطان نے دولت گرائی کو کریمیا کا خان مقرر کیا لیکن کریم گرائی کی لیاقت و شجاعت سے اسے کوئی مناسبت نہ تھی۔

روس کی تیاریاں اسی درمیان میں کیتھرائن نے پانچ فوجیں میدان جنگ کو روانہ کیں، پہلی فوج نے شہزادہ گالٹزن (Galitzen) کی سرکردگی میں مولڈیویا پر حملہ کر کے خوزیم کا محاصرہ کر لیا، دوسری فوج جنرل رومانزوف (Romarzoff) کے زیر قیادت دریائے نیپر اور بحر ازف کے درمیان روسی قلعوں کے استحکام اور ازف اور تگنروک کے قلعوں کی از سر نو تعمیر کے لیے روانہ ہوئی، جو معاہدہ بلغراد کی رو سے مسمار کر دیے گئے تھے، تیسری فوج دس گیارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ پولینڈ پر قبضہ کرنے کے لیے بڑھی تاکہ اس طرف سے ترکوں کو مدد نہ مل سکے، چوتھی نے قبارطہ اور کیوبان کے تاتاری علاقوں کا رخ کیا اور پانچویں تفلیس کی طرف روانہ ہوئی تاکہ وہاں سے شہزادگان جارجیا کے ساتھ مل کر ارض روم اور طرابزون پر حملہ کرے، ساتھ ہی مونٹی نگرو کی عیسائی رعایا کے پاس روپیہ، سامان حرب اور فوجی افسر روانہ کیے گئے کہ انہیں ترکوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کریں۔

امین پاشا کی نا اہلی | روس کی ان تیاریوں کے باوجود امین پاشا ۱۷۶۹ء تک مقابلہ کے لیے روانہ نہ ہو سکا اور روانہ ہونے کے بعد بھی خود یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کوچ کس سمت کو ہونا چاہیے، اس نے فوجی افسروں کو مشورہ کے لیے جمع کیا اور فنِ حرب سے اپنی عدمِ واقفیت کا اعتراف صاف الفاظ میں کرتے ہوئے فوج کی نقل و حرکت سے متعلق ان کی رائے دریافت کی، اس نے کہا:

> ”مجھے جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے، فوج کی نقل و حرکت کا فیصلہ آپ لوگوں پر ہے، اور یہ آپ ہی بتائیں گے کہ افواجِ عثمانیہ کی کامیابی کے لیے بہترین تدبیریں کیا ہوں گی، آپ لوگ بلا تکلف اپنے خیالات ظاہر کریں اور اپنے مشورہ سے میری رہنمائی کریں۔“

افسرانِ فوج کو سپہ سالار کے اس اعترافِ نا اہلی پر سخت تعجب ہوا لیکن ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بحث و مباحثہ کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کریں، چنانچہ متعدد افسروں نے مختلف رائیں پیش کیں، آخر میں صرف اس پر اتفاق ہو سکا کہ دریائے ڈینوب کو عبور کر کے مولڈیویا میں داخل ہو جائیں اور پھر جیسی صورت مناسب ہو اس کے مطابق عمل کریں، چنانچہ فوج نے دریائے ڈینوب کو عبور کیا، پھر دریائے پرتھ کے ساحل پر خانڈپی پہنچی جو خوزیم اور باسی کے درمیان واقع ہے، وہاں سامانِ رسد کی قلت اور پسوؤں اور مچھروں کی کثرت نے سپاہیوں کو پریشان کر دیا اور امین پاشا نے مجبور ہو کر بندر کا رخ کیا لیکن اس طرف بھی وہی دشواریاں پیش آئیں جن سے خانڈپی میں دوچار ہونا پڑا تھا، اس درمیان میں شہزادہ گالٹزن پوڈولیا سے تازہ افواج لے کر ترکوں کے مقابلہ کی تیاریاں کر رہا تھا، روس نے پولینڈ کو مجبور کر کے اس سے دولتِ عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کرا دیا تھا جس کے جواب میں بابِ عالی نے بھی بادلِ ناخواستہ پولینڈ کے خلاف ہتھیار اٹھائے، خوزیم کے قریب روسی اور عثمانی فوجوں میں متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں جن میں صدرِ اعظم امین پاشا اور گالٹزن دونوں نے اپنی نا اہلی کا پورا پورا ثبوت دیا، سلطان نے امین

پاشا کو معزول کر کے واپس بلا لیا اور اگست ۱۷۶۹ء میں اسے قتل کرا دیا، امین پاشا کا جانشین صدر اعظم علی پاشا ایک بہادر افسر تھا، سالار عسکر ہونے کے بعد اس نے روسی فوجوں پر خوزیم کے قریب متعدد حملے کیے اور پولینڈ میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن آخر کار اسے ہزیمت ہوئی اور ۱۸؍ستمبر ۱۷۶۹ء کو خوزیم نے ہتھیار ڈال دیے، ترکی فوجوں نے پسپا ہو کر دریائے ڈینوب کی طرف کوچ کیا، کیتھرائن نے بھی گالٹزن کو اس کی نالائقی کی بنا پر واپس بلا لیا اور اس کی جگہ رومانزوف کی روسی فوجوں کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا، جس نے تھوڑے ہی دنوں میں تمام مولڈیویا پر قبضہ کر لیا۔

موریا میں روس کی شکست | لیکن اس کامیابی سے کیتھرائن کے حوصلوں کی تشفی نہ ہوئی، اس کی ''مشرقی تجویز'' کا اہم ترین مقصد ترکوں کو یورپ سے نکال دینا تھا، یہی مقصد پیٹر اعظم کے پیش نظر بھی تھا اور مارشل میونخ کی تمام سرگرمیاں بھی صرف اسی کے لیے تھیں، یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے روسی فوجوں کی فتوحات کے علاوہ عیسائی رعایا کو بھی دولت علیہ کے خلاف برگشتہ کر دینا بہت ضروری تھا، چنانچہ کیتھرائن نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے آدمیوں کو خفیہ طور پر راہبوں کے لباس میں یونان اور یورپین ترکی کے جنوبی علاقوں میں بھیجنا شروع کر دیا تھا تاکہ عیسائی رعایا کو علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کر رکھیں، موریا کی یونانی رعایا میں کیتھرائن کے فرستادوں کی کوششیں خاص طور پر کامیاب ہوئیں اور ان لوگوں نے اصرار کے ساتھ کیتھرائن سے مدد کی درخواست کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر بالکل تیار ہیں، یہ وقت دولت علیہ کے لیے مختلف پریشانیوں کا وقت تھا، ایک طرف اگر کریمیا اور دریائے ڈینوب کے ساحلی علاقوں پر روسی فوجیں غالب آ رہی تھیں تو دوسری طرف مصر کے والی علی بیگ نے تقریباً خود مختاری حاصل کر لی تھی، پھر شام میں بھی بغاوت پھیلی ہوئی تھی، روس نے باغیوں کی مدد کر کے ان کی ہمتوں کو اور بھی بڑھا دیا اور کیتھرائن کو توقع ہوئی کہ ایک ہی کوشش میں یونان، مصر اور شام

تینوں صوبے سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل جائیں گے، یونان والوں کے اصرار پر اس نے ایک بحری جنگی بیڑا الکسیز اورلوف (Alexiso.foff) کی سرکردگی میں روانہ کیا جو فروری ۱۷۷۰ء میں ساحل موریہ کے سامنے نمودار ہوا، باغیوں نے روسی فوج کا پرجوش استقبال کیا اور اس علاقہ کے ترک باشندوں پر جن کی تعداد نسبتہً بہت کم تھی، شدید ترین مظالم توڑے۔[1] محسن زادہ پاشا سابق صدر اعظم موریا کا حاکم تھا، اس نے نہایت استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا اور بالآخر یونانی باغیوں اور ان کے روسی حلیفوں کو میدان جنگ میں شکست دی، روسی دستہ شکست کھا کر اپنے جہازوں پر بھاگا اور فوراً لنگر اٹھا کر یونانیوں کو خیر باد کہتا ہوا روانہ ہو گیا، واپسی میں جزائر موڈن وکورن پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، ۷/ جولائی ۱۷۷۰ء کو جزیرہ سیوس (Seios) کے قریب ایک عثمانی بیڑہ سے مقابلہ ہوا، ترکوں کو شکست ہوئی لیکن اس جنگ میں عثمانی بیڑے کے ایک افسر حسن الجزائری نے اپنی حیرت انگیز شجاعت کا لوہا غنیم سے بھی منوالیا، اس نے اپنا جہاز روسی امیر البحر کے جہاز کے قریب لے جا کر گولہ باری شروع کر دی اور دشمن سے گھرے ہونے کے باوجود کمال بے خوفی کے ساتھ لڑتا رہا، یہاں تک کہ دونوں جہازوں میں آگ لگ گئی۔

عثمانی جہازوں کی بربادی عثمانی بیڑہ شکست کے بعد چشمہ (Tehesma) کی چھوٹی سی بندرگاہ میں پناہ گزیں ہوا، جہاں روسی امیر البحر الفنسٹن (Flphinslone) نے اس کا محاصرہ کر لیا، الفنسٹن ایک انگریز افسر تھا جس کی خدمات روس نے حاصل کر لی تھیں، اس کے علاوہ اور بھی متعدد انگریز روسی بیڑہ کے ذمہ دار عہدوں پر مامور تھے، ان ہی میں سے ایک نے جس کا نام ڈگڈیل (Dugdale) تھا، الفنسٹن اور ایک دوسرے انگریز افسر گریگ (Gregg) کے مشورہ سے عثمانی بیڑہ کو برباد کر دینے کی ایک نہایت خطرناک تدبیر اختیار کی، وہ اپنے جہاز کو لے کر چشمہ کی بندرگاہ میں داخل ہوا، جہاں عثمانی جہاز ایک دوسرے سے

---

[1] ایورسلے ص ۲۱۴

ملے ہوئے محصور کھڑے تھے اور جب ان کے قریب پہنچ گیا تو ایک جہاز میں آگ لگا دی، آگ لگنے سے قبل ہی اس جہاز کے تمام روسی سپاہی اپنی جان بچانے کے لیے پانی میں کود پڑے تھے اور اس کو تنہا چھوڑ دیا تھا لیکن ڈگڈیل نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر عثمانی بیڑہ کے ایک جہاز میں آگ لگا دی، یہ آگ فوراً ہی دوسرے جہازوں تک پھیل گئی اور چوں کہ بندرگاہ کے تنگ ہونے کی وجہ سے تمام جہاز پاس ہی پاس کھڑے ہوئے تھے، اس لیے پورا بیڑہ دیکھتے ہی دیکھتے جل کر برباد ہو گیا، صرف ایک جہاز باقی رہ گیا جسے روسیوں نے گرفتار کر لیا اور پھر شسمہ کے شہر، قلعہ اور توپ خانہ پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد الفنسٹن نے چاہا کہ روسی بیڑہ کے ساتھ فوراً دردانیال کو روانہ ہو جائے اور بحر مارمورا میں داخل ہو کر قسطنطنیہ پر گولہ باری شروع کر دے لیکن اورلوف نے اس تجویز پر عمل کرنے میں پس و پیش اور تاخیر کی، ترکوں نے اس کی اطلاع پاتے ہی دردانیال کے دونوں ساحلوں پر دو دو توپ خانے آمنے سامنے نصب کر دیے اور اس مورچہ بندی کے بعد روسی جہازوں کے لیے دردانیال میں داخل ہونا ناممکن ہو گیا۔

حسن کی حیرت انگیز کامیابی ادھر سے مایوس ہو کر اورلوف روسی بیڑہ کے ساتھ جزیرہ لمنوس پہنچا اور وہاں اپنی فوجیں اتار کر جزیرہ کے خاص قلعہ کا محاصرہ کر لیا، دو ماہ کے محاصرہ کے بعد قلعہ کے ترکی دستہ نے بعض شرائط پر ہتھیار ڈال دینا منظور کیا لیکن اسی درمیان میں حسن الجزائری نے باب عالی سے اس بات کی اجازت حاصل کر لی کہ قسطنطنیہ کے چار ہزار اوباشوں کی ایک فوج مرتب کر کے لمنوس کو روسی پنجہ سے چھڑا لینے کی کوشش کرے، جب اس سے کہا گیا کہ ایسی فوج سے یہ مہم سر نہ ہو سکے گی تو اس نے جواب دیا کہ اگر حسب منشا کام نہ ہوا تو بھی اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ دارالسلطنت کے بدمعاشوں میں چار ہزار کی کمی ہو جائے گی، چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۷۷۰ء کو علی الصباح اس عجیب و غریب فوج کے ساتھ لمنوس کے مشرقی

ساحل پر اتر کر اس نے محاصرہ کرنے والوں پر اچانک حملہ کر دیا، روسیوں کا اکثر حصہ قتل ہو گیا، بقیہ اپنی جان لے کر بھاگا اور جہازوں پر سوار ہو کر فوراً روانہ ہو گیا، اس مہم کی حیرت انگیز کامیابی کے بعد سلطان نے حسن کو عثمانی بحریہ کا قپودان پاشا مقرر کیا، حسن نے ایک تازہ بیڑا مرتب کر کے چند ہی روز کے بعد بندر موندریسو (Mondreso) کے قریب روسی بیڑہ کو پھر شکست دی، اورلوف کو مجبوراً اپنے جہاز لے کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔

علی بیگ کی بغاوت

اس وقت مصر اور شام میں بغاوت برپا تھی، اورلوف نے باغی مملوکوں کے سردار علی بیگ کی مدد کے لیے چار ہزار روسی فوجی سپاہی شام میں اتارے، عکہ کے عامل شیخ طاہر نے بھی علی بیگ کا ساتھ دیا، چنانچہ شیخ طاہر اور روسی فوج کی مدد سے اس نے غزہ، بیت المقدس، یافا اور دمشق وغیرہ شام کے متعدد بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا، وہ چاہتا تھا کہ اس کے بعد اناطولیہ پر حملہ آور ہو لیکن مصر کے ایک مملوک امیر ابوذہب نے جو علی بیگ کا عزیز تھا، خود اس کے خلاف بغاوت کر دی جس کے مقابلہ کے لیے علی بیگ کو مصر واپس جانا پڑا، علی بیگ کو شکست ہوئی اور وہ مع اپنے چار سو روسی مددگاروں کے ساتھ مارا گیا، ابوذہب نے علی بیگ اور روسی امراء کے سر کاٹ کر قسطنطنیہ بھیج دیے۔

ترکوں کی مسلسل شکست

اس درمیان میں دریائے ڈینوب کے ساحلی علاقوں میں روس سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور عثمانی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں، ۱۷۷۰ء میں روسی سپہ سالار روماتزوف نے تمام مولڈیویا کو تاراج کر ڈالا، صدر اعظم خلیل پاشا تیس ہزار عثمانی سپاہ اور تاتاریوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مقابلہ کے لیے آگے بڑھا، کرتال کے مقام پر دونوں فوجیں مقابل ہوئیں، میدان روسیوں کے ہاتھ رہا اور ترک اپنی توپیں اور بہت کچھ سامان چھوڑ کر منتشر ہو گئے، ۱۷۷۰ء کے آخر تک دریائے ڈینوب کے شمال میں عثمانی قلعے تھے، سب پر روس کا قبضہ ہو گیا، صدر اعظم کی فوج میں صرف دو ہزار سپاہی باقی رہ گئے، آئندہ سال (۱۷۷۱ء) عثمانی اقتدار کے لیے اور زیادہ برباد کن ثابت

ہوا۔ شہزادہ ڈول گوروکی (Dolgoruki) اسّی ہزار روسی اور ساٹھ ہزار تاتاری سپاہ کے ساتھ، جو کیتھرائن کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، کریمیا پر حملہ آور ہوا۔ سلیم گرائی خان کریمیا نے شروع میں تو مقابلہ کیا لیکن جلد ہمت ہار گیا اور ملک کو روسیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر قسطنطنیہ روانہ ہو گیا۔ اس کے یوں بھاگ کھڑے ہونے سے تاتاریوں کی ہمت چھوٹ گئی اور بہتوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر اناطولیہ میں پناہ لی، جو باقی رہ گئے، انہوں نے روسی فاتحوں سے صلح کر لینی چاہی، ڈول گورکی نے نہایت ہوشیاری سے کام لیا اور وعدہ کیا کہ زارینہ کی زیر سیادت اہل کریمیا کی آزادی برقرار رکھی جائے گی اور کریمیا کے شاہی خاندان کا ایک رکن وہاں کا فرماں روا مقرر کر دیا جائے گا، اس وعدہ کی بنا پر تاتاریوں نے زارینہ کی وفاداری کا حلف لیا اور اپنے اڑتالیس نمائندوں کو سلیم گرائی کے دو لڑکوں کے ساتھ کیتھرائن کے دربار میں سینٹ پیٹرس برگ روانہ کیا، اس کے بعد کافہ، کرش اور ینی قلعہ کے قلعوں نے اپنے دروازے روسیوں کے لیے کھول دیے، کریمیا میں جو ترکی دستہ متعین تھا، اس نے روسی فوج کا مقابلہ کیا لیکن اس کی تعداد غنیم کے مقابلہ میں اس قدر کم تھی کہ مقاومت بے سود ثابت ہوئی اور شکست کے بعد ترکی سرعسکر گرفتار ہو کر سینٹ پیٹرس برگ بھیج دیا گیا، سارے کریمیا پر روس کا تسلط قائم ہو گیا، اسی سال روسی فوجوں نے یکے بعد دیگرے ولاچیا اور مولڈیویا پر بھی قبضہ کر لیا اور خوزیم اور یاسی کے اہم قلعے بھی فتح کر لیے، البتہ اوزاکوف اور کلبرن کی مدافعت میں عثمانی فوجیں کامیاب رہیں اور محسن زادہ پاشا نے روسیوں کو شکست دے کر گرگیو (Giurgevo) کے قلعہ پر جو دریائے ڈینوب کے ساحل پر واقع تھا، دوبارہ قبضہ کر لیا مگر جارجیا اور منگریلیا سے ترکوں کو پسپا ہونا پڑا۔

یورپ کی خدائی روسی فوجوں کی ان فتوحات سے اب آسٹریا اور پرشا کی حکومتیں متردد نظر آنے لگیں، کیوں کہ روس کی بڑھتی ہوئی طاقت خود ان کے لیے خطرناک ہو رہی تھی، چنانچہ دونوں نے کوشش شروع کی کہ کسی طرح دولت عثمانیہ اور روس میں صلح ہو جائے، اس

جنگ میں یورپین حکومتوں کی سیاست مکر و فریب کا ایسا نمونہ تھی، جس کی مثال صرف یورپ ہی کی تاریخ میں مل سکتی ہے، اس اجمال کی تفصیل کے لیے سطور ذیل ملاحظہ ہوں۔

فرانس | حکومت فرانس دولت عثمانیہ کی دوست اور روس کی دشمن تھی، اس کی خارجی سیاست کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ دولت علیہ سے مل کر روس کے دائرہ اقتدار کو بڑھنے سے روکے، خصوصاً پولینڈ کو اس کی زد سے محفوظ رکھے لیکن اس کے باوجود وہ روس سے ترکوں کی حمایت میں جنگ کرنے کے لیے تیار نہ تھا، برخلاف اس کے اس کی پالیسی یہ تھی کہ جنگ سے علاحدہ رہ کر سلطنت عثمانیہ اور روس کو باہم لڑا دے، تا کہ دونوں ایک ہی وقت میں کمزور ہو جائیں، فرانس کے وزیر اعظم شوازیل (Choiseul) نے دسمبر ۱۷۶۹ء میں ایک خط پرنس کونتز (Kunitz) وزیر اعظم آسٹریا کو اس مضمون کا لکھا کہ ترکی اور روس کی جنگ جتنے ہی زیادہ عرصہ تک قائم رہے، فرانس اور آسٹریا کے اتحاد کے لیے مفید ہے، کیوں کہ اس صورت میں دونوں حریف یکساں طور پر کمزور ہو جائیں گے اور اگر زمانہ نے مساعدت کی تو اس سے ہمیں بے شمار فوائد حاصل ہوں گے[1]، نہ صرف یہ کہ اس جنگ کے جاری رکھنے میں حکومت فرانس اپنا فائدہ دیکھ رہی تھی بلکہ روس کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لیے باب عالی کو اپنی ترغیبوں سے مجبور بھی اسی نے کیا، چنانچہ جب کیتھرائن کے ایجنٹ یونان، کریٹ، بوسنیا اور مونٹی نیگرو میں پہنچ کر عیسائی رعایا کو دولت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے لگے تو فرانس کے سفیر ورجینز (Vergernes) نے اس بات پر زور دیا کہ روس کی ان کارروائیوں کا جواب دیا جائے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد جب اہل پولینڈ کی ایک جماعت روس کے مظالم سے تنگ آ کر سلطنت عثمانیہ کی سرحد میں پناہ گزیں ہوئی اور روسی دستوں نے وہاں اس کا تعاقب کیا تو باب عالی کو اعلان جنگ پر آمادہ کرنے میں زیادہ دخل سفیر فرانس ہی کے مشورہ کو تھا، حکومت فرانس کے نزدیک یہ جنگ اتنی اہم اور ضروری تھی کہ اس نے اپنے سفیر کو اس عظیم الشان خدمت کے

---

[1] المسئلۃ الشرقیہ از مصطفیٰ کامل پاشا مطبوعہ مصر حصہ اول، صفحہ ۳۹-۴۰۔

صلہ میں تین ملین کی گراں قدر رقم پیش کی تھی، مگر ویجیز نے اس رقم کو واپس کر دیا اور لکھا کہ اعلان جنگ ہو گیا ہے، میں نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی، تین ملین کی رقم جو میرے کام کے لیے بھیجی گئی ہے واپس کرتا ہوں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے[1]۔

انگلستان فرانس کی دشمنی تو چھپی ہوئی تھی لیکن انگلستان کا طرزِ عمل واضح طور پر مخالفانہ تھا، گو بظاہر وہ بھی اپنے کو دولت عثمانیہ کی حیثیت سے پیش کر رہا تھا، چنانچہ جیسا کہ مصطفیٰ کامل پاشا نے لکھا ہے، اٹھارہویں صدی میں انگلستان کی سیاست دولت عثمانیہ کی نسبت دو رخی تھی، ایک طرف تو وہ روسیوں کو جنگ میں پوری مدد دے رہا تھا اور دوسری طرف دولت عثمانیہ کی دوستی کا دم بھر رہا تھا، تاکہ اس کے رازوں سے واقف ہو کر حکومت روس کو باخبر کرتا رہے، انگلستان کی اس پالیسی کے مختلف اسباب تھے، چند ہی سال قبل انگلستان نے فرانس کو شکست دے کر ہندوستان پر قبضہ کیا تھا، جس کی وجہ سے فرانس اس کا سب سے بڑا دشمن تھا اور چوں کہ فرانس دولت عثمانیہ کا حلیف تھا، اس لیے قدرتاً انگلستان روس کی جانب مائل ہوا، روس اور انگلستان کے اتحاد میں اس وجہ سے بھی سہولت ہوئی کہ ابھی تک روس کی توجہ ہندوستان کی جانب مبذول نہیں ہوئی تھی اور انگلستان کو روس کی طرف سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا تھا، علاوہ بریں ان دونوں سلطنتوں میں تجارتی تعلقات بھی تھے، روس کی درآمد تمام تر انگلستان سے ہوتی تھی، اگر انگلستان روس کا ساتھ نہ دیتا تو ان تجارتی تعلقات کا منقطع ہو جانا یقینی تھا لیکن چوں کہ اسی زمانہ میں انگلستان اپنی سلطنت کے اندرونی خلفشار میں مبتلا تھا، یعنی ایک طرف امریکہ کے نوآبادکار آزادی اور خودمختار حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم کرنے کی جدوجہد جاری تھی، اس لیے روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ میں وہ کوئی نمایاں حصہ نہ لے سکا، تاہم اس کے متعدد جنگی جہاز روسی بیڑہ میں شامل تھے اور بہت سے انگریز افسر روسی جہازوں اور فوجوں میں کام

---

[1] میریٹ، ص ۱۴۷۔

کر رہے تھے، پھر بھی جیسا کہ اوپر بیان ہوا وہ دولت علیہ کی دوستی کے پردہ میں روس کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا اور اعلانیہ دشمنی کو اپنے مقصد کے خلاف سمجھتا تھا، اس لیے اس نے ۱۷۷۰ء میں باب عالی کے سامنے اپنی خدمات روس سے صلح کرانے کے لیے پیش کیں، اس کے جواب میں باب عالی نے سفیر برطانیہ کو یہ لکھا کہ ”یہ کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ انگلستان اپنی وساطت سے صلح کرانے کی تجویز پیش کر رہا ہے، حالاں کہ اس کے جہاز روسی بیڑہ میں شامل ہو کر ہم سے جنگ کر رہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ اس کی یہ تجویز صرف روس کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے ہے، پس انگلستان کو چاہیے کہ اپنی پالیسی صاف طور پر ظاہر کر دے تاکہ باب عالی کو معلوم ہو جائے کہ وہ کس کے ساتھ ہے۔“[1] اس جواب کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کو معلوم ہو گیا کہ باب عالی اس کی دورخی پالیسی سے واقف ہے، چنانچہ اس نے شرمندہ ہو کر اپنے جہاز اور افسر روس سے واپس بلا لیے لیکن یہ اس وقت ہوا جب لڑائی قریب ختم کے تھی، پھر بھی انگلستان روس کے ساتھ حق دوستی کچھ نہ کچھ ادا کرتا رہا، چنانچہ جب باب عالی نے پرشا اور آسٹریا سے یہ خواہش کی کہ وہ درمیان میں پڑ کر صلح کرا دیں تو برطانوی سفیر نے ایک جاسوس کی طرح اس کی اطلاع حکومت روس کو دے دی تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں، کیتھرائن کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے جنرل رومانزوف کو ہدایت کی کہ وہ صدر اعظم کو لکھے کہ روس باب عالی کے ساتھ صلح کی گفتگو کرنے کے لیے تیار ہے، بشرطیکہ سفیر روس اوبرسکوف جو اعلان جنگ کے وقت قسطنطنیہ میں قید کر لیا گیا تھا، آزاد کر دیا جائے اور پرشا اور آسٹریا کو صلح کے مقابلہ میں نہ پڑنے دیا جائے کیوں کہ ایسی صورت میں فرانس بھی دخل دے گا اور اس کی مداخلت زارینہ کو قطعاً منظور نہیں ہے، روس کے ساتھ انگلستان کی شرکت کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ دوران جنگ میں جب فرانسیسی وزیر اعظم شوازیل نے اپنی مجلس میں یہ تجویز پیش کی کہ روسی بیڑوں پر ضرب لگائی جائے تو قبل اس

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا ص ۸۸۔

کے کہ خود فرانس کی مجلس میں یہ تجویز منظور کر دی جائے، برطانوی وزارت نے یہ اعلان کیا کہ روس کے خلاف ہر کارروائی انگلستان کی اہانت اور دشمنی تصور کی جائے گی[1]، اسی کے ساتھ حکومت فرانس کا بھی اس تجویز کو نامنظور کر دینا یہ واضح کر دیتا ہے کہ دولت عثمانیہ کے ساتھ اس کی دوستی کی حقیقت کیا تھی۔

پرشا

فریڈرک اعظم بھی روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، مگر اس طرح کہ دولت عثمانیہ کو نقصان نہ پہنچنے پائے اور وہ روس سے جنگ کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا بلکہ اس کا حلیف ہونے میں اپنا فائدہ دیکھ رہا تھا، اس کی خارجی سیاست کے دو اہم جزو تھے، پولینڈ کی تقسیم اور سلطنت عثمانیہ کی بقاء، پولینڈ کی سرحد مملکت پرشا سے ملی ہوئی تھی، اور پرشا کو اپنے حدود کی توسیع کا موقع صرف پولینڈ ہی میں حاصل تھا جس پر روس کے فریب واستبداد کا تسلط قائم تھا، گو حکومت بظاہر حکومت پولینڈ کے ہاتھ میں تھی، فرانس پولینڈ کی تقسیم کا سخت مخالف تھا اور چوں کہ آسٹریا فرانس کا حلیف تھا، اس لیے فریڈرک کے لیے ضروری تھا کہ تقسیم پولینڈ کا لالچ دے کر آسٹریا کو فرانس کی دوستی سے علاحدہ کرے، آسٹریا اور روس کی شرکت کے بغیر فریڈرک کے لیے اپنا مقصد حاصل کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ جب روس اور دولت عثمانیہ کی جنگ شروع ہوئی تو فریڈرک نے اس بات کی کوشش کی کہ آسٹریا کو فرانس کے اتحاد سے علاحدہ کر کے پرشا، روس اور آسٹریا کا ایک اتحاد ثلاثہ پولینڈ کی تقسیم کے لیے قائم کرے لیکن جب فریڈرک کے سفیر نے روسی وزیر اعظم سے اس مسئلہ میں گفتگو کی تو موخر الذکر نے یہ جواب دیا کہ اتحاد ثلاثہ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کی تقسیم بھی ہونا چاہیے، فریڈرک اس کے لیے راضی نہ تھا، بظاہر تو اس میں پرشا کا فائدہ تھا لیکن جیسا کہ مصطفیٰ کامل پاشا فرماتے ہیں فریڈرک پرشا کا حقیقی فائدہ دولت عثمانیہ کی بقا اور استقلال میں دیکھتا تھا، وہ اپنی بصیرت سے یہ دیکھ رہا تھا کہ پرشا اور روس کی دوستی ایک روز ختم ہو جائے گی اور اس

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا ص ۴۷ و میریٹ ص ۱۳۹۔

وقت سلطنت عثمانیہ کا قیام بطور ایک قلعہ اور چٹان کے ہوگا، جو روس کو آگے بڑھنے سے روکے گی اور جس کی قوت پر پرشا اعتماد کرے گا۔ بہرحال حکومت روس کے اس جواب کے باوجود فریڈرک نے تقسیم پولینڈ کی تجویز ترک نہ کی، بلکہ اس مقصد کے لیے اس نے آسٹریا سے ایک مخفی اتحاد کرنا چاہا، اخفا کا اہتمام صرف اس غرض سے کیا گیا کہ حکومت روس کو تشویش پیدا ہو جائے اور وہ پرشا کے ساتھ اتحاد کرنے کی ضرورت محسوس کرے، چنانچہ شہر نیس میں فریڈرک نے میریا تھریسا اور اس کے لڑکے جوزف ثانی سے جو انتظام سلطنت میں اب اپنی ماں کا شریک تھا، ملاقات کی اور اگست ۱۷۶۹ء میں آسٹریا اور پرشا کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہو گیا، روس چوں کہ اس معاہدہ کے مضمون سے ناواقف تھا، اس لیے اس کو یہ خطرہ ہوا کہ اس معاہدہ میں مسئلہ شرقیہ کا فیصلہ اس کے مفاد کے خلاف کیا گیا ہے، چنانچہ جیسا کہ فریڈرک نے پیش بینی کی تھی، روس کو بھی پرشا کے ساتھ اتحاد کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور ۱۲ اکتوبر ۱۷۶۹ء کو اس نے ۱۷۶۴ء کے معاہدہ کی تجدید کر دی جس کی رو سے روس اور پرشا آٹھ سال کے لیے حلیف بن گئے تھے، فریڈرک کی خواہش پر اس تازہ معاہدہ کی مدت ۱۷۸۰ء تک بڑھا دی گئی۔

اس کے بعد فریڈرک نے یہ چاہا کہ روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان صلح کرا دے، باب عالی کی طرف سے بھی صلح کے لیے پرشا اور آسٹریا کی وساطت کی خواہش کی گئی لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا سفیر انگلستان نے باب عالی کی اس خواہش کی اطلاع حکومت روس کو کر دی اور کیتھرائن نے پرشا اور آسٹریا کی وساطت قبول کرنے سے انکار کر دیا، اسی اثنا میں روسی فوجیں بندر اور کرمان وغیرہ پر قابض ہو گئیں اور ان فتوحات سے روس کے حوصلے بہت بڑھ گئے، چنانچہ جب فریڈرک نے دولت عثمانیہ اور روس میں صلح کرانے کے لیے کیتھرائن سے اصرار شروع کیا تو اس نے ۲۰ ستمبر ۱۷۷۰ء کو فریڈرک کو ایک خط لکھا جس میں صلح کے شرائط حسب ذیل قرار دیے۔

ازف اور کابارڈا پر روس کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے اور ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتیں دولت عثمانیہ کی فرماں روائی سے آزاد کر دی جائیں یا یہ دونوں صوبے تاوان جنگ کے طور پر چوتھائی صدی کے لیے روس کو دے دیے جائیں، بسرابیا اور کریمیا کے تاتاریوں کی خود مختاری تسلیم کر لی جائے۔ بحر اسود میں روسی جہازوں کو آزادی حاصل ہو، یونانی مجمع الجزائر میں سے ایک جزیرہ روس کو دے دیا جائے اور ان تمام یونانیوں کے لیے جنہوں نے دوران جنگ میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کی تھی، عام معافی کا اعلان کر دیا جائے[1]۔

مذکورہ بالا شرائط معلوم کرنے کے بعد فریڈرک نے اپنے بھائی پرنس ہنری کو جو سینٹ پیٹرس برگ میں مقیم تھا، ۳ر جنوری ۱۷۷۱ء کو یہ لکھا کہ "روس کے شرائط صلح نے مجھے حیرت زدہ کر دیا ہے اور میں انہیں ترکوں اور اہل آسٹریا کے سامنے پیش کرنے سے معذور ہوں، کیوں کہ وہ قطعاً ناقابل قبول ہیں۔" پھر ۵ر جنوری ۱۷۷۱ء کو اس نے خود کیتھرائن کو بھی ایک خط لکھا کہ اگر وہ آسٹریا کے ساتھ جنگ کرنے سے بچنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ ازف اور کاربارڈا کے لینے اور بحر اسود میں جہاز رانی کی آزادی حاصل کرنے پر قناعت کرے۔ فریڈرک خوب جانتا تھا کہ ولاچیا اور مولڈیویا پر روس کا قبضہ آسٹریا کو کسی طرح گوارا نہ ہوگا، کیوں کہ ان ہی صوبوں پر خود آسٹریا کی نظریں بھی لگی ہوئی تھیں۔

آسٹریا اس جنگ میں حکومت آسٹریا کی پالیسی سب سے زیادہ پر فریب تھی، وہ روس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہو کر دولت عثمانیہ سے اتحاد بھی کرنا چاہتی تھی اور اس اتحاد سے فائدہ اٹھا کر سلطنت عثمانیہ کے بعض علاقوں پر قبضہ بھی کر لینا چاہتی تھی، چنانچہ وہ کبھی دولت علیہ کی طرف مائل ہوتی اور کبھی روس کی طرف، علاوہ بریں وہ دولت علیہ کو فرانس کے اتحاد سے جو خود اس کا حلیف بھی تھا، علاحدہ کر دینا چاہتی تھی کیوں کہ اس اتحاد کی صورت میں وہ باب عالی کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ فرانس اس وقت مالی معاوضہ میں دولت عثمانیہ کی مدد دینے

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا، ص ۵۰-۴۹۔

جہازوں سے کرنے پر آمادہ تھا لیکن آسٹریا کے سفیر مقیم قسطنطنیہ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور عثمانی وزراء کو سمجھایا کہ خشکی کی لڑائی میں بحری بیڑے مفید نہ ہوں گے اور یہ کہ فرانس کا مقصد دراصل دولت علیہ کی مدد کرنا نہیں ہے بلکہ روس کی دشمنی میں وہ ایک طویل مدت تک جنگ کو جاری رکھنا چاہتا ہے، عثمانی وزراء نے اس رائے کی صحت کو تسلیم کر کے فرانس کی تجویز نامنظور کر دی، آسٹریا کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں روس کا تسلط کریمیا پر ہو گیا، جس کی وجہ سے باب عالی کو آسٹریا کے ساتھ اتحاد کرنا بہت غنیمت معلوم ہوا اور اس نے عجلت سے کام لیا، چنانچہ ۶/ جولائی ۱۷۷۱ء کو دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا، جس کے شرائط حسب ذیل تھے:

۱- روس کے مقابلہ میں آسٹریا دولت عثمانیہ کی مدد کرے گا۔

۲- سلطنت عثمانیہ کا کوئی حصہ آسٹریا علاحدہ نہ ہونے دے گا۔

۳- دولت عثمانیہ کی عزت کے خیال سے آسٹریا پولینڈ کے استقلال کی حفاظت کرے گا۔

۴- اس کے معاوضہ میں دولت عثمانیہ نے عہد کیا کہ وہ ایک کروڑ تیرہ لاکھ پچاس ہزار فلورن کی رقم آسٹریا کو ادا کرے گی۔

۵- نیز ولاچیا کوچک کا علاقہ آسٹریا کے حوالہ کر دے گی اور

۶- سلطنت عثمانیہ میں آسٹریا کی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے ہر طرح سے مدد کرے گی۔

اس معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ فریقین اسے مخفی رکھیں گے، خصوصاً فرانس سے جو اس وقت آسٹریا کا حلیف تھا۔

سفیر آسٹریا نے جب اس معاہدہ کی نقل اپنی حکومت کے پاس دستخط کے لیے بھیجا تو کونز دولت عثمانیہ کی طرف سے مطمئن ہو گیا اور اب اسے روس کو دھمکی دینے کا ایک اچھا

آلہ ہاتھ آ گیا، اس کا مقصد روس پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے علاقوں پر قبضہ کرنا آسٹریا کو شریک کیے بغیر آسان نہ ہوگا، کونتز اس میں کامیاب رہا، کیتھرائن نے اپنے ایک خاص سفیر کو سلطنت عثمانیہ کی تقسیم سے متعلق مندرجہ ذیل تین تجویزیں لے کر حکومت آسٹریا کے پاس بھیجا۔

۱- سرویا، بوسنیا، ہرزیگووینا، البانیا اور مقدونیا پر آسٹریا قبضہ کر لے اور سلطنت عثمانیہ کے بقیہ حصے مع قسطنطنیہ کے روس کے لیے چھوڑ دے۔

۲- ولاچیا، سرویا، بلغاریا اور ہرزیگووینا کو آسٹریا لے لے اور مقدونیا، البانیا، رومانیا، اکثر جزائر یونان، ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ روس کو دے دے، کریمیا اور موریا خودمختار حکومتیں کر دی جائیں۔

۳- ترکوں کو دریائے ڈینوب کے شمالی علاقوں پر باقی رکھا جائے، سرویا، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے آسٹریا کو دے دیے جائیں، بحر اسود کے ساحلی علاقوں پر روس کا قبضہ ہو جائے اور تاتاری صوبے آزاد رہیں[1]۔

روسی سفیر نے تقسیم پولینڈ سے متعلق بھی بعض تجویزیں پیش کیں، حکومت آسٹریا نے باوجود اس معاہدہ کے جو اس نے ابھی حال میں باب عالی سے کیا تھا اور جس نے سلطنت عثمانیہ کے تحفظ و استقلال کا ذمہ لیا تھا، نیز پولینڈ کی تقسیم کے روکنے کا عہد کیا تھا، روس کے پیش کردہ شرائط پر گفتگو شروع کر دی، برخلاف اس کے باب عالی نے جو معاہدہ آسٹریا سے کیا تھا، اس پر وہ دیانت داری کے ساتھ قائم رہا اور ۲۵ جولائی ۱۷۷۱ء کو اس رقم کی ایک قسط جس کی ادائگی معاہدہ مذکور میں اس نے اپنے ذمہ لی تھی، حکومت آسٹریہ کے پاس روانہ کر دی، حکومت آسٹریا نے اس رقم کو تو لے لیا مگر باب عالی کے تقاضوں کے باوجود معاہدہ پر دستخط کرنے سے گریز کرتی رہی، کونتز چاہتا تھا کہ روس کے ساتھ ایک نیا

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا ص ۵۶-۵۵۔

معاہدہ ہو جائے جس سے آسٹریا کو اس سے زیادہ فائدہ پہنچے، جتنا دولت عثمانیہ سے اتحاد کرنے میں پہنچتا تھا، اس کو یہ بھی خوف تھا کہ اگر وہ ترکوں کے ساتھ اتحاد کرے گا تو روس اور پرشا پولینڈ کو باہم تقسیم کر لیں گے اور اسے کچھ نہ دیں گے، بہر حال جب باب عالی کی طرف سے اس معاہدہ پر دستخط کرنے کا اصرار ہوا تو کونٹز نے ۳ اکتوبر ۱۷۷۱ء کو ایک خلعنامہ تحریر باب عالی میں بھیجی اور اسے اطمینان دلایا کہ حکومت آسٹریا اپنے معاہدہ پر وفاداری کے ساتھ قائم ہے لیکن معاہدہ پر دستخط کرنا اب بھی ٹال گیا۔

اسی اثنا میں برطانوی سفیر مقیم قسطنطنیہ کو اس خفیہ معاہدہ کی نقل ہاتھ آگئی، اس نے اس کی ایک نقل فریڈرک اعظم اور کیتھرائن کے پاس بھیج دی، فریڈرک نے اپنے سفیر کو ہدایت کی کہ باب عالی کو حکومت آسٹریا کی خود غرضیوں سے متنبہ کر دے اور یہ ظاہر کر دے کہ وہ دولت عثمانیہ کو کس قدر نقصان پہنچانا چاہتی ہے، اس نے اپنے سفیر مقیم پیرس کو بھی لکھا کہ وزارت فرانس کے سامنے یہ تجویز پیش کرے کہ روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان صلح کرانے کے لیے ایک کانفرنس قسطنطنیہ میں منعقد کی جائے، فریڈرک کا مقصد یہ تھا کہ آسٹریا نے دولت علیہ اور فرانس کے ساتھ جو غداری کی ہے، وہ یورپین سلطنتوں کے سامنے کھل جائے مگر وزارت فرانس اس کانفرنس کی تحریک کرنے کے لیے آمادہ ہوئی۔

اس درمیان میں جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور روسی فوجوں میں فتوحات کے باوجود کمزوری کے آثار ظاہر ہو رہے تھے خصوصاً پولینڈ میں یہ آثار زیادہ نمایاں تھے، روس کی مالی حالت بھی روز بروز زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی، ان حالات کو دیکھتے ہوئے کیتھرائن اب جنگ کو ختم کرنے پر مائل ہوئی، چنانچہ اس نے ۲ دسمبر ۱۷۷۱ء کو فریڈرک کے پاس ایک خط بھیجا جس میں یہ لکھا کہ حکومت روس مولڈیویا اور ولاچیا کے مطالبے سے دست بردار ہوتی ہے لیکن اس کے معاوضہ میں یہ چاہتی ہے کہ دولت عثمانیہ بندر اور اوکزاکوف کے شہر اس کے حوالے کر دے، اسی خط میں کیتھرائن نے تقسیم پولینڈ سے متعلق فریڈرک کی تجویز

بھی منظور کر لی، اس شرط کے ساتھ کہ اگر آسٹریا روس سے جنگ کرے تو فریڈرک روس کی مدد کے لیے بیس ہزار فوج ولاچیا اور مولڈیویا کے صوبوں میں روانہ کرے۔

تقسیم پولینڈ اس مسئلہ میں فریڈرک اور کیتھرائن کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی، اس کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ پرشا اور روس پولینڈ کی تقسیم پر متحد ہو گئے، اس اتحاد کی وجہ سے آسٹریا کے سامنے صرف دو صورتیں رہ گئیں، یا تو وہ ان معاہدوں کو پورا کرے جو اس نے فرانس اور دولت عثمانیہ کے ساتھ کیے تھے اور پولینڈ کو تقسیم نہ ہونے دے یا پھر روس اور پرشا سے مل کر خود بھی پولینڈ کی تقسیم میں شریک ہو جائے اور فرانس اور دولت علیہ کے معاہدوں کی پروا نہ کرے، کونتز نے یورپین حکومتوں کے اس اصول کی بنا پر کہ سیاست میں عہد و پیمان کوئی چیز نہیں، دوسری صورت اختیار کی، چنانچہ ۲۸ جنوری ۱۷۷۲ء کو اس نے حکومت روس کو لکھا کہ آسٹریا نے تقسیم پولینڈ کی تجویز نیز سلطنت عثمانیہ سے متعلق کیتھرائن کے مطالبات کو منظور کر لیا ہے اور یہ توقع ظاہر کی ہے کہ پولینڈ کی طرح سلطنت عثمانیہ کی تقسیم بھی عمل میں آئے گی اور آسٹریا کو بھی اس تقسیم میں حصہ ملے گا، اپنی حکومت کی اس غداری پر خود میریا تھریسیا نے بھی نفرین کرتے ہوئے اقرار کیا کہ ''آسٹریا نے جو سیاست اختیار کی وہ شرافت، سلطنت کی عزت، عہد و پیمان اور عقیدہ کے بالکل مخالف تھی[1]'' بہر حال کونتز کی اس پالیسی کی وجہ سے تقسیم پولینڈ کی تجویز پر روس، پرشا اور آسٹریا کا اتفاق ہو گیا اور اس بدقسمت ملک کی جو پہلے ہی سے روس کے فریب اور دراندازیوں کا شکار اور اس کے پیدا کیے ہوئے فتنوں کی وجہ سے جماعتوں کے باہمی نزاعات میں مبتلا تھا، پہلی تقسیم ۱۷۷۲ء میں ہو گئی، باب عالی نے جب یہ دیکھا کہ حکومت آسٹریا اس کے ساتھ فریب کر رہی ہے تو اس نے معہودہ رقم کی آئندہ قسط نہیں بھیجی، کونتز نے اس چیز کو دولت عثمانیہ اور آسٹریا کے اتحاد کی شکست کا سبب قرار دیا، حالاں کہ جس معاہدہ کی بنا پر یہ اتحاد قائم ہوا تھا، اس پر کونتز نے آخر وقت تک دستخط

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا، ص ۶۰۔

نہیں کیے تھے اور نہ حکومت آسٹریا کی طرف سے معاہدہ کی کوئی شرط پوری کی گئی تھی، برخلاف اس کے باب عالی کو جس نے دیانت داری کے ساتھ رقم مذکور کی ایک قسط آسٹریا کو ادا کردی تھی اور آسٹریا نے اسے بلا تامل قبول بھی کر لیا تھا، اسی معاہدہ کے فریب میں مبتلا رکھ کر کونتز نے نہ صرف پولینڈ بلکہ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے متعلق بھی کیتھرائن سے مراسلت شروع کردی تھی۔

صلح کانفرنسیں

جب دولت عثمانیہ کو یہ معلوم ہوا کہ روس ولاچیا اور مولڈیویا کے صوبوں سے دست بردار ہو کر صلح کے لیے آمادہ ہے تو وہ بھی راضی ہو گئی اور دونوں حکومتوں کے نمائندے شرائط صلح طے کرنے کے لیے ۱۰؍جون ۱۷۷۲ء کو شہر توکشانی میں جمع ہوئے، بیس روز کی گفت وشنید کے بعد تاتاریوں کی آزادی کے مسئلہ کے علاوہ اور تمام شرائط پورے ہوگئے، ترک نمائندے اس بات پر زور دے رہے تھے کہ تاتاریوں کا دولت عثمانیہ کے زیر اقتدار رہنا ضروری ہے، کیوں کہ سلطان کو بہ حیثیت خلیفۃ المسلمین کے ان پر فرماں روائی کا حق حاصل ہے، حکومت روس نے اس مطالبہ کو منظور نہ کیا، چنانچہ اسی بات پر کانفرنس شکست ہوگئی، چند مہینوں کے بعد روس نے ایک دوسری کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی اور دولت علیہ نے اسے منظور کر لیا، چنانچہ یہ کانفرنس بخارسٹ میں منعقد ہوئی اور شرائط صلح پر مہینوں بحث ومباحثہ ہوتا رہا، اس کانفرنس میں روس اس بات پر راضی تھا کہ تاتاری کو دولت عثمانیہ کے زیر سیادت رہنے دیا جائے لیکن وہ کرش اور اینی قلعہ کو چھوڑنے پر کسی طرح تیار نہ ہوا اور دولت علیہ ان دونوں قلعوں سے دست بردار ہونے پر راضی نہ ہوئی، بالآخر ۱۵؍فروری ۱۷۷۳ء کو روسی سفیر اوبریسکوف نے کیتھرائن کی طرف سے مندرجہ ذیل شرائط صلح باب عالی میں پیش کرکے الٹی میٹم دیا کہ اگر یہ شرائط قبول نہ کیے گئے تو جنگ ازسرنو شروع کردی جائے گی۔

۱- روس تاتاریوں کی آزادی کا محافظ قرار دیا جائے اور کرش اور ینی قلعہ کے

قلعوں پر روس کا قبضہ قائم رکھا جائے۔

۲- بحرِ سود اور بحرِ الجین میں روس کے تجارتی اور جنگی جہازوں کو آمد ورفت کی پوری آزادی حاصل ہو۔

۳- مذکورہ بالا قلعوں کے علاوہ کریمیا کے تمام دوسرے قلعے تاتاریوں کو واپس کر دیے جائیں۔

۴- مولڈیویا کا امیر گریگوری غیکا (Gregory Ghika) جو اس وقت روسیوں کے قبضہ میں تھا، پھر مولڈیویا کا موروثی فرماں روا مقرر کر دیا جائے اور وہ ہر تین سال میں ایک بار اپنی ریاست کی ایک سال کی آمدنی بطور خراج باب عالی کو پیش کرتا رہے۔

۵- روس کا ایک مستقل نمائندہ قسطنطنیہ میں مقیم رہے۔

۶- کلبرن پورے مالکانہ حقوق کے ساتھ روس کو دے دیا جائے اور اوکزاکوف کا قلعہ مسمار کر دیا جائے۔

۷- باب عالی روس کے فرماں رواؤں کے لیے ''پادشا'' کا لقب نیز سلطنت عثمانیہ کے ان عیسائی باشندوں کی حمایت کا حق تسلیم کرے جو کلیسائے یونان سے تعلق رکھتے ہوں۔[1]

بخارسٹ کانفرنس کی ناکامی سلطان اور وزراء سلطنت صلح کے خواہاں تھے اور مذکورہ بالا شرائط میں سے دفعہ اول کے علاوہ ہر دفعہ منظور کر لینے پر آمادہ تھے، دفعہ اول میں بھی روس بالآخر اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ تاتاریوں پر دولت علیہ کی سیادت قائم رکھی جائے، البتہ وہ کرش اور ینی قلعہ چھوڑنے کو تیار نہ ہوا اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا سبب بن گیا، باب عالی نے صورت حال سے مجبور ہو کر اور تمام شرائط منظور کر لیے مگر کرش اور ینی قلعہ سے دست بردار ہونا اسے کسی طرح منظور نہ تھا، جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مفتی اعظم اور سلطنت کے تمام علماء نے اس شرط کے قبول کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا، نیز دیوان

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۳۳۴۔

میں بھی اس کی مخالفت شدت سے کی گئی تھی، علماء کی مخالفت کے باوجود اس شرط کو قبول کر کے آزادی تسلیم کر لی جاتی تو اس سے قسطنطنیہ میں بغاوت برپا ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا، چنانچہ کرچ اور ینی قلعہ کے تنازعہ پر بخارسٹ کی صلح کانفرنس بھی شکست ہوئی اور جنگ از سر نو شروع کر دی گئی۔

محسن زادہ پاشا: فوکشانی اور بخارسٹ کی کانفرنسوں کے دوران قیام صلح کا جو وقفہ میسر آ گیا تھا، اس سے فائدہ اٹھا کر صدر اعظم محسن زادہ پاشا نے استحکام سلطنت کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، ۱۷۶۸ء میں جنگ شروع ہونے سے پیشتر بھی وہ صدر اعظم رہ چکا تھا لیکن چونکہ اس نے سلطان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا کہ پوری طرح تیار ہونے سے قبل جنگ شروع کر دینا دولت عثمانیہ کے لیے مضر ہو گا، اس لیے مصطفیٰ نے اسے صدارت کے عہدہ سے معزول کر دیا تھا، اس کے بعد وہ موریا کا سرعسکر مقرر ہوا اور وہاں اس نے روسیوں اور یونانیوں کو زبردست شکست دے کر موریا میں عثمانی تسلط کو از سر نو قائم کر دیا، اس شاندار کامیابی کے صلہ میں سلطان نے اسے صوبہ ودین کا سرعسکر مقرر کیا، جو شمال کا سرحدی صوبہ ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا، وہاں بھی محسن زادہ پاشا کی لیاقت خاص طور پر نمایاں رہی، دوران جنگ میں سلطان مصطفیٰ کو احساس ہوا کہ محسن زادہ پاشا کو صدارت کے عہدہ سے معزول کرنے میں اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی، چنانچہ ۱۷۷۱ء کے آخر میں اس نے دوبارہ اس کو صدر اعظم مقرر کیا، محسن زادہ پاشا نے فوکشانی اور بخارسٹ کی کانفرنسوں میں صلح کے لیے انتہائی کوشش کی تھی لیکن چند ماہ کی اس مختصر فرصت میں جب کہ شرائط صلح پر گفتگو اور مراسلت ہوتی رہی، اس نے عثمانی فوجوں کی تنظیم و استحکام میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ہر ممکن ذریعہ سے ان کے اندر دشمن کے مقابلہ کے لیے ایک تازہ جوش پیدا کرنے کی کوشش کی، پیہم شکستوں نے فوج کے اخلاق بھی خراب کر دیے تھے، سپاہیوں میں ایک طرف تو لوٹ مار کی عادت پیدا ہو گئی تھی اور دوسری طرف

وہ دشمن کی قوت سے مرعوب ہونے لگے تھے، محسن زادہ پاشا نے لوٹ مار کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں اور جن افسروں نے دشمن کے مقابلہ میں بزدلی دکھا کر اپنی فوج کے سامنے ایک بری مثال قائم کی تھی، انہیں قتل کرا دیا، اس نے شکست خوردہ دستوں کو از سرِ نو منظم کیا اور اہل بوسنیا اور سلطنت کے دوسرے جنگ جو قبائل سے تازہ فوجیں تیار کیں، اس نے دریائے ڈینوب کے ان قلعوں کو جو اس وقت تک ترکوں کے قبضہ میں رہ گئے تھے، خصوصاً سلسٹریا کو تازہ دستوں اور سامان رسد سے خوب مستحکم کر لیا اور شوملہ کو اپنا فوجی مستقر بنایا۔

معرکہ سلسٹریا ۱۷۷۳ء کے موسم بہار میں جنگ پھر چھڑ گئی، روسی اور عثمانی فوجوں کے درمیان متعدد معرکے ہوئے جن میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے فریق کو فتح ہوئی لیکن ان فتوحات سے روس کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، کیوں کہ سلسٹریا، وارنا اور شوملہ کے مضبوط اور اہم قلعوں پر ترک ابھی تک بدستور قابض تھے، آخر کار جنرل روما نزوف نے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے سلسٹریا کا محاصرہ کر لیا، سلسٹریا کے سرعسکر عثمان پاشا نے آگے بڑھ کر روما نزوف کو دریا عبور کرنے سے روکنے کی کوشش کی تھی، مگر جنرل وائیسمین کے حملہ نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا اور اس کی فوج بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتی ہوئی سلسٹریا میں واپس آ گئی، اس کے بعد روما نزوف نے شہر پر گولہ باری شروع کی، ستر توپیں پیہم گولے برسا رہی تھیں، یہاں تک کہ دیواروں میں کئی جگہ رخنے پیدا ہو گئے اور روسی فوجیں شہر کے اندر داخل ہونے کے لیے پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوئیں، چھ گھنٹہ تک نہایت سخت معرکہ رہا، ترک حیرت انگیز جاں بازی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن روما نزوف مسلسل تازہ دستے اپنی فوج کی مدد کے لیے بھیجتا جاتا تھا، آخر کار ترکوں کو پسپا ہونا پڑا اور روسی شہر کے اندر پہنچ گئے، مگر یہ کامیابی عارضی تھی، شہر کے اندر ترکوں نے عثمان پاشا کے زیر قیادت جس دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا اس نے روما نزوف کی آنکھیں کھل گئیں، آبادی کے تمام

مرد دشمن کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے ہر ہر قدم پر روسیوں کو آگے بڑھنے سے روکا اور ایسی شدت سے لڑے کہ روسی بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہوئے، ان کے آٹھ ہزار سپاہی مارے گئے اور ایک ہزار زخمی ہوئے، عثمان پاشا کے اس کارنامہ کے صلہ میں سلطان نے اسے "غازی" کا لقب عطا کیا۔

روسی مظالم | اس کے بعد روسیوں نے قرہ سو کے مقام پر عثمانی لشکر پر حملہ کیا اور اسے شکست دی، اس کامیابی سے ان کے حوصلے بڑھ گئے اور رومانزوف نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ وارنہ کی طرف روانہ کیا اور دوسرا شوملہ کی طرف، شوملہ کے راستہ میں بازارجیک کا غیر محفوظ شہر پڑتا تھا، جس کا تقریباً پورا فوجی دستہ اور اکثر باشندے شہر خالی کر کے چلے گئے تھے، روسیوں نے اسے نہایت آسانی سے فتح کر لیا لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے "فتح کی سہولت نے ان کو شہر کی باقی ماندہ آبادی کے ساتھ جو تقریباً تمام تر کمزور اور بوڑھے مردوں، بے کس عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھی، انتہائی وحشیانہ سلوک کرنے سے باز نہیں رکھا" عورتیں، بوڑھے اور بچے سب کے سب دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کے مار ڈالے گئے۔

روس کی شکست | لیکن روسیوں کو ان مظالم کی سزا بہت جلد مل گئی، جب شوملہ میں قرہ سو کی شکست اور بازارجیک کی تباہی کی اطلاع پہنچی تو صدر اعظم نے فوجی افسروں کی ایک مجلس منعقد کر کے مشورہ کیا، رئیس آفندی (وزیر خارجہ) عبدالرزاق نے اپنی خدمات پیش کیں، چنانچہ وہ واصف آفندی (ترک مورخ) مفتی فلپوپلیس اور صرف چار سو آدمیوں کے دستے کے ساتھ جو تقریباً تمام تر اسی کے ملازم تھے، روسیوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو گیا، راستہ میں اس نے عثمانی فوج کے منتشر دستوں کو جو شکست کے بعد گرد و نواح کے علاقوں میں پھیل گئے تھے، از سر نو جمع کیا اور انہیں لے کر رجیہ کے مقام پر روسی فوج کے مقدمۃ الجیش کو شکست دی، اس کے بعد وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا دفعۃً بازارجیک کے روسی دستوں پر ٹوٹ پڑا، روسی اس اچانک حملہ سے ایسا بدحواس ہوئے کہ اپنا تمام سامان

چھوڑ کر بھاگے، یہاں تک کہ ترکوں نے علاوہ اسلحہ اور گولہ بارود کے ذخیرہ کے بقول فان ہیمر چولہے پر چڑھی ہوئی گوشت کی دیگچیوں پر بھی قبضہ کرلیا[1]، اسی درمیان میں روسیوں کو وارنہ میں بھی سخت شکست ہوئی، ان کے دو ہزار آدمی مارے گئے اور مال غنیمت میں دس توپیں اور سامان کی سو گاڑیاں ترکوں کے ہاتھ آئیں، وارنا کی جنگ اور بازارجیک پر دوبارہ قبضہ ۱۷۷۳ء کی مہم کے آخری معرکے تھے، اس مہم میں ترکوں کی کامیابی کا پلہ بہ نسبت روسیوں کے بہت بھاری تھا۔

وفات | ۲۵ / دسمبر ۱۷۷۳ء کو سلطان مصطفیٰ ثالث کا انتقال ہوگیا۔

مصطفیٰ اپنے اکثر پیش روؤں کی طرح ایک بلند علمی ذوق رکھتا تھا، اس نے بہت سے مدارس اور خانقاہیں قائم کیں اور تعلیم کو ترقی دی، ملکی اصلاحات کی ضرورت وہ شدت سے محسوس کرتا تھا اور اس سلسلہ میں اس نے بعض اہم اصلاحات جاری کیں، مثلاً حرم کے اخراجات میں بہت کچھ تخفیف کردی، صیغہ اوقاف کا کام قزلر اغاسی کے ہاتھ سے نکال کر صدراعظم کے سپرد کردیا اور مالیات کی درستی کی کوشش کی لیکن جب سے روس کی جنگ کا سلسلہ شروع ہوا، مصطفیٰ کی ساری توجہ سلطنت کے تحفظ کی جانب مبذول رہی اور اندرونی اصلاحات کا کام ملتوی ہوگیا، پھر بھی اس کا یہ کارنامہ کم قابل قدر نہیں کہ اس نے بعض اصلاحات کو عمل میں لا کر سلیم ثالث اور محمود ثانی کے لیے ایک عمدہ مثال قائم کردی۔

---

[1] فریڈ ص ۱۵۹۔

عبدالحمید اوّل

۱۱۸۷ھ تا ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۷۴ء تا ۱۷۸۹ء

مصطفیٰ ثالث کے بعد اس کا بھائی عبدالحمید تخت پر آیا، روس سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا، کیتھرائن نے سابق ہزیمتوں کی تلافی کے لیے کافی تیاریاں کر لی تھیں، برخلاف اس کے ترک اب جنگ کو ختم کر دینا چاہتے تھے، عام باشندوں کے علاوہ فوج کے افسر، وزراء اور خود سلطان بھی صلح کے خواہاں تھے، صرف علماء کی جماعت یہ عذر پیش کر رہی تھی کہ سلطان کے لیے بہ حیثیت خلیفۃ المسلمین کے تاتاریوں کو اپنی سیادت سے محروم کر دینا اور کرش اور ینی کے قلعوں کو جو کریمیا کے اہم ترین قلعے تھے، روسیوں کے حوالے کر دینا کسی طرح مناسب نہیں لیکن ۱۷۷۴ء کی مہم کا آغاز ہی ترکوں کے لیے اس قدر خلاف توقع ہوا کہ علماء کے ان دلائل کے باوجود باب عالی کو صلح کا فیصلہ کر لینا پڑا۔

ترکوں کی شکست ۱۴ / اپریل ۱۷۷۴ء کو صدر اعظم محسن زادہ پاشا اپنے مستقر شوملہ سے نکل کر ہرسوا کی طرف بڑھا جہاں روسی فوجیں ایک نئے جنرل سوارو (Suwarrow) کی سرکردگی میں لڑائی کے لیے تیار کھڑی تھیں، سوارو نے ترکوں کے حملہ کا انتظار نہیں کیا، بلکہ خود پیش قدمی کر کے کوزلیجہ کے مقام پر صدر اعظم کی فوج پر حملہ آور ہوا اور اسے شکست دی، ترکی لشکر کا تمام سامان مع انتیس توپوں کے روسیوں کے ہاتھ آیا، محسن زادہ پاشا نے شوملہ واپس آ کر دیکھا کہ اس کے پچیس ہزار سپاہیوں میں سے صرف آٹھ ہزار باقی رہ گئے ہیں،

کچھ تو میدان جنگ میں کام آئے لیکن زیادہ تر ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے، اپنی قلیل جمعیت کے ساتھ روس کی فاتح فوج کا روکنا جو اب تیزی کے ساتھ شوملہ کی طرف بڑھتی آ رہی تھی محال تھا۔ بدقسمتی سے ینی چری نے عین اس نازک موقع پر بغاوت کر دی اور جب رئیس آفندی نے ان کو دشمن کے مقابلہ کے لیے مجتمع کرنے کی کوشش کی تو اس کا سر اڑا دیا، اس حالت میں صدر اعظم نے اپنے ایک افسر کو روسی سپہ سالار رومانزوف کے پاس بھیجا اور التوائے جنگ کی خواہش کی، رومانزوف نے اس سے انکار کر دیا لیکن شرائط صلح پر گفتگو کرنے کے لیے صدر اعظم کو دعوت دی، چنانچہ محسن زادہ پاشا نے سلطان کی اجازت حاصل کرنے کے بعد دولت عثمانیہ کے وکلاء کو روانہ کیا تا کہ شہزادہ رپن سے جو سلطنت روس کا نمائندہ تھا، شرائط صلح کریں۔

صلح نامۂ کینارجی ۱۲؍جولائی ۱۷۷۴ء کو کینارجی (Kainardji) کے مقام پر مجلس صلح منعقد ہوئی اور صرف سات گھنٹوں کی گفت و شنید کے بعد تمام شرائط فریقین کے درمیان طے ہو گئے، فوکشانی اور بخارسٹ کی صلح کانفرنسوں کی مدت اور نتائج کے مقابلہ میں کینارجی کا یہ صلح نامہ حد درجہ حیرت انگیز ہے لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے کہ دونوں فریق اب جنگ کو ختم کر دینے کے دل سے خواہاں تھے، روس کا حال باوجود اس کی شاندار فتوحات کے سلطنت عثمانیہ سے کہیں زیادہ خراب تھا، دوران جنگ میں اس کا جانی اور مالی نقصان بہت زیادہ ہو چکا تھا اور اس کے سپاہیوں کی جتنی تعداد میدان جنگ میں کام آئی تھی اس سے زیادہ سامان رسد کی کمی اور وبائی بیماریوں سے ہلاک ہوئی تھی، اس کے متعدد صوبے طاعون نے برباد کر ڈالے تھے، استراخان کے قریب کے ایک علاقہ حکومت روس کے مظالم کی وجہ سے تقریباً ویران ہو گیا تھا، وہاں کے چار لاکھ باشندے نقل مکان کر کے ۱۷۷۱ء میں سلطنت چین میں جا کر آباد ہو گئے تھے، علاوہ بریں پوگاشف (Pugalcheff) کے دعوئ سلطنت سے خود روس کے اندر ایک ایسی شورش پیدا ہو گئی تھی جس نے چند ہی دنوں میں خانہ

جنگی کی شکل اختیار کرلی اور پوگا شف کے حامیوں نے ۱۷۷۳ء اور ۱۷۷۴ء میں جنوبی روس کے تمام علاقے تاراج کر ڈالے، پوگا شف نسلاً ایک روسی قزاق تھا، گذشتہ جنگ میں وہ روسی فوج کا افسر رہ چکا تھا، مگر کسی وجہ سے فوج سے علاحدہ ہوگیا، اور کچھ دنوں ادھر ادھر پھرتا رہا، پھر ۱۷۷۳ء میں دفعتہً اس نے اعلان کیا کہ میں کیتھرائن کا مقتول شوہر شہنشاہ پیٹر ثالث ہوں جسے تخت سلطنت کی خاطر کیتھرائن نے اپنے عاشقوں سے سازش کرکے اپنی دانست میں قتل کرادیا تھا، چوں کہ روس میں بہت سے لوگ کیتھرائن کی حکومت کے خلاف تھے، اس لیے وہ پوگا شف کے ساتھ ہوگئے، صلح کے لیے روس کی آمادگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تقسیم پولینڈ کا پہلا معاہدہ حال ہی میں ہوا تھا اور کیتھرائن اس بات کی سخت ضرورت محسوس کررہی تھی کہ دولت عثمانیہ کی طرف سے مطمئن ہوکر پوری توجہ کے ساتھ پولینڈ پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کرے، کریسی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اگر یہ حالات پیش نظر رکھے جائیں تو پھر اس فیاضی اور عالی ہمتی کی حقیقت کھل جاتی ہے، جو روس نے بزعم خود سلطنت عثمانیہ کے ساتھ معاہدہ کینارجی میں برتی اور زیادہ سخت شرائط پر اسے مجبور نہ کیا،[1] صلح نامہ کے شرائط تو چار روز قبل ہی طے ہوگئے تھے لیکن رومانزوف نے دستخط کے لیے ۲۱/ جولائی کی تاریخ مقرر کی جو معاہدہ پرتھ کے تکملہ کی تاریخ تھی، مقصد یہ تھا کہ آئندہ وہ تاریخ روسیوں کے بجائے عثمانیوں کی شکست وذلت کی یادگار رہے، کینارجی کا مقام بھی اسی وجہ سے منتخب کیا گیا تھا کہ وہیں ایک سال قبل روسی جنرل وائسمین ترکوں کے ہاتھ سے جنگ میں مارا گیا تھا۔

صلح نامۂ کینارجی اٹھائیس دفعات پر مشتمل تھا، ان میں دو خفیہ دفعات کا اضافہ بھی کیا گیا، جن کے رو سے باب عالی نے یہ وعدہ کیا کہ تین سال کے اندر چار ملین روبل حکومت روس کو ادا کرے گا اور کیتھرائن نے ذمہ لیا کہ روسی بیڑہ بحر الجین سے فوراً واپس بلا لیا جائے گا، اور دفعات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۲۰۵۔

روس تقریباً ان تمام عثمانی علاقوں سے دست بردار ہو گیا جن پر اس کی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، کریمیا البتہ دولت علیہ کو واپس نہ ملا، بلکہ سرحد پولینڈ تک بسرابیا کا تاتاری علاقہ اس کے ساتھ شامل کر کے ایک مستقل تاتاری حکومت قائم کر دی گئی، جس کے خان کے انتخاب کا حق صرف تاتاریوں کو دیا گیا اور اس انتخاب میں روس اور باب عالی کی مداخلت ممنوع قرار دی گئی، اس دفعہ میں یہ تصریح خاص طور پر کر دی گئی تھی کہ کسی عذر کی بنا پر حکومت روس یا دولت عثمانیہ خان کریمیا کے انتخاب میں دخل نہ دے گی اور نہ مملکت مذکورہ کے خانگی، سیاسی، ملکی اور اندرونی معاملات میں مداخلت کرے گی، بلکہ دونوں قوم تاتار کو سیاسی اور ملکی حیثیت سے ان طاقتوں کے ہم پلہ تسلیم کریں گی، جو خود مختار ہیں اور صرف خدا کے زیر فرمان ہیں، تاہم کریمیا اور دوسرے تاتاری علاقوں میں سے روس نے کرش، ینی قلعہ، ازف اور کلبرن کے قلعوں اور ان کے ملحق اضلاع پر اپنا قبضہ قائم رکھا، یہ استثنا اپنے اندر آئندہ خطرات کا بہت کچھ سامان رکھتا تھا، کیوں کہ ان علاقوں پر قابض رہنے سے روس کو کریمیا پر حملہ کرنے کا ہر وقت موقع حاصل تھا، قبارطہ کے دونوں علاقے بھی، اگرچہ وہاں کے باشندے مسلمان تھے، روس کو دیے گئے، باقی اور تمام عثمانی مقبوضات جو روس نے دوران جنگ میں فتح کر لیے تھے اور جن میں ولاچیا، مولڈیویا، بسرابیا، جارجیا اور منگریلیا شامل تھے، سلطنت عثمانیہ کو واپس کر دیے گئے، اوکزاکوف کے قلعہ اور ضلع پر ترکوں کا قبضہ قائم رہا، ولاچیا اور مولڈیویا کو دولت عثمانیہ کے حوالے کرتے ہوئے یہ تصریح کر دی گئی کہ وہاں کے باشندوں کے تمام باغیانہ جرائم جو دوران جنگ میں سرزد ہوئے تھے، معاف کر دیے جائیں گے، عیسائی رعایا کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی اور آئندہ ان پر زیادہ نرمی کے ساتھ حکومت کی جائے گی، دولت عثمانیہ کی طرف سے سفیر روس متعینہ قسطنطنیہ کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ بوقت ضرورت ان صوبوں کے حق میں باب عالی میں معروضات پیش کرے اور وعدہ کیا گیا کہ ان معروضات کی سماعت پوری توجہ کے ساتھ کی جائے گی۔

عام عیسائی رعایا کے متعلق جو دفعہ صلح نامہ میں شامل کی گئی وہ نہایت اہم تھی، اس کے رو سے حکومت روس کو سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت کا حق حاصل ہو گیا اور روس کے سفیروں کو باب عالی میں عیسائیوں کی طرف سے معروضات پیش کرنے کی اجازت دے دی گئی، یہ حق کسی دوسری مسیحی حکومت کو نہیں دیا گیا، روس کی رعایا کو بیت المقدس کی زیارت کی بھی عام اجازت دی گئی، یہ زائرین ہر قسم کے محصول سے معاف کر دیے گئے اور باب عالی نے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا۔

روس اور دولت عثمانیہ کے تجارتی جہازوں کو ان تمام سمندروں میں جو ان سلطنتوں کے کنارے واقع تھے، آمد و رفت کی پوری آزادی دی گئی، اسی دفعہ میں روس کو یہ حق بھی دیا گیا کہ سلطنت عثمانیہ کے جس حصہ میں مناسب سمجھے اپنے قونصل مقیم رکھے لیکن دولت علیہ کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ اپنے قونصل سلطنت روس میں بھیجے، اس کے لیے صرف اسی قدر کافی سمجھا گیا کہ اس کی رعایا کو روس میں بری اور بحری تجارت کی اجازت دے دی گئی اور عثمانی تاجروں کے ساتھ مراعات کا وعدہ کیا گیا۔

صلح نامہ میں یہ بھی طے پایا کہ آئندہ ایک روسی سفیر قسطنطنیہ میں مقیم رہا کرے گا اور زار روس "بادشاہ" کے لقب سے پکارا جائے گا، باب عالی نے زار روس کے لیے "بادشاہ" کا لقب اس وقت تک تسلیم نہیں کیا تھا، معاہدۂ کینارجی سے قبل دونوں سلطنتوں کے درمیان جتنے معاہدے اور صلح نامے ہو چکے تھے، سب کالعدم قرار دے دیے گئے، علاوہ اس معاہدہ کے جو علاقہ ازف کے حدود اور سرحد کیوبان کے تعین کے لیے ۱۷۰۰ء میں ہوا تھا، اس کی پابندی بدستور قائم رکھی گئی۔

صلح نامہ کی کسی دفعہ میں پولینڈ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں آیا، حالاں کہ ابتدائے جنگ کے من جملہ اور اسباب کے ایک اہم سبب قضیہ پولینڈ بھی تھا، ایک اور حیرت خیز بات یہ تھی کہ اس صلح نامہ کی ترتیب میں کوئی دوسری حکومت شریک نہیں کی گئی، یہ کیتھرائن کی ایک

کھلی ہوئی کامیابی تھی۔

صلح نامۂ کینارجی کی اہمیت

صلح نامہ کینارجی بہ لحاظ اپنے نتائج کے ان تمام صلح ناموں سے زیادہ اہم ہے جو دولت عثمانیہ کے آغاز زوال کے بعد باب عالی اور عیسائی حکومتوں کے درمیان اس سے قبل ہو چکے تھے، دولت علیہ کی فوجی قوت کا خوف یورپ کے دل سے صلح نامہ کارلووٹز کے بعد ہی نکل گیا تھا لیکن صلح نامہ کینارجی نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ ترکوں کے لیے خود اپنے مقبوضات کا تحفظ بھی دشوار ہو گیا ہے، کریمیا اور دوسرے تاتاری علاقوں کا سلطنت عثمانیہ کے حدود سے نکل جانا دولت علیہ کے انحطاط و زوال کی ایک ناقابل انکار شہادت تھی، صلح نامہ کارلووٹز کے بعد ہنگری کی عیسائی رعایا دولت عثمانیہ کی حکومت سے آزاد ہو گئی تھی لیکن کریمیا ایک خالص اسلامی صوبہ تھا اور اس کا ہاتھ سے نکل جانا ہنگری کی دست برداری سے بہت زیادہ اہم تھا، صلح نامہ کینارجی میں کریمیا کی آزادی صاف الفاظ میں تسلیم کر لی گئی تھی اور فریقین نے اس کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے کا سختی سے عہد کیا تھا لیکن یہ آزادی محض روسی تسلط کا دیباچہ تھی، کریمیا کو دولت عثمانیہ سے آزاد کرانے کی کوشش کیتھرائن نے صرف اس غرض سے کی تھی کہ اس پر قبضہ کرنا آسان ہو جائے، چنانچہ صلح نامہ کے چند ہی دنوں بعد اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے کریمیا میں اندرونی خلفشار پیدا کرانا شروع کر دیا اور پھر اپنے ہی برپا کیے ہوئے فتنہ کو دبانے کی حیلہ سے اس نے اپنی فوجیں بھیج کر پورے ملک پر قبضہ کر لیا، اس صلح نامہ کی ایک دوسری اہم دفعہ جس کے نتائج دولت عثمانیہ کے لیے نہایت مضر تھے، وہ تھی جس میں روس کو سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت کا حق خصوصاً ان عیسائیوں کی جو کلیسائے یونان سے وابستہ تھے، دیا گیا تھا، یہ ایک ایسا حق تھا جو مستقبل میں دولت علیہ کے لیے اہم ترین خطرات سے پُر تھا، مصطفیٰ کامل پاشا فرماتے ہیں کہ:

> ''عیسائی رعایا کی حمایت سے متعلق جو شرط رکھی گئی اس سے دولت عثمانیہ ہمیشہ

کے لیے ایک آفت میں مبتلا ہوگئی، کیوں کہ اس کے بعد ہر یورپین سلطنت دولت علیہ کے معاملات میں عیسائیت کے نام پر دخل دینے لگی اور پھر جب کبھی دولت علیہ اور یورپ کی کسی حکومت میں جنگ ہوتی تو اس کا سبب مسیحیت اور اس کے حقوق قرار دیے جاتے[1]۔"

بعض اصلاحات صلح نامہ کینارجی کا اخلاقی اثر ترکوں پر برا پڑا، وہ روس کی طاقت سے مرعوب نظر آنے لگے، تاہم ایک جماعت استقلال کے ساتھ سلطنت کی خدمت کے لیے مستعد رہی اور شکست و ہزیمت کی اس کاری ضرب سے بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی، اس جماعت کا سب سے زیادہ ممتاز فرد حسن پاشا الجزائری تھا، سلطان کو اس پر کامل اعتماد تھا اور اس نے حسن پاشا کو تقریباً غیر محدود اختیارات دے رکھے تھے، حسن پاشا نے بری اور بحری فوجوں کو ازسرنو منظم کرنے کے لیے بعض نہایت مفید اصلاحات جاری کرنی چاہیں لیکن جہاں تک بری فوج کا تعلق تھا، اسے کامیابی نہیں ہوئی، ینی چری اور سپاہی دستوں نے جدید آلات حرب اور اصلاح شدہ فوجی قواعد کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، البتہ بحریہ کی اصلاح میں حسن پاشا کی کوششیں ایک حد تک بارآور ہوئیں، ایک انگریز جہاز ساز کی مدد سے اس نے نئے طرز کے جنگی جہاز تعمیر کرائے اور الجزائر اور دوسری بربری ریاستوں نیز بحرایڈریاٹک کے مشرقی ساحل کی بندرگاہوں سے بہترین جہازرانوں کو بلا کر ان جہازوں پر مقرر کیا، اس نے کپتانوں کو مجبور کیا کہ اپنے جہازوں کی دیکھ بھال ہمیشہ خود کرتے رہیں، اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ لائق اور تجربہ کار جہازرانوں کی کافی تعداد ضرورت نگہبانی کے لیے ہر وقت قسطنطنیہ میں موجود رہے، پہلے یہ دستور تھا کہ موسم سرما میں جہاز بندرگاہوں میں کھڑے کر دیے جاتے تھے اور جہازرانوں کو رخصت کر دیا جاتا تھا، حسن پاشا نے اس دستور کے خطرہ کو ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ دارالسلطنت کو یوں غیر محفوظ چھوڑ دینے سے روسی جہاز بحر اسود کے بندرگاہوں سے نکل کر باسفورس پر آسانی

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا ص ۱۵۔

بے قابض ہو سکتے ہیں اور پھر وہ عثمانی بیڑہ کو اس کی بندرگاہوں میں فنا کر سکتے ہیں، چنانچہ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ جس طرح بری فوجوں کے لیے قسطنطنیہ میں بارکیں بنی ہوئی ہیں، جن میں وہ موسم سرما میں قیام کرتی ہیں، اسی طرح جہازرانوں کے لیے بھی بارکیں بنوا دی جائیں لیکن صدر اعظم اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں نے خفیہ طور پر اس تجویز کی پرزور مخالفت کی کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ دارالسلطنت میں اتنی بڑی بحری فوج کے قیام سے حسن پاشا کو کس قدر قوت حاصل ہو جائے گی، چوں کہ صدر اعظم ان بارکوں کی تعمیر کے لیے روپیہ دینے میں برابر حیلے حوالے کرتا رہا، اس لیے مجبور ہو کر حسن پاشا نے خود اپنے ذاتی روپیہ سے جہازرانوں کے لیے ایک مستقر مختصر پیمانہ پر تعمیر کرا دیا، اس نے جہاز کے افسروں کی فنی تعلیم کے لیے ایک بحری مدرسہ بھی قائم کیا لیکن اس کی یہ تمام تجویزیں سلطنت کے دوسرے عہدہ داروں کی مخالفت کی وجہ سے آخرکار ناکام رہیں، اسی مخالفت کی وجہ سے وہ نظام جاگیرداری کی اصلاح میں بھی کامیاب نہ ہو سکا، جو اہل دربار کی غیر دیانت داری کے باعث نہایت ابتر ہو رہا تھا اور جنگ کے موقعوں پر باب عالی کو اس کے فائدے سے بہت کچھ محروم رہنا پڑتا تھا۔

بغاوتوں کا استیصال حسن پاشا کی ان تجویزوں کے ناکام رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے ان بغاوتوں کے فرو کرنے کی غرض سے جو گذشتہ جنگ کے دوران میں سلطنت کے مختلف صوبوں میں نمودار ہوئی تھیں، اکثر پایہ تخت سے باہر رہنا پڑتا تھا، اور اس کے حریفوں کو اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل جاتا تھا، چنانچہ شام میں شیخ ظاہر نے خودسری اختیار کر لی تھی، سلطان نے حسن پاشا کو اس کی تنبیہ کے لیے روانہ کیا، حسن پاشا نے عکہ کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا اور شیخ ظاہر کو قید میں ڈال دیا، پھر اس نے مصر کے ملحق علاقہ کو بھی سر کیا اور بغاوت کا فتنہ کچھ دنوں کے لیے فرو ہو گیا۔

دو ہی سال کے بعد ۱۷۷۸ء میں حسن پاشا کو موریا کی سرکشی دور کرنے کے لیے

جانا پڑا۔ ۱۷۷۰ء میں جب روسی جنرل اورلوف کی حمایت میں موریا کے یونانی باشندوں نے دولت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا تو البانی دستے ان کے مقابلہ میں بھیجے گئے تھے اور انہوں نے یونانیوں اور روسیوں کو شکست دے کر بھگا دیا تھا، یہ دستے امن قائم ہونے کے بعد وہیں رہ گئے تھے اور اب انہوں نے خود دولت علیہ کے خلاف سر اٹھایا، وہ ہر طرف لوٹ مار کرتے پھرتے تھے اور قتل و غارت گری میں ان کے یہاں یونانیوں اور ترکوں کی کوئی تفریق نہ تھی، حسن پاشا نے موریا پہنچ کر ان کو شکست دی اور وہاں سے نکال باہر کیا، اس کے بعد سلطان نے اسے موریا کا حاکم مقرر کر دیا، اس نے ازسرنو امن وامان قائم کیا اور زراعت وتجارت کو ترقی دی۔

کچھ دنوں کے بعد مصر میں مملوکوں کی بغاوت رونما ہوئی، سلطان نے حسن پاشا کو ان کی سرکوبی کے لیے بھی روانہ کیا، چنانچہ اس نے قاہرہ پر قبضہ کر لیا اور باغیوں کے زیر کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، اگر تھوڑی سی مہلت اسے اور مل گئی ہوتی تو وہ مصر کی بغاوت کا بھی استیصال کر دیتا لیکن ۱۷۸۷ء میں روس سے جنگ کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور سلطان نے اسے قسطنطنیہ واپس بلا لیا۔

کیتھرائن کے منصوبے | صلح نامہ کینارجی کی سیاہی ابھی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کیتھرائن نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ کی تیاریاں پھر شروع کر دیں، اس کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا، یعنی ترکوں کو یورپ سے نکال کر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا، یہ مقصد پیٹر اعظم کی وصیت کے مطابق حکومت روس کا اولین فرض قرار پا چکا تھا، چنانچہ جب ۱۷۸۷ء میں کیتھرائن نے اپنی فوجیں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیں تو اس کی غرض یہ نہ تھی کہ چند قلعوں پر قابض ہو جائے اور بحر اسود میں روسی جہازوں کو آمدورفت کی اجازت دے دی جائے، بلکہ وہ شروع سے آخر تک قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہی تھی لیکن حالات خلاف توقع پیش آئے، ترکوں کا عزم واستقلال ان کی شجاعت کے

مضر ثابت ہوا اور روسی فوجوں کو بعض سخت شکستیں اٹھانی پڑیں، جان و مال کے شدید نقصان کے علاوہ پوگاشف کی پیدا کردہ خانہ جنگی نے بھی کیتھرائن کو صلح کے لیے مجبور کیا لیکن جب ۱۱ر جنوری ۱۷۷۵ء کو پوگاشف گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا نیز پولینڈ کے ان صوبوں پر جو از روئے تقسیم روس کے ہاتھ آئے تھے، پوری طرح تسلط قائم ہو گیا تو کیتھرائن کے دل میں قسطنطنیہ کی فتح کا حوصلہ پھر جوش زن ہوا، چنانچہ اسی حوصلہ کی ایک بین شہادت تھی کہ جب ۱۷۷۸ء میں کیتھرائن کا دوسرا پوتا پیدا ہوا تو اس نے اس کا نام قسطنطین رکھا اور اس کی رضاعت اور پرورش و پرداخت کے لیے یونانی عورتیں مقرر کیں اور جب وہ لڑکا بڑا ہوا تو بڑے بڑے لائق یونانی اساتذہ سے اس کو تعلیم دلوائی، اس طرح شہزادہ نے یونانی زبان میں مہارت حاصل کر لی، ایک انگریز مسٹر ایٹن (Eton) جو اس وقت سینٹ پیٹرس برگ میں مقیم تھا اور شہزادہ پوٹمکن اور حکومت روس کے دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں سے گہرے تعلقات رکھتا تھا، بیان کرتا ہے کہ شہزادہ قسطنطین کی ساری تعلیم اسی مقصد کو سامنے رکھ کر دی گئی تھی کہ وہ قسطنطنیہ کے تخت کا اہل ہو سکے، اور اس وقت تک کسی شخص کو بھی زارینہ کے اس ارادہ کے متعلق کوئی شبہ نہ تھا۔[1]

ایٹن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ۱۷۷۹ء میں کیتھرائن اور شہزادہ پوٹمکن نے ایک اسکیم مرتب کی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ کے نو آبادکاروں کے خلاف روس انگلستان کو پوری مدد دے اور اس کے معاوضہ میں انگلستان روس کی مدد کرے جب وہ پھر ترکوں پر حملہ آور ہو، چنانچہ اس اسکیم کے مطابق جزیرہ مانرکا (Minorca) جو اس وقت انگریزوں کے قبضہ میں تھا، روس کو دیا جانے والا تھا تاکہ بحر روم میں روسی جہازوں کے لیے ایک اسٹیشن کا کام دے، نیز یونانی باغیوں کے جمع ہونے کے لیے ایک محفوظ مقام حاصل ہو جائے، پوٹمکن اس اسکیم کو برطانوی سفیر متعینہ سینٹ پیٹرس برگ کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۲۷۔

روس کے وزیر خارجہ کاؤنٹ پانین (Count Panin) نے جو انگلستان کے مقابلے میں فرانس کا حامی تھا، درمیان میں پڑ کر اس معاملہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا، ائین لکھتا ہے کہ اس اسکیم کی ناکامی پر پوٹمکن مرتے وقت تک افسوس کرتا رہا اور وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دولت عثمانیہ کے خلاف روس کی کامیابی انگلستان سے اتحاد کرنے پر منحصر ہے[1] خود کیتھرائن کا ذاتی خیال اس سے مختلف تھا۔

سلطنت عثمانیہ کی مجوزہ تقسیم: گذشتہ جنگ میں کیتھرائن کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ سے متعلق اپنے حوصلوں کو پورا کرنا آسٹریا کی شرکت کے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ اس نے ترکوں سے لڑائی چھیڑنے سے پہلے شہنشاہ جوزف ثانی سے جو میریا تھریسیا کی وفات (۱۷۸۰ء) کے بعد سلطنت آسٹریا کا مطلق العنان فرماں روا تھا، ایک بار ملاقات کی اور اسے اپنا گرویدہ اور اپنی "مشرقی تجویز" کا پرجوش حامی بنا لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جون ۱۷۸۱ء میں دونوں کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ سے ایک معاہدہ ہو گیا جس کے رو سے کیتھرائن اور جوزف نے مشرق ادنی میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا عہد کیا، اس معاہدہ میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا، لیکن ستمبر ۱۷۸۲ء میں کیتھرائن نے جوزف کے سامنے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی ایک مستقل اسکیم پیش کی۔

اسکیم کی بنیاد اس مفروضہ پر تھی کہ روس اور آسٹریا متحد ہو کر ترکوں کو ان کے تمام یورپین مقبوضات سے نکال دیں گے اور ان کے نکل جانے کے بعد پھر ان علاقوں کی تقسیم میں کوئی دشواری باقی نہ رہے گی، مجوزہ تقسیم یہ تھی کہ اوکزاکوف دریائے بوگ اور دریائے نیسٹر کا درمیانی علاقہ اور بحر الجین کے دو جزیرے روس کو دے دیے جائیں، مولڈیویا، بسرابیا اور ولاچیا کو متحد کر کے ڈاسیا کے نام سے ایک آزاد مملکت قائم کر دی جائے اور شہزادہ پوٹمکن کو اس کا بادشاہ بنا دیا جائے، آسٹریا کے حصہ میں سرویا، بوسنیا، ہرزیگووینا اور ڈلماشیا کے

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۴۲۲۔

صوبے رکھے گئے تھے، ڈلماشیا چوں کہ وینس کا مقبوضہ تھا، اس لیے اس کی تلافی کے لیے وینس کو موریا، قبرص (سائپرس) اور کریٹ دیے گئے، کیتھرائن کو یورپین حکومتوں میں سے مخالفت کا اندیشہ صرف فرانس کی طرف سے تھا، اس لیے فرانس کو راضی کرنے کے لیے مصر وشام کے صوبے اس کے سامنے پیش کیے جانے والے تھے لیکن اس اسکیم میں سب سے زیادہ دل چسپ حصہ وہ تھا جس میں ایک بازنطینی سلطنت کا نقشہ مرتب کیا گیا تھا یعنی تھریس، مقدونیا، بلغاریہ، شمالی یونان اور البانیا کو ملا کر ایک نئی سلطنت قائم کی گئی تھی جس کا پایہ تخت قسطنطنیہ تھا اور کیتھرائن کا دوسرا پوتا شہزادہ قسطنطین اس سلطنت کا فرماں روا قرار دیا گیا تھا، چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا اس شہزادہ کی تعلیم وتربیت میں یہی مقصد کیتھرائن کے پیش نظر تھا، کیتھرائن کو اپنی اسکیم کی کامیابی پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے پہلے ہی سے اس نئی سلطنت کے لیے ایک سکہ بھی ڈھلوالیا تھا، جس کے ایک طرف شہزادہ قسطنطین کے چہرے کی شبیہ تھی اور دوسری طرف ایک تمثیلی نشان تھا جو ہلال پر صلیب کی آئندہ فتح ونصرت کو ظاہر کرتا تھا، یورپین حکومتوں کے اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے کہ مبادا سلطنت روس اور جدید بازنطینی سلطنت بعد میں ایک ہی فرماں روا کے زیر حکومت آجائیں، کیتھرائن کافی ضمانت دینے پر آمادہ تھی۔[1]

شہنشاہ جوزف کو مذکورہ بالا اسکیم سے پورا پورا اتفاق نہ تھا، اس کا خیال تھا کہ اس تقسیم میں آسٹریا کا حصہ کم رکھا گیا ہے، وہ ڈلماشیا کے علاوہ استریا (Istra) کا علاقہ بھی چاہتا تھا اور سرویا کے علاوہ ولاچیا کوچک کا بھی امیدوار تھا، اسے یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ دریائے ڈینوب کے بقیہ علاقے سلطنت عثمانیہ سے نکل کر روس کے دائرۂ اقتدار میں آجائیں، تاہم وہ سمجھتا تھا کہ کیتھرائن کی مخالفت کرنے سے بجز نقصان کے کچھ حاصل نہ ہوگا، اس لیے اس نے اس اسکیم کو منظور کرکے کیتھرائن کی دوستی کو قائم رکھا۔

کریمیا پر روس کا قبضہ یہ اسکیم بہرحال کاغذ ہی تک محدود رہی اور کیتھرائن کے حوصلوں

---

[1] میریٹ ص ۱۵۵-۱۵۶۔

کے باوجود عمل میں نہ آسکی لیکن ۱۷۸۳ء میں اس نے کریمیا پر قبضہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ باضابطہ قبضہ تو ۱۷۸۳ء میں ہوا مگر اس کے لیے کوشش صلح نامہ کینارجی کے بعد ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ اس صلح نامہ میں حکومت روس نے عہد کیا تھا کہ وہ کریمیا کے اندرونی اور ملکی معاملات میں مداخلت نہ کرے گی اور نہ اس کے فرماں روا کے انتخاب میں کوئی دخل دے گی لیکن اس کے باوجود اس نے ''دوستانہ مشورہ'' کے طور پر کریمیا کے اندرونی معاملات میں ابتدا ہی سے دخل دینا شروع کردیا تھا اور جب باب عالی نے احتجاج کیا کہ یہ ''معاہدہ کینارجی'' کی صریح خلاف ورزی ہے تو اس کا جواب یہ دیا کہ اہل کریمیا کے باہمی جھگڑوں سے خود روس کے سرحدی علاقوں پر مضر اثر پڑنے کا اندیشہ ہے، تاتاریوں نے دولت گرائی کو اپنا خان منتخب کیا تھا، کیتھرائن نے اسے اپنے اثر میں لانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی، اس لیے اس نے اب یہ تدبیر اختیار کی کہ سازشوں کے ذریعہ سے دولت گرائی کے خلاف ملک میں شورش برپا کرادی اور پھر اس شورش کو فرو کرنے کے حیلہ سے اپنی فوجیں کریمیا میں روانہ کیں، روسی افسر برابر یہ اعلان کرتے جاتے تھے کہ ان کا مقصد ہرگز کریمیا کو فتح کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ صرف امن قائم کرنے کے لیے آئے ہیں، بہرحال انہوں نے دولت گرائی کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کردیا اور اس کی جگہ شاہین گرائی کو منتخب کرایا، یہ شخص روس کے زیر اثر اور تاتاریوں میں حد درجہ نامقبول تھا، چنانچہ کیتھرائن کے حسب توقع بہت جلد اس کے خلاف شورش برپا ہوگئی اور تاتاریوں نے اسے تخت سے معزول کردینا چاہا، چوں کہ باب عالی بھی شاہین کا مخالف تھا، اس لیے اس نے ۱۷۷۶ء میں ایک وفد سینٹ پیٹرس برگ روانہ کیا اور کیتھرائن سے مدد کی درخواست کی، کیتھرائن اسی موقع کا انتظار کررہی تھی، اس نے شاہین کو اپنی سرپرستی کا اطمینان دلایا اور روسی سپہ سالار رومانزوف کو حکم دیا کہ فوجیں تیار رکھی جائیں تاکہ اگر ترک اس معاملہ میں روس کی مخالفت کریں تو ان کا مقابلہ کیا جائے لیکن باب عالی میں اس وقت روس سے جنگ

چھیڑنے کی قوت نہ تھی، البتہ کیوبان کے تاتاری قبائل نے روس کی اس خطرناک مداخلت کے خلاف ہتھیار اٹھائے لیکن جنرل سوارو نے شکست دے کر ان کا زور توڑ دیا، ۱۷۷۹ء میں باب عالی اور روس کے درمیان ایک جدید معاہدہ ہو گیا، جس میں صلح نامہ کینارجی کی دفعات از سر نو تسلیم کی گئیں، حالاں کہ کریمیا کے ساتھ روس کا طرز عمل صلح نامہ مذکور کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تھا، اس معاہدہ میں سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے شاہین گرائی کو کریمیا کا جائز فرماں روا بھی تسلیم کیا۔

لیکن شاہین گرائی زیادہ دنوں تک تخت پر نہ رہ سکا، پوٹمکن نے اپنے ایجنٹ خان کے دربار میں متعین کر دیے، انہوں نے اس کو روسی رسم و رواج اور روسی لباس اختیار کرنے کی ترغیب دی، جس سے تاتاریوں کے قومی اور مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچا اور اس کے خلاف عام بے زاری پھیلنے لگی، ان روسیوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ شاہین کے خلاف جو شورش پھیل رہی تھی، اسے اپنی خفیہ کوششوں سے بہت بڑھا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا اعلانیہ بغاوت پر آمادہ ہو گئی، اب شاہین کے ان روسی مشیروں نے اسے کیتھرائن سے فوجی مدد طلب کرنے کی رائے دی، وہ غریب ان کے ہاتھوں میں کچھ ایسا مجبور ہو رہا تھا کہ چارو ناچار اس کو روس سے مدد کی درخواست کرنی پڑی، چنانچہ فوراً روسی فوجیں کریمیا میں پہنچ گئیں اور بغاوت فرو کر دی گئی لیکن اب کیتھرائن کو تاتاریوں کی فلاح و بہبود کے لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ کریمیا بلا تاخیر سلطنت روس میں شامل کر لیا جائے، جن احسان ناشناسوں نے اس تجویز کی مخالفت کی انہیں بے دردی سے قتل یا جلا وطن کر دیا گیا اور شاہین گرائی کو مجبور کیا گیا کہ زارینہ کے حق میں کریمیا اور کیوبان کی مملکت سے دست بردار ہو جائے، اس سے ایک تحریر بھی اس مضمون کی حاصل کر لی گئی کہ اس کے خاندان کے وہ افراد جو وراثۃً تخت و تاج کے مستحق ہوتے، آئندہ ہمیشہ کے لیے کریمیا کی فرماں روائی سے معزول کیے گئے۔

ظلم و فریب کی اس حیرت انگیز کارروائی کے لیے سند جواز بھی ویسی ہی بے نظیر

پیش کی گئی، چنانچہ تاتاریوں کے ملک پر اس طرح قبضہ کر لینے کے بعد کیتھرائن کی طرف سے جو اعلان اپریل ۱۷۸۳ء میں شائع کیا گیا، وہ اسی قسم کی خداعیوں سے پر تھا جس کا نمونہ تقسیم پولینڈ کے موقع پر یورپ کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا، یعنی کریمیا اور کیوبان کو سلطنت روس میں شامل کر لینے کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ قوم تاتار کو طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کے مصائب سے نجات دلائی جائے اور روس کے سایۂ عاطفت میں پرامن زندگی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز کیا جائے، مغربی یورپ میں کیتھرائن کے اس الطاف خسروانہ پر تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہونے لگے لیکن خود تاتاریوں نے ان نعمتوں کی ناقدری کی اور ایک جماعت ملکی آزادی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، جنرل پوٹمکن (جو شہزادہ پوٹمکن کا عزیز تھا) نے فوراً ہی ان کی تنبیہ کر دی، قتل عام میں تیس ہزار تاتاری جن میں بوڑھے، بچے، عورتیں بھی شامل تھے، تہ تیغ کر دیے گئے، روسیوں کے مظالم سے بچنے کے لیے ہزاروں وطن چھوڑ کر بھاگ گئے، بھاگنے والوں میں پچھتر ہزار آرمینی عیسائی بھی تھے، جن میں سے سات ہزار کے علاوہ باقی سب فاقہ کشی اور سردی کی شدت سے راستہ ہی میں ہلاک ہو گئے[1]۔

فرانسیسی مؤرخ ژوون کیئر اس سلسلہ میں روکیئر کا ذیل بیان نقل کرتا ہے:

"صلح نامہ کینارجی کے نتائج بہت جلد محسوس ہو گئے، مسقوی کارپردازوں کی سازشوں سے قرم میں فساد ہوا، دولت قرائے معزول کیا گیا اور اس کی جگہ شاہین عزائے مقرر ہوا جس نے آپ کو کیتھرائن کی سرپرستی میں دیا، امراء نے نئے خان قرم کے خلاف بغاوت کی، خان نے روس سے مدد کی درخواست کی۔ (۱۷۸۳ء) پوٹمکن نے فوراً ستر ہزار آدمیوں کے ساتھ قرم پر حملہ کر دیا لیکن اس کی فتح کو فتح کی دیوی نے شرف نہیں بخشا، قتل کے سبب سے یہ فتح حاصل ہوئی اور پھانسیوں کے ساتھ اس کا اعلان ہوا، خود خان کی آنکھوں کے سامنے کئی ہزار شریف تاتاری سنگسار اور قتل کر دیے گئے، روسیوں نے بدقسمت شاہین

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۲۷۶۔

> گرائے کو ایک زمانہ تک ذلیل ملول میں رکھا، آخر بے چارے کو اپنی سلطنت سے جس کی اس نے تحقیر کی تھی دست کش ہونا پڑا، بعد ازاں روسیوں نے اس کو کالوگا میں قید کیا، اس کو سخت تکالیف دیں اور اس کے ساتھ نہایت وحشیانہ برتاؤ کیا اور بالآخر اس کو ترکوں کے انتقام کے لیے سرحدی علاقے پر چھوڑ دیا، ترکوں نے اس کو پکڑا اور رہوڈس روانہ کیا، جہاں فرانسیسی قونصل کی مزاحمت کے باوجود قتل کر دیا گیا۔"[1]

کریمیا کے مذکورہ بالا واقعات کی خبر جب قسطنطنیہ پہنچی تو وہاں سخت اضطراب پیدا ہوا لیکن اس وقت دولت عثمانیہ کی فوجی قوت ایسی نہ تھی کہ روس کے خلاف فوراً اعلان جنگ کر دیا جاتا، فرانس کو بھی کیتھرائن کی اس کارروائی سے نہایت تشویش ہوئی، چنانچہ اس نے روس کے مقابلہ میں جس کی قوت اب خطرناک طور پر بڑھتی جا رہی تھی، مغربی حکومتوں کا ایک اتحاد قائم کرنا چاہا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس نے انگلستان کی طرف توجہ کی اور جون ۱۷۸۳ء میں فرانسیسی سفیر مقیم لندن نے انگلستان کے وزیر خارجہ مسٹر فاکس (Fox) سے مل کر کہا کہ شاہ فرانس کو سینٹ پیٹرس برگ کی وزارت سے یہ سرکاری اطلاع ابھی ملی ہے کہ روس نے کریمیا اور کیوبان پر قبضہ کر لیا، کیا انگلستان اس قسم کی فتح کو بے اعتنائی کے ساتھ دیکھتا رہے گا؟ فاکس نے جواب دیا کہ مجھے اس میں شبہ ہے کہ روس نے حقیقۃً ان صوبوں پر قبضہ کر لیا ہے، کیوں کہ فریڈرک ایسا ہونے نہ دے گا اور قبل اس کے کہ ایسا ہو وہ روس کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا، اس کے بعد سفیر فرانس نے اس مسئلہ پر فاکس سے متعدد بار گفتگو کی اور انگلستان اور فرانس کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ اگر کیتھرائن کی فتوحات کو روکا نہ گیا تو بہت جلد روسی بیڑا باسفورس میں نظر آئے گا اور قسطنطنیہ پر بھی کیتھرائن کا قبضہ ہو جائے گا لیکن فاکس کی بے اعتنائی بدستور قائم رہی اور آخر میں ان تمام

---

[1] تاریخ دولت عثمانیہ از ڈلا ژون کیئر (اردو ترجمہ) سلسلہ نصاب سیمیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، جلد اول: ص ۳۴۲ (Histoire del Empire Ottoman By Dela Jonquiere)

باتوں کا جواب اس نے یہ دیا کہ کریمیا سلطنت روس میں شامل کیا جا چکا ہے اور اس معاملہ میں مداخلت کرنے کا وقت اب باقی نہیں رہا، علاوہ بریں انگلستان اور زارینہ کے درمیان کچھ معاہدے ہو چکے ہیں جن کو توڑنا مناسب نہیں، فاکس کی طرف سے مایوس ہو کر سفیر فرانس نے خود جارج سوم شاہ انگلستان سے ملاقات کی اور اس کو روسی فتوحات کی اہمیت سمجھائی اور بتایا کہ آسٹریا اور روس مل کر سلطنت عثمانیہ کو باہم تقسیم کر لینا چاہتے ہیں، جس طرح کہ انہوں نے پولینڈ پر چھاپا مار کر اس کے بڑے حصہ کو تقسیم کر لیا، جارج سوم ان واقعات سے بہت متاثر ہوا اور اس نے کہا کہ اگر ایسا ہی ہوتا رہا تو چند دنوں میں یورپ مثل ایک جنگل کے ہو جائے گا جہاں زیادہ طاقت ور کمزوروں کو لوٹ لے گا اور کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکے گا لیکن جارج اپنی وزارت اور پارلیمنٹ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا اور یہ دونوں دولت عثمانیہ کے مخالف اور روس کے طرف دار تھے، علاوہ بریں چوں کہ حال ہی میں امریکہ کی جنگ آزادی ختم ہوئی تھی اور اس میں فرانس کی اعانت سے امریکہ والوں نے انگلستان کو شکست دی تھی، اس لیے باوجود اس کے کہ فرانس اور انگلستان کی حکومتوں کے درمیان صلح نامہ ہو گیا تھا، انگریزوں میں اب بھی فرانس کے خلاف بیزاری کا جذبہ عام طور پر پھیلا ہوا تھا اور وہ اس کے ساتھ اتحاد کرنے پر آمادہ نہ تھے، چنانچہ مایوس ہو کر سفیر فرانس نے ۸/ اگست ۱۷۷۳ء کو اپنی حکومت کو اطلاع دے دی کہ روس کے خلاف انگلستان کا تعاون حاصل ہونے کی کوئی امید نہیں۔

پرشا اور آسٹریا سے بھی فرانس کو ویسی ہی مایوسی ہوئی، فریڈرک نے ۱۷۵۶ء کے اس معاہدہ اتحاد کی شکایت کی جس کے رو سے فرانس اور آسٹریا ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے اور حکومت فرانس کو جواب دیا کہ پرشا سے اتحاد کی خواہش کرنے سے پہلے اسے چاہیے کہ آسٹریا سے اپنے دوستانہ تعلقات منقطع کر دے، اسی طرح حکومت آسٹریا نے بھی جو سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے لیے روس سے سازش کر رہی تھی، سفیر فرانس کی گذارشات پر مطلق توجہ نہ کی۔

۱؎ کریسی: جلد ۲، ص ۲۶۹ - ۲۷۰۔

فرانس تنہا دولت عثمانیہ کی حمایت میں روس سے جنگ کرنے پر تیار نہ تھا، چنانچہ جب اس نے آخری طور پر باب عالی کو یہ اطلاع دی کہ مغربی حکومتوں سے مدد ملنی ممکن نہیں تو مجبوراً ۸/ جنوری ۱۷۸۴ء کو روس سے ایک صلح نامہ کر لینے پر جس کے رو سے کریمیا اور کوبان پر کیتھرائن کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔

قسطنطنیہ کا راستہ لیکن کیتھرائن کا سب سے بڑا مقصد (یعنی قسطنطنیہ کی فتح) ابھی تک حاصل نہ ہوا تھا اور اس کی ساری توجہ اب اسی کے لیے وقف ہو رہی تھی، اس نے آسٹریا کے ساتھ باہمی امداد کا ایک جدید معاہدہ کیا اور اوائل ۱۷۸۷ء میں شہنشاہ جوزف کے ہمراہ کریمیا کے سفر کے لیے روانہ ہوئی، دوران سفر میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم پر اعلانیہ گفتگو ہوتی رہی، کیتھرائن کو قسطنطنیہ کی فتح کا اتنا یقین تھا کہ جب وہ شہر خرسن سے گزر رہی تھی تو شہر کے جنوبی دروازہ کی محراب پر یہ الفاظ جلی حروف میں لکھوا دیے تھے "قسطنطنیہ کا راستہ"۔

اعلان جنگ کیتھرائن حملہ کے لیے بالکل تیار تھی لیکن وہ چاہتی تھی کہ پیش قدمی کا الزام ترکوں کے سر رہے، اس غرض سے اس نے اپنے ایجنٹ خفیہ طور پر مولڈیویا، ولاچیا، یونان اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں میں پہلے سے بھیج دیے تھے تاکہ عیسائی رعایا کو بغاوت کے لیے آمادہ کر رکھیں، روسی قونصل بھی جو صلح نامہ کیناری کے بموجب سلطنت کے مختلف حصوں میں مقرر کر دیے گئے تھے، رعایا کو بھڑکا رہے تھے، امیر ولاچیا نے اعلانیہ خودسری کر کے روس کے دامن میں پناہ لی تھی، باب عالی نے حکومت روس سے یہ مطالبہ کیا کہ امیر ولاچیا کو پناہ نہ دی جائے اور ان قونصلوں کو معزول کر دیا جائے جو دولت علیہ کے خلاف رعایا کو ابھار رہے ہیں لیکن کیتھرائن نے اسے نامنظور کر دیا اور اس کے جواب میں بسرابیا کے صوبہ اور اوکزاکوف اور کرمان کے شہروں کا مطالبہ کیا، اس بنا پر کہ یہ علاقے پہلے خان کریمیا کے زیر نگیں تھے، جس کی مملکت اب روس میں شامل ہو گئی تھی، ترکوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، وہ اس توہین آمیز برتاؤ کو اب مطلق برداشت نہیں کر سکتے

تھے، جس کے ذریعہ سے کیتھرائن انھیں جنگ کے لیے برانگیختہ کر رہی تھی، مجبور ہو کر باب عالی نے ۱۵ر اگست ۱۷۸۷ء کو روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

انگلستان کا فریب | مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر باب عالی کی طرف سے اعلان جنگ بہر حال ناگزیر تھا، تاہم اسے جنگ کی ترغیب دینے میں انگلستان کے "دوستانہ مشوروں" کو بھی بہت کچھ دخل تھا، سفیر فرانس نے دولت عثمانیہ کی حمایت میں انگلستان سے اتحاد کرنے کی جو کوشش کی اور مسٹر فاکس نے روس کی دوستی کا جیسا کھلا ہوا ثبوت دیا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، بایں ہمہ انگلستان دولت علیہ کا ہمدرد بنا رہا اور دوستی کے پردہ میں دشمنی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، ایک طرف تو اس نے اس بات کی کوشش کی کہ فرانس اور دولت علیہ میں پھوٹ ڈال دے اور دوسری طرف اپنی مدد کا فریب دے کر باب عالی کو روس کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر آمادہ کر دیا، ژون کیٹر انگلستان کی اس پالیسی پر لوا لے کا حسب ذیل بیان نقل کرتا ہے:

> "انگلستان نے جس کے مشورے، جس کا توسط، جس کی غیر جانب داری ترکی کے حق میں سم قاتل کا کام کر رہی تھی، باب عالی کے سامنے فرانس کے اغراض کو بری روشنی میں پیش کیا اور یہ اتہام لگایا کہ فرانس دراصل اس سے عیاری اور بے وفائی کو کام میں لا رہا ہے اور دیوان کو ترغیب دی کہ وہ فرانسیسی تجاویز صلح کو رد کر دے، روس سے سازش کر کے اس نے باب عالی کو باور کرایا کہ روس دراصل خوف سے پیچھے ہٹ رہا ہے اور یہ کہ اسے سابقہ فتوح کے واپس لینے کا وقت آ گیا ہے، اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ آسٹریا کو لڑائی سے باز رکھے گا، سویڈن اور لہستان (پولینڈ) کو اس کی طرف سے لڑائی پر آمادہ کرے گا اور اپنی بحری قوت سے پوری مدد کرے گا۔"[1]

ترکوں کی ابتدائی شکست | اعلان جنگ کے بعد سلطان نے غازی حسن پاشا کو فوراً

---

[1] تاریخ دولت عثمانیہ (اردو ترجمہ) از ژون کیٹر، جلد اول، ص ۳۴۲۔

مصر سے واپس بلا لیا، جہاں وہ مملوکوں کی بغاوت فرو کرنے میں مشغول تھا اور اسے بحر اسود اور ملحق علاقوں کی بری اور بحری فوجوں کی کمان دے کر اوکزاکوف روانہ کیا تا کہ وہاں سے کلبرن پر حملہ آور ہو جو دریائے نیسٹر کے دہانہ پر اوکزاکوف کے بالمقابل دوسرے ساحل پر واقع تھا، کلبرن میں روسی فوج کا سپہ سالار سوارو تھا، جو اپنے وقت کا بہت مشہور جنرل تھا، اس نے عثمانی فوج کے نصف حصہ کو بغیر کسی مزاحمت کے دریا عبور کرنے دیا اور پھر دفعۃً اس پر حملہ کر دیا، ساتھ ہی روسی اور عثمانی بیڑوں میں بھی جنگ چھڑ گئی، جس کی وجہ سے بقیہ ترکی دستے اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے کلبرن نہ پہنچ سکے اور چھ سات ہزار سپاہی جو کلبرن کے ساحل پر اتر چکے تھے، سوارو کے اچانک اور شدید حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور قریب قریب سب لڑتے ہوئے مارے گئے، بحری جنگ میں بھی ترکوں کو شکست ہوئی اور حسن پاشا کے جہازوں کا بیشتر حصہ برباد ہو گیا۔

آسٹریا کا فریب اس کے بعد ۱۷۸۷ء کی بقیہ مدت میں پھر کوئی لڑائی نہیں ہوئی بلکہ موسم سرما کے مہینے فریقین نے آئندہ جنگ کی تیاریوں میں صرف کیے، ۱۷۸۸ء کے شروع میں سویڈن اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس کی وجہ سے کیتھرائن کو روسی فوجوں اور جہازوں کا معتد بہ حصہ بحر بالٹک اور اس کے ساحلی علاقوں کی طرف روانہ کر دینا پڑا، ابھی تک آسٹریا نے دولت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا، حالانکہ روس اور آسٹریا میں معاہدہ اتحاد ہو چکا تھا اور اس کی رو سے آسٹریا کو شروع ہی سے روس کا ساتھ دینا چاہیے تھا، وجہ یہ تھی کہ جب لڑائی شروع ہوئی اس وقت جوزف صوبہ نیدرلینڈز کی شورش فرو کرنے میں مشغول تھا، چنانچہ جب تک ادھر سے کسی حد تک اطمینان نہ ہو چکا اس نے دولت علیہ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا، برخلاف اس کے اس نے اپنے سفیر کے ذریعے باب عالی میں یہ پیغام بھیجا کہ وہ روس اور دولت عثمانیہ میں صلح کرا دینے کے لیے تیار ہے، لیکن ہمدردی اور دوستی کی یہ نمائش اسی وقت تک قائم رہی جب تک اسے اپنی سلطنت کی

اندرونی مشکلات کی طرف سے نجات نہ حاصل ہوئی، جوں ہی نیدرلینڈز کی شورش ختم ہوئی اس نے دولت علیہ کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، اعلان جنگ سے قبل ہی جب کہ وہ بظاہر روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے باب عالی کو اس فریب میں مبتلا رکھ کر بلغراد پر قبضہ کر لینا چاہا، چنانچہ ۲ دسمبر ۱۷۸۷ء کی شب میں آسٹرین فوج کے ایک دستہ نے بلغراد پر اچانک حملہ کر دیا، چوں کہ بقیہ دستے وقت پر پہنچ نہ سکے تھے، اس لیے یہ حملہ ناکام رہا اور قریب تھا کہ پورا دستہ ترکوں کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا لیکن آسٹرین کمانڈر نے بلغراد کے سرعسکر سے معافی مانگ کر اپنے سپاہیوں کی جان بچائی، سرعسکر نے ان حملہ آوروں کو صحیح وسالم واپس چلے جانے کی بھی اجازت دے دی، باب عالی نے حکومت آسٹریا کے اس شرم ناک طرز عمل کی شکایت جوزف سے کی اور اسے وہ زمانہ یاد دلایا جب شہنشاہ چارلس ششم کی وفات پر یورپ کی مسیحی سلطنتیں جنگ جانشینی کو برپا کر کے آسٹریا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھیں اور میریا تھریسیا کو اس کے حق سے محروم کر دینے پر تلی ہوئی تھیں لیکن دولت علیہ نے آسٹریا کے مصائب سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا، حالاں کہ اسے چارلس کے فریب کا بدلہ لینے کا بہت اچھا موقع تھا بلکہ اس کے برخلاف وہ انتہائی دیانت داری کے ساتھ اپنے معاہدہ کی پابند رہی اور آسٹریا کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے قطعی طور پر انکار کر دیا لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے کہ حکومت آسٹریا پر حرص وہوس کا اتنا غلبہ تھا کہ احسان مندی، ایمان داری اور وقار وعزت کے شریفانہ جذبات اس کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکے، چنانچہ ۱۰ فروری ۱۷۸۸ء کو جوزف نے دولت علیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

جوزف کو نہ صرف بوسنیا اور سرویا بلکہ مولڈیویا اور ولاچیا کی فتح کا حوصلہ بھی تھا، چنانچہ اس مہم کے لیے اس نے دولاکھ فوج اور دو ہزار توپیں فراہم کیں، طے یہ پایا کہ ایک روسی فوج مولڈیویا میں داخل ہو کر آسٹریا کی فوج کے ساتھ آگے بڑھے گی لیکن چوں کہ اس زمانہ

میں سویڈن اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی، اس لیے کیتھرائن آسٹریا کی مدد کے لیے دس ہزار سے زیادہ فوج روانہ نہ کر سکی، اسی معذوری سے روسی بیڑا بھی حسب وعدہ بحر الجین میں نہ پہنچ سکا، تاہم بحر اسود میں روس کا ایک طاقت ور بیڑا جنگ کے لیے تیار تھا اور روسی فوجیں بحر اسود اور بحر کاسپین کے درمیانی علاقوں میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، روس کی خاص فوج شہزادہ پوٹمکن کی سپہ سالاری میں دریائے بوگ کے قریب پڑی ہوئی تھی لیکن اگست ۱۷۸۸ء تک روسی فوجیں صرف تیاریوں میں مصروف رہیں اور کسی لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔

جوزف کی مضحکہ خیز شکست

باب عالی نے یہ دیکھ کر کہ روس کی طرف سے فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے، ایک زبردست فوج آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ کی، جس نے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے منڈیا کے مقام پر آسٹرین فوج کو شکست دی، جوزف اس شکست خوردہ فوج کی مدد اور ہنگری کی حفاظت کے لیے اسی ہزار سپاہیوں کے ساتھ فوراً روانہ ہوا اور سلاطنیہ میں خیمے نصب کر دیے جہاں سے قریب ہی صدر اعظم کا لشکر پڑا ہوا تھا لیکن بالکل آخر وقت میں جب کہ عثمانی لشکر پر حملہ کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں جوزف کو اپنی کامیابی میں شبہ پیدا ہوا اور اس کی ہمت چھوٹ گئی، وہ ایسا گھبرایا کہ فوراً ہی کوچ کا فیصلہ کر لیا، اس خطرہ سے کہ مبادا ترکوں کو خبر ہو جائے اور وہ دفعۃً حملہ کر دیں، واپسی نہایت خفیہ طور پر آدھی رات کو شروع ہوئی، آسٹرین فوج میں سخت اضطراب برپا تھا، وہ تیزی کے ساتھ تمیسوار کی طرف بھاگی جا رہی تھی، اتنے میں کسی طرف سے یہ خبر اڑ گئی کہ ترک پیچھا کرتے ہوئے آ رہے ہیں اور عن قریب حملہ کیا چاہتے ہیں، اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ ساری فوج میں انتہا درجہ کی بد حواسی پھیل گئی، توپ خانے پیچھے تھے اور پوری رفتار کے ساتھ بھگائے ہوئے لائے جا رہے تھے، پیدل سپاہیوں نے یہ سمجھا کہ ترک سر پر آ گئے، انھوں نے فوراً چھوٹے چھوٹے دستے قائم کر کے ہر طرف بے تحاشا گولیاں چلانی شروع کر دیں، جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ دستے خود ایک دوسرے ہی پر گولیاں چلا رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہی ہاتھوں سے

دس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، اس کے بعد ترکوں نے پہنچ کر دراصل حملہ کیا، آسٹرین پہلے ہی سے ہمت ہار چکے تھے، مقابلہ نہ کر سکے اور سراسیمہ ہو کر بھاگے، ان کے توپ خانوں اور لاؤ لشکر کا بڑا حصہ ترکوں کے ہاتھ آیا، جوزف کا شوق سپہ سالاری پورا ہو گیا، اس نے پھر کسی فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے کی جرأت نہیں کی، یہ واقعہ ستمبر کا تھا، نومبر میں آسٹریا اور دولت علیہ کے درمیان تین مہینہ کے لیے عارضی صلح ہو گئی، اس ایک سال کی مہم میں آسٹریا کے تیس ہزار آدمی میدان جنگ میں اور چالیس ہزار وبائی بیماریوں سے ہلاک ہو گئے تھے[1]۔

سقوط اوکزاکوف اگست ۱۷۸۸ء میں پوٹمکن نے اوکزاکوف کا محاصرہ شروع کر دیا تھا لیکن دسمبر تک یہ قلعہ فتح نہ ہو سکا، آخر میں عاجز آ کر اس نے جنرل سوارو کو مدد کے لیے بلایا، سوارو کے پہنچنے سے محاصرہ کی شدت بہت بڑھ گئی، آخری حملہ ۱۶ر دسمبر کو ہوا، چار ہزار روسی ترکی بندوقوں کی باڑھ سے ڈھیر ہو گئے لیکن سوارو تازہ دستے پے در پے آگے بھیجتا جاتا تھا، آخر میں روسیوں کی کثرت تعداد غالب آئی اور وہ قلعہ میں داخل ہو گئے، اندر پہنچنے کے بعد بھی ترکوں نے حیرت انگیز جاں بازی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، مگر روسی فوجوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو وہ زیادہ دیر تک روک نہ سکے، روسیوں نے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد قتل عام شروع کر دیا اور تین روز تک ناقابل ذکر درندگی کے ساتھ یہ خونیں کھیل کھیلتے رہے، بوڑھے، بچے اور عورتیں سب کے سب نہایت سفاکی سے تہ تیغ کر دیے گئے، چالیس ہزار کی آبادی میں سے صرف چند سو جانیں ”جن میں زیادہ تر بچے اور عورتیں تھیں“ روسیوں کی خوں خوار تلواروں سے سلامت بچ سکیں، یہ قلیل تعداد بھی بعض روسی افسروں کی ذاتی کوششوں سے بچ سکی۔

اوکزاکوف کے محاصرہ میں ایلجن، شہزادہ پوٹمکن کے ساتھ تھا، ترکوں کی شجاعت اور سرفروشی کے مناظر تو اس نے پہلے بھی دیکھے تھے مگر اس موقع پر وہ ان کے صبر و استقلال کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ ہو گیا، وہ لکھتا ہے:

---

[1] ایورسلے، ص ۲۲۱۔

”ترکی عورتیں اور بچے (جن کی تعداد چار سو تھی) اوزنا اوق کی فتح کے بعد جب شہر سے نکال کر روسی فوج کے پڑاؤ پر لائے گئے تو پہلی رات کو سب کے سب ایک خیمہ میں ٹھہرا دیے گئے، موجودہ حالات میں ان کے قیام کے لیے اس سے بہتر کوئی انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا، گو اس رات کو سخت برف باری ہو رہی تھی اور ان غریبوں کو سردی کی شدت اور کپڑوں کے نہ ہونے سے بے حد تکلیف تھی، ان میں بہتیرے زخموں کی شدید تکلیف میں بھی مبتلا تھے، چوں کہ میں ترکی زبان بولتا تھا، اس لیے مجھے ان کی حفاظت اور نگرانی کی خدمت سپرد کی گئی، میں نے دیکھا کہ ان سبھوں پر کامل سکوت طاری ہے، کوئی عورت نہ روتی ہے نہ آہ و فغاں کرتی ہے، حالاں کہ ان میں شاید ہر ایک کا باپ یا بچہ یا شوہر قتل ہو چکا تھا، یہ عورتیں سکون اور استقلال کے لہجہ میں بات کرتیں اور جو سوالات میں ان سے کرتا ان کے جواب بغیر کسی اضطراب کے دیتی ہیں، میں حیرت میں تھا اور یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی یہ حالت بے حسی کا نتیجہ ہے یا اس بات کا کہ انھوں نے قسمت کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے اور سہے ہیں اور یا پھر ان سب کا سبب تسلیم و رضا کی وہ تعلیم ہے جو ان کا مذہب انھیں دیتا ہے اور آج بھی میں اس کا سبب معلوم کرنے سے ویسا ہی قاصر ہوں، ان میں سے ایک عورت خاموش لیکن غیر معمولی طور پر غمگین انداز میں بیٹھی ہوئی تھی، میرا جی چاہا کہ اسے کچھ تسلی دوں، چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ تو کیوں نہیں ہمت سے کام لیتی اور مصیبت کو ایک مسلمان کی طرح برداشت کرتی جیسے کہ تیری ساتھی عورتیں برداشت کر رہی ہیں، اس نے میرا جواب ان مؤثر الفاظ میں دیا ”میں نے اپنے باپ، اپنے شوہر اور اپنے بچوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے، اب میرا ایک ہی بچہ رہ گیا ہے“ میں نے جلدی سے پوچھا کہ وہ بچہ کہاں ہے؟ اس نے سکون کے ساتھ جواب دیا کہ ”یہ ہے“ اور ایک بچے کی طرف اشارہ کیا جو اس کے پہلو میں پڑا ہوا تھا اور جس نے اسی وقت دم توڑا تھا، میں اور وہ لوگ جو میرے ساتھ تھے، بے اختیار رو پڑے لیکن وہ ذرا بھی نہیں روئی، اس رات کو میں ان مصیبت زدہ

عورتوں اور بچوں کو زخموں اور سردی کی تکلیف سے مررہے تھے اپنے گرم زمین دوز کمرے میں لے گیا اور جتنے آدمیوں کی اس میں گنجائش تھی، ان کو وہاں ٹھہرایا، وہ لوگ بارہ روز میرے ساتھ رہے لیکن اس پوری مدت میں ان میں سے کسی ایک نے بھی نہ کوئی شکوہ کیا اور نہ اپنے شدید اندرونی صدمہ کو ظاہر ہونے دیا، بلکہ ہر عورت خواہ وہ بوڑھی ہو یا جوان اپنی سرگزشت مجھ سے اس طرح بیان کرتی تھی جیسے وہ کسی غیر متعلق آدمی کا قصہ کہہ رہی ہو، بغیر فریاد، بغیر ٹھنڈی سانسوں اور بغیر آنسوؤں کے۔[1]"

سلطان کی وفات دوسرے سال مارچ ۱۷۸۹ء میں صدر اعظم یوسف پاشا تازہ فوجوں کے ساتھ آسٹریا کی مہم پر روانہ ہوا، اس نے فوج کا ایک حصہ پیچھے چھوڑ دیا تاکہ ولاچیا اور مولڈیویا میں غنیم کی نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہے اور خود ۷۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ دریائے ڈینوب کو عبور کر کے ٹرانسلوینیا میں داخل ہو گیا، وہاں سے اس کا قصد خود آسٹریا پر چڑھائی کرنے کا تھا لیکن ۷/اپریل ۱۷۸۹ء کو سلطان عبدالحمید کا انتقال ہو گیا اور سلیم ثانی کی تخت نشینی کے ساتھ ہی صدارت کے عہدہ پر بھی ایک دوسرا آدمی مقرر کیا گیا، نیا صدر اعظم ودین کا سابق والی تھا، فوجی لیاقت کے اعتبار سے وہ صدر اعظم کے عہدہ کا بالکل مستحق نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف پاشا کہ مہم فسخ کر دی گئی اور عثمانی فوجیں ٹرانسلوینیا سے واپس بلالی گئیں۔

---

[1] کریسی، جلد ۲ ص ۲۹۳-۲۹۲، فٹ نوٹ۔

سلیم ثالث

۱۲۰۳ھ تا ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء

سلطان سلیم خاں ثالث ستائیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، وہ فطرتاً بہت ذہین اور حوصلہ مند تھا اور اس کے چچا سلطان عبدالحمید اول نے اس کی تعلیم و تربیت خاص توجہ کے ساتھ کی تھی، دولت عثمانیہ کے مروجہ دستور کے مطابق سلیم کو بھی عبدالحمید کے عہد حکومت میں نظر بند رہنا پڑا تھا لیکن یہ نظر بندی محض برائے نام تھی، سلطان مرحوم کی غیر معمولی شفقت نے اسے بہت زیادہ آزادی دے رکھی تھی، جس سے فائدہ اٹھا کر اس نے امور سلطنت سے متعلق بہت کچھ مفید معلومات حاصل کر لیے تھے، اس کے احباب میں ایک اطالوی طبیب لورنزو (Lorenzo) نامی تھا، اس کے ذریعہ سے اس نے مغربی یورپ کی سلطنتوں کے ملکی اور فوجی دستور و قوانین سے بھی کافی واقفیت حاصل کر لی تھی اور وہ اسباب بھی معلوم کر لیے تھے، جنھوں نے مغربی قوموں کو آل عثمان کے مقابلہ میں نمایاں طور پر فائق و ممتاز بنا دیا تھا، اس نے شاہ فرانس اور اس کے بعض وزراء سے خفیہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم کر رکھا تھا اور سلطنت عثمانیہ میں اصلاحات جاری کرنے کے بارہ میں ان سے مشورہ کیا کرتا تھا، اس کے والد مرحوم سلطان مصطفیٰ خان ثالث نے اس کے لیے اپنے عہد حکومت کی ایک سرگذشت چھوڑی تھی، جس میں اس عہد کے خاص خاص واقعات، ترکوں کے انحطاط و

زوال اور نظام سلطنت کے فساد و انتشار پر مفصل تبصرہ تھا اور آخر میں ان خرابیوں کو دور کرنے کی وصیت بھی درج تھی، چنانچہ تخت پر آنے سے پہلے ہی سلیم اصلاحات کے لیے تیار ہو چکا تھا اور زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد غالباً سب سے پہلا کام یہی کرتا لیکن روس و آسٹریا سے جنگ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا، اس لیے اس کو ساری توجہ اسی جانب مبذول کرنی پڑی اور اصلاحات کو مجبوراً کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دینا پڑا۔

جنگ کا سلسلہ شہنشاہ جوزف گذشتہ تجربہ کی بنا پر تیز علالت کی معذوری سے خود میدانِ جنگ میں نہ آسکا اور آسٹرین فوج کی کمان مارشل لوڈن (Loudon) کے سپرد کی جو جنگ ہفت سالہ کا ایک آزمودہ کار اور مشہور جنرل تھا، لوڈن نے بوسنیا اور سرویا پر حملہ کیا اور ان دونوں صوبوں میں اسے کامیابی ہوئی، سرویا کی عیسائی رعایا نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن بوسنیا کی مسلمان آبادی جاں بازی سے مقابلہ کرتی رہی، بہرحال بوسنیا اور سرویا کے بیشتر حصوں پر لوڈن نے قبضہ کر لیا، آسٹریا کی ایک دوسری فوج شہزادہ کوبرگ (Coburg) کی سرکردگی میں جنرل سوارو کی روسی فوج کے ساتھ مولڈیویا کی طرف بڑھی، سلطان سلیم نے ان کے مقابلہ میں حسن پاشا کو سالار عسکر بنا کر روانہ کیا، حسن پاشا ایک بڑی فوج کے ساتھ شہزادہ کوبرگ کی طرف بڑھا جو مولڈیویا کی سرحد پر فوکشانی میں پڑا ہوا تھا، کوبرگ کی شکست یقینی تھی اگر سوارو ۳۶ گھنٹے کے اندر ساٹھ میل کا دشوار گزار پہاڑی راستہ طے کر کے اس کی مدد کو عین وقت پر نہ پہنچ گیا ہوتا، اس نے ترکی حملہ کا انتظار نہ کیا بلکہ پہنچنے کے چند ہی گھنٹوں کے بعد خود حسن پاشا کے لشکر پر حملہ کر دیا، یہ حملہ پوری طرح کامیاب رہا، ترکوں کے پیر اکھڑ گئے اور ان کا تمام توپ خانہ اور بہت زیادہ سامان غنیم کے ہاتھ آیا، اس کے بعد سلطان نے ایک دوسری فوج روانہ کی، جس سے ۱۶؍ ستمبر ۱۷۸۹ء کو دریائے رمنک کے قریب جنرل سوارو کی فوج سے سخت مقابلہ ہوا، اس معرکہ میں بھی ترکوں کو شکست ہوئی، ان پے در پے شکستوں سے قسطنطنیہ میں سخت شورش پھیلی اور لوگوں نے سارا الزام سالار

عسکر حسن پاشا کے سر عائد کر کے سلطان سے اس کے قتل کا مطالبہ کیا، حسن پاشا دولت علیہ کی خدمت میں بوڑھا ہو گیا تھا اور اس نے سلطنت کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے لیکن اس شورش کے فرو کرنے کے لیے سلیم کو مجبوراً اس کے قتل کا حکم دینا پڑا، اسی سال بلغراد اور سمندریا پر بھی آسٹریا کا قبضہ ہو گیا، ۱۷۹۰ء میں آسٹریا اور روس کی فوجیں متحدہ طور پر قسطنطنیہ کی جانب بڑھنے والی تھیں لیکن دو وجوہ سے یہ مہم ناتمام رہی۔

آسٹریا سے صلح | پہلی بات تو یہ ہوئی کہ شہنشاہ جوزف نے اپنی وسیع سلطنت میں جو اصلاحات جاری کی تھیں، ان کے خلاف سلطنت کے تقریباً ہر حصہ میں بغاوت برپا ہو گئی اور اسے مجبوراً اپنی فوجیں اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ترکوں کے مقابلہ سے ہٹا لینی پڑیں، دوسرا سبب یہ ہوا کہ ۱۷۹۰ء ہی میں جوزف کا انتقال ہو گیا اور اس کا جانشین اس کا بھائی گرانڈ ڈیوک لیوپولڈ (Leopold) ہوا، وہ شروع ہی سے اپنی سلطنت کے اندرونی خلفشار اور حکومت پرشا کی دراز دستیوں کے اندیشہ سے دولت عثمانیہ سے ایک باعزت صلح کر لینے کا خواہش مند تھا، علاوہ بریں وہ دولت عثمانیہ کے خلاف روس سے اتحاد کرنے کو سلطنت آسٹریا کے لیے کچھ مفید نہیں خیال کرتا تھا، چنانچہ چند چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے بعد جن میں سے ایک میں آسٹرین فوج نے اورسوا پر قبضہ کر لیا اور دوسری میں گرجیوو کے قریب میدان ترکوں کے ہاتھ رہا، باب عالی اور آسٹریا کے درمیان عارضی طور پر صلح ہو گئی، جس کا تکملہ ۴/ اگست ۱۷۹۱ء کو صلح نامہ سستوا (Sislsva) کے ذریعہ کر دیا گیا، اس صلح نامہ کی ترتیب میں انگلستان، پرشا اور ہالینڈ کی وساطت کو خاص دخل تھا، اس کے رو سے آسٹریا نے وہ تمام علاقے جو دوران جنگ میں بوسنیا، سرویا اور ولاچیا کے صوبوں میں فتح کیے تھے اور جن میں بلغراد اور سمندریا کے اہم قلعے بھی شامل تھے، دولت عثمانیہ کو واپس کر دیے، صرف کروشیا کے ایک مختصر سے خطہ اورسوا کے قدیم شہر پر اپنا قبضہ باقی رکھا۔

یونانیوں کی بغاوت | لیکن کیتھرائن نے دولت علیہ سے صلح کرنے میں انگلستان پرشا

اور ہالینڈ کی وساطت قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا، حالاں کہ ان ہی کی مداخلت سے اسے سویڈن کے ساتھ صلح کرنی پڑی تھی، وہ اب تک قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہی تھی اور فخریہ کہتی تھی کہ اگر مغربی سلطنتیں اسے سینٹ پیٹرس برگ چھوڑنے پر مجبور کریں گی تو وہ قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنائے گی، اسی مقصد سے اس نے یونانیوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف بھڑکانے کی پوری کوشش کی اور ۱۷۸۹ء میں جنگ شروع ہونے سے قبل یونان کے ہر حصہ میں اپنے نمائندے بھیج کر وہاں کے باشندوں کو بغاوت کے لیے تیار کر دیا، چنانچہ ۱۷۹۰ء میں یونان کے چند ممتاز آدمیوں کا ایک وفد بھی اس کی خدمت میں سینٹ پیٹرس برگ حاضر ہوا اور ترکوں کے آزادی حاصل کرنے کے لیے اس سے فوجی مدد کی استدعا کی، کیتھرائن نے مدد دینے کا وعدہ کیا، پھر وفد شہزادہ قسطنطین کے پاس گیا، جسے کیتھرائن نے بازنطینی سلطنت کا پہلا تاج دار نامزد کیا تھا، قسطنطین نے ارکان وفد سے یونانی زبان میں کہا، جاؤ تم جیسا چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا، یونانیوں نے تیرہ جہازوں کا ایک بیڑا تیار کر رکھا تھا، کیتھرائن نے اس کے لیے توپیں فراہم کر دیں اور ایک یونانی افسر لمبرو کویزیانی (Lambro Caviaziani) کو اس بیڑہ کا امیر البحر مقرر کیا لیکن جب بحر ایجین میں عثمانی جہازوں سے مقابلہ ہوا تو پورا یونانی بیڑا شکست کھا کر غرق ہو گیا۔

سقوط اسمٰعیل بحری جنگ کا یہ نتیجہ کیتھرائن کے لیے زیادہ تشویش کا باعث نہ ہوا کیوں کہ اس کی بری فوجیں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، ۱۷۹۰ء کو سب سے بڑا معرکہ اسمٰعیل کی فتح تھی، جو بحر اسود سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر دولت عثمانیہ کا ایک نہایت اہم قلعہ تھا، روسی فوجوں کے بلغاریا میں داخل ہونے کے لیے اس قلعہ کی فتح نہایت ضروری تھی، پوٹمکن نے مہینوں اس کا محاصرہ جاری رکھا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی، آخر میں اس نے یہ مہم جنرل سوارو کے سپرد کی، سوارو نے ۱۶ر دسمبر کو کمان اپنے ہاتھ میں لی اور ۲۲ر دسمبر کو روسی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں، ترکی دستہ نے مدافعت میں جاں بازی کا حق ادا کر دیا۔

روسیوں کو اصلی مقابلہ شہر میں داخل ہونے کے بعد پیش آیا، بقول کریسی ہر سڑک ایک میدان جنگ تھی اور ہر مکان ایک قلعہ تھا، آخر میں روسی ہر طرف قتل عام کرتے ہوئے تاف شہر میں پہنچے جہاں ترکوں اور تاتاریوں کا ایک دستہ عثمانی شجاعت کے حیرت انگیز جوہر دکھانے کے لیے اکٹھا ہو گیا تھا، دو گھنٹے نہایت سخت لڑائی ہوتی رہی، یہاں تک کہ اس دستہ کا ایک ایک سپاہی لڑتے ہوئے مارا گیا، اس جنگ میں چونتیس ہزار ترک ہلاک اور دس ہزار گرفتار ہوئے، روسیوں نے شہر میں داخل ہو کر درندگی کی جو مثال پیش کی اس سے خود سوراروف کی نگاہیں بھی ناآشنا تھیں، چنانچہ اس نے اپنے ایک دوست سے بعد میں اعتراف کیا کہ اس ناقابل دید منظر کو دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے تھے[1]۔

صلح کی گفتگو | سلطان سلیم نے روس کے مقابلہ میں تازہ فوجیں روانہ کیں لیکن انہیں بھی شکست ہوئی، اس درمیان میں انگلستان، پرشا اور ہالینڈ صلح کے لیے برابر کوشش کر رہے تھے، شروع میں تو کیتھرائن نے ان کی مداخلت کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور شاہ پرشا کو یہ جواب لکھوا دیا کہ "زارینہ جنگ و صلح میں صرف اپنی خواہش کی پابند ہے اور امور مملکت میں کسی کی مداخلت گوارا نہ کرے گی" لیکن جب اکتوبر ۱۷۹۱ء میں جنگ کے سب سے بڑے محرک اور حامی پوٹمکن کا انتقال ہو گیا اور اتحاد ثلاثہ (انگلستان، ہالینڈ اور پرشا) کی طرف سے بھی اصرار بڑھتا ہی گیا تو مجبوراً کیتھرائن نے صلح کے شرائط پر گفتگو کرنا منظور کر لیا، اتحادیوں نے روس کے سامنے بھی وہی شرط پیش کی، جس پر آسٹریا کو رضامند کیا گیا تھا، یعنی فریقین دوران جنگ کے تمام مفتوحات سے دست بردار ہو جائیں لیکن کیتھرائن کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئی اور صلح سے صاف انکار کر دیا، وہ کم از کم اوکزاکوف اور دریائے نیسٹر و دریائے بوگ کے درمیانی علاقہ پر اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتی تھی، اتحادی اس پر رضامند نہ تھے اور انہوں نے روس پر دباؤ ڈالنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

---

[1] ایورسلے، ص ۲۳۱۔

انگلستان کی نئی پالیسی انگلستان کے لیے روس کی مخالفت ایک بالکل نئی چیز تھی، اٹھارہویں صدی کے بیشتر حصہ میں روس کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے اور اس نے کبھی ان جارحانہ تجاویز کی مخالفت نہیں کی جو دولت عثمانیہ کے خلاف حکومت روس کے پیش نظر تھیں اور جن پر وہ استقلال کے ساتھ عمل کرتی چلی آرہی تھی، لارڈ چیتھم (Lord Chatham) وزیر اعظم برطانیہ جس کی سیاست خارجہ پر اب تک عمل درآمد تھا، ترکوں کی حمایت کا مستقل طور پر مخالف تھا، یہ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۷۸۴ء میں کیتھرائن نے کریمیا کو زبردستی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تو انگلستان میں اس کے خلاف ایک آواز بھی بلند نہیں ہوئی، برخلاف اس کے چارلس فاکس نے جو اس وقت وزیر خارجہ تھا، علانیہ کہا کہ ”میری سیاست خارجہ ایک عمیق بنیاد پر قائم ہے، شمالی طاقتوں (بہ شمول روس) سے اتحاد رکھنا ہر روشن خیال انگریز کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔“[1] اسی بنا پر جب ۱۷۹۱ء میں انگلستان کے نوجوان وزیر اعظم مسٹر پٹ (Pitt) نے حکومت کی قدیم سیاست سے جس پر خود اس کا باپ لارڈ چیتھم شدت سے عامل تھا، انحراف کرکے دولت عثمانیہ کی حمایت میں روس کو صلح کے لیے مجبور کرنا چاہا تو اور پارلیمنٹ سے ایک جنگی بیڑہ کی تیاری کے لیے روپیہ کی درخواست کی تاکہ اگر کیتھرائن اتحادیوں کی وساطت کو مسترد کردے اور صلح کے لیے راضی نہ ہو تو اسے جنگی جہازوں کے ذریعہ راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے، تو انگلستان میں اس تحریک کی پرزور مخالفت کی گئی اور پارلیمنٹ میں فاکس نے جو اب مخالف پارٹی کا لیڈر تھا، نہایت شدت کے ساتھ اختلاف کیا، پٹ نے اس بیڑہ کو پرشا کے تحفظ اور یورپ میں توازن قوت کے قائم رکھنے کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے اپنی تقریر میں اصلی زور انہی دو مقاصد پر دیا، اس نے بتایا کہ ترکوں کی حمایت مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ ان مقاصد کے حصول میں دولت عثمانیہ کی بقا معین ہوتی تھی، پارلیمنٹ میں اس مسئلہ پر کئی بار بحثیں ہوئیں جن میں

---

[1] ایورسلے، ص ۲۳۲

مخالف پارٹی کے مقرروں نے ترکی کو محض ایک وحشی ملک ٹھہرایا اور کہا کہ نہ یورپ کے نظام مملکت میں اسے کوئی دخل ہے اور نہ اس کے حشر کا کوئی اثر توازن قوت پر پڑ سکتا ہے، انہوں نے کیتھرائن کی فراخ دلی اور عالی ظرفی کی تعریف و تحسین میں واقعات کو نظر انداز کر دیا اور روس کی دراز دستیوں کی طرف سے جو خطرہ مسٹر پٹ نے یورپین مملکتوں سے متعلق ظاہر کیا تھا، اس کا خوب مضحکہ اڑایا، فاکس نے کہا کہ سلطنت عثمانیہ پر روس کا قبضہ ہو جانا ایک خلاف قیاس بات ہے اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو بہتر ہی ہوگا، اس کی جماعت کے ایک رکن مسٹر وہٹ بریڈ (Whotbread) تھے، انہوں نے فرمایا ''فرض کیجیے کہ زارینہ کے قصد و ارادہ کی نسبت جو باتیں بیان کی جاتی ہیں وہ سب پوری بھی ہو جائیں اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے ترکوں کو ان کے تمام یورپین صوبوں سے نکال دے تو بھی کیا کوئی غیر جانب دار شخص اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اس واقعہ سے نوع انسانی کو بہت کچھ فائدہ پہنچے گا''[1] ۱۷۹۲ء کے سیشن میں اس مسئلہ پر پھر بحث ہوئی اور مسٹر پٹ نے واضح طور پر بیان کیا کہ آئندہ انگلستان کی سیاست خارجہ کا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ یورپ میں توازن کو قائم رکھا جائے اور اسی بنا پر جہاں تک ممکن ہو نہ سلطنت روس کی قوت کو بڑھنے دیا جائے اور نہ سلطنت عثمانیہ کی قوت کو گھٹنے دیا جائے[2]۔

فاکس وغیرہ کی شدید مخالفت کے باوجود پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے پٹ کی تجویز منظور کر لی لیکن پٹ کو اس کا اندازہ بہ خوبی ہو گیا تھا کہ رائے عامہ روس سے جنگ کرنے کی مخالف ہے، چنانچہ اس نے اپنی تجویز واپس لے لی اور روس کے مقابلہ میں جنگی بیڑہ بھیجنے کا خیال ترک کر دیا لیکن وہ روس کی قوت کو بڑھنے دینے پر کسی طرح تیار نہ تھا، اس کے نزدیک روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جلد سے جلد صلح ہو جانا نہایت ضروری تھا، اس غرض سے وہ کیتھرائن پر برابر دباؤ ڈالتا رہا۔

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۳۰۸ [2] ایضاً، ص ۳۰۹۔

صلح نامۂ یاسی کیتھرائن بھی اب صلح کے لیے آمادہ معلوم ہوتی تھی، پولینڈ کے جو صوبے روس، آسٹریا اور پرشا کی غاصبانہ تقسیم کے بعد اہل ملک کے زیر حکومت باقی رہ گئے تھے، ان میں محبان وطن نے کوسی اسکو (Kosciusko) کے زیر قیادت اصلاحات شروع کر دی تھیں، جو کیتھرائن کے مصالح کے منافی تھیں، وہ پولینڈ کی دوسری تقسیم کا عزم کر چکی تھی اور اب چاہتی تھی کہ ترکوں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جنرل سوارو کو روس کی فتح مند اور آزمودہ کار فوجوں کے ساتھ پولینڈ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کرے، چنانچہ ۱۷۹۱ء کے وسط ہی سے صدر اعظم اور جنرل ریپنن میں صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور اگست میں تمام شرائط طے ہو گئے، ۹ رجنوری ۱۷۹۲ء کو یاسی کے مقام پر فریقین میں باضابطہ طور پر ایک صلح نامہ مرتب ہو گیا، اس کی ترتیب و تکمیل میں کوئی دوسری حکومت شریک نہیں کی گئی، روس نے قلعہ اوزاکوف اور دریائے نیسٹر اور دریائے بوگ کے درمیانی علاقہ کے علاوہ تمام فتوحات جو بسرابیا، مولڈیویا، ولاچیا اور کیوبان کے صوبوں پر مشتمل تھیں، دولت عثمانیہ کو واپس کر دیں اور دریائے نیسٹر سلطنت روس کی نئی سرحد قرار پایا، جس کے مغرب کے تمام مفتوحہ علاقے سلطنت عثمانیہ کو واپس کر دیے گئے، یونان بدستور باب عالی کے زیر حکومت رہا، اس صلح نامہ کے رو سے کیوبان کا صوبہ بھی دولت علیہ کو واپس مل گیا لیکن اس علاقہ میں جو چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہوئی تھیں ان پر زارینہ کی سیادت تسلیم کر لی گئی۔

کیتھرائن کی موت کیتھرائن نے یہ صلح محض حالات سے مجبور ہو کر کی تھی اور اس سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ پولینڈ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد پوری تیاری کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے یورپی اور ایشیائی صوبوں پر بیک وقت حملہ کر دے، چنانچہ چار سال کے اندر اس نے پولینڈ پر اپنا تسلط مکمل طور پر قائم کر لیا، ۱۷۹۳ء میں پولینڈ کی دوسری تقسیم عمل میں آئی جس میں کیتھرائن اور فریڈرک نے آسٹریا کو شریک نہیں کیا لیکن ۱۷۹۵ء میں جب یہ بدقسمت ملک آخری طور پر تقسیم کیا گیا تو اس لوٹ میں روس، پرشا اور آسٹریا تینوں

شریک ہوئے، غرض پولینڈ کی طرف سے مطمئن ہو کر کیتھرائن نے سلطنت عثمانیہ پر حملہ کی تیاریاں فوراً شروع کر دیں، اس نے تین لاکھ فوج اور ایک زبردست فوجی بیڑہ تیار کیا تھا اور جنگ کا اعلان بہت جلد کرنے والی تھی لیکن قضا نے مہلت نہ دی اور ۱۷۹۶ء میں اس کی موت کی وجہ سے یہ مہم جو دولت عثمانیہ کے لیے غالباً روس کی سابق جنگوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی ملتوی ہو گئی۔

ملکی نظم و نسق سلطان سلیم نے صلح نامہ یاسی کے بعد اپنی ساری توجہ ملکی اصلاحات پر مرکوز رکھی چاہی کیوں کہ سلطنت کے ہر شعبہ خصوصاً محکمۂ فوج کی حالت حد درجہ خراب تھی لیکن چند ہی سال کے بعد فرانس سے جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے اصلاحات کا کام جو شروع کر دیا گیا تھا ملتوی ہو گیا، اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ کے نظم و نسق کی جو حالت تھی اس کا اندازہ کریسی کے صفحات سے بخوبی ہوتا ہے، ہم اس کے بیان کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں:

پاشا سلیم کی سلطنت میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کی چھبیس ولایتیں شامل تھیں، یہ ولایتیں ایک سو تر سٹھ علاقوں میں تقسیم تھیں جن کو لوا کہتے تھے، ہر لوا میں متعدد قضا یا ضلع ہوتے تھے، ہر قضا اپنا انتظام خود کرتا اور وہ عموماً ایک شہر اور اس کے ماتحت علاقوں پر مشتمل ہوتا یا ایک ضلع (ناحیہ) پر جس میں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قصبے یا گاؤں شامل ہوتے تھے، ولایت کا حاکم ایک پاشا ہوتا تھا جسے "سہ اسپ دم" نشان عطا ہوتا تھا[1]، ایسے پاشا کا منصب ایک وزیر کے منصب کے برابر ہوتا، وہ اپنی ولایت کے ایک یا چند خاص لواؤں پر براہ راست حکومت کرتا، بقیہ لواؤں کے مقامی حکام پر وہ ایک عام سیادت رکھتا تھا، بعض لواؤں کی

---

[1] یہ عثمانی فوج کا نشان تھا، گھوڑے کی دم نیزہ کے سرے پر باندھ دی جاتی تھی اور پاشاؤں کے منصب کے لحاظ سے دموں کی تعداد معین ہوتی تھی، چنانچہ درجہ اول کے پاشا "پاشائے سہ نشان" اور درجہ دوم و سوم کے "پاشائے دو نشان" یا "پاشائے یک نشان" کہے جاتے تھے۔

حکومت ایسے پاشاؤں کے سپرد تھی جو "پاشائے دونشان" تھے، ان ہی لواؤں اور ولایتوں کو عموماً پاشالق کہتے تھے، عام طور پر پاشاؤں کا تقرر ہر سال ہوتا تھا لیکن اگر کوئی پاشا اتنا طاقت ور ہوتا کہ اسے برطرف کرنے میں باب عالی کو بغاوت کا اندیشہ ہوتا یا وہ دیوان عالی کے بعض وزراء کو رشوت کے ذریعہ سے اپنا حامی بنائے رکھتا تو ایک ہی شخص کئی کئی سال تک بلکہ کبھی کبھی تمام عمر اپنے عہدہ پر مامور رہتا، بائیس لواؤں کے پاشا مدت العمر کے لیے مقرر ہوتے تھے۔

اعیان | انتظام کے سلسلہ میں پاشا کی مدد کے لیے باب عالی کی طرف سے دو یا تین آدمی مقرر کیے جاتے تھے، جن کا انتخاب اس ولایت (صوبہ) کے باشندے کرتے تھے، یہ لوگ اعیان کہلاتے تھے، کبھی کبھی اعیان کا عہدہ موروثی ہوتا تھا لیکن اس صورت میں یہ ضروری تھا کہ نئے اعیان کو اپنے مورث کی جگہ پر مقرر ہونے کے لیے باشندوں کی کثرت رائے حاصل ہو، عیسائی رعایا کے افسران ہی کی قوموں میں سے مقرر کیے جاتے تھے، جو ٹیکس ان کے ضلع پر لگایا جاتا تھا اس کی تشخیص افراد پر یہی افسر کیا کرتے تھے۔

باب عالی کا ضعف گو اٹھارہویں صدی کے آخر تک سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبے ہاتھ سے نکل گئے تھے، مثلاً ہنگری، ٹرانسلوینیا اور کریمیا میں اس کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، نیز بحر اسود اور بحر ازوف کے شمالی ساحلی علاقوں سے بھی اس کا قبضہ اٹھ چکا تھا، تاہم سلطنت کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا، وہ اس وقت بھی دنیا کی عظیم الشان سلطنتوں کا ہم پلہ تھا لیکن اس وسیع سلطنت کے بیشتر صوبوں پر سلطان کی حکومت محض برائے نام تھی، باب عالی کی کمزوری اور مقامی حکام کی خودسری قریب قریب ہر جگہ نمایاں تھی، عرب میں وہابیوں کا زور تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ جن پر ابھی تک ان کا قبضہ نہ ہوا تھا، باقی سارا ملک ان ہی کے زیر تسلط تھا، مصر میں باب عالی کے حکام کا اقتدار ختم ہو چکا تھا، اگرچہ قاہرہ میں سلطان کا علم اب بھی لہرا رہا تھا، اسی طرح شام میں دروزیوں اور لبنان اور فلسطین کے پہاڑی باشندوں نے تقریباً خودمختاری حاصل کر لی تھی، یونان کے شمالی علاقوں کے بعض فرقے بھی

خودمختار ہو گئے تھے، مونٹی نیگرو اور ہرزیگووینا کا بھی یہی حال تھا، مولڈیویا اور ولاچیا دولت عثمانیہ کو واپس کر دیے گئے تھے مگر یہ دونوں صوبے باب عالی سے زیادہ حکومت روس کے زیر اثر تھے، بغاوت اور خانہ جنگی بڑے بڑے پاشاؤں کا عام شیوہ تھا، مثلاً عکہ میں جزار پاشا نے محصول اور خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور سلطان کے آدمیوں کو جو یہ رقمیں وصول کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے قتل کرا دیا تھا، پاشائے بغداد کی خودسری بھی ایسی ہی تھی، چنانچہ کئی سال تک بغداد کی ولایت سے باب عالی کو کچھ بھی رقم وصول نہ ہوئی، ودین کا مشہور پاشا پزوان اوغلو سالوں افواج سلطانی کا مقابلہ کرتا رہا اور قریبی صوبوں پر ایک خودمختار فرماں روا کی طرح وقتاً فوقتاً حملے کیا کرتا تھا، ان کے علاوہ بہت سے دوسرے پاشاؤں کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی، ان تمام بغاوتوں اور شورشوں کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کے بہت کم حصہ میں امن و امان قائم تھا اور نہ عام طور پر رعایا بے اطمینان اور جان و مال کی طرف سے خطرہ میں مبتلا تھی۔

رعایا کے مصائب جن صوبوں کے پاشا باب عالی کے مطیع و منقاد بھی ہوتے وہاں بھی رعایا کے مصائب تھوڑے نہ تھے، پاشاؤں کا تقرر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا عموماً سالانہ ہوا کرتا تھا اور اکثر رشوت کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا تھا، خود امیدوار کے پاس اس جلیل القدر عہدہ کی "خریداری" کے لیے کافی روپیہ مشکل سے ہوتا تھا، وہ عموماً کسی دولت مند یونانی یا ارمنی ساہوکار سے روپیہ قرض لیتا تھا اور وہ ساہوکار درحقیقت اس پاشا ہی کا مرتہن ہو جاتا تھا، اس کا ایک معتمد ایجنٹ پاشا کے ساتھ سکریٹری کی حیثیت سے رہا کرتا تھا اور اکثر وہی صوبہ کا اصلی حکمراں ہوتا تھا، یہ عیسائی ایجنٹ اپنی ہم مذہب رعایا کو خصوصیت کے ساتھ بہت ستاتے تھے، چوں کہ پاشا کو ہر سال اپنے عہدہ کی "خریداری" کے لیے روپیہ کی ضرورت ہوا کرتی تھی، اس لیے ساہوکار کی گرفت سے آزاد ہونا آسان نہ تھا، کبھی کبھی باب عالی کی طرف سے یہ مطالبہ بھی ہوتا تھا کہ امیدوار سرکاری مال گزاری کی بروقت ادائگی کے لیے کسی ارمنی صراف (ساہوکار) کی ضمانت پیش کرے، اس سے ساہوکاروں کا اقتدار اور بھی

بڑھ گیا تھا اور ان کا دست ستم رعایا پر زیادہ دراز ہوتا جاتا تھا، ان ساہوکاروں کے ایجنٹ رعایا سے مال گزاری وصول کرنے میں بے حد سختی کرتے تھے اور وصول کردہ رقم کا زیادہ سے زیادہ حصہ خود دبا لینے کی کوشش کرتے تھے، نتیجہ یہ تھا کہ محاصل کا بہت تھوڑا حصہ باب عالی میں پہنچتا تھا، اعیان ولایت جن کا فرض تھا کہ اپنے ہم وطنوں کو پاشا اور اس کے ٹیرے ساتھیوں کے مظالم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے، اکثر خود بھی شریک جرم ہو جاتے تھے، اعیان میں سے اگر کوئی ایمان دار شخص ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تو پاشا اس کا سخت مخالف ہو جاتا اور جھوٹے الزامات عائد کر کے قاضی کی عدالت کے ذریعہ اسے تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرتا، اس خوف سے اعیان بھی پاشا کی مخالفت کرتے ہوئے ڈرتے تھے، سالانہ مال گزاری اگر پابندی کے ساتھ خزانہ سلطانی میں پہنچتی رہتی تو باب عالی کی طرف سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی کہ یہ رقم کن جائز یا ناجائز طریقوں سے وصول کی گئی ہے، البتہ اگر پاشا کے خلاف صوبوں کے باشندوں کی طرف سے پر زور شکایتیں باب عالی میں پہنچتیں اور تحقیقات کرنے پر وہ صحیح ثابت ہوتیں تو پاشا نہ صرف معزول کر دیا جاتا بلکہ اسے قتل کی سزا بھی دی جاتی لیکن اس سزا سے رعایا کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، کیوں کہ مقتول پاشا کی تمام املاک بحق سلطانی ضبط کر لی جاتی اور اس کی جگہ پر کوئی دوسرا پاشا مقرر کر دیا جاتا، جو مذکورہ بالا وجوہ سے ساہوکاروں ہی کی گرفت میں رہتا اور وہ بھی عموماً وہی طریقے اختیار کرتا جو اس کے پیش رو نے اختیار کیے تھے، ان تعدیوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پاشا اپنی ولایتوں میں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ رہا کرتے تھے جس کے قائم رکھنے کے لیے کافی روپیہ کی ضرورت ہوتی تھی، علاوہ بریں انہیں فوج بھی رکھنی پڑتی تھی جس کے اخراجات بھی صوبہ ہی کے باشندے پورے کرتے تھے۔

پاشا کے بعد بے اور آغا کا درجہ تھا، جو اپنے اپنے علاقوں میں ویسا ہی اختیار رکھتے تھے، جیسا پاشا اپنی ولایت میں رکھتا تھا، ان کے علاوہ تمام سلطنت میں ہزاروں چھوٹے

چھوٹے عمال تھے، جنہوں نے چار چار یا پانچ پانچ گاؤں میں مال گزاری کا ٹھیکہ باب عالی سے لے رکھا تھا، یہ لوگ رعایا سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کی سختیاں بھی ساہوکاروں کے ایجنٹوں سے کم نہ تھیں۔

نظام جاگیری کی ابتری | سلطنت کا ضعف واختلال نظام جاگیری کی ابتری سے اور بھی ترقی کر گیا تھا، بہتیرے صوبوں میں تقریباً خودمختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں، سلیمان اعظم نے جن مضبوط بنیادوں پر نظام جاگیری کو قائم کیا تھا اور جاگیرداروں کو قابو میں رکھنے کے لیے جو ضوابط مقرر کیے تھے، وہ سب اٹھارہویں صدی کے اختتام سے پیشتر بدل چکے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے ہر حصہ خصوصاً ایشیائی صوبوں میں ایک بڑی تعداد خودسر جاگیرداروں کی پیدا ہو گئی تھی، جو نسلاً بعد نسل اپنی جاگیروں پر قابض چلے آتے تھے، یہ جاگیردار عموماً درہ بے کہے جاتے تھے، یہ لوگ صرف نام کے لیے سلطان اور پاشا کے مطیع تھے، ورنہ حقیقۃً بالکل آزاد تھے اور اپنے علاقوں میں جو چاہتے کرتے، باب عالی میں اتنی قوت نہ تھی کہ ان سے اپنے احکام کی تعمیل کرا سکتا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ جس بدنظمی میں مبتلا تھی، اس کا اندازہ سر جان ہاب ہاؤس (Sir John Hobhouse) کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے جو موصوف کے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے، یہ بیان اگرچہ صرف ایک صوبہ البانیا سے متعلق ہے تاہم اس سے دوسرے صوبوں کے حالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، سر جان لکھتے ہیں:

> "البانیا میں تقریباً ہر قسم کی حکومت کے نمونے ملتے ہیں، بعض ضلعوں اور شہروں پر ایک شخص کی حکومت ہے، جس کا ترکی لقب بولو باشی یا یونانی لقب کپتان ہے، جو مسیحی یورپ سے لیا گیا ہے، بعض اپنے اکابر کے زیر حکومت ہیں اور بعض کسی کی حکومت تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ہر شخص خود اپنے خاندان کا حاکم ہے، چند مقامات پر حکومت معرض تعطل میں ہے اور گو بظاہر طوائف الملوکی کی حالت نہیں ہے، تاہم کوئی حاکم بھی نہیں ہے، ہمارے زمانہ

میں آرجیروکاسٹرو (Argyro Castro) کے وسیع شہر کی یہی حالت تھی، مقبوضات کے بعض علاقے ایسے ہیں جہاں ہر آغا یا بے جو گویا ہمارے قدیم تعلقہ داروں کا جواب ہو سکتا ہے، ایک چھوٹا سا سردار ہے اور گاؤں کے لوگوں پر ہر طرح کا حق رکھتا ہے، باب عالی کا احترام جس نے دولت عثمانیہ کے دور عظمت میں مملکت کو چھوٹی چھوٹی پاشائیوں اور امارتوں میں تقسیم کر دیا تھا، اب بہت کم رہ گیا ہے اور مختلف علاقوں کے حدود جو اس نے قائم کیے تھے، درہم برہم اور فراموش ہو چکے ہیں۔"

مرکزی حکومت | قسطنطنیہ کی برائے نام مرکزی حکومت میں صدر اعظم ملکی اور فوجی معاملات میں سب سے بڑا عہدہ دار تھا، مذہبی معاملات میں مفتی اعظم کا عہدہ سلطان کے بعد جو خلیفۃ المسلمین بھی تھا، سب سے بڑا تھا، صدر اعظم کے ماتحت قائم مقام کے علاوہ جو نائب صدر کی حیثیت رکھتا تھا ایک اور وزیر تھا جس کا تعلق ملکی اور فوجی دونوں شعبوں سے تھا، امور خارجہ رئیس آفندی کے سپرد تھے، چاؤش باشی صدر اعظم کے دیوان عدالت کا نائب صدر اور دار السلطنت کی پولیس کا افسر اعلیٰ تھا، ان کے علاوہ نشانجی، دفتر دار اور متعدد دوسرے عہدہ دار تھے، ایک بہت بڑی تعداد حضوریوں اور ایسے لوگوں کی تھی جو بلحاظ اس امر کے کہ ان میں ضروری قابلیت ہے بھی یا نہیں سرکاری عہدوں پر مامور تھے اور سلطنت کی بدنظمی سے حتی الامکان پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

دیوان | دیوان سلطانی اب عموماً ڈیڑھ مہینہ میں ایک بار منعقد ہوتا تھا، صدر اعظم کے دیوان کا اجلاس نسبۃً جلد جلد ہوا کرتا تھا اور یہ بطور دیوان عدالت منعقد ہوتا، جس میں صدر اعظم کے علاوہ قپودان پاشا، دونوں قضاۃ عسکر، نشانجی اور دفتر دار شریک ہوتے، اہم مواقع پر تقریباً چالیس ارکان کی ایک بڑی مجلس منعقد ہوتی، جس میں سلطنت کے تمام شعبوں کے اعلیٰ عہدہ دار شرکت کرتے، ناگہانی ضرورتوں کے موقع پر اراکین دیوان جب طلب کیے جاتے تو وہ مسئلہ زیر غور پر کھڑے کھڑے مشورہ کرتے، ایسی مجلس کا نام "استادہ دیوان" تھا۔

مخصوص مراعات | جماعت علماء اور خصوصاً اس کے پیشوا مفتی اعظم کی قوت بہ نسبت پہلے کے بڑھ گئی تھی اور برابر ترقی کرتی جاتی تھی، یہی حال اوقاف کی تعداد کا تھا، اشخاص کی ذاتی جائیدادوں کے علاوہ کہیں کہیں پورے پورے ضلع اور شہر مسجدوں اور دوسرے مذہبی اداروں پر وقف تھے، ان اوقاف کے متولی مقررہ زر استثناء کے سوا جس کی مقدار عموماً بہت کم ہوتی تھی، ہر قسم کے محصولوں اور مطالبوں سے بری تھے، ایسی ہی رعایتیں اکثر ان لوگوں کو بھی حاصل تھیں جو سلطانہ والدہ اور بعض دوسرے عالی مرتبہ اشخاص کے ذاتی علاقوں کے باشندے تھے، بہتیرے ضلعے ایسے بھی تھے، جہاں عیسائی رعایا قدیم رواج یا شاہی فرمان کے بموجب بلاشرکت غیرے قابض تھی اور جہاں کسی ترک کے لیے جا کر آباد ہونا قطعاً ممنوع تھا، سلطنت کے مختلف حصوں میں مغربی اقوام کے لوگ آباد تھے، جو باب عالی کے سایہ عاطفت میں خود اپنے ملکی قوانین اور قونصلوں کے ماتحت آسودگی اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس عام بدنظمی کے دور میں بھی کچھ حکام ایسے تھے جو نہایت لیاقت اور عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرتے تھے، اسی طرح بعض پاشا بھی باوجود سخت گیر ہونے کے اپنی ولایتوں میں کامل طور پر امن و امان قائم کیے ہوئے تھے، اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ میں جو تھوڑی بہت تجارت اور خوش حالی پائی جاتی تھی، وہ ان ہی مراعات اور ایسے حکام اور پاشاؤں کی رہین منت تھی۔

فوج | فوج جو اندرونی بغاوتوں کو فرو کر کے سلطنت میں امن و امان قائم کرنے اور اسے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ تھی، اس کی حالت حکومت کے ہر شعبہ سے زیادہ خراب تھی، اس کی دو قسمیں تھیں، تنخواہ دار اور غیر تنخواہ دار، تنخواہ دار فوج کا سب سے بڑا اور اہم ترین حصہ ینی چری تھے، اٹھارہویں صدی کے آخر میں ان کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار تھی، ینی چری دستے سلطنت کے مختلف شہروں میں رہتے تھے، جہاں انہوں نے ایک طرح کی فوجی حکومت قائم کر رکھی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف کاروبار بھی کرتے تھے، اگرچہ

سرکاری رجسٹر میں ینی چری کا شمار ایک لاکھ پچاس ہزار درج تھا لیکن ان کی تعداد حقیقۃً اتنی نہ تھی، سیکڑوں ہزاروں نام فرضی درج رجسٹر کر لیے گئے تھے، جن کی تنخواہیں باب عالی سے وصول کی جاتی تھیں، پھر بھی ینی چری کی تعداد بہت زیادہ تھی اور جنگ و امن دونوں حالتوں میں ان کی اہمیت دوسرے فوجی دستوں سے بڑھی ہوئی تھی، وہ اپنے مذہب میں نہایت سخت تھے اور چوں کہ انہیں معلوم تھا کہ سلاطین ان پر کامل اعتماد نہیں رکھتے، اس لیے وہ بھی ہر ایجاد اور اصلاح کو حسد اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہمیشہ رعایا کو ستانے اور باب عالی کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ رہا کرتے تھے۔

ینی چری کے علاوہ توپچیوں کی فوج تھی، جس کی تعداد تیس ہزار تھی، یہ بھی ینی چری دستوں کی طرح سلطنت کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، اورنہ اور قسطنطنیہ کے بوستانجی یعنی قصر سلطانی کے باغبانوں کا شمار بھی فوج میں تھا اور ان کا مسلح دستہ سلطان کے "باڈی گارڈ" کی خدمت انجام دیتا تھا، ان کے علاوہ باقاعدہ پیدل فوج کے دوسرے دستے بھی تھے، "سپاہیوں" اور "اسلحہ داروں" کے قدیم سوار دستے بھی اب تک قائم تھے، اگرچہ ان کی تعداد اور قوت میں بہت کچھ کمی ہو گئی تھی، بے ضابطہ فوج میں خصوصیت کے ساتھ دو دستے شامل تھے جو زعامت اور تیمار کے جاگیردار جنگ کے موقعوں پر فراہم کرتے تھے لیکن جاگیروں میں جو فساد و انتشار پھیلا ہوا تھا اس کی وجہ سے ان دستوں کی تعداد اور فوجی قابلیت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ یہ یقین تھا کہ جتنے سپاہی جاگیرداروں کے علم کے نیچے جمع ہوں گے وہ آخر وقت تک جنگ میں شریک بھی رہیں گے، علاوہ بریں جنگ کے زمانہ میں کچھ نئے دستے بھرتی کر لیے جاتے تھے جن کو میری عسکری کہتے تھے، انہیں صرف لڑائی کی مدت کی تنخواہ دی جاتی تھی، جب کسی ترکی شہر کا محاصرہ ہوتا تو محاصرہ کے قائم رہنے تک اس شہر کے مسلمان باشندوں کا ایک فوجی دستہ بنا دیا جاتا اسے یرلی نفرات کہتے تھے، ان کے علاوہ رضا کاروں کے بے ضابطہ دستے بھی تھے، جو لڑائی کے موقعوں پر عثمانی لشکر کے ساتھ ہو جاتے تھے۔

۔۔ سلطان کی باضابطہ اور بے ضابطہ فوجوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا، صوبوں میں پاشاؤں کے فوجی دستے بھی ہوتے تھے، جنہیں پاشا خود بھرتی کرتے تھے اور جن کی تنخواہیں وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے، یہ دستے مستقل نہ تھے بلکہ صرف جنگ کی مدت تک رکھے جاتے تھے۔

ان مختلف ذرائع سے سپاہیوں کی ایک عظیم الشان تعداد علم سلطانی کے نیچے اکٹھا ہو جاتی تھی، چنانچہ جنگ کی ابتدا میں تین لاکھ آدمیوں تک غنیم کے مقابلہ میں روانہ کیے جا سکتے تھے اور اگر میدان عثمانیوں کے ہاتھ رہتا تو ان کے علاوہ بے اور بے شمار دوسرے رضا کار فوج میں شامل ہونے کے لیے تیار ملتے لیکن یہ انبوہ زیادہ تر بے ضابطہ دستوں پر مشتمل ہوتا، جو نظم و تجربہ دونوں سے عاری ہوتے، یہ دستے بہت کچھ چھ مہینے سے زیادہ کے لیے بھرتی کیے جاتے، شکست کے لیے پہلے ہی موقع پر وہ ہزاروں کی تعداد میں میدان جنگ چھوڑ کر منتشر ہو جاتے اور اپنے گھروں کو واپس جاتے ہوئے راستہ میں دشمن یا سلطان کے جو علاقے بھی ملتے، بلا امتیاز انہیں لوٹتے جاتے، ترک سپاہی اپنی فطری شجاعت اور ملکۂ تیغ زنی کی وجہ سے اب بھی ایک خوف ناک حریف تھا اور ترک سواروں کی طوفانی یورش خصوصاً ایسے علاقوں میں جہاں کوئی دوسری سوار فوج گزرنے کی جرأت بھی نہ کر سکتی، دشمن کے لیے اور بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی لیکن جہاں تک فوجی ضبط و نظم کا تعلق تھا، مسیحی یورپ کی فوجوں کے مقابلہ میں عثمانی فوج بالفاظ نپولین محض ایک ایشائی بھیڑ تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ سوار اور پیدل دونوں فوجوں میں اسلحہ کے متعلق کوئی ضابطہ نہ تھا اور نہ ان کو باقاعدہ دستوں میں لڑنے کی تعلیم دی جاتی تھی، ہر سپاہی جو ہتھیار چاہتا، استعمال کرتا اور جب لڑائی شروع ہو جاتی تو جس طرح چاہتا لڑتا، فرانسیسی جنرل بوئیر (Boyer) اس زمانہ کے ترک سپاہی کی نسبت لکھتا ہے کہ:

> ''ان میں نہ کوئی ترتیب ہے نہ ثابت قدمی، وہ دستے بنا کر فوجی اصول کے مطابق چل بھی نہیں سکتے، بے ترتیب ٹولیوں میں آگے بڑھتے ہیں اور دفعۃً غضب ناک ہو

کر نہایت شدت کے ساتھ دشمن پر حملہ کردیتے ہیں۔"

بحریہ بحریہ کی حالت غازی حسن پاشا کی کوششوں کے باوجود بری فوجوں سے بھی زیادہ خراب تھی[1]۔

غرض اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ بحیثیت مجموعی اپنے زوال و پستی کی انتہا کو پہنچ گئی تھی، سلطان سلیم کی اصلاحی کوششوں سے اس کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا، یہ صحیح ہے کہ ان اصلاحات کی مخالفت شدت کے ساتھ کی گئی، یہاں تک کہ فوج نے علانیہ بغاوت کردی اور سلیم کو اپنے تخت کی حفاظت کے لیے مجبوراً اصلاحات کو منسوخ کردینا پڑا، گو اس کے باوجود وہ نہ صرف معزول کردیا گیا بلکہ ایک سال کے بعد قتل بھی کردیا گیا لیکن ان اصلاحات سے جو نئی روح پیدا ہوگئی تھی، وہ پھر کبھی فنا نہ ہوئی اور دولت عثمانیہ کے آئندہ فرماں رواؤں اور مدبروں نے سلیم ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، سلطان محمود ثانی اور سلطان عبدالمجید اوّل کے اصلاحی کارناموں کا سنگ بنیاد سلیم ہی کے ہاتھوں سے رکھا گیا تھا۔

اصلاحات سلیم نے اصلاحات کا آغاز صلح نامۂ یاسی کے فوراً بعد کردیا تھا، اس نے سلطنت کے ہر شعبہ کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ایک جامع اسکیم مرتب کی تھی، نظام جاگیری اس حد تک ابتر ہوچکا تھا کہ اسے منسوخ کردینا ہی مناسب خیال کیا گیا، تجویز یہ تھی کہ موجودہ جاگیرداروں کے مرنے پر ان کی جاگیریں (زعامت اور تیمار دونوں) ضبط کرلی جائیں اور آئندہ ان جاگیروں کی آمدنی سرکاری خزانہ میں جمع کی جائے اور اس سے ایک نئی فوج کے مصارف ادا کیے جائیں، ولایتوں کے اصلاح نظم ونسق کے لیے یہ قرار پایا کہ پاشاؤں کے اختیارات کم کردیے جائیں، ہر ولایت کا حاکم تین سال کے لیے مقرر کیا جائے اور اس مدت کے خاتمہ پر اس کا دوبارہ تقرر صرف باشندگان ولایت کی رضامندی سے کیا جائے، ولایتوں سے متعلق ایک اور اصلاح بھی تجویز کی گئی، جس سے باشندوں کو

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۳۲۹-۳۱۴۔

بہت فائدہ پہنچا، وہ یہ کہ مال گزاری وصول کرنے کے لیے جو ٹھیکے لوگوں کو دیے جاتے تھے، وہ سب موقوف کر دیے جائیں اور آئندہ تمام مال گزاری صرف سرکاری خزانہ کے عمال کے ذریعہ سے وصول کی جائے، مرکزی حکومت میں صدر اعظم کے اختیارات کسی قدر محدود کر دیے گئے اور تمام اہم مسائل پر دیوان سے مشورہ کرنا اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔

تعلیم سلیم نے رعایا کے ہر طبقہ میں تعلیم پھیلانے کی کوشش کی اور تمام سلطنت میں مدرسے قائم کیے، اس کی سرپرستی سے یونانیوں نے خاص طور پر فائدہ اٹھایا اور اپنے قدیم مدرسوں کو مستحکم کرنے کے علاوہ بہت سے جدید مدرسے بھی قائم کر لیے لیکن ان کی انقلاب پسند جماعت نے مدرسوں اور مطبعوں کے ذریعہ سے اپنی قوم میں دولت عثمانیہ کے خلاف شورش برپا کرنے کی کوشش کی، باوجود اس کے سلیم نے یونانی مدرسوں اور چھاپا خانوں کو بند نہیں کیا بلکہ قسطنطنیہ میں ایک مطبع قائم کرکے یونانی پادریوں کے ذریعہ سے اس فتنہ کا سد باب کرنا چاہا، سلطنت عثمانیہ میں پہلا مطبع سلطان احمد ثالث کے عہد میں قائم ہوا تھا، سلیم نے علوم کی نشر و اشاعت کے لیے متعدد مطبعے قائم کیے، اس کے حکم سے مصافیات (Tactics) اور استحکامات کے فن کی بہت سی کتابوں کے ترجمے فرانسیسی زبان سے ترکی زبان میں کرکے شائع کیے گئے، اس نے عثمانیوں کی سیاسی تربیت کی غرض سے یورپ کے خاص خاص پایہ تختوں میں مستقل سفارت خانے قائم کرنے چاہے، چنانچہ لندن، پیرس، ویانا اور برلن میں ترکی سفارتیں قائم ہو گئیں اور سفیروں کے ساتھ عثمانیوں کی ایک جماعت روانہ کی گئی لیکن حکومت روس نے بعض حیلوں سے ترکی سفارت خانے کو اپنے یہاں قائم نہ ہونے دیا۔

فوج سلیم نے سب سے زیادہ توجہ فوجی اور بحری اصلاحات پر کی، ینی چری کی خودسری پر نظر رکھتے ہوئے وہ خوب جانتا تھا کہ مذکورہ بالا اصلاحات کے جاری کرنے اور سلطنت کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک منظم اور وفادار فوج کی کتنی ضرورت ہے، پیٹر اعظم کی مثال بھی ہمیشہ اس کے پیش نظر تھی، جس نے یورپین فوجوں کے نمونہ کے مطابق

جدید فوجیں تیار کر کے اندرونی اور بیرونی دونوں دشمنوں کو شکست دے دی تھی، ینی چری کی سرکشی روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی، وہ سلطنت کے امن و امان کے لیے ایک مستقل خطرہ تھے، وہ اپنے نظام میں کسی اصلاح کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، یہی وجہ تھی کہ سلیم کو ایک ایسی فوج قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جو یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق مرتب کی گئی ہو اور جس پر پوری طرح اعتماد کیا جا سکے، گذشتہ جنگ میں جو قیدی گرفتار ہو کر آئے تھے، ان میں ایک ترک بھی تھا جو مدت سے روسی فوج میں ملازم تھا اور ترقی کر کے نفٹنٹ کے عہدہ تک پہنچ گیا تھا، اس کا نام عمر آغا تھا، صدر اعظم یوسف پاشا اکثر اس سے روسیوں کے فوجی نظام پر باتیں کیا کرتا تھا، چنانچہ آغا عمر کی خواہش پر اس نے عثمانیوں کا ایک دستہ یورپین طرز پر مرتب کرنے کی اجازت دے دی، عمر آغا نے اس دستہ کو یورپین طریقے سے مسلح کر کے تربیت دینا شروع کیا، جنگ کے خاتمہ پر جب یوسف پاشا قسطنطنیہ کو واپس ہوا تو عمر آغا اور اس کے نئے دستہ کو بھی ساتھ لایا اور ان کے لیے قسطنطنیہ سے قریب ایک گاؤں میں چھاؤنی بنوا دی، جب سلیم کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے ایک روز خود جا کر اس دستہ کا معائنہ کیا اور دیکھتے ہیں عثمانی فوجوں پر اس کی برتری محسوس کر لی، اس نے نہ صرف اسے قائم رکھا بلکہ دیوان میں یہ تجویز پیش کی کہ ینی چری میں بھی یہ جدید نظام جاری کر دیا جائے۔ ینی چری نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سلیم کو بالآخر وعدہ کرنا پڑا کہ جدید نظام کی پابندی ینی چری پر عائد نہ کی جائے گی، تاہم عمر آغا کا دستہ بدستور قائم رکھا گیا۔

۱۷۹۶ء میں جنرل ڈوبائے (Dubayet) جمہوریہ فرانس کے سفیر کی حیثیت سے قسطنطنیہ آیا، وہ سلطان کو نذر دینے کے لیے متعدد توپیں اور چند فرانسیسی توپچی اور انجینیر بھی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا تاکہ عثمانی توپچی ان کی مدد سے یورپ کے جدید حربی اصولوں سے واقف ہو جائیں اور اپنے اسلحہ خانوں اور توپ ڈھالنے کے کارخانوں میں ضروری

اصلاحات جاری کر سکیں، اس کے ساتھ فرانسیسی پیدل اور سوار فوجوں کے بہت سے افسر بھی تھے، جنہیں وہ "سپاہی" (سوار) اور ینی چری (پیدل) فوجوں کی تنظیم و تربیت کے لیے لایا تھا، سلیم نے اس تحفوں کو بہت خوشی کے ساتھ قبول کیا اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، چنانچہ توپ خانوں میں فرانسیسی توپچیوں کی مدد سے بہت کچھ اصلاحیں کی گئیں اور سواروں کا ایک دستہ بھی یورپین طرز پر مسلح اور مرتب کر لیا گیا، لیکن ینی چری نے برہم ہو کر یورپ کے اسلحہ اور جنگی طریقوں کے اختیار کرنے سے قطعی انکار کر دیا، مجبوراً فرانسیسی افسروں نے اسی فوج کو تعلیم دینے پر قناعت کی جو عمر آغا کی تربیت میں قائم کی گئی تھی، قسطنطنیہ پہنچنے کے چند ہی مہینوں کے بعد جنرل دوبائے کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیشتر افسر فرانس واپس چلے گئے لیکن قپودان کوچک حسین پاشا نے نظام جدید[1] کی قدر و اہمیت کا اندازہ کر کے کچھ افسروں کو اپنی ملازمت میں رکھ لیا اور اونچی اونچی تنخواہوں کا لالچ دے کر مسلمانوں کو عمر آغا کی فوج میں داخل ہونے کی ترغیب دی، ۱۷۹۸ء میں جس فرانس اور دولت علیہ کے درمیان جنگ چھڑی تو اس نئی فوج کی تعداد چھ سو تھی۔

بحریہ کوچک حسین ۱۷۹۲ء میں قپودان پاشا مقرر ہوا تھا، وہ بارہ سال تک اس عہدہ پر مامور رہا اور اس مدت میں اس نے ترکی بیڑہ اور سلاح خانہ کی نئی تنظیم کی، اس نے فرانسیسی اور انگریزی بیڑوں کے نمونہ پر عثمانی بیڑے کو از سر نو منظم کیا اور بہت سے نئے جنگی جہاز بنوائے، اس نے سویڈن اور فرانس کے ماہر انجینیروں کی ایک بڑی تعداد بلوائی اور ان کی مدد سے عثمانیوں کو جدید طرز کی توپیں ڈھالنا سکھائیں، سلطان عبدالحمید اول کے عہد میں بیرن دی توت کے زیر نگرانی ایک مدرسہ توپچیہ قسطنطنیہ میں قائم ہوا تھا، کوچک حسین پاشا نے اسے نئے سرے سے منظم کیا اور ایک جدید بحری مدرسہ قائم کیا، ان مدارس کے طلبہ کے لیے اس نے

---

[1] "نظام جدید" اس نئی فوج کا بھی نام تھا جو یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق مرتب کی گئی تھی اور سلیم کی اصلاحات کا مجموعی نام بھی "نظام جدید" تھا۔

فن استحکامات سے متعلق فرانسیسی پروفیسر وابان اور دوسرے ماہرین فن کی کتابوں کے ترجمے ترکی زبان میں طبع کرائے اور مدرسہ توپچیہ میں ایک کتب خانہ قائم کیا، جس میں وہ تمام اہم کتابیں جمع کیں جو یورپ میں جدید فنون جنگ اور ریاضیات پر لکھی گئی تھیں، اس کتب خانہ میں چار سو کتابیں تھیں، جن میں بہترین فرانسیسی مصنفین کی کتابوں کا انتخاب تھا فرانسیسی زبان کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا، جو بقول ژون کیئر "اس زمانہ کے لحاظ سے نہایت بے باکانہ بدعت تھی" حسین پاشا نے بحری ڈاکوؤں کے استیصال کی بھی پوری کوشش کی، جنہوں نے بحر ایجین کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور تجارتی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، اس نے اپنے تقرر کے پہلے ہی سال میں لمبرد کو یزیانی (Lambro Caviaziani) مشہور بحری ڈاکو کے بیڑہ کا قلع قمع کر دیا، اس کی سرگرمیوں سے ان ڈاکوؤں کی قوت بہت کچھ کمزور ہو گئی۔

نپولین اس درمیان میں انقلاب فرانس کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے اور فرانسیسی فوجیں حریت، مساوات اور اخوت کے نعرے بلند کرتی ہوئی سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، چند سال کے اندر نپولین بوناپارٹ نے وینس کی قدیم جمہوریہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور پھر اپنی فاتح فوج کے ساتھ آسٹریا کی جانب بڑھا لیکن سلیم نے دولت عثمانیہ کے قدیم دشمنوں (وینس و آسٹریا) کے خلاف اس کے روایتی حلیف (فرانس) کے جارحانہ اقدام سے فائدہ اٹھانے کی مطلق کوشش نہیں کی، بلکہ اپنی توجہ تمام تر ملکی اصلاحات کی جانب رکھی، شاہ فرانس لوئی شانزدہم کے قتل سے وہ ضرور متاثر ہوا، لوئی کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات تھے، چنانچہ تخت نشینی سے پہلے بھی وہ اس سے خط و کتابت کیا کرتا تھا، پھر بھی اپنی سلطنت کی اندرونی حالت پر نظر رکھتے ہوئے نیز ان اصلاحات کی تکمیل کے لیے جو اس نے شروع کر دی تھیں، سلیم کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ یورپ کے اس ہنگامہ رستخیز سے الگ رہے، مگر اس کی یہ کنارہ کشی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی، ۱۷۹۷ء میں صلح نامہ کیمپو فورمیو (Campo Formio) کے رو سے جو آسٹریا اور جمہوریہ فرانس کے درمیان طے ہوا، جمہوریہ وینس کا خاتمہ

ہوگیا، خود وینس اور اس کے اطالوی مقبوضات کا ایک بڑا حصہ آسٹریا کے ہاتھ آیا اور بحر ایڈریاٹک کے مقبوضات جزائر آئیونین اور وہ شہر جو بحر ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر وینس کی ملک تھے، جمہوریہ فرانس کے قبضہ میں آئے، اس طرح فرانسیسی علاقے سلطنت عثمانیہ کی سرحد سے بالکل متصل ہوگئے، نپولین کی حیرت انگیز فتوحات نے جمہوریہ فرانس کے حوصلے بہت بڑھا دیے تھے، چنانچہ جزائر آئیونین کے حاصل کرنے کے بعد اسے عثمانی مقبوضات کی طرف بڑھنے کا خیال پیدا ہوا اور سلطنت عثمانیہ کے ضعف واختلال نے اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچائی، بہتیرے صوبوں کے پاشا مثلاً علی پاشا والی یانیہ، عثمان پاشا (پزوان اوغلو) والی ودین اور جزار پاشا والی عکہ قریب قریب خود مختار ہو چکے تھے، مصر محض نام کے لیے سلطان کے زیر حکومت تھا، ورنہ اصلی حکومت مملوکوں کی تھی، باب عالی کی طرف سے جو پاشا وہاں مقرر ہوتا تھا، اسے حقیقۃً مملوکوں کے مقابلہ میں کوئی اختیار حاصل نہ تھا، سرویا اور یونان بغاوت کے جذبات سے لب ریز تھے اور صرف موقع کا انتظار کر رہے تھے، سارے یورپ کی طرح فرانس کی مجلس عاملہ (ڈائرکٹری) کو بھی یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ بہت قریب ہے اور وہ اس سلطنت کی تقسیم میں سب سے بڑا حصہ لینے کا قصد کر رہی تھی، اسی غرض سے نپولین نے اپنے فرستادے ان میں سے کئی صوبوں خصوصاً یونان میں روانہ کیے تھے اور وہاں کے باشندوں کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر وہ دولت علیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کریں گے تو فرانسیسی فوج ان کی مدد کرے گی، چنانچہ طولوں میں پینتیس ہزار آزمودہ کار فرانسیسی سپاہیوں کی ایک فوج تیار کی گئی، جنگی جہازوں کے علاوہ سواری اور بار برداری کے تین سو جہاز تھے، عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ حملہ سلطنت عثمانیہ کے کسی یورپین صوبہ پر ہوگا لیکن آخر وقت میں نپولین کی تحریک سے حکومت فرانس نے یہ فیصلہ کیا کہ مصر کی راہ سے انگلستان پر ضرب لگائی جائے، نپولین کو یہ امید تھی کہ وہ مصر کو فتح کرنے کے بعد ہندوستان پر حملہ کرے گا اور سلطنت برطانیہ کو برباد کرکے فرانس کے لیے ایک عظیم

الشان مشرقی سلطنت قائم کرے گا، لیکن مصر دولت عثمانیہ کے زیر حکومت تھا اور مملوکوں کی سرکشی اور عملی خود مختاری کے باوجود سلطان کی فرماں روائی سے آزاد نہیں سمجھا جاتا تھا، دولت عثمانیہ اور فرانس کے درمیان دوستانہ تعلقات مدت سے قائم تھے، اس لیے مصر پر حملہ کرنے کا کوئی معقول عذر فرانس کے پاس نہ تھا، مگر نپولین باب عالی کی کمزوری اور مملوکوں کی سرکشی سے پوری طرح واقف تھا، اس نے مصر پہنچ کر اپنی مہم کا مقصد یہ ظاہر کیا کہ میں سلطان کی حمایت اور اہل مصر کو مملوکوں کے مظالم سے نجات دلانے آیا ہوں، اسی مصلحت سے اس نے دولت عثمانیہ کے خلاف کوئی اعلان جنگ نہیں کیا۔

نپولین کو حکومت فرانس کی طرف سے یہ خفیہ احکامات ملے تھے کہ مصر پر قبضہ کر کے جہاں تک ممکن ہو انگریزوں کو ان کے ایشیائی مقبوضات سے نکال دیا جائے، بحر احمر پر فرانسیسی تسلط مکمل طور پر قائم کر دیا جائے اور مالٹا پر قبضہ کر لیا جائے، ان احکام کے علاوہ خود نپولین کی ذاتی اسکیم یہ تھی کہ ایشیا میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنے کے بعد یونانیوں اور دوسرے عیسائی فرقوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارے، ترکوں کو شکست دے کر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے اور پھر وہاں سے یورپ پر حملہ آور ہو۔

مالٹا ۱۰؍ مئی ۱۷۹۸ء کو نپولین نہایت خاموشی کے ساتھ طولون سے روانہ ہوا، اس کے ساتھ فرانس کے علما اور ماہرین فن کی ایک جماعت بھی تھی، جو مصر کے مطالعہ اور وہاں کے حالات کی اصلاح و ترقی کے اسباب پر غور کرنے کے لیے اس مہم میں شریک کی گئی تھی، نپولین نے مہم کے اصلی مقصد کو یہاں تک خفیہ رکھا کہ فوج کو بھی اطلاع نہ دی، طولون سے روانگی کے تین ہفتہ بعد فرانسیسی بیڑا مالٹا پہنچا، مبارزین سینٹ جان کی وہ شجاعت جس نے سلیم اعظم جیسے فاتح کے حملہ کو بھی ناکام رکھا تھا، وہ صدیوں کے اندر عیش و عشرت کی نذر ہو چکی تھی، باہمی اختلافات نے ان کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دیا تھا، چنانچہ انہوں نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے اور یہ اہم جزیرہ سلطنت فرانس میں شامل کر لیا گیا۔

اسکندریہ مالٹا کی فتح کے بعد نپولین نے جزیرہ کریٹ کا رخ کیا، مگر یہ معلوم کر کے انگریز امیر البحر نیلسن (Nelson) اس کے تعاقب میں ہے، وہ فوراً اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گیا اور اب پہلی بار اس نے فوج کو اس کی منزل مقصود سے آگاہ کیا۔ اس نے اپنے اعلان میں فوج کو یوں مخاطب کیا:

> ”سپاہیو! تم ایک ایسی فتح کے لیے جا رہے ہو جس کے اثرات دنیا کی تہذیب اور تجارت پر بے حساب ہوں گے۔ تم انگلستان پر موت کی ضرب لگانے سے پہلے ہی ایک نہایت یقینی اور کاری ضرب لگاؤ گے، ممالک جو تمام تر انگریزی تجارت کے حامی ہیں، تمہارے پہنچنے کے چند ہی دنوں بعد نیست و نابود ہو جائیں گے۔“[1]

نیلسن کو جب طولون سے فرانسیسی بیڑے کی روانگی کا علم ہوا تو یہ قیاس کر کے کہ نپولین مصر پر حملہ کرنا چاہتا ہے، خود بھی اپنے جنگی جہازوں کے ساتھ اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گیا لیکن وہاں ۲۸ رجون کو پہنچنے کے بعد اسے اطلاع ملی کہ فرانسیسی بیڑے کا کہیں پتہ نہیں، چنانچہ مایوس ہو کر وہ سسلی کو لوٹ آیا، اس کی واپسی کے دو ہی روز بعد یکم جولائی کو نپولین اسکندریہ پہنچا، وہاں کا مختصر ترکی دستہ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا، ۱۷ رمحرم ۱۲۱۳ھ مطابق ۲ رجولائی ۱۷۹۸ء کو نپولین نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔

اسکندریہ پر حملہ کرنے کا عذر نپولین اس کے سوا کچھ نہ پیش کر سکا کہ مصر پر اصلی حکومت مملوکوں کی ہے اور وہ انگریزی تجارت کے حامی ہیں، نیز یہ کہ انہوں نے فرانسیسی تاجروں کے ساتھ بدسلوکیاں کی ہیں، بہر حال اس نے باب عالی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مصر کا حملہ حقیقۃً ایک دوستانہ فعل ہے، کیوں کہ اس سے مملوکوں کی قوت کا خاتمہ ہو جائے گا جنہوں نے عثمانی اقتدار کو محض نام کے لیے باقی رکھا ہے لیکن نپولین کی خاص کوشش

---

[1] سوانح نپولین اول از ڈاکٹر ہالینڈ روز ص ۱۸۸ مطبوعہ لندن ۱۹۱۹ء (The Life of Napolean By Halland Rose)

یہ تھی کہ مصر کے عام باشندوں کی حمایت حاصل کی جائے، چنانچہ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مسلمان باشندوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی جائے، اس نے اعلان شائع کیا جس میں مملوکوں کے مظالم کا ذکر کرنے کے بعد اپنے کو اہل مصر کا حامی اور مددگار ثابت کرنا اور انہیں اس امر کا یقین دلانا چاہا کہ فرانسیسی مہم کا مقصد صرف یہ ہے کہ مصر کو مملوکوں کے پنجہ سے نجات دلائی جائے، ایک طویل مدت سے جارجیا اور کوہ قاف میں خریدے ہوئے غلاموں کا گروہ دنیا کے سب سے زیادہ خوب صورت مقام کو اپنے مظالم کی آماج گاہ بنائے ہوئے ہے لیکن خداوند عالم جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، ان کی سلطنت کے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے، اے اہل مصر! انہوں نے تم سے بیان کیا ہے کہ میں تمہارے مذہب کو برباد کرنے کی غرض سے آیا ہوں، ان کی باتوں کا یقین نہ کرو، انہیں یہ جواب دو کہ میں تمہارے حقوق کو دوبارہ قائم کرنے اور غاصبوں کو سزا دینے کے لیے آیا ہوں اور یہ کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ اور قرآن کی جتنی عزت مملوک کرتے ہیں، ان سے زیادہ میں کرتا ہوں، نہایت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ہمارا ساتھ دیں گے، ان کی خوش حالی اور مرتبہ میں ترقی ہوگی لیکن سخت افسوس ہے ان کی حالت پر جو مملوکوں کے ساتھ ہو کر ہم سے لڑیں گے، ہر شخص مملوکوں کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کرے گا اور پکارے گا:

بزرگی اور عظمت ہے سلطان کے لیے اور عظمت ہے فرانسیسی فوج کے لیے جو سلطان کی حلیف ہے، مملوکوں پر لعنت اور اہل مصر کے لیے خوش قسمتی[1]، نپولین نے مصریوں کے اطمینان کے لیے اٹلی اور مالٹا کی فتوحات کا بھی حوالہ دیا، کیا ہم نے پوپ کو برباد نہیں کر دیا جو لوگوں کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کا حکم دیتا تھا؟ کیا ہم نے مبارزین مالٹا کو برباد نہیں کر دیا، اس لیے کہ وہ احمق خیال کرتے تھے کہ مسلمانوں سے جنگ کرنا خدا کی مرضی کے مطابق ہے؟

---

[1] ایورسلے، ص ۲۳۱۔

قاہرہ کی مہم اسکندریہ میں ایک فوجی دستہ جنرل کلیبر (Kleber) کے زیر قیادت متعین کر کے نپولین ایک ہفتہ کے اندر قاہرہ کی طرف روانہ ہو گیا، ریگستان میں دھوپ کی شدت فرانسیسی فوج کے لیے ناقابل برداشت تھی، پیاس کی تکالیف سب سے زیادہ تھی، راستے کے کنوؤں کو عربوں نے پتھر کے ٹکڑوں سے پاٹ دیا تھا اور تھوڑا سا پانی بھی بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا، نتیجہ یہ تھا کہ ایک ایک گھونٹ پانی کے لیے سپاہی آپس میں لڑ بیٹھتے تھے، اس فوج کا ایک اعلیٰ افسر بیان کرتا ہے کہ ایک گلاس پانی سونے کی تول بکتا تھا، سپاہیوں کے علاوہ افسروں میں بھی اس مہم کے شدائد سے سخت برہمی تھی، ان حالات کے باوجود خود نپولین کے عزم واستقلال میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا اور نہ اس کے بشرے سے خفیف سی پریشانی بھی ظاہر ہوتی تھی، ایک روز ایک فوجی دستہ، جس کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا، ایک سپاہی نے بے خوف ہو کر نپولین سے یہ سوال کیا کہ ”کیا آپ اسی طرح ہم لوگوں کو ہندوستان لے جائیں گے؟“[1] نپولین نے فوراً جواب دیا کہ ”نہیں، میں تم جیسے سپاہیوں کے ساتھ اس مہم پر روانہ نہ ہوں گا۔“ سوال کرنے والا اور اس کے ساتھ اس جواب سے پانی پانی ہو گئے۔

جنگ اہرام مراد بے اور ابراہیم بے نے جو مملوکوں کے سردار اور حقیقۃً مصر کے اصلی حکمراں تھے، آگے بڑھ کر فرانسیسی فوج کو روکنا چاہا، پہلے آٹھ سو مملوک سواروں کا ایک دستہ سامنے آیا، جسے نپولین نے آسانی کے ساتھ منتشر کر دیا لیکن جب وہ قاہرہ کے قریب پہنچا تو ۷/ صفر ۱۲۱۳ھ مطابق ۲۱/ جولائی ۱۷۹۸ء انبابہ کے مقام پر مراد بے سے مقابلہ پیش آیا، جو دس بارہ ہزار سواروں کو لے کر پایہ تخت کی حفاظت کے لیے مستعد کھڑا تھا، اس معرکہ میں جو جنگ اہرام کے نام سے مشہور ہے (کیوں کہ اہرام مصر سامنے نظر آ رہے تھے)، مملوکوں نے ایسی شجاعت دکھائی کہ فرانسیسی متحیر رہ گئے لیکن ان کی حیرت انگیز شجاعت گولیوں کی باڑھ

---

[1] ہالینڈ روز، ص ۱۹۰-۱۸۹۔

کے سامنے کارگر نہ ہو سکی، علاوہ بریں فرانسیسی فوج کی تعداد تیس ہزار تھی اور یہ سب نہایت آزمودہ کار سپاہی تھے، برخلاف اس کے مراد بے کی فوج میں بارہ ہزار سے زیادہ آدمی نہ تھے، جن میں مملوک صرف پانچ ہزار تھے، باقی نو آموز فلاحین تھے، مراد بے کی شکست سے قاہرہ کا راستہ صاف ہو گیا اور چھ روز بعد نپولین نے اس پر باضابطہ قبضہ کر لیا، دو ہفتے تک قاہرہ میں قیام کرنے کے بعد وہاں کے ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر نپولین ابراہیم بے کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اسے شکست دے کر شام کی طرف بھگا دیا۔

جنگ نیل اس درمیان میں نلسن یہ معلوم کر کے کہ فرانسیسی بیڑہ مصر پہنچ چکا ہے، اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گیا تھا اور پہنچتے ہی ۱۷؍صفر مطابق یکم اگست کو اس نے فرانسیسی جہازوں پر جو خلیج ابو قیر میں لنگر انداز تھے، حملہ کر دیا، یہ لڑائی تاریخوں میں جنگ نیل کے نام سے مشہور ہے، نلسن کو شاندار فتح حاصل ہوئی، فرانسیسی امیر البحر مارا گیا، اس کے تقریباً تمام جہاز برباد ہو گئے یا گرفتار کر لیے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ نپولین کی فوج جو قاہرہ پر قابض تھی، فرانس سے بالکل منقطع ہو گئی، نپولین کو اس حادثہ کی اطلاع اس وقت ہوئی جب ابراہیم بے کو شکست دینے کے بعد ۱۹؍اگست کو وہ قاہرہ واپس آیا، اس نے یہ خبر سن کر صرف اس قدر کہا ”اب ضروری ہے کہ یا تو ہم ان ہی ملکوں میں رہ جائیں یا قدما کی طرح شاندار طریقہ سے یہاں سے نکلیں، انگریز ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم اپنے قصد و ارادہ سے زیادہ کارنامے کر دکھائیں۔“

قیام مصر نپولین نے یہ دیکھ کر موجودہ صورت حال میں فرانس سے کمک نہیں پہنچ سکتی اور مصر میں مجبوراً قیام کرنا پڑے گا، ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے اس کی فوج کو خارجی مدد کی ضرورت باقی نہ رہی، طولون سے اس کے ساتھ مختلف علوم و فنون کے اہل کمال آئے تھے، چنانچہ ان میں سے بعض نے سامان رسد کی دشواریاں دور کرنے کے لیے بڑے پیمانہ پر غلہ کی کاشت شروع کی اور غلہ پیسنے کے لیے بڑی بڑی پون چکیاں قائم کیں، بعض نے

انگور کے باغ لگائے اور سپاہیوں کے لیے ایک قسم کی جو کی شراب تیار کی، آلات اور مشینوں کی فراہمی کے لیے کارخانے قائم کیے گئے، زمین سے خام شورہ نکالا گیا اور شورہ کے کارخانوں میں فوج کی ضروریات کے لیے کافی بارود تیار کی گئی۔

علمی سرگرمیاں علمی سرگرمیوں کا بھی یہی حال تھا، نپولین نے ایک کیمیاوی معمل قائم کیا جہاں فرانس کے مشہور علمائے سائنس برتھولے (Bertholell) اور مونج (Monge) تجربے کیا کرتے تھے، نپولین ان تجربوں کو دیکھنے کے لیے خود بھی ہفتہ میں کئی بار معمل میں جایا کرتا تھا، اس نے علمائے سائنس کی ایک مجلس ''ادارۂ مصریہ'' کے نام سے قائم کی جس کا افتتاح ۲۲ راگست ۱۷۹۸ء[1] کو ایک مملوک سردار کے محل میں بڑی شان وشوکت کے ساتھ کیا گیا، مونج اس مجلس کا صدر اور نپولین نائب صدر تھا، اس مجلس میں متعدد علمی شعبے تھے، نپولین نے اپنا نام شعبہ ریاضیات میں درج کرایا، ارکان مجلس کے کارنامے علمی تجربات تک محدود نہ تھے، بلکہ ان کی سرگرمیوں کا کافی حصہ مصر کے آثار قدیمہ، وادی نیل کی پیمائش اور ارضیاتی تحقیقات پر مشتمل تھا، نپولین نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ''اصلی اور واحد فتوحات جن پر بعد میں افسوس اور پشیمانی نہیں ہوتی وہی ہیں جو جہالت پر حاصل کی جائیں'' مصر کے چند روزہ قیام میں اس نے جو کچھ کر دکھایا وہ اس کے تمام کارناموں میں اس قول کی بہترین شرح ہے۔

مصریوں سے میل جول نپولین کی ان سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مصر میں گویا مستقل طور پر قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، ملکی باشندوں سے میل جول بڑھانے کے لیے اس نے ان کے رسم ورواج میں اختیار کر لیے اور اپنی قوم کے بعض رواج ان میں جاری کیے، وہ کبھی کبھی مصری لباس بھی پہنا کرتا تھا، اس نے مدرسے قائم کیے، سڑکوں اور نہروں کی مرمت کرائی اور نوجوان مصری عورتوں سے اپنے سپاہیوں کی شادی کر دی، فرانسیسی سپاہی بھی نئے ماحول سے جلد مانوس ہو گئے اور قاہرہ کے عیش وعشرت میں وطن کی یاد بھول گئے۔

---

[1] ہالینڈ روز ص ۱۹۵-۱۹۴۔

قاہرہ کی بغاوت لیکن نپولین اگر یہ سمجھتا تھا کہ ان کارروائیوں سے اہل مصر فرانسیسی حکومت کو خوشی کے ساتھ قبول کرلیں گے تو اس کی غلط فہمی بہت جلد دور ہوگئی، ۲۱/ اکتوبر ۱۷۹۸ء کو قاہرہ میں ایک زبردست بغاوت نمودار ہوئی، جس میں بہت سے فرانسیسی مارے گئے، تاہم محبان وطن کی یہ کوشش بالکل ناکام رہی، ان سے نہایت خوف ناک انتقام لیا گیا، فرانسیسی مورخ ارنسٹ ہامیل (Ernest Hamel) لکھتا ہے:

> "یہ بغاوت ہول ناک، وحشیانہ اور ظالمانہ طریقہ سے فرو کی گئی، دستے تقسیم کرکے فوج باغیوں پر ٹوٹ پڑی اور انہیں چن چن ذبح کرکے ڈال دیا، بوناپارٹ نے حکم دے دیا کہ تمام مسلح باشندے جو سڑک پر پائے جائیں قتل کردیے جائیں، باغیوں نے جلد اطاعت قبول کرلی، اگرچہ ان کے پانچ ہزار سے زیادہ آدمی قتل ہوگئے، فاتح (نپولین) کی رحم دلی کی بہت کچھ تعریف کی گئی ہے لیکن اس رحم دلی کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے، ایک مقررہ مدت تک تیس قیدی روزانہ قتل کیے جاتے رہے، مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں وحشت بیٹھ جائے، ایک روز صبح کو فرانسیسی دستے خچروں کا ایک جھنڈ جن پر بورے لدے ہوئے تھے، ہنکاتے ہوئے قاہرہ میں لائے، اس وقت وہاں آدمیوں کا بڑا اژدہام تھا اور ہر شخص یہ معلوم کرنے کا مشتاق تھا کہ بوروں میں کیا چیز ہے، سپاہیوں نے بیک وقت تمام بورے کھول ڈالے اور ان کے اندر سے سیکڑوں سر برآمد ہوئے، آخر ان بدنصیبوں کا جرم کیا تھا؟ صرف یہ کہ وہ اپنے وطن کو آزاد کرانا چاہتے تھے، جسے دشمن نے حملہ کرکے برباد کرڈالا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ ریگستان کے سیاہ باشندے یورپین تہذیب کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ کریں گے۔"[1]

اعلانِ جنگ نپولین کے حملہ کے وقت مصر اگرچہ عملاً مملوکوں کے زیر تسلط تھا، تاہم دولت عثمانیہ کی سیادت بدستور تسلیم کی جاتی تھی اور وہاں کا حاکم اعلیٰ باب عالی ہی کا فرستادہ

---

[1] اسٹوریخس ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۱۲، ص ۴۶۷۔

پاشا ہوا کرتا تھا، چوں کہ سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت قابل اطمینان نہ تھی اور سمندر کی راہ سے فرانسیسی فوجوں کی کمک روکی نہیں جا سکتی تھی، اس لیے سلیم کو اعلان جنگ کرنے میں کسی قدر تامل تھا لیکن مصر کی فتح سے ہندوستان پر بھی زد پڑتی تھی اور نپولین کی "مشرقی سلطنت" کی اسکیم اب مخفی نہ رہ گئی تھی، اس لیے انگلستان نے اس خطرہ کے سدباب کے لیے باب عالی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، اسی طرح روس نے بھی فرانس کی دشمنی میں دولت علیہ سے اتحاد کرنے کی خواہش کی اور اپنا جنگی بیڑہ اس کی مدد کے لیے پیش کیا، چنانچہ سلطنت عثمانیہ، انگلستان اور روس کے درمیان ایک اتحاد قائم ہو گیا اور باب عالی نے ۲۱ر ربیع الاول ۱۲۱۳ھ (۲ر ستمبر ۱۷۹۸ء) کو جمہوریہ فرانس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا، اس کے بعد روسی اور ترکی بیڑوں نے دردانیال سے نکل کر جزائر آئیونین پر قبضہ کر لیا، جو معاہدہ کیمپو فورمیو کے رو سے سلطنت فرانس میں شامل کر لیے گئے تھے، روس اور دولت عثمانیہ کا یہ پہلا اتحاد تھا جو ایک متفقہ جنگ کے لیے کیا گیا تھا، دونوں حلیف اب تک ایک دوسرے کے شدید ترین دشمن تھے۔

شام سلیم نے شام اور جزیرہ روڈس میں فوجوں کی تیاری کا حکم دیا، شام کی فوج کا سپہ سالار جزار پاشا مقرر ہوا جو اپنی سابق خودسری کے باوجود اس وقت دولت عثمانیہ کی خدمت کے لیے آمادہ ہو گیا تھا، تجویز یہ تھی کہ شامی فوج صحرا کو عبور کر کے فرانسیسیوں پر مصر میں حملہ آور ہو اور اسی وقت مصطفیٰ پاشا روڈس کی فوج کے ساتھ خلیج ابوقیر کی طرف سے حملہ کرے لیکن بجائے اس کے کہ نپولین مصر میں ان حملوں کا انتظار کرتا، وہ پچیس ہزار سپاہیوں کو لے کر جن میں کچھ مملوک بھی شامل تھے، جنوری ۱۷۹۹ء میں شام کی طرف روانہ ہو گیا اور ۱۵ر فروری کو العریش، ۲۵ر فروری کو غزہ اور ۷ر مارچ کو یافہ فتح کر لیا، یافہ کے ترکی دستے نے جس کی تعداد پانچ ہزار تھی، اس شرط پر ہتھیار ڈالے تھے کہ انھیں فوجی قیدی سمجھا جائے گا لیکن شہر پر قبضہ کرنے کے بعد نپولین نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور پورے دستہ کو قتل

کرا دیا۔

اس کے بعد وہ عکا کی طرف بڑھا جس کی فتح کے بعد پورے شام کی فتح میں کوئی روک باقی نہ رہ جاتی، ۲۰/ مارچ کو محاصرہ شروع ہوا اور دو مہینے تک جاری رہا لیکن نپولین کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور یہ شہر فتح نہ ہو سکا، محصورین کی غیر معمولی شجاعت کے علاوہ ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی بحری سمت سے عکا کو مدد برابر پہنچ رہی تھی اور محاصرہ کے لیے جو بڑی بڑی توپیں نپولین نے سمندر کے راستے سے روانہ کی تھیں انہیں انگریز امیر البحر سر سڈنی اسمتھ نے چھین لیا تھا اور خود فرانسیسیوں کے خلاف استعمال کر رہا تھا، اس درمیان میں نپولین کو یہ اطلاع ملی کہ دمشق کی عثمانی فوج عکا کی مدد کے لیے روانہ ہو چکی ہے، اس نے جنرل کلیبر کو ایک دستہ کے ساتھ روانہ کیا کہ اس فوج کو آگے بڑھنے سے روکے، جبل طابور کے قریب فریقین کا مقابلہ ہوا اور ترکوں نے کلیبر کے پورے دستہ کو گھیر لیا، اگر نپولین عین وقت پر اس کی مدد کے لیے نہ پہنچ جاتا تو کلیبر مع اپنے سپاہیوں کے گرفتار ہو جاتا لیکن ۱۶/ اپریل کو جبل طابور پہنچتے ہی اس نے ترکوں کو شکست دے کر بھگا دیا، اس کے بعد وہ پھر عکا واپس آ گیا، ۷/ مئی کو روڈس سے فوجی کمک پہنچی، جس سے محصورین کے حوصلے اور بڑھ گئے، اس کے بعد کلیبر نے پوری قوت کے ساتھ ایک آخری حملہ قلعہ پر کیا، مگر وہ بھی اور حملوں کی طرح ناکام رہا، بالآخر مایوس ہو کر نپولین نے ۲۰/ مئی کو محاصرہ اٹھا لیا اور مصر کی طرف روانہ ہوا، اس کی "مشرقی سلطنت" کی اسکیم ہمیشہ کے لیے درہم برہم ہو گئی، عکا کی طرف دیکھ کر اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ "اس حقیر قلعہ سے مشرق کی قسمت وابستہ تھی۔"

جنگ ابو قیر نپولین کے مصر پہنچنے کے بعد ہی روڈس کی پندرہ ہزار عثمانی فوج مصطفیٰ پاشا کے زیر قیادت خلیج ابو قیر میں داخل ہوئی اور آسانی کے ساتھ وہاں کے فرانسیسی دستہ کو شکست دے دی، یہ سن کر نپولین فوراً قاہرہ سے روانہ ہو کر ۲۵/ جولائی کو ابو قیر پہنچا، مصطفیٰ پاشا پہلے سے تیار تھا، لڑائی گھمسان کی ہوئی اور ترک ایسی بہادری سے لڑے کہ فرانسیسیوں کے پیر

اکھڑ گئے لیکن فتح کے جوش میں انہوں نے منتشر ہو کر زخمی سپاہیوں کے سر کاٹنے شروع کر دیے، نپولین نے فوراً اس حالت سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تازہ دم دستوں کو جنرل میورا (Murat) کی سرکردگی میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا، میورا عثمانی سر عسکر کے خیمہ تک پہنچ گیا یہاں تک کہ دونوں میں دست بدست لڑائی ہونے لگی اور دونوں نے ایک دوسرے کو زخمی کیا، اس عرصہ میں ترک جو پہلے ہی منتشر ہو چکے تھے فرانسیسیوں کے تازہ حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے، بہتیرے جان بچانے کے لیے سمندر میں کود پڑے اور ان میں سے زیادہ تر ڈوب کر ہلاک ہو گئے، ایسی صورت میں مصطفیٰ پاشا کے لیے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، اس فتح نے عکا کی ناکامی کی کچھ تلافی کر دی اور مصر میں نپولین کا اقتدار قائم ہو گیا۔

مصر پر عثمانی تسلط ان ہی دنوں فرانس سے جو اطلاعات موصول ہوئیں ان کے لحاظ سے نپولین نے جلد از جلد وہاں پہنچ جانا ضروری خیال کیا، چنانچہ مصر کا انتظام جنرل کلیبر کو سپرد کر کے وہ ۲۲ر اگست کو نہایت خفیہ طور پر اپنے بعض افسروں کے ساتھ اسکندریہ سے فرانس کو روانہ ہو گیا، کلیبر نے سڈنی اسمتھ سے جو مصطفیٰ پاشا کی فوج کے ساتھ مصر آیا تھا، صلح کی گفتگو شروع کی اور بالآخر تخلیہ مصر کا معاہدہ کر لیا لیکن جب برطانوی امیر البحر لارڈ کائتھ (Keith) نے اس امر پر اصرار کیا کہ فرانسیسی فوج کو اپنے ہتھیار رکھ دینے چاہئیں تو کلیبر نے غصہ سے معاہدہ چاک کر ڈالا اور اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا "سپاہیو! اس گستاخی کا جواب فتوحات کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا" چنانچہ وہ چھ ہزار کا ایک دستہ لے کر عثمانی فوج پر حملہ آور ہوا جو اوائل ۱۸۰۰ء میں صدر اعظم کے زیر کمان مصر پہنچی تھی اور ۲۰ر مارچ کو ہیلیو پولس (Halic Polis) کی جنگ میں اسے شکست دی لیکن اس کے چند روز بعد کسی نے اسے قتل کر دیا، کلیبر کا جانشین منو (Menou) اپنی فوجی لیاقت کے اعتبار سے اس کا ہم پلہ نہ تھا، جنگ ہیلیو پولس کے بعد ایک سال تک فرانسیسی فوج مصر پر قابض رہی، مارچ ۱۸۰۱ء

میں سر ابر کرومبی (Abercromby) کی سرکردگی میں ایک انگریزی فوج مصر آئی، اس کے بعد ایک دوسری فوج جنرل بیرڈ (Baird) کے ساتھ پہنچی، فرانسیسی فوج کا کچھ حصہ قاہرہ میں تھا اور کچھ اسکندریہ میں، مارچ میں سر ابر کرومبی نے اسکندریہ میں فرانسیسیوں کو شکست دی اور جون میں ترکی اور انگریزی فوجوں نے قاہرہ کے فرانسیسی دستہ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا، ستمبر میں فرانسیسی سپہ سالار نے مصر سے نکل جانے کا معاہدہ کیا، فرانسیسی فوج کو انگریزی جہازوں پر فرانس واپس جانے کی اجازت دی گئی اور مصر پر دولت عثمانیہ کا تسلط از سر نو قائم ہو گیا۔

فرانس سے صلح مارچ ۱۸۰۲ء میں انگلستان اور فرانس کے درمیان معاہدۂ امیان (Amiens) کے رو سے ایک عارضی صلح ہو گئی، ساتھ ہی فرانس اور دولت علیہ کے درمیان بھی صلح نامہ ہو گیا، نپولین نے فرانس کے قونصل اول کی حیثیت سے مصر پر دولت عثمانیہ کی فرماں روائی تسلیم کر لی اور سلطان نے ان حقوق اور مراعات کی تجدید کی جو اہل فرانس کو اپنے سابق بادشاہوں کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھے۔

اندرونی شورشیں ۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہو جانے کے بعد سلیم کو چند سال کے لیے جنگ سے مہلت مل گئی لیکن جہاں تک سکون کا تعلق تھا وہ اس مختصر فرصت میں بھی میسر نہ آیا، وہابیوں نے شام پر از سر نو حملہ شروع کر دیا تھا، ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں انہوں نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر قبضہ کر کے تمام عرب پر اپنا تسلط قائم کر لیا، مصر میں فرانسیسی فوجوں کے چلے جانے کے بعد ممالک کی خودسری بدستور شروع ہو گئی، باب عالی کی طرف سے جو فوجیں ان کے مقابلہ کے لیے بھیجی گئیں ان سے وہ عرصہ تک لڑتے رہے، شام میں جزار پاشا پھر خود مختار بن بیٹھا اور مرتے دم (۱۸۰۴ء) تک سرکشی پر قائم رہا، ودین میں پزوان اوغلو کی بغاوت باب عالی کی انتہائی کوششوں کے بعد بھی فرو نہ ہو سکی، یہاں تک کہ سلیم نے مجبور ہو کر ۱۸۰۶ء میں اس کی پوری مدت حیات تک کے لیے اسے ان تمام علاقوں کا حاکم تسلیم کر لیا جن پر وہ بہ اختیار خود قابض ہو گیا تھا اور بطور سند اس کو درجہ اول کے پاشا کا نشان

عطا کیا، غرض صلح کے زمانہ میں بھی سلطنت کے مختلف حصوں میں شورش برپا تھی۔

سرویا سب سے زیادہ نازک سرویا کا حال تھا، اس وقت سرویا کا والی حاجی مصطفیٰ پاشا تھا، وہ ایک نہایت رحم دل اور دردمند شخص تھا اور رعایا میں اس قدر مقبول تھا کہ عیسائی اسے ”اہل سرویا کی ماں“ پکارتے تھے، اس کے عہد میں ہر طرف امن و امان تھا، تجارت ترقی پر تھی اور سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف ہوتا تھا[1] لیکن سلیم کی فوجی اصلاحات نے سرویا کے ینی چری دستوں کو اتنا برانگیختہ کیا کہ انہوں نے بغاوت کر کے تمام صوبہ میں قتل و غارت گری شروع کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ سرویا کے باشندے عاجز آ کر ان کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور سلطانی فوجوں کی مدد سے ان کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا مگر اس کامیابی سے ان کے اندر آزادی کا حوصلہ پیدا ہو گیا اور اب انہوں نے وطنی آزادی کے لیے خود دولت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

اس جرأت کے مختلف اسباب تھے، سلطنت عثمانیہ اور آسٹریا کی گذشتہ جنگ میں جس کا خاتمہ صلح نامہ سستووا پر ہوا تھا، جب آسٹریا کی فوجیں سرویا میں داخل ہوئیں تو وہاں کی عیسائی رعایا نے حملہ آوروں کا خیر مقدم کیا اور فوجی دستے قائم کر کے دولت علیہ کے خلاف آسٹریا کو بہت کچھ مدد پہنچائی، صلح نامہ سستووا کے رو سے سرویا پھر دولت عثمانیہ کو واپس مل گیا، عثمانی تسلط کے قائم ہونے پر عیسائی رعایا کے فوجی دستے توڑ دیے گئے لیکن پچھلی جنگ میں جو فوجی روح ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی وہ فنا نہ ہوئی، اس روح کو حاجی مصطفیٰ نے بھی زندہ رکھنا چاہا، اس نے رعایا کو ینی چری کی غارت گری سے محفوظ رکھنے کے لیے سروی کسانوں کے مسلح دستے قائم کر دیے، تحریک آزادی کا ایک دوسرا سبب وہ شورشیں تھیں جو خود مختار حکومت قائم کرنے کے سلسلہ میں متعدد صوبوں میں برپا تھیں، سرویا بھی ان شورشوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کے باشندوں میں بھی آزادی کا جذبہ پیدا ہو

---

[1] ریز تجزیے بلقان از طرہ ص ۳۰۹۔

گیا، یہ جذبہ انقلاب فرانس کی ہنگامہ خیزیوں سے اور بھی ترقی کر گیا لیکن ان اسباب کے باوجود سرویا میں قومی آزادی کی تحریک دفعۃً تیز نہ ہوجاتی اگر ینی چری نے اپنے مظالم سے وہاں کے باشندوں کو عاجز نہ کر دیا ہوتا۔

ینی چری کی قتل وغارت گری | یوں تو سلطنت کے ہر حصہ میں ینی چری کی خودسری بڑھی ہوئی تھی لیکن سرویا میں بالخصوص ان کی سرکشی کی کوئی انتہا نہ تھی، بلغراد اور دوسرے شہروں کے ینی چری دستے نہ صرف عیسائی رعایا میں لوٹ مار اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کیے ہوئے تھے، بلکہ اپنے ہم مذہب ''سپاہی'' جاگیرداروں پر بھی جن کو وہاں کی زمینیں سلطان کی طرف سے فوجی خدمات کے صلہ میں ملی تھیں، ان کا دست ستم اتنا ہی دراز تھا۔ چنانچہ عیسائی رعایا اور سپاہی جاگیردار دونوں نے ینی چری کے مظالم کے خلاف باب عالی میں فریاد کی، سلیم نے بکیر پاشا کو بلغراد کا والی مقرر کر کے روانہ کیا اور اسے حکم دیا کہ ینی چری دستوں کو بلغراد اور سرویا کے تمام علاقوں سے نکال دے، بکیر پاشا نے ینی چری سردار دلی احمد کو قتل کر کے انہیں سرویا سے نکال دیا، ینی چری نے پزوان اوغلو باغی ودین کے یہاں جا کر پناہ لی، پزوان اوغلو نے ان کی سفارش باب عالی میں کی اور اس بات کی اجازت دلوا دی کہ اگر وہ امن وسکون کے ساتھ رہنے کا وعدہ کریں تو بلغراد واپس آ سکتے ہیں لیکن سرویا میں داخل ہونے کے بعد ان کی غارت گری بدستور سابق پھر شروع ہوگئی، اس وقت حاجی مصطفیٰ پاشا نے جو بکیر پاشا کے بعد سرویا کا والی مقرر ہوا تھا، اہل سرویا کو ینی چری کے مقابلہ کے لیے ابھارا، چنانچہ سروی دستوں نے پاشا اور سپاہی جاگیرداروں کی مدد سے باغیوں کو شکست دے کر بھگا دیا، اس واقعہ کی اطلاع جب قسطنطنیہ اور سلطنت کے دوسرے حصوں کے ینی چری دستوں کو پہنچی تو ان میں سخت برہمی پیدا ہوئی، علماء اور عام مسلمانوں کو بھی کفار کی مدد سے ینی چری کا سرویا سے نکالا جانا حد درجہ ناگوار ہوا، سلیم نے رائے عامہ سے مجبور ہو کر مصطفیٰ پاشا کو حکم دیا کہ ینی چری کو بلغراد واپس آنے کی اجازت دے دی جائے لیکن انہوں

نے سرویا میں آتے ہی اپنے دشمنوں سے پورا پورا انتقام لینا شروع کر دیا، چنانچہ بلغراد پہنچ کر انہوں نے مصطفیٰ پاشا کو قتل کر دیا اور پورے صوبہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اپنی جماعت کے چار سرداروں کو ہر حصہ کا حاکم مقرر کیا، اپنی تعداد کو ناکافی دیکھ کر انہوں نے بوسنیا اور البانیا کے باغیوں کی ایک مسلح فوج بھی تیار کر لی اور اس کے بعد بے خوف ہو کر لوٹ مار کرنے لگے، یہاں تک کہ ان کے مظالم سے عیسائی رعایا اور مسلمان جاگیردار دونوں بالکل عاجز آ گئے، باب عالی کے پاس اس وقت اتنی فوج نہ تھی کہ انہیں قابو میں لا سکے، اس لیے اس نے صرف دھمکی سے کام نکالنا چاہا اور انہیں متنبہ کیا کہ اگر وہ اپنا ہاتھ نہ روکیں گے تو ان کی سرکوبی کے لیے غیر قوم اور غیر مذہب کے سپاہی متعین کر دیے جائیں گے، ینی چری نے یہ قیاس کر کے کہ ان سپاہیوں سے باب عالی کی مراد سرویا کے عیسائی باشندے ہیں، انہیں بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔

ینی چری کا استیصال سرویا کے باشندوں میں آزادی کی روح اس سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی، انہوں نے فوجی تربیت بھی ایک حد تک حاصل کر لی تھی، سلطانی فوج کی مدد سے ایک بار وہ ان ہی ینی چری دستوں کو شکست بھی دے چکے تھے، چنانچہ اب متفقہ طور پر انہوں نے اپنی قوم کے ایک کسان جارج پیٹروچ (George Petrowitcsh) کو جو تاریخ میں عموماً قرہ جارج کے نام سے مشہور ہے، سپہ سالار مقرر کر کے ینی چری کا مقابلہ شروع کیا، سپاہی جاگیرداروں نے بھی ان کی مدد کی اور باب عالی کی فوجیں بھی بکیر پاشا والی بوسنیا کی سرکردگی میں ان کی مدد کے لیے آ گئیں، باب عالی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کی بار بلغراد کے ینی چری دستوں کا کامل استیصال کر دیا جائے، عیسائی رعایا بھی انتہائی غیظ و غضب میں ان کی بیخ کنی پر آمادہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ینی چری کو شکست ہوئی، کچھ بھاگ کر پزوان اوغلو کے پاس پناہ گزیں ہوئے، بقیہ قتل کر دیے گئے۔

سرویا کا مطالبۂ آزادی ینی چری کے استیصال کے بعد باب عالی نے حکم دیا کہ چوں کہ

ملک میں امن وامان قائم ہو گیا ہے، اس لیے سروی دستوں کے باقی رکھنے کی ضرورت نہیں رہی، وہ توڑ دیے جائیں لیکن عیسائیوں میں اب آزادی کا حوصلہ پیدا ہو چکا تھا، ینی جری کو شکست دے کر ان کی ہمتیں بہت بڑھی ہوئی تھیں، بلغراد اور چند دوسرے قلعوں کے علاوہ سرویہ کے باقی تمام علاقوں پر ان ہی کا قبضہ تھا، چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ باب عالی کے حکم کی تعمیل میں ہتھیار رکھ کر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے اور جاگیرداروں کے ماتحت زراعت اور دوسرے کاروبار میں بدستور سابق مشغول ہو جاتے، انہوں نے ملکی آزادی حاصل کرنے کے لیے خود دولت علیہ کے خلاف جنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور فوجی مدد کے لیے ایک وفد اگست ۱۸۰۴ء میں زار روس کی خدمت میں بھیجا، زار نے انہیں مشورہ دیا کہ جنگ شروع کرنے سے قبل اپنے مطالبات باب عالی میں پیش کریں اور وعدہ کیا کہ باب عالی پر دباؤ ڈال کر ان کے مطالبات منظور کرانے کی کوشش کرے گا، چنانچہ اس ہدایت کے بموجب ۱۸۰۵ء میں اہل سرویا نے ایک وفد قسطنطنیہ بھیجا اور باب عالی سے یہ درخواست کی کہ آئندہ سرویا کے تمام قلعوں میں سروی دستے متعین کر دیے جائیں اور چوں کہ گذشتہ ہنگاموں میں پورا صوبہ سخت مصیبتوں میں مبتلا تھا، اس لیے خراج اور محاصل کا تمام بقایا معاف کر دیا جائے، ان میں سے پہلا مطالبہ نہایت اہم تھا، اس کے معنی یہ تھے کہ دولت عثمانیہ کے زیر سیادت انہیں حکومت خود اختیاری دے دی جائے۔

روس کی جنگی تیاریاں اس وقت روس اور فرانس میں جنگ چھڑ چکی تھی اور روس باب عالی میں اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اس جنگ میں دولت عثمانیہ کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا، ۱۷۹۸ء کے بعد جب روس اور دولت علیہ میں اتحاد قائم ہوا تو سلیم نے روس کو بہت سی خاص مراعات دے دی تھیں، جن کو ترک نہایت خطرناک خیال کرتے تھے، مثلاً ۱۸۰۱ء میں فرانس سے صلح ہو جانے کے بعد بھی اس نے روسی جہازوں کے لیے باسفورس اور دردانیال سے گزرنے کی اجازت باقی رکھی، حالاں کہ

یہ اجازت ابتداءً محض ضرورت جنگ کی بنا پر دی گئی تھی، قسطنطنیہ میں ترکوں نے اس اجازت کے قائم رکھنے پر اس قدر برہمی کا اظہار کیا کہ بالآخر مجبور ہو کر سلیم کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ اگر روس کسی ایسی حکومت سے برسرپیکار ہوگا جس کے تعلقات دولت عثمانیہ سے دوستانہ ہوں گے تو یہ اجازت منسوخ کر دی جائے گی۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر روس نے جزائر آئیونین میں اپنی فوجی قوت بہت بڑھا لی تھی اور ترک افسروں کے احتجاج کے باوجود البانیا کے باشندوں کو بھی اپنی فوج میں داخل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۰۲ء میں باب عالی نے روس سے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ مولڈیویا اور ولاچیا کے امیر اس کے مشوروں کے بغیر معزول نہ کیے جائیں گے اور تاجروں کے علاوہ دوسرے ترک ان علاقوں میں نہ رہ سکیں گے، یہ گویا مولڈیویا اور ولاچیا کو روس کی سرپرستی میں دے دینا تھا۔ ۱۸۰۵ء میں روس نے بحر اسود کے جنوبی مشرقی ساحل پر اپنا اقتدار اس سے بھی زیادہ قائم کر لیا، باب عالی نے اسے دریائے فاسس (واقع منگریلیا) میں جہازوں کی آمد و رفت اور ان جہازوں کی حفاظت کے لیے دریائے مذکور کے ساحلوں پر قلعے تعمیر کر کے ان میں فوجی دستے رکھنے کی اجازت دے دی، پاشائے ارض روم کو حکم ملا کہ ان قلعوں کی تعمیر میں روسیوں کی مدد کرے نیز جنگ ایران کے سلسلہ میں جو اس وقت روس سے جاری تھی، ان کی اعانت کرے، اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر روس نے ان ضلعوں پر بھی قبضہ کر لیا جو دریائے فاسس سے کافی فاصلہ پر واقع تھے اور قلعہ انکریا (Anakria) پر قبضہ کر کے ایک دوسرا قلعہ بحر اسود کے ساحل پر تعمیر کر لیا۔

یہ سب تیاریاں مکمل ہونے کے بعد جب زار نپولین کے خلاف آسٹریا اور انگلستان سے اتحاد کرنے جا رہا تھا تو روسی سفیر اٹالنسکی (Italinski) نے اپنی حکومت کی طرف سے یہ مطالبات پیش کیے کہ باب عالی روس کے ساتھ فوراً ایک جارحانہ اور مدافعانہ اتحاد کر لے، نیز اپنی تمام رعایا کو جو کلیسائے یونان کی پیرو ہو زار کی سرپرستی میں دے دے اور اس بات کا وعدہ کرے کہ جب کبھی ترکوں کی طرف سے ان کے ساتھ کوئی زیادتی ہوگی تو سفیر

روس کی درخواست پر باب عالی اس کی تلافی کرنے پر مجبور ہوگا، یہ مطالبات ٹھیک اس وقت پیش کیے گئے جب روس ہی کی تحریک پر سرویا کے وفد نے اپنے مطالبات باب عالی میں پیش کیے تھے، یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سرویا کے عیسائی یونانی کلیسا کے پیرو تھے۔

سلیم کے لیے روس کے یہ مطالبات ناقابل برداشت تھے، خصوصاً وہ جس کا تعلق عیسائی رعایا کی سرپرستی سے تھا کیوں کہ اس کی منظوری حقیقۃً روس کی غلامی کے مترادف تھی لیکن اس خطرہ سے کہ روسی فوجیں جو بحر اسود کی بندرگاہوں میں جمع تھیں، آٹھ روز کے اندر قسطنطنیہ پہنچ سکتی ہیں، روس نے جو دستے جزائر آئیونین میں اکٹھا کر لیے تھے وہ فوراً البانیا میں داخل ہو کر البانی اور یونانی باغیوں کے ساتھ اورنہ پر چڑھائی کر سکتے تھے، جارجیا کی روسی فوجیں جو ایرانیوں کے مقابلہ میں فتح یاب ہو چکی تھیں، ایشیائے کوچک کی راہ سے دارالسلطنت کی طرف بڑھ سکتی ہیں اور سرویا کے عیسائیوں کو ملا کر روس بلغاریا پر قبضہ کر سکتا ہے، سلیم اور ارکان دیوان نے یہی مناسب خیال کیا کہ ان مطالبات پر گفت و شنید کا سلسلہ کچھ دنوں جاری رکھا جائے اور اس درمیان میں ان حملوں سے بچنے کے لیے جو تدبیریں ممکن ہوں، اختیار کی جائیں، چنانچہ اٹالنسکی سے گفتگو شروع ہوئی اور اس کا سلسلہ کچھ عرصہ تک قائم رہا، اس فرصت میں سلیم نہایت سرگرمی کے ساتھ مدافعت کی تیاریاں کرتا رہا۔

سرویا کی آزادی

سلیم کو یقین تھا کہ روس سے جنگ ناگزیر ہے، اس لیے وہ سرویا کے مسئلہ کو جلد سے جلد طے کر لینا چاہتا تھا، آئندہ جنگ کے خیال سے وہ سرویا کے ساتھ برسرپیکار ہونا مناسب نہیں سمجھتا تھا لیکن چوں کہ سرویا کی وفاداری پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس بات کا قوی احتمال تھا کہ لڑائی میں سرویا روس کا ساتھ دے گا نیز اس اندیشہ سے بھی کہ اگر سرویا کا مطالبہ منظور کر کے بلغراد اور دوسرے قلعوں سے ترکی دستے نکال لیے گئے تو قسطنطنیہ میں سخت شورش برپا ہو جائے گی، سلیم نے اس مطالبہ کو نامنظور کر دیا اور سروی وفد کو قید کر لینے کا حکم دیا، ساتھ ہی اس نے نیش کے پاشا کو سرویا کی بغاوت فرو کرنے کے لیے

روانہ کیا، قرہ جارج نے پاشا کی فوج کا سرحد پر مقابلہ کیا اور اسے شکست دی، اس کے بعد سلیم نے دو فوجیں اور روانہ کیں، مگر اہل سرویا نے قرہ جارج کی سرکردگی میں انہیں بھی شکست دی اور بلغراد اور دوسرے سروی قلعوں پر جن میں ترکی دستے متعین تھے، قبضہ کرلیا، اس طرح ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں سرویا کے عیسائیوں نے بغیر کسی بیرونی مدد کے تقریباً کامل خودمختاری حاصل کرلی۔

فرانس سے اتحاد

اس درمیان میں یورپ میں جنگ چھڑ چکی تھی اور ایک طرف فرانس اور دوسری طرف روس اور انگلستان، اس جنگ میں سلطنت عثمانیہ کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کر رہے تھے، اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے روسی سفیر کا تقاضا بھی برابر جاری تھا، برخلاف اس کے فرانسیسی سفیر سلیم پر زور ڈال رہا تھا کہ وہ ان مطالبات کو مسترد کر دے اور نپولین کو شہنشاہ فرانس تسلیم کرکے فرانس کے ساتھ اتحاد قائم کرلے، روسی اور برطانوی سفیر نپولین کو شہنشاہ تسلیم کرنے کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے متفقہ طور پر باب عالی کو دھمکی دی کہ اگر ایسا کیا گیا تو جنگ کا اعلان فوراً کر دیا جائے گا، قسطنطنیہ میں دونوں فریق کی کوششیں ابھی جاری تھیں کہ نپولین نے آسٹریا اور روس کی فوجوں کو زبردست شکست دے کر باب عالی کے لیت ولعل کا ایک حد تک خاتمہ کر دیا، ان شکستوں کا فوری اثر یہ ہوا کہ پندرہ ہزار روسی فوج جو سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے سیاسٹوپول میں تیار رکھی گئی تھی، وسط روس میں واپس بلالی گئی کیوں کہ وہاں کی فوجیں فرانسیسیوں کے مقابلہ میں مغرب کی جانب روانہ ہو رہی تھیں، نپولین کی ان فتوحات کا ایک دوسرا نمایاں اثر یہ ہوا کہ روسی سفیر کا لب ولہجہ بالکل بدل گیا اور اس کے مطالبات کی شدت باقی نہیں رہی، چنانچہ باب عالی کو اب روس کی طرف سے وہ خطرہ نہ رہا جو پہلے تھا اور وہ فرانس سے اتحاد کرنے پر مائل ہونے لگا۔

روس سے اعلان جنگ

۲۶/ دسمبر ۱۸۰۵ء کو معاہدہ پریسبرگ (Presburg) کے رو سے فرانس اور آسٹریا کے درمیان صلح ہوگئی، من جملہ اور علاقوں کے ڈلماشیا اور کروشیا کا

ایک حصہ فرانس کے ہاتھ آیا اور اب فرانسیسی اور عثمانی سلطنتیں ہم سرحد ہو گئیں، فرانسیسی سفیر نے اس صلح نامہ کی ایک نقل صدر اعظم کے سامنے پیش کی اور ان فوائد کو مفصل طور پر بیان کیا جو نپولین کی دوستی سے دولت عثمانیہ کو حاصل ہو سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ باب عالی نے نپولین کو فرانس کا شہنشاہ تسلیم کر لیا، ۱۸۰۶ء میں نپولین نے جنرل سباستیانی (Sebastiani) کو اپنا غیر معمولی سفیر بنا کر سلیم کے پاس بھیجا، سباستیانی نے اس بات کی کوشش کی کہ دولت عثمانیہ اور روس میں جنگ چھڑ جائے تاکہ زار کو اپنی کچھ فوجیں پولینڈ سے ہٹا لینی پڑیں جہاں وہ فرانس کی فاتح افواج کے مقابلہ میں فریڈرک ولیم، شاہ پرشا کی مدد کر رہا تھا، چنانچہ سباستیانی کی تحریک پر سلیم نے مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کو جن کی نسبت تقریباً یقین تھا کہ وہ روس کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں اور اس سے سازش کر کے دولت علیہ کو نقصان پہنچا رہے ہیں، ان حکومتوں سے برطرف کر دیا، چوں کہ یہ فعل ۱۸۰۲ء کے معاہدہ کے خلاف تھا، اس لیے روسی سفیر نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، سفیر برطانیہ نے بھی اس احتجاج میں روس کی ہم نوائی کی اور دونوں ملکوں نے باب عالی کو یہ دھمکی دی کہ عن قریب روسی فوجیں مولڈیویا میں داخل ہوں گی اور انگریزی بیڑہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے گا، سلیم نے معاہدہ مذکور کی خلاف ورزی کی تلافی کر دینی چاہی اور معزول شدہ امیروں کو دوبارہ مقرر کرنے کے لیے احکام جاری کیے لیکن اس سے قبل ہی روسی فوجیں مولڈیویا میں داخل ہو کر یاسی تک پہنچ چکی تھیں، زار الکزنڈر پہلے ہی سے جنگ کے لیے تیار تھا، مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کی معزولی سے اس کو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور اس نے فوراً بغیر کسی اعلان جنگ کے پینتیس ہزار فوج جنرل میکلسن (Michelson) کے زیر کمان ان صوبوں پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی، میکلسن تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا ۲۷ دسمبر ۱۸۰۶ء کو ولاچیا کے پایہ تخت بخارسٹ میں داخل ہو گیا، اب مجبور ہو کر باب عالی کو بھی روس کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑا۔

برطانیہ کا الٹی میٹم | حکومت برطانیہ نے روس کو پوری مدد دی، برطانوی سفیر مسٹر ار بتھنات

(Arbuthnot) نے باب عالی کو الٹی میٹم دیا کہ اگر روس اور انگلستان کے ساتھ دولت عثمانیہ فوراً اتحاد نہ کر لے گی اور فرانسیسی سفیر رخصت نہ کر دیا جائے گا تو روسی فوجیں نیز برطانیہ اور روس کے جنگی بیڑے حملہ کر دیں گے، رئیس آفندی (وزیر خارجہ) نے اربتھناٹ کو اس کے جواب میں یہ لکھا کہ دولت علیہ نے ہمیشہ جنگ سے احتراز کیا اور صلح قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن روس اسے [illegible] پر مجبور کرتا رہا، اس نے اپنے خط میں مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کا خاص طور پر حوالہ دیا کہ باوجود اس کے کہ سلطان نے انہیں معزول کر دیا تھا تاہم صرف روس کے مطالبہ پر اس نے اپنے سابق حکم کو منسوخ کر دیا اور انہیں دوبارہ مقرر کرنے کے لیے فرمان جاری کیا، سلطان نے یہ ذلت محض جنگ سے بچنے کی غرض سے گوارا کی لیکن روس نے اس کی پرواہ نہ کی اور بغیر کسی اعلان جنگ کے اپنی فوجیں مولڈیویا اور ولاچیا میں روانہ کر دیں، آخر میں اس نے لکھا کہ "اگر برطانیہ عظمیٰ روس کی مدد میں سلطان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے تو سلطان بھی قوت کا جواب قوت سے دے گا اور اس انتہائی نامنصفانہ حملہ سے بچنے کے لیے خدا کی ذات پر بھروسہ کرے گا اور اگر آخر کار ترکی کو فنا ہی ہونا ہے تو وہ اپنے پایہ تخت کی حفاظت کرنے میں فنا ہوگی اور اس وقت سب سے زیادہ خود انگریز قوم کو اس ناقابل تلافی نقصان کا تجربہ ہوگا جو سلطنت عثمانیہ کی تباہی سے واقع ہو کر رہے گا۔"[1]

یہ جواب پاتے ہی اربتھناٹ فوراً قسطنطنیہ سے روانہ ہو کر برطانوی بیڑہ پر پہنچی جو امیر البحر ڈک ورتھ (Duckworth) کی سرکردگی میں جزیرہ ٹینیڈوس کے قریب لنگر انداز تھا، ڈک ورتھ کو یہ ہدایت تھی کہ جلد سے جلد قسطنطنیہ پہنچ کر عثمانی بیڑہ کی سپردگی کا مطالبہ کرے اور اگر یہ مطالبہ پورا نہ کیا جائے تو عثمانی جہازوں میں آگ لگا کر قسطنطنیہ پر گولہ باری شروع کر دے، چنانچہ ۱۹ فروری ۱۸۰۷ء کو انگریزی بیڑہ بلا کسی نقصان کے درہ دانیال میں داخل ہو گیا اور بحر مارمورا میں پہنچ کر ترکوں کے ایک بڑے اور چار چھوٹے جہازوں پر گولہ باری کر

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۲۶۷۔

کے انہیں ڈبو دیا، دردانیال کی مورچہ بندی اس قدر کمزور تھی کہ انگریزی بیڑہ کو اس سے گزرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی اور ترکی توپوں کی گولہ باری کے باوجود جنوبی ہوا سے فائدہ اٹھا کر اس نے آبنائے کو عبور کر لیا، ڈک ورتھ قسطنطنیہ سے چند میل کے فاصلہ پر لنگر انداز ہوا اور مندرجہ ذیل شرائط صدر اعظم کی خدمت میں بھیجے:

۱- باب عالی روس اور انگلستان سے اتحاد کر لے۔

۲- عثمانی بیڑہ اور دردانیال کے قلعے انگلستان کے حوالے کر دیے جائیں۔

۳- روس کو مولڈیویا اور ولاچیا دے دیا جائے۔

۴- سباستیانی کو رخصت کر دیا جائے اور فرانس سے جنگ کا اعلان کر دیا جائے۔

باب عالی نے دس روز تک اربتھناٹ اور ڈک ورتھ کو صلح کی گفتگو میں مصروف رکھا، اس فرصت میں انتہائی جوش و سرگرمی کے ساتھ قسطنطنیہ کی قلعہ بندی کا کام ہوتا رہا، دارالسلطنت کی پوری مسلمان آبادی سلیم اور جنرل سباستیانی کے زیر ہدایت دن رات کام کرتی تھی اور اس نے اپنے حیرت انگیز عزم و جاں فشانی سے قسطنطنیہ کو اتنے مستحکم طریقہ پر قلعہ بند کرا لیا کہ برطانوی امیر البحر کو بے نیل و مرام واپس ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا، اسے خطرہ پیدا ہوا کہ مبادا وہ خود اپنے تمام جہازوں کے ساتھ گرفتار ہو جائے، چنانچہ یکم مارچ کو اس نے لنگر اٹھانے کا حکم دیا اور ۳/ مارچ کو دردانیال سے ہو کر واپس ہوا لیکن اب کی بار اس کا بیڑا بہ مشکل سلامت گزر سکا، قدیم ترکی توپوں نے بھی آٹھ سو پونڈ کے سنگی گولے انگریزی جہازوں پر برسانے شروع کیے، جن سے کئی جہاز زخمی ہوئے اور دو ڈوب گئے اور چھ سو آدمی ہلاک ہوئے۔

مصر کی ناکام مہم اس ذلت کی تلافی کے لیے برطانیہ نے پانچ ہزار فوج مصر پر حملہ کرنے کی غرض سے سسلی سے روانہ کی، یہ فوج ۱۸/ مارچ ۱۸۰۷ء کو اسکندریہ کے قریب اتری اور آگے بڑھ کر شہر پر حملہ آور ہوئی، اسکندریہ میں اس وقت ساڑھے چار سو ترکوں کا

ایک دستہ متعین تھا جو مقابلہ نہ کر سکا اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا لیکن انگریزی فوج کی یہی پہلی اور آخری کامیابی تھی، اس کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں، ان میں سے ہر ایک میں اسے شکست ہوئی اور سینکڑوں آدمی تلف ہو گئے، آخر کار یہ معلوم کر کے کہ ایک زبردست عثمانی فوج قاہرہ سے روانہ ہو کر مقابلہ کے لیے آ رہی ہے، جنرل فریزر (Fraser) نے صلح کا علم بلند کیا اور مصر سے نکل جانے کی یہ شرط پیش کی کہ تمام انگیز قیدی واپس کر دیے جائیں، یہ شرط منظور کر لی گئی اور ۲۵ ستمبر کو انگریزی بیڑہ ناکام و نامراد اسکندریہ سے روانہ ہو گیا۔

قسطنطنیہ اور مصر کی ان ناکام مہموں سے برطانیہ کے اقتدار کو شدید صدمہ پہنچا۔

روس سے جنگ کا سلسلہ ۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہو جانے کے بعد سلیم نے اصلاحات کا کام پھر شروع کر دیا تھا، دو تین سال کے اندر فوجی اصلاحات میں بہت ترقی ہو گئی تھی، فرانسیسی افسروں کی تربیت میں توپچیوں نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اب ان کی اہمیت ینی چری سے بھی زیادہ ہو گئی تھی، عکا کی مدافعت میں عمر آغا کی چھوٹی سی فوج نے ایسے جوہر دکھائے کہ ”نظام جدید“ کی برتری کا اعتراف دوست اور دشمن سب نے کیا، اسی فوج نے بلغاریا اور روملیا کے ڈاکوؤں کا بھی استیصال کر دیا جن کے زبردست جتھے ان صوبوں کے امن وامان کے لیے ایک مستقل خطرہ تھے، ان ڈاکوؤں کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ انہوں نے ینی چری کے دستوں کو بھی شکست دے کر بھگا دیا تھا، سلیم نے ”نظام جدید“ کے دو دستے اور قائم کر کے فرانسیسی افسروں کے زیر نگرانی انہیں یورپ کے بہترین فوجوں کے نمونہ پر تعلیم دلوائی، اس نے ان کی تنخواہ کے لیے ایک علاحدہ فنڈ بھی قائم کیا، بعض پاشاؤں خصوصاً عبدالرحمن پاشا والی کرمانیہ نے بھی ان فوجی اصلاحات میں سلیم کی پرجوش تائید کی اور اپنے صوبوں میں بھی یہ اصلاحات شروع کیں، سلیم کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ ۱۸۰۵ء میں اس نے ایک فرمان جاری کیا کہ آئندہ ینی چری اور سلطنت کی دوسری فوجوں میں سے بہترین نوجوان منتخب کر کے ”نظام جدید“ میں داخل کیے جائیں، اس فرمان کے جاری ہوتے ہی

ینی چری نے علانیہ بغاوت کردی، اس وقت ان کی قوت بغداد میں ٹوٹ چکی تھی لیکن دوسرے صوبوں میں وہ اب بھی طاقت ور تھے، چنانچہ ادرنہ میں دس ہزار ینی چری نے جمع ہوکر علم بغاوت بلند کردیا اور اگست ۱۸۰۶ء میں "نظام جدید" کے جو دستے انھیں قابو میں لانے کے لیے روانہ کیے گئے تھے، ان کو شکست دے دی، سلطنت کے اور حصوں میں بھی ان کی شورشیں اس قدر بڑھیں کہ سلیم کو نہ صرف یہ فرمان منسوخ کردینا پڑا بلکہ دوسری فوجی اصلاحات بھی فی الحال روک دینی پڑیں، مفتی اعظم صالح زادہ اسعد آفندی کے اثر سے بغاوت کا فتنہ جلد فرو ہوگیا، البتہ ینی چری کے مطالبہ پر صدر اعظم حافظ اسمٰعیل پاشا معزول کردیا گیا اور اس کی جگہ ینی چری کا آغا ابراہیم حلمی پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، "نظام جدید" کے خلاف شورش اتنی زیادہ تھی کہ ۱۸۰۶ء میں جب روس نے مولڈیویا اور ولاچیا پر چڑھائی کی تو باب عالی کو روسیوں کے مقابلہ میں ایک نئی فوج بھیجنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

سلیم کے خلاف سازش

فوجی اصلاحات کے روک دینے سے ینی چری کی بغاوت اس وقت فرو ہوگئی لیکن اصلاحات کے خلاف جذبات اسی طرح برانگیختہ تھے، ۱۸۰۷ء کے شروع میں شیخ الاسلام اسعد آفندی کا انتقال ہوگیا، وہ سلیم کا ایک مخلص دوست اور اس کی اصلاحات کا پرجوش حامی تھا، اس کی موت سلیم کے لیے نہ صرف ایک ذاتی سانحہ تھی بلکہ اس کی معزولی اور کل اصلاحات کی منسوخی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی، علماء کی جماعت بہ حیثیت مجموعی پہلے ہی سے اصلاحات کی مخالف تھی، نیا مفتی اعظم عطاء اللہ آفندی بھی تمام تر ینی چری کے زیر اثر تھا لیکن سلیم کی معزولی میں جس شخص نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ قائم مقام موسیٰ پاشا تھا، اس وقت صدر اعظم فوج کے ساتھ محاذ جنگ پر تھا اور موسیٰ پاشا قائم مقام کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں اس کی جگہ کام کر رہا تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے مفتی اعظم، ینی چری اور دارالسلطنت کے بعض دوسرے فوجی دستوں کے ساتھ سلیم کے خلاف ایک گہری سازش کی، "نظام جدید" کا ایک حصہ اس وقت باسفورس کے قلعوں کی

حفاظت پر متعین تھا، بقیہ فوج ایشیا میں تھی، باسفورس کے دستِ حفاظت میں دو ہزار خام سپاہی بھی تھے، جو "یمکی" کہلاتے تھے اور "نظامِ جدید" کے سپاہیوں کے ساتھ اس غرض سے رکھے گئے تھے کہ بتدریج ان سے متاثر ہوتے رہیں لیکن موسیٰ پاشا نے ان میں یہ افواہ اڑا دی کہ سلطان انہیں بہ جبر نظامی دستوں کے ساتھ ملا دینا چاہتا ہے، اس خبر سے ان میں سخت برہمی پیدا ہوئی، دوسری طرف اس نے یہ کیا کہ سلیم کو جو اس کی سازش سے بالکل بے خبر تھا، ترغیب دے کر "یمکیوں" کے نام ایک حکم جاری کرایا کہ وہ نظامیوں کا سا لباس اختیار کرلیں، سلطان کا فرستادہ محمد آفندی جوں ہی یہ حکم لے کر پہنچا، بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے محمد آفندی کو تو اسی وقت باغیوں نے قتل کر دیا، اس کے بعد وہ دارالسلطنت کے ینی چری دستوں کو ساتھ لے کر آت میدان میں جمع ہوئے اور وہاں ینی چری نے اپنے شوربے کی دیگیں الٹ دیں، یہ بغاوت کا اعلان تھا اور اس سے مقصود یہ تھا کہ وہ سب سلطان کا دیا ہوا کھانا نہ کھائیں گے۔

سلیم کی معزولی | موسیٰ پاشا نے چوں کہ سلیم کو بالکل دھوکے میں رکھا تھا، اس لیے وہ اس صورتِ حال کے لیے مطلق تیار نہ تھا، باغیوں کا سردار قباقجی اوغلو جب آت کے میدان میں آیا، اس وقت بھی موسیٰ پاشا نے سلیم کو فریب دینے کی کوشش کی اور اسے اطمینان دلایا کہ یہ شورش بہت جلد فرو ہو جائے گی، چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ نظامی دستوں کو باسفورس سے طلب کر لیتا اور ان کے آنے تک اپنے باڈی گارڈز کی مدد سے محل کی حفاظت کرتا، اس نے باغیوں کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں راضی ہونا تھا نہ ہوئے، قباقجی اوغلو کے ہاتھ میں اصلاحات کے خاص خاص طرف داروں کی ایک فہرست تھی، اس میں وزراء، اکابر و اعیان بھی شامل تھے، یہ سب کے سب گھسیٹ کر آت کے میدان میں لائے گئے اور نہایت بے دردی سے قتل کر دیے گئے، دو روز تک قتل کا سلسلہ جاری رہا، اصلاحات کے تمام طرف دار مارے گئے یا بھاگ گئے، آخر میں سلیم نے یہ دیکھ کر کہ اب خود اس کے تخت پر حملہ

ہوا چاہتا ہے، ایک فرمان کے ذریعہ تمام اصلاحات منسوخ کر دیں لیکن باغیوں نے اس کی معزولی کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا، مفتی اعظم نے جو اس سازش میں شروع سے شریک تھا، اپنے فتوے سے اس فیصلہ پر قانون کی مہر بھی ثبت کر دی، ۲۲ ربیع الاول ۱۲۲۲ھ مطابق ۲۹ مئی ۱۸۰۷ء کو ینی چری موسیٰ پاشا کی سرکردگی میں قصر سلطانی میں داخل ہوئے، سلیم نے کوئی مزاحمت نہ کی، وہ نہایت وقار کے ساتھ تخت سے اترا اور محل کے اس حصہ میں چلا گیا جہاں شہزادہ مصطفیٰ اب تک نظر بند تھا، باغیوں نے مصطفیٰ کو لا کر تخت پر بیٹھا دیا، سلیم نے اپنی بقیہ مدت عمر جو صرف ایک سال اور رہ گئی تھی، سلطنت عثمانیہ کے آئندہ وارث شہزادہ محمود کو تربیت دینے میں گزار دی۔

مصطفیٰ رابع

۱۲۲۲ھ تا ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۷ء تا ۱۸۰۸ء

مصطفیٰ رابع تیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اس نے صرف تیرہ مہینے حکومت کی لیکن یہ حکومت محض نام کی تھی، اصلی اقتدار ان باغیوں کو حاصل تھا جنہوں نے سلیم کو معزول کر کے اسے تخت پر بیٹھایا تھا، قباقچی اوغلو، باسفورس کے قلعوں کا حاکم مقرر ہوا، سلیم کی تمام اصلاحات منسوخ کر دی گئیں۔

ان واقعات کی خبر سے عثمانی فوجیں جو دریائے ڈینوب کے ساحلی علاقوں میں روس سے جنگ کر رہی تھیں بہت مطمئن اور مسرور ہوئیں لیکن صدر اعظم ابراہیم علمی پاشا نے جو اس وقت سپہ سالار تھا، اس بغاوت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، اس پر ینی چری نے اسے قتل کر دیا اور اس کی جگہ چلبی مصطفیٰ پاشا کو سپہ سالار اور صدر اعظم مقرر کیا۔

ابراہیم پاشا کے قتل اور چلبی مصطفیٰ کے تقرر سے فوج میں کمزوری اور انتشار پیدا ہو گیا، اگر روسی فوجوں کا بڑا حصہ اس وقت پرشا میں نپولین سے جنگ کرنے میں مصروف نہ ہوتا تو اس کمزوری سے دولت عثمانیہ کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا لیکن اس کی خوش قسمتی سے اسی درمیان میں (۱۴ جون ۱۸۰۷ء) نپولین نے روسیوں کو فریڈلینڈ میں ایک زبردست شکست دی کہ اس کے اثر سے ڈینوب کی روسی فوجیں بھی پسپا ہونے لگیں۔

نپولین کی غداری اس کے بعد زار الکزنڈر نے نپولین سے صلح کی درخواست کی لیکن قبل اس کے کہ فریقین ٹلسیٹ کے مقام پر شرائط صلح طے کریں، پرشا کے وزیر اعظم ہارڈنبرگ (Hardenberg) نے دونوں کے سامنے ایک دل چسپ اسکیم پیش کی، جس سے مقصود یہ تھا کہ نپولین کی توجہ پرشا پر قبضہ کرنے کے بجائے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی جانب مائل ہو جائے، اسکیم یہ تھی کہ ولاچیا، مولڈیویا، بلغاریا اور رومیلیا کے صوبے روس کو دے دیے جائیں، یونان اور جزائر آئیونین پر فرانس قبضہ کرلے، بوسنیا اور سرویا، آسٹریا کی سلطنت میں شامل کردیے جائیں، پولینڈ کو از سرنو مرتب کرکے شاہ سیکسنی (Sexony) کو اس کا فرماں روا مقرر کردیا جائے اور سیکسنی پر پرشا کی حکومت قائم کردی جائے لیکن نپولین پرشا کو شکست دے کر پامال کرچکا تھا، وہ ایک حقیر دشمن کی پیش کردہ اسکیم پر غور کرنے کے لیے تیار نہ ہوا[1]

تاہم سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ خود اس کی ذاتی اسکیم کے لیے اہمیت سے خالی نہ تھا، اس وقت اس کا سب سے بڑا مقصد سلطنت برطانیہ کو نیست و نابود کردینا تھا لیکن اس کا حصول روس کو برطانیہ کے اتحاد سے علاحدہ کیے بغیر محال تھا، فریڈلینڈ کی شکست نے روس کی قوت بہت کچھ توڑ دی تھی اور زار اب صلح کا خواہش مند بھی تھا لیکن نپولین سے مل کر اپنے سابق حلیف برطانیہ سے جنگ کرنے کے لیے الکزنڈر خاطر خواہ معاوضہ کا امیدوار تھا، نپولین نے اسے منظور کرلیا، چنانچہ معاہدہ ٹلسیٹ (۷ر جولائی ۱۸۰۷ء) کے خفیہ دفعات میں یہ طے پایا کہ باب عالی نپولین کے پیش کردہ شرائط پر روس سے صلح نہ کرے گا تو فرانس اور روس متحد ہوکر ترکوں کو قسطنطنیہ اور رومیلیا کے علاوہ باقی تمام یورپین ولایتوں سے نکال دیں گے اور ان ولایتوں کو باہم تقسیم کرلیں گے، تقسیم کی شکل یہ تھی کہ فرانس، بوسنیا، البانیا، یونان اور مقدونیا پر قبضہ کرلے گا اور مولڈیویا، ولاچیا، بلغاریا اور دریائے مارٹیزا تک کے تمام علاقے روس کو دے دیے جائیں گے، آسٹریا کو راضی کرنے کی غرض سے سرویا کا صوبہ اس کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا[2]

---

[1] ہیرہٹ، ص ۱۸۳-۱۸۵ [2] فریڈزک، ص ۱۹۶۔

انگریزوں کو قسطنطنیہ حاصل کرنے پر بھی اصرار تھا مگر نپولین نے اس سے قطعی انکار کر دیا، اس خفیہ معاہدہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نپولین ذاتی اغراض کے لیے اپنے حلیف سلطنت عثمانیہ کو قربان کر دینے پر کہاں تک آمادہ تھا، حالاں کہ روس سے دولت علیہ کی موجودہ جنگ زیادہ تر اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھی، بہر حال اگست ۱۸۰۷ء میں اس کی وساطت سے فریقین میں عارضی طور پر صلح ہو گئی۔

حالاتِ آستانہ | اس درمیان میں دار السلطنت کی حالت روز بہ روز زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی، حکومت کے تمام اختیارات مفتی اعظم اور قائم مقام موسیٰ پاشا کے ہاتھ میں تھے اور یہی دونوں سلطان کے نام سے حکم رانی کر رہے تھے لیکن چند دنوں کے بعد خود ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور مفتی اعظم نے قباقچی اوغلو سے سازش کر کے موسیٰ پاشا کو نہ صرف معزول بلکہ جلا وطن بھی کرا دیا، اس کے بعد طاہر پاشا قائم مقام مقرر ہوا، مگر چوں کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے اختیارات استعمال کرنا چاہتا تھا، اس لیے مفتی اعظم نے اسے بھی برطرف کرا دیا، طاہر پاشا نے مصطفیٰ پاشا بیرقدار کے پاس جا کر پناہ لی جو روسچق کا والی اور سلطان سلیم کے وفادار نمک خواروں میں تھا۔

سلطان مصطفیٰ کی تخت نشینی کے بعد بھی سلیم کے حامیوں کی ایک جماعت اسے دوبارہ تخت پر لانا چاہتی تھی، بیرقدار اس جماعت کا سردار تھا، چنانچہ طاہر پاشا کے آنے کے بعد اس نے اپنا ایک معتمد صدر اعظم چلبی مصطفیٰ پاشا اور دوسرے وزراء کے پاس بھیجا اور انہیں یہ سمجھایا کہ مفتی اعظم قباقچی اوغلو نے صرف اپنی قوت اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے فوج میں شورش برپا کر رکھی ہے اور فوج کے بھروسہ پر حکومت کے تمام نظم و نسق کے مالک بنے ہوئے ہیں، بیرقدار نے ابھی اپنے اصلی مقصد یعنی سلیم کو دوبارہ تخت پر بٹھانے کی تجویز کو بالکل مخفی رکھا اور صدر اعظم وغیرہ پر محض یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ صرف مفتی اعظم اور قباقچی اوغلو کو سزا دینا چاہتا ہے، چوں کہ صدر اعظم کے اختیارات بھی ان دونوں کی وجہ سے پامال

ہو رہے تھے، اس لیے وہ بیرقدار سے مل گیا اور قباقجی اوغلو کے قتل کے حکم دے دیا، چنانچہ وہ رات کے وقت اپنے محل میں قتل کر دیا گیا۔

سلیم کا قتل اس اثنا میں بیرقدار ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ قسطنطنیہ کے قریب پہنچ چکا تھا، اس نے متعدد اعیان حکومت کو طلب کر کے باغی فوج کی بیخ کنی اور اور سلطنت میں امن وامان قائم کرنے کا حلف لیا، اس کے بعد وہ فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، سلطان مصطفیٰ نے یہ سمجھ کر کہ مظاہرہ مفتی اعظم اور ینگچری فوج کے خلاف ہے، مفتی کو برطرف کر دیا اور اس فوج کو توڑ دینے کا حکم دیا، مگر بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ بیرقدار کا اصلی مقصد کیا ہے، چنانچہ محل کا پھاٹک بند کر لیا گیا اور شاہی دستہ مدافعت کے لیے تیار ہو گیا، بیرقدار نے حملہ کا حکم دیا اور تھوڑی دیر میں محل کے اندر داخل ہو گیا لیکن اسی درمیان میں مصطفیٰ نے سلیم اور اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ محمود دونوں کے قتل کا حکم دے دیا تھا، وہ جانتا تھا کہ ان کے بعد تنہا وہی سلطنت کا وارث باقی رہ جائے گا اور پھر کسی عثمانی کو اسے قتل یا معزول کرنے کی جرأت نہ ہوگی، چنانچہ قبل اس کے کہ بیرقدار محل کے اس حصہ میں پہنچ سکے جہاں سلیم نظر بند تھا، مصطفیٰ کے جلادوں نے سلیم کا کام تمام کر دیا، سلیم اتنا طاقت ور تھا کہ وہ بغیر کسی ہتھیار کے ان جلادوں کا مقابلہ کرتا رہا اور ان میں سے کئی ایک کو مار کر گرا دیا لیکن آخر میں قلب پر ایک کاری ضرب لگنے کی وجہ سے وہ سنبھل نہ سکا اور جلادوں نے اس کے گلے میں پھندا ڈال کر اسے ختم کر دیا، اگر یہ مقابلہ چند منٹ اور جاری رہتا تو بیرقدار وہاں پہنچ گیا ہوتا اور سلیم کی جان بچ جاتی، جب بیرقدار نے محل میں داخل ہو کر سلیم کو ہر طرف تلاش کرنا شروع کیا تو جلادوں نے اس کی لاش اس کے سامنے پھینک دی اور پکار کر کہا لو جسے تم تلاش کر رہے ہو وہ یہ ہے، بیرقدار اپنے بادشاہ کی لاش پر گر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، قپودان پاشا سعید علی قریب ہی کھڑا ہوا تھا، اس نے بیرقدار کا شانہ ہلا کر کہا کہ یہ وقت انتقام کا ہے رونے کا نہیں ہے، یہ سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس ایوان میں آیا، جہاں سلطان

مصطفیٰ اپنے عہد حکومت کے آخری لمحات نہایت سراسیمگی کی حالت میں گزار رہا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ تو یہاں کیا کرتا ہے، یہ جگہ اس شخص کے لیے خالی کر جو تجھ سے زیادہ اس کا مستحق ہے، بیرقدار نے اسے کھینچ کر تخت سے اتار دیا۔

مصطفیٰ نے سلیم اور محمود دونوں کے مار ڈالنے کا حکم دیا تھا، چنانچہ سلیم تو ختم کر دیا گیا لیکن محمود کی جان بچ گئی۔ اس کے ایک وفادار غلام نے اسے حمام کے آتش دان میں ایسی ہوشیاری سے چھپا دیا تھا کہ جلاد اس کی تلاش میں آخر وقت تک ناکام رہے، یہاں تک کہ بیرقدار کے سپاہیوں کے محل میں داخل ہونے کے بعد جلادوں کو خود اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور محمود کی تلاش سے مایوس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

مصطفیٰ کی معزولی اسی روز ۴/ جمادی الاول ۱۲۲۳ھ مطابق ۲۸/ جولائی ۱۸۰۸ء میں سلطان مصطفیٰ کی معزولی اور شہزادہ محمود کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا، چند دنوں کے بعد مصطفیٰ قتل کر دیا گیا تاکہ پھر کوئی فتنہ برپا نہ ہو۔

LIBRARY
Welfare Islamic University
Book No. 2126
Babar Block, Garden Town, Lahore

Daulat-E-Usmania

Vol-1

Dr. Mohammad Uzair

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. Box No. 19
Shibli Road, Azamgarh- 276 001 (U.P)
E-mail : shibli_academy@rediffmail.com
Website : www.shibliacademy.org

Rs. 200/-

بسلسلۂ تاریخ اسلام

دولتِ عثمانیہ

سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل

جلد دوم

از محمود ثانی ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) تا جنگ عظیم ۱۳۳۸ھ (۱۹۹۱ء)

از

ڈاکٹر محمد عزیر

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، یو۔ پی (الھند)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

جملہ حقوق بحق دارالمصنفین محفوظ

سلسلہ دارالمصنفین : ۹۵

نام کتاب : دولت عثمانیہ دوم
مصنف : محمد عزیر
صفحات : ۳۱۶
طباعت : جدید معیاری ایڈیشن ۲۰۰۹ء
ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو۔پی)
مطبع : معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یو۔پی)
قیمت : ۲۰۰ روپے

ISBN: 978-93-80104-32-4

باہتمام

عبدالمنان ہلالی

Lahore
Islamic
University
Book No.
Garden Town, Lahore

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

مجھے افسوس ہے کہ دولت عثمانیہ کی دوسری جلد کی اشاعت میں بہت تاخیر ہوئی، مسودہ کئی سال قبل لکھا جا چکا تھا مگر پریس میں بھیجنے سے پہلے جب نظر ثانی شروع کی تو بہت کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت معلوم ہوئی اور تقریباً پوری کتاب از سرِ نو لکھنی پڑی، علاوہ بریں درس و تدریس کی مشغولیت اور بعض دیگر اسباب سے بھی کام کی رفتار بہت سست رہی اور کبھی کبھی مہینوں مسودہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

نظر ثانی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس جلد کی ضخامت بہت بڑھ گئی اور جمہوریہ کا حصہ جو پہلے اس میں شامل تھا اور جس میں جدید ترکی کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں الگ کر دینا پڑا، چونکہ قیامِ جمہوریہ سے آلِ عثمان کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے مناسب بھی یہی ہے کہ اس کی ایک جلد علاحدہ ہو۔

محمد عزیر (رفیق دار المصنفین)
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۳۰ر اپریل ۱۹۴۳ء

فہرست مضامین

دولت عثمانیہ جلد دوم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
دیباچہ		ارناؤٹی اور کلیفٹ	۱۵
محمود ثانی		حکومت میں یونانیوں کا اقتدار	۱۶
۱۲۲۳ھ تا ۱۲۵۵ھ	۱-۹۳	عام یونانیوں کی حالت	۱۷
۱۸۰۸ء ۱۸۳۹ء		ہتیریہ اور تحریک آزادی	۱۹
ینی چری کی بغاوت	۱	انقلاب فرانس کا اثر	۲۱
زار اور نپولین کا خفیہ معاہدہ	۲	ہتیریا	۲۲
انگلستان سے صلح	۳	روس کی سازشیں	۲۳
روس سے جنگ	۴	برات	۲۵
صلح نامہ بخارسٹ	۵	علی پاشا	۲۶
سرویا کی خودمختاری	۶	مولڈیویا کی بغاوت	۲۹
میلوش حکمران سرویا	۷	انتقام	۳۰
سلطنت عامہ کی کمزوری	۷	ہتیریا سے تفریق اور زار کی مخالفت	۳۱
افریقی مقبوضات	۹	بغاوت مولڈیویا کا استیصال	۳۲
محمد علی	۹	موریا میں ترکوں کا قتل عام	۳۲
حجاز کی مہم	۱۰	باب عالی کی طرف سے جوابی کارروائی	۳۳
وہابی بغاوت کا انسداد	۱۱	گریگوریوس کی پھانسی	۳۴
محمد علی کی بغاوت	۱۲	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۳۴
بغاوت یونان	۱۳	یونانیوں کا قتل	۳۵
یونانیوں کی بحری قوت	۱۴	یونانی سفاکیاں	۳۶

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
باغیوں کے ساتھ مغرب کی ہمدردی	٣٩	محمود کی وفات	٦٣
برطانیہ کی معاندانہ روش	٤٠	محمود کی عظمت	٦٣
مصر کی مدد	٤١	سلطان عبدالمجید خاں	
سوریا کی تسخیر	٤٢	١٢٥٥ھ تا ١٢٧٧ھ	٦٨-٩٥
ینی چری کا استیصال	٤٣	١٨٣٩ء ١٨٦١ء	
محمود کے کارنامے	٤٥	محمد علی سے صلح	٦٩
دول عظمیٰ کی دشمنی	٤٦	خط شریف گلخانہ	٧٠
معاہدۂ آق کرمان	٤٨	دستور عالی ١٨٥٦ء	٧٦
مسیحی اتحاد	٤٩	دیگر اصلاحات	٨٠
واقعۂ نوارینو	٥٠	فوجی اصلاحات	٨١
نوارینو کی شکست کا اثر	٥٢	اصلاحات کا اثر	٨١
جنگ روس	٥٣	سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویز	٨٣
ایک شدید غلطی اور شدید تر غلط فہمی	٥٥	جنگ کریمیا کے اسباب	٨٣
طلسم قوت	٥٦	اعلان جنگ	٨٥
صلح نامۂ ادرنہ	٥٨	انگلستان اور فرانس کی حمایت	٨٦
ہجوم مصائب	٦٠	سباسٹوپول کی فتح	٨٧
محمد علی کی بغاوت	٦٠	سقوط قارص	٨٧
روس کی مدد	٦٢	صلح کی گفتگو	٨٧
معاہدۂ کوتاہیہ	٦٣	صلح نامۂ پیرس	٨٨
معاہدۂ خونکار اسکلہ سی	٦٣	خفیہ معاہدے	٨٩
محمد علی سے دوبارہ جنگ	٦٣	صلح نامۂ پیرس پر ایک نظر	٨٩

مضمون	صفحہ
مختلف شورشیں کریٹ	۹۱
جدہ پر گولہ باری	۹۲
فتنہ لبنان	۹۲
سلطان کی وفات	۹۵
اس عہد کی خصوصیت	۹۵
سلطان عبدالعزیز ۱۲۷۷ھ تا ۱۲۹۳ھ ۱۸۶۱ء ۱۸۷۶ء	۹۷-۱۲۳
مالی اصلاحات کی کوشش	۹۸
سرب کی فتنے سرویا	۱۰۰
سرویا کا استقلال	۱۰۰
کریٹ کی بغاوت	۱۰۱
معاہدۂ پیرس کی خلاف ورزی	۱۰۲
بلغاریا کا قومی کلیسا	۱۰۳
باب عالی میں روس کا اثر	۱۰۳
جمعیت سلافیہ	۱۰۶
مدحت پاشا کی اسکیم	۱۰۷
سلطان کی فضول خرچی	۱۰۸
مدحت پاشا کی صدارت	۱۰۹
مالی ابتری	۱۱۱
بغاوت ہرزیگووینہ	۱۱۲

مضمون	صفحہ
اندرانی نوٹ	۱۱۳
جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کا قتل	۱۱۴
بغاوت بلغاریا	۱۱۵
حقیقت حال	۱۱۷
یادداشت برلن	۱۲۲
دولت علیہ کی مشکلات	۱۲۳
سلطان کا عزل	۱۲۳
سلطان مراد خامس ۱۲۹۳ھ - ۱۸۷۶ء	۱۲۶-۱۳۰
وفات عبدالعزیز	۱۲۷
کپتان حسن کا واقعہ	۱۲۷
معزولی کا سوال	۱۲۸
مراد کا عزل	۱۳۰
سلطان عبدالحمید خان ثانی ۱۲۹۳ھ تا ۱۳۲۷ھ ۱۸۷۶ء ۱۹۰۹ء	۱۳۱-۲۲۴
صدارت مدحت پاشا	۱۳۲
دستور اساسی کا اعلان	۱۳۳
ایک بدگمانی	۱۳۴
قسطنطنیہ کی کانفرنس	۱۳۷
مجلس عالیہ کا فیصلہ	۱۴۰

مضمون	صفحہ
روس سے جنگ	۱۴۰
پلونا	۱۴۲
صوفیہ اور ادرنہ	۱۴۴
معاہدۂ سان اسٹیفانو	۱۴۵
اس معاہدہ کی مخالفت	۱۴۶
روس اور برطانیہ کا خفیہ معاہدہ	۱۴۷
برلن کانگریس	۱۴۹
عہد نامۂ برلن	۱۴۹
مونٹی نیگرو کی نزاع	۱۵۲
یونان کا قضیہ	۱۵۳
مشرقی رومیلیا اور بلغاریا کا اتحاد	۱۵۳
سرویا اور بلغاریا کی جنگ	۱۵۵
اتحاد بلغاریا کی تکمیل	۱۵۶
دول یورپ کی مداخلت	۱۵۷
کریٹ	۱۵۸
جنگ یونان	۱۶۳
یونان سے کریٹ کا الحاق	۱۶۴
مسئلہ آرمینیا	۱۶۵
تونس	۱۷۶
مصر	۱۸۱
ترقی و اصلاحات	۱۸۱

مضمون	صفحہ
ملکی قرضہ کا بار	۱۸۲
نہر سویز کے حصوں کی فروخت	۱۸۲
نہر سویز کی اہمیت	۱۸۳
مصر میں فرانسیسی اور برطانوی اقتدار	۱۸۴
توفیق پاشا	۱۸۵
دستوری حکومت کا اعلان	۱۸۶
انگلستان اور فرانس کا طرز عمل	۱۸۷
درویش پاشا	۱۸۸
اسکندریہ کا بلوہ	۱۸۹
حقیقت حال	۱۸۹
اسکندریہ کی گولہ باری	۱۹۱
جنگ آزادی	۱۹۴
خدیو کی وطن دشمنی	۱۹۵
قومی حکومت	۱۹۶
کفر دوار	۱۹۶
اسماعیلیہ	۱۹۷
پروفیسر پامر کی خفیہ مہم	۱۹۸
خدیو کی غداری	۲۰۱
وطنی فوج کی بدقسمتی	۲۰۲
معرکۂ قصاصین	۲۰۲
تل الکبیر	۲۰۳

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
مصر پر انگریزوں کا قبضہ	۲۰۵	سالونیکا کمیٹی	۲۳۱
جرمنی کا فوجی اور اقتصادی اثر	۲۰۶	تحقیقاتی کمیشن	۲۳۲
بغداد ریلوے	۲۰۷	انقلاب میں عجلت	۲۳۲
بغداد ریلوے کی اہمیت	۲۰۸	اعلان انقلاب	۲۳۳
اتحاد ثلاثہ	۲۰۹	الطاف خسروانہ کا فریب	۲۳۳
اندرونی اور بیرونی سازشیں	۲۰۹	مناستر پر قبضہ	۲۳۴
مقدونیا کی بدامنی	۲۱۱	یلدیز کی سراسیمگی	۲۳۷
مرزتگ پروگرام	۲۱۲	دستوری حکومت کا اعلان	۲۳۷
مقدونیا کی تقسیم کے منصوبے	۲۱۳	خط ہمایوں یکم اگست ۱۹۰۸ء	۲۳۹
عبدالحمید کا استبداد	۲۱۵	ایک اعتراض	۲۴۰
فوج کی تعلیم	۲۱۷	نئی وزارت	۲۴۱
نظام جاسوسی	۲۱۷	انجمن اتحاد و یورپ کا پیامبر	۲۴۳
عوام کی بیداری	۲۲۰	انجمن کا سیاسی پروگرام	۲۴۳
عام بیداری	۲۲۲	پارلیمنٹ کا افتتاح	۲۴۴
انجمن اتحاد و ترقی	۲۲۳	جوابی انقلاب	۲۴۴
غیر اسلامی انجمنوں سے مفاہمت	۲۲۳	بغاوت کا استیصال	۲۴۶
پیرس کی انقلابی کانگریس	۲۲۶	سلطان کی معزولی	۲۴۶
مقدونیا کا انتخاب	۲۲۶	**نوجوان ترک**	[illegible]
انجمن کی احتیاطی تدبیر	۲۲۹	**۲۴۸ تا ۲۹۳**	
عورتوں کی خدمات	۲۳۰	اندرونی مخالفین عیسائی	۲۴۸
خفیہ جلسے اور نئے ممبروں کا داخلہ	۲۳۰	غیر ترک مسلمان	۲۴۹

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
ترکی	۲۵۰	سقوط ادرنہ	۲۶۸
بیرونی دشمن	۲۵۰	سقوطری	۲۶۹
روس اور آسٹریا کی اسکیم	۲۵۰	صلح نامہ لندن ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء	۲۷۰
بلغاریا	۲۵۱	اتحاد میں افتراق	۲۷۰
بوسنیا و ہرزیگووینا	۲۵۲	آغاز جنگ جون ۱۹۱۳ء	۲۷۳
طرابلس	۲۵۲	جنگ تقسیم	۲۷۳
جنگ طرابلس	۲۵۴	فتح ادرنہ	۲۷۴
انور بے	۲۵۵	عارضی صلح	۲۷۳
صلح نامہ لوزان	۲۵۶	صلح نامہ بخارسٹ	۲۷۴
بلقانی ریاستوں کا اتحاد	۲۵۸	جنگ کے نتائج	۲۷۵
روس کی سازشیں	۲۵۹	**جنگ عظیم**	۲۷۹-۳۰۹
البانیا کی بغاوت	۲۶۱	۳۳۹ تا ۳۵۵	
ترکی کی اندرونی حالت	۲۶۱	جنگ عظیم کی شرکت	۲۸۰
جنگ بلقان	۲۶۳	دردانیال کی مہم	۲۸۳
عثمانی شکست کے اسباب	۲۶۴	معرکۂ گیلی پولی	۲۸۵
یورپ کا پاس عہد	۲۶۵	ایشیائے کوچک	۲۸۸
عارضی صلح	۲۶۵	عراق	۲۸۹
صلح کانفرنس لندن	۲۶۶	عرب کی بغاوت	۲۹۰
انقلاب وزارت	۲۶۶	مصر	۲۹۱
استقلال البانیا	۲۶۷	بالشویک انقلاب مارچ ۱۹۱۷ء	۲۹۱
اعادۂ جنگ	۲۶۸	شام و فلسطین	۲۹۱

مضمون	صفحہ
صلح نامۂ مدرس	۲۹۲
خفیہ معاہدے	۲۹۳
اندرونی حالات	۲۹۵
صلح کانفرنس کی بے پروائی	۲۹۸
عدالیہ پر اٹلی کا قبضہ	۲۹۹
سمرنا پر یونانی قبضہ	۲۹۹
سمرنا کا قتل عام	۳۰۰
ملی تحریک	۳۰۱
نظام حکومت ۳۸۹ – ۳۵۶	۳۰۲–۳۳۲
ادارۂ حکومت	۳۰۵
واضعہ کا طریقہ	۳۰۶
ادارۂ حکومت کا تعلیمی نظام	۳۰۷
بنیادی اصول	۳۱۰
ارکان ادارہ کے حقوق	۳۱۱
سلطان	۳۱۲
قانون وراثت	۳۱۶
دیوان	۳۱۶
وزراء	۳۱۷
دفتر دار اور نشانجی	۳۱۷
عسکریہ	۳۱۷

مضمون	صفحہ
ینی چری	۳۱۸
باب عالی کے چوبی	۳۲۰
جاگیری سپاہی	۳۲۱
دیوان پاشا	۳۲۲
ادارۂ اسلامیہ	۳۲۳
تعلیمی نظام	۳۲۳
مفتی	۳۲۴
نظام عدالت	۳۲۶
قاضی	۳۲۷
صدر اعظم کی عدالت	۳۲۷
ملتقی	۳۲۸
انقلابی تبدیلیاں	۳۲۹
ممالک محروسہ	۳۳۱
تعلیم ۳۹۰ – ۳۰۹	۳۳۲–۳۴۰
دینی دور	۳۳۲
دور تنظیمات	۳۳۷
ابتدائی تعلیم	۳۳۸
ثانوی تعلیم	۳۳۹
اعلیٰ تعلیم	۳۴۰
چند مدارس و مکتب	۳۴۲

مضمون صفحہ
بعض باتوں کی کمی ۳۴۷
نوجوان ترکوں کی تعلیمی اصلاحات ۳۴۷

عثمانی ترک

(۱)

ادبی، تمدنی اور سیاسی تحریکیں

۳۱۰ - ۳۳۰

۳۷۸-۳۵۰
قدیم ادب ۳۵۳
فطرت پسندانہ شاعری ۳۵۵
عہد تنظیمات ۳۵۵
شناسی ۳۵۵
نامق کمال ۳۵۷
عبد الحق حامد ۳۶۱
ضیا پاشا ۳۶۲
ادبیات جدیدہ ۳۶۲
حیات و کائنات کا ایک نیا تصور ۳۶۶
پریس کی آزادی ۳۶۹
رسم الخط کا مسئلہ ۳۷۰
تحریک اتحاد عثمانی ۳۷۱
تحریک اتحاد اسلامی ۳۷۲
تحریک اتحاد تورانی ۳۷۶

مضمون صفحہ

عثمانی ترک

(۲)

معاشرت و اخلاق و عادات

۳۳۱ - ۳۶۸

۳۷۹-۴۰۱
معاشرت کی سادگی ۳۸۰
حمام ۳۸۶
قہوہ خانے ۳۸۸
شہری زندگی کی ایک خصوصیت ۳۸۹
حرم کی زندگی ۳۹۲
عورتوں کی بیرونی تفریحیں ۳۹۶
تعدد ازدواج ۳۹۸
غلام اور کنیزیں ۳۹۸
اخلاق و عادات ۴۰۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمود ثانی

۱۲۲۳ھ تا ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹ء

ینی چری کی بغاوت: محمود کو تخت پر بٹھانے کے بعد مصطفےٰ پاشا بیرقدار نے صدارت عظمیٰ کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے اور سب سے پہلے ان غداروں کو سزائیں دیں جنھوں نے سلیم کو تخت سے اتارنے میں نمایاں حصہ لیا تھا، چنانچہ موسیٰ پاشا اور اس کے ساتھی قتل کردیے گئے، اس کے بعد بیرقدار نے ایک نئی فوج یورپ کے فوجی نظام کے مطابق تیار کرنی شروع کی۔ ینی چری نے بظاہر کوئی مخالفت نہیں کی، لیکن حقیقۃً وہ صرف موقع کا انتظار کر رہے تھے، چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد جب بیرقدار نے ان کی وفاداری پر اعتماد کرکے اپنی البانی اور بوسنی فوجوں کو قسطنطنیہ سے رخصت کردیا اور صرف چار ہزار سپاہی رکھ چھوڑے تو ینی چری نے انتقام کے لیے تلواریں نکال لیں اور البانی فوجوں کی روانگی کے دوسرے ہی دن رات کے وقت انھوں نے صدراعظم کے محل پر حملہ کرکے اس میں آگ لگادی، بیرقدار نے بھاگ کر ایک سنگی برج میں پناہ لی جو اس وقت بارود خانہ تھا، وہاں اس نے بڑی جانبازی سے باغیوں کا مقابلہ کیا لیکن کسی طرح میگزین میں آگ

لگ گئی اور پیرقدار جل کر ہلاک ہو گیا، اس کے بعد دو روز تک ینی چری اور نظام جدید کی فوجوں میں نہایت خوں خوار جنگ برپا رہی، موخر الذکر کی مدد کے لیے قاضی پاشا جو پیرقدار کا دوست تھا، آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ سلسٹری سے آ گیا، کپودان پاشا سعید علی نے بھی قاضی پاشا کا ساتھ دیا اور ایک جنگی جہاز سے ینی چری کی بارکوں پر گولے برسائے لیکن بالآخر توپچی بھی ان سے جا ملے جو شروع میں اس لڑائی سے بالکل الگ تھے ینی چری کی قوت بہت بڑھ گئی اور انھوں نے نظامی فوجوں کو مار کر بھگا دیا، وہ فاتحانہ جوش کے ساتھ سابق سلطان مصطفیٰ کو تخت پر بٹھانے کے لیے محل کی طرف بڑھے لیکن اس درمیان میں مصطفیٰ قتل کیا جا چکا تھا اور چوں کہ محمود کے سوا خاندان عثمانی کا کوئی دوسرا فرد سلطنت کا وارث نہ رہ گیا تھا، اس لیے مجبوراً انھیں محمود ہی کو اپنا سلطان تسلیم کرنا پڑا، تاہم انھوں نے محمود سے اپنے کل مطالبات منظور کرا لیے، ایک فرمان کے ذریعہ تمام جدید اصلاحات منسوخ کر دی گئیں اور قدیم نظام اپنی تمام برائیوں کے ساتھ از سر نو قائم ہو گیا، تین چار سال تک سلطنت کا انتظام در اصل ینی چری کے ہاتھوں میں رہا، صدر اعظم اور دوسرے وزرا کا عزل و نصب بھی انھی کی مرضی پر تھا، محمود اپنی بے بسی پر خون کے گھونٹ پی رہا تھا اور انتقام کے لیے صرف وقت کا منتظر تھا۔

زار اور نپولین کا خفیہ معاہدہ: روس سے جنگ کا جو سلسلہ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں شروع ہوا تھا اور اس درمیان میں دو سال کے لیے منقطع ہو گیا تھا، صلح نامہ تلسیت (جون ۱۸۰۷ء) میں نپولین اور زار الکزنڈر کے درمیان یہ بھی طے پایا تھا کہ روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ ختم کر دی جائے اور روسی فوجیں مولڈیویا اور ولاچیا سے ہٹا لی جائیں لیکن جب تک فریقین میں شرائط صلح مستقل طور پر طے نہ ہو جائیں ترک ان صوبوں میں داخل نہ ہوں، چنانچہ اگست ۱۸۰۷ء میں معاہدۂ سلوبوسیا (Slobosia) کے رو سے جنگ روک دی گئی اور تقریباً دو سال تک کوئی لڑائی نہیں ہوئی مگر روس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور اپنی فوجیں مولڈیویا اور ولاچیا سے نہیں ہٹائیں، برخلاف اس کے الکزنڈر نے

نپولین سے ایک خفیہ معاہدہ کر کے ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی دولت علیہ اس وقت فرانس کی حلیف تھی مگر نپولین نے اسپین کو حاصل کرنے کی غرض سے سلطنت عثمانیہ کو روس کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے میں تامل نہ کیا، اس مسئلہ پر الگزنڈر اور نپولین میں زبانی گفتگو ہوئی اور صلح نامہ ٹلسیٹ میں ایک خفیہ دفعہ کا اضافہ کیا گیا کہ اگر باب عالی فرانس اور روس کی سفارشات کو قبول نہ کرے تو رومیلیا اور قسطنطنیہ کے علاوہ اس کے تمام یوروپین صوبے لے لیے جائیں اور یہ بھی طے پایا کہ صلح نامہ مذکور کی کھلی ہوئی دفعات میں مولڈیویا اور ولاچیا کے تخلیہ سے متعلق جو دفعہ ہے، اس کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے، اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے بعد نپولین نے اپنے سفیروں کے ذریعہ اور پھر خود الگزنڈر سے گفتگو کر کے اس کے سامنے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویزیں پیش کیں، دو تجویزیں زیر بحث تھیں، پہلی یہ تھی کہ روس کو مولڈیویا، ولاچیا اور بلغاریا دے دیا جائے، فرانس، البانیا، یونان اور کینڈیا پر قبضہ کر لے اور بوسنیا اور سرویا کے صوبے آسٹریا کے حوالہ کر دیے جائیں، دوسری تجویز یہ تھی کہ آسٹریا کو نہ صرف بوسنیا اور سرویا بلکہ مقدونیا بھی دے دیا جائے، البتہ سالونیکا کا شہر اور بندرگاہ مستثنیٰ کر دی جائے، فرانس کو البانیا، یونان اور کینڈیا کے علاوہ تمام یونانی مجمع الجزائر، قبرص، شام اور مصر بھی دے دیے جائیں روس، مولڈیویا، ولاچیا، بلغاریہ، تھریس اور ان ایشیائی صوبوں کو جو باسفورس کے قریب واقع تھے، اپنی سلطنت میں شامل کرے(۱) لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے "قوی رہزنی کی اس عظیم الشان اسکیم" میں قسطنطنیہ روس کے حصہ میں جا رہا تھا اور اس پر نپولین کسی طرح راضی نہ ہو، دوسری طرف الگزنڈر بھی قسطنطنیہ سے دست کش ہونے پر مطلق تیار نہ تھا، آخر نقطہ پر پہنچ کر یہ ساری اسکیم درہم برہم ہو گئی، لارڈ ایورسلے اس اسکیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے "اس میں شبہ نہیں کہ نپولین اپنے نئے حلیف ترکوں کو چھوڑ دینے اور ان کی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے لیے ان کے قدیم دشمن سے مل جانے پر راضی تھا،

---

(۱) تاریخ ترکان عثمانی از کریسی جلد دوم ص ۳۷۹

تاریخ میں غداری کی اس سے بڑی مثال نہیں مل سکتی"۔ (۱)

انگلستان سے صلح: ان تجویزوں کی ناکامی کے باوجود مولڈیویا اور والاچیا پر روسی فوجوں کا قبضہ بدستور قائم رہا، آسٹریا کے لیے یہ صورت حال نہایت تشویش ناک تھی، اسے روس اور فرانس کی سازش اور ان کے خفیہ منصوبوں کا شبہ ہو گیا تھا، یہ دیکھ کر کہ انگلستان ہی ایک ایسی طاقت ہے جو دولت عثمانیہ سے متحد ہو کر فرانس اور روس کے منصوبوں کو ناکام رکھ سکتی ہے اور اس طرح آسٹریا کے سر سے وہ خطرہ دور ہو سکتا ہے جو مولڈیویا اور والاچیا پر روس کے قبضہ سے قائم تھا، اس نے دولت علیہ اور انگلستان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی، چنانچہ اسی کی وساطت سے جنوری ۱۸۰۹ء میں صلح نامہ دردانیال کا تصفیہ ہو گیا۔

روس سے جنگ: روس کے رویہ سے ترکوں میں سخت برہمی پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ جب ان کی خواہش کے مطابق باب عالی نے جنگ کا اعلان کیا تو سلطنت کے ہر حصہ سے بکثرت رضا کار محاذ پر جانے کے لیے جمع ہونے لگے لیکن فوج کا نظام اس قدر خراب تھا کہ ان پر جوش رضا کاروں کی خدمت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا، ۱۸۰۹ء میں روسی جنرل بگریشن (Bagration) نے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے متعدد ترکی قلعوں پر قبضہ کر لیا، دوسرے سال سلسٹریا کے اہم قلعہ پر بھی روسیوں کا قبضہ ہو گیا، اس کے بعد انھوں نے روستچق پر حملہ کیا، لیکن وہاں انھیں شدید نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا، مگر اسی سال انھوں نے صدر اعظم کی فوج کو شکست دے کر روستچق پر دوبارہ حملہ کیا، اب کی بار وہ کامیاب رہے اور روستچق کے علاوہ سیسٹوا اور بعض دوسرے قلعوں پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا، سیسٹوا کے بعد انھوں نے شومہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جو کوہ بلقان کو عبور کرنے کے لیے ضروری تھا لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

اس درمیان میں الکزنڈر اور نپولین کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے، ۱۸۱۱ء میں

---

(۱) ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے ص ۲۵۳

الکزنڈر کو نپولین کی طرف سے اس حد تک خطرہ لاحق ہوا کہ اس نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف روسی فوجوں کے جارحانہ اقدام کو بالکل روک دیا اور اپنے جنرلوں کو حکم دیا کہ صرف مدافعانہ جنگ جاری رکھیں، ترک بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ انھوں نے دریائے ڈینوب کو عبور کر لیا مگر اپنے افسروں کی نااہلی کی وجہ سے انھیں آخر میں شکست ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب الکزنڈر کو ہر لمحہ نپولین کے حملہ کا اندیشہ تھا اور وہ اپنی تمام قوتیں اس کے مقابلہ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، اس لیے فتح یاب ہونے کے باوجود اس نے باب عالی سے صلح کی گفتگو شروع کر دی مگر چونکہ وہ بسرابیا کے علاوہ مولڈیویا اور ولاچیا کے لینے پر بھی مصر تھا اور محمود نے یہ مطالبہ سختی سے مسترد کر دیا، اس لیے صلح کی کوشش ابتدا میں ناکام رہی، اس اثنا میں نپولین کے حملہ کا خطرہ بڑھتا ہی جاتا تھا اور الکزنڈر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو ترکوں سے صلح کر کے اس کے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے، چنانچہ صلح کی گفتگو پھر شروع ہوئی اور آخر کار ۱۶؍ جمادی الاولی ۱۲۲۷ھ مطابق ۲۸؍ مئی ۱۸۱۲ء کو صلح نامہ بخارست پر دولت عثمانیہ اور روس کے وکلا کے دستخط ہو گئے۔

صلح نامہ بخارست: اس صلح نامہ کے رو سے دریائے پرتھ دونوں سلطنتوں کے درمیان حد فاصل قرار پایا، ولاچیا کا پورا صوبہ اور مولڈیویا کا بڑا حصہ جو دریائے پرتھ کے مغرب میں واقع تھا، دولت عثمانیہ کو واپس کر دیا گیا، بسرابیا اور مولڈیویا کے ایک جزو پر روس کا قبضہ باقی رہا، صلح نامہ کی ایک دفعہ سرویا سے متعلق بھی تھی، سلطان نے اہل سرویا کی گزشتہ باغیانہ شورشوں کو معاف کر دیا اور ملک کے داخلی معاملات کا انتظام انہی کے ہاتھوں میں دے دیا، خراج کی رقم بھی کم کر دی گئی اور اس کی وصولی ٹھیکہ داروں کے ہاتھ سے نکال کر شاہی خزانہ کے عہدہ داروں کے سپرد کر دی گئی، سرویا پر سلطان کی فرماں روائی باقی رکھی گئی اور یہ طے پایا کہ بلغراد اور دوسرے قلعوں میں ترکی دستے پھر متعین کر دیے جائیں۔

سرویا کی خودمختاری: لیکن سرویا اس فیصلے سے مطمئن نہ ہوا اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس نے پھر بغاوت شروع کردی، قلعوں پر سروی فوجوں کا قبضہ تھا، باب عالی نے معاہدے کی رو سے ان کے تخلیہ کا مطالبہ کیا، لیکن سرویا نے اس کے جواب میں حکومت خود اختیاری کی خواہش کی، ہر فریق اپنے مطالبہ کی تکمیل کو مقدم قرار دیتا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۸۱۳ء میں سلطان نے سرویہ کے قلعوں پر قبضہ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کی، قرہ جارج نے کچھ مزاحمت کی، جب دیکھا کہ اب کی بار وہ بہت جلد پست ہو گیا تو اپنا تمام زر و جواہر لے کر سرویا سے بھاگ گیا اور آسٹریا کی سلطنت میں پناہ لی، ترکوں نے سرویا کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا، امید تھی کہ پورے صوبہ پر ان کا تسلط ہو جائے گا لیکن قرہ جارج کے فرار ہونے کے بعد میلوش اوبرینووچ (Milosch Obrenowitch) نامی ایک دوسرا قومی سردار سامنے آ گیا، جس نے ۱۸۱۵ء میں اپنی قوم کو منظم کر کے نہایت بہادری کے ساتھ ترکوں کا مقابلہ کیا اور چند ہی مہینوں میں ترکی دستوں کو شکست دے کر سرویا کے تمام علاقوں سے نکال دیا، صرف قلعوں پر ترکوں کا قبضہ باقی رہ گیا، دوسرے سال سلطان نے ایک اور فوج روانہ کی لیکن وہ سرحد ہی تک پہنچ کر رک گئی اور صلح کی گفتگو شروع ہوئی، جس کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا، واقعہ یہ تھا کہ باب عالی اس وقت زیادہ فوجیں سرویا میں بھیجنے کے لیے تیار نہ تھا، نپولین کی فتوحات کا خاتمہ روس کی شکست اور اس کی گرفتاری پر ہو چکا تھا اور یورپ کی بڑی سلطنتیں ویانا میں ایک کانفرنس منعقد کر کے یورپ کا نقشہ از سر نو مرتب کر رہی تھیں، اس کانفرنس میں دولت عثمانیہ شریک نہیں کی گئی لیکن سرویا کا ایک وفد جو مدد کی درخواست لے کر گیا تھا باریاب کیا گیا، روس، آسٹریا اور پروشیا کے فرماں رواؤں کا یہ اتحاد مقدس باب عالی کی تشویش کا باعث تھا، کیوں کہ روس کو حملہ کرنے کے لیے صرف بہانہ کی ضرورت تھی اور سرویا کی حمایت دولت عثمانیہ کو نقصان پہنچانے کا ایک اچھا ذریعہ تھی، ان حالات میں محمود نے مناسب سمجھا کہ جنگ جاری رکھنے کے بجائے سرویا والوں سے صلح کر لی جائے۔

صلح نامہ میں اہل سرویا کو عام معافی دی گئی محاصل کی وصولی انہی کے سپرد کر دی گئی، بارہ سرداروں کا ایک دیوان قائم کر کے ہر سردار کے انتخاب کا حق اس کے ضلع کے باشندوں کو دے دیا گیا، ملکی، مذہبی اور عدالتی خود اختیاری تسلیم کر لی گئی اور اہل سرویا کو ہتھیار رکھنے کی اجازت اور اپنا ایک امیر منتخب کرنے کا حق عطا کیا گیا، سرویا پر سلطان کی فرماں روائی اب بھی قائم رکھی گئی، گو یہ فرماں روائی سالانہ خراج اور بلغراد نیز چند دوسرے قلعوں پر قبضہ رکھنے تک محدود تھی۔

میلوش حکمران سرویا: قرہ جارج نے ترکوں کی شکست کی خبر سن کر پھر وطن کا رخ کیا، ۱۸۱۷ء میں وہ خفیہ طور پر سرویا کی سرحد میں داخل ہوا مگر وہاں اب میلوش کی حکومت تھی، قرہ جارج کی واپسی سے میلوش کو تشویش پیدا ہوئی کیوں کہ پہلی جنگ آزادی میں اس کی شجاعت اور جاں فروشانہ خدمات نے اہل سرویا کے دلوں پر اس کی محبت اور احترام کے جو نقوش بٹھا دیے تھے، وہ دوسری جنگ میں اس کے فرار ہو جانے کے بعد بھی بالکل محو نہیں ہوئے تھے، میلوش نے اپنی سرداری کو خطرہ میں دیکھ کر قرہ جارج کو فریب سے قتل کرا دیا اور اپنی وفاداری کے ثبوت میں اس کا سر کاٹ کر باب عالی میں بھیج دیا، اسے اب کسی حریف کا خوف نہ تھا، نومبر ۱۸۱۷ء میں تمام ضلعوں کے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں نے اسے سرویا کا حکمران (Prince) منتخب کر کے ملک کی حکومت اس کے خاندان کے لیے نسلاً بعد نسل مستقل کر دی، شروع میں سلطان نے یہ لقب تسلیم نہیں کیا لیکن معاہدۂ اورنہ کے بعد ۱۸۳۰ء میں اس نے حکمران کا لقب میلوش اور اس کے جانشینوں کے لیے باضابطہ طور پر منظور کر لیا۔

سلطنت کی عام کمزوری: سرویا کی بغاوت باب عالی کے ضعف کی تنہا مثال نہ تھی سلطنت کے ہر حصہ میں مرکزی حکومت کی کمزوری نمایاں تھی، پاشاؤں کی خودسری روز بروز بڑھتی جاتی تھی، ایپرس میں علی پاشا والی یانینا تقریباً خود مختار بن بیٹھا تھا اور اب وہ یونان، تھسلی اور جزائر آیونین کو اپنی حکومت میں شامل کرنے کا حوصلہ کر رہا تھا، اسی

ضرن ودین، عکا اور بغداد کے پاشاؤں نے بھی چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں، عرب میں وہابیوں نے تقریباً مکمل آزادی حاصل کر لی تھی اور حرمین شریفین پر بھی قبضہ کر لیا تھا، مصر میں محمد علی پاشا اپنے استقلال کی کوششوں میں مصروف تھا، والاچیا، مولڈیویا اور یونان کے صوبے بھی بغاوت کے لیے بالکل تیار تھے، سلطنت کا کوئی حصہ قابل اطمینان حالت میں نہ تھا، ینی چری جن کی شجاعت اور وفاداری پر دولت عثمانیہ کی قوت کا مدار تھا اور جنھوں نے اول تین صدیوں میں سلطنت کے حدود ایشیا، یورپ اور افریقہ کے وسیع رقبوں تک پہنچا دیے تھے اب خود اپنی حکومت کے لیے ایک مستقل اور زبردست خطرہ بن کر رہ گئے تھے، روس سے جو لڑائیاں ہوئیں یا سرکش پاشاؤں کے مقابلہ میں جو مہمیں پیش آئیں ان میں اس بات کا اندازہ اچھی طرح ہو گیا تھا کہ ینی چری میں وہ پہلی سی قوت باقی نہیں رہی، جہاں تک فوجی نظم وضبط کا تعلق تھا انیسویں صدی کے شروع میں وہ اس سے تقریباً خالی ہو چکے تھے، انھوں نے ان فوجی اصلاحات کے قبول کرنے سے جو یورپ میں جاری کی گئی تھیں اور جن کی وجہ سے یوروپین فوجوں کی برتری کا ثبوت ہر جنگ میں ملتا جاتا تھا قطعاً انکار کر دیا تھا، وہ ہر اصلاح کے مخالف تھے، خواہ فوجی ہو یا ملکی، سلطنت کے مختلف حصوں میں شورش برپا رکھنا ان کا مرغوب مشغلہ تھا، دشمن کے مقابلہ میں تو ان کے قدم جمتے نہ تھے لیکن بغاوت اور سرکشی کے ذریعہ اپنی قوت کے مظاہرے وہ کبھی نہ چوکتے، سلطان پر دباؤ ڈال کر جس شخص کو چاہتے وزارت کے عہدہ پر مامور کراتے اور جس وزیر سے ناخوش ہوتے اسے معزول کرا کے قتل کر دیتے، قسطنطنیہ کے باشندے ان کے خوف سے لرزاں رہتے تھے، صوبوں میں وہ ہر باغی پاشا کی رشوت قبول کرنے پر تیار ہو جاتے، ان کی سرکشی کا تجربہ محمود سے قبل بھی متعدد سلاطین کو ہو چکا تھا اور انھوں نے سلطنت کے امن وامان کے لیے ینی چری کے استیصال کی ضرورت بہت پہلے محسوس کر لی تھی لیکن یہ کام اتنا مشکل تھا کہ اس کے لیے محمود ہی جیسے صاحب عزم کی ضرورت تھی، تاہم اسے بھی اٹھارہ سال تک ان کی شورشیں انتہائی ضبط وتحمل کے ساتھ

برداشت کرنی پڑیں۔

افریقی مقبوضات: یوں تو سلطنت کے ہر حصہ میں کمزوری کی علامتیں ظاہر تھیں لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر افریقی مقبوضات میں نمایاں تھا، جب سے دولت عثمانیہ کی بحری قوت میں ضعف شروع ہوا، الجزائر، تونس اور طرابلس کے صوبے رفتہ رفتہ خودمختار ہوتے گئے اور انیسویں صدی کے شروع میں انھوں نے قریب قریب مکمل آزادی حاصل کر لی، دولت عثمانیہ سے ان کا تعلق اس حد تک منقطع ہو چکا تھا کہ یوروپین حکومتیں ان کے بحری ڈاکوؤں کو جب موقع ملتا گرفتار کر لیتیں اور ان کے اس فعل سے باب عالی کو کوئی شکایت نہ ہوتی۔ افریقہ کے عثمانی مقبوضات میں سب سے زیادہ اہم صوبہ مصر کا تھا، لیکن وہاں بھی دولت علیہ کا اقتدار بہت کم رہ گیا تھا، عرصے سے مصر کی اصلی حکومت مملوکوں کے ہاتھ میں تھی۔ باب عالی کی طرف سے جو پاشا وہاں کا والی مقرر کر کے بھیجا جاتا تھا، اس کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ خراج کی معینہ رقم وصول کر کے پابندی کے ساتھ قسطنطنیہ بھیجتا رہے، مملوک اپنی منظم فوجی قوت کے زور سے سارے ملک پر چھائے ہوئے تھے، ۱۷۹۸ء میں نپولین نے انھیں شکست دے کر مصر پر قبضہ کر لیا تھا مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد فرانسیسی فوج مصر سے نکل جانے پر مجبور ہوئی اور ۱۸۰۲ء میں صلح نامہ امیان کے رو سے یہ صوبہ دولت علیہ کو واپس کر دیا گیا، واپسی کے بعد بھی مصر پر باب عالی کی حکومت صرف نام کے لیے تھی، اصلی اقتدار مملوکوں کا تھا جن کی قوت نپولین کے حملے سے کمزور تو ضرور ہوئی تھی مگر فنا نہیں ہوئی تھی، ۱۸۰۵ء میں سلطان نے محمد علی کو مصر کا پاشا مقرر کر کے بھیجا، محمد علی کے تقرر سے مصری تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

محمد علی: محمد علی ۱۷۶۵ء میں کوالا نامی ایک قصبہ میں پیدا ہوا جو مقدونیا اور تھریس کی سرحد پر واقع تھا، اس کا باپ ایک چھوٹا سا زمیندار تھا، بچپن ہی میں وہ یتیم ہو گیا، اس نے پڑھنا لکھنا کچھ نہ سیکھا، وہ اپنے ایک عزیز کے دیوان میں جو رشتہ میں اس کا چچا ہوتا تھا ملازم ہو گیا، یہ شخص باب عالی کی طرف سے کوالا کا حاکم تھا، ابتدا میں محمد علی نے تمباکو کی

تجارت شروع کی جو مقدونیا کی بہت زرخیز تجارت تھی، لیکن جب ۱۷۹۸ء میں نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو باب عالی کے حکم سے محمد علی کے چچا نے تین سو البانی سپاہیوں کا ایک دستہ مصر روانہ کیا اور اپنے لڑکے علی آغا کو اس دستہ کا افسر مقرر کر کے محمد علی کو بحیثیت اس کے مشیر کے ساتھ کر دیا، اپنی دماغی قابلیت کی وجہ سے محمد علی بہت جلد اس دستہ کا حقیقی افسر بن گیا، گو بظاہر فوج کی کمان علی آغا کے ہاتھ میں تھی اس کے بعد چند معرکوں میں جو فرانسیسی فوج سے مصر میں پیش آئے محمد علی نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے، جس کے صلہ میں قپودان پاشا نے جو ترکی فوج کا سپہ سالار بھی تھا ۱۸۰۱ء میں اسے ترقی دے کر مصر کے نئے والی خسرو پاشا سے نہایت پر زور الفاظ میں اس کی سفارش کی، محمد علی ذہانت اور قابلیت میں خسرو پاشا سے بڑھا ہوا تھا، چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں اس نے باب عالی پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا اور ایسی تدبیریں کیں کہ ۱۸۰۵ء میں خسرو پاشا واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ خود محمد علی مصر کا حاکم مقرر کر دیا گیا، ۱۸۰۷ء میں اس نے ایک انگریزی فوج کو جو سکندریہ پر قابض ہو گئی تھی شکست دے کر بھگا دیا، اس کے بعد اس کا اقتدار تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ پینتیس سال کی عمر میں وہ مصر کا سب سے زیادہ طاقتور شخص بن گیا، یہ دیکھ کر مملوکوں نے اس کی مخالفت شروع کی، محمد علی ان کی قوت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ جب تک وہ فنا نہ ہو جائیں گے مصر پر پوری طرح تسلط قائم نہ ہو سکے گا، چنانچہ اس نے حملہ کر کے انھیں کئی بار شکست دی اور ان کی قوت کو بہت کچھ نقصان پہنچایا، لیکن مملوکوں کا زور اب بھی کسی قدر باقی تھا، اب محمد علی نے فریب سے کام لیا اور ۵ صفر ۱۲۲۶ھ (یکم مارچ ۱۸۱۱ء) کو ان کے تقریباً پانچ سو بڑے بڑے سرداروں کو قاہرہ کے قلعہ میں مدعو کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ فریقین باہم صلح کر کے وہابیوں کے استیصال کے لیے متحد طور پر ایک مہم حجاز کو روانہ کریں، مملوک اس فریب میں آ گئے اور ان کے تمام سردار صلح کی گفتگو اور حجازی مہم پر غور کرنے کے لیے محمد علی کی پرتکلف دعوت میں شریک ہوئے، کھانے کے بعد محمد علی نے قلعہ کے دروازے بند کروا دیے اور پھر اپنے

اپنی سپاہیوں کو اشارہ دیا انھوں نے دیکھتے دیکھتے تمام مملوک سرداروں کو گولیوں کا نشانہ بنا لیا، صرف ایک سردار اس قتل عام سے بچ کر نکل گیا، وہ قلعہ کی فصیل کی بلند دیوار سے گھوڑا کودا کر بھاگ نکلا، باقی سب ہلاک ہو گئے، اس کے بعد تمام مصر میں مملوکوں کا قتل عام شروع ہو گیا اور ان کی پوری آبادی تقریباً نیست و نابود ہو گئی۔

حجاز کی مہم: محمد علی اب پورے مصر کا بلا شرکت غیرے مالک تھا، اب حجاز کی طرف توجہ کرنے کے لیے اس نے اپنے بیٹے طوسون پاشا کی سرکردگی میں وہابیوں کے خلاف حجاز کو فوجیں روانہ کیں، طوسون پاشا نے وہابیوں کو شکست دے کر مدینہ منورہ کو ان کے قبضہ سے چھڑا لیا، مکہ معظمہ پر اب بھی ان کا تسلط قائم تھا اور انھوں نے طوسون پاشا کو طائف میں محصور کر لیا، یہ معلوم کر کے محمد علی پاشا خود مصر سے روانہ ہوا، ۲۸ شعبان ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۲ء) کو مکہ معظمہ پہنچ کر شریف غالب کو گرفتار کیا اور اسے مصر بھیج دیا، وہابیوں سے جنگ جاری رہی، تقریباً مکہ معظمہ کے قبضہ سے نکل جانے سے وہابیوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، ۱۹ ربیع الآخر ۱۲۲۹ھ (۱۰ اپریل ۱۸۱۴ء) کو ان کے امیر سعود کا انتقال ہو گیا، اس کے بعد جنگ میں آل سعود کو پے در پے شکستیں ہوئیں اور وہ صلح کرنے پر آمادہ ہو گئے، محمد علی پاشا مکہ سے روانہ ہو کر ۱۵ رجب ۱۲۳۰ھ کو مصر پہنچ گیا۔

وہابی بغاوت کا انسداد: امیر سعود کے انتقال کے بعد ان کے فرزند عبداللہ جانشین ہوا، اس نے طوسون پاشا سے صلح کی گفتگو کی اور اپنے پایہ تخت درعیہ میں اس کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا، لیکن جب طوسون پاشا نے اس کی اطاعت قبول کر لی تو اس نے عہد توڑ دیا، اس معاہدہ صلح کے بعد سلطان کی ایک ... بغاوت ... کر دی ... ان کے مقابلہ میں روانہ کیا گیا ... مصر میں محمد علی پاشا سے بغاوت ... ابراہیم پاشا نے درعیہ کو فتح کیا اور ذیقعدہ ۱۲۳۰ھ (نومبر ۱۸۱۹ء) میں قاہرہ پہنچ گیا۔

جزیرہ نما عرب میں امن قائم ہونے کے بعد محمد علی پاشا نے ولایتوں پر ... کے

لیے از سر نو تیاری شروع کر دی اور اپنے بڑے لڑکے ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی۔ ابراہیم پاشا مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد نجد کی طرف روانہ ہوا اور رس اور بعض دوسرے شہروں پر قبضہ کرتا ہوا ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۳ھ مطابق ۶ اپریل ۱۸۱۸ء کو شہر درعیہ کے سامنے پہنچا، جس میں عبداللہ بن سعود اپنے زبردست لشکر کے ساتھ مقیم تھا اور اس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ سات ماہ کے محاصرہ کی شدت سے عاجز آ کر عبداللہ بن سعود نے ابراہیم پاشا سے صلح کی درخواست کی اور شرائط صلح طے کرنے کے لیے خود ابراہیم پاشا کے خیمہ میں آیا، ابراہیم پاشا نے اس کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ آخر کار ان شرائط پر صلح قرار پائی کہ درعیہ ابراہیم پاشا کے حوالہ کر دیا جائے گا لیکن وہاں کے باشندوں کے جان و مال کی ہر طرح حفاظت کی جائے گی، کوکب دری اور دوسرے جواہرات جن پر مدینہ منورہ کی فتح کے وقت وہابیوں نے قبضہ کر لیا تھا، واپس کر دیے جائیں گے اور عبداللہ بن سعود سلطان کی خواہش کے مطابق قسطنطنیہ بھیج دیا جائے گا۔ چنانچہ عبداللہ بن سعود مصر کے راستہ سے قسطنطنیہ روانہ ہو گیا، قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد ۱۹ دسمبر ۱۸۱۹ء کو وہ قتل کر دیا گیا۔

محمد علی کی بغاوت: اس کے بعد محمد علی نے سنار اور نوبیہ کے علاقے فتح کر کے مملکت مصر میں شامل کر لیے۔ اس نے یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق ایک باقاعدہ سپاہیوں کی فوج تیار کی، جس کی تنظیم و تربیت کے لیے اس نے فرانس کے ان آزمودہ کار فوجی افسروں کو بڑی بڑی تنخواہوں پر اپنے ہاں بلا لیا تھا جو نپولین کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے۔ اس نے فرانسیسی انجینیروں کی مدد سے ایک زبردست بحری بیڑہ بھی تعمیر کرایا، گودی اور بندرگاہ، قوی توپخانے اور سلح خانے قائم کیے اور اسکندریہ سے قاہرہ تک ایک نہر تعمیر کرائی، حکومت اور انتظام کا ملکہ اسے فطرت کی طرف سے ملا تھا، وہ دشمنوں کے لیے نہایت سخت تھا مگر رعایا کے ساتھ اس کا سلوک ہمیشہ عدل و انصاف کا تھا۔ اس کی عدالت میں ہر مذہب اور فرقہ کے لوگوں کے ساتھ یکساں انصاف کیا جاتا تھا۔

اسے وہاں پہنچنے کے مقصود کا بار گراں تھا اور اس کی فوج اور بحری بیڑے بھی نہایت منظم تھے۔ چنانچہ اس کے عہد حکومت میں ملک میں جس قدر امن و امان اور خوشحالی تھی، اس سے پہلے مدت سے نہیں دیکھی گئی تھی۔ محمد علی نے نہ صرف مصر میں امن و امان قائم کیا بلکہ ۱۸۲۵ء میں سلطان کی طلب پر اپنی فوجیں یونان میں بھیج کر وہاں کی زبردست بغاوت کا بھی استیصال کر دیا۔

بغاوت یونان: یونان کی بغاوت مختلف اسباب کا نتیجہ تھی، یہ اسباب مدت سے جمع ہو رہے تھے اور ان میں سے بعض خود دولت عثمانیہ کے پیدا کردہ تھے مثلاً ترکوں نے جب کوئی ملک فتح کیا تو وہاں کے باشندوں سے اپنی فرماں روائی تسلیم کرانے کے بعد صرف خراج لینے پر قناعت کی اور ان کے مذہب، ان کی زبان اور ان کے رسم و رواج سے کوئی تعرض نہیں کیا، انھوں نے مفتوحین کی عصبیت بھی قائم رہنے دی، ان کا یہ طرز عمل تمام مفتوحہ قوموں کے ساتھ تھا مگر بالعموم یونانیوں کے ساتھ انھوں نے خاص خصوصیت برتی۔ بقول سر چارلس ایلیٹ (Eliot) ”جنوبی مشرقی یورپ پر حکومت ترکوں کی تھی لیکن اس (انیسویں) صدی تک اس کے مذہب، تعلیم، تجارت اور مالیات کا انتظام یونانیوں کے ہاتھ میں تھا“(۱) اتنا ہی نہیں بلکہ امور سلطنت کا انتظام بھی بہت کچھ یونانیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ ترکوں نے یونان اور اس کے متعدد جزائر فتح کرنے کے بعد مقامی حکومت بڑی حد تک یونانیوں کو سپرد کر دی تھی۔ بحر ایڈریاٹک اور بحر آئیونین کے یونانی جزائر میں یونانیوں کی خود اختیاری خاص طور پر نمایاں تھی، ان جزیروں میں بڑے بڑے تاجر اور جہاز راں تھے، جنھوں نے بغاوت میں خصوصیت کے ساتھ حصہ لیا، شیویل اپنی کتاب ”جزیرہ نمائے بلقان اور مشرق ادنیٰ“ میں یونانیوں کی مقامی حکومت خود اختیاری کے متعلق بیان کرتا ہے کہ ”بحر آئیجین کے جزیروں میں یہ حیرت انگیز حد تک ترقی کر گئی تھی، اس خطہ میں ہر جزیرہ کسی تحریری سند شاہی کی بنا پر اپنے معاملات کا انتظام خود کرتا تھا

---

(۱)The Eastern Question by: Marntt. P 198

اور سال میں ایک بار کے علاوہ جب خراج کی معہودہ رقم وصول کرنے کے لیے عثمانی عہدہ دار آتا تھا شاید ہی کبھی کوئی سرکاری عہدہ دار وہاں نظر آتا ہو۔ پھر تھسلی اور ایپرس کے پہاڑی علاقوں میں گاؤں کے باشندے نہ صرف اپنے ہاں کے ملکی انتظامات کے مالک تھے بلکہ انہیں ہتھیار رکھنے کا غیر معمولی حق بھی حاصل تھا۔ ان کے مسلح دستوں نے جو ارماتولی (Armatoles) کے نام سے مشہور تھے، مفسدات کو ڈاکوؤں سے پاک رکھنے کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ یونانیوں میں حکومت خود اختیاری کی آخری مثال کے طور پر پیلوپونیسس (Peloponnesus) کی حالت پر غور کیجیے جو موجودہ زمانہ میں موریا کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کی فراہمی میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے موریا کے پاشا نے ان کی ذمہ داری دولت مند یونانی زمینداروں کی ایک جماعت پر ڈال رکھی تھی جن کو پرائمیٹ (Primates) کہتے تھے اور جو لوگ ضلعوں اور دیہاتوں کے منتخب شدہ نمائندوں سے مدد لیتے تھے۔ یہ پرائمیٹ ترکوں کے گماشتہ ہونے کی حیثیت سے اگرچہ نادانستہ اور اکثر شاید دانستہ بھی اپنے غریب ہم مذہبوں پر ظلم کرتے رہتے تھے تاہم چونکہ وہ حکومت اور رعایا کے درمیان اہل موریا کی ایک نمائندہ جماعت تھے اس لیے موافق حالات میں ایک حقیقی مجلس شوریٰ کی حیثیت اختیار کر سکتے تھے۔" (۱)

یونانیوں کی بحری قوت: جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ بحر ایڈریاٹک اور بحر ایجین کے جزیروں میں تاجروں اور ماہر جہاز رانوں کی ایک کثیر تعداد نے قومی تحریک میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ ترکی بحریہ میں جہاز رانوں کا بڑا حصہ ابتدا ہی سے یونانیوں پر مشتمل تھا اور سلطنت عثمانیہ کی تجارت بھی بیشتر انہی کے ہاتھوں میں تھی۔ اٹھارہویں صدی میں دولت علیہ اور روس کی جنگ میں یونانیوں کو اپنی تجارت کے فروغ دینے کا بہت موقع ملا۔ معاہدۂ کینارجی (۱۷۷۴ء) کے تتمہ کے طور پر ۱۷۸۳ء میں روس اور دولت علیہ میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا جس کے رو سے یونانی جہازوں کو مخصوص تجارتی رعایتیں اور روسی علم

---

(1) The Balkan Peninsula and the near east by F. Schevill. P. 3[illegible]

استعمال کرنے کی اجازت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد جب نپولین کے عہد میں فرانس اور انگلستان کی جنگ نے ترکی جہازوں کے سوا تمام جہازوں کی ناکہ بندی کر دی تو یونانیوں نے روسی علم چھوڑ کر ترکی علم استعمال کرنا شروع کر دیا۔ غرض اس زمانہ میں بھی جب یورپ کی تمام قومیں نپولین کے اٹھائے ہوئے طوفان میں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھیں یونانی اپنی تجارت کو برابر ترقی دیتے رہے اور انھوں نے نہ صرف بہت زیادہ دولت پیدا کر لی بلکہ جہاز رانی کے فن میں بھی مہارت حاصل کر لی، چونکہ شمالی افریقہ کے بحری قزاقوں سے انھیں خطرہ رہا کرتا تھا، اس لیے وہ اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے چھوٹی توپیں بھی رکھنے لگے تھے، اس طرح آہستہ آہستہ انھوں نے ایک ایسا بیڑا تیار کر لیا تھا جو آئندہ جنگ میں کام آ سکتا تھا۔

ارماتولی اور کلیفت: بحری قوت کے علاوہ یونانیوں میں بری طاقت بھی ایک حد تک پیدا ہو گئی تھی جس کے ذرائع ارماتولی (Armatoli) اور کلیفٹ (Klephts) تھے۔ بازنطینی قیصروں کے عہد میں دروں اور سڑکوں کی حفاظت کے لیے تھسلی کے سرحدی علاقوں کے وحشی پہاڑی باشندے ایک قسم کی بے ضابطہ ردیف (Militis) میں بھرتی کیے جاتے تھے، ان کو ارماتولی کہتے تھے، سلاطین عثمانیہ نے یہ نظام حسب معروف جاری رکھا بلکہ اسے ترقی دی، یہ گویا ایک مقامی پولیس تھی، یونان کے پہاڑی باشندے کئی پشتوں سے اسلحہ کے استعمال کے عادی تھے اور پہاڑی لڑائیوں میں ملکہ حاصل کر چکے تھے، ارماتولی کے دستوں میں جن کی حیثیت مسلح گارڈ کی تھی، صرف یونانی باشندے بھرتی کیے جاتے تھے اور ان کے افسر بھی تمام تر یونانی ہی ہوتے تھے، ابتداءً ان کو صرف ان پہاڑی ڈاکوؤں سے ملک کی حفاظت کے لیے ہتھیار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی اور اکثر ڈاکوؤں ہی کے گروہ سے وہ بھرتی بھی کیے جاتے تھے لیکن جب اٹھارہویں صدی کے آخر میں باب عالی کو ان کی تعداد اور تنظیم کی طرف سے اندیشہ پیدا ہوا تو اس نے ان کے دستے کم کرنے شروع کیے، یہ دیکھ کر ارماتولی باغی ہو گئے اور

اپنے سابق ساتھیوں یعنی کلیفٹ کی جماعت میں شریک ہونے لگے۔ کلیفٹ وقتاً فوقتاً اپنے پہاڑی دروں سے نکل کر قرب وجوار کے باشندوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور ہتھیار بھی ان کے پاس بہت وافر مقدار میں رہا کرتے تھے، وہ اپنی قوت سے کسی قومی تحریک کو بہت کچھ مدد پہنچا سکتے تھے، یونان کی جنگ آزادی میں ارماتولی اور کلیفٹ کی خدمات خاص طور پر نمایاں ہیں۔

حکومت میں یونانیوں کا اقتدار: یونانیوں کو سلطنت عثمانیہ کے ملکی معاملات میں بھی بڑا اقتدار حاصل تھا، قسطنطنیہ کا ایک حصہ فنار کے نام سے مشہور تھا، اس میں یونانی کلیسا کا بطریق اور اونچے درجہ کے پادری اور اسقف رہا کرتے تھے، بعد میں بڑے بڑے دولت مند یونانیوں نے آکر اسی حصہ میں بودوباش اختیار کرلی، یہ لوگ کلیسا کے صیغۂ مال کے کارکن بھی تھے اور باب عالی کی طرف سے بھی محصول جمع کرتے تھے، رفتہ رفتہ سترہویں صدی عیسوی میں فناریوں کا ایک جدید سیاسی طبقہ قائم ہو گیا اور سلطنت عثمانیہ کے دفتروں میں اکثر یونانی عہدہ دار اسی طبقہ کے لوگ ہونے لگے، تاہم احمد کوپریلی کے صدر اعظم ہونے سے پہلے عثمانی دفتروں میں جو یونانی کام کرتے تھے ان کے عہدے زیادہ بلند نہ تھے لیکن ١٦٦٩ء میں کینڈیا کی فتح کے بعد احمد کوپریلی نے اپنے سکریٹری پانایوتی (Panayoti) کے لیے جو ایک متمول یونانی تھا ترجمان باب عالی (Dragoman of the Porte) کا ایک جدید عہدہ قائم کیا جو ایک نہایت اہم سیاسی عہدہ بن گیا، پانایوتی کے بعد ایک دوسرا لائق یونانی اس عہدہ پر مقرر کیا گیا، رفتہ رفتہ یہ عہدہ وزارت امور خارجہ کا عہدہ بن گیا، جس پر یونانیوں ہی کا تقرر ہوتا رہا اور سلطنت عثمانیہ کے غیر ملکی معاملات زیادہ تر انہی کے ہاتھوں میں رہے، یونانیوں کے بعد عثمانی بحریہ کے لیے بھی ایک مترجم کا عہدہ قائم کیا گیا اور اس پر بھی ایک یونانی ہی مقرر کیا گیا، یہ مترجم عثمانی امیر البحر کے سکریٹری کا منصب رکھتا تھا اور چونکہ امیر البحر جزائر اگیین کا گورنر بھی تھا اس لیے مترجم بحریہ (Dragoman of the Fleet) سے ان جزائر کی

یونانی آبادی کے تعلقات سرکاری طور پر قائم ہو گئے۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں مولڈیویا اور ولاچیا کی امارت بھی دوسرے بڑے بڑے عہدوں کی طرح یونانیوں کو دی گئی، یہ بڑے بڑے عہدہ دار اپنے ماتحت عہدوں پر اپنے ہی ہم وطن اور ہم قوم اشخاص کو مقرر کرتے تھے، یوں رفتہ رفتہ حکومت کے تمام شعبوں میں یونانیوں کا اقتدار روز بروز بڑھتا گیا۔

عام یونانیوں کی حالت: سلطنت عثمانیہ کی عام یونانی رعایا کی حالت بھی یورپ کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں کہیں بہتر تھی۔ چارلس فنلے اپنی مستند و مشہور کتاب تاریخ یونان میں لکھتا ہے:

> "حکومت عثمانیہ کو بعض حیثیتوں سے یورپ میں سب سے زیادہ مستبد حکومت تھی، تاہم دوسرے اعتبارات سے سب سے زیادہ متحمل اور روادار بھی تھی۔ یہ جسم کو قید کر لیتی تھی لیکن دماغ کو آزاد چھوڑ دیتی تھی۔ عیسائی رعایا کے نچلے طبقے یورپ کے دوسرے حصوں کے مسیحی کاشتکاروں کی بہ نسبت ذاتی حیثیت سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ یونانی نہ تو صنعت و حرفت کے غلام تھے اور نہ زرعی غلام۔ ان کی مزدوری زیادہ آزاد بھی تھی اور زیادہ نفع بخش بھی اور انہیں شہری حقوق اتنے ہی زیادہ حاصل تھے جتنے فرانس میں اسی طبقہ کے لوگوں کو انقلاب سے قبل حاصل تھے۔"

> "اٹھارہویں صدی کے آخر کے قریب جب ترکی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا، یونانی ایک ترقی کرنے والی قوم بن گئے تھے۔ ان میں ایک بڑی تعداد چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی بھی تھی جنہیں اپنی حالت کے سدھارنے کے مواقع حاصل تھے۔ شہروں میں مزدوروں اور تاجروں کی جفاکش آبادی کو دولت مند تاجروں کی

> بدعت سے جن کو اکثر غیر ملکی طاقتوں کی حمایت حاصل ہوتی رہتی بچاتی تھی۔ ساحلی علاقوں میں یونانیوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی جس میں زیادہ تر یونانی ملاح اور بحری تاجر شامل تھے، یونانیوں کو بڑی حد تک شخصی آزادی کے مواقع حاصل تھے۔ اقتصادی پہلو کے اعتبار سے کسان اور تاجر کی بھی قدر تھی جس قدر یونانی کسان اور تاجر اور معاشرتی مدارج کی ترقی میں یونانیوں کے مقابلہ میں ترکوں کے لیے سیاسی زندگی کو ہموار رکھتی تھیں، صوبوں کے بہت کم ترک باشندوں کو انتظام حکومت میں کبھی کبھی اتنا دخل حاصل ہوتا جتنا اہل فنار کو باقاعدہ اور مستقل صورت میں حاصل تھا۔ دیہاتی علاقوں میں اسلامی آبادی کے مسلمان افسر شاذ و نادر ہی لوگوں کو بے انصافی سے بچانے کی اتنی قدرت رکھتے تھے جتنی یونانی جماعتوں کو حاصل تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھیں یونانیوں سے کم حقوق و مراعات حاصل تھے۔"(۱)

یورپین سیاحوں کا بیان ہے کہ یونانیوں کی مذہبی آزادی پر آئرلینڈ کے کیتھولک رشک کرتے تھے اور بعض معاملات میں انھیں اس سے زیادہ اختیارات حاصل تھے جتنے فرانس کے باشندوں کو اپنے علاقوں میں۔ اگرچہ بعض سیاحوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یونانی بڑے مصائب میں مبتلا تھے اور انھیں اپنی جان و مال کی طرف سے ہمیشہ خطرہ رہا کرتا تھا لیکن بعض دوسرے سیاحوں کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ یورپ کی کسی قوم پر محصول کا بار اتنا نہ تھا جتنا یونانیوں پر اور نہ کسی قوم پر شخصی حیثیت سے اس قدر پابندیاں عائد تھیں۔ یونانی کلیسا کے پاس بڑی دولت تھی اور تمام ترکی میں اس کا سیاسی اقتدار بھی زیادہ تھا، یونانیوں کو موجودہ یورپ اور دنیا میں شاہانہ قوت حاصل تھی، یورپ میں

---

(۱) تاریخ یونان از جارج فنلے جلد پنجم ص ۱۲۷-۱۲۸، آکسفورڈ ۱۸۷۷ء

A History of Greece by George Finley Oxford 1877

سلطنت عثمانیہ کے محاصل کا بڑا حصہ یونان کے پرائمیٹ وصول کرتے تھے اور بہت سے اضلاع میں یونانی بلدیوں (میونسپلٹیوں) کو تقریباً غیر محدود اختیارات حاصل تھے(۱) روس، پولینڈ اور ہنگری کے عیسائی کاشتکاروں کی بہ نسبت سلطنت عثمانیہ میں عیسائی کاشتکاروں کو اپنی محنت کا پھل زیادہ ملتا تھا، یونانی شہری کو تقریری آزادی اس سے زیادہ حاصل تھی جتنی شہنشاہ نپولین اول کے عہد میں سلطنت فرانس کے شہریوں کو حاصل تھی اور اپنے قصبوں کے انتظامی معاملات میں انھیں اتنا ہی اختیار حاصل تھا جتنا فرانس کے باشندوں کو(۲) سلطنت عثمانیہ کے عیسائی باشندے 'رعایا' کا لفظ اپنے لیے تحقیر کا باعث سمجھتے تھے، دولت علیہ کے تمام عیسائی مورخوں نے بھی غلطی سے اس کو ایک تحقیری لقب خیال کیا ہے، بہرحال ترکوں نے یونانیوں کے ساتھ یہاں تک رواداری برتی تھی کہ انھیں 'رعایا' کے بجائے 'معاون' کہتے تھے، فرانسیسی مورخ والازون لکھتا ہے: "انھوں (ترکوں) نے یونانیوں کا یہاں تک لحاظ رکھا تھا کہ انھیں 'رعایا' کے تحقیری نام کے بجائے 'معاون' کا لقب دیا تھا۔"(۳)

تعلیم اور تحریک آزادی: تعلیم میں بھی یونانی یورپ کی کسی قوم سے پیچھے نہ تھے بلکہ ان میں پڑھے لکھے آدمیوں کا تناسب غالباً یورپ کی دوسری عیسائی قوموں سے زیادہ تھا(۴) سلطان سلیم ثالث کے عہد سے یونانیوں میں تعلیم بہت تیز ترقی کی اور تعلیم ہی ان کی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، ان کے مدارس سلطنت کے حصہ میں قائم ہو گئے تھے، علاوہ بریں دولت مند اشخاص اپنے لڑکوں کو یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے تھے، جہاں وہ قومی آزادی کے خیالات سے متاثر ہوتے تھے اور واپس ہونے کے بعد اپنے وطن میں ان خیالات کی اشاعت کرتے تھے، ہر یونانی جو لکھ پڑھ سکتا تھا وہ قدیم یونانی لٹریچر سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا تھا اور

---

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۷-۶ (۲) ایضاً ص ۱۷ (۳) تاریخ دولت عثمانیہ از والاژن (ترجمہ اردو) جلد اول ص ۳۰۳ (۴) فنلے جلد ۶ ص ۱۶

قدیم یونان کی عظمت کی یاد کو بھی نئے دور میں بھی اس نے بیدار رکھی تھی۔ ایک شاعر اور ایک ادیب کی کوششوں سے آزادی کی بیداری قوم میں ہوئی۔ ریگاز (Rhigas) کی قومی نظموں نے اہل یونان کے جذبۂ حریت کو مشتعل کر دیا۔ وہ ایک خفیہ سیاسی انجمن کا بانی بھی تھا اور یہ انجمن یونان کی مختلف سیاسی انجمنوں سے خفیہ تعلق رکھتی تھی، چنانچہ سازشوں کی بنا پر ۱۷۹۸ء میں وہ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ کوریز (Koraes) کی خدمات ریگاز سے زیادہ وسیع اور پائیدار تھیں۔ اس نے سیاسی کتابیں بھی لکھیں لیکن اس کا اہم کارنامہ وہ مقدمات ہیں جو اس نے یونانی ادبیات عالیہ (کلاسکس) پر فصیح اور صحیح زبان میں لکھے ہیں۔ ان مقدمات سے اس نے سیاسی پروپیگنڈے کا کام بھی لیا اور اس طرح یونان پرستی کی تحریک کو مدد پہنچائی اور ساتھ ہی ساتھ لسانی اصلاح کی تحریک بھی شروع کی جسے یونانی زبان کی نشاۃ ثانیہ کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ یونانی زبان اسی کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔

ایلیسن فلپس (Alison Philips) لکھتا ہے:

> مراعات خصوصی (۱) سے پہلے بھی سلطان کی عیسائی رعایا اپنے مذہبی ارکان بے خوف ادا کرتے، دولت جمع کرتے اور جس طرح چاہتے تعلیم حاصل کرنے میں بالکل آزاد تھی۔ یونانی بلا امتیاز حکومت کے اونچے درجے تک ترقی کر سکتا تھا، ترجمان باب عالی یا کسی صوبہ کا گورنر ہو سکتا تھا۔ عثمانی حکومت میں کسانوں کا درجہ اٹھارہویں صدی کے یورپ کے اکثر حصوں سے کہیں بہتر تھا۔ زرعی غلامی جو تمام مسیحی یورپ میں تقریباً عالمگیر تھی، ترکی میں مفقود ہو چکی تھی اور ترکی سلطنت کے بہت سے حصوں میں کاشتکاروں کو ایسی خوش حالی حاصل تھی کہ اس سے

---

(۱) مراعات خصوصی یا Capitations، مراعات اور امتیازات تھے جو سلطنت عثمانیہ میں غیر ملکیوں کو حاصل تھے، ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا۔

بعض ان قوموں سے کہیں جو زیادہ مہذب سمجھی جاتی تھیں واقف بھی نہ تھے۔"(۱)

مذکورہ بالا حالات کی موجودگی میں یونانیوں کا علم بغاوت بلند کرنا تعجب سے خالی نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یونانیوں کو جو مراعات سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھیں وہی ان کی حوصلہ افزائی کا سبب بن گئیں، اس کے علاوہ دولت علیہ کی بڑھتی ہوئی کمزوری، اس کے اندرونی معاملات میں یوروپین حکومتوں کی مداخلت، یونانیوں کے ساتھ روس کی سازشیں اور پھر انقلاب فرانس کی عام ہنگامہ خیزی ان سب نے مل کر یونانی قوم کو جسے خود سلاطین عثمانیہ کی پالیسی نے ریاست اندر ریاست (Imperium in imperis) کے امتیازات دے کر شروع ہی سے ایک حد تک حکومت خود اختیاری تفویض کر دی تھی مکمل آزادی کے لیے آگے بڑھایا اور بالآخر انگلستان، روس اور فرانس کی حمایت نے اسے کامیاب کیا۔

انقلاب فرانس کا اثر: یونان کی تحریک آزادی پر انقلاب فرانس کا بہت زیادہ اثر پڑا، اس وقت یورپ کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جو فرانس کے عہد آفریں انقلاب سے متاثر نہ ہوا، یونانیوں نے بھی اس انقلاب کا خیر مقدم کیا، ان پر پیرس کی ادبی انجمنوں کا اثر خصوصیت کے ساتھ پڑا، بقول فنلے انھوں نے دیکھا کہ تحریر و تقریر سے تلوار کا کام لیا جا سکتا ہے یعنی حکومت الٹ دی جا سکتی ہیں، یونانی چونکہ تحریر و تقریر میں ہمیشہ سے ماہر رہے ہیں اس لیے انھوں نے سلطنت عثمانیہ کا تختہ الٹ دینے کی غرض سے ادبی مجلسیں اور خفیہ انجمنیں قائم کرنی شروع کر دیں، ان میں سے دو انجمنیں خاص طور پر اہم تھیں، ایک فلومیوز سوسائٹی (Philomuse Society) جو ۱۸۱۲ء میں ایتھنز میں قائم ہوئی اور دوسری فلکیہ ہتیریا (Philike Hetairia) جسے ۱۸۱۴ء میں تین یونانی تاجروں نے اوڈیسا

---

(۱) "یونان کی جنگ آزادی" از ایلیسن فلپس مطبوعہ لندن ۱۸۹۷ء ص ۸

The War of Greek Independence by Alison Phillips London 1897

میں قایم کیا، فائلو میوز سوسائٹی ایک قسم کی ادبی انجمن تھی اور وہ اپنے سرمایہ سے یونانیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ کی یونی ورسٹیوں میں بھیجتی تھی، چنانچہ جن لوگوں نے یونان کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا، ان میں سے بیشتر نے اسی انجمن کی مالی مدد سے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی۔

ہتیریا: فائلیک ہتیریا ایک سیاسی انجمن تھی، جو خاص طور پر یونان میں انقلاب پیدا کرنے کی غرض سے قایم کی گئی تھی، فنلے کا بیان ہے کہ اس کے ابتدائی ارکان دیوالیے تاجر اور سازشی قسمت آزما تھے، انجمن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ عثمانیوں کا جوا کندھے سے اتارنے کے بعد مشرق میں یونانی سلطنت از سرِ نو قایم کی جائے اور اس کے لیے تمام یونانیوں کو فوجی حیثیت سے منظم کیا جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے انجمن نے ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس کے بعض منصوبے عجیب و غریب تھے مثلاً سلطنت عثمانیہ کو فنا کر دینے کے لیے اوڈیسا کے ارکان ہتیریا نے یہ تجویز کیا تھا کہ قسطنطنیہ میں آگ لگا دی جائے، سلاح خانہ کو جلا دیا جائے، جنگی جہازوں کا بیڑا برباد کر دیا جائے، سلطان اور اس کے وزیروں کو قتل کر دیا جائے اور قسطنطنیہ کی پوری مسلمان آبادی تہ تیغ کر دی جائے، فنلے ان منصوبوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "یہ تجارت پیشہ مفسدہ پرداز خیال کرتے تھے کہ ایک سلاح خانہ میں آگ لگا کر اور ایک بادشاہ کو قتل کر کے وہ سلطنت کا تختہ الٹ سکتے ہیں، انھوں نے اس امکان کو نظر انداز کر دیا تھا کہ اس سے کروڑوں جنگجو مسلمانوں کی آتش غضب بجا طور پر بھڑک اٹھتی اور وہ خونیں انتقام کے جوش میں ترکی حکومت کو بچانے کے لیے قسطنطنیہ کی طرف دوڑ پڑتے اور اگر یہ سازش کرنے والے عثمانی نظام حکومت کی تمام خرابیوں کے اصلی سرچشمہ کو نیست و نابود کر چکے ہوتے تو مسلمانوں نے ایک جدید اور زیادہ طاقتور ترکی سلطنت کی بنیاد رکھ دی ہوتی"(۱) ہتیریا کی کامیابی کی بڑی وجہ وہ خیالات تھے جو عام طور پر اس وقت

---

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۱۰۰

سلطنت عثمانیہ کے متعلق پھیلے ہوئے تھے، عموماً یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ سلطنت اپنی زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہی ہے اور روس بہت جلد قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے والا ہے۔ ہیٹیریا اسی زمانہ میں قائم ہوئی جب یہ خیالات یونانیوں میں کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ اس کے ممبروں کی تعداد تیزی کے ساتھ بڑھتی گئی اور تھوڑے ہی دنوں میں ہزاروں تک پہونچ گئی اور بہت سے دولت مند اور ذی اثر یونانی اس میں شامل ہو گئے، روس کے بہت سے فوجی افسر بھی اس کے ممبر ہو گئے تھے۔ ان کی شرکت کی وجہ سے عوام یہ سمجھتے تھے کہ آئندہ جنگ آزادی میں روس یونان کی مدد کرے گا، اسی بنا پر لوگ بکثرت اس انجمن کے ممبر بنتے گئے، میریٹ کا بیان ہے کہ ۱۸۲۰ء تک اس کے ممبروں کا شمار دو لاکھ تک پہنچ گیا تھا(۱) ہر طبقہ کے لوگ اس میں داخل ہوتے تھے، دلی خلوص اور جاں نثاری کے ساتھ یونان کی آزادی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا رکنیت کی ایک لازمی شرط تھی، جو لوگ انجمن میں داخل ہوتے تھے ان کو یہ حلف دیا جاتا تھا: اپنے مذہب اور وطن کے لیے جنگ کرو، اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے ملک کے دشمنوں سے نفرت کرو، انھیں ستاؤ، انھیں بالکل نیست و نابود کر دو" (۲) اس انجمن کا ایک اہم قانون یہ تھا کہ ہر ممبر کو اپنے لیے اسلحہ اور گولا بارود خود فراہم کرنا پڑتا تھا، انجمن کے ایجنٹ جن کو مبلغ یا داعی (Apostles) کہتے تھے سلطنت عثمانیہ کے ہر حصہ میں یونانی کلیسا کے پیروؤں کے پاس بھیجے جاتے تھے تاکہ ترکوں کے خلاف نفرت اور روس کے ساتھ عقیدت کے جذبات پھیلائیں، ہیٹیریا کی شاخیں اور اس کے نمائندے سلطنت عثمانیہ کے ہر یورپین صوبہ میں، ایشیائے کوچک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اور ہر غیر مملکت میں جہاں یونانیوں کی کوئی تعداد آباد تھی پھیلے ہوئے تھے۔

روس کی سازشیں: جس چیز نے یونانیوں کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کی، وہ روس کی سرپرستی تھی، گو یہ سرپرستی تمام تر روس کے ذاتی اغراض پر منحصر تھی اور وہ شروع سے

---

(۱) میریٹ ص ۲۰۳ (۲) کریسی جلد ۲ ص ۲۰۱

یونانیوں کو بطور آلۂ کار کے استعمال کرنا چاہتا تھا، پطرِ اعظم کے وقت ہی سے روس کے مدبرین نے یونانیوں کے مذہبی تعصب کو زار کے ساتھ قلبی تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا شروع کر دیا تھا، دریائے پرتھ کے ساحل پر پطر کی فاش شکست نے چند دنوں کے لیے روس کے اثر کو بڑھنے سے روک دیا لیکن ملکہ این اور کیتھرائن ثانیہ کے دوران حکومت میں روس کے ایجنٹ سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں میں نہایت سرگرمی کے ساتھ سازشوں کا جال پھیلاتے رہے اور یونانیوں کو دولت علیہ کے خلاف بغاوت کرنے پر برابر آمادہ کرتے رہے۔ فنلے لکھتا ہے کہ "روس کی سازشی جتھوں نے اہل یونان پر بہت سے مصائب ڈھائے ہیں عملی طور پر ۱۷۷۰ء میں شروع ہوئی تھیں۔ چینڈلر (Chandler) نے جو ۱۷۶۷ء میں یونان گیا تھا، لوگوں کو اس تصور سے مطمئن پایا کہ انھیں روس کی مدد سے جلد حکومت عثمانیہ سے نجات ملنے والی ہے"(۱) روس کی مدد کی حقیقت کیا تھی، اس کے متعلق بھی فنلے کا بیان قابل غور ہے۔ وہ لکھتا ہے "بہت عرصے تک روس کے اثر نے یونانیوں کی توجہ ملکی اصلاحات سے ہٹا کر فتح کے منصوبوں کی طرف مبذول کر دی، حکومت روس یونانیوں کو ایسی حالت میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ دوسروں کی مدد کے بغیر خود اپنی کوششوں سے آزادی حاصل کر لیں، سلطان کی غیر مطمئن رعایا کی حیثیت سے وہ کیتھرائن کی پالیسی کے کارآمد آلے تھے لیکن ملکی حقوق و مراعات کے حاصل ہونے کی صورت میں جن سے انھیں (اہل) کیوس (Chios) کی طرح اپنی حالت کو بہتر بنانے کا موقع ملتا، وہ سلطان ہی کا مددگار بن جاتے اور ترکی سلطنت عثمانیہ کے جائز وارث قرار دیے جاتے۔"(۲)

۱۸۲۰ء میں جب عثمانی فوجیں علی پاشا والی یانینا سے جنگ میں مصروف ہوئیں تو یونانیوں کا بہترین موقع مل گیا اور روسی ایجنٹوں کی سرگرمیاں بھی بہت بڑھ گئیں۔ فنلے کا بیان ہے کہ "یونانیوں نے جو روش اختیار کی وہ اکثر اوقات باغیانہ تھی۔

---

(۱) فنلے جلد ۵ ص ۲۲۸ (۲) ایضاً ص ۱۷-۲۲۲

روسی ایجنٹ ان کی پشت پناہی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے"، جن صوبوں میں یونانیوں کی تعداد زیادہ تھی وہاں عثمانی حکام کو بڑی دقتیں پیش آتی تھیں، روسیوں کے طرز عمل کی وجہ سے کسی پاشا کے لیے یونانیوں کی گستاخیوں کو روکنے کی غرض سے کوئی کارروائی کرنا بغیر اس کے کہ پہلے سے اس کے متعلق صریح احکام قسطنطنیہ سے حاصل کر لیے جائیں خطرہ سے خالی نہ تھا(۱)۔ ہیتریا کے ممبر زار روس الکزنڈر اوّل کا نام برابر استعمال کرتے تھے، جس کے متعلق یونانیوں کا یہ عام خیال تھا کہ وہ در پردہ اس انجمن کی مدد کر رہا ہے، تاہم چونکہ ہیتریا کی کارروائیاں بہت خفیہ ہوا کرتی تھیں اس لیے شروع میں باب عالی کو اس کا علم نہ ہوا، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت عثمانیہ میں اس وقت تک جاسوسی کا نظام قائم نہیں ہوا تھا، چنانچہ جیسا کہ فنلے نے لکھا ہے "نظام جاسوسی کی غیر موجودگی نے ہیتریا کو یونانیوں کی رائے میں سلطان کی حکومت کو دشمن، آسٹریا اور خود روس کی حکومت کے مقابلہ میں قابل ترجیح بنا دیا تھا"۔ بہر حال ۱۸۲۰ء کے دوران میں یونانیوں کے طرز عمل میں جو غیر معمولی فرق نمایاں ہوا اسے ترک نظر انداز نہ کر سکے اور سلطان اور وزرائے سلطنت کو بار بار اس کی طرف متوجہ کیا گیا، روس کے ایجنٹ ایک طرف ہیتریا کی سازشوں کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور دوسری طرف اس کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔

براَت: یونانیوں کی اس بدلی ہوئی روش کا ایک خاص سبب تھا، کچھ دنوں سے سلطنت عثمانیہ میں ایک دستور 'براَت' کا جاری ہو گیا تھا، جس کے رو سے سلطان کی رعایا کسی دوسری حکومت کی جس سے دولت علیہ کے دوستانہ تعلقات ہوں رعایا بن سکتی تھی، یونانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہ رعایت حاصل کر کے مغربی حکومتوں کی رعایا بن گئی تھی، اس رعایت کی وجہ سے یہ لوگ اکثر سلطنت کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے رہتے لیکن سزا سے محفوظ رہتے، ان کو 'براتلی' کہتے تھے، یہ ترکی آبادی میں رہتے تھے اور

---

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۱۵۵

بہت سے بڑے بڑے محصولوں سے جن کو مسلمان بھی ادا کرتے تھے بری تھے، یہ لوگ تجارت کرتے لیکن نہ تو ان محصولوں کو ادا کرتے اور نہ ان قوانین کی پابندی کرتے جو تجارت سے متعلق سلطنت عثمانیہ میں رائج تھے، یہاں تک کہ عثمانی پولیس انھیں گرفتار بھی نہیں کرسکتی تھی، کیوں کہ جس حکومت کی رعایا وہ بن گئے تھے اس کا قنصل یا سفیر ان کی حمایت کرتا تھا، اسی طبقہ کے لوگ یونانی انقلاب کے سب سے زیادہ سرگرم کارکن تھے، اگر ان کی سازشیں کھل بھی جاتیں تو وہ اس حمایت کی وجہ سے سزا سے قطعی طور پر محفوظ رہتے۔ (۱)

ہتیریا کے سردار اوائل ۱۸۲۰ء میں علم بغاوت بلند کرنے کی تیاریاں کر ہی رہے تھے کہ علی پاشا والی یانینا اور باب عالی میں جنگ چھڑ گئی اور بغاوت شروع کرنے کے لیے یہ موقع انھیں بہت مناسب ہاتھ آگیا کیوں کہ بہترین عثمانی فوجیں اس وقت علی پاشا کے مقابلہ میں مصروف تھیں۔

علی پاشا: اس وقت تک باب عالی ہتیریا کی خفیہ کارروائیوں سے بے خبر تھا اور سلطان محمود سلطنت کے سرکش پاشاؤں کی سرکوبی کا تہیہ کرکے سب سے پہلے علی پاشا والی یانینا کو زیر کرنے کے لیے فوجیں روانہ کر رہا تھا، علی پاشا ۱۷۵۰ء میں البانیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں تپلن (Tepelene) میں پیدا ہوا، جہاں اس کے اجداد کئی پشتوں سے سرداری کرتے آئے تھے، علی کے باپ نے ہمسایہ پہاڑی سرداروں سے لڑائی کرنے میں اپنے بیشتر موروثی مقبوضات کھو دیے تھے، بچپن ہی میں علی یتیم ہو گیا تھا مگر اس کی ماں نے خاندان کی سرداری کو قائم رکھا، ایک روز وہ ایک حریف قبیلہ کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئی تھی اور اس قبیلہ کے لوگوں نے اسے اور اس کی لڑکی کو ستایا تھا، اس نے علی کو جو ابھی بچہ ہی تھا قسم دی کہ بڑا ہو کر اس اہانت کا سخت انتقام لے، چنانچہ علی نے اس قسم کو پورا کیا اور اس قبیلہ سے نہایت ہولناک انتقام لیا، اپنی حیرت انگیز جرأت کی بنا پر وہ پندرہ سال کی

---

(۱) اٹلے جلد ۲ ص ۱۰۷

عمر میں ایک بڑی جماعت کا سردار بن گیا تھا، قرب و جوار کے علاقوں میں لوٹ مار کرنا اس کا مرغوب مشغلہ تھا، چند سال کے اندر اس نے اپنے خاندانی علاقوں کا بڑا حصہ دشمنوں سے واپس لے لیا اور البانیا میں اس کی شجاعت اور قابلیت کی شہرت روز بروز پھیلتی گئی، ۱۷۸۸ء میں جب دولت علیہ اور آسٹریا میں جنگ ہوئی تو علی نے عثمانی فوج میں گراں قدر خدمات انجام دیں جن کے صلہ میں وہ تریکالا (واقع تھسلی) کا پاشا بنا دیا گیا، اس کے بعد وہ ۱۷۸۸ء میں یانینا کا پاشا بن بیٹھا، وہ نہایت ذہین اور طباع تھا اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں بڑے سے بڑے فریب اور مظالم سے بھی باز نہ آتا، رفتہ رفتہ اس نے ہمسایہ پہاڑی علاقوں پر اپنا تسلط پوری طرح قایم کرلیا اور یانینا کو پایہ تخت بنا کر ایک خودمختار فرماں روا کی طرح حکومت کرنے لگا، دشمنوں کے ساتھ اس کا سلوک انتہائی ظالمانہ تھا لیکن اپنی رعایا کے ساتھ وہ عدل و انصاف کا برتاؤ کرتا اور جو شہر اور علاقے اس کے زیر حکومت تھے وہاں ہر طرف امن و خوشحالی نمایاں تھی (۱) وہ علوم و فنون کا بڑا سرپرست تھا، اس کی مملکت میں متعدد کالج، اسکول اور کتب خانے قایم تھے اور اس کے عہد حکومت میں یانینا یونانی قوم کا ادبی مرکز بن گیا تھا، چونکہ جنوبی البانیا کی ادبی زبان یونانی تھی اس لیے مسلمان اور عیسائی دونوں اسے پڑھتے تھے، مسلمان نظمیں اور نغمے، خطوط اور حساب کتاب یونانی زبان میں لکھتے تھے، جن کے بہت سے قلمی نسخے تیار کیے جاتے تھے لیکن مسلمانوں کی لکھی ہوئی نظموں اور نغموں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ (۲)

انقلاب فرانس کے بعد علی پاشا نے نپولین اور یورپ کے دوسرے فرماں رواؤں سے مراسلت کا سلسلہ قایم کر رکھا تھا، جو اسے گو باضابطہ نہیں مگر عملاً ایک خودمختار حکمراں تسلیم کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ علی پاشا اپنی حکومت میں پورے البانیا، تھسلی، یونان اور جزائر اکیین کو شامل کرنا چاہتا تھا، اس کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا لیکن ۱۸۱۹ء تک وہ اپنے

---

(۱) کریسی جلد ۲ ص ۳۰۲ ۔ (۲) فنلے جلد ۱ ص ۵۹

مقبوضات میں اضافہ کرتا چلا گیا، محمود کے لیے اس خودسر پاشا کی سرکشی عرصے سے تشویش کا باعث تھی، اوائل ۱۸۲۰ء میں علی نے ایک ایسی حرکت کی جس سے محمود کو فوراً اس فتنہ کے استیصال کی جانب متوجہ ہونا پڑا، علی کا ایک دوست اسماعیل پاشو بے تھا، جس سے وہ کسی بات پر خفا ہو گیا اور آخرکار اس کی جان کا دشمن ہو گیا، اسماعیل پاشو بے یانینا سے بھاگ کر قسطنطنیہ چلا آیا اور سلطان کے دربار میں ملازم ہو گیا، علی نے اپنے دو آدمیوں کو اسماعیل پاشو بے کو قتل کرنے کے لیے قسطنطنیہ بھیجا، چنانچہ ان لوگوں نے ایک روز دن کے وقت جامع ایاصوفیہ کے دروازہ پر اسماعیل پاشو بے پر حملہ کیا، مگر وہ بچ گیا اور یہ دونوں گرفتار کر لیے گئے، انھوں نے صاف صاف بیان کیا کہ علی پاشا نے انھیں اس قاتلانہ مہم پر مامور کیا تھا، انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ علی پاشا نے اطمینان دلایا تھا کہ اگر وہ اپنی مہم میں کامیاب رہے تو دیوان کے معتمد ارکان انھیں سزا سے بچانے کے لیے تیار ملیں گے، یہ معلوم کر کے کہ علی پاشا رشوت کے ذریعہ سے دیوان میں بھی اس قدر اثر رکھتا ہے، محمود سخت برہم ہوا، حملہ آور تو فوراً قتل کر دیے گئے اور علی بغاوت کا مجرم قرار دیا گیا، اسے چالیس روز کی مہلت دی گئی کہ باب عالی میں حاضر ہو کر معذرت پیش کرے لیکن یہ مدت گزر گئی اور علی نہ آیا، اس کے بعد وہ قانون کی حمایت سے محروم کر دیا گیا اور محمود نے اعلان کرا دیا کہ جو شخص بھی اس کی سفارش کرے گا وہ فوراً قتل کر دیا جائے گا، اس نے اسماعیل پاشو بے کو یانینا کا پاشا مقرر کر کے علی پاشا کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا۔

علی پاشا، اسماعیل پاشو بے کا مقابلہ کامیابی سے کرتا رہا اور تقریباً دو سال تک قابو میں نہ آیا، آخرکار ۱۸۲۲ء کے شروع میں محمود نے مشہور عثمانی جنرل خورشید پاشا کو اس مہم پر روانہ کیا، خورشید پاشا کے پہنچتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا اور چند ہی دنوں میں علی پاشا کو یانینا میں محصور ہو جانا پڑا، ۵ فروری ۱۸۲۲ء میں خورشید پاشا نے اسے گرفتار کر لیا اور اس کا سر کاٹ کر سلطان کے پاس قسطنطنیہ بھیج دیا۔

علی پاشا کی بغاوت سے یونانیوں کو بڑی مدد ملی، باب عالی کی توجہ بہتیر یا کی

سازشوں کی طرف سے بد دل ہوتے پائی اور بغاوت یونان کے ابتدائی مہینوں میں عثمانی فوج علی پاشا کے مقابلہ میں جنرل خورشید پاشا کی سرکردگی میں یانینا کے محاصرہ میں مشغول رہا اور یہ فرصت یونانیوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔

مولڈیویا کی بغاوت: یونان کی انقلابی جماعت کو جب علی پاشا کی جنگ بہت غنیمت معلوم ہوئی اور انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں مطلق کوتاہی نہیں کی۔ فروری ۱۸۲۱ء میں ہپسی لانٹی (Hypsilanti) نامی ایک یونانی امیر نے جس کا باپ یکے بعد دیگرے مولڈیویا اور والاچیا کا حاکم رہ چکا تھا اور جو خود اس وقت ہیٹیریا کا سردار اور روسی فوج کا ایک ممتاز افسر تھا ایک دستے کے ساتھ مولڈیویا میں داخل ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا اور تمام یونانیوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی۔ یونانیوں کو روس سے بہت کچھ توقعات تھیں، زار الگزنڈر کا وزیر خارجہ کاپو ڈی اسٹریا (Capodi Istria) نسلاً یونانی اور ہیٹیریا کا ایک رکن تھا، ہپسی لانٹی زار مذکور کا ایڈی کانگ تھا، اس بنا پر عام خیال یہ تھا کہ ہپسی لانٹی کی پشت پر روس کی طاقت بھی ہے، چنانچہ اس نے مولڈیویا میں داخل ہونے کے بعد وہاں کے باشندوں کے نام بغاوت کا جو دعوت نامہ شائع کیا اس میں یہ اعلان بھی کیا تھا کہ یہ تحریک 'ایک بڑی طاقت' کی تائید اور حمایت سے شروع کی گئی ہے، چوں کہ روسی فوجیں مولڈیویا میں آسانی کے ساتھ پہنچ سکتی تھیں اس لیے وہی صوبہ بغاوت کی ابتدا کے لیے منتخب کیا گیا مگر یہ انتخاب غلط ثابت ہوا، مولڈیویا کے باشندے یونانیوں کے مظالم سے تنگ آکر ان سے نفرت کرنے لگے تھے اور انھوں نے باغیوں کی مدد میں مطلق سرگرمی نہیں دکھائی، ایلیسن فلپس لکھتا ہے:

> "رومانی کسانوں کو فناری یونانیوں کی جماعت رہائی دلانے والوں کے بھیس میں محض محصلین اور ایک دام فریب معلوم ہوئی، اس وقت تک وہ یونانیوں کو صرف اپنے ہوسپودار(۱) اور اس

---

(۱) مولڈیویا اور والاچیا کے والی جن کو تقریباً شاہانہ اختیارات حاصل تھے ہوسپودار کہے جاتے تھے

> کے ماتحت افسروں کے ذریعہ سے جاتے تھے، جو ظلم وتشدد کے ساتھ ان سے محصول وصول کرتے اور جن کی حکومت میں ان کی حالت ان کسانوں سے زیادہ مصیبت کی تھی جو براہ راست سلطان کے زیر حکومت تھے، روس کے نام سے بھی ان کے دلوں میں شکریہ کا جذبہ نہیں پیدا ہوا کیوں کہ ۱۸۰۸ء سے ۱۸۱۲ء تک جب مولڈیویا اور ولاچیا کی ریاستیں روس کے قبضہ میں رہیں، وہاں کے باشندے حملہ آوروں کے استحصال بالجبر سے مصیبت کی آخری حد تک پہنچ گئے تھے اور اپنے مکانوں اور کھیتوں کو زار کی ظالمانہ پالیسی کی وجہ سے تباہ و برباد ہوتا ہوا دیکھ چکے تھے۔‘‘(۱)

بغاوت کا آغاز گلاٹز (Galatz) یاسی اور بعض دوسرے مقامات پر ترکوں کے قتل عام سے کیا گیا، ہر طبقہ کے ترک، تاجر، سپاہی، جہاز راں سب دفعۃً گرفتار کر کے نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیے گئے، گلاٹز کے مقامی باشندوں نے ان کارروائیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا، یہ کام صرف ہتیریا کے ممبروں نے انجام دیا، یاسی (پایہ تخت مولڈیویا) میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد صرف پچاس تھی جو ہوسپوڈار کے دربار میں بطور گارڈ آف آنر کے مقیم تھے، جان اور مال کی حفاظت کے وعدہ پر پہلے ان سے ہتھیار رکھ دینے کو کہا گیا، جب انھوں نے ہتھیار رکھ دیے تو سب کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا، انہی کے ساتھ تمام مسلمان تاجر بھی جو یاسی میں مقیم تھے قتل کر دیے گئے، اپسیلانٹی ان کے قتل کے وقت خود موجود تھا، اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی جہاں جہاں یونانیوں نے موقع پایا مسلمانوں کے قتل و غارت گری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ (۲)

انتقام: گلاٹز اور یاسی کے قتل عام کی خبر بہت کچھ مبالغہ کے ساتھ تیزی سے ہر طرف

---

(۱) ایلیسن فلپس ص ۳۱ (۲) فنلے جلد ۶ ص ۱۲۰

پھیل گئی اور مسلمانوں نے مدافعت کے لیے ہتھیار سنبھال لیے، فنلے لکھتا ہے:

> "یہ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس نازک موقع پر عثمانی تسلط کو سب سے زیادہ مؤثر مدد یونانیوں کی سفاکی سے پہنچی نہ کہ سلطان محمود کی سرگرمی سے، اہل ہیتریا کے مظالم نے ابتدا ہی سے انقلاب کے جنگ استیصال ہونے کا اعلان کر دیا تھا، مسلمانوں نے خون آشام مسرت کے ساتھ اپنے دشمنوں کا یہ فیصلہ قبول کر لیا کیوں کہ ان کے نزدیک اس چیز نے ان کے مقصد کو انصاف اور خدا کے منشا کے مطابق بنا دیا، انھوں نے اپنے بھائیوں کے خون کا انتقام لینے اور اپنی قوم اور اپنے مذہب کو خونخوار حملہ آوروں سے بچانے کے لیے ہتھیار سنبھال لیے۔"(۱)

قسطنطنیہ میں جب ان واقعات کی اطلاع پہنچی تو مسلمانوں کو دفعۃً معلوم ہوا کہ عیسائیوں نے ان کے خلاف ایک زبردست سازش کا جال پھیلا رکھا ہے، انتقام کے جوش میں انھوں نے قسطنطنیہ کے سیکڑوں یونانیوں کو قتل کر ڈالا، سمرنا اور بعض دوسرے شہروں میں بھی بہت سے یونانی قتل کر دیے گئے۔

ہیتریا سے بطریق اور زار کی مخالفت: اپسیلانٹی نے بغاوت کا علم مذہب کے نام پر بلند کیا تھا اور زار روس کے نام سے فائدہ اٹھانے کی بھی پوری کوشش کی تھی لیکن گلاٹز اور یاسی کا قتل عام خود اس کی تحریک کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوا، بطریق قسطنطنیہ نے ہیتریا کے خلاف کفر کا فتویٰ شائع کیا اور اپسیلانٹی اور اس کے ساتھیوں پر لعنت بھیجی، چنانچہ اب اپسیلانٹی کی مہم کوئی مذہبی مہم نہ رہ گئی، اہل رومانیہ (مولڈیویا اور ولاچیا) نے بھی اپسیلانٹی کی اسکیم کے خلاف جسے وہ یونانیوں کے حب جاہ کا نتیجہ قرار دیتے تھے، اب اپنی شدید نفرت کا اظہار شروع کیا، اس کے خدم و حشم کی بدکرداریوں اور اس کی فوجوں میں

---

(۱) فنلے جلد ۶ صفحہ ۱۲۱

نظم وضبط کے فقدان نے اہل ولاچیا کو متنفر کر دیا تھا، اسی درمیان میں یہ خبر پہنچی کہ روس نے ہیتریا سے اپنی کامل بے تعلقی کا اعلان کر دیا ہے اور زار الکزنڈر نے ہپسیلانٹی کی روش پر صاف لفظوں میں نفرین کی ہے، اتحاد مقدس کے ارکان (روس، آسٹریا، پرشا) نے لیباخ (Laybach) کی مجلس سے اپنا یہ فیصلہ شائع کیا کہ وہ ہر قسم کی انقلابی تحریکوں کے مخالف ہیں اور الکزنڈر نے اس کے ثبوت میں سلطان کے ساتھ صلح قایم رکھنے کا اعلان کیا اور اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ عثمانی فوجیں ولاچیا اور مولڈیویا میں داخل ہو کر ان شورشوں کو رفع کر دیں جو ہپسیلانٹی کے مجنونانہ منصوبے سے پیدا ہوگئی تھیں، اس کے ساتھ ہی اس نے ہپسیلانٹی کو روس کی ملازمت سے برخاست کر دیا اور اسے حکم دیا کہ فوراً ہتھیار رکھ دے (۱) لیکن ہپسیلانٹی اپنی روش پر قایم رہا اور بقول فلپس جھوٹ پر جھوٹ گڑھتا رہا، اس نے اپنے فوجی سرداروں سے بیان کیا کہ الکزنڈر نے انقلاب کی مذمت علانیہ اس وجہ سے کی ہے تاکہ یورپ میں امن وامان قایم رہے، حالاں کہ نجی طور پر اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہوں اور اس نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ (۲)

بغاوت مولڈیویا کا استیصال: بہر حال زار کے اعلان سے مولڈیویا میں باغیوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا اور عثمانی فوج نے بخارسٹ (پایہ تخت ولاچیا) پر قبضہ کر لیا، ۱۹/ جون ۱۸۲۱ء کو ترکوں نے ڈراگشان کے مقام پر ہپسیلانٹی کے ساتھیوں کو زبردست شکست دے کر بغاوت مولڈیویا کا خاتمہ کر دیا، ہپسیلانٹی بھاگ کر ہنگری پہنچا اور وہاں ۱۸۲۷ء تک وہ مٹرنخ وزیر اعظم سلطنت آسٹریا کے حکم سے قید رہا، دوسرے سال وہ مر گیا، ڈراگشان کی جنگ کے چار روز بعد ترکوں نے مولڈیویا کے صدر مقام یاسی پر بھی قبضہ کر لیا۔

موریا میں ترکوں کا قتل عام: لیکن مولڈیویا کی بغاوت کے فرو ہونے سے پہلے اس

---

(۱) فنلے جلد ۲ ص ۱۲۶ (۲) ایلیسن فلپس ص ۳۸

کے شعلے موریا اور جزائر یونان میں بھڑک چکے تھے۔ موریا کے یونانی ترکوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا عزم کر کے اٹھے تھے، وہ اپنے انقلابی گیت میں اس عزم کا اعلان یوں کرتے پھرتے تھے۔ "ترک اب زندہ نہ رہنے پائیں گے، نہ موریا میں نہ دنیا کے کسی حصہ میں"۔ میریٹ لکھتا ہے کہ موریا میں تو یہ دھمکی تقریباً حرف بحرف پوری ہوئی۔ اپریل ۱۸۲۱ء میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا اور بیس ہزار ترک تہ تیغ کر دیے گئے، صرف وہی بچ رہے جو بھاگ کر قلعہ بند شہروں میں پہنچ سکے، ایک ہفتے کے اندر موریا میں عثمانی تسلط کا خاتمہ ہو گیا (۱) عیسائی مورخین بھی اقرار کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا استیصال پہلے سے سوچی ہوئی اسکیم کا نتیجہ تھا، اس قتل عام کا باعث عوام کے انتقامی جذبات یا کلیفٹ (پہاڑی ڈاکوؤں) کی محض خونخواری سے زیادہ ارکان ہیٹریا اور یونان کے اہل قلم اور خطیبوں کی کوششیں تھیں، جنھوں نے اپنا تمام زور قلم اور ساری خطابت ہر یونانی کے سینہ کو انتقام کے شدید ترین جذبات سے پر کرنے میں صرف کر دی تھی، ان کا قول تھا کہ "انقلاب کو خون کا چھینٹا دے کر صلح کو ناممکن بنا دینا چاہیے۔ (۲)

تین مہینے کے اندر ان قلعوں کے فوجی دستے بھی ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئے جن میں اس قتل عام سے بچے بچائے لوگوں نے بھاگ کر پناہ لی تھی، الیور سلے کا بیان ہے کہ "اکثر صورتوں میں ہتھیار اس شرط پر ڈالے گئے تھے کہ محصورین کی جانیں محفوظ رہیں گی لیکن اس پابندی کی صورت میں بھی نہیں کی گئی، فوجی دستے، ترکی باشندے اور وہ لوگ جو مضافات سے بھاگ کر وہاں جمع ہوئے تھے، سب کے سب سفاکانہ طور پر قتل کر دیے گئے۔" (۳)

باب عالی کی طرف سے جوابی کارروائی: شروع میں ان واقعات کی خبر جب قسطنطنیہ پہنچی تو سلطان نے صدر اعظم کو حکم دیا کہ سرکاری عہدہ داروں میں سے چند ممتاز یونانیوں کو منتخب کر کے ان سے ان کے ہم وطنوں کے افعال کی ضمانت لے لی

---

(۱) میریٹ ص ۲۰۵ (۲) فنلے جلد ۶ ص ۱۵۲ (۳) الیور سلے ص ۳۶۱

جائے، اس سے مقصود یہ تھا کہ باغیوں کے دلوں میں دہشت بیٹھ جائے مگر موریا کے یونانیوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، چنانچہ ان یونانی عہدہ داروں کے مچلکے ضبط کر لیے گئے اور انھیں مسلمان مقتولین کے انتقام میں پھانسی دے دی گئی، ۱۶؍اپریل ۱۸۲۱ء کو ترجمان باب عالی موروزی (Murusi) جو ایک ممتاز یونانی تھا اپنے سرکاری ایوان میں قتل کیا گیا اور چند ہفتہ میں متعدد نامور یونانیوں کو پھانسی دی گئی۔

گریگوریوس کی پھانسی: ۲۲؍اپریل ۱۸۲۱ء "ایسٹر سنڈے" کے روز یونانی کلیسا کے بطریق اعظم گریگوریوس کو ارکان ہیٹریا کی باغیانہ اسکیم میں شریک ہونے کے جرم میں سلطان کے حکم سے پھانسی کی سزا دی گئی، پھانسی سے پہلے وہ باضابطہ طور پر اپنے عہدہ سے معزول کیا گیا اور کلیسا کی مجلس نے ایک دوسرے بطریق کو اس کی جگہ منتخب کر لیا، اس واقعے سے قسطنطنیہ سے لے کر سینٹ پیٹرس برگ تک دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

گریگوریوس کی لاش تین روز تک دار پر لٹکتی رہی، اس کے بعد وہ یہودیوں کے سپرد کر دی گئی، جو اسے قسطنطنیہ کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور سمندر میں پھینک آئے، بعض یونانیوں نے رات کے وقت اسے پانی سے نکال کر ایک جہاز پر اوڈیسہ پہنچا دیا، وہاں یہ مشہور کیا گیا کہ سمندر نے معجزہ کے طور پر اس شہید کی لاش کو اوپر ڈال دیا تھا اور روس کے ایک تجارتی جہاز نے جو ادھر سے گزر رہا تھا اسے اٹھا لیا، بہر حال روسیوں نے پورے مذہبی رسوم اور فوجی شان کے ساتھ لاش کو دفن کیا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: مسیحی دنیا نے یہ سمجھا کہ گریگوریوس کی لاش کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا حکم یہودیوں کو اس لیے دیا گیا تھا کہ عیسائی مذہب کی مزید تذلیل کی جائے، حالاں کہ یہ خیال غلط تھا، بقول فنلے یہ کارروائی اس وقت عثمانیوں کے قانون فوجداری کا ایک جز تھی اور اس کا نفاذ مسلمان اور عیسائی دونوں پر یکساں ہوتا تھا، گریگوریوس کے پھانسی دیے جانے کے ایک سال بعد ٹھیک یہی برتاؤ ینی چری کے ایک سردار حسن بیرقدار کی لاش کے ساتھ بھی کیا گیا، جس کا جرم یہ تھا کہ اس نے مسلمانوں کی ایک جماعت

لے کر بہت سے عیسائی خاندانوں کو لوٹا مارا تھا، سلطان کے حکم سے سپاہیوں کا ایک دستہ عیسائیوں کی حفاظت کے لیے مقرر کیا گیا تھا، حسن اسی دستہ کا مقابلہ کرتے ہوئے ۲۴ رجون ۱۸۲۲ء کو گولی سے مارا گیا اور اس کی لاش بھی یہودیوں کو دے دی گئی جو اسے قسطنطنیہ کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور سمندر میں ڈال دیا۔ (۱)

یونانیوں کا قتل: مذکورہ بالا اشخاص کے علاوہ جن کو سلطان کے حکم سے موت کی سزا دی گئی، قسطنطنیہ میں سیکڑوں یونانی عام مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس وقت ترکوں کے بعض باا‌ثر طبقوں نے مصلحت اس میں سمجھی کہ مذہبی تعصب کو برانگیختہ کرکے قسطنطنیہ کے مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف مشتعل کر دیں، بعض علما اور ینی چری کو یہ شبہ تھا کہ محمود ان کے مراعات خصوصی میں تخفیف کرنی چاہتا ہے، چنانچہ انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی، وہ علانیہ تمام مسلمانوں کو مقتولین موریا کے انتقام کی دعوت دیتے تھے، ان کے پیدا کردہ ہنگاموں سے قسطنطنیہ میں تقریباً تین ہفتے طوائف املوکی برپا رہی، اراذل و انفار عیسائیوں کے محلوں میں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے، ایک روز وہ بطریق کے مکان میں گھس گئے، راہب جان لے کر چھتوں کے راستہ سے بھاگے اور پڑوس کے ترکوں کے مکانات میں پناہ لی، فنلے لکھتا ہے:

"مسلمانوں کی شرافت کا یہ واقعہ ضرور قلمبند کرنے کے قابل ہے کہ انھوں نے عیسائی پادریوں کو اپنے ہاں پوشیدہ رکھ کر عوام کے غیظ و غضب سے بچا لیا" (۲) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یونانیوں کی بغاوت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی بغاوت برپا ہوا چاہتی ہے، مسلمانوں کی بغاوت کو روکنے اور ینی چری کو قابو میں رکھنے کی غرض سے محمود نے اس فوج کے تین سرداروں کو دیوان میں مستقل جگہوں پر مقرر کر دیا۔

سمرنا کا حال قسطنطنیہ سے بھی زیادہ خراب تھا، ایشیائے کوچک کے متعدد گروہ جو مولڈیویا کے باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے گھر سے روانہ ہوئے تھے، شمال کی طرف

---

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۱۸۸ (۲) ایضاً ص ۱۸۹

کوچ کرنے کی بجائے سرنا میں داخل ہو گئے، جہاں عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی اور جہاں بغیر لڑے بھڑے انھیں بہت کچھ مال غنیمت اور غلاموں کے حاصل ہونے کی امید تھی، چنانچہ شہر اور قرب و جوار کے دیہاتوں میں کئی روز تک قتل و غارت گری جاری رہی، اونچے طبقہ کے ترکوں نے عیسائیوں کے بچانے کی کوشش کی، اس کی سزا میں عام مسلمانوں نے خود ملاے سرنا اور متعدد اعیان کو قتل کر دیا۔

یونانی سفاکیاں: مسلمانوں کا جوش انتقام یونانی سفاکیوں کا قدرتی نتیجہ تھا، دوران بغاوت میں یونانیوں نے وحشت و بربریت کی ایسی ہولناک مثالیں پیش کیں کہ ان کے اعتراف سے عیسائیوں کا قلم بھی گریز نہ کر سکا، شروع ہی میں یونانیوں نے ایک ترکی جہاز کو گرفتار کر لیا تھا جس پر سابق شیخ الاسلام اپنے تمام خاندان کے ساتھ حج کے لیے جا رہے تھے، قسطنطنیہ میں جب یونانیوں کے خلاف شورش برپا ہوئی تو موصوف نے ایک فرمان شائع کر کے مسلمانوں کو پرامن رہنے کی نصیحت کی تھی اور یونانیوں کے ساتھ زیادتی کرنے سے روکا تھا، ان کے اس رویہ سے مسلمان خود ان کے مخالف ہو گئے اور سلطان محمود کو اس مخالفت کی شدت سے مجبور ہو کر انھیں شیخ الاسلام کے منصب سے معزول کر دینا پڑا تھا، اس کے بعد وہ سفر حج کے لیے روانہ ہو گئے، لیکن ابھی جزائر ایجین تک پہنچے تھے کہ یونانیوں نے ان کے جہاز کو گرفتار کر لیا، انھوں نے سب سے پہلے شیخ الاسلام کی نظر کے سامنے ان کی لڑکیوں اور خاندان والوں کو ذبح کر کے سمندر میں پھینک دیا، اس کے بعد دوسرے ترک خاندان جو اس جہاز پر تھے قتل کیے گئے، آخر میں خود شیخ الاسلام کو سخت اذیتوں کے ساتھ قتل کیا، بقول مصطفیٰ کامل پاشا یہ جزا تھی اس نصیحت کی جو شیخ الاسلام موصوف نے مسلمانوں کو پرامن رہنے اور یونانیوں کے ساتھ زیادتی نہ کرنے کی کی تھی، فنلے لکھتا ہے: "معذور و مجبور بوڑھے مرد، اونچے طبقہ کی عورتیں خوبصورت لونڈی غلام اور کم سن بچے جہاز کے عرشہ پر گائے بیل کی طرح ذبح کر دیے گئے، اس ظالمانہ کارروائی کو ہلکا کرنے کی کوشش بعد کو یہ کہہ کر کی گئی کہ یہ ایک انتقامی فعل

تھا۔ یہ بیان غلط ہے جو لوگ ان مظالم کے مرتکب ہوئے، انھوں نے شیخ الاسلام کے قتل سے پہلے اپنے بطریق کی پھانسی کا حال نہیں سنا تھا، اصل یہ ہے کہ شروع ہی سے سمندر و خشکی دونوں جگہ لڑائی کا مقصد ترکوں کو نیست و نابود کر دینا تھا۔ (۱)

انگریزی جنرل گارڈن (Gordon) یونانیوں کا پرجوش حامی، جو دوران بغاوت یونانیوں کے ساتھ ترکوں سے لڑا ہے، اپنی "تاریخ انقلاب یونان" میں لکھتا ہے:

"یونانیوں نے جو بھی قومی و شخصی مظالم برداشت کیے ہوں ان کے انتقام کی درندگی کو حق بجانب ثابت کرنا ناممکن ہے۔" (۲)

یونانیوں اور ترکوں کا پہلا باقاعدہ مقابلہ موریا کے پایہ تخت تریپوٹزا کے قریب والٹتی کے مقام پر ہوا جس میں ترکوں کو شکست ہوئی، اس کے بعد باغیوں نے نوارینو اور تریپولٹزا کا محاصرہ کر لیا، ۱۹/ اگست ۱۸۲۱ء کو نوارینو کا فوجی دستہ فاقہ کشی سے عاجز آ کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا، ہتھیار اس شرط پر ڈالے گئے تھے کہ قلعہ کا تمام سامان، زر و جواہر اور سونے چاندی کے برتن یونانیوں کے حوالہ کر دیے جائیں گے اور اس کے معاوضہ میں ترکوں کو مصر یا تونس روانہ کر دیا جائے گا، اس معاہدہ کے مطابق جب ترکوں نے تمام سامان دے دیا تو یونانیوں نے نقض عہد کر کے ان کا قتل عام شروع کیا اور ایک گھنٹہ کے اندر تمام مرد، عورتوں اور بچوں کو قتل کر ڈالا، فرانٹزس (Phrantzes) نامی ایک یونانی پادری جس نے انقلاب یونان کی ایک مستند تاریخ لکھی ہے، اس موقع پر موجود تھا، اس نے نوارینو کے چشم دید حالات بیان کیے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ عورتیں بندوق کی گولیوں اور تیغوں کے زخم سے مجروح ہو کر سمندر کی طرف بھاگتی تھیں اور انھیں عمداً گولیوں سے مارا جاتا تھا، مائیں شیر خوار بچوں کو سینوں سے لگائے ہوئے اپنی برہنگی کو چھپانے کی غرض سے (ظالموں نے ان کے کپڑے بھی چھین لیے تھے) سمندر میں کود پڑی تھیں لیکن جب وہ پانی میں چھپنے کی کوشش کرتی تھیں تو یہ سنگ دل رئفل بردار انھیں

---

(۱) فنلے جلد ۹ ص ۱۷۳ (۲) ایضاً ۱۹۳

گولیوں کا نشانہ بناتے، شیر خوار بچوں کو ماؤں کے سینوں سے چھین کر چٹانوں سے ٹکراتے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے، تین چار سال کے بچے زندہ سمندر میں پھینک دیے جاتے تھے۔ (۱)

ٹریپولتزا کا محاصرہ چھ مہینے تک جاری رہا، پانی ختم ہو جانے سے بالآخر وہاں بھی ترکوں کو ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ یونانی توپ خانہ کا ایک نوجوان فرانسیسی افسر کرنل ریبا یونانی فوجوں کے شہر میں داخل ہونے کے وقت وہاں موجود تھا، اس نے صاف گوئی کے ساتھ یونانی سپاہیوں کے وحشیانہ مظالم بیان کیے ہیں جو تین روز تک خود اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتے رہے، وہ لکھتا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے پہلے عموماً شدید جسمانی اذیت پہنچائی جاتی تھی، اڑتالیس گھنٹے کے بعد یونانیوں نے (قتل عام سے بچے ہوئے) مرد، عورت، بوڑھے بچے خصوصاً عورتوں اور بچوں کو جمع کیا اور پہاڑ کی ایک گھاٹی میں لے جا کر ایک ایک کو قتل کر ڈالا۔ (۲)

اس واقعہ کے دو سال بعد خود فنلے کا گذر اس مقام سے ہوا، وہ بیان کرتا ہے کہ میں نے بغیر دفن کی ہوئی ہڈیوں کے ڈھیر دیکھے، جو موسم سرما کی بارش اور گرمیوں کی دھوپ سے سفید ہو گئی تھیں، بہت سی ہڈیوں کے ناپ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ بچوں کی ہڈیاں ہیں۔ (۳)

ایلیسن فلپس اہل یونان کی غداریوں اور سفاکیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ”حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ اس بغاوت کی امتیازی صفت غداری اور غیر محدود سفاکی تھی، ایک وحشی قوم کی زیادتیوں کا لحاظ کرنا جس کے صدیوں کے دبے ہوئے شدید بغض و عناد کو بالآخر نکلنے کا موقع ملا تھا، شاید روا ہو سکتا ہے لیکن کوئی شے اس بے دردانہ غداری کا عذر

---

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۲۱۵ (۲) ایضاً ص ۲۱۹ (۳) ایضاً ص ۲۱۹ فٹ نوٹ

> برأت نہیں ہو سکتی، جو تقریباً ہر موقع پر قتل و خون سے پہلے برتی جاتی تھی اور چوں کہ یورپ نے ترکوں کے ظالمانہ انتقامات پر بڑی لعنت ملامت کی ہے اس لیے تاریخ کے اصول انصاف کے رو سے ہمارے لیے ان جرائم کا چھپانا جائز نہیں جو ان انتقامات کے محرک ہوئے۔"(۱)

باغیوں کے ساتھ مغرب کی ہمدردی: ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۴ء تک بغاوت کی شورش مسلسل قائم رہی، اس درمیان میں نہ صرف موریا بلکہ خلیج کورنتھ کے شمال میں تھسلی کی سرحد تک تمام یونانی علاقے جن میں ایتھنز بھی شامل تھا عملاً خود مختار ہو گئے اور ایک قومی حکومت قائم کر لی گئی، یورپ نے اہل یونان کے ساتھ بڑی ہمدردی ظاہر کی، یونان کے علوم قدیمہ اور رومانیت کے نام پر ایک زبردست تحریک تمام یورپ میں پھیل گئی، جس کے خاص علمبردار انگلستان اور فرانس کے مشہور شاعر لارڈ بائرن (Byron) اور وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) تھے۔

ان ممالک میں یونان کی مدد کے لیے متعدد انجمنیں قائم ہوئیں اور بہت سے والنٹیر وہاں روانہ ہو گئے، بائرن خود جنوری ۱۸۲۴ء میں یونان آ کر باغیوں کی فوج میں شامل ہوا لیکن تین ہی مہینے کے بعد اپریل میں وہ ملیریا کا شکار ہو گیا، تاہم اس قلیل مدت میں اس پر یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ یونانی سردار نفاق، سازش اور خود غرضی میں مبتلا ہیں اور جس بلند تخیل کو سامنے رکھ کر یہ جنگ شروع کی گئی ہے، اس کی حقیقت شراب سے زیادہ نہیں، ایسا ہی تجربہ دوسرے یونان پرستوں کو بھی ہوا، چنانچہ فرانسیسی والنٹیروں کی ایک جماعت نے یونان پہنچ کر جو حالات بچشم خود مشاہدہ کیے ان سے متاثر ہو کر اس نے فرانسیسی امیر البحر سے درخواست کی کہ اسے فرانس واپس بھیج دیا جائے، مشہور فرانسیسی مصنف الفرید میتر نے اس درخواست کو اپنی کتاب میں جو استقلال یونان پر اس نے لکھی ہے نقل کیا ہے، ہم مصطفیٰ کامل پاشا کے حوالہ سے اس کے ایک حصہ کا ترجمہ ذیل میں

---

(۱) یونان کی جنگ آزادی ص ۵۷

درج کرتے ہیں۔

> ”ہمارے فرانس سے روانہ ہونے سے پہلے لوگ یونانیوں کی شجاعت اور بہادری کی تعریف کرتے تھے کہ وہ دلیری اور عظمت میں اپنے اسلاف سے بڑھ کر ہیں لیکن ہم نے یہاں ایسے لوگوں کو پایا جو حب مال میں جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو جہالت اور وحشت کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ (۱)

کانڈر ربوجول بغاوت یونان کے ذکر میں ۲۲ر دسمبر ۱۸۲۷ء کو لکھتا ہے:

> ”میں مشرق میں آیا اور میں یونانیوں کا بہت بڑا مددگار تھا اور تجربہ سے پہلے ان کے متعلق میرے حسن ظن میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا تھا لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ وہ وطنیت، شجاعت اور اتحاد سے بالکل خالی ہیں، ان کے ہر رئیس کی خواہش یہ ہے کہ دولت مند ہو جائے، طوائف الملوکی بلاد یونان میں انتہا کو پہنچ گئی ہے اور بیشتر حکام جو ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں مسلح بحری ڈاکوؤں کی حیثیت سے مشہور ہیں، اگر دول (عظمیٰ) مداخلت نہ کرتیں تو یونانی اس سال سپر ڈال دیتے، یوروپین اقوام کے ممنون کرم ہو کر بھی یونانی ڈاکو خود انہی قوموں کی تجارت پر حملے کرتے تھے۔ (۲)

برطانیہ کی معاندانہ روش: ان حالات کے باوجود مسیحی یورپ سے باغیوں کو برابر مدد پہنچتی رہی، دولت عثمانیہ کے ساتھ انگلستان کے تعلقات دوستانہ تھے، لیکن انگلستان نے بھی یونانیوں کی مدد اس طرح علانیہ شروع کی کہ بالآخر اوائل ۱۸۲۴ء میں دونوں حکومتوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے، سلطان کو یہ سن کر حیرت ہوئی کہ لندن کے لارڈ میئر (Lord Meyor) نے یونانیوں کی مدد کے لیے ایک بڑی رقم روانہ کی ہے اور لارڈ

---

(۱) المسالۃ الشرقیہ از مصطفیٰ کمال پاشا حصہ اول ص ۸۰ (۲) ایضاً ص ۸۱-۸۰

بائرن اور کرنل اسٹین ہوپ (لارڈ ہیرنگٹن)(Corral Stanhope. Earl of Harrington) جو انگلستان کی شاہی فوج کا افسر تھا، کھلم کھلا یونانی فوج میں شامل ہو گئے ہیں، جزائر آیونین کے برطانوی افسروں نے باغی ارماتولی کو پناہ دی ہے اور انگریز ساہوکاروں نے باغیوں کے لیے روپیہ بھیجا ہے، سلطان نے ان باتوں کو حکومت برطانیہ کے معاندانہ ارادوں کی طرف منسوب کیا، چنانچہ ۹ر اپریل ۱۸۲۳ء کو برطانوی سفیر لارڈ اسٹینگفورڈ (Stingford) سے اس طرز عمل کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا، رئیس آفندی (عثمانی وزیر خارجہ) نے سفیر مذکور سے کہا کہ یہ بات خلاف عقل ہے کہ کوئی حکومت خواہ وہ کسی شکل کی ہو اتنی طاقت نہیں رکھتی کہ اپنی رعایا کو ان کی من مانی لڑائیوں سے باز رکھ سکے یا غیر حکومتوں کے ساتھ جو معاہدے ہو چکے ہیں انھیں توڑنے پر ان کو سزا دے سکے، اگر ایسا ہی ہے تو پھر یورپ کا امن جسے قائم رکھنے کے لیے حکومت برطانیہ اسی قدر فکرمندی ظاہر کرتی ہے، غیر سرکاری افراد کی خواہشات پر منحصر ہو کر رہ جائے گا، کیوں کہ اس وقت ایک مملکت دوسری مملکت سے یہ کہہ سکے گی کہ ”میں آپ کی مخلص اور وفادار دوست ہوں لیکن میری استدعا ہے کہ آپ بس اسی سے مطمئن رہیں اور ناراض نہ ہوں، اگر میری رعایا میں سے کچھ لوگ آپ کی رعایا پر چڑھ دوڑیں اور ان کے گلے کاٹ ڈالیں“ ملٹے لکھتا ہے کہ ”اس بے لاگ اور منصفانہ احتجاج میں آخر میں قطعی طور پر یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ برطانوی رعایا کو ترکی کے خلاف جنگ کرنے اور یونانیوں کی اسلحہ، روپیہ اور گولے بارود سے مدد کرنے سے روکا جائے“(۱) لیکن بعد کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ چند دنوں کے بعد حکومت برطانیہ نے اس نقاب کو بھی اٹھا دیا اور یونانیوں کی حمایت میں علانیہ طور پر میدان میں آ گئی۔

مصر کی مدد: چار سال کی کوششوں کے باوجود جب بغاوت کا استیصال نہ ہو سکا بلکہ باغیوں کی قوت روز بروز بڑھتی ہی گئی تو ۱۹۲۴ء میں سلطان نے محمد علی پاشا والی مصر کو مدد

---

(۱) ملٹے جلد ۲ ص ۸

کے لیے طلب کیا اور اس خدمت کے معاوضہ میں محمد علی کی خواہش پر شام، دمشق اور کریٹ کے علاقوں کو مصر کی پاشائی میں شامل کر دینے کا وعدہ کیا، چنانچہ مصری بیڑہ جس پر دس ہزار پیدل اور ایک ہزار سوار فوج تھی محمد علی پاشا کے لڑکے ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں ۲۵ جولائی ۱۸۲۴ء کو اسکندریہ سے روانہ ہوا اور یونان پہنچ کر موڈن میں لنگر انداز ہوا، مصری فوج کے ایک حصہ نے وہاں سے کوچ کر کے نوارینو کا محاصرہ کر لیا، یونانیوں کی بہترین فوج جو سات ہزار آدمیوں پر مشتمل تھی اس اہم قلعہ کو بچانے کے لیے بڑھی مگر ابراہیم پاشا کے سپاہیوں نے جن کی تعداد اس معرکہ میں صرف تین ہزار تھی حملہ کر کے انھیں بری طرح شکست دی، یونانی نہایت انتشار کی حالت میں بھاگ کھڑے ہوئے، ایورسلے لکھتا ہے کہ "یہ جنگ اس بات کا ثبوت تھی کہ بہترین یونانی فوجیں بھی کسی لڑائی میں اور تربیت یافتہ مصریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں"(۱) ۲۷ رمضان ۱۲۴۰ھ (۱۲ مئی ۱۸۲۵ء) کو ابراہیم فاتحانہ شان سے نوارینو میں داخل ہوا۔

قلعہ کا فوجی دستہ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو چکا تھا مگر یونانیوں کو یاد تھا کہ جب ترکوں نے نوارینو میں ہتھیار ڈالے تھے تو ان کے ساتھ معاہدہ کی پابندی کیوں نہ کی گئی تھی، اسی سلوک کی توقع وہ اپنے لیے بھی کر رہے تھے، غداری اور معاہدہ شکنی جن لوگوں کا قومی شعار رہا ہو وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ انتقام کے موقع پر بھی کوئی قوم عفو درگذر کی مثال پیش کر سکتی ہے اور مفتوحین کی جان کی حفاظت خود اپنے سپاہیوں کے ذریعہ کرا سکتی ہے لیکن ابراہیم نے یہ کر دکھایا، معاہدہ کے مطابق اس نے پورے دستہ کو فرانسیسی اور آسٹروی جہازوں پر کارتووا روانہ کر دیا، مسلمانوں کا ایک گروہ جنھیں نوارینو کے قتل عام کی یاد اب تک بے چین کیے ہوئے تھی انتقام کی فکر میں اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر ابراہیم نے اس کی پیش بینی کر کے عیسائیوں کی حفاظت کی تدبیر پہلے سے کر دی تھی، سوار فوج کے ایک دستہ نے ترکوں کو قریب آنے سے روکے رکھا اور پیچھے یونانی عرب پیدل فوج

---

(۱) ایورسلے ص ۲۶۷

کی سنگینوں کے سایہ میں جہازوں تک پہنچا دیے گئے۔ (۱)

موریا کی تسخیر: نواریوں کی فتح کے بعد ابراہیم پاشا نے یکے بعد دیگرے موریا کے تمام اہم شہروں اور قلعوں پر قبضہ کرلیا، ۲۲ راپریل ۱۸۲۶ء کو مغربی یونان کا سب سے اہم قلعہ مسولونگی فتح ہوگیا اور جون ۱۸۲۷ء میں لارڈ کوشرین (Cochrane) جنرل چرچ (Church) اور دوسرے انگریز افسروں کی پوری مدد کے باوجود ایتھنز کو بھی ہتھیار ڈال دینے پڑے اور کورنتھ پر بھی ترکوں کا قبضہ ہوگیا، اب سارے موریا میں عثمانی تسلط قائم تھا، یونان کی قومی حکومت کو جو دورانِ بغاوت میں قائم کرلی گئی تھی جزیرہ پوروس (Poros) میں منتقل ہوجانا پڑا، بحری جنگ میں بھی یونانیوں کو شکست ہوئی، ان شکستوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ یونانی سرداروں میں خود آپس ہی میں نفاق پیدا ہوگیا، جس نے ان کی رہی سہی قوت کو بالکل توڑ دیا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر دول عظمیٰ اس موقع پر مداخلت نہ کرتیں اور یونانیوں کی حمایت میں دولت علیہ سے خود ہی برسرپیکار نہ ہوجاتی تو بغاوت کا استیصال مکمل طور پر ہوجاتا اور یونان میں پھر ترکی حکومت قائم ہوجاتی۔

ینی چری کا استیصال: ابراہیم پاشا کی کامیابیوں نے سلطان کو یونان کی طرف سے ایک حد تک مطمئن کرکے سلطنت کی اندرونی خرابیوں کی جانب توجہ کرنے کا موقع دیا، عرصہ سے دولت عثمانیہ کے زوال کا اصلی باعث ینی چری فوجیں ہورہی تھیں، وہ ہر اصلاح کی مخالفت کرتیں اور اپنی بدعنوانیوں کو قائم رکھنے کے لیے سلطان سلیم جیسے مدبر اور بیدار مغز فرماں رواکے قتل سے بھی باز نہ آئیں، اصلاح پسند وزرا کی ایک خاص تعداد ان کی سرکشی کا شکار ہوچکی تھی، خود محمود کو ان کے ہاتھوں جو تلخ گھونٹ پینے پڑے اس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے، نہ صرف یہ کہ سلطنت کے لیے وہ ایک مستقل فتنہ ہوکر رہ گئی تھیں بلکہ بیرونی دشمنوں کے مقابلہ میں بھی اب ان پر مطلق اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا، ۱۸۱۰-۱۱ء کی جنگ اور پھر بغاوت یونان کے دوران میں یہ پوری طرح ثابت ہوگیا تھا کہ ان کی

---

(۱) فنلے جلد ۲ ص ۲۶۲

زبردست تنظیم اور غیر معمولی شجاعت اب باقی نہیں رہی اور عثمانی فتوحات جن فوجوں کی رہین منت تھیں، وہ دشمن کے مقابلہ میں اب جم کر لڑ بھی نہیں سکتی تھیں۔ یونان میں مصری فوج کی کامیابی نے جو یورپ کے فوجی نظام کے مطابق مرتب اور منظم کی گئی تھی ینی چری کی فرسودگی اور کمزوری کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ محمود کے علاوہ قسطنطنیہ کے عام باشندے، ارکان دیوان اور جماعت علما بھی دونوں کے فرق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ محمود نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ینی چری کو جو مدت سے دردِ سر بنے ہوئے تھے ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا عزم کر لیا۔ اس کے لیے وہ پہلے ہی سے در پردہ تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ توپچیوں کی فوج بڑھائی تھی اور اس میں ایسے اشخاص کو افسر مقرر کیا تھا جن کی وفاداری پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں جب ینی چری کے استیصال کا اس نے قطعی فیصلہ کیا اس کے توپچیوں کی تعداد چودہ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اس فوج کا افسر اعلیٰ ابراہیم سلطان محمود کا نہایت معتمد سردار تھا۔ محمود نے ینی چری کا آغا حسین نامی ایک افسر کو مقرر کیا تھا جو اس کے احکام کی تعمیل کے لیے ہمہ تن تیار تھا۔ اس نے علما کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا تھا اور چند دنوں پیشتر مفتی اعظم کے عہدہ پر ایک ایسے شخص کو مقرر کیا تھا جو اس کا ہمنوا اور مؤید تھا۔

ان تیاریوں کے بعد محمود نے وزرا اور علما کی ایک مجلس منعقد کی جس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ کفار پر غالب آنے کے لیے ضروری ہے کہ عثمانی فوجیں از سر نو باقاعدہ منظم کی جائیں۔ اس کے بعد تمام حاضرین مجلس کے دستخطوں سے ایک فتویٰ اس مضمون کا شائع کیا گیا کہ ینی چری کے ہر دستہ سے سپاہیوں کی ایک معین تعداد جدید فوجی قواعد سیکھنے کے لیے بھیجی جائے۔ اس فتوے سے ینی چری میں بڑی برہمی پھیلی اور انھوں نے ۱۵رجون ۱۸۲۶ء کو آت میدان میں جمع ہو کر اپنی شوربے کی دیگچیاں الٹ دیں جو گویا بغاوت کا اعلان تھا اور خاص خاص وزیروں کے قتل کا مطالبہ کرتی ہوئی قصر سلطانی کی طرف بڑھیں۔ محمود مقابلہ کے لیے تیار تھا۔ اس نے علم نبوی کو اپنے ہاتھ میں لے کر بلند کیا

اور تمام مسلمانوں کو بادشاہ وقت اور امیر المومنین کی حمایت کے لیے بلایا، اس علم کو دیکھ کر لوگ جوق جوق اس کے گرد جمع ہونے لگے، فوراً ہی توپچیوں کی فوج اور ایشیائی دستے بھی جو اسی وقت کے لیے سقوطری میں مقیم تھے موقع پر پہنچ گئے، جوں ہی ینی چری سڑکوں میں داخل ہو کر محل کی طرف بڑھے، ابراہیم نے توپچیوں کو گولہ باری کا حکم دیا، ینی چری گولوں کی تاب نہ لا سکے اور پسپا ہوئے اور ات میدان میں اکٹھا ہو کر تھوڑی دیر تک اپنی بندوقوں سے بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن گولوں کی باڑھ سے تنگ آ کر انھیں وہاں سے بھی ہٹنا پڑا اور اب انھوں نے اپنی بارکوں میں جا کر پناہ لی اور وہاں بہت جم کر مقابلہ کیا، محمود نے تمام توپیں بارکوں کے سامنے لگوا دیں اور مسلسل گولہ باری ہونے لگی، تھوڑی دیر میں تمام بارکیں جل کر برباد ہو گئیں اور ینی چری کا ایک ایک سپاہی ہلاک ہو گیا، قسطنطنیہ میں جتنے ینی چری اس طرح مارے گئے ان کی تعداد چار ہزار بتائی جاتی ہے، ان کے علاوہ ہزاروں جو سلطنت کے مختلف حصوں میں تھے چن چن کر قتل کر دیے گئے اور یہ پوری فوج بالکل ختم کر دی گئی یہاں تک کہ اس کا نام بھی سرکاری دفتروں سے مٹا دیا گیا۔

محمود کے کارنامے: عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد محمود کو جن پیش از پیش مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کے حیرت انگیز عزم و استقلال نے ان تمام مشکلات کو اٹھارہ سال کی قلیل مدت میں دور کر دیا، سلطنت عثمانیہ کی بنیاد جو ۱۸۰۸ء میں متزلزل ہو گئی تھی، ۱۸۲۶ء میں پھر مستحکم نظر آنے لگی، ابتداءً تقریباً ہر بڑے صوبہ میں شورش برپا تھی، محمود نے سب کو فرو کیا، سب سے بڑا سرکش والی یانینا علی پاشا تھا وہ گرفتار کر کے قتل کیا گیا، عرب میں وہابیوں کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا، مصر میں مملوک نیست و نابود کر دیے گئے، محمد علی پاشا کی طرف سے سرکشی کی کوئی علامت ابھی ظاہر نہیں ہوئی تھی، برخلاف اس کے اس کی بری اور بحری فوجیں ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں یونان کو دولت علیہ کے لیے از سر نو فتح کر رہی تھیں، اس درمیان میں مولڈیویا اور ولاچیا

کی بغاوتیں بھی فرو کی گئیں اور سرویا کے قلعوں پر بھی عثمانی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ سب سے آخر محمود نے ینی چری کا استیصال کر کے سلطنت عثمانیہ کو اس کے سب سے بڑے اندرونی خطرہ سے ہمیشہ کے لیے نجات دلائی، یہ سب کچھ محمود نے تنہا اپنی خداداد قابلیت اور آہنی عزم کی قوت سے کیا۔

دول عظمیٰ کی دشمنی: ینی چری کو ختم کرنے کے بعد محمود نے اپنی نئی فوج کی تعداد جو یورپ کے فوجی نظام کے مطابق مرتب اور مسلح کی گئی تھی اور جس کا لباس بھی یورپین طرز کا تھا بڑھا کر چھیالیس ہزار کر لی جو ینی چریوں کی فوج اس کے علاوہ تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ فوج کی تعداد بتدریج ڈھائی لاکھ تک پہنچا دے لیکن دول عظمیٰ خصوصاً روس جو ہر موقع پر دولت عثمانیہ کی اصلاح اور ترقی کی راہ میں حائل ہو جاتی تھیں، محمود کی فوجی اصلاحات کا آغاز دیکھ کر جو دیگر اصلاحات کا مقدمہ تھیں اس قدر خوف زدہ ہوئیں کہ انھوں نے فوراً جنگ چھیڑ دی اور ان اصلاحات کو مکمل ہونے کا موقع نہ دیا۔ محمود کے عہد کے ایک نہایت مستند مورخ فون مولٹکی (Yon Moltke) کی رائے ہے کہ اگر ینی چری کے استیصال کے بعد ترکی کو امن وسکون کے دس سال میسر آ جاتے تو سلطان محمود کی فوجی اصلاحات اس مدت میں کچھ قوت حاصل کر لیتیں اور ایک قابل اعتماد فوج کی مدد سے سلطان اپنے ملک کے نظم ونسق میں ضروری اصلاحات جاری کر لیتا، سلطنت عثمانیہ کی مردہ شاخوں میں نئی روح پھونک دیتا اور اپنے پڑوسیوں کے لیے خوفناک بن جاتا، لیکن روس نے ان میں سے ایک بات بھی نہ ہونے دی اور سلطان کی فوجی اصلاحات کو شروع ہی میں ختم کر دیا(۱) مولٹکی کے بیان کی تصدیق سب سے زیادہ ان مراسلات سے ہوتی ہے جو ۱۸۲۸-۲۹ء کی جنگ میں روس کے بڑے بڑے مدبرین نے ایک دوسرے کو بھیجے تھے اور جن میں انھوں نے صاف طور پر ظاہر کر دیا تھا کہ محمود کی اصلاحات کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ روس فوراً جنگ چھیڑ دے۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ دولت عثمانیہ نے محمود

---

(۱) مولٹکی بحوالہ کریسی جلد ۲ ص ۳۱۲

کے زیر سیادت جتنی طاقت حاصل کر لی ہے اتنی طاقت مدت سے اسے حاصل نہ تھی اور اس دوراندیشی پر اسے آپ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے جدید ترکی فوجوں کو زیادہ قوت حاصل کرنے کا موقع نہ دیا بلکہ ابتدا ہی میں ان کا زور توڑنے کی تدبیر کر دی۔ (۱)

محمود کی فوجی اصلاحات کے پورے طور پر بار آور نہ ہونے کے دو خاص اسباب تھے، ایک تو روس کی وہ معاندانہ کوششیں جن کا اعتراف اس کے ذمہ دار ارکان حکومت نے صاف الفاظ میں کیا ہے، دوسرے حکومت برطانیہ کا یونانیوں کی حمایت میں دولت علیہ سے برسر پیکار ہو جانا، روس اور سلطنت عثمانیہ کے تعلقات قرنوں سے خراب تھے اور جب سے دولت علیہ کا زوال شروع ہوا روس نے کوئی موقع اس کی کمزوری سے فائدہ کا نہ چھوڑا، یونان کی بغاوت روس کے لیے ایک بہترین موقع تھی لیکن انقلاب فرانس اور نپولین کی جنگوں کے بعد ویانا کی کانگریس نے یورپ میں از سر نو امن و امان قائم کرنے کی جو کوشش کی تھی اس کے لحاظ سے توقع نہ تھی کہ یونان کے باغیوں کو کسی یورپین حکومت سے مادی مدد مل سکے گی، ان کو سب سے زیادہ امید روس سے تھی مگر الکزنڈر اول یونانیوں سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود نفس بغاوت کا سخت مخالف تھا اور یونان کے باغیوں کی مدد کر کے خود اپنی رعایا میں بغاوت کا حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا، اسی بنا پر اس کی حیات تک یونانیوں کو روس سے کوئی مدد نہ مل سکی لیکن یکم دسمبر ۱۸۲۵ء کو الکزنڈر کا انتقال ہو گیا اور روس کے تخت پر اس کا بھائی نکولس (Nicholas) آیا جو تمام تر روس کے قومی جذبات کا مجسمہ تھا اور ترکوں کو یورپ سے نکال دینا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا، نکولس کا تخت نشین ہونا ہی دولت عثمانیہ سے جنگ چھڑ جانے کے لیے کافی تھا، روس کی اندرونی سیاست نے اس میں اور بھی جلدی کی، سینٹ پیٹرس برگ میں ایک جماعت نکولس کی تخت نشینی کی مخالف تھی، یہاں تک کہ فوج بھی اس سے متاثر ہو گئی تھی اور اندیشہ تھا کہ عنقریب خانہ جنگی شروع ہو جائے گی،

---

(۱) کریسی ص ۳۱۳-۱۴

دارالسلطنت کے مدبروں کے نزدیک خونریزی کو رفع کرنے کی بہترین صورت یہی تھی کہ سلطنت عثمانیہ سے جنگ چھیڑ دی جائے(۱) لڑائی کے لیے بہانہ تلاش کرنا چنداں مشکل نہ تھا، سرویا، مولڈیویا اور ولاچیا کے معاملات جو معرض التوا میں تھے ان کے متعلق گفتگو پھر شروع کر دی گئی اور روسی وزیروں نے ایسا لب ولہجہ اختیار کیا کہ اس سے ان کا اصلی مقصد صاف ظاہر ہوتا تھا، چنانچہ اسی سال ۱۸۲۶ء میں جب کہ ینی چری کے استیصال کو صرف دو مہینے گزرے تھے روس کی طرف سے پر زور مطالبہ کیا گیا کہ ایشیا کے بعض قلعے جو اس کے دعوے کے مطابق صلح نامہ بخارسٹ میں اسے دئیے جا چکے تھے فوراً حوالہ کر دیے جائیں، مولڈیویا اور ولاچیا کے باشندوں کو وہ تمام حقوق دے دیے جائیں جو بغاوت سے پہلے انھیں حاصل تھے اور اہل سرویا کے سیاسی حقوق کے تسلیم کرنے میں مزید تاخیر نہ کی جائے، ترکوں کو ان مطالبات پر طیش آیا مگر ینی چری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور جدید فوج اس وقت تک اتنی تیار نہ تھی کہ روس کا مقابلہ کر سکے، اس لیے محمود کو مجبوراً دبنا پڑا اور ۲۸ صفر ۱۲۴۲ھ مطابق ۷ اکتوبر ۱۸۲۶ء کو معاہدہ آق کرمان پر دستخط ہو گئے۔

معاہدۂ آق کرمان: اس معاہدہ میں صلح نامہ بخارسٹ کی ازسرنو تصدیق کی گئی اور یہ طے پایا کہ مولڈیویا اور ولاچیا کے باشندوں کو وہ تمام حقوق پھر دے دیے جائیں جو صلح نامہ مذکور نیز خط شریف ۱۸۰۲ء کے رو سے انھیں مل چکے تھے، ان ولایتوں کے عہدہ داران (ہوسپودار) کا انتخاب وہیں کے رؤسا اپنی جماعت میں سے سات سال کے لیے کیا کریں، باب عالی کو حق نہ ہوگا کہ ان میں سے کسی امیر کو روس کی منظوری کے بغیر معزول کرے، مولڈیویا کے رؤسا کو جو ۱۸۲۱ء کی بغاوت میں شریک تھے اور پھر روس جا کر پناہ گزین ہوئے تھے وطن واپس آنے اور اپنی جائداد و املاک پر قابض ہونے کی اجازت دی جائے، سرویا کی آئندہ حکومت سے متعلق وہاں کے باشندے اپنے نمائندوں کے ذریعہ باب عالی سے معاملات طے کر لیں اور جو کچھ طے ہو اسے فوراً ایک خط شریف میں

---

(۱) سوگلی بحوالہ کریسی جلد ۲ ص ۲۱۵

شائع کر کے اس معاہدہ میں شامل کر دیا جائے، سرویا کو جو حقوق دیے جائیں ان میں مندرجہ ذیل امور کی تصریح خاص طور پر کر دی جائے۔ مذہبی آزادی، اپنے سرداروں کا آزادانہ انتخاب، حکومت خود اختیاری، جو علاقے سرویا سے علاحدہ کر لیے گئے تھے ان کا دوبارہ الحاق، متعدد محصولوں کو ملا کر صرف ایک محصول کا نفاذ، تجارتی آزادی، شفاخانوں مدرسوں اور مطبعوں کا قیام اور یہ قانون کہ قلعوں کے فوجی دستوں کے علاوہ کسی مسلمان کو سرویا میں رہنے کی اجازت نہ دی جائے، معاہدہ کی دوسری دفعات بھی دولت علیہ کے خلاف ہی تھیں مثلاً شمالی افریقہ کے بحری قزاقوں سے روسی تاجروں کو جو نقصان پہنچے اس کی تلافی کا ذمہ دار باب عالی ہوگا اور اب تک جن حکومتوں کو بحر اسود میں جہاز رانی کا حق حاصل نہ تھا اگر آئندہ انھیں یہ حق دیا جائے تو باب عالی ذمہ دار ہوگا کہ اس اجازت سے روس کی تجارت کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

مسیحی اتحاد: محمود نے مذکورہ بالا شرائط کی تلخی صرف اس خیال سے گوارا کر لی تھی کہ فی الحال جنگ سے مہلت مل جائے گی اور فوجی و ملکی اصلاحات جاری کی جا سکیں گی، جن کے لیے امن کی فرصت ضروری تھی لیکن یورپ کی مسیحی طاقتوں کے لیے دولت عثمانیہ پر حملہ کرنے کا اس سے بہتر موقع مشکل سے میسر آ سکتا تھا، جب کہ ایک طرف ینی چری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور دوسری طرف سلطنت کی بقیہ فوجیں یونانی بغاوت کے فرو کرنے میں مصروف تھیں روس تو قدیم دشمن تھا ان حکومتوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ کیا جو مدت سے دوستی کا دم بھر رہی تھیں، چنانچہ انگلستان اور فرانس نے یونان کی درپردہ ہمدردی سے نکل کر علانیہ حمایت شروع کر دی، ۶ر جولائی ۱۸۲۷ء کو روس، انگلستان اور فرانس کے درمیان لندن میں ایک معاہدہ ہوا جس کا مقصد جنگ یونان کی خوں ریزی کو ختم کرنا اور ترکوں اور یونانیوں میں صلح کرا دینا ظاہر کیا گیا، ارکان معاہدہ نے محاربین کے درمیان مصالحت کرا دینے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور صلح کی بنیادی شرط یہ قرار دی کہ یونان کو عملاً بالکل آزاد کر دیا جائے، سلطان کی فرماں روائی

صرف نام کے لیے باقی رہے اور اسے ایک معین رقم بطور سالانہ خراج کے ملتی رہے، جسے یونانی خود ہی جمع کر کے بھیج دیا کریں گے۔ ان شرائط پر گفتگو کرنے کے لیے یہ طے پایا کہ جنگ فوراً روک دی جائے اور اگر باب عالی دول عظمیٰ کی وساطت قبول کرنے سے انکار کرے تو یونان کو ایک آزاد حکومت تسلیم کر کے اس سے بین الاقوامی تعلقات قائم کر لیے جائیں، چنانچہ اس معاہدہ کے مطابق روس انگلستان اور فرانس کے سفیروں نے باب عالی سے جنگ روک دینے اور مذکورہ بالا شرائط پر صلح کر لینے کا مطالبہ پیش کیا، محمود نے اس مطالبہ کو فوراً مسترد کر دیا اور جواب دیا کہ غیر حکومتوں کو سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، خصوصاً جبکہ وہ ملک جسے عثمانی مقبوضات سے علاحدہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، صدیوں سے دولت علیہ کے زیر حکومت رہ چکا ہے اور وہ جماعت جس کی پاسداری میں اتحادیوں نے بین الاقوامی قوانین کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، ڈاکوؤں اور باغیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

واقعہ نوارینو: دول ثلاثہ نے جب یہ دیکھا کہ ابراہیم پاشا کو موریا میں شاندار کامیابی حاصل ہو رہی ہے اور اس نے یونانیوں کو ہر موقع پر شکست دے کر بغاوت کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے تو انھوں نے یونان کی حمایت میں اپنے جنگی بیڑے بھیج کر امیر البحروں کے ذریعہ سے ابراہیم پاشا سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ باغیوں کے خلاف اب کوئی کارروائی نہ کرے اور اپنے جہازوں اور فوج کو لے کر مصر واپس چلا جائے، ابراہیم پاشا نے جواب دیا کہ وہ اپنے والد یا باب عالی کے احکام کے بغیر ایسا کرنے سے معذور ہے، البتہ اس نے باب عالی کے احکام کے پہنچنے تک عارضی صلح منظور کر لی لیکن یوروپین امیر البحروں نے اس معاہدہ کی پابندی نہیں کی اور برابر یونانیوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، مہلت جنگ سے فائدہ اٹھا کر یونانی ان مقامات پر حملہ کرنے لگے جنھیں ابراہیم پاشا فتح کر چکا تھا، انگریز اور یوروپین افسر بھی یونانی فوجوں میں شامل تھے، ابراہیم پاشا نے ان کارروائیوں کے خلاف سخت احتجاج کیا مگر دول عظمیٰ کے امیر البحروں نے اس کی مطلق

پر واقع تھیں۔ برخلاف اس کے جب ابراہیم پاشا نے شہر پٹراس (Patras) کو بچانے کے لیے جس پر یونانیوں نے حملہ کر دیا تھا، نوارینو کی بندرگاہ سے نکلنا چاہا تو انگریزی امیر البحر کوڈرنگٹن (Codrington) نے جو اتحادی بیڑے کا سرعسکر تھا معاہدۂ صلح کا حوالہ دے کر اسے روک دیا۔

اتحادی بیڑا عثمانی بیڑے کی ناکہ بندی کرنے کے لیے خلیج نوارینو میں داخل ہو گیا تھا، کوڈرنگٹن کو یہ ہدایت تھی کہ ابراہیم پاشا تک کسی قسم کی مدد پہنچنے نہ دے گو اس کے لیے بالآخر توپ سے کام لینا پڑے۔ ابراہیم پاشا نے یہ دیکھ کر کہ دول متحدہ کی دست اندازی سے یونانیوں کی شورش کچھ بڑھ رہی ہے، موریا کے اندرونی علاقوں میں جا کر اس فتنہ کو روکنے کی کوشش کی۔ کوڈرنگٹن نے اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو دفعۃً ترکی و مصری جہازوں پر جو خلیج نوارینو میں لنگر انداز تھے حملہ کر دیا، حملہ کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ عثمانی بیڑے سے ایک گولی آ کر ایک انگریز کو لگی اور وہ مر گیا، اس ایک شخص کی جان کے بدلے میں تقریباً پورا عثمانی بیڑا برباد کر دیا گیا جس میں ہزاروں مسلمان ہلاک ہوئے، عثمانی بیڑے میں کشتیوں کی تعداد تو ضرور زیادہ تھی لیکن جنگی جہازوں کی تعداد اور مجموعی حیثیت سے اتحادی بیڑا اس سے بہت بہتر تھا(۱) چار گھنٹے تک شدید جنگ ہوتی رہی، ترکوں اور مصریوں نے نہایت شجاعت سے مقابلہ کیا مگر آخر میں چند کشتیوں کے علاوہ باقی سب جہاز برباد ہو گئے۔

اس واقعہ سے تمام یورپ متحیر ہو گیا اور بقول میریٹ انگلستان کی حکومت تک کو اس سے سراسیمگی پیدا ہوئی، اس وقت تک دول متحدہ میں سے کسی نے بھی دولت عثمانیہ سے جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا، اس لیے واقعہ نوارینو کی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ چنانچہ ۲۹ جنوری ۱۸۲۸ء کو شاہ انگلستان نے اس واقعہ پر اپنے شدید غم کا اظہار کیا اور "ایک قدیم حلیف کی بحری فوجوں سے لڑائی ہو گئی" (۲) اور قوی امید ظاہر کی کہ اس

---

(۱) [illegible] جلد ۲ ص ۲۳۰ (۲) میریٹ ص ۲۲۰

حادثۂ مشئومہ کے بعد پھر جنگ وجدل کی نوبت نہ آئے گی۔" (۱) لیکن موسیو الفریڈ نیر نے صحیح لکھا ہے کہ اتحادی بیڑے نے جو کچھ کیا وہ فرانس، روس اور انگلستان کی متفقہ رائے سے کیا۔ (۲)

نوارینو کی شکست کا اثر: نوارینو کا حادثہ دولت عثمانیہ کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوا، اس سے صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ ابراہیم پاشا کا بحری تعلق مصر سے منقطع ہو گیا بلکہ جنگ یونان کا بھی خاتمہ ہو گیا اور یونان کے باغی ایک خود مختار مملکت کے حاکم بن گئے، ابراہیم پاشا کو اپنی فوجیں لے کر مصر واپس چلا جانا پڑا، اس کے بعد فرانسیسی جنرل میسن (Maison) اتحادیوں کی طرف سے موریا میں داخل ہوا اور اس نے بقیہ ترکی فوجوں کو بھی وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا، نوارینو کے واقعہ سے بحر اسود پر روس کا تسلط بھی قائم ہو گیا، جو آیندہ جنگ میں اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوا کیوں کہ اس سے وارنا کی فتح آسان ہو گئی اور روسی فوجیں بلقان کو عبور کر کے قسطنطنیہ کے حملہ کے قصد سے آگے بڑھ سکیں۔

ان واقعات کے باوجود سلطان محمود نے معاہدۂ لندن کے شرائط منظور کرنے سے قطعی انکار کر دیا، البتہ وزرا نے سلطنت کی کمزوری کو محسوس کر کے اس بات کی کوشش کی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے، چنانچہ انھوں نے یونان سے متعلق کچھ تجویزیں اتحادیوں کے سامنے ان کی سفیروں کے ذریعہ سے پیش کرنی چاہیں، وہ تجویزیں یہ تھیں کہ باب عالی تمام باغیوں کو معاف کر دے گا، محصولوں اور خراج کی باقی ماندہ رقم سے دست بردار ہو جائے گا، جو جائدادیں ضبط کر لی گئی تھیں انھیں واپس کر دے گا، یونانیوں کے تمام سابق حقوق ازسر نو عطا کر دے گا اور اس بات کی ضمانت دے گا کہ حکومت پہلے کی بہ نسبت زیادہ نرمی سے کی جائے گی مگر سفرا معاہدۂ لندن کے شرائط پر مصر رہے اور ان میں سے کسی تجویز کو منظور نہیں کیا (۳) ۸/دسمبر ۱۸۲۷ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہو گئے، یہ ان

---

(۱) میریٹ ص ۲۲۱ (۲) مصطفیٰ کامل پاشا ص ۱۱۷ (۳) کریسی جلد ۲ ص ۲۲۱

حکومت کی طرف سے تعلقات کے منقطع ہونے کا اعلان تھا، رئیس آفندی نے معاملات کو سمجھانے کی ایک بار اور کوشش کی مگر روسی سفیر نے اس کے مراسلہ کا کوئی جواب بھی نہیں دیا، حقیقت یہ تھی کہ زار نکولس جنگ کے لیے بالکل تیار تھا، وہ بسربیا کے علاقے میں نئی فوجیں بھرتی کر رہا تھا اور بحر اسود کی بندرگاہوں میں فوجی سامان اور جہازوں کو اکٹھا کر رہا تھا کہ ضرورت کے وقت عثمانی مقبوضات پر فوراً حملہ کیا جا سکے، باب عالی اور روس کے درمیان بعض شکایتیں عرصہ سے چلی آ رہی تھیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود نکولس جیسے زار کے لیے جنگ کا حیلہ بن سکتی تھی مثلاً مولڈیویا، ولاچیا اور سرویہ کے معاملات ہر موقع پر روس کے کام آ سکتے تھے، دوسری طرف باب عالی ایشیا کے چند قلعوں کا دعویدار تھا جن پر روس ناجائز قابض تھا، ان حالات سے محمود کو یقین ہو گیا تھا کہ نکولس جنگ کے لیے بالکل تیار ہے اور عنقریب حملہ کر دے گا، لہذا بجائے اس کے کہ وہ روس کے حملہ کا انتظار کرے ۲۰ دسمبر ۱۸۲۷ء کو اس نے خود ہی اعلان جنگ کر دیا۔

جنگ روس: مئی ۱۸۲۸ء میں زار نکولس خود میدان میں آیا اور دریائے پرتھ کو عبور کر کے پندرہ ہزار فوج کے ساتھ مولڈیویا میں داخل ہو گیا، تقریباً اسی وقت روسی بیڑہ بھی درۂ دانیال میں داخل ہوا۔

سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں میں ایک لاکھ روسی فوجیں روانہ کی گئی تھیں، ان کے علاوہ جنرل کاؤنٹ پسکیوچ (Count Paskiwetsch) آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایشیائی صوبوں میں داخل ہوا اور سولہ ہزار کا ایک لشکر بوقت ضرورت کے لیے کمک محفوظ رکھا۔ بحری قوت میں روس کی فوقیت مسلم تھی، پہلے کے جہازوں کے علاوہ بحر اسود میں اس کے سولہ بڑے جنگی جہاز لڑائی کے لیے تیار تھے، نیز یونان میں اس کا وہ بیڑا ابھی موجود تھا جس نے نوارینو میں ترکی بیڑے کو شکست دینے میں مدد کی تھی، اس جنگ میں شروع سے آخر تک روس کی بحری طاقت اس کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئی۔ برخلاف اس کے دولت علیہ کی بری اور بحری دونوں قوتیں روس

کے مقابلہ میں بہت کمزور تھیں، بری فوجوں کی تعداد جو نظام جدید کے مطابق مرتب کی گئی تھی صرف اڑتالیس ہزار تھی، ان میں زیادہ تر نوجوان تھے جو ابھی جدید بھرتی کیے گئے تھے کیونکہ فوجی اصلاحات کے خلاف ان کی بدظنی بڑی عمر کے ترکوں کی طرح شدید نہ ہوئی لیکن ناتجربہ کاری کے باوجود جو چیز ان نوجوانوں کو آزمودہ کار سپاہیوں پر فوقیت دیتی تھی وہ ان کی اطاعت شعاری تھی، میدان جنگ میں انھوں نے اپنی شجاعت سے روسیوں کے دانت کھٹے کر دیے، روسی سفیر متعینہ پیرس ۱۹ / نومبر ۱۸۲۸ء کو لکھتا ہے: "ایسی حالت میں جب کہ اصلاحات کی پوری تکمیل نہیں ہوئی اور وہ ابتدائی حالت میں ہیں، سلطان نے ہمارا باضابطہ اور شدت سے مقابلہ کیا ہے تو اس صورت میں ان کا مقابلہ کس قدر زبردست ہوتا جب کہ ان کو تکمیل کا موقع مل جاتا اور وہ پایۂ کمال کو پہنچ جاتے" (۱) ان جدید فوجوں کے علاوہ جاگیرداروں کی بے ضابطہ فوجیں بھی طلب کی گئی تھیں لیکن چونکہ یوروپین صوبوں میں محمودی اصلاحات کے خلاف عام بیزاری پھیلی ہوئی تھی اس لیے جاگیری فوجوں کا بڑا حصہ صرف ایشیائی صوبوں سے فراہم ہو سکا، یوروپین صوبوں نے بہت کم مدد دی، چنانچہ بوسنیا نے جو ایک نہایت جنگجو صوبہ تھا اور اس میں زیادہ تر مسلمان آباد تھے کوئی فوج نہیں بھیجی، فوجی افسروں میں بھی تجربہ کار اب تک نظام قدیم کے حامی تھے اور بقول کریسی اصلاحات کی وجہ سے سلطان سے ان کی بیزاری تقریباً اتنی ہی شدید تھی جتنی روسی قوت کے خلاف ان کی نفرت۔

مئی ۱۸۲۸ء میں روسی فوجیں مولڈیویا اور ولاچیا پر قبضہ کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور دریائے ڈینوب کو عبور کر کے ۱۵ / جون کو ابرائیل کا قلعہ فتح کر لیا، اس کے بعد انھوں نے شوملہ اور وارنا کا رخ کیا، شوملہ پر انھوں نے کئی حملے کیے مگر کامیابی نہیں ہوئی اور آخر میں شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا، وارنا سے بھی انھیں اسی طرح پسپا ہونا پڑتا لیکن یوسف پاشا کمانڈر وارنا کی غداری سے جو قلعہ کے تقریباً پورے وقت کے ساتھ دشمن سے

---

(۱) تاریخ دولت عثمانیہ از ژوزن کیزر (ترجمہ اردو) جلد اول ص ۵۹

جاملا، یہ اہم قلعہ بآسانی فتح ہو گیا۔ اس کے بعد سلسٹریا کا محاصرہ شروع ہوا مگر اس میں روسیوں کو ناکامی ہوئی اور اسی معرکہ پر یورپین ترکی میں ۱۸۲۸ء کی جنگ کا خاتمہ ہو گیا، فان مولتکی جو اس جنگ میں دولت علیہ کی طرف سے شریک تھا لکھتا ہے: ''اگر ہم ان زبردست قربانیوں کا لحاظ کریں جو ۱۸۲۸ء کی جنگ میں روس کو برداشت کرنا پڑیں تو یہ بتانا مشکل ہوگا کہ فتح ان کی ہوئی یا ترکوں کی، پہلی جنگ کا فیصلہ دوسری جنگ کے نتیجہ پر منحصر رہا۔''(۱)

ایشیا میں روسیوں کی کامیابی زیادہ نمایاں تھی، اناپا (Anapa) ہرٹ وٹز (Hertwitz) اور بعض دوسرے قلعوں پر ان کا قبضہ ہو گیا، جس کی وجہ سے دوسرے سال ایشیائے کوچک کا داخلہ آسان ہو گیا لیکن اصلی مہم یورپ کی تھی اور اسی پر مغربی حکومتوں کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں، چنانچہ جب ۱۸۲۹ء میں جنگ دوبارہ شروع ہوئی تو نکولس نے سال گذشتہ سے بہتر اور زیادہ تعداد میں فوجیں روانہ کیں اور ان کا سپہ سالار مارشل ڈیبش (Diebits ck) کو مقرر کیا۔

ایک شدید غلطی اور شدید تر غلط فہمی: شوملہ کی عثمانی فوج نے ۱۷؍ مئی ۱۸۲۹ء کو جنگ چھیڑ کر پراوادی کو روسیوں کے قبضہ سے چھڑا لینے کی کوشش کی، مقابلہ ابھی جاری ہی تھا کہ مارشل ڈیبش جس نے ۱۸؍ مئی کو سلسٹریا کا محاصرہ شروع کر دیا تھا، اپنی فوج کا بڑا حصہ لے کر پراوادی کی طرف تیزی سے روانہ ہوا اور پراوادی اور شوملہ کے درمیان کولیوشا (Kulewtsha) کے مقام پر ترکوں کو شکست دی، عثمانی سر عسکر صدر اعظم رشید پاشا نے شکست خوردہ فوج کو دوبارہ شوملہ میں جمع کرنے کی کوشش کی مگر یہ خیال کر کے کہ ڈیبش اب شوملہ پر حملہ کرے گا، اس نے ان دستوں کا بڑا حصہ طلب کر لیا جو کوہ بلقان کے دروں کی حفاظت کے لیے متعین کیے گئے تھے، یہ ایک نہایت شدید غلطی تھی جس کا خمیازہ دولت علیہ کو بہت جلد بھگتنا پڑا، اس وقت تک کوئی حملہ آور فوج ان

---

(۱) کریسی ج ۲ ص ۳۲۳

دروں کو عبور کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن رشید پاشا کی اس حیرت انگیز غلطی کی وجہ سے ڈیبچ کے لیے یہ عمل ممکن ہوا۔ ۲۶ جون کو سلسٹریا کا قلعہ سر ہوا اور روسیوں نے اس مستحکم قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس سے فارغ ہو کر ڈیبچ فوراً بلقان کی طرف روانہ ہو گیا، بحر اسود کا بیڑا ساحل پر روسی فوجوں کی مدد کے لیے جنگی جہاز پہلے سے تیار تھے۔ ڈیبچ نے اپنی فوج کا ایک دستہ شوملہ میں صدر اعظم کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے چھوڑا اور صرف تیس ہزار سپاہیوں کو لے کر بلقان کے دروں کی طرف بڑھا۔ اسے علم تھا کہ قسطنطنیہ اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے بڑے شہروں میں محمود کی اصلاحات کے خلاف عام طور پر بیزاری پھیلی ہوئی ہے، جس سے رومیلیا اور یونان کی قومیں بھی متاثر ہیں، ان حالات سے اس کے حوصلے اور بھی بڑھے ہوئے تھے، الغرض ڈیبچ نہایت خاموشی کے ساتھ روانہ ہو کر دو روز کی قلیل مدت میں اس نے کوہ بلقان کے دروں کو عبور کر لیا اور جنوبی وادی تک پہنچ گیا، دروں کی حفاظت کے لیے جو دستے متعین کیے گئے تھے، ان کی تعداد رشید پاشا کی ناعاقبت اندیشی سے پہلے ہی کم ہو چکی تھی، اس لیے وہ ڈیبچ کی فوج کو روک نہ سکے، روسی جب پہاڑوں کو طے کر کے وادی میں پہنچے تو ان کی تعداد بیماریوں اور طاعون سے بہت گھٹ چکی تھی لیکن ترکوں کو اس کی خبر نہ تھی، وہ سمجھتے تھے کہ ڈیبچ کے ساتھ کم سے کم ساٹھ ہزار فوج ہوگی، چنانچہ انھیں یہی خیال تھا کہ شوملہ سے روانہ ہونے کے قبل ڈیبچ نے صدر اعظم کی فوج کو بے دست و پا کر دیا ہوگا، ورنہ اس کے لیے کوہ بلقان کا عبور کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا، اس خیال سے ان کے ہاتھ پاؤں اور بھی پھول گئے، ڈیبچ متعدد قلعوں کو فتح کرتا ہوا چلا گیا، یہاں تک کہ ۲۰ اگست ۱۸۲۹ء کو سلطنت عثمانیہ کے قدیم پایۂ تخت ادرنہ کے ترکی دستہ نے بھی صرف تیس ہزار روسی سپاہیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

طلسم قوت: ڈیبچ نے اس مہم میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا تھا کہ رومیلیا کی عثمانی رعایا کو روسی فوجوں کی غارت گری سے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے، یہ دانشمندی اس کے حق

میں نہایت مفید ثابت ہوئی۔ عیسائی آبادی نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا اور مسلمان بھی یہ دیکھ کر کہ جان و مال، ناموس و مذہب یا مقامی حکومت خود اختیاری کسی چیز سے تعرض نہیں کیا جاتا، ہتھیار ڈال دینے کے بعد بدستور اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے، اس تدبیر سے ڈیبش کی چھوٹی سی فوج قدم قدم پر لڑائیاں لڑنے سے بچ گئی، جن میں الجھ کر اسے بالآخر برباد ہو جانا پڑتا اور ڈیبش کی فوجی قوت کا طلسم کامیابی کے ساتھ ترکوں پر قائم رہا، وہ خوب جانتا تھا کہ اگر اورنہ سے آگے بڑھ کر قسطنطنیہ کی طرف کوچ کرے گا تو یہ فریب زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکے گا اور چونکہ قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے محمود نے فوجیں فراہم کر لی تھیں اور مسلمانوں کا جوش غیرت سقوط اورنہ کے بعد انتہائی درجہ تک پہنچ چکا تھا، اس لیے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کا خیال ایک خواب سے زیادہ نہ تھا، علاوہ بریں رشید پاشا کی فوج شوملہ سے نکل کر پشت کی طرف سے حملہ کر سکتی تھی، اس خطرہ کا جو دستہ ڈیبش نے پیچھے چھوڑ دیا تھا وہ صدر اعظم کو روکنے کے لیے کافی نہ تھا، دوسری طرف سکودرا کا پاشا مصطفیٰ جس نے اب تک خودسری کی وجہ سے جنگ میں شرکت نہیں کی تھی، اب تیس ہزار بہترین البانی فوج کے ساتھ دارالسلطنت کی حفاظت کے لیے مستعد تھا، ایسی صورت میں ڈیبش کی کامیابی کی طرف یہی ایک تدبیر تھی کہ جس طرح ممکن ہو اپنی فوجی قوت کا طلسم قائم رکھتے ہوئے صلح کی کوشش کرے، اس کی خوش قسمتی سے نہ صرف قسطنطنیہ کے باشندوں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی بلکہ عثمانی مدبرین اور یوروپین سفرا بھی اس کی فوج کی اصلی حالت سے بے خبر تھے، وہ سمجھتے تھے کہ روسی فوج کی تعداد ساٹھ ہزار ہے، اسی درمیان میں ینی چری کے حامیوں نے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کی لیکن محمود چونکہ پہلے سے تیار تھا، اس لیے فوراً ہی یہ شورش رفع کر دی گئی اور تمام باغی قتل کر دیے گئے، تاہم قسطنطنیہ میں نئی شورشوں کا خطرہ اب بھی محسوس کیا جاتا تھا، ایسی حالت میں وزرائے سلطنت اور یوروپین سفیروں نے متفقہ طور پر محمود سے درخواست کی کہ دولت عثمانیہ کو تباہی سے بچانے کے لیے جس طرح ممکن ہو روس سے صلح کر لی جائے، مغربی

حکومتوں کے اس نیک مشورہ کا سبب تو ظاہر ہے، وہ کسی حال میں بھی قسطنطنیہ پر روس کا قبضہ گوارا نہیں کر سکتی تھیں، البتہ عثمانی وزرا کا اصرار نیک نیتی پر مبنی تھا، محمود یوں دب کر صلح کرنے کے لیے مطلق آمادہ نہ تھا، لیکن جب ہر چہار طرف سے سخت اصرار ہونے لگا تو مجبور ہو کر اس نے مارشل ڈیبش کے پاس عثمانی نمایندوں کو بھیجنا منظور کر لیا، ۱۵/ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۴/ اپریل ۱۸۲۹ء کو صلح نامہ اورنہ پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔

صلح نامۂ اورنہ: اس صلح نامہ کے رو سے زار نے یوروپین ٹرکی کے وہ تمام مقامات دولت عثمانیہ کو واپس کر دیے جن پر روسی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، البتہ دریائے ڈینوب کا دہانہ اور مولڈیویا کا ایک حصہ جو ڈینوب کے بائیں ساحل پر واقع تھا، سلطنت روس میں شامل کر لیا گیا، وسطِ یورپ خصوصاً آسٹریا کی تجارت کے لیے اس علاقہ اور ڈینوب کے دہانہ کا قبضہ نہایت اہم تھا، ایشیا میں آناپا اخلتزیک اور چند دوسرے قلعوں اور علاقوں کے علاوہ بقیہ تمام فتوحات سے روس دست بردار ہو گیا، مولڈیویا اور ولاچیا کے لیے یہ طے پایا کہ ان کے امیروں کا انتخاب آیندہ مدۃ العمر کے لیے ہوا کرے گا، کسی ترک افسر کو ان کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا اور نہ ان ریاستوں میں کسی مسلمان کو بود و باش اختیار کرنے کی اجازت ہوگی، وہاں کے مسلمانوں کو اٹھارہ ماہ کی مہلت دی گئی کہ اپنی جائدادیں فروخت کر ڈالیں، باب عالی کی فرماں روائی صرف نام کے لیے باقی رہ گئی اور ان کے لیے جو سالانہ خراج منظور ہوا، وہ بھی دو سال کے لیے معاف کر دیا گیا، ایسی ہی آزادی سرویا کو بھی دی گئی اور یہ قرار پایا کہ معاہدہ آق کرمان کی ان تمام دفعات پر جن کا تعلق سرویا سے ہے فوراً عمل درآمد شروع کر دیا جائے، بلغراد اور اورسوا کے قلعوں کے علاوہ سرویا کے اور تمام قلعوں سے ترکی دستے ہٹا لیے جائیں اور کوئی ترک اس صوبہ کے کسی دوسرے حصہ میں نہ رہنے پائے، سلسٹریا دولت علیہ کو واپس کر دیا گیا لیکن یہ طے پایا کہ ڈینوب کے دوسرے قلعے مسمار کر دیے جائیں، یہ بھی طے پایا کہ بحر اسود، باسفورس اور دردانیال کو روس کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیا جائے، دوران جنگ میں روس

کی تجارت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کے لیے ساڑھے سات سو پونڈ بطور تاوان ادا کیے جائیں اور اس کے علاوہ پچاس لاکھ پونڈ تاوان جنگ حکومت روس کو ادا کیے جائیں، اس رقم کی ادائیگی کے لیے دس سالانہ قسطیں مقرر کر دی گئیں اور روس کو یہ حق دیا گیا کہ جب تک پوری رقم ادا نہ ہو جائے وہ اپنے مقبوضات سے کلیۃً دست بردار نہ ہو، چنانچہ یہ تصریح کر دی گئی کہ پہلی قسط کی ادائیگی کے بعد روسی فوجیں ادرنہ کا تخلیہ کریں گی، دوسری قسط کے بعد وہ بلقان سے واپس چلی جائیں گی، تیسری قسط کے بعد دریائے ڈینوب کے اس پار چلی جائیں گی اور جب تک بقیہ قسطیں ادا نہ کی جائیں گی یعنی دسویں سال تک مولڈیویا اور ولاچیا پر روس کا قبضہ باقی رہے گا۔

صلح نامہ کی دفعہ نمبر (۱۰) کے رو سے باب عالی نے معاہدۂ لندن مورخہ جولائی ۱۸۲۷ء نیز منضبطہ لندن مورخہ مارچ ۱۸۲۹ء کے شرائط جو انگلستان، فرانس اور روس کے درمیان طے ہوئے تھے منظور کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ یونان ایک خود مختار سلطنت قرار پایا، اس کی حد خلیج ارتا (Arta) اور خلیج وولو (Vclo) کے درمیانی خط سے متعین کر دی گئی، اس خط کے شمال میں تھسلی اور البانیا کے صوبے دولت عثمانیہ کے سرحدی صوبے قرار پائے، جزائر آئیونین پر برطانیہ کا قبضہ قائم رہا، لیکن کریٹ اور وہ جزیرے جو تھریس اور ایشیائی ساحل سے قریب تھے، دولت علیہ کی فرماں روائی میں رہنے دیے گئے۔

محمود کو اس صلح نامہ سے بے حد صدمہ ہوا، اس پر دستخط کرتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ہفتوں شدید حزن و ملال کی حالت میں وہ محل میں پڑا رہا اور کہیں باہر نہیں نکلا، اس صدمہ کی شدت اس وقت اور بھی بے پایاں ہو گئی جب صلح نامہ کے تکملہ کے بعد اسے روسی فوج کی اصل قوت کا علم ہوا اور اس نے معلوم کیا کہ ڈیبش کا پورا لشکر سترہ ہزار سے زیادہ نہ تھا، اگر روسی فوج کے متعلق غلط اطلاعات کی بنا پر وہ اپنے وزیروں کے اصرار سے مجبور نہ ہو گیا ہوتا اور چند دنوں اور صلح سے انکار کرتا رہتا تو ڈیبش کی دھمکیوں کی ساری حقیقت بہت جلد کھل جاتی اور اس کی خستہ و پریشان حال فوج

کا کوئی سپاہی سلامتی کے ساتھ واپس نہ جا سکتا۔

ہجوم مصائب: صلح نامہ اورنہ کے دوسرے ہی سال جولائی ۱۸۳۰ء میں دولت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا، یہ صوبہ اگرچہ دولت علیہ سے عملاً آزاد ہو چکا تھا تاہم اس کی فرماں روائی اب بھی تسلیم کرتا تھا اور اس کے عامل کا تقرر باب عالی ہی کی طرف سے ہوا کرتا تھا لیکن چوں کہ جنگ روس میں عثمانی فوجوں کو بہت نقصان پہنچ چکا تھا اور صلح کے بعد سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، اس لیے محمود کو یہ تلخ گھونٹ بھی مجبوراً پینا پڑا، عام طور پر لوگوں نے گذشتہ جنگ کی شکستوں کا سبب محمود کی فوجی اصلاحات کو قرار دینا شروع کیا اور یہ خیال اس کثرت سے پھیلتا گیا کہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۳ء تک سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوتیں برپا ہوئیں، یورپین صوبوں میں زیادہ شدید بوسنیا اور البانیا کی بغاوتیں تھیں جن کے فرو کرنے میں صدر اعظم رشید پاشا کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور شاہی خزانہ پر جو پہلے ہی تقریباً خالی ہو چکا تھا اور بھی زیادہ بار پڑ گیا، ایشیائی صوبوں کی شورشیں بھی کم تشویش ناک نہ تھیں مگر سب سے زیادہ خطرناک مصر کی حالت تھی جو عنقریب اعلان جنگ کرنے والا تھا، محمد علی پاشا کے حوصلے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے، وہ صرف نام کے لیے باب عالی کا مطیع تھا، ورنہ حقیقتاً ایک خود مختار فرماں روا کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، مصر میں اپنی حکومت کو پوری طرح مستحکم کر کے وہ تو اب خود سلطنت عثمانیہ کے تخت کا حوصلہ کر رہا تھا، نوارینو کی شکست کے بعد اس نے اپنا جنگی بیڑہ از سر نو تعمیر کر لیا تھا، اس کے پاس ایک آموزدہ کار اور اعلیٰ درجہ کی تربیت یافتہ فوج تھی جس کے افسر زیادہ تر فرانسیسی تھے اور اس فوج کا سپہ سالار خود اس کا لڑکا ابراہیم پاشا تھا جس کی فوجی قابلیت اور شجاعت کا سکہ جنگ یونان میں بیٹھ چکا تھا۔

محمد علی کی بغاوت: یونان کی بغاوت فرو کرنے کے لیے جب محمود نے محمد علی پاشا کو طلب کیا تھا تو اس خدمت کے معاوضہ میں اسے مصر کے علاوہ شام، دمشق، طرابلس

(مشرقی ایشیا) اور کریٹ کا والی بھی بنا دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن چونکہ جنگ یونان کا نتیجہ دولت علیہ کے خلاف رہا اور ابراہیم پاشا موریا کو تخلیہ کر کے اپنی فوج کے ساتھ مصر واپس چلا گیا، اس لیے محمد علی نے جب ان چاروں ولایتوں کی درخواست کی تو محمود نے صرف کریٹ کا عطا کیا جانا منظور کیا، یہ بات محمد علی جیسے شخص کو سخت ناگوار ہوئی، اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا لیکن شام پر حملہ کرنے کے لیے موقع کا انتظار کرتا رہا، اتفاق سے ۱۸۳۱ء میں اسے ایک حیلہ ہاتھ آگیا، کچھ مصریوں نے بھاگ کر عکا میں پناہ لی تھی، محمد علی نے عبداللہ پاشا والی عکا کو لکھا کہ ان باغیوں کو واپس کر دو، اس نے انکار کیا، یہ عذر محمد علی کے لیے بہت کافی تھا فوراً ایک زبردست فوج ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں روانہ کی، ابراہیم پاشا نے شام میں داخل ہو کر سب سے پہلے عکا کا محاصرہ کر لیا، لیکن جب اس کی فتح میں دیر ہوئی تو کچھ فوج وہاں چھوڑ کر خود آگے بڑھ گیا اور یافا، غزہ اور بیت المقدس پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا، ۲۷ رمئی ۱۸۳۲ء کو عکا بھی فتح ہو گیا اور ۱۵ رجون کو ابراہیم نے دمشق پر بھی قبضہ کر لیا۔

ابراہیم پاشا کے حملہ کی خبر قسطنطنیہ پہنچی تو سلطان نے ایک فوج حسین پاشا کی قیادت میں روانہ کی لیکن ابراہیم ترکوں کے مقدمۃ الجیش کو شکست دے کر حلب میں داخل ہو گیا، ۲۹ رجولائی کو بیلان کے مقام پر اس نے خود حسین پاشا کو سخت شکست دی، ایشیائے کوچک کا راستہ اب کھلا ہوا تھا، محمود نے رشید پاشا کو تازہ فوج کے ساتھ روانہ کیا، ۲۹ راکتوبر ۱۸۳۲ء کو قونیہ میں مقابلہ ہوا جس میں رشید پاشا کو شکست ہوئی، اس کے بعد ابراہیم کوتاہیہ کی طرف بڑھا اور وہاں پہنچ کر بروصہ کا قصد کیا، جو دولت عثمانیہ کا پہلا پایہ تخت رہ چکا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شام کی طرح ایشیائے کوچک پر بھی بہت جلد اس کا تسلط قائم ہو جائے گا، ان فتوحات کے بعد آئندہ سال قسطنطنیہ پر حملہ کا خطرہ ایک بالکل قدرتی امر تھا۔

محمود نے اس خطرہ کو محسوس کر کے سب سے پہلے برطانیہ سے مدد کی خواہش

کی، لیکن اس نے صاف جواب دیا۔ روس اس موقع کا منتظر ہی تھا، چنانچہ دسمبر ۱۸۳۲ء میں نکولس نے جنرل موراویف (Mouravieff) کو خاص اس غرض سے قسطنطنیہ بھیجا کہ سلطان کے سامنے ابراہیم کی فتوحات کا خطرہ ظاہر کر کے قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے روس کی مدد پیش کرے لیکن باوجود اس خطرہ کے محمود کو روس کی مدد قبول کرنے میں تامل تھا، موراویف کو جب باب عالی میں ناکامی ہوئی تو وہ سیدھا اسکندریہ پہنچا کہ محمد علی پر دباؤ ڈال کر کم سے کم ابراہیم پاشا کو آگے بڑھنے سے روکے، زار کی اس تشویش کا سبب صرف یہ نہ تھا کہ قسطنطنیہ پر ابراہیم کا قبضہ ہو جائے گا بلکہ وہ متعدد معاہدے بھی معرض خطر میں تھے جو روس اور دولت علیہ کے درمیان ہو چکے تھے اور جن سے روس نے بہت سے حقوق حاصل کر لیے تھے، زار جو بحر روم میں اپنے جہازوں کی آمد و رفت کے لیے آبنائے باسفورس اور دردانیال کو کھلا رکھنا چاہتا تھا اس بات کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا کہ آل عثمان کے کمزور فرماں رواؤں کے بجائے محمد علی کا طاقتور خاندان قسطنطنیہ کے تخت پر قابض ہو جائے۔

روس کی مدد: اس درمیان میں محمود کو اندازہ ہو گیا تھا کہ روس سے مدد لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں، چنانچہ اس نے نہ صرف ایک جنگی بیڑے کی خواہش کی بلکہ بری فوج بھی طلب کی، ۲۰؍فروری ۱۸۳۳ء کو چار جنگی جہاز، چھ ہزار فوج لے کر باسفورس میں داخل ہوئے اور قسطنطنیہ کے سامنے لنگر انداز ہوئے، ان جہازوں کی آمد سے برطانیہ اور فرانس دونوں کو نہایت تشویش ہوئی اور انھوں نے سلطان پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ روسی بیڑہ واپس کر دیا جائے، زار نے جواب دیا کہ جب تک ابراہیم اپنی فوج کے ساتھ کوہ طور کے اس پار لوٹ نہ جائے گا اس کے جہاز واپس نہ جائیں گے، ادھر محمد علی کو اصرار تھا کہ پورا شام، فلسطین کا ایک حصہ اور اطنہ کی اہم بندرگاہ اور ضلع اس کے حوالہ کر دیا جائے، مارچ میں سلطان نے شام، حلب اور دمشق دے کر صلح کرنی چاہی مگر محمد علی نے اپنے مطالبات میں کوئی تخفیف منظور نہیں کی۔

معاہدہ کوتاہیہ: مجبوراً محمود نے ایک دوسرا جنگی بیڑا اور بری فوج روس سے طلب کی، ۵/اپریل کو بارہ ہزار روسی فوج سقوطری کے قریب اتری، یہ دیکھ کر انگلستان اور فرانس کی پریشانی اور بھی زیادہ بڑھی کیونکہ قسطنطنیہ میں روسی اقتدار کا قائم ہو جانا ان کے مصالح کے سراسر خلاف تھا، چنانچہ انھوں نے محمد علی اور محمود دونوں پر صلح کے لیے پھر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور اب کی بار اپنی کوششوں میں کامیاب رہے۔ ۸/اپریل ۱۸۳۳ء کو باب عالی اور محمد علی پاشا کے درمیان کوتاہیہ میں ایک معاہدہ ہوا جس کے رو سے محمد علی کے تمام مطالبات منظور کر لیے گئے۔ ۲۰/مئی کو سلطان نے ایک فرمان کے ذریعہ مصر و کریٹ کے علاوہ بیت المقدس، طرابلس، حلب، دمشق اور اطنہ کی حکومتیں بھی محمد علی کو عطا کیں یعنی تقریباً وہ تمام علاقے اس کو دے دیے گئے جنھیں سلطان سلیم اول کی فتوحات نے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا تھا۔

معاہدہ خونکار اسکلہ سی: قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے اب روسی فوجوں کی ضرورت نہ تھی، لیکن ان کی واپسی سے قبل باب عالی کو روس کے ساتھ ایک جارحانہ اور مدافعانہ معاہدہ کرنا پڑا جو معاہدہ خونکار اسکلہ سی (۸/جولائی ۱۸۳۳ء) کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ سے روس کو دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا ایک قانونی حیلہ ہاتھ آگیا، اس کی ایک نہایت اہم خفیہ دفعہ یہ تھی کہ روس کے مطالبہ پر دردانیال دوسرے ملکوں کے جنگی بیڑوں کے لیے بند کر دیا جائے گا، روس کے جنگی جہازوں کو باسفورس اور دردانیال سے گذرنے کی عام اجازت دی گئی۔

محمد علی سے دوبارہ جنگ: معاہدہ کوتاہیہ کے بعد صرف چند سال تک محمد علی سے صلح رہی، ۱۸۳۹ء میں جنگ پھر شروع ہوگئی، محمود کے لیے شام اور فلسطین کے علاقوں میں محمد علی کے منصوبے تشویش کا باعث ہو رہے تھے، دوسری طرف محمد علی حکومت خود اختیاری سے کم پر قانع نہ تھا اور جو ولایتیں اسے دی گئی تھیں ان کا خود مختار فرماں روا بننا چاہتا تھا، دونوں اپنی جگہ غیر مطمئن تھے اور آئندہ جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے۔

ابتدا محمد علی نے کی، ۱۸۳۸ء میں جب وہ اپنی تیاریاں مکمل کر چکا تو باب عالی میں سالانہ خراج بھیجنے سے انکار کر دیا، یہ گویا مکمل خود مختاری کا اعلان تھا اس کے بعد حرم نبوی ﷺ کی حفاظت کے لیے جو ترکی دستہ مقرر تھا اسے برطرف کر کے اس نے اپنا عربی دستہ وہاں متعین کر دیا، یہ سلطان کی فرماں روائی سے آزاد ہونے کا دوسرا اعلان تھا، محمود نے اس کے پاس حکم بھیجا کہ ترکی دستہ حرم نبوی ﷺ میں پھر متعین کر دیا جائے، خراج کا بقایا ادا کر دیا جائے اور ولایت مصر پر محض ایک والی کی حیثیت سے حکمرانی کی جائے لیکن محمد علی نے ان میں سے ہر حکم کی تعمیل سے انکار کیا، اس پر محمود نے ایک فوج حافظ پاشا کی قیادت میں شام پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی اور قپودان احمد فوضی پاشا کو جنگی بیڑے کے ساتھ اس کی مدد کے لیے مامور کیا، ۲۵/ جون ۱۸۳۹ء کو نزیب کے مقام پر حافظ پاشا اور ابراہیم پاشا کا مقابلہ ہوا، عثمانی فوج کے پورے پورے دستے جن کے غدار افسر محمد علی سے رشوت لے چکے تھے جنگ کے درمیان ہی میں دشمن سے جا ملے، جو باقی رہ گئے تھے وہ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے اور منتشر ہو گئے، پورا توپخانہ، تمام سامان رسد اور اسلحہ ابراہیم پاشا کے ہاتھ آیا۔

عثمانی بیڑے کی سرگذشت اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور عبرت انگیز تھی، بجائے اس کے کہ احمد فوضی پاشا شام پہونچ کر حافظ پاشا کی مدد کرتا وہ اپنے جہازوں کو لیے ہوئے سیدھا اسکندریہ چلا گیا اور وہاں ۱۳/ جولائی کو پورا بیڑہ محمد علی کے حوالہ کر دیا، غداری کی ایسی عبرت انگیز مثال تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔

محمود کی وفات: لیکن قبل اس کے کہ ان واقعات کی اطلاع اس تک پہنچے یکم جولائی ۱۸۳۹ء کو محمود اپنی زندگی کے آخری مرحلے سے فارغ ہو چکا تھا، موت کی دستگیری نے ان روح فرسا حادثات کے صدمہ سے بچا لیا۔

محمود کی عظمت: عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سے زندگی کے آخری لمحہ تک محمود کو گوناگوں مشکلات و مصائب کا سامنا رہا، غیروں سے زیادہ اپنوں نے دشمنی کا

ثبوت دیا اور مخالفت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن سلطنت کی خدمت و اصلاح کا فرض جو اس نے اپنے لیے مقرر کر لیا تھا اس کی انجام دہی سے تمام مصیبتوں اور مخالفتوں کے باوجود وہ کسی وقت بھی غافل نہ رہا۔ اصلاحات کی جو اسکیم اس نے مرتب کی تھی اس پر لڑائیوں اور بغاوتوں کی کثرت سے اس کی حیات میں پوری طرح عمل درآمد نہ ہو سکا اور یہ کام اس کے فرزند و جانشین سلطان عبدالمجید خاں کے لیے ملتوی رہا، تاہم جن اصلاحات کو وہ جاری کر سکا وہ بھی اپنی اہمیت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ اس کے نام کو بقائے دوام کی سند دے چکی ہیں۔

محمود کا سب سے بڑا کارنامہ ینی چری کا استیصال ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ینی چری صرف فوجی اصلاحات کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ ہر قسم کی اصلاحات کو بری نظر سے دیکھتے تھے، کیوں کہ موجودہ نظام کی ابتری ہی میں انھیں اپنا فائدہ دکھائی دیتا تھا، برخلاف اس کے محمود پر یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو چکی تھی کہ جب تک حکومت کے ہر شعبہ میں بنیادی اصلاحات جاری نہ ہوں گی سلطنت عثمانیہ روز بروز تباہی و بربادی سے قریب ہوتی جائے گی، یہی یقین تھا جس نے اصلاحات کے جاری کرنے میں اسے اس قدر متشدد بنا دیا تھا، جو شخص ان کی نکتہ چینی یا مخالفت کرتا اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔ بکتاشی درویش ینی چری کے شروع سے حامی تھے، ینی چری کی طرح یہ لوگ بھی اصلاحات کے مخالف تھے، ان کے استیصال کے بعد درویشوں نے اپنے مذہبی اثر سے قسطنطنیہ کے باشندوں کو ابھارنے کی کوشش کی، محمود نے اس فرقہ کو خلاف قانون قرار دے کر جلاوطن کر دیا اور ان کے تکیوں کو برباد کر ڈالا، بکتاشیوں کے تین بڑے بڑے پیشوا شرعی فتویٰ کی بنا پر قتل کر دیے گئے۔

ینی چری کو ختم کرنے کے بعد محمود نے قدیم فوجی نظام کو منسوخ کر دیا، چنانچہ سپاہی، سلحدار، علوفہ جی اور دوسری قدیم فوجیں ختم کر دی گئیں اور ان کی جگہ نئی فوجیں جو یورپ کے فوجی نظام کے مطابق مرتب اور مسلح کی گئی تھیں قائم کی گئیں، اس نے اسی

سلسلہ میں نظامِ جاگیری کو بھی منسوخ کر دیا، جس میں بہت زیادہ ابتری پھیلی ہوئی تھی، تیمار اور زعامت کی جاگیریں یا تو ضبط کر لی گئیں یا صرف جاگیرداروں کی مدت حیات تک کے لیے چھوڑ دی گئیں اور زمینوں کی جو آمدنی اب تک جاگیرداروں کو ملا کرتی تھی وہ اب سرکاری خزانہ کو منتقل کر دی گئی، نظامِ جاگیری کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر درہ بے تقریباً ہر صوبہ میں چھوٹے چھوٹے خود مختار فرماں روا بن بیٹھے، ان کی قوت کے توڑنے میں سخت دشواریاں پیش آئیں اور برسوں لگ گئے، اکثر بغاوتیں بھی ہوئیں لیکن محمود کے عزم میں کوئی فرق نہ آیا، بالآخر اسے کامیابی ہوئی، یہاں تک کہ پوری سلطنت میں جزیرہ قبرص ہی ایک ایسا مقام رہ گیا جہاں کے درہ بے اپنے سابق اختیارات کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔

اب تک جو لوگ قتل یا جلاوطن کیے جاتے تھے، ان کی ساری املاک سلطنت کے حق میں ضبط کر لی جاتی تھی، اور یہ سرکاری خزانہ کے لیے آمدنی کا ایک معقول ذریعہ تھا جو عدالت ان معاملات کے لیے قائم تھی، چوں کہ اس میں بے عنوانیاں بہت ہونے لگی تھیں اس لیے محمود نے اسے بند کر دیا، اسی طرح اس نے پاشاؤں کے ہاتھ سے سزائے موت کے اختیارات بھی لے لیے جو انھیں اپنے علاقوں میں حاصل تھے اور جن کی بنا پر وہ ملزم کو برأت کا موقع دیے بغیر جب چاہتے قتل کرا دیتے تھے، اس نے ایک فرمان کے ذریعہ اعلان کرا دیا کہ کوئی شخص خواہ وہ ترک ہو یا عیسائی مقدمہ کی باقاعدہ سماعت کے بغیر قتل نہ کیا جائے اور ہر ملزم کو اپیل کا حق دیا جائے کہ پہلے وہ قاضی عسکر کی عدالت میں اسے پیش کرے اور اگر وہاں بھی فیصلہ اس کے خلاف ہو تو خود سلطان کے حضور میں اپیل کرے۔

سلیمان اعظم کے وقت سے ایک دستور یہ ہو گیا تھا کہ سلاطین نے دیوان میں آنا ترک کر دیا تھا، جہاں کی ساری کارروائی صدر اعظم کی صدارت میں ہوا کرتی تھی، سلطنت عثمانیہ کے منجملہ دیگر اسباب زوال کے ایک سبب یہ بھی تھا، محمود نے اس دستور کو توڑا اور پابندی کے ساتھ دیوان میں آنا شروع کیا۔

اوقاف کے انتظام میں بڑی بے عنوانیاں ہو رہی تھیں، اس لیے محمود نے ان

جائدادوں کو سرکاری نگرانی میں لے لیا۔

فروری ۱۸۳۴ء میں ایک فرمان شائع کر کے محمود نے ان ٹیکسوں کو منسوخ کر دیا جو سرکاری حکام دورہ کے زمانہ میں صوبوں کے باشندوں پر مدت سے لگاتے آئے تھے، اسی فرمان میں ششماہی دو قسطوں کے علاوہ محاصل کی دوسری تمام وصولی خلافِ قانون قرار دی گئی، جزیہ کی تشخیص اور وصولی میں بھی سرکاری عمال کی تعدیوں سے اکثر شکایتیں پیدا ہوتی رہتی تھیں، محمود نے قدیم طریقہ کو منسوخ کر کے یہ کام ایک مجلس کے سپرد کر دیا، جس کے ارکان قاضی، صوبہ کا گورنر اور اعیان یعنی ہر ضلع کے عیسائیوں کے بلدی سردار مقرر کیے گئے، مالیات میں اس نے اور بھی متعدد اصلاح جاری کیں، اس کی قطع و برید سے خود قصر سلطانی بھی نہ بچ سکا، چنانچہ محل کے تمام بے کار اور غیر مفید عہدہ دار برطرف کر دیے گئے۔

ان اہم اصلاحات کے علاوہ محمود نے لباس میں بھی بعض نمایاں اصلاحیں کیں مثلاً عمامہ کی بجائے ترکی ٹوپی پہننا، سلطنت کے ہر حصہ میں ضروری قرار دیا اور خود فرانسیسی لباس اختیار کر کے دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی، فوج کے لیے یوروپین لباس پہلے ہی جاری کیا جا چکا تھا۔

محمود کو تمام رعایا خصوصاً عیسائیوں کا بڑا خیال رہتا تھا، ان کی حالت سے براہ راست آگاہی حاصل کرنے کے لیے اس نے سلطنت کے یورپی علاقوں کا دورہ کیا، ٹرون کیر لکھتا ہے:

> "اس نے مطالبات کا خیر مقدم کیا، شکایات کو سنا، حق تلفی کی دادرسی کی، سب شکووں کو دور کیا اور اپنے اس منشا کو اچھی طرح سے ظاہر کر دیا کہ اس کی تمام رعایا میں بغیر امتیاز قوم و ملت انصاف کی حکمرانی رہے گی۔ (۱)

---

(۱) دولا ٹرون کیر (ترجمہ اردو) ص ۲۶۲

سلطان عبدالمجید خان

۱۲۵۵ھ تا ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء

محمود ثانی کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا عبدالمجید خان سولہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ دولت عثمانیہ کی حالت اس وقت بہت نازک تھی۔ نزیب کی فیصلہ کن شکست کے بعد جس سے ابراہیم پاشا کے لیے قسطنطنیہ کا راستہ صاف ہو گیا تھا، ادھر ترکی کے امیر البحر احمد پاشا غنیم سے مل گیا اور ترکی بیڑہ کو اسکندریہ لے جا کر محمد علی کے سپرد کر دیا۔ یہ خبر اس قدر وحشت اثر تھی کہ نو عمر سلطان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے محمد علی سے صلح کی گفتگو شروع کر دی۔ محمد علی نے صلح کے لیے یہ شرط پیش کی کہ مصر، شام، طرابلس (واقع ایشیائے کوچک) اطنہ اور کریٹ کی پاشائیاں اسے نسلاً بعد نسل تفویض کر دی جائیں اور وعدہ کیا کہ اگر اس کا یہ مطالبہ منظور کر لیا گیا تو وہ ترکی بیڑہ کو سلطان کی خدمت میں واپس کر دے گا۔ دیوان ابھی اس مطالبہ پر غور ہی کر رہا تھا کہ انگلستان، فرانس، روس، آسٹریا اور پرشا کے سفیروں نے محمد علی کی بڑھتی ہوئی قوت کو اپنی حکومتوں کے مصالح کے خلاف دیکھ کر سلطان سے درخواست کی کہ ابھی کوئی جواب نہ دیا جائے، انھوں نے امید دلائی کہ دول عظمیٰ کے اثر سے یہ معاملہ سلطنت عثمانیہ کے مفاد کے مطابق طے کر دیا جائے گا۔ فرانس بظاہر اس تحریک میں شریک تھا لیکن درپردہ وہ محمد علی کا حامی تھا، چنانچہ جب ۱۵؍ جولائی ۱۸۴۰ء کو دولت عثمانیہ، انگلستان، روس، آسٹریا اور پرشا کے

نمایندوں نے لندن میں وہ شرائط طے کرنے چاہے جو محمد علی اور باب عالی کے درمیان صلح کی بنیاد قرار پانے والے تھے تو فرانس نے اس معاہدہ میں شرکت نہیں کی ؛ بہر حال اتحادیوں نے محمد علی کو الٹی میٹم دیا کہ دس روز کے اندر سلطان کی اطاعت قبول کرکے اپنی فوجیں شام سے ہٹا لے، جس کے معاوضہ میں مصری پاشائی اس کی نسل کے لیے اور شام کی پاشائی خود اس کی مدت حیات کے لیے مستقل کر دی جائے گی، ورنہ اگر مدت معینہ کے اندر اس نے یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو شام کی پاشائی سے اسے دست بردار ہونا پڑے گا اور مصری پاشائی بھی صرف اس کی حیات کے لیے محدود کر دی جائے گی، الٹی میٹم میں یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ اگر یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا یا اس کی تعمیل میں تاخیر ہوئی تو اتحادیوں کے بحری بیڑے فوراً مصر اور شام کی ناکہ بندی شروع کر دیں گے، محمد علی کو فرانس سے مدد کی توقع تھی، اس بنا پر اس نے شرائط صلح کو نامنظور کر دیا، چنانچہ انگریزی بیڑہ روس اور آسٹریا کے چند جنگی جہازوں کے ساتھ شام کی طرف بڑھا، ۲۹ ر اگست ۱۸۴۰ء کو بیروت گولہ باری کے بعد فتح ہو گیا اور عثمانی فوجوں نے جو انگریزی جہازوں پر آئی تھیں، مصری دستہ کو وہاں سے نکال کر شہر پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد انگریزی بیڑہ نے عکا پر گولہ باری شروع کی اور ۳ ر نومبر کو وہ بھی فتح ہو گیا پھر یکے بعد دیگرے شام کے دوسرے قلعے بھی محمد علی کے ہاتھ سے نکلتے گئے اور عثمانی فوجوں نے انگریزوں نیز مقامی باشندوں کی مدد سے جو تھوڑے ہی دنوں میں مصری حکومت کی سختی سے گھبرا اٹھے تھے نومبر کے آخر تک پورے شام پر اپنا تسلط قائم کیا۔

محمد علی سے صلح: شام کی فتح کے بعد انگریزی بیڑہ اسکندریہ کی طرف بڑھا، محمد علی کو اس وقت تک اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اتحادیوں کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا، چنانچہ اس نے امیر البحر نیپیر (Napier) سے صلح کی گفتگو شروع کر دی اور ترکی بیڑہ کو واپس کر دینے نیز کینڈیا (کریٹ) اور ان چند ایشیائی علاقوں سے جو ابھی تک اس کے قبضہ میں تھے، اپنی فوجیں ہٹا لینے پر رضامندی ظاہر کی، صلح کی گفتگو میں اتحادیوں کے علاوہ فرانس بھی

شریک ہوا، بالآخر ۲۰ر ستمبر ۱۸۴۱ء کو یہ طے پایا کہ صرف مصر کی پاشائی محمد علی اور اس کے ورثہ کے لیے مستقل کر دی جائے، بقیہ تمام علاقے اس کے قبضہ سے نکال لیے گئے، مصر کی سالانہ آمدنی کا ایک ربع بطور خراج مقرر کیا گیا، جو اسے ہر سال باب عالی میں پیش کرنا تھا، بعد میں چار لاکھ پونڈ سالانہ کی رقم مقرر کر دی گئی، اس کے علاوہ باب عالی کی طلب پر چند بحری اور فوجی دستوں کی فراہمی بھی لازمی قرار دی گئی، اس معاہدہ کے رو سے اس پر یہ پابندی بھی عاید کر دی گئی کہ مصر میں اٹھارہ ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھے۔

محمد علی پاشا اور باب عالی کے معاملات کے طے ہو جانے کے بعد اتحادیوں اور باب عالی کے درمیان ایک علاحدہ معاہدہ ہوا جس کے رو سے ترکی جہازوں کے علاوہ تمام دوسری حکومتوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ دردانیال اور آبنائے باسفورس میں ممنوع قرار دیا گیا، اس کے بعد بارہ سال تک دولت عثمانیہ کو کسی غیر ملکی طاقت سے جنگ پیش نہیں آئی اور امن وسکون کی اس فرصت میں سلطان کو ان اصلاحات کے جاری کرنے کا موقع ملا جن کی ابتدا سلطان محمود ثانی نے کر دی تھی، وقتاً فوقتاً سلطنت کے مختلف حصوں میں شورشیں برپا ہوتی رہیں، لیکن سرلشکر عمر پاشا نے ہر موقع پر انھیں جلد فرو کر دیا۔

خط شریف گلخانہ: سلطان محمود نے اپنی حکومت کے آخری سالوں میں اصلاحات کی ایک مکمل تجویز تیار کر لی تھی لیکن مسلسل جنگوں نے ان کے نفاذ کی مہلت نہ دی، تاہم اپنی وفات سے قبل اس نے وارث سلطنت شہزادہ عبدالمجید کو ان اصلاحات کی اہمیت اچھی طرح سمجھا دی تھی، چنانچہ عبدالمجید نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے چار ہی ماہ بعد اپنے قصر گلخانہ سے سلطان محمود کے تیار کردہ فرمان کا اعلان کیا جو تاریخ میں 'خط شریف گلخانہ کے نام سے مشہور ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے سلطنت عثمانی کا اہم ترین دستور خیال کیا جاتا ہے، اس کا ملخص ترجمہ درج ذیل ہے:

" یہ امر بخوبی معلوم ہے کہ حکومت عثمانیہ کے ابتدائی دور

میں قرآن مجید کے احکام اور سلطنت کے قوانین کا احترام ہمیشہ کیا جاتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کی طاقت وعظمت میں ترقی ہوتی گئی اور بلا استثنا اس کے تمام باشندوں میں بہت زیادہ خوش حالی اور فارغ البالی پھیل گئی۔

ڈیڑھ سو برس سے مسلسل حادثات اور مختلف اسباب سے شرع شریف اور قوانین سلطنت کی پابندی جاتی رہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ قوت اور خوش حالی ضعف اور افلاس سے بدل گئی ہے کیوں کہ جو سلطنت اپنے قوانین کی پابندی ترک کر دیتی ہے اس کا سارا استحکام بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

ہم ابتدائی سے ان امور پر غور کر رہے ہیں اور تخت نشینی کے روز سے آج تک فلاح عامہ، صوبوں کی اصلاح حال اور قومی بار کی تخفیف ہماری توجہ کا مرکز ہے، اگر ہم عثمانی صوبوں کے جغرافی حالات، زمین کی زرخیزی اور باشندوں کی موزونی طبع اور ذکاوت فہم کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں یقین آجائے گا کہ موثر طریقوں کے دریافت اور استعمال کرنے پر امید ہے کہ خدا کی مدد سے خاطر خواہ نتیجہ چند ہی سالوں میں حاصل ہو جائے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مدد اور نبی کریم ﷺ کی دعا پر پورا اعتماد کر کے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ جدید قوانین کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کے صوبوں میں عمدہ نظم و نسق پیدا کرنے کی کوشش کریں، یہ قوانین خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل امور سے متعلق ہوں گے۔

(۱) رعایا کی جان، آبرو اور مال کے کامل تحفظ کی ضمانت۔

(۲) محاصل کی وصولی کا ایک باقاعدہ نظام۔

(۳) فوج کی بھرتی اور اس کی مدت ملازمت کی تعیین کے لیے بھی ایسا ہی باقاعدہ نظام۔

محاصل کی تشخیص کا انتظام نہایت درجہ اہم ہے کیوں کہ سلطنت کو اپنے علاقوں کی حفاظت کرنے میں مختلف اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور فوجوں نیز دوسری ملازمتوں کے لیے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے جس کے حاصل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ رعایا پر چندے لگائے جائیں۔

اگرچہ خدا کی عنایت سے ہماری رعایا کچھ عرصہ سے اجاروں کی مصیبت سے نجات پا چکی ہے جن کو اب تک غلطی سے آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا، تاہم ایک مہلک دستور اب بھی جاری ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں یعنی وہ مراعات جو 'التزامات' کے نام سے مشہور ہیں۔

اس نظام کے تحت صوبہ کا ملکی اور مالی انتظام کسی ایک شخص کی مطلق العنانی کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو بعض اوقات نہایت سخت گیر اور حریص ثابت ہوتا ہے کیوں کہ حاکم اگر نیک نفس ہے تو وہ اپنے فائدے کے علاوہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔

لہٰذا ضروری ہے کہ آئندہ ملت عثمانیہ کے ہر فرد پر اتنا ہی محصول لگایا جائے جتنا اس کی حیثیت کے موافق ہو اور اس سے زیادہ کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ بری اور بحری فوجوں کے اخراجات کی تعیین خاص قوانین کے ذریعہ کر دی جائے، اگرچہ ملک کی حفاظت کا خیال سب پر مقدم ہے اور تمام باشندوں کا فرض ہے کہ اس مقصد کے

لیے سپاہی فراہم کریں، تاہم ضروری ہے کہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے فوجی دستوں کے لیے جو ہر ضلع مہیا کرے قوانین مقرر کردیے جائیں، نیز فوجی سپاہیوں کی مدت ملازمت کم کرکے چار یا پانچ سال کردی جائے، کیوں کہ ضلع کی آبادی کا لحاظ کیے بغیر کسی ضلع سے زیادہ اور کسی سے کم سپاہیوں کا بھرتی کرنا ناانصافی کے علاوہ ملک کی زراعت اور صنعت وحرفت کو ایک مہلک صدمہ پہنچانا ہے، اسی طرح سپاہیوں کو تمام عمر فوجی خدمت میں رکھنے کے لیے ان کے اندر مایوسی پیدا ہوجاتی ہے اور ملک کی آبادی بھی کم ہونے لگتی ہے۔

مختصر یہ کہ ان مختلف قوانین کے بغیر جن کی ضرورت تسلیم کرلی گئی ہے، سلطنت میں نہ قوت رہ سکتی ہے نہ دولت، نہ خوش حالی نہ امن، برخلاف اس کے ان جدید قوانین کی موجودگی سے یہ تمام باتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

لہٰذا آئندہ ہر ملزم کے مقدمہ کی سماعت علانیہ طور پر ہمارے شرعی قانون کے مطابق ہوا کرے گی اور جب تک باضابطہ فیصلہ نہ سنا دیا جائے کسی شخص کو اختیار نہ ہوگا کہ دوسرے کو خفیہ طور پر یا علانیہ زہر دے کر یا کسی دوسرے طریقے سے مار ڈالے۔

کسی کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ دوسرے کی آبرو پر حملہ کرے خواہ وہ کوئی بھی ہو، ہر شخص اپنے ہر قسم کے مال واسباب پر قابض رہے گا اور پوری آزادی کے ساتھ اسے فروخت یا منتقل کرسکے گا کسی کو اس میں مزاحمت کا حق نہ ہوگا، مثلاً کسی مجرم کے بے گناہ ورثا اپنے قانونی حقوق سے محروم نہ کیے جائیں گے اور نہ اس مجرم کا مال واسباب ضبط کیا جائے گا۔

یہ مراعات ہماری تمام رعایا کے لیے خواہ وہ کسی مذہب یا فرقہ سے تعلق رکھتی ہو یکساں طور پر جاری ہوں گی اور وہ بلا استثناء ان سے مستفید ہوگی۔

پس جیسا کہ ہماری مقدس شریعت کے قانون کا تقاضا ہے سلطنت کے تمام باشندوں کو ان کی جان، آبرو اور مال کی نسبت ہماری طرف سے کامل ضمانت عطا کی جاتی ہے۔

دوسرے امور کے لیے چوں کہ ضروری ہے کہ اہل الرائے کے اتفاق سے طے کیے جائیں، اس لیے ہماری مجلس عدلی (Council of Justice) جس میں متعین دنوں میں ہمارے وزرا اور اعیانِ سلطنت بھی شریک ہوا کریں گے، جان و مال کی حفاظت اور محاصل کی تشخیص سے متعلق بنیادی قوانین مرتب کرنے کی غرض سے منعقد ہوتی رہے گی۔ ان مجالس میں ہر شخص اپنے خیالات و آرا کا اظہار آزادی سے کرے گا۔

جو قوانین فوجی ملازمت سے متعلق ہوں گے ان پر مجلس حربی میں بحث ہوگی جس کا اجلاس سر عسکر کے محل میں ہوا کرے گا جس وقت کوئی قانون طے کر لیا جائے گا وہ فوراً ہمارے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس غرض سے کہ وہ ہمیشہ کے لیے قائم اور قابل نفاذ ہو جائے ہم اس کی منظوری اپنے دستِ خاص سے اس کے اوپر لکھ دیں گے۔

چونکہ ان قوانین کا مقصد تمام تر مذہب، حکومت، قوم اور سلطنت کا احیا ہے، اس لیے ہم عہد کرتے ہیں کہ کوئی بات ایسی نہ کریں گے جو ان کے مخالف ہو۔

اپنے اس عہد کی ضمانت کے طور پر ہمارا ارادہ ہے کہ اس

فرمان کو سلطنت کے تمام علماء اور اعیان کی موجودگی میں اس ایوان میں رکھ دینے کے بعد جس میں نبی کریم ﷺ کے تبرکات رکھے ہوئے ہیں قادر مطلق کے نام پر خود بھی اس کی پابندی کا حلف لیں اور علماء و اعیان کو بھی اس کا حلف دلوائیں۔

اس کے بعد علماء یا اعیان میں سے کوئی شخص یا کوئی اور جو بھی ان قوانین کی خلاف ورزی کرے گا اسے بلا لحاظ اس کے عہدہ یا شہرت کے وہ سزا دی جائے گی جو جرم کے ثابت ہونے کی حالت میں مقرر ہے۔ اس کے لیے تعزیری قوانین کا ایک مجموعہ منضبط کیا جائے گا۔

چونکہ آج سے سلطنت کے تمام عہدہ داروں کو معقول تنخواہیں دی جائیں گی، اور جن لوگوں کی خدمات کا معاوضہ اس وقت کافی نہیں ملتا انہیں بھی ترقی دے دی جائے گی، اس لیے رشوت ستانی کے خلاف جس کی ممانعت قوانین الٰہی میں آئی ہے اور جو زوال سلطنت کے خاص اسباب میں سے ایک سبب ہے، سخت قانون نافذ کیا جائے گا۔

ان قوانین سے چونکہ قدیم دستوروں کی مکمل تجدید ہوتی ہے اور وہ بالکل بدل جاتے ہیں، اس لیے یہ فرمان عالی قسطنطنیہ اور ہماری سلطنت کے تمام شہروں میں شائع کر دیا جائے گا اور حلیف طاقتوں کے تمام سفیروں کو جو قسطنطنیہ میں مقیم ہیں اس کی نقلیں باضابطہ طور پر بھیجی جائیں گی تاکہ وہ ان قوانین کی مراعات کے شاہد رہیں جو خدا کے فضل و کرم سے ہمیشہ قائم رہیں گی۔

خدائے قدیر ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے جو لوگ ان قوانین کے خلاف کوئی بات کریں ان پر عذاب الٰہی نازل ہو اور وہ

ہر قسم کی خوشی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں۔"(۱)

دستور ثانی ۱۸۵۶ء: ۲۱ فروری ۱۸۵۶ء کو سلطان عبدالمجید نے حکومت عثمانیہ کے دوسرے اہم دستور کا اعلان کیا، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

> "تمام رعایا کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ضمانت جو "خط شریف گلخانہ" میں کی گئی ہے اس کی توثیق کی جاتی ہے۔ اس باب میں رعایا کے مراتب و مذاہب میں کسی قسم کا امتیاز جائز نہ ہوگا۔
>
> ان تمام حقوق و مراعات کی جو نصاریٰ اور سلطنت کے دوسرے فرقوں کو دیے گئے ہیں از سر نو توثیق کی جاتی ہے، ان حقوق و مراعات پر بلا تاخیر نظر ثانی کر کے زمانہ اور سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق انھیں ترقی دی جائے گی اور اس غرض سے بطریق کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی، جو مذکورہ بالا اصلاحات پر بحث کر کے اپنی رائے باب عالی میں پیش کرے گی، سلطان محمد فاتح اور اس کے جانشینوں نے جو حقوق بطریق کو عطا کیے تھے ان میں اس جدید حق کا اضافہ کیا جائے گا اور آئندہ بطریق کا انتخاب تمام عمر کے لیے ہوا کرے گا۔
>
> نصاریٰ اور دوسرے فرقوں کے بطریقان، اسقفوں اور مذہبی عہدہ داروں کو باب عالی کے تجویز کردہ طریقہ کے مطابق وفاداری کا حلف لینا پڑے گا۔
>
> وہ تمام محصول اور چندے جو مختلف فرقوں کے پادری اپنی جماعتوں سے وصول کیا کرتے تھے ممنوع قرار دیے جاتے ہیں، مقررہ تنخواہیں بطریقوں، اسقفوں اور تمام چھوٹے بڑے مذہبی عہدہ داروں کو

---

(۱) کریسی جلد ۲ ص ۳۵۲-۵۵

ان کے مراتب اور خدمات کے لحاظ سے دی جائیں گی، پادریوں کی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

موجودہ کلیساؤں، مدرسوں، ہسپتالوں اور قبرستانوں کی مرمت کی عام اجازت ہے لیکن اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا ہسپتال کے تعمیر کرنے کی ضرورت ہوگی اور بطریق یا اس فرقہ کا مذہبی پیشوا اسے منظور کرے گا تو جدید تعمیر کا نقشہ باب عالی میں پیش کیا جائے گا، اگر کوئی وجہ مانع نہ ہوگی تو سلطان نقشہ کو ملاحظہ فرما کر تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا۔

ہر فرقہ کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

وہ تمام القاب وامتیازات جن سے رعایا کے بعض طبقے اعلیٰ اور بعض ادنیٰ شمار ہوتے ہیں ہمیشہ کے لیے شاہی دفتر سے خارج کیے جاتے ہیں، اسی طرح عہدہ داروں اور عام لوگوں کو بھی دل آزار اور اہانت آمیز کلمات کے استعمال سے سختی سے روکا جاتا ہے، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے سزا کے مستوجب ہوں گے۔

چونکہ تمام مذاہب کو آزادی حاصل ہے، اس لیے کوئی شخص اپنے مذہب کی وجہ سے ستایا نہ جائے گا اور نہ کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

ملکی اور فوجی عہدے تمام رعایا کے لیے یکساں طور پر کھلے رہیں گے تقرر صرف قواعد وضوابط کے مطابق اور قابلیت کی بنا پر ہوگا۔

ہر فرقہ کو علوم وفنون کے مدارس قائم کرنے کی اجازت ہے، البتہ نصاب تعلیم اور اساتذہ کا انتخاب ایک مخلوط مجلس کے زیر نگرانی ہوگا

جو باب عالی کی طرف سے مقرر کی جائے گی۔

وہ تمام مقدمات جن کا تعلق تجارت یا فوجداری سے ہوگا اور جن میں فریقین مختلف فرقوں کے ہوں گے مخلوط عدالتوں میں پیش کیے جائیں گے اور ان کا اجلاس برسر عام ہوا کرے گا، صوبوں اور سنجقوں کے دیوانی کے مقدمات بھی مخلوط عدالتوں میں وکیل اور قاضی کی موجودگی میں پیش ہوں گے اور ان عدالتوں کا اجلاس بھی برسر عام ہوگا۔

جن مقدمات میں فریقین ایک ہی فرقہ کے ہوں گے یا جو مقدمات عدالت سے متعلق ہوں گے وہ فریقین کی خواہش کے مطابق یا ان کے بطریق کے سامنے پیش ہوں گے یا ان کی قومی مجلس کے۔

ایک ضابطہ تجارت و ضابطہ فوجداری نیز وہ تمام قواعد و ضوابط جو مخلوط عدالتوں سے متعلق ہیں حتی الامکان جلد از جلد شائع کر دیے جائیں گے اور سلطنت عثمانیہ میں جتنی زبانیں مستعمل ہیں ان سب میں ان کا ترجمہ کر دیا جائے گا۔

قید خانوں اور حوالاتوں کی اصلاح کی جائے گی اور معمولی جرائم کے مجرموں کے لیے نئے ضابطے مرتب کیے جائیں گے، علاوہ ان سزاؤں کے جو باب عالی کے ضابطہ پولیس کے رو سے مقرر ہوں گی اور تمام ایذائیں یکسر منسوخ کی جاتی ہیں، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی۔

چونکہ محصولوں کے عائد کرنے میں مساوات برتی جائے گی، اس لیے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرح عیسائی اور دوسرے فرقے کے لوگ بھی فوج میں داخل ہوں لیکن انھیں فوجی خدمات کے معاوضہ میں نقد رقم پیش کرنے کی اجازت بھی حاصل رہے گی۔

مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں کو بھی فوج میں بھرتی کرنے کے ضوابط مرتب کر کے جلد شائع کر دیے جائیں گے۔

صوبوں کی مجلسوں میں اصلاح کی جائے گی تاکہ انتخابات بہتر طریقہ پر ہو سکیں اور باشندوں کی آزاد اور صحیح رائے معلوم ہو سکے۔

چونکہ تجارتی معاملات اور غیر منقولہ جائدادوں کے قوانین تمام رعایا کے لیے یکساں ہیں اس لیے باب عالی جب غیر حکومتوں سے کوئی ایسا معاملہ کرے گا جس کے رو سے غیر ملکی باشندوں کو سلطنت کے ان قوانین کو تسلیم کر کے اسی حساب سے محصول ادا کرنا ضروری ہوگا جس حساب سے ملکی باشندے ادا کرتے ہیں تو ایسی صورت میں غیر منقولہ جائدادوں کی ملکیت حاصل کرنے کا حق بھی غیر ملکی باشندوں کو عطا کیا جائے گا۔

ٹھیکہ داروں کی وساطت سے عشر اور دوسرے محصولوں کے وصول کرنے کا جو طریقہ اب تک رائج تھا وہ موقوف کیا جاتا ہے، آئندہ جہاں تک ممکن ہوگا حکومت کے عہدہ دار براہ راست وصول کیا کریں گے۔

مقامی محصولوں کی تشخیص حتی الامکان اس طرح کی جائے گی کہ پیداوار اور تجارت کی ترقی کو نقصان نہ پہنچے۔

صوبوں میں محصول ان امور کے لیے عاید کیے جائیں گے جو سب کے لیے مفید ہوں مثلاً سڑکوں کی تعمیر جو اندرون ملک کے علاوہ سمندر کے ساحل تک چلی جائیں گی۔

ہر عہدہ دار کی تنخواہ متعین کر دی جائے گی۔

عیسائی اور دوسرے فرقوں کے معاملات کی نگرانی کے لیے

> ایک ایک افسر مقرر ہوگا جو اپنے مشوروں سے اسٹیٹ کونسل کو مدد دے گا، یہ افسر صدر اعظم کی مجلس وزرا میں سے منتخب کیے جائیں گے، ان کا تقرر ایک سال کے لیے ہوا کرے گا۔
>
> اسٹیٹ کونسل کے ممبروں کو معمولی اور غیر معمولی اجلاسوں میں اپنی رائے آزادانہ طور پر ظاہر کرنے کی اجازت ہوگی اور ان پر اس کے خلاف کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے گا۔
>
> رشوت ستانی کے قوانین بلا امتیاز تمام رعایا کے لیے یکساں طور پر نافذ ہوں گے، خواہ اس کے مجرم کسی طبقہ یا رتبہ کے اشخاص ہوں۔
>
> باب عالی مالی اعتبار کے قائم کرنے میں حتی الامکان پوری کوشش کرے گا اور جن چیزوں سے اس اعتبار کو تقویت ہوتی ہے مثلاً بنک وغیرہ ان کو فروغ دے گا اور ان کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کرے گا۔
>
> باب عالی ملکی پیداوار کے نقل وحمل کے لیے سڑکیں اور نہریں تعمیر کرائے گا اور تمام رکاوٹوں کو دور کرکے زراعت کی ترقی میں آسانیاں بہم پہنچائے گا۔"(۱)

دیگر اصلاحات: مذکورہ بالا اصلاحات کے علاوہ سلطان عبدالمجید نے بعض دوسری اہم اصلاحات بھی جاری کیں، ۱۸۴۶ء کے فرمان کے رو سے ایک مجلس تعلیم عامہ مقرر ہوئی، ایک جدید یونی ورسٹی کا قیام طے پایا، تعلیم کی نگرانی علما کے ہاتھوں سے نکال کر مجلس تعلیم کے سپرد کردی گئی اور جو مکاتب مسجدوں میں قائم تھے انھیں بھی اس مجلس کے زیر اہتمام ابتدائی مدارس بنادیا گیا، دوسری اہم اصلاح بردہ فروشی کے متعلق ہوئی چونکہ بردہ فروشی کا رواج تمام سلطنت میں عام طور پر تھا، اس لیے دفعتاً اس کو ممنوع قرار دینے میں

---

(۱) کریسی جلد ۲ ص ۲ - ۲۵۷

عام برہمی کا اندیشہ تھا مگر باب عالی نے ایسے قوانین نافذ کر دیے جن سے بردہ فروشی میں پیش از پیش مشکلات پیدا ہو گئیں، علاوہ بریں ۱۸۵۷ء میں سلطان نے ایک فرمان جاری کر کے اپنے حدود سلطنت میں دوسرے ملکوں سے غلاموں کا لانا بھی ممنوع قرار دے دیا، اس فرمان پر اگر سختی سے عمل درآمد شروع کر دیا جاتا تو نہ صرف بردہ فروشی کا استیصال ہو جاتا بلکہ غلاموں اور لونڈیوں کی تعداد بھی کم ہوتے ہوتے ایک روز سلطنت عثمانیہ سے بالکل مفقود ہو جاتی کیونکہ ترکی میں یہ دستور عرصہ سے چلا آتا تھا کہ چند سال کی خدمت کے بعد غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کر دیتے تھے اور چونکہ اب جنگ میں اسیروں کے حاصل ہونے کا امکان کم رہ گیا تھا اور دوسرے ملکوں سے خرید کر لانا خلاف قانون تھا، اس لیے غلامی کا سلسلہ جلد منقطع ہو جاتا۔

فوجی اصلاحات: سب سے زیادہ اہم فوجی اصلاحات تھیں، "خط شریف گلخانہ" کے اعلان کے بعد ہی فوج کی بھرتی کا باقاعدہ نظام قائم کر دیا گیا تھا لیکن نظام جدید کے مطابق فوج کی ترتیب ۱۸۴۳ء میں مکمل ہوئی جب رضا پاشا سر عسکر تھا، فوج دو حصوں میں تقسیم کی گئی، ایک نظام دوسری ردیف، نظام وہ فوج تھی جو میدان جنگ میں رہا کرتی تھی ردیف وہ تھی جو میدان جنگ کی معینہ مدت ختم کرنے کے بعد آئندہ ضرورتوں کے لیے مستعد رکھی جاتی تھی، ہر ضلع سے ایک مقررہ تعداد فوج کی لی جاتی تھی، جس میں بیس سال سے زیادہ عمر کے لوگ بھرتی کیے جاتے تھے، اس تعداد میں ایک حصہ رضا کاروں کا ہوتا تھا بقیہ حکومت کی طرف سے بھرتی ہوتے تھے، نظام فوج میدان جنگ میں پانچ سال رکھی جاتی تھی، اس کے بعد سپاہیوں کو وطن واپس جانے کی اجازت دے دی جاتی تھی لیکن انھیں واپسی کے بعد بھی سات سال تک اپنے ضلع کی ردیف میں شامل رہنا پڑتا تھا، کسی جنگ یا ضرورت ناگہانی کے موقع پر ردیف کو پھر طلب کیا جا سکتا تھا۔

اصلاحات کا اثر: سلطنت عثمانیہ ان تمام اصلاحات کی جس حد تک ضرورت تھی اس کا اندازہ ان بے نوائیوں سے ہو سکتا ہے جو حکومت کے ہر شعبہ میں روز بروز بڑھتی جاتی

تھیں اور اختلال و بدنظمی پیدا کر کے سلطنت کی بنیادوں کو متزلزل کر رہی تھیں، لیکن چونکہ ان اصلاحات سے غیر متدین اور ظالم عہدہ داروں کو نقصان پہنچتا تھا اور فوج کی سرکشی کا بھی سدباب ہو رہا تھا اس لیے ان کے خلاف مختلف صوبوں مثلاً البانیا، کردستان اور بوسنیا وغیرہ میں بغاوتیں برپا ہوگئیں، خوش قسمتی سے باب عالی کی خدمت کے لیے عمر پاشا کا سا بے نظیر جنرل موجود تھا جس کی غیر معمولی شجاعت اور دانش مندی نے نہ صرف ان بغاوتوں کا استیصال کیا بلکہ باغیوں کو اصلاحات کے قبول کرنے پر بھی راضی کر لیا، اس طرح محمد علی سے صلح کے بعد سے جنگ کریمیا کے شروع ہونے تک باب عالی کو بارہ سال کی مہلت اصلاحات کے جاری کرنے کے لیے مل گئی، اس مدت میں سلطنت کی تجارتی اور عام خوش حالی میں نمایاں طور پر روز افزوں ترقی ہوتی گئی، جس کے آثار سلطان محمود کی حکومت کے آخری سالوں میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے، چنانچہ ۱۸۵۳ء میں لارڈ پامرسٹن (Palmerston) نے نہایت پرزور الفاظ میں اپنی اس رائے کا اظہار پارلیمنٹ میں کیا کہ جتنی ترقی و اصلاح سلطنت عثمانیہ نے گذشتہ سالوں میں کی ہے کسی دوسری حکومت نے نہیں کی۔ (۱)

دولت علیہ کی یہ ترقی روس کی نگاہوں میں کھٹک رہی تھی، لیکن سلطان عبدالمجید کی دانش مندانہ روش نے کسی آویزش کا موقع نہ دیا، البتہ ۱۸۴۹ء میں جب روس اور آسٹریا کی متحدہ فوجوں نے ہنگری کی جنگ آزادی کا خاتمہ کر دیا اور ہنگری کے بہت سے فوجی سردار بھاگ کر ترکی میں پناہ گزیں ہوئے تو روس اور آسٹریا دونوں نے باب عالی کو الٹی میٹم دیا کہ ان سرداروں کو فوراً سلطنت عثمانیہ سے نکال دیا جائے ورنہ جنگ ناگزیر ہو جائے گی، یہ موقع بہت نازک تھا، باب عالی جنگ کے لیے تیار نہ تھا، اس کی فوجوں کی تنظیم نظام جدید کے مطابق ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی، تاہم سلطان نے گوارا نہ کیا کہ ان سرداروں کو جنھوں نے اس کی سلطنت میں آکر پناہ لی تھی دشمنوں کے حوالہ کر دے، اس

---

(۱) کریسی جلد ۲ ص ۲۶۵

نے روس اور آسٹریا کی دھمکیوں کے باوجود ان سرداروں کو حوالہ کرنے سے انکار کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ روس اور آسٹریا نے باب عالی سے سفارتی تعلقات منقطع کر دیے اور کچھ دنوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگ بہت جلد شروع ہو جائے گی، لیکن انگلستان اپنے سفیر سر اسٹراٹفرڈ کیننگ (Sir Stratford Canning) کے مشورہ کے مطابق جو قسطنطنیہ میں مقیم تھا اور اپنے اخلاق و فراست کی وجہ سے سلطان کے مزاج میں بہت کچھ دخل رکھتا تھا، یہ اعلان کیا کہ اگر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کیا گیا تو انگلستان اس کی مدد کرے گا اور اس اعلان کے بعد نومبر ۱۸۴۹ء میں ایک برطانوی بیڑہ دولت علیہ کی حمایت کے لیے دردانیال میں پہنچ بھی گیا، روس اور آسٹریا نے انگلستان کا یہ طرز عمل دیکھ کر جنگ چھیڑنا مناسب نہیں خیال کیا اور دونوں نے باب عالی سے سفارتی تعلقات جو کچھ دنوں کے لیے منقطع ہو گئے تھے پھر قائم کر لیے۔

سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویز: اس واقعہ سے روس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دولت عثمانیہ کے خلاف کوئی قدم انگلستان کی حمایت کے بغیر کامیابی کے ساتھ اٹھایا نہیں جا سکتا، لہٰذا نکولس نے اب حکومت برطانیہ کو ملانے کی تدبیر شروع کی، اس سے قبل بھی ۱۸۴۴ء میں جب وہ انگلستان گیا تھا تو برطانوی وزیروں سے ترکی کے مستقبل کے متعلق گفتگو کی تھی، لیکن چونکہ اس گفتگو کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا اس لیے اب اس نے زیادہ موثر طریقہ پر کوشش شروع کیا اور اوائل ۱۸۵۳ء میں سر ہملٹن سیمور (Sir Hamilton Seymour) برطانوی سفیر مقیم سینٹ پیٹرس برگ سے خود گفتگو کر کے انگلستان اور روس کے درمیان سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی ایک تجویز پیش کی، اس نے سیمور اور وزارت برطانیہ کو یقین دلانا چاہا کہ "یورپ کا مرد بیمار" عنقریب دم توڑنے والا ہے، اس لیے بجائے اس کے کہ اس کی موت کا ناگہانی واقعہ اور اس کے ترکہ کی تقسیم بین الاقوامی آویزش کا سبب بنے مناسب ہے کہ اس مسئلہ کا تصفیہ پہلے ہی کر لیا جائے، مصر اور کریٹ چونکہ انگلستان کے لیے زیادہ موزوں تھے، اس لیے نکولس نے یہ دونوں صوبے اسی کے حصہ میں رکھے،

روس کے لیے مولڈیویا، والیچیا، سرویا اور بلغاریہ کا قبضہ زیادہ مناسب معلوم ہوا، چنانچہ نکولس نے سیمور سے کہا کہ "مولڈیویا اور والیچیا کی ریاستیں حقیقتاً میرے زیر تحفظ ایک خود مختار مملکت ہیں، ان کی حیثیت بدستور قائم رہے گی، سرویا کو بھی ویسی ہی دستور حکومت دے دیا جائے، اسی طرح بلغاریہ کو بھی" سب سے زیادہ اہم قسطنطنیہ کا مسئلہ تھا، نکولس نے صاف الفاظ میں کہا کہ قسطنطنیہ پر نہ انگلستان کا قبضہ ہونے پائے گا نہ فرانس کا نہ کسی دوسری بڑی طاقت کا، خود روس کے متعلق بھی اس نے یہی فیصلہ کیا، البتہ اتنا کہے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر ضرورت مجبور کرے گی تو چند دنوں قسطنطنیہ پر روسی فوجیں قابض رہیں گی، غرض اس تمام گفت و شنید کا خلاصہ یہ تھا کہ روس اور انگلستان مل کر سلطنت عثمانیہ پر جلد از جلد حملہ کر دیں اور اسے آپس میں بانٹ لیں، لیکن حکومت برطانیہ نے زار کی یہ تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا، نکولس بہر حال حملہ کی پوری تیاریاں کر چکا تھا اور صرف موقع کا منتظر تھا۔

جنگ کریمیا کے اسباب: یہ موقع جلد ہاتھ آ گیا، فلسطین کے مقامات مقدسہ کا مسئلہ ۱۸۵۰ء میں پھر سامنے آ گیا تھا، فرانس اور روس لاطینی اور یونانی کلیسا کے عیسائیوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور ہر ایک اپنے کو بیت المقدس اور دوسرے مقامات کے تحفظ کا مستحق قرار دیتا تھا، یہاں تک تو معاملہ زیادہ اہم نہ تھا لیکن ان مقامات کے تحفظ کے علاوہ فریقین نے اب ان تمام عیسائیوں کے تحفظ کا دعویٰ بھی پیش کیا جن کا تعلق لاطینی اور یونانی کلیساؤں سے تھا، اس دعوے کے قبول کرنے کے یہ معنی تھے کہ سلطان یورپ میں اپنی نصف سے زیادہ رعایا کی فرماں روائی کے حق سے دست بردار ہو جاتا۔ چنانچہ باب عالی نے فرانس اور روس کے اس حق کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا، فرانس نے بالآخر یہ تسلیم کیا کہ اسے صرف انہی رومن کیتھولک فرانسیسیوں کے تحفظ کا حق حاصل ہے جو سلطنت عثمانیہ میں مقیم ہیں، لیکن روس اپنے دعوے پر قائم رہا اور شہزادہ مینشی کوف (Menschi Kolf) نے قسطنطنیہ پہنچ کر ان سب عیسائی رعایا کی حفاظت کا مطالبہ پیش

کیا جو کلیسائے یونان کی پیرو اور سلطنت عثمانیہ میں آباد تھی، یہ مطالبہ اس سے قبل بھی روس کی طرف سے دو بار پیش کیا جا چکا تھا، لیکن باب عالی نے انتہائی مصیبتوں کے باوجود اسے کبھی منظور نہیں کیا، ایک بار روس نے اسے صلح نامہ کینارجی کی گفت وشنید کے درمیان پیش کیا تھا، جس سے زیادہ سخت شرائط پر دولت عثمانیہ نے اس سے قبل کوئی صلح نہیں کی تھی پھر دوسری بار یہی مطالبہ ۱۸۰۵ء میں سلطان سلیم کے سامنے پیش کیا گیا اور سلطان کے انکار پر چند ہی دنوں بعد روسی جنرل میکلسن (Michelson) نے مولڈیویا اور والاچیا پر قبضہ کر لیا، یہ دونوں مواقع دولت علیہ کے لیے نہایت نازک تھے مگر اس نے روس کو صاف جواب دے دیا تھا۔ اس مسئلہ کے متعلق باب عالی اور روس کے درمیان جو معاہدات ہو چکے تھے ان کا خلاصہ صرف یہ تھا:

(۱) زائر، پادری اور مسافر محصول ادا کیے بغیر بیت المقدس اور دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کر سکتے ہیں۔

(۲) سفارت کے موجودہ گرجا کے علاوہ قسطنطنیہ کے ایک خاص حصہ میں چند جدید گرجے تعمیر کیے جا سکتے ہیں، اسی قسم کی اجازت اس صلح نامہ میں بھی دی گئی تھی جو ۱۷۴۰ء میں فرانس سے ہوا تھا۔

(۳) شہنشاہ روس نہیں بلکہ باب عالی بدستور سابق سلطنت عثمانیہ میں مذہب عیسوی کا محافظ رہے گا، شہنشاہ روس کو صرف اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ کلیسائے یونان اور اس کے عہدہ داروں کی نسبت باب عالی میں معروضات پیش کرے اور ان معروضات پر توجہ کرنا باب عالی کے لیے صرف دوستی کی بنا پر ضروری ہوگا۔

اعلان جنگ: لیکن روس نے جو مطالبات اب پیش کیے وہ مذکورہ بالا معاہدوں سے بہت زیادہ تھے، سلطان عبدالمجید نے انھیں منظور کرنے سے یکسر انکار کر دیا، اس پر روسی سفیر شہزادہ مین شی کوف فوراً قسطنطنیہ سے روانہ ہو گیا اور باب عالی اور روس کے سفارتی تعلقات منقطع کر دیے گئے، ۳ر جولائی ۱۸۵۳ء کو روسی فوجیں دریائے پرتھ کو عبور کرکے

مولڈیویا اور ولاچیا پر قابض ہو گئیں، یکم اکتوبر کو باب عالی نے بھی اعلان جنگ کر دیا، ترکی فوج نے عمر پاشا کی قیادت میں دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور ۲ رنومبر کو اولٹے نٹزا (Oltenilza) اور ۵ رکو ساٹیٹ (C tatc) کے معرکہ میں روسیوں کو شکست دی، ان معرکوں سے تمام یورپ کو ان اصلاحات کی کامیابی کا اندازہ ہو گیا جو دولت علیہ کے فوجی نظام میں جاری کی گئی تھیں۔

انگلستان اور فرانس کی حمایت: اسی درمیان میں ۲۲ راکتوبر کو انگلستان اور فرانس کے جنگی بیڑے باب عالی کی حمایت میں دردانیال میں داخل ہوئے، صلح کی گفتگو بھی جاری تھی لیکن جب ۳۰ رنومبر کو روسی بیڑے نے سباسٹوپول سے نکل کر دفعۃً ترکی بیڑے پر حملہ کر کے اسے غرق کر دیا جو ایشیائے کوچک کے ساحل پر سینوپ کی بندرگاہ میں لنگر انداز تھا تو انگلستان اور فرانس کو یقین ہو گیا کہ جنگ کے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ اتحادی بیڑے فوراً بحر اسود میں پہنچ گئے اور ۲۸ رمارچ ۱۸۵۴ء کو انگلستان اور فرانس نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، ان حکومتوں نے اپنی فوجیں قسطنطنیہ بھیجیں، جہاں سے وہ وارنا کو روانہ کر دی گئیں تاکہ مولڈیویا اور ولاچیا سے روسی فوجوں کو نکالنے میں ترکوں کی مدد کریں۔

۱۸۵۴ء کے اوائل میں ایک روسی فوج نے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے سلسٹریا کا محاصرہ کر لیا جو کوہ بلقان اور قسطنطنیہ کے درمیان ایک نہایت اہم قلعہ تھا لیکن ترکوں نے موسیٰ پاشا کی سرکردگی میں بڑی شجاعت اور جاں بازی کے ساتھ مدافعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسیوں کو بہت کچھ جان و مال کا نقصان اٹھانے کے بعد آخر کار ۲۵ رجون کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا، اس شکست کے بعد روسی فوج ڈینوب کو دوبارہ عبور کر کے واپس چلی گئی، ترکوں نے تعاقب کیا، محاذ جنگ اب مولڈیویا اور ولاچیا میں قائم ہونے والا تھا کہ حکومت آسٹریا درمیان میں آ گئی، یہ دیکھ کر کہ ان ریاستوں میں روسیوں کا قیام آسٹریا کے لیے خطرہ سے خالی نہیں، اس نے صاف الفاظ میں روس کو متنبہ کر دیا کہ اگر مولڈیویا اور ولاچیا سے فوجیں ہٹا نہ لی جائیں گی تو آسٹریا کو مجبوراً اتحادیوں کا ساتھ دین

بڑے گا، نیز اور دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے تیار نہ تھی، اس نے بادل ناخواستہ اپنی فوجیں ہٹالیں اور دونوں دریائے پرتھ کو عبور کرکے پھر سرحد روس میں واپس چلی آئیں، محاربین کی مفاہمت سے آسٹروی فوجوں کو چند دنوں ان ریاستوں پر قابض رہنے کی اجازت دی گئی۔

سباسٹوپول کی فتح: روس کی بری طاقت کی طرف سے دولت عثمانیہ کو اب کوئی خطرہ نہ تھا لیکن اس کی بحری قوت پر ابھی تک کوئی زد نہیں پڑی تھی، سباسٹوپول کا زبردست بحری اسلحہ خانہ دولت علیہ کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا، اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے کریمیا پر حملہ کرنا ضروری تھا، سباسٹوپول کریمیا کا نہایت مستحکم بندرگاہ تھا، اسے برباد کردینے سے روس کی بحری طاقت پر ایک کاری ضرب پڑ سکتی تھی، اس لیے اتحادیوں نے اب سباسٹوپول کو اپنا مقصود بنایا، ان کی فوجیں یوپٹوریا (Eupatoria) کے قریب ساحل پر اتریں ۱۴؍ستمبر ۱۸۵۴ء کو اس شہر پر قابض ہوگئیں، پھر ۲۰؍ستمبر ۱۸۵۴ء کو جنگ الما (Alma) میں روسی فوج کو شکست دی، جس کے بعد سباسٹوپول کا راستہ کھل گیا، سباسٹوپول کا محاصرہ ایک سال تک قائم رہا اور ۸؍ستمبر ۱۸۵۵ء کو اتحادیوں کی فتح پر ختم ہوا، اس طویل مدت میں فریقین نے شجاعت وجاں بازی کے خوب خوب جوہر دکھائے۔

سقوط قارص: ایشیا میں روسی فوجوں کو پے در پے متعدد فتوحات حاصل ہوئیں لیکن قارص پہنچ کر انہیں رک جانا پڑا اور محاصرہ کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا، ترکوں نے بڑی بہادری کے ساتھ مدافعت کی اور ۲۹؍ستمبر کو جنرل موراویف کی فوج کو زبردست شکست دی، لیکن محاصرہ قائم رہا، چوں کہ باہر سے مدد نہ پہنچ سکی اور سامان رسد بالکل ختم ہو چکا تھا اس لیے مجبور ہوکر محصورین کو ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

صلح کی گفتگو: سباسٹوپول کا محاصرہ ابھی جاری ہی تھا کہ ۲؍مارچ ۱۸۵۵ء کو زار نکولس کا انتقال ہوگیا اور اس کا لڑکا الگزنڈر ثانی تخت نشین ہوا، الگزنڈر نے بھی اگرچہ بالات

گیا تھا کہ وہ بھی انگلستان اور فرانس کے نقش قدم پر چلے گا ادھر سیواسٹوپول کی تسخیر اور اتحادیوں کے بڑھتے ہوئے حوصلوں سے اس کو اندازہ ہو گیا کہ جنگ کو جاری رکھنا روس کے لیے کسی طرح مناسب نہیں، چنانچہ جب آسٹریا کی وساطت سے صلح کی گفتگو پھر شروع ہوئی اور شرائط تصفیہ پر غور کرنے کے لیے ویانا میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تو روس کو بہت جھنجھلاہٹ و تعلل کے بعد راضی ہونا پڑا۔ صلح نامہ کی ترتیب کے لیے پیرس کا مقام منتخب ہوا۔ ۲۵ فروری ۱۸۵۶ء کو دولت عثمانیہ، فرانس، انگلستان، روس، آسٹریا اور سارڈینیا کے نمائندے وہاں جمع ہوئے۔ سارڈینیا جنگ کے آخری دور میں اتحادیوں کا شریک ہو گیا تھا۔ آسٹریا ثالث بالخیر کی حیثیت سے اس کانفرنس کی کارروائیوں میں شروع ہی سے پیش پیش تھا، آخر میں پروشیا کو بھی شریک کر لیا گیا تھا۔ ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد ۲۳ رجب ۱۲۷۲ھ مطابق ۳۰ مارچ ۱۸۵۶ء کو صلح نامہ پیرس مرتب ہوا اور مذکورہ بالا سات حکومتوں کے نمائندوں نے اس پر دستخط کر دیے۔

صلح نامہ پیرس: اس صلح نامہ کی خاص دفعات حسب ذیل تھیں:

(۱) ان حکومتوں نے دولت عثمانیہ کو باضابطہ طور پر مجلس دول یورپ کا رکن بنایا اور اس کی آزادی اور اس کے مقبوضات کی سالمیت کے لیے متحدہ طور پر ضمانت کی۔

(۲) سلطان نے بلا امتیاز نسل و مذہب تمام رعایا کی اصلاح حال کا وعدہ کیا اور یورپین حکومتوں نے صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا مجموعی یا انفرادی طور پر انہیں کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

(۳) بحر اسود تمام قوموں کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیا گیا لیکن جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا، روس اور دولت علیہ کو اس کے ساحلوں پر اسلحہ خانے قائم کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

(۴) وہ تمام علاقے جو دوران جنگ میں فریقین نے فتح کر لیے تھے واپس کر دیے گئے، چنانچہ قارص دولت علیہ کے حوالہ کر دیا گیا اور کریمیا روس کے۔

(۵) ایک بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں دریائے ڈینوب بھی تمام قوموں کے جہازوں کے لیے کھول دیا گیا۔

(۶) جنوبی بسرابیا کا علاقہ جس پر روس نے قبضہ کرلیا تھا، مولڈیویا میں شامل کردیا گیا، مولڈیویا اور والاچیا کی ریاستوں پر باب عالی کی فرماں روائی بدستور قائم رکھی گئی، روس ان ریاستوں کی حمایت کے حق سے جس کا وہ بلا شرکت غیرے دعویدار تھا، دست بردار ہوگیا اور ان کے حقوق کا تحفظ مذکورہ بالا حکومتوں نے مجموعی طور پر اپنے ذمہ لے لیا، ان ریاستوں کو حکومت خود اختیاری کے حقوق عطا کیے گئے، انھیں مذہب، قانون سازی اور تجارت کی پوری آزادی اور ایک قومی مسلح فوج رکھنے کی اجازت دی گئی۔

(۷) سرویا کو بھی یہی حقوق دیے گئے، البتہ قومی فوج رکھنے کی اجازت نہ ملی، اس کے اندرونی معاملات میں باب عالی کی فوجی مداخلت دول یورپ کی اجازت کے بغیر ممنوع قرار دی گئی۔

ضمنی معاہدے: صلح نامہ پیرس کے تکملے کے بعد اسی روز دو معاہدے اور مرتب ہوئے، ایک کے رو سے ۱۸۳۱ء کے معاہدہ کی تجدید کی گئی اور دردانیال اور آبنائے باسفورس میں غیر حکومتوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ بند کردیا گیا، دوسرا صرف زار اور سلطان کے درمیان ہوا جس کی بنا پر ہر فریق کو چھ چھوٹے اسٹیمر اور چار ہلکی کشتیاں بحر اسود کی ساحلی ضروریات کے لیے رکھنے کی اجازت دی گئی، ۱۵/اپریل کو ایک عہد نامہ اور ہوا جس میں برطانیہ، آسٹریا اور فرانس نے مجموعی اور انفرادی طور پر دولت عثمانیہ کی آزادی اور سالمیت کو قائم رکھنے کی ضمانت لی اور عہد کیا کہ صلح نامہ پیرس کے کسی جزو کی خلاف ورزی جنگ کا سبب قرار دی جائے گی۔

صلح نامہ پیرس پر ایک نظر: صلح نامہ پیرس نے بظاہر روس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا، ڈیڑھ سو برس سے اس کے پیش نظر تین خاص مقاصد تھے، جن کے حصول کے لیے وہ مسلسل کوشش کرتا آرہا تھا: (۱) بحر اسود میں اپنی جنگی اور تجارتی برتری قائم کرنا

(۲) بحر روم میں نکلنے کے لیے ایک آزاد اور محفوظ راستہ حاصل کرنا (۳) باب عالی سے اس امر کو تسلیم کرالینا کہ روس کو دولت علیہ کی عیسائی رعایا کے سیاسی اور مذہبی حقوق کی نگہداشت کا حق حاصل ہے، وقتاً فوقتاً فرماں روایان روس خصوصاً زارینہ کیتھرائن خود سلطنت عثمانیہ کی تقسیم اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا خواب بھی دیکھتے آئے تھے، صلح نامہ پیرس نے نہ صرف اس خواب کو پریشان کردیا بلکہ ان مذکورہ بالا منصوبوں کی راہ میں بھی سخت رکاوٹیں پیدا کردیں جو پیٹر اعظم کے زمانہ سے الگزینڈر ثانی کے عہد تک حکومت روس کے اہم ترین مقاصد تھے۔

تاہم یہ رکاوٹیں زیادہ دنوں تک قائم نہ رہیں، ۱۸۷۰ء میں روس نے صلح نامہ پیرس کی خلاف ورزی کا اعلان کرتے ہوئے بحر اسود میں جنگی جہازوں کے ذریعہ اپنا تسلط پھر قائم کرلیا اور ۱۸۷۸ء میں بسرابیا کا وہ علاقہ جو ۱۸۵۶ء میں اس سے لے کر مولڈیویا میں شامل کردیا گیا تھا واپس لے لیا، اس وقت دول عظمیٰ میں سے کسی نے بھی صلح نامہ پیرس کی پروا نہ کی، جس کے رو سے متفقہ طور پر انھوں نے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کی ضمانت کی تھی۔

صلح نامہ پیرس میں دول عظمیٰ نے دو باتوں پر خاص طور سے زور دیا تھا، ایک تو یہ کہ سلطنت عثمانیہ کی آزادی اور اس کے مقبوضات کی سالمیت کا تحفظ کیا جائے گا، دوسری یہ کہ اس کے اندرونی معاملات میں مطلق مداخلت نہ کی جائے گی لیکن بعد کے واقعات نے ظاہر کردیا کہ یہی دو چیزیں تھیں جن کی خلاف ورزی صلح نامہ کے بعد سب سے پہلے کی گئی، بادی النظر میں یورپین حکومتوں کا روس کے جارحانہ اقدام کے خلاف متحدہ ہو جانا دولت عثمانیہ کی حمایت اور ہمدردی پر مبنی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ روس کی بڑھتی ہوئی قوت خود ان کے مفاد کے لیے خطرناک ثابت ہورہی تھی اور اسے قابو میں رکھنا ضروری تھا، چنانچہ جنگ کا خاتمہ جب ان کے حسب دلخواہ ہوگیا تو وہ طلسم بھی ٹوٹنا شروع ہوا جس کا ڈھانچہ صلح نامہ پیرس کی نظر فریب دفعات پر کھڑا کیا گیا تھا، مولڈیویا اور ولاچیا

کی ریاستوں میں اتحاد و استقلال کی تحریک پیدا کی گئی اور ۱۸۵۸ء میں دول یورپ کے زیر حمایت الکزینڈر کوزا (Alexander Couza) ان متحدہ ریاستوں کا پہلا امیر منتخب ہوا، باب عالی نے نزاع کو ختم کر دینے کی غرض سے اس اتحاد و انتخاب کو تسلیم کر لیا، اس کے بعد کریٹ، سرویا، مونٹی نگرو، بوسنیا، ہرزیگووینا اور بلغاریا میں بغاوت کی شورشیں برپا ہوئیں، ان سب علاقوں کو ان حکومتوں میں سے جنھوں نے صلح نامہ پیرس پر دستخط کیے تھے کسی نہ کسی کی حمایت حاصل تھی، چنانچہ دولت علیہ کے مقبوضات کی حفاظت کا جو عہد کیا گیا تھا وہ ان شورشوں کے ذریعہ پورا کیا گیا، اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا وعدہ یوں وفا ہوا کہ ان بغاوتوں کے فرو کرنے کی غرض سے جب عثمانی فوجیں روانہ کی جانے لگیں تو یوروپین حکومتوں نے انھیں روکنے کی کوشش کی. جیسا کہ فرانس اور روس نے ۱۸۵۸ء میں اپنے جہاز مونٹی نگرو کے ساحل پر بھیجے تا کہ عثمانی فوجوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکیں، دول عظمیٰ نے متفقہ طور پر سلطنت عثمانیہ کے استقلال و تحفظ کی ضمانت کی تھی لیکن استقلال و تحفظ ہی کا عذر پیش کر کے انھوں نے اس کے تقریبا تمام یوروپین مقبوضات اس سے علاحدہ کر دیے، انھوں نے دولت عثمانیہ کو مجلس دول یورپ کا رکن بنایا تھا، لیکن رکنیت کے اس اعزاز سے دولت علیہ کو صرف یہ حاصل ہوا کہ اس کے اندرونی معاملات میں یوروپین حکومتوں کی مداخلت روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس کے لیے مصیبتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مختلف شورشیں کریٹ: صلح نامہ پیرس کے بعد سلطان عبدالمجید کی وفات تک کسی غیر حکومت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی لیکن مدبرانِ یورپ کی مداخلت کے باعث سلطنت کے مختلف حصوں میں شورشیں برپا ہوتی رہیں، چنانچہ ۱۸۵۸ء میں کریٹ کے یونانیوں نے علم بغاوت بلند کیا، یہ فتنہ وقتی طور پر رفع کر دیا گیا، لیکن ۱۸۶۶ء میں سلطان عبدالعزیز کے دور حکومت میں زیادہ قوت کے ساتھ پھر ابھرا اور اب کی بار حکومت کو خود اختیاری کے جدید حقوق دے کر باغیوں کو راضی کرنا پڑا۔

جدہ پر گولہ باری: جولائی ۱۸۵۸ء میں جدہ کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا چند مسلمانوں نے فرانسیسی قنصل اور اس کے اسٹاف پر حملہ کر دیا، جس میں قنصل اور اس کا سکریٹری مجروح ہوا اور قنصل کی بیوی ماری گئی، فوراً ہی انگریزی اور فرانسیسی جہاز قسطنطنیہ پہنچے، باب عالی نے اطمینان دلایا کہ مجرموں کو کافی سزا دی جائے گی لیکن چونکہ سزا میں کچھ تاخیر ہوئی اس لیے انگریزی جہاز نے جدہ پہنچ کر نامق پاشا والی مکہ سے جو جدہ آگئے تھے اور انھوں نے مجرموں کو گرفتار کر لیا تھا، مطالبہ کیا کہ مجرموں کو فوراً پھانسی دے دی جائے ورنہ چوبیس گھنٹوں کے بعد گولہ باری شروع کر دی جائے گی، نامق پاشا کو باب عالی کے حکم کا انتظار تھا، اس لیے انھوں نے فوراً پھانسی دینے میں تامل کیا، اس پر انگریزی جہاز نے گولہ باری شروع کر دی، اس اثنا میں اسمٰعیل پاشا عثمانی جہاز کے ساتھ جدہ پہنچ گئے، انھوں نے گولہ باری بند کرا کے مجرموں کی پھانسی کا حکم سنایا، اگر اسمٰعیل پاشا کا جہاز وقت پر نہ پہنچ گیا ہوتا تو جدہ تباہ ہو جاتا اور برطانیہ سے باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی۔

قضیہ لبنان: ۱۸۶۰ء میں شام میں ایک نیا فتنہ اٹھا جس کی وجہ سے یورپین حکومتوں کو مداخلت کا ایک اور موقع ہاتھ آیا، لبنان میں دروزی اور مارونی دو فرقے زیادہ اقتدار رکھتے تھے، دروزی مسلمان اور مارونی کیتھولک عیسائی تھے، شورش کی ابتدا مارونی کسانوں کی طرف سے ہوئی جو اپنے ہم مذہب جاگیرداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، چوں کہ یہ بغاوت حقیقتاً نظام جاگیری کے خلاف تھی اس لیے دروزی شیوخ نے بھی شروع میں مارونی جاگیرداروں کا ساتھ دیا مگر چند دنوں کے بعد پادریوں کے بھڑکانے سے اس شورش نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا اور نہایت تیزی سے شام کے اکثر حصوں میں پھیل گئی، خصوصاً لبنان میں اس کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے، مارونیوں نے حتی الامکان قتل و غارت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن چونکہ دروزی نسبتاً زیادہ طاقتور تھے اس لیے بالآخر غلبہ انھی کو حاصل ہوا اور انتقام کے جوش میں انھوں نے ہزاروں عیسائیوں کو قتل

کرڈالا، اس میں شبہ نہیں کہ مقامی ترک دستوں نے دروزیوں کے روکنے میں سخت غفلت برتی ورنہ قتل و غارت کے وہ واقعات پیش نہ آتے جو بقول ایک عیسائی مورخ کے سلطنت عثمانیہ اور اسلام دونوں کے لیے باعث ننگ تھے، دمشق میں عیسائیوں کا قتل سب سے زیادہ ہوا، برطانوی قنصل کا بیان ہے کہ ساڑھے پانچ ہزار سے کم ہلاک نہیں ہوئے، اس موقع پر امیر عبدالقادر الجزائری (۱) نے عیسائیوں کو جو مدد دی اس کا اندازہ فرانسیسی مورخ ولاتروں کیئر کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے:

> "دمشق میں اگر عبدالقادر نہ ہوتا تو ایک عیسائی کی بھی صورت نہ دکھائی دیتی، یہ عرب بہادر جس نے سولہ سال تک فرانسیسیوں سے نہایت بے دردی سے جنگ کی تھی دمشق میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا، آگ کے شعلے پہلی ہی دفعہ بھڑکے تھے اور درماندوں کی صدا پہلی ہی دفعہ بلند ہوئی تھی کہ اس نے بلا کسی پس و پیش کے عیسائیوں اور ان کے قاتلوں کے درمیان آپ کو ڈال دیا، ایک چھوٹی

---

(۱) ۱۸۳۰ء میں جب فرانس نے الجزائر پر قبضہ کیا تو امیر عبدالقادر مسلسل سترہ برس تک وطن کی آزادی کے لیے لڑتے رہے، انھوں نے متعدد معرکوں میں فرانسیسی فوج کو سخت شکست دی، ان کی جاں بازی اور حیرت انگیز شجاعت کا اعتراف خود اہل فرانس نے کیا ہے، آخر کار جب ان کے سپاہیوں کی بڑی تعداد شہید ہو گئی اور غنیم کی فوج میں اضافہ ہوتا گیا تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہ زیادہ مدافعت بے سود ہوگی اور حکومت فرانس کے اس وعدہ پر اعتماد کر کے کہ ان سے مطلق تعرض نہ کیا جائے گا بلکہ انھیں اجازت ہوگی کہ جہاں چاہیں چلے جائیں، ۲۳ دسمبر ۱۸۴۷ء کو ہتھیار ڈال دیے، لیکن نپولین ثالث نے یہ وعدہ پورا نہ کیا، برخلاف اس کے انھیں قید کر دیا اور بارہ برس تک قید میں رکھا، بالآخر اس شرط پر کہ وہ الجزائر کو واپس نہ ہو جائیں گے، اس نے انھیں رہا کر دیا اور ایک لاکھ فرانک سالانہ وظیفہ ان کے لیے مقرر کر دیا، چنانچہ وہ ہجرت کر کے پہلے بروصہ گئے اور پھر وہاں سے دمشق آ کر مقیم ہو گئے اور وہیں ۱۸۸۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

> کی فوج کے ساتھ اس نے عیسائیوں کو عوام الناس سے چھڑایا اور اپنا محل انھیں رہنے کو دیا، جو ہزار ہا آ کے پناہ لینے لگے اور عیسائیوں کے سکونتی مقام پر عرب سواروں کی پہرہ بندی کر دی، اس شخص نے جو مسلمان اور اولاد پیغمبر علیہ السلام تھا اور فرانس کا قدیم دشمن تھا، ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ان خون خوار ٹولیوں کو پسپا کیا جو اسلام اور ترکی کے لیے باعث ننگ تھیں، اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان بدقسمتوں پر پوشاک کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کیا جنھیں اس نے موت کے پنجے سے رہائی دی تھی، اس نے خود اپنی نگرانی میں عیسائی محافظین کو بیروت پہنچایا جہاں انھیں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا، اس کا یہ ایثار، اس کی یہ شرافت اور اس کی یہ شریفانہ بہادری ایک لمحہ کے لیے بھی کم نہ ہوئی، اس کی زندگی کا یہ صفحہ ایسا شاندار ہے جس کے آگے ایک صدی کا کارنامہ بھی مدہم پڑ جاتا ہے۔" (۱)

یہ واقعہ سن کر مسیحی یورپ کے ہر گوشہ سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی، فرانس کیتھولک مارونیوں کا خاص حامی تھا، اس نے ان کی مدد کے لیے ایک فوج شام میں بھیجنی چاہی، اس اندیشہ سے کہ مبادا فرانس شام میں اپنا تسلط قائم کرے پہلے تو برطانیہ اور دوسری حکومتوں نے یہ تجویز منظور نہ کی مگر آخر کار ۳/ اگست ۱۸۶۰ء کو سارڈینیا کے علاوہ ان تمام مغربی حکومتوں نے جنھوں نے صلح نامہ پیرس پر دستخط کیے تھے پیرس ہی میں یہ طے کیا کہ بارہ ہزار یورپین فوج شام میں امن قائم کرنے کی غرض سے روانہ کی جائے، چنانچہ فرانس نے فوراً چھ ہزار فوج روانہ کی، لیکن اس فوج کے شام پہنچنے سے قبل فواد پاشا وزیر خارجہ، سلطان کے حکم سے وہاں پہنچ کر اس شورش کو رفع کر چکے تھے، ان کے حکم سے عثمانی فوج کے ایک سو گیارہ سپاہی گولی سے مارے گئے، ستاون بڑے بڑے دروزی

---

(۱) تاریخ دولت عثمانیہ از والاژدان لیکر ترجمہ اردو جلد اول ص ۵۰۶

پھانسی پر لٹکا دیے گئے اور خود احمد پاشا والی دمشق کو قتل کی سزا دی گئی، اس کے بعد بیروت میں ایک بین الاقوامی کمیشن بیٹھا جس کے فیصلہ کے مطابق سیکڑوں دروزی جلاوطن کر کے طرابلس (افریقہ) بلغراد اور ودین بھیج دیے گئے، خورشید پاشا حاکم بیروت کو موت کی سزا تجویز ہوئی لیکن بعد میں ان کو معزول کر کے قسطنطنیہ بلا لیا گیا، عیسائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لیے سات کروڑ پچاس لاکھ قرش (۱) کی رقم باب عالی کی طرف سے منظور ہوئی جو بہ اقساط ادا کر دی گئی۔ لبنان کی آئندہ حکومت کے متعلق کمیشن نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے دولت عثمانیہ کے زیر سیادت خود مختار کر دیا جائے اور اس کے والی کا تقرر سلطان کی عیسائی رعایا میں سے باب عالی کی طرف سے ہوا کرے۔ ۵؍ جون ۱۸۶۱ء کو فرانسیسی فوج شام سے روانہ ہوئی جس غرض سے یہ فوج بھیجی گئی تھی، وہ فواد پاشا کے دمشق پہنچنے کے بعد ہی پوری ہو چکی تھی، اسے نو ماہ تک شام میں قیام کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن دول عظمیٰ نے دولت عثمانیہ کی حمایت کا جو پیمان صلح نامہ پیرس میں باندھا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے ملکی انتظامات میں مداخلت کرنے کے لیے محض نیک مشوروں پر قناعت نہ کی جائے بلکہ حسب ضرورت فوجی مدد بھی پہنچائی جائے۔

سلطان کی وفات: ۱۷؍ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۵؍ جون ۱۸۶۱ء کو سلطان عبد المجید نے وفات پائی اور اس کا بھائی عبد العزیز تخت نشین ہوا۔

اس عہد کی خصوصیت: عبد المجید کا عہد حکومت دولت عثمانیہ کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس عہد میں ان اصلاحات پر عمل درآمد شروع ہوا جن کا خاکہ محمود ثانی نے تیار کیا تھا اور جو اس کی وفات کے بعد مرتب ہو کر تنظیمات کے نام سے مشہور ہوئیں، تنظیمات جدید ترکی کا سنگ بنیاد ہیں، یہ صحیح ہے کہ عبد المجید کے زمانہ میں وہ پوری طرح نافذ نہ ہو سکیں تاہم جیسا کہ خالدہ ادیب خانم نے لکھا ہے: ”ان کا جتنا حصہ ہزارہا مشکلات کے باوجود عمل میں لایا گیا وہ بھی کچھ کم نہ تھا، ان پر جا بجا جتنے اعتراضات کیے

---

(۱) قرش یا غرش ایک ترکی سکہ جو دو پنس سے لے کر ڈھائی پنس تک کا ہوتا ہے۔

جا نہیں مگر یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سے ایک نہایت اہم نتیجہ برآمد ہوا یعنی جدید ترکی کی بنیاد قائم ہوگئی، انھوں نے ترکوں کی قوم کو اس قابل کر دیا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود مسمار شدہ سلطنت کی بنیادوں پر ایک نئی عمارت بنا کر رہے۔''(۱)

عبدالمجید کے عہد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ترکوں میں پہلی مرتبہ اصلاحات کی جانب میلان ظاہر ہوا، محمود کے زمانہ میں جو کچھ اصلاحات ہوئی تھیں وہ حکومت نے کی تھیں، نہ صرف یہ کہ جمہور نے ان اصلاحات کو پسند نہیں کیا بلکہ ان کی مخالفت کی اور سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوتیں برپا ہوگئیں، برخلاف اس کے عبدالمجید نے جب تنظیمات کا اعلان کیا تو ترکوں کے ہر طبقہ نے مسرت ظاہر کی، ان کے اندر یہ تبدیلی عام درسگاہوں سے زیادہ قومی ادب کے اثر سے پیدا ہوئی تھی، جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

---

(۱) ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش ص ۶۰-۵۹

سلطان عبدالعزیز

۱۲۷۷ھ تا ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۶۱ء تا ۱۸۷۶ء

سلطان عبدالمجید کی وفات پر اس کا بھائی عبدالعزیز تخت نشین ہوا۔ عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سلطان عبدالعزیز نے ایک فرمان کے ذریعہ ان اصلاحات کی تکمیل کا وعدہ کیا جو محمود ثانی اور عبدالمجید نے شروع کی تھیں، چنانچہ اس نے حکومت کے نظم و نسق میں مفید اصلاحات جاری کیں، نہریں اور سڑکیں تعمیر کرائیں، زراعت اور معدنیات کو ترقی دی۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایک جدید نظام قائم کیا جو مذہبی نظام تعلیم سے آزاد تھا۔ یہ جدید مدارس ہر فرقے کے طلبہ کے لیے یکساں طور پر کھلے ہوئے تھے۔ اس نے ایک عدالت عالیہ بھی قائم کی جس میں عیسائی اور مسلمان ججوں کی تعداد برابر تھی اور ۱۸۶۸ء میں حکومت کے انتظام کے لیے ایک کونسل آف اسٹیٹ (مجلس ملکیہ) قائم کی۔ اس مجلس کو قانون سازی اور انتظام دونوں کے اختیارات حاصل تھے۔ اس کے ارکان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ مدحت پاشا جو اپنے تدبر، اپنی روشن خیالی اور اپنے مضبوط اخلاق کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اس کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۰ء میں ایک ضابطہ فوجداری (Penal Code) اور ۱۸۵۰ء میں ضابطہ تجارت (Commercial Code) مرتب ہو چکا تھا۔ یہ دونوں فرانسیسی ضابطہ قوانین سے ماخوذ تھے۔ ۱۸۷۰ء میں ایک جدید ضابطہ دیوانی ”مجلہ“ نافذ کیا گیا جس میں قانون

شریعت کو زمانہ حال کی ضروریات کے مطابق مدون کرنے کی کوشش کی گئی۔ سلطان عبدالعزیز کے عہد تک غیر ملکی باشندوں کو سلطنت عثمانیہ میں اراضیات پر مالکانہ قبضہ حاصل کرنے کا حق نہ تھا۔ ۱۸؍ جون ۱۸۶۷ء کو ایک قانون نافذ ہوا جس کی رو سے پہلی بار انھیں سلطنت کے ہر حصہ میں علاوہ حجاز کے یہ حق دیا گیا لیکن اس حق کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ ان جائدادوں کے متعلق ہر معاملہ میں انھیں سلطنت عثمانیہ کے ملکی قوانین کا پابند ہونا پڑے گا اور اپنے ملک کے قوانین سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو ابتداہی میں عبدالعزیز کے ساتھ آیا مالیات کا تھا۔ سلطنت کے اخراجات آمدنی سے بہت زیادہ تھے اور قرضوں کا بار بڑھتا جارہا تھا۔ عبدالعزیز نے سلطنت کے مصارف میں جو زیادہ تر بدانتظامی کا نتیجہ تھے حتی الامکان کمی کرنے کی کوشش کی اور اپنے ذاتی اخراجات میں بھی بہت کچھ تخفیف کردی لیکن بیرونی حکومتوں کا قرض اتنا زیادہ ہوگیا تھا کہ سلطنت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ سود میں چلا جاتا تھا اور میزانیہ کا توازن کسی طرح درست نہیں ہوتا تھا۔

مالی اصلاحات کی کوشش: یوروپین حکومتوں سے قرض لینے کا سلسلہ سلطان عبدالمجید ہی کے وقت سے شروع ہوگیا تھا، اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ جب یونان نے آزادی حاصل کرنے کے لیے علم بغاوت بلند کیا اور عیسائی حکومتیں اس کی مدد کے لیے کھڑی ہوئی تو سلطنت عثمانیہ کو نئے سرے سے جنگی سامان اور جہازوں کی تعمیر کی ضرورت پیش آئی اور چونکہ خزانہ میں کافی روپیہ موجود نہ تھا، اسلیے سلطان محمود ثانی نے ہنڈیاں جاری کی اور ۱۸۳۰ء میں پہلی بار بتیس ہزار کیسہ کی ہنڈیاں آٹھ فی صدی سالانہ سود پر آٹھ سال کے لیے جاری کی گئیں لیکن شام اور مصر کی جنگوں کی وجہ سے یہ قرض معینہ مدت میں ادا نہ ہوسکا اور اس کے بدلہ میں قرض خواہوں کو دوسری ہنڈیاں دے دی گئیں، جنگ کے مصارف اور سلطنت کے اخراجات اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ یہ دوسری ہنڈیاں بھی ادا نہ ہوسکیں، جب سلطان عبدالمجید تخت پر آیا تو اس نے مالیات کو درست کرنے کی کوشش کی

لیکن جنگ کریمیا کے کثیر مصارف کے باعث وہ مالی اصلاحات میں کامیاب نہ ہو سکا اور نہ صرف یہ کہ ملکی ہنڈیاں کے ادا کرنے کی صورت پیدا نہ ہوئی بلکہ جنگی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اسے مجبوراً بعض یوروپین حکومتوں سے قرض لینا پڑا، علاوہ بریں اندرون ملک میں بھی ہنڈیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، ملکی اور بیرونی قرضوں کا بار سلطنت پر زیادہ ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ۱۸۶۱ء میں سلطان عبدالعزیز تخت نشین ہوا اور اس نے فواد پاشا کو صدر اعظم مقرر کر کے جنوری ۱۸۶۲ء میں مالیہ اور میزانیہ (بجٹ) کا انتظام اس کے سپرد کیا، پھر اسی سال جون میں سلطان نے فواد پاشا کے نام ایک دوسرا فرمان جاری کیا کہ ہنڈیوں کے تمام قرضے ادا کر دیئے جائیں، اس طرح کہ چالیس فی صدی رقم سونے چاندی کے سکوں میں ادا کر دی جائے اور بقیہ ساٹھ فی صدی کے لیے نئی ہنڈیاں دے دی جائیں، اس کے لیے باب عالی نے اسی لاکھ انگریزی پونڈ قرض لیے اور جب یہ رقم بھی کافی نہ ہوئی تو عثمانی بینک کے ذریعہ اسی لاکھ اور قرض لیے، چوں کہ ملکی اصلاحات کا کام جاری تھا اور اسی کی وجہ سے خزانہ پر زیادہ بار پڑ رہا تھا اس لیے اب ان بڑھتے ہوئے قرضوں کا سالانہ سود ادا کرنا بھی ناممکن ہو گیا، سلطان نے حکومت کے ہر شعبہ میں تخفیف کا حکم جاری کیا، یہاں تک کہ اپنے ذاتی مصارف بھی بہت کم کر دیے، ان تدبیروں سے اتنی گنجائش ہوئی کہ مصطفیٰ فاضل پاشا ناظر مال سالانہ سود ادا کر سکا لیکن اس کے بعد ہی مالیات کے متعلق صدر اعظم فواد پاشا سے اختلاف رائے کی وجہ سے مصطفیٰ فاضل پاشا کو مستعفی ہو جانا پڑا اور اس کی جگہ کافی پاشا ناظر مال مقرر ہوا، کافی پاشا اور فواد پاشا نے تمام قرضوں کے لیے نئے تمسکات جاری کرنے کا فیصلہ کیا، سلطان نے اس قرارداد کے مطابق ایک فرمان جاری کیا اور چار کروڑ عثمانی گنی کے تمسکات جاری کیے گئے لیکن جب سود ادا کرنے کا وقت آیا تو خزانہ بالکل خالی تھا، اس لیے حکومت پھر مجبور ہوئی کہ نئے حصے عثمانی بنک کے ذریعے سے پیرس اور لندن میں فروخت کرے، چنانچہ ۱۸۶۵ء میں عثمانی بنک نے بارہ فیصدی نفع پر لندن اور پیرس میں

حصے فروخت کرنا شروع کیے لیکن چونکہ حکومت کی ساکھ قائم نہیں رہ گئی تھی، اس لیے بہت کم لوگوں نے حصے خریدے اور صرف اسی قدر رقم فراہم ہو سکی کہ اس سے ضروری سود ادا کر دیا گیا۔ اس ناکامی کو بعض اہل غرض نے فواد پاشا کی مالی بدانتظامی کے ثبوت میں سلطان کے سامنے پیش کیا، چنانچہ سلطان نے فواد پاشا کو معزول کر کے ۴ر جون ۱۸۶۶ء کو محمد رشدی پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، رشدی پاشا نے دوبارہ کوشش کی کہ ایک بڑی رقم قرض لے کر تمام موجودہ قرضوں کو ادا کر دیں مگر کامیابی نہیں ہوئی، اس کے بعد رشدی پاشا نے عثمانی بنک سے یہ معاملہ کیا کہ بنک سلطنت کے بعض خاص قرضوں کا سود ہر تیسرے مہینے ادا کرتا رہے اور اس کے معاوضہ میں سلطنت کی بعض متعین آمدنیاں بنک کو ملتی رہیں، اس طرح سود رفتہ رفتہ ادا ہونے لگا اور سلطنت دیوالیہ ہونے سے بچ گئی۔ اس کے بعد بغیر نئے حصے کھولے ہوئے حکومت اپنی ضروریات کے لیے بنکوں سے قرض لینے لگی۔ (۱)

سیاسی فتنے، رومانیا: جب سلطنت کی مالی حالت روبہ اصلاح ہونے لگی تو سیاسی فتنے اٹھ کھڑے ہوئے، ۱۸۶۷ء میں ولاچیا اور مولڈیویا کی ولایتوں نے باضابطہ طور پر متحد ہو کر رومانیا کی ریاست قائم کر لی اور ۱۸۶۸ء میں جرمن شہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا فرماں روا منتخب کیا، یہ کارروائی صلح نامہ پیرس کے مخالف تھی، لارڈ ایورسلے لکھتا ہے کہ دول عظمیٰ کو اس بات کی فکر تھی کہ حتی الامکان باب عالی کو آویزش سے بچایا جائے، اس لیے ان کے سفیروں نے سلطان پر دباؤ ڈال کر شہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا موروثی فرماں روا تسلیم کرا لیا (۲) دول عظمیٰ کی یہ خیراندیشی کوئی نئی چیز نہ تھی، باب عالی کو اس کا تجربہ اس وقت سے ہوتا آیا تھا جب سے دولت علیہ کا زوال شروع ہوا، جوں جوں سلطنت کمزور ہوتی گئی یوروپین سلطنتوں کی دردمندی میں بھی اضافہ ہوتا گیا، رومانیا پر اگرچہ سلطان کی فرماں روائی نام کے لیے باقی رہی تاہم عملاً وہ گویا آزاد ہو گیا، شہزادہ

---

(۱) تاریخ دولت عثمانیہ از محمد فرید بک ص ۲۹۳-۹۵ (۲) لارڈ ایورسلے ص ۳۱۲

جانشین چونکہ پرشیا کے شاہی حکمران خاندان کا ایک فرد تھا اس لیے اس کا انتخاب رومانیا کی آزادی کا بڑی حد تک ضامن تھا۔

سرویا کا استقلال: سلطنت عثمانیہ سے متعلق دول عظمیٰ کی یہی بے التفاتی سرویا کے معاملات میں بھی ظاہر ہوئی، صلح نامہ پیرس کی رو سے دولت عثمانیہ کو بلغراد اور سرویا کے تین دوسرے قلعوں میں فوجی دستے رکھنے کا حق حاصل تھا، سرویا میں ترکوں کی آخری حکومت کا اقتدار کا نشان اب باقی رہ گیا تھا، جس وقت مائیکل کی سرپرستی میں اہل سرویا نے اس نشان کو بھی مٹا دینے کا فیصلہ کیا اور باب عالی سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فوجیں ان قلعوں سے نکال لے۔ باب عالی نے معاہدہ پیرس کی بنا پر انکار کیا اور سرویا کو جنگ کی دھمکی دی لیکن چونکہ اسی زمانہ میں جزیرہ کریٹ میں بغاوت برپا تھی اور باب عالی کی ساری توجہ اسی کی طرف مبذول تھی، اس لیے دول عظمیٰ کے سفیروں کا دوستانہ مشورہ قبول کرنا پڑا اور مارچ ۱۸۶۷ء میں ترکی فوجیں بلغراد اور دوسرے سرحدی قلعوں سے واپس بلالی گئیں، اب سرویا کا استقلال مکمل ہو گیا اور اس کے امیر نے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔

کریٹ کی بغاوت: کریٹ کی بغاوت یونان کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی، یونان اس جزیرہ کو اپنے میں شامل کرنا چاہتا تھا اور اس غرض سے وہاں کے عیسائیوں کو جو زیادہ تر یونانی نسل کے تھے دولت عثمانیہ کے خلاف برابر ابھارتا رہتا تھا، جب بغاوت کی شورش زیادہ ہوئی تو اسماعیل پاشا خدیو مصر نے بھی اپنی فوجیں دولت علیہ کی مدد کے لیے کریٹ میں بھیجیں اور مصری فوجوں نے ارکادین کے معرکہ میں بڑی شجاعت دکھائی، اس درمیان میں باب عالی نے کریٹ محمد پاشا وزیر اعظم کو باغیوں سے گفتگو کرنے کے لیے کریٹ روانہ کیا، لیکن چونکہ محمد پاشا اس سے پہلے کریٹ کا گورنر رہ چکا تھا اور لوگ اس سے بیزار تھے اس لیے گفتگو کامیاب نہیں ہوئی، ۱۸۶۷ء میں رشدی پاشا صدارت سے الگ کیے گئے اور ان کی جگہ محمد امین عالی پاشا دوسری بار صدر اعظم مقرر ہوئے اور فواد پاشا سابق صدر اعظم وزیر خارجہ بنائے گئے، انھوں نے پہنچ کر یہ طے کیا کہ پہلی

محمد پاشا کو کریٹ سے واپس بلا لیا گیا اور ان کی جگہ عمر پاشا منتقل کر دیا گیا کو وہاں کا حاکم اور مختار بنا کر بھیجا۔ عمر پاشا کو بغاوت کے فرو کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی قریب تھا کہ وہ اس فتنہ کو پوری طرح دبا دیتے لیکن عین اسی وقت دول عظمیٰ نے مداخلت کی اور عمر پاشا کو اپنا ہاتھ روک لینا پڑا۔ اکتوبر ۱۸۶۷ء میں باب عالی نے صدر اعظم عالی پاشا کو بھیجا کہ بچشم خود کریٹ کے حالات کا معائنہ کریں۔ عالی پاشا نے اہل جزیرہ کو حکومت کے عہدے اور منصب دے کر ان کی تسکین خاطر کی پوری کوشش کی لیکن باغیوں کا اصل مقصد یونان سے کریٹ کا الحاق تھا۔ اس لیے عالی پاشا کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ آخر فروری ۱۸۶۹ء میں دول عظمیٰ کی تجویز سے ایک کانفرنس پیرس میں منعقد کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کی طرف سے ایک فرمان جاری کیا گیا جس کے رو سے کریٹ کو حکومت خود اختیاری کے بعض حقوق دے دیئے گئے اور وہاں کا خراج جو واجب الادا تھا معاف کر دیا گیا، نیز اہل جزیرہ فوجی خدمت سے بری کر دیئے گئے(۱) اس طرح یہ بغاوت کچھ دنوں کے لیے فرو ہو گئی۔

معاہدہ پیرس کی خلاف ورزی۔ ۱۸۷۰ء میں باب عالی کو دول عظمیٰ کی دوستی کا ایک اور تجربہ ہوا۔ معاہدہ پیرس (۱۸۵۶ء) کی ایک دفعہ کے رو سے بحر اسود میں روس اور ترکی کے جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ان دونوں حکومتوں کو اس کے ساحلوں پر بحری اسلحہ خانے قائم کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ جب ۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی کی جنگ شروع ہوئی تو روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ پابندی توڑ دینی چاہی اور ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو مذکورہ بالا دفعہ کی منسوخی کا اعلان کر دیا۔ جرمنی کے وزیر اعظم پرنس بسمارک نے اس جنگ میں روس کی غیر جانبداری کی قیمت یہ مقرر کی تھی کہ معاہدہ پیرس کی اس خلاف ورزی میں جرمنی روس کی تائید کرے گا۔(۲)

فرانس خود ایک مصیبت میں مبتلا تھا، وہ روس کو برانگیختہ کرنے کے لیے کسی

---

(۱) تاریخ دولت عثمانیہ از محمد فرید بک ص ۲۹ (۲) ایورسلے ص ۳۱۳

حربی تیاری تھا، برطانیہ کی عنان حکومت مسٹر گلیڈسٹن کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ قرار دے رکھا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں، چنانچہ برطانیہ نے بھی روس کے اس فعل کے خلاف مطلق احتجاج نہیں کیا اور روس نے بحر اسود پر اپنا تسلط پھر قائم کر لیا۔

بلغاریا کا قومی کلیسا: ۱۸۷۰ء میں ایک اور نہایت اہم واقعہ پیش آیا، جس نے مسئلہ مشرقی کو پیچیدہ سے زیادہ پیچیدہ تر بنا دیا، اس وقت تک مملکت یونان اور رومانیا، سرویا اور مونٹی نگرو (جبل اسود) کی سرحدوں کے باہر بلقان کی عیسائی آبادی بجائے نسل کے مذہب کے لحاظ سے منقسم تھی، جنوبی مشرقی یورپ کی تمام عیسائی دنیا جو سلطنت عثمانیہ کے زیر فرمان تھی خواہ کسی نسل و قوم سے تعلق رکھتی ہو یونانی کلیسا کے ماتحت تھی اور اسی وجہ سے یونانی سمجھی جاتی تھی (۱) چنانچہ روس کے سوا بلقان کی سلافی قوموں مثلاً بلغاری اور بوسنی کا شمار بھی یونانیوں ہی میں ہوتا تھا لیکن کچھ عرصے سے اہل بلغاریا میں نسلی اور وطنی احساس ترقی کر رہا تھا اور اب وہ اپنا مستقل قومی کلیسا قائم کرنے کا عزم کر رہے تھے، یونانی کلیسا کے بطریق اعظم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اہل بلغاریا کو کچھ مخصوص مراعات دے کر راضی کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی برگشتگی یہاں تک بڑھ چکی تھی کہ وہ یونانی کلیسا کی وجہ سے آرتھوڈکس مذہب ہی کو ترک کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے اور بجائے اس کے رومن کیتھولک مذہب قبول کرنے پر تیار تھے، چنانچہ انھوں نے اس کے متعلق پوپ سے گفتگو بھی شروع کر دی (۲) لیکن اس موقع پر روس نے ان کی مدد کی اور وعدہ کیا کہ باب عالی پر اثر ڈال کر بلغاریا کے لیے ایک مستقل کلیسا قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لے گا، جنرل اگناتیف (gnatief) اس وقت باب عالی میں روسی سفیر تھا اور اس کا اثر نہ صرف وزرا بلکہ خود سلطان پر بھی بہت زیادہ تھا، اگناتیف نے اہل بلغاریا کی استدعا اپنی سفارش کے ساتھ پیش کی، اگناتیف کا مقصد یہ تھا کہ ایسا کرنے

---

(۱) کیمبرج ماڈرن ہسٹری جلد ۱۲ ص ۳۸۰ (۲) [illegible] بلقان اور مشرق قریب از شیول ص ۳۸۹

سے بلغاری قوم کا ایک مستقل وجود قائم ہو جانا تھا جو آئندہ روس کے زیر حمایت [illegible] اور یونانیوں کے مقابلہ میں استعمال کی جا سکتی تھی۔ صدر اعظم فواد پاشا نے بھی اہل بلغاریا کی مذہبی اور ملی تحریک کو ترقی دینی چاہی تاکہ بلقان میں ایک غیر موافق عنصر یونانیوں کا رقیب پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ۱۰ مارچ ۱۸۷۰ء کو سلطان عبدالعزیز نے ایک فرمان صادر کر کے بلغاریا کی علاحدگی کو تسلیم کیا اور اس کے لیے کلیسائے یونان سے آزاد ایک مستقل قومی کلیسا قائم کرنے کی اجازت دی، نہ صرف یہ بلکہ بہت سے ضلعوں کا پورا علاقہ بلغاری کلیسا کے تحت کر دیا گیا۔ اس فرمان میں یہ تصریح بھی کر دی گئی کہ اگر متعدد دیگر عیسائی حلقے بلغاری کلیسا میں داخل ہونا چاہیں تو ان حلقوں کی دو ثلث آبادی کی خواہش معلوم ہونے پر یہ حق انھیں دے دیا جائے گا(۱) اس تاریخ سے بلقان میں ایک جدید قومیت کی بنیاد پڑ گئی، بلغاری قوم جو صدیوں سے سو رہی تھی بیدار ہو کر اب ایک قوی حریف کی حیثیت سے یونانیوں کے مقابل آ گئی۔

باب عالی میں روس کا اثر: تخت نشینی کے بعد سے دس سال تک عبدالعزیز کو فواد پاشا، عالی پاشا، رشدی پاشا اور مدحت پاشا جیسے محب وطن اور قابل مدبرین کی خدمات حاصل رہیں جن کے زیر اثر اس نے بہت سی اصلاحات جاری کیں۔ ان میں سے بعض [illegible] ہوئیں جب اس نے عثمانی بیڑے کو یورپ کے بہترین بیڑوں کا ہم پلہ بنا دیا اور فوج کی تنظیم اس طریقہ پر کی کہ آئندہ جنگ روس میں پلونا کے معرکہ میں ترکوں کی جانبازی نے تمام دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا، عدالتوں میں انصاف ہونے لگا، پریس کو حکومت پر تنقید کرنے کی آزادی ملی اور [illegible] سلطنت [illegible] عہدہ [illegible] کی تیاری ہوئی، تاہم [illegible] نے [illegible] سے [illegible] میں چند مہینوں کے اندر فواد پاشا اور عالی پاشا دونوں کا انتقال ہو گیا، یہ دونوں اپنی غیر معمولی قابلیت اور مقبولیت کی وجہ سے شروع ہی سے سلطان پر بہت زیادہ اثر رکھتے تھے اور حقیقتاً

---

(۱) شیول ص ۲۸۶

سلطنت کا نظم ونسق انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ ان کی وفات کے بعد عبدالعزیز دوسرے وزیروں کے اثر سے آزاد ہو گیا اور اب مطلق العنانی کا دور شروع ہوا۔ اس نے محمود ندیم پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا جس کے زمانہ میں رشوت کا بازار پھر گرم ہوا۔ عہدے اور منصب فروخت ہونے لگے، حکومت کے ہر شعبہ میں بدنظمی پھیلنے لگی اور سلطنت کے مختلف صوبوں میں شورشیں برپا ہونا شروع ہوئیں۔

اس صورت حال سے روس نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کا سفیر جنرل اگناتیف عالی پاشا کی وفات سے چند سال قبل قسطنطنیہ آ گیا تھا۔ ترک مورخ احمد صائب بک نے لکھا ہے کہ اگناتیف وہ شخص ہے جس نے مشرق ادنیٰ میں سیاست روس کی ترویج میں سب سے زیادہ حصہ لیا اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں ذلیل سے ذلیل طریقہ اختیار کرنے سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ جب تک زمام حکومت عالی پاشا کے ہاتھ میں تھی اسے کامیابی نہ ہو سکی، لیکن جب ۱۸۷۲ء میں عالی پاشا کا انتقال ہو گیا اور محمود ندیم پاشا صدر اعظم مقرر ہوا تو اگناتیف نے دیکھا کہ موقع سے فائدہ اٹھانے کا وقت آ گیا ہے۔ محمود نے اپنے کو بالکل اگناتیف کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور حکومت روس اور سفیر روس کا تابع فرمان ہو گیا تھا۔ اس کی حکومت زار کی حکومت تھی نہ کہ سلطان کی۔ کسی وزیر نے ایسی خیانت کی مثال نہیں پیش کی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ حکومت کے عہدہ داروں کا عزل و تقرر بھی اگناتیف ہی کی رائے سے ہوا کرتا تھا (۱) حد یہ ہے کہ شیخ الاسلام حسن فہمی آفندی بھی اگناتیف کے جادو سے محفوظ نہ تھا، چنانچہ اس نے ایک روز اگناتیف سے کہا کہ میری دو آنکھیں ہیں، ایک تو اور ایک میرا لڑکا حیدر (۲) مسٹر نائٹ اپنی مشہور کتاب بیداری ترکی (Awakening of Turkey) میں لکھتے ہیں کہ "روسی ڈپلومیسی نے قسطنطنیہ میں غلبہ حاصل کر لیا تھا اور حسب دستور قدیم جماعت اصلاح کے خلاف سازش میں مصروف تھی اور سلطنت عثمانیہ کی بربادی کی تدبیریں کر رہی تھی۔"

---

(۱) واقعہ السلطان عبدالعزیز از احمد صائب بک مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ ص ۱۰۵-۷ (۲) ایضاً ص ۱۰۸

جمعیت سلافیہ: سلطنت عثمانیہ کو برباد کرنے کے لیے روس نے جو ذرائع اختیار کیے ان میں جمعیت سلافیہ کی تشکیل ایک نہایت موثر ذریعہ تھی۔ پان سلاوزم (Pan Slavism) یا اتحاد سلافی کا مقصد یہ تھا کہ تمام سلافی قوموں کو روس کے زیر سیادت متحد کر کے دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارا جائے، چنانچہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر روس کے چند ادیب اہل قلم نے ۱۸۰۰ء میں جمعیت سلافیہ قائم کی۔ اس جمعیت نے سلافی قوموں کے اندر روسی ادبیات کی نشر و اشاعت شروع کی تا کہ ان کے قلوب روس کی جانب آسانی سے مائل ہو سکیں۔ اس نے بلغاریہ، سرویہ، بوسنیا، ہرزیگووینا اور مونٹی نگرو (جبل اسود) کے باشندوں کو جو روس سے نسلی اور دینی تعلق رکھتے تھے دولت علیہ کی حکومت سے آزاد کرانے کی کوششیں کی۔ روسی ایجنٹ تاجر اور علماء کی صورت میں سلطنت عثمانیہ کے ان صوبوں میں جاتے تھے جو روس کے قریب تھے اور جمعیت سلافیہ کی طرف سے سلافی قوموں کے بچوں کو بلاد روس میں بھیجتے تھے جہاں جمعیت کی طرف سے ان کی تعلیم کے لیے مدارس قائم کیے گئے تھے۔ یہ لڑکے وہاں سے تعلیم حاصل کر کے جب واپس ہوتے تو جمعیت کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیے اپنے شہروں میں مدارس قائم کرتے۔ جمعیت کے ارکان بلقان کے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ عیسائیوں کو خوشخبری سناتے کہ عنقریب وہ روس اور جمعیت سلافیہ کی مدد سے ترکی کی حکومت سے نجات پا جائیں گے۔ وہ ان کی مالی مدد بھی کرتے اور خفیہ طور پر ان کے لیے فوجی سامان بھی پہنچاتے رہتے۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ بلقان کے تمام عیسائی جمعیت سلافیہ سے متفق ہو گئے اور علم بغاوت بلند کرنے کے لیے اس کے اشارہ کا انتظار کرنے لگے۔ حکومت روس کے بڑے بڑے ارکان اس جمعیت میں شریک تھے اور اگناتیف اس کا سب سے زیادہ قوی رکن تھا۔ (۱)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنگ کریمیا کے بعد سے اتحاد سلافی کے جدید عقیدہ کے مبلغین جن میں زیادہ تر روسی تھے اپنی ہم مذہب اور ہم نسل قوموں میں مسلسل پیہم

---

(۱) المسالہ الشرقیہ ص ۹۷۔

کرنے میں مشغول تھے، ۱۸۶۷ء میں اتحاد سلافی کی ایک عظیم الشان کانگریس ایک سائنٹفک انجمن کے پردہ میں ماسکو میں منعقد ہوئی، اس کانگریس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحاد سلافی کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا صدر مقام ماسکو تھا اور ایک چھوٹی کمیٹی بخارسٹ میں قائم کی گئی، کتابیں اور مختصر رسالے بلقان میں تقسیم کیے جاتے تھے، نوجوان سلافی کثرت سے روسی یونیورسٹیوں میں جانے لگے، جس طرح رومانیا کے نوجوان پیرس جاتے تھے، سرویہ، مونٹی نگرو، بوسنیا اور بلغاریہ میں ہر طرف خفیہ سوسائٹیوں کا جال بچھا ہوا تھا، اس تحریک کو سرکاری مدد بھی حاصل تھی، عوام کے پروپگنڈے کی پشت پر اعلیٰ سیاسی قوتیں بھی کام کر رہی تھیں، جزیرہ نمائے بلقان میں ہر روسی قنصل اتحاد سلافی کا رکن تھا اور جنرل اگناتیف جو اس تحریک کا ایک پرجوش حامی تھا، قسطنطنیہ میں سفیر مقرر کیا گیا تھا۔“(۱)

مدحت پاشا کی اسکیم: روس کی یہ سرگرمیاں باب عالی سے پوشیدہ نہ تھیں، مدحت پاشا نے ولایت ڈینوب (بلغاریا) کی گورنری کے زمانہ (۱۸۶۵ء لغایتہ ۱۸۶۸ء) میں دیکھا تھا کہ روسی پروپگنڈے کی کامیابی کا بڑا ذریعہ یہ ہے کہ بلغاریا کے نوجوان طلبہ اوڈیسا، خارکوف اور کیف کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے روس بھیجے جاتے ہیں اور وہاں سے اتحاد سلافی کے پرجوش مبلغ ہو کر وطن کو لوٹتے ہیں اور دولت عثمانیہ کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہوتے ہیں، چنانچہ مدحت پاشا نے یہ فیصلہ کیا کہ بلغاریا کے خاص خاص شہروں میں ایسے مدرسے قائم کر دیے جائیں جہاں مسلمان اور عیسائی لڑکے یکجا تعلیم پا سکیں اور یہ تعلیم اعلیٰ درجہ کی اور عہد حاضر کے مطابق ہو تاکہ انھیں کہیں باہر جانے کی ضرورت باقی نہ رہے، اگر اس تجویز پر عمل کیا جاتا تو مسلمان اور عیسائی طلبہ کے درمیان دوستانہ روابط قائم ہو جاتے اور روسی پروپگنڈے کا اثر بہت کم ہو جاتا، مدحت پاشا نے بلغاریا کے لیے اصلاحات کی جو اسکیم باب عالی میں پیش کی اس میں مخلوط تعلیم کی یہ تجویز بھی شامل تھی، جس وقت یہ اسکیم قسطنطنیہ پہنچی اگناتیف پہلا شخص تھا جس نے اس

---

(۱) میریٹ ص ۳۱۹-۲۰

کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا، اس نے دیکھا کہ یہ اسکیم جمعیۃ سلافی کے اغراض و مقاصد سے بالکل مخالف ہے، چنانچہ اس نے اسے درہم برہم کرنے کی پوری کوشش کی اور آخر کار کامیاب ہوا، دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں یورپین سفیروں کی مداخلت کوئی نئی چیز نہ تھی، اگناتیف نے سلطان کو ذہن نشین کرانا شروع کیا کہ مدحت پاشا اپنے صوبہ میں جو اصلاحات جاری کر رہے ہیں خصوصاً مقامی مجلسوں کا قیام، ان کی روح شخصی حکومت کے سراسر منافی ہے اور ان اصلاحات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ وہ صوبہ سلطنت سے علاحدہ ہو جائے گا اور مصر کی طرح مکمل آزادی کا دعویٰ کرنے لگے گا، اتفاق یہ کہ ولایت ڈینیوب کے سرکاری اخبار میں مرکزی مجلس کے ممبروں کے لیے طباعت کی غلطی سے ”مندوبین“ (Deputies) کا لفظ چھپ گیا تھا، اگناتیف نے اس لفظ کو خاص اہمیت دے کر عبدالعزیز کے سامنے پیش کیا، عبدالعزیز پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے منجملہ دیگر اصلاحات کے مدحت پاشا کی تعلیمی اسکیم کے منظور کرنے سے بھی انکار کر دیا، وجہ یہ ظاہر کی کہ ان اسکولوں کے اخراجات پورے نہ ہو سکیں گے، حالانکہ مدحت پاشا نے اپنی رپورٹ میں تصریح کر دی تھی کہ نصف اخراجات کا انتظام صوبہ کی سالانہ آمدنی سے ہو جائے گا اور نصف مقامی چندوں سے پورے کر لیے جائیں گے (1) اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ مدرسے قائم کر دیے جاتے تو بلقان میں ”جمعیۃ سلافی“ کی سرگرمیوں کا بہت کچھ سد باب ہو جاتا لیکن سلطان پر اگناتیف کا جادو چل گیا اور ساری اسکیم درہم برہم ہو گئی۔

سلطان کی فضول خرچی: فواد پاشا اور عالی پاشا کے انتقال کے بعد جیسا کہ اوپر بیان ہوا اگناتیف کا اثر اور بھی بڑھ گیا، دوسری طرف عبدالعزیز بھی اپنے کو اب حقیقی معنوں میں ایک مطلق العنان فرماں روا محسوس کرنے لگا، سلطنت کی مالی حالت سے قطعاً بے پروا ہو کر اس نے فضول خرچی شروع کر دی جس سے ملکی قرضہ کا بار روز بروز بڑھتا چلا گیا، اسے تعمیرات کا بہت شوق تھا، چنانچہ سنگ مرمر کے بڑے بڑے عالی شان محل تیار ہونے

---

(1) سوانح مدحت پاشا از علی حیدر مدحت، مطبوعہ لندن ۱۹۰۳ء، ص ۴۰-۴۲

لگے، صدر اعظم محمود ندیم پاشا کو اپنا منصب برقرار رکھنے کی فکر تھی، وہ سلطان کی ہر خواہش کو آنکھ بند کرکے پورا کرتا رہا، ان فضول خرچیوں کا اثر دور دراز صوبوں پر بھی پڑنے لگا، قصر یلدیز کے مطالبات اتنے کثیر تھے کہ صوبوں کی معمولی آمدنی ان کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی، مجبوراً چندے لگائے جانے لگے، رفاہ عام کے کام ملتوی کیے جانے لگے اور ان کے لیے جو رقمیں جمع کی جاتی تھیں، وہ قسطنطنیہ بھیجی جانے لگیں، قصر سلطانی کے نااہل مقربان قسطنطنیہ سے صوبوں میں بھیجے جاتے اور والیوں کو حکم دیا جاتا کہ انھیں آمدنی کی جگہوں پر مقرر کیا جائے، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے ہر شعبہ میں ابتری پھیلنے لگی اور مختلف علاقوں میں ہنگامے برپا ہونا شروع ہوئے۔

مدحت پاشا کی صدارت: یہ حالت دیکھ کر سلطان نے محمود ندیم پاشا کو برخاست کر دیا اور اس کی جگہ ۱۸۷۳ء میں مدحت پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، مدحت پاشا نے سب سے پہلے مالیات کی درستی کی طرف توجہ کی، کاغذات کے معائنہ سے معلوم ہوا کہ ایک لاکھ ترکی پونڈ کا حساب درج نہیں ہے اور تحقیقات سے پتہ چلا کہ یہ رقم محمود ندیم پاشا نے وصول کی ہے، مدحت پاشا نے حکم دیا کہ اسے جلد سے جلد محمود ندیم سے واپس لیا جائے، محمود ندیم نے بیان کیا کہ گو یہ رقم اس کے نام سے برآمد کی گئی ہے لیکن دراصل قصر سلطانی میں بھیجی گئی ہے، والدہ سلطانہ اس کی پشت پناہ تھی، بہرحال مدحت پاشا کے اصرار سے وہ پہلے ادرنہ اور پھر طرابزون جلاوطن کرکے بھیج دیے گئے لیکن کچھ دنوں کے بعد سلطان نے اسے قسطنطنیہ آنے کی اجازت دے دی، دارالسلطنت میں اب دو جماعتیں صاف طور پر ایک دوسرے کی مخالف نظر آرہی تھیں، ایک طرف مدحت پاشا تھے جنھیں قسطنطنیہ اور صوبوں کی رائے عامہ کی تائید نیز روشن خیال علما اور صوفتہ (مدارس دینیہ کے طلبہ) کی حمایت حاصل تھی، دوسری طرف وہ پورا گروہ تھا جو سلطنت کی بدنظمی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور جسے محمود ندیم کی قیادت اور والدہ سلطانہ اور قصر یلدیز کی پشت پناہی حاصل تھی، محمود ندیم کا ایک اور زبردست حامی جنرل اگناتیف تھا جو اسے دوبارہ صدارت پر لاتے

کے لیے ہر ممکن طریقہ سے سلطان پر اثر ڈال رہا تھا۔

اسی درمیان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے مدحت پاشا کی صدارت عبدالعزیز پر گراں محسوس ہونے لگی، خدیو مصر اسماعیل پاشا وقتاً فوقتاً قسطنطنیہ آیا کرتا تھا اور قصر سلطانی میں بڑی بڑی رقمیں اور بیش قیمت ہدایا پیش کر کے ہر مرتبہ سلطان سے حکومت خود اختیاری کے کچھ حقوق حاصل کر لیتا تھا، خدیو کی آمد قصر سلطانی اور اس کے تمام عہدہ داروں کے لیے آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ بن گئی تھی، چنانچہ وہ مدحت پاشا کی صدارت کے زمانہ میں بھی آیا لیکن اب کی بار اسے مطلق کامیابی نہیں ہوئی اور اپنے ہدایا کے ساتھ بے نیل مرام اسے مصر واپس جانا پڑا۔ اس واقعہ سے جتنی مایوسی خدیو مصر کو ہوئی اتنی ہی قصر سلطانی کے ارکان کو بھی ہوئی اور خود سلطان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ اہم تھا، مدحت پاشا کے صدارت پر آنے سے پہلے آسٹریا کے ایک شخص بیرن ہرش (Baran Hirsch) نے باب عالی سے ریل کی پٹریوں کے لگانے کا ٹھیکہ لیا تھا اور لکڑی کاٹنے کے سلسلہ میں ترکی کے ان جنگلوں پر جو دنیا کے بہترین جنگل سمجھے جاتے ہیں غیر محدود اختیارات حاصل کر لیے تھے، علاوہ بریں ہرش نے پٹریاں صرف میدانی علاقوں میں بچھائیں اور اجرت اس شرح سے طلب کی جو میدانوں اور پہاڑوں دونوں کے اوسط پر لگائی گئی تھی، اس ٹھیکہ میں ہرش کی کامیابی کا راز صرف رشوت تھی، اس نے بڑی بڑی رقمیں قصر سلطانی اور وزرا کی خدمت میں پیش کر کے ٹھیکہ کا تصفیہ کرا لیا تھا، مدحت پاشا نے جب زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور انھیں اس معاملہ کا علم ہوا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، تحقیقات سے ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ خود سلطان کی ذات بھی رشوت سے بری نہیں ہے، چنانچہ وہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں سمجھایا کہ اس ٹھیکہ میں دولت علیہ کا کس قدر نقصان ہے اور اس بات پر زور دیا کہ جو رقمیں ہرش سے لی گئی ہیں ان کو واپس کر کے یہ معاملہ ختم کر دیا جائے، عبدالعزیز نے بادل ناخواستہ مدحت پاشا کا مشورہ قبول کر لیا، رقمیں واپس

کرا دیں لیکن اس کے بعد مدحت پاشا کو برخاست کر دیا۔ (۱)

مالی ابتری: اس کے بعد مدحت پاشا سالونیکا کے گورنر بنا کر بھیجے گئے، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ رخصت لے کر قسطنطنیہ چلے آئے اور یہاں کچھ دنوں وزیر عدل اور پھر صدر کونسل آف اسٹیٹ رہنے کے بعد مستعفی ہو کر خانہ نشیں ہو گئے، اس درمیان میں سلطنت کی بدنظمی روز بروز بڑھتی جاری تھی، یکے بعد دیگرے کئی صدر اعظم مقرر اور برخاست کیے گئے، ان میں سے کوئی چند مہینوں سے زیادہ نہ رہا، چنانچہ محمد رشدی پاشا، اسعد پاشا اور شروانی رشدی پاشا نے اپنی قلیل مدت صدارت میں حالات کی درستی کی انتہائی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے، بالآخر سلطان نے محمد ندیم پاشا کو دوبارہ صدر اعظم مقرر کیا، اس وقت مالیات کا نظام اس درجہ خراب ہو چکا تھا کہ سلطنت عنقریب دیوالیہ ہوا چاہتی تھی۔ چنانچہ ۷/ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو باب عالی نے اپنے قرض خواہوں کو اطلاع دے دی کہ حکومت پورا سود ادا کرنے سے قاصر ہے، اس پر سارے یورپ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، یورپ کے ہر پایہ تخت اور ہر بڑے شہر میں جن ساہوکاروں نے بڑی بڑی شرح سود پر باب عالی کو قرضے دیے تھے جلسے کیے اور ترکی حکومت اور ترکی قوم دونوں کے خلاف شدید غیظ وغضب کا اظہار کیا، ان جلسوں نے دولت عثمانیہ کے خلاف سیاسی جوش کے بھڑک اٹھنے کے لیے زمین خوب تیار کر دی تھی۔

بغاوت ہرزیگووینا: اس درمیان میں روس کی معاندانہ کوششیں برابر جاری تھیں، جمعیۃ سلافیہ کے ارکان بلقان کی عیسائی رعایا کو بھڑکانے میں سرگرم تھے، آسٹریا کی نگاہیں بوسنیا اور ہرزیگووینا پر لگی ہوئی تھیں، وہ ان صوبوں میں بغاوت برپا کرا کے خود ان پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا، چنانچہ اس مقصد سے خفیہ طور پر وہ بوسنیا اور ہرزیگووینا میں اسلحہ اور گولا بارود بھیج رہا تھا، سرویا اور مونٹی نگرو کے شورش پسند بھی ہرزیگووینا میں جمع ہو رہے تھے، ان تیاریوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جولائی ۱۸۷۵ء میں موشار (ہرزیگووینا) کے کسانوں

---

(۱)- سوانح مدحت پاشا ص ۶۶-۶۵

نے وقت پر ٹیکس ادا کرنے اور زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرنے سے انکار کردیا اور بغاوت کے لیے آمادہ ہوگئے، مقامی حکام بجائے اس کے کہ شورش کو فوراً ختم کر دیتے باب عالی کے احکام کا انتظار کرنے لگے، اس سے باغیوں کی ہمت اور بڑھ گئی اور چونکہ انھیں خارجی مدد کا یقین دلایا گیا تھا، اس لیے ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا، آخرکار مختار پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج باب عالی کی طرف سے بھیجی گئی، جس نے باسانی بغاوت کو فرو کردیا لیکن یہ چیز روس اور آسٹریا کی پالیسی کے بالکل خلاف ہوئی، ان کا مقصد صرف بغاوت کے قائم رہنے سے پورا ہوسکتا تھا، چنانچہ انھوں نے باغیوں کو دوبارہ پھر ابھارا اور ان کی طرف سے چند مطالبات اپنے سفیروں کے توسط سے باب عالی میں پیش کیے، صدر اعظم اسعد پاشا نے حسن نیت کے باوجود کمزور آدمی تھے، انھوں نے روس اور آسٹریا کے سفیروں کی یہ خدمت قبول کرلی، وہ باغیوں اور باب عالی کے درمیان مصالحت کرادیں گے، جیسا کہ علی حیدر مدحت نے لکھا ہے، کوئی پالیسی اس سے زیادہ مہلک نہیں ہوسکتی تھی، اس سے باغیوں کی انتہائی حوصلہ افزائی ہوئی، انھوں نے سمجھا کہ حکومت خود اس شورش کے فرو کرنے سے قاصر ہے، اس کارروائی سے باغیوں کی حیثیت حریف مقابل کی ہوگئی اور جو چیز پہلے تھوڑے سے کسانوں کی ایک معمولی سی شورش تھی وہ اب باقاعدہ بغاوت کے درجہ تک پہنچ گئی، جس کے لیڈر غیر ملکی قنصلوں اور سفیروں کے ذریعے سے باب عالی سے مساویانہ طور پر معاملات کرنے لگے۔

بہرحال ۲؍ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو سلطان کی طرف سے ایک ارادہ شائع ہوا جس میں فوری اور عام اصلاحات کا وعدہ کیا گیا لیکن باغیوں نے اس کی پروا نہ کی، اس کے بعد ۱۲؍ دسمبر کو ایک شاہی فرمان صادر ہوا جس میں باغیوں کے سابق مطالبات منظور کر لیے گئے یعنی یہ کہ ٹیکسوں کی مقدار کم کردی جائے گی اور بوسنیا اور ہرزیگووینا کے باشندوں کو خود اپنی پولیس قائم کرنے کی اجازت ہوگی، اس فرمان میں سلطان نے یہ بھی وعدہ کیا کہ مقامی انتخابی مجلسیں فوراً قائم کردی جائیں گی جن میں عیسائی ممبروں کی جگہیں محفوظ

ہوں گی، لیکن روس اور آسٹریا کی پشت پناہی سے باغیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، انھوں نے اس کے بعد بھی ہتھیار نہیں ڈالے، دول عظمیٰ کی مداخلت کے لیے یہ موقع بہت مناسب تھا، چنانچہ روس، آسٹریا اور جرمنی کے فرماں رواؤں نے باہم مشورہ کیا اور آسٹریا کے چانسلر کاونٹ اندراسی (Andrassy) نے بوداپسٹ سے وہ نوٹ جاری کیا جو اس کے نام سے مشہور ہے۔

اندراسی نوٹ: 'اندراسی نوٹ' میں یہ بتانے کے بعد کہ دول عظمیٰ بغاوت کے فرو کرنے اور یورپ میں امن قائم رکھنے کے لیے کس قدر بے چین ہیں اور باب عالی ان اصلاحات کے نافذ کرنے سے جو مدت سے واجب ہو چکی تھیں کہاں تک قاصر رہا ہے، اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ سلطان پر دباؤ ڈال کر مندرجہ ذیل مطالبات پورے کرائے جائیں:

بوسنیا اور ہرزیگووینا کے باشندوں کو پوری مذہبی آزادی عطا کی جائے اور مسلم اور غیر مسلم رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے، اجارہ داروں کے ذریعہ سے ٹیکس کی وصولی کا طریقہ بند کر دیا جائے اور آئندہ ٹیکس براہ راست عمال حکومت کے ذریعہ وصول کیے جائیں، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے باشندوں سے جو ٹیکس لیے جائیں وہ انھی صوبوں کی مقامی ضروریات پر صرف ہوں، ایسے کسانوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے جو زمین کے مالک ہوں اور اس طرح دیہی آبادی کی حالت بہتر بنائی جائے، ایک کمیشن مقرر کیا جائے جس کے ارکان میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو اور وہ اپنی نگرانی میں نہ صرف ان اصلاحات کو جاری کرائے جو دول عظمیٰ کی طرف سے پیش کی گئی ہیں بلکہ ان کو بھی جن کا وعدہ سلطان نے ۲/اکتوبر اور ۱۲/دسمبر کے فرمان میں کیا ہے، آخر میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر مذکورہ بالا مطالبات جلد اور موثر طریقہ پر پورے نہ کیے گئے تو دول عظمیٰ بغاوت کے روکنے کی کوشش سے بری الذمہ ہو جائیں گی۔

۳۰/جنوری ۱۸۷۶ء کو تمام دول عظمیٰ کی طرف سے 'اندراسی نوٹ' باب عالی

میں پیش کیا گیا، ۱۱ فروری کو سلطان نے اس کی تمام دفعات باستثنا ایک دفعہ کے جس میں ٹیکسوں کو صرف مقامی ضروریات میں صرف کرنے پر زور دیا گیا تھا منظور کر لیں لیکن اس کے بعد بھی باغیوں نے ہتھیار نہیں رکھے اور اس بات کو مطالبہ کرتے رہے کہ پہلے اصلاحات جاری کر دی جائیں، باب عالی کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ بغاوت جب تک قائم ہے اصلاحات کی کسی اسکیم کا نافذ کرنا ممکن نہیں، اس درمیان میں شورش برابر بڑھتی چلی گئی، بوسنیا بھی ہرزیگووینا کے ساتھ شریک ہو گیا، دوسری طرف سرویا، مونٹی نیگرو اور بلغاریا بھی علم بغاوت بلند کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے تھے۔

جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کا قتل: باب عالی کی صلح جوئی اور انتہائی مراعات کے باوجود بلقان کے عیسائیوں میں سرکشی کا جذبہ یوروپین حکومتوں کی حوصلہ افزائی سے روز بروز زیادہ مشتعل ہوتا جا رہا تھا کہ ۵ مئی ۱۸۷۶ء کو سالونیکا میں جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کے قتل کا واقعہ پیش آیا، جس نے سارے یورپ کو ترکوں کے خلاف دفعتہ برانگیختہ کر دیا، سبب یہ ہوا کہ ایک بلغاری لڑکی اسلام قبول کرکے اپنے گاؤں سے سالونیکا آئی تاکہ وہاں کی مجلس عالیہ کے سامنے اس کا اعلان کرکے اپنے ایک ہم وطن نوجوان مسلمان سے شادی کی اجازت حاصل کرے، جب وہ سالونیکا کے اسٹیشن پر پہنچی تو یونانیوں اور بلغاریوں کا ایک کثیر مجمع پہلے سے موجود تھا، ان لوگوں نے لڑکی کی نقاب اور فرغل کو نوچ کر پھینک دیا اور اسے زبردستی ایک گاڑی میں بٹھا کر فوراً امریکن قنصل خانہ میں پہنچا دیا، جہاں نائب قنصل نے جو ایک بلغاری عیسائی تھا اور اسی نے یہ تمام انتظامات کیے تھے لڑکی کو رات بھر چھپائے رکھا اور دوسرے دن اسے اپنے ایک دوست کے گھر بھیج دیا، شہر کے بنی الصباح مسلمانوں کا ایک گروہ جس میں زیادہ تر ادنیٰ طبقے کے لوگ تھے قنصل خانہ کے پاس جمع ہوا اور لڑکی کی واپسی کا مطالبہ کیا، ادھر سے جواب ملا کہ لڑکی یہاں نہیں ہے، اس کے بعد یہ لوگ برہم ہو کر قریب کی مسجد میں اکٹھا ہوئے اور آئندہ تدبیروں پر غور کرنے لگے، بدقسمتی سے مسلمانوں کے اس جوش کی حالت میں

جرمن اور فرانسیسی قنصل مسجد میں داخل ہوئے، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مجمع کو سمجھانے کے لیے عمداً مسجد میں گئے تھے یا مسجد کے دروازہ کے قریب تھے اور بھیڑ کے دھکے میں بلا ارادہ اندر پہنچ گئے تھے، بہر حال جس صورت سے بھی وہ گئے ہوں مجمع انھیں مسجد کے اندر دیکھتے ہی بے قابو ہو گیا اور چند آدمی کھڑکیوں کی آہنی سلاخیں کھینچ کر ان پر ٹوٹ پڑے اور دونوں کو وہیں ختم کر دیا، انگریزی قنصل مسٹر بلنٹ نے شروع ہی میں مجمع کا رنگ دیکھ کر امریکن نائب قنصل لزارو (Lazaro) کے یہاں جو اس ہنگامہ کا اصلی باعث تھا بہت اصرار کے ساتھ کہلا بھیجا کہ لڑکی فوراً واپس کر دی جائے ورنہ جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کی جان خطرہ میں ہے لیکن لزارو نے پہلے تو یہ عذر کیا کہ معلوم نہیں لڑکی کہاں ہے اور جب بلنٹ کے مزید اصرار پر اس نے لڑکی واپس کی تو وقت گزر چکا تھا اور دونوں قنصل مارے جا چکے تھے۔

اگرچہ باب عالی نے مجرموں کو سزا کے لیے فوراً احکام صادر کیے اور چھ آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی اور بہتوں کو قید کی سزائیں دی گئیں تاہم یورپ کا جوش تھام اس کے بعد بھی ٹھنڈا نہ ہوا، یورپین پریس نے اس آگ کو خوب بھڑکایا اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ سلطنت عثمانیہ کے تمام عیسائیوں کی جانیں خطرہ میں ہیں اور وہاں کی پوری مسلمان آبادی عیسائیوں کے قتل عام پر آمادہ ہو گئی ہے، عیسائیوں کے تحفظ کے لیے جو تجویزیں پیش کی گئیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ترکوں کے مقابلہ میں صلیبی اتحاد قائم کیا جائے۔

بغاوت بلغاریا: اتفاق سے اسی زمانہ میں بلغاریہ میں بھی بغاوت شروع ہو گئی تھی اس سے مسیحی اتحاد کی ضرورت اور بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی، حقیقت یہ تھی کہ بلقان کی تمام شورشیں ایک منظم تحریک کا نتیجہ تھیں، روس کی سرپرستی میں پان سلافیہ کے ارکان نے پورے جزیرہ نما میں خفیہ کمیٹیوں کا جال بچھا رکھا تھا، سرویا نے بوسنیا اور ہرزیگووینا کے آغاز سے روس کا معاون تھا، چنانچہ ابھی ان صوبوں کی بغاوت جاری ہی

تھی کہ بلغاریا کے بعض ضلعوں میں بھی یہ فتنہ رونما ہوا، مقامی حکام نے یہ دیکھ کر کہ ہرزیگووینا میں ابتدائی غفلت کا نتیجہ کیا ہوا، اس شورش کے تمام لیڈروں کو گرفتار کرلیا، اس پر جنرل اگناتیف نے باب عالی میں اتنا سخت احتجاج کیا کہ قسطنطنیہ سے نہ صرف ان لیڈروں کی رہائی کا حکم پہنچا بلکہ حکومت کے جو عہدہ دار ان کی گرفتاری میں شریک تھے وہ برخاست کر دیے گئے(۱) اس کارروائی سے بلغاریا کے مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا، انھوں نے یہ دیکھ کر کہ باغیوں کی ٹولیاں یوروپین قنصلوں کی حمایت میں منظم ہوتی جارہی ہیں اور مقامی حکام جو انسدادی تدبیریں اختیار کرتے ہیں ان پر سزا دی جاتی ہے، اس معاملہ کو خود اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کرلیا اور تمام صوبہ میں مدافعتی کمیٹیاں بنا کر چرکس یا نیم فوجیوں کی کمان میں مقامی جتھے قائم کرلیے۔

علم بغاوت باضابطہ طور پر تو مئی ۱۸۷۶ء کو بلند کیا گیا لیکن فساد کے بادل مہینوں پہلے سے مختلف اطراف سے اٹھتے ہوئے نظر آرہے تھے، چنانچہ اکتوبر ۱۸۷۵ء سے قبل باب عالی کو اطلاع دی گئی تھی کہ بلغاریہ کے تین ضلعوں فلبوپولیس، اسکی زغرا اور ترنووہ میں سخت شورش برپا ہونے کا خطرہ ہے اور ان اضلاع کے حکام نے باب عالی سے پرزور استدعا کی تھی کہ فوجی دستے فوراً روانہ کر دیے جائیں تاکہ پرامن باشندوں کی جان ومال کی حفاظت کی جاسکے لیکن اگناتیف نے پھر مداخلت کی اور اس بات پر زور دیا کہ باضابطہ فوجوں کی موجودگی سے مقامی باشندوں میں اور بھی اشتعال پیدا ہوگا اور شورش جلد شروع ہو جائے گی، محمود ندیم اس کی باتوں میں آگیا، اور ان اضلاع کے حکام کی پیہم درخواستوں کے باوجود اس نے کوئی باضابطہ فوج بلغاریا میں نہیں بھیجی، چنانچہ اکتوبر ۱۸۷۵ء میں اسکی زغرا کے عیسائیوں نے دفعۃً مسلمانوں پر حملہ کر دیا، اس کے متعلق نائب قنصل بروفی (Brophy) سرہنری الیٹ (Sir H. Elliat) سفیر برطانیہ مقیم قسطنطنیہ کو لکھتا ہے:

---

(۱) سوانح مدحت پاشا ص ۱۷

> "اکتوبر ۱۸۷۵ء میں یہ بالکل طے ہو چکا تھا کہ بلغاریہ کے آٹھ دس مقامات پر بیک وقت شورش شروع کر دی جائے لیکن کسی خاص سبب کے پیش آ جانے سے بغاوت کو ملتوی کر دینا مناسب سمجھا گیا، چنانچہ تمام مرکزوں میں ہرکارے بھیج دیے گئے لیکن اسکی زغرا میں التوا کی اطلاع چونکہ بہت بعد پہنچی اور وہاں کے لوگوں نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ باغیوں کی پوری فوج ان کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئی، علم بغاوت بلند کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ مئی (۱۸۷۶ء) کی شورش، بغاوت یا انقلاب جو کچھ بھی ہو دراصل اکتوبر ۱۸۷۵ء میں واقع ہونے والا تھا مگر نہیں ہوا۔"(۱)

حقیقت حال: بہتر ہو گا کہ بغاوت بلغاریہ کی اصل حقیقت خود برطانوی قنصلوں اور سرہنری الیٹ کے مراسلوں سے پیش کی جائے، فلپوپلیس کا نائب قنصل ڈیوپوئی (Dupuis) نے ۱۷ اگست ۱۸۷۶ء کو لارڈ ڈربی وزیر خارجہ انگلستان کو مندرجہ ذیل رپورٹ بھیجا ہے:

> "صورت حال یہ تھی جب ۲ مئی کو انقلابی کمیٹیوں کی مرتب اور منظم کی ہوئی بغاوت جو گذشتہ تین سالوں سے بخارسٹ اور ماسکو میں قائم تھی، بمقام اوراتالان (Auratalan) میں شروع ہوئی، انقلابیوں کی تجویز یہ تھی اور ان کی مدد دیہاتوں کے پادری اور معلم بامزن رہے تھے کہ ساری ولایت میں ریلوے اسٹیشن اور پل تباہ کر دیے جائیں، اور ادرنہ اور فلپوپلیس کے شہروں میں آگ لگا دی جائے، پانچ سو آدمیوں کو لے کر تاتار بازارجق پر چھاپا مارا جائے اور وہاں حکومت کے ذخیرہ پر قبضہ کر لیا جائے، فوجوں کے لیے گورنر جنرل

---

(۱) رپورٹ پارلیمنٹ (Blue Bock) متعلق ترکی بحوالہ تصیر سوانح مدحت پاشا ص ۲۹۲

> کے پاس اور نہ تار بھیجا گیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے یہ جواب دیا کہ چونکہ کوئی باضابطہ فوج بھیجنے کے لیے موجود نہیں ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ بے ضابطہ دستے فراہم کر لیے جائیں، ۴ مئی کو فلپو پولیس کے چند ممتاز اشخاص نے وہاں کے ملا کے زیر صدارت ایک جلسہ کیا جس میں گورنر جنرل کی یہ تجویز کہ نفری (بے ضابطہ سپاہی) بھرتی کر لیے جائیں منظور کی گئی اور فیصلہ کی اطلاع ارکان جلسہ کے دستخطوں کے ساتھ ادرنہ بھیج دی گئی، اس کے بعد فوراً باشی بوزقوں یعنی بے ضابطہ سپاہیوں کو بھرتی کرنے کے لیے ولایت کے مختلف حصوں میں احکام بھیجے گئے۔“

باغیوں کا طریقہ کار یہ تھا کہ جو مسلمان بھی ملتا اسے بے دریغ قتل کر دیتے، بوڑھے بچے یا مرد و عورت کی کوئی تفریق نہ تھی، مقصد یہ تھا کہ مسلمان بھی انتقام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور پھر یورپین حکومتوں کو مداخلت کا موقع ہاتھ آئے، اس میں شبہ نہیں کہ عیسائیوں نے ایسی درندگی کا ثبوت دیا کہ مسلمانوں کا جوش انتقام بالآخر بھڑک اٹھا اور باشبوزق بھی اعتدال سے متجاوز ہو گئے، لیکن عیسائی بیانات میں تصویر کا صرف ایک رخ پیش کیا گیا ہے، چنانچہ ڈیویوئی مذکورہ بالا رپورٹ کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

> ”یہ علانیہ کہا جاتا ہے کہ فلپو پولیس کا روسی نائب قنصل ان غمناک مصیبتوں کا تنہا ذمہ دار ہے جو بلغاریہ پر نازل ہوئی ہیں، علاوہ بریں بہت سے دیہاتوں میں خود بلغاریوں نے آگ لگا دی تا کہ وہاں کے باشندوں کو بغاوت پر مجبور کریں، سنگرلی کا گاؤں جو اس وقت صرف کھنڈر ہے شروع میں ایک پادری ہی نے اس میں آگ لگائی، یہ شخص لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر مجبور کرنے کی غرض سے ہاتھ میں چاقو لے کر ادھر ادھر دوڑتا پھرتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ تمہاری مخلصی کا وقت اب آ گیا ہے اور روسی سپاہی ترکوں کے مقابلہ میں تمہاری

مدد کرنے کے لیے قریب پہنچ گئے ہیں، قابل اعتماد اور آزاد شہادت کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ بلغاریا کی بغاوت کا خاکہ احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ ان لوگوں نے تیار کیا تھا، جو غیر علاقوں سے آئے تھے اور فوجی مصروفیات (Tactics) کے ماہر اور تجربہ کار تھے، اگر ان کی تدبیریں کامیاب ہو جاتیں اور اہل بلغاریا ترکوں پر غلبہ حاصل کر لیتے تو کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں ترکی کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا اور بلغاریا والوں نے اس سے کہیں زیادہ مظالم کیے ہوتے جتنے مسلمانوں کے سر عاید کیے جاتے ہیں، کیوں کہ ابتدائے بغاوت ہی سے اول الذکر نے ہر ترک کو جو انھیں ملا عمر یا جنس کا لحاظ کیے بغیر قتل کر ڈالا اور متعدد مواضع پر ان کے ساتھ ناقابل بیان مظالم کیے، اس میں شبہ نہیں کہ سفاکیوں کا ارتکاب دونوں طرف سے ہوا ہے خلاف مجھ سے قابل وثوق طور پر بیان کیا گیا ہے کہ کارلوو کے مقام پر بلغاریوں نے ایک ترک لڑکے کی دونوں بانہوں کی کھال کہنی تک کھینچ لی اور اوتلو کوئی میں بلغاریوں نے اسی (۸۰) مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا اور ایک بچہ کو ٹکڑے کر کے اس کا گوشت علانیہ فروخت کیا، اس کے علاوہ عورتوں کے ساتھ ایسے وحشیانہ مظالم کیے، ان کا ذکر بھی نہیں کیا جا سکتا۔"(۱)

ترکوں کے انتقام کی خبر سب سے پہلے لندن کے اخبار ڈیلی نیوز (Daily News) میں شائع ہوئی جس کا نامہ نگار قسطنطنیہ میں مقیم تھا، اس خبر سے انگلستان میں سخت برہمی پیدا ہوئی، مسٹر گلیڈسٹن (Gladstone) نے بلغاری سفاکیوں کو اپنی مسلسل تقریروں کا موضوع بنا کر سارے ملک میں ترکوں کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور پھر اسی عنوان سے ایک رسالہ لکھ کر شائع کیا جو ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوا اور اس نے

---

(۱) رپورٹ پارلیمنٹ، بحوالہ مختصر سوانح مدحت پاشا ص ۲۸۷

اس آگ کو اور بھی بھڑکایا، حکومت برطانیہ کی طرف سے والٹر بیرنگ (walter Baring) واقعات کی تحقیق کے لیے روانہ کیا گیا، اس نے لکھا کہ ابتدا میں بلغاریوں نے (۱۳۶) مسلمانوں کو قتل کیا تھا مگر بعد کے قتل عام میں جب مسلمانوں نے انتقام لیا تو ۱۲ ہزار عیسائیوں سے کم ہلاک نہیں ہوئے۔(۱)

ڈیلی نیوز کے جس مقالہ نے ترکوں کے خلاف انگلستان میں ایجی ٹیشن کا آغاز کیا اس کی نسبت سر ہنری ایسٹ ۲۵/ جولائی ۱۸۷۶ء کو لکھتے ہیں:

> ”میں یہ یقین کرنے کی وجہ رکھتا ہوں کہ ڈیلی نیوز کا نامہ نگار جس کے خطوط نے انگلستان کے لوگوں کو بلغاریوں کی طرف اس قدر متوجہ کیا، ایک باغی سردار کے دو بلغاری عزیزوں کی باتوں سے فریب کھا گیا، ان میں سے ایک قسطنطنیہ میں ایک بلغاری اخبار کا اڈیٹر تھا، ظاہر ہے کہ اس کے ذریعہ جو اطلاع حاصل کی گئی ہوگی وہ مشکل ہی قابل اعتماد خیال کی جا سکتی ہے۔“(۲)

چوں کہ اس بغاوت کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ یورپ میں ترکوں کے خلاف اشتعال اور نفرت پھیلائی جائے اس لیے انتہائی مبالغہ آمیز خبریں بھی ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کر لی جاتی تھیں، سر ہنری الیٹ ۶/ جولائی کو لکھتے ہیں:

> ”بغاوت کے فرو کرنے میں جو زیادتیاں کی گئیں وہ یقیناً بہت بڑی تھیں جیسا کہ اس فوج کی نوعیت کا لازمی اقتضا تھا جس سے فوری ضرورت کے موقع پر باب عالی کو مجبوراً کام لینا پڑا، لیکن یہ بھی اسی حد تک یقینی ہے کہ جو تفصیلات دی گئی ہیں وہ تقریباً تمام تر روسی اور بلغاری ذرائع سے ماخوذ ہیں اور ان میں اس قدر شرمناک حد تک مبالغہ کیا گیا ہے کہ وہ زیادہ توجہ کی مستحق نہیں ہو سکتیں، نفرت انگیز مظالم

---

(۱) میریٹ ص ۲۳۰ (۲) رپورٹ پارلیمنٹ بحوالہ ضمیمہ سوانح مدحت پاشا ص ۲۹۰

> کے واقعات ایسے تفصیلی طریقے سے بیان کیے گئے تھے کہ ان کی سچائی میں شبہ کرنا تقریباً ناممکن تھا، لیکن تحقیق کرنے سے وہ سراسر بناوٹی ثابت ہوئے۔"(۱)

بغاوت کی اسکیم یوں مرتب کی گئی تھی کہ انقلابی کمیٹیوں کے ایجنٹ باہر سے آکر عیسائیوں کو ابھارتے تھے، انھیں روسی مدرسوں کے تعلیم یافتہ پادری اور سکول ماسٹر پہلے سے تیار کر رہے تھے، یہ ایجنٹ لوگوں کو اس بات پر برانگیختہ کرتے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ انواع واقسام کے مظالم کریں تاکہ ترک انتقام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور پھر ان کے خلاف یورپ میں صدائے احتجاج بلند کی جا سکے، چنانچہ نائب قنصل کالورٹ (Calvert) ۲۹/اگست کو فلپوپلیس سے لکھتا ہے:

> "عیسائی کمشنروں میں سے ایک یوئنچو آفندی (Youantcho) خود بلغاری ہے، بیان کرتے ہیں کہ انھیں اس امر میں مطلق شبہ نہیں کہ گذشتہ مئی کی ابتدائے شورش میں باغیوں کی طرف سے بڑے وحشیانہ مظالم کیے گئے اور ان مظالم کا ارتکاب عمداً کیا گیا تاکہ وہ بلغاریہ میں عام بغاوت برپا کرنے کا بہترین ذریعہ ہوں، کیوں کہ اس کے بعد حاکم قوم کی طرف سے جس بے امتیاز انتقام کا ہونا لازمی تھا وہ عیسائیوں کی حالت کو اس قدر ناقابل برداشت بنا دیتا کہ خواہ وہ کتنا ہی پرامن طریقے سے رہنا چاہتے حفاظت خود اختیاری کے لیے انھیں مجبوراً اٹھنا ہی پڑتا، منجملہ دیگر واقعات کے بلیک بے (Blacque) نے ترنوو کے قریب ایک گاؤں کے عیسائی باشندوں کی زبانی یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ شورش کے شروع میں باغیوں نے وہاں کے ایک دولت مند ترک کو پکڑا جس سے اس کی عدل پروری اور فیض رسانی کی وجہ سے

---

(۱) رپورٹ پارلیمنٹ بحوالہ تبصرہ سوانح مدحت پاشا، ص ۲۹۱

مسلمان اور عیسائی دونوں یکساں محبت کرتے تھے اور اس کو زمین میں کمر تک دفن کر کے پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دیا۔"(۱)

۴ مئی کو اوتلوکوئی کی شورش کی اطلاع دیتے ہوئے سر ہنری الیٹ لارڈ ڈربی کو لکھتے ہیں:

"یہ معلوم تھا کہ انقلابی ایجنٹ اہل بلغاریا میں سرگرمی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں اور حال میں اسلحہ اور گولا بارود کثیر مقدار میں باہر سے لایا گیا ہے۔"(۲)

والٹر بیرنگ کی تحقیقات کے متعلق جو حکومت برطانیہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا سر ہنری الیٹ ۱۱ اگست کو لارڈ ڈربی کو لکھتے ہیں:

"مسٹر بیرنگ کا ایک خط کل ملا جس میں یہ الفاظ درج ہیں:
اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گذشتہ بغاوت کے برپا کرنے میں فلپو پولیس کا روسی قنصل پیش پیش تھا۔"(۳)

یادداشت برلن: روس ایک طرف تو انقلابی کمیٹیوں کے ذریعہ سے بلقان کے ہر حصہ میں بغاوت پھیلا رہا تھا اور دوسری طرف دول عظمٰی کا دباؤ ڈال کر باب عالی سے باغیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، چنانچہ اس کی تحریک سے آسٹریا اور پرشا بھی اس کے معاون ہو گئے اور ۱۱ مئی ۱۸۷۶ء کو پرنس گورچاکوف، کاونٹ اندراسی اور پرنس بسمارک نے برلن میں باہم مشورہ کر کے باب عالی میں بھیجنے کے لیے ایک یادداشت مرتب کی جو "یادداشت برلن" (Berlin Memorandum) کے نام سے مشہور ہے، اس میں مندرجہ ذیل مطالبات پیش کیے گئے۔

(۱) بوسنیا اور ہرزیگووینا میں بغاوت کی وجہ سے جتنے مکان منہدم ہو گئے ہیں وہ سب باب عالی کی طرف سے پھر بنا دیے جائیں، کاشت کاروں کو جتنے بیجوں اور

---

(۱) رپورٹ پارلیمنٹ، بحوالہ ضمیمہ سوانح مدحت پاشا، ص ۲۸۹ (۲) ایضاً ص ۲۵۹ (۳) ایضاً ص ۲۸۸

سامانِ زراعت کی ضرورت ہو وہ فراہم کیے جائیں اور بوسنیا اور ہرزیگووینا کے باشندوں کو تین سال کا ٹیکس معاف کر دیا جائے۔

(۲) بوسنیا اور ہرزیگووینا کے لیے ایک مخلوط کمیشن بٹھایا جائے، جس کے ارکان مسلمان اور عیسائی دونوں ہوں اور اس کمیشن کا صدر ایک مقامی عیسائی ہو۔

(۳) دونوں صوبوں سے بجز دس متعین قلعوں کے ترکی فوجیں ہٹالی جائیں۔

(۴) جب تک بوسنیا اور ہرزیگووینا میں اصلاحات مکمل طور پر نافذ نہ ہو جائیں اور امن و امان از سر نو قائم نہ ہو جائے عیسائیوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت دی جائے۔

(۵) دول عظمیٰ کے قنصلوں اور معتمدوں کو حق حاصل ہوگا کہ اپنی نگرانی میں یہ مطالبات پورے کرائیں۔

آخر میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر فوجی کارروائیاں موقوف کر کے دو مہینے کی مدت میں یہ مطالبات پورے نہ کیے گئے تو دولت علیہ کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے گا۔

فرانس اور اٹلی نے بھی اس یادداشت سے اتفاق کیا، لیکن حکومت برطانیہ کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ روس، آسٹریا اور پرشا نے اس سے مشورہ کیے بغیر یادداشت کو مرتب کر لیا، چنانچہ اس نے اس کارروائی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے انگریزی بیڑے کو خلیج بیسیکا میں جو دردانیال کے دہانے پر واقع ہے لنگر انداز ہونے کا حکم دیا۔ برطانیہ کے اس طرز عمل سے یادداشت برلن کی دھمکی بہت کچھ بے اثر ہو گئی اور مجوزہ مداخلت کا خیال ترک کر دیا گیا۔

دولت علیہ کی مشکلات: غرض دولت عثمانیہ کے لیے ہر طرف دشمنوں کا سامنا تھا، سارے بلقان میں بغاوت کی آگ پھیلتی جا رہی تھی، روس اور آسٹریا کی سرپرستی میں بوسنیا، ہرزیگووینا اور بلغاریا کی شورشیں جاری تھیں، مونٹی نیگرو عنقریب اعلانِ جنگ کرنے والا تھا، سرویا روسی افسروں کی نگرانی میں پوری طرح مسلح ہو رہا تھا، رومانیا بھی لڑائی کی تیاریوں میں مصروف تھا، یورپین پریس ترکوں کے خلاف منظم پروپگنڈا کر رہا تھا،

اندرونی حالت یہ تھی کہ خزانہ بالکل خالی تھا، حکومت کی باگ محمود ندیم پاشا کے ہاتھ میں تھی اور وہ دولت علیہ کے سب سے بڑے دشمن جنرل اگناتیف کے زیر اثر تھا، خود سلطان ان حالات سے بے خبر یا بے پروا اپنے تعیشات میں منہمک تھا، سلطنت کے اندرونی معاملات میں یوروپین طاقتوں کی مداخلت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، ''اندراسی نوٹ'' اور ''یادداشت برلن'' سے اس مداخلت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

سلطان کا عزل: ان حالات میں سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لیے کچھ محب وطن مدحت پاشا کے مکان پر جمع ہو کر غور و فکر کر رہے تھے، بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سلطان کو معزول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں لیکن اس سے پہلے صدر اعظم محمود ندیم پاشا اور شیخ الاسلام حسن فہمی آفندی کو برطرف کرنا ضروری سمجھا گیا، ۱۰ مئی کو شہزادہ عزالدین (سلطان کا سب سے بڑا لڑکا) وزارت جنگ کے دفتر کو جا رہا تھا کہ راستے میں کئی ہزار صوفتہ نے اسے روک کر سلطان کے پاس واپس بھیجا اور اس کے توسط سے یہ درخواست پیش کی کہ محمود ندیم اور حسن فہمی آفندی برخاست کر دیے جائیں، سلطان اس مطالبہ کو مسترد نہ کر سکا اور اس نے دونوں کو موقوف کر کے محمد رشدی پاشا کو صدر اعظم اور حسن خیر اللہ آفندی کو شیخ الاسلام مقرر کیا، رشدی پاشا کے اصرار سے مدحت پاشا کو بھی وزارت میں جگہ دی گئی لیکن کوئی خاص شعبہ ان کے سپرد نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد وزراء نے صورت حالات پر غور کر کے خود سلطان کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا لیکن سلطان کا عزل شیخ الاسلام کے فتوے کے بغیر ممکن نہ تھا، چنانچہ حسب ذیل استفتا کیا گیا:

> ''اگر امیر المومنین اختلال دماغ کا ثبوت دے، سلطنت کے معاملات سے عدم واقفیت ظاہر کرے، محاصل ملکی کو قوم و ملک کی طاقت برداشت سے زیادہ ذاتی اخراجات میں صرف کرے، سیاسی اور مذہبی معاملات میں ابتری پیدا کرنے کا باعث ہو اور اس کا برسر حکومت

رہنا قوم و ملک کے لیے مضر ہو جائے تو ایسی صورت میں کیا اسے
معزول کیا جا سکتا ہے؟''

شیخ الاسلام نے جواب دیا کہ معزول کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ اس فتوے کے مطابق وزرا نے ۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ مطابق ۲۹؍ مئی ۱۸۷۶ء کو سلطان عبدالعزیز کو معزول کر کے سلطان عبدالمجید خاں کے لڑکے شہزادہ مراد کو تخت پر بٹھایا، عبدالعزیز نے یہ دیکھ کر قسطنطنیہ کی فوج بھی وزرا کے زیر اثر آ گئی ہے، مزاحمت بے سود خیال کی اور خاموشی سے کنارہ کش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

سلطان مراد خاں خامس

۷ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ (۲۹ر مئی ۱۸۷۶ء) لغایہ ۱۲ر شعبان ۱۲۹۳ھ (یکم ستمبر ۱۸۷۶ء)

تخت نشینی کے بعد مراد نے تمام وزرا کو ان کی جگہ برقرار رکھا اور صدر اعظم رشدی پاشا کے نام ایک فرمان صادر کیا کہ وزرا غور و خوض کرنے کے بعد حکومت کے مختلف شعبوں کی اصلاح کے لیے اپنی رائے حضور سلطانی میں پیش کریں، اس نے خود اپنے ذاتی خیالات بھی اس فرمان میں ظاہر کیے مثلاً یہ کہ تمام رعایا کو بلا امتیاز نسل و مذہب پوری قانونی آزادی حاصل ہونی چاہیے تاکہ ان کے اندر قومی اور وطنی جذبات مستحکم ہو سکیں اور مختلف شعبوں خصوصاً شعبۂ مالیات کی از سر نو تنظیم و اصلاح کی جائے، اس نے لکھا کہ شعبۂ مالیات کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ کوئی خرچ اس وقت تک جائز نہ سمجھا جائے، جب تک سلطنت کے بجٹ میں پہلے سے منظور نہ کرا لیا گیا ہو، چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے شاہی اخراجات میں سے تین لاکھ ترکی پونڈ سالانہ کی تخفیف کر دی اور چند کوئلہ کی کانیں اور کارخانے جو شاہی ملک تھے صیغۂ مالیات کو دے دیے، مدحت پاشا اور ان کے ساتھیوں نے سلطان عبدالعزیز کے آخر عہد حکومت میں دستوری حکومت کا ایک خاکہ تیار کر لیا تھا، لیکن عبدالعزیز کی مطلق العنانی اور محمود ندیم اور اگناتیف کے اثر و اقتدار کی وجہ سے وہ صرف مسودہ کی حد تک محدود تھا، مراد نے وعدہ کیا کہ جس قدر جلد ممکن ہوگا یہ دستور نافذ کر دیا جائے گا، کمال بے اور ضیا بے جو نہایت ممتاز شاعر اور اہل قلم

تھے، اس کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر کیے گئے اور سعد اللہ بے چیف سکریٹری کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ یہ تقررات اس بات کے ضامن تھے کہ باب عالی کے خلاف قصر سلطانی کی سازشیں کامیاب نہ ہونے پائیں گی اور سلطنت کا کام ہمواری سے چلتا رہے گا۔

حامیان اصلاح اب تک کامیاب ہوتے چلے آئے تھے، سلطان عبد العزیز کی معزولی سے بظاہر استبداد اور مطلقیت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور یہ انقلاب بغیر کسی کشت و خون کے عمل میں آیا تھا، مراد کی تخت نشینی سے بڑی بڑی توقعات قائم ہو گئی تھیں، لیکن سلطنت کی بدقسمتی سے وہ صرف تین مہینے حکومت کر سکا اور یہ ساری توقعات امید موہوم ثابت ہوئیں۔

جس روز مراد تخت پر بیٹھا اسی روز سے وزراء نے محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ اعصابی انتشار میں مبتلا ہے، چنانچہ بہترین ڈاکٹروں کے مشورہ سے علاج شروع کیا گیا اور امید کی جاتی تھی کہ تھوڑے دنوں کے بعد یہ شکایت جاتی رہے گی، لیکن دو واقعات لگے بعد دیگرے ایسے پیش آئے کہ ان سے اس کے اعصاب پر بے حد اثر پڑا اور صحت کی تمام امیدیں درہم برہم ہو گئیں۔

وفات عبد العزیز: پہلا واقعہ سلطان عبد العزیز کی خودکشی کا تھا، معزولی سے پانچ دن بعد اس نے ایک قینچی لے کر اپنی دونوں بازوؤں کی رگیں کاٹ ڈالیں، جس سے خون اس کثرت سے نکلا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا، قسطنطنیہ کے سترہ ممتاز ڈاکٹروں نے جن میں ہر قوم کے لوگ تھے لاش کا معاینہ کرکے خودکشی کا خیال ظاہر کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ موت ان زخموں سے واقع ہوئی ہے جو قینچی سے دونوں بازوؤں میں کیے گئے تھے۔

کپتان حسن کا واقعہ: اس واقعہ سے مراد کے دماغ پر نہایت سخت اثر پڑا، دس روز بعد یہ دوسرا واقعہ پیش آیا جس نے اس کو اور بھی زیادہ متاثر کیا، حسن نامی ایک چرکس کپتان کسی وقت سلطان عبد العزیز کا اے ڈی کانگ رہ چکا تھا، اس کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ وہ اپنے آقا کا انتقام لینا چاہتا ہے، چنانچہ وزیر جنگ حسین عونی پاشا نے اسے بغداد جانے

کو ختم کر دے لیکن وہ نٹ گیا، اس پر عونی پاشا نے اسے قید کر دیا، دو دن قید میں رہنے کے بعد اس نے اطاعت کا اظہار کیا اور رہا کر دیا گیا، ۱۵/ جون کو رات کے وقت جبکہ تمام وزرا مدحت پاشا کے مکان پر کابینہ کے ایک جلسہ میں شریک تھے، چرکس حسن چھ بھرے ہوئے پستولوں سے مسلح ہو کر کسی طرح اس کمرہ میں داخل ہو گیا جہاں اجلاس ہو رہا تھا اور اندر پہنچتے ہی سب سے پہلے حسین عونی پاشا کو گولیوں کا نشانہ بنایا، اس کے بعد فوراً رشید پاشا، وزیر خارجہ کی طرف مڑا اور اسے بھی زخمی کیا، وزیر بحریہ قیصرلی احمد نے چاہا کہ جھپٹ کر حسن کے ہاتھ سے پستول چھین لے مگر حسن نے فوراً خنجر سے وار کر کے اسے گرا دیا، حسین عونی نہایت زخمی ہونے کے باوجود زینوں تک پہنچ گیا تھا، لیکن حسن نے اس کا پیچھا کیا اور گردن پر خنجر کی ایسی کاری ضرب لگائی کہ عونی وہیں ٹھنڈا ہو گیا، اس کے بعد کمرہ میں واپس آ کر اس نے بے تحاشا ہر طرف گولی چلانی شروع کی اور اپنے تمام پستول خالی کر دیے، انہی گولیوں سے چھت کا جھاڑ بھی چور چور ہو گیا اور کمرہ میں اندھیرا ہو گیا، یہ تاریکی اس وقت بہت مفید ثابت ہوئی کیوں کہ محمد رشدی پاشا، خالد پاشا اور قیصرلی احمد پاشا حسن کی زد سے بچ کر قریب کے ایک کمرہ میں پہنچ گئے اور دروازہ بند کر لیا اندھیرے میں مدحت پاشا کے کوٹ کی آستین حسن کے ہاتھ آ گئی مگر وہ خود بچ گئے، ان کا ایک ملازم احمد آغا گولیوں کی آواز سن کر دوڑا اور قاتل کو گرفتار کرنا چاہا مگر حسن نے وہیں اسے گولی سے مار کر ختم کر دیا، یکی شہر شکری بے کا بھی، جو وزیر بحر کا ایڈی کانگ تھا اور اسے بچانے کے لیے دوڑا تھا، بالآخر فوجی پولیس کا ایک دستہ آیا اور فریقین کے درمیان کچھ دیر تک باقاعدہ جنگ ہوتی رہی، تب کہیں قاتل گرفتار ہوا، اسے عدالت سے پھانسی کی سزا دی گئی لیکن آخری وقت تک وہ اس سے انکار کرتا رہا کہ کوئی اور بھی اس کا شریک جرم ہے۔ (۱)

معزولی کا سوال: ان حادثات کا اثر مراد کے دماغ کے لیے تباہ کن ثابت ہوا، اس کی

---

(۱) سوانح مدحت پاشا ص ۹۲-۹۳

صحت کی طرف سے اب مایوسی ہونے لگی، سلطنت کے لیے یہ صورت حال نہایت نازک تھی، مجلس وزرا میں دو جماعتیں قایم ہوگئیں، صدر اعظم محمد رشدی پاشا اور اکثر وزرا یہ جانتے تھے کہ مراد اصلاحات کا حامی ہے، اس لیے وہ اسے معزول کر کے اصلاحات کو خطرہ میں ڈالنے پر تیار نہ تھے، خصوصاً اس وجہ سے کہ آیندہ سلطان کے طرز عمل کے متعلق انھیں کوئی آگاہی نہ تھی، اس بنا پر ان کی رائے تھی کہ صبر سے کام لینا چاہیے اور مراد کی صحت یابی کا انتظار کرنا چاہیے۔

دوسری طرف سلطان کے بہنوئی داماد محمود جلال الدین پاشا کی پارٹی تھی، جس میں قصر سلطانی کے بعض اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ فوج کے دو ایک با اثر مارشل مثلاً رودیف پاشا کمانڈر قسطنطنیہ شامل تھے، یہ لوگ مدحت پاشا اور حامیان دستور کے خیالات سے متفق نہ تھے، وہ دیکھتے تھے کہ اگر مراد معزول نہ کیا جائے گا تو ان کی امیدیں پوری نہ ہوسکیں گی، کیوں کہ وزارت میں ان کی اقلیت تھی، قصر سلطانی میں ضیا بے اور کمال بے جیسے لوگوں کا اقتدار تھا اور باب عالی میں حامیان اصلاح کی حکومت تھی، لیکن اگر مراد معزول کردیا گیا اور شہزادہ عبدالحمید تخت پر آیا تو اصلاحات کی پوری اسکیم درہم برہم ہوجائے گی اور وہ خود برسر حکومت آجائیں گے، ان کے پیش نظر زیادہ تر اپنا ذاتی اقتدار تھا، اس پارٹی کی پشت پر رجعت پسندوں کی پوری جماعت تھی۔

بدقسمتی سے صورت حالات بھی اسی جماعت کے موافق تھی، عثمانی قانون کے رو سے کوئی ایسا شخص جس کا دماغ پوری طرح صحیح نہ ہو، سلطان نہیں ہوسکتا تھا، عثمان اول کی تلوار باندھنے کی رسم بھی جو تخت نشینی کی ایک ضروری اور نہایت اہم رسم تھی ابھی ادا نہیں ہوئی تھی، ابھی تک کوئی سلطان نماز جمعہ اور اس کے بعد کی رسم سلاملق سے غیر حاضر نہیں ہوا تھا، ان موقعوں پر مراد کے موجود نہ ہونے سے عوام میں بجا طور پر تشویش پھیل رہی تھی، یوروپین حکومتیں الگ دخل انداز ہو رہی تھیں، ان کے سفرا یہ سوال کرتے تھے کہ انھیں کب اور کس سلطان کے سامنے اپنے سفارت نامے پیش کرنے چاہئیں۔

ان حالات میں مجلس وزرا نے یہ فیصلہ کیا کہ مدحت پاشا، ولی عہد سلطنت شہزادہ عبدالحمید سے زبانی گفتگو کر کے یہ معلوم کریں کہ اصلاحات کے جاری کرنے میں اس کے تعاون پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور اگر اس طرف سے اطمینان ہو جائے تو اسے تخت پر بٹھانے سے پہلے مندرجہ ذیل شرائط منظور کرا لیے جائیں۔

(۱) بلا تاخیر جدید دستور حکومت کا اعلان کر دیا جائے گا۔

(۲) امور حکومت میں صرف ذمہ دار وزیروں سے مشورہ کیا جائے گا۔

(۳) ضیا بے اور کمال بے کو کاتب خاص (پرائیویٹ سکریٹری) اور سعد اللہ بے کو باشکاتب (چیف سکریٹری) مقرر کیا جائے گا۔

مراد کا عزل: عبدالحمید نے مدحت پاشا کی یہ تینوں شرطیں منظور کر لیں، اس کے وعدہ پر اعتماد کر کے وزرا نے مراد کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا، معزولی سے پہلے صدر اعظم رشدی پاشا نے مراد کے دماغی اختلال کی نسبت قسطنطنیہ کے چھ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے تصدیق کرائی، ان سب نے متفقہ طور پر لکھا کہ اگر مدت دراز کے بعد خلاف توقع مراد کا دماغ درست بھی ہو جائے تو بھی وہ اپنی اصلی حالت پر کبھی نہ آ سکے گا، چنانچہ اختلال دماغ کی بنا پر شیخ الاسلام نے اس کے عزل کا فتویٰ دیا اور ۱۲/ شعبان ۱۲۹۳ھ مطابق یکم ستمبر ۱۸۷۶ء کو وزرا نے اسے تخت سے اتار کر شہزادہ عبدالحمید کو اس کی جگہ بٹھایا۔

* * *

سلطان عبدالحمید خاں ثانی

۱۲۹۳ھ تا ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء

عبدالحمید کو تخت پر لانے سے پہلے مدحت پاشا اور ان کی پارٹی نے تین شرطیں اس سے منظور کرائی تھیں: (۱) قانون اساسی کا اعلان (۲) امور سلطنت میں صرف ذمہ دار وزیروں سے مشورہ کرنا (۳) ضیا بے اور کمال بے کو کاتب خاص (پرائیویٹ سکریٹری) اور سعد اللہ بے کو باشکاتب (چیف سکریٹری) مقرر کرنا، لیکن عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد عبدالحمید نے آخری دو شرطوں کی مطلق پابندی نہیں کی اور پہلی شرط صرف نام کے لیے پوری کی، پہلے ہی تقررات سے اس کی آئندہ پالیسی کا اندازہ ہو گیا، اس نے داماد محمود جلال الدین پاشا کو مشیر سرائے سلطانی (Grand Marshal the Palace) اور انگلیز سعید پاشا(۱) کو رئیس یاوریہ (فرسٹ ایڈی کانگ) کے عہدہ پر مقرر کیا، یہ دونوں مدحت پاشا کی جماعت کے خلاف تھے، لیکن چوں کہ ان عہدوں کا تعلق قصر سلطانی سے تھا، اس لیے ان کا تقرر تمامتر سلطان کی ذاتی رائے پر منحصر تھا مگر باشکاتب (چیف سکریٹری) کا معاملہ بالکل دوسرا تھا، یہ عہدہ دار ہمیشہ سے سلطان کا دست راست ہوتا آیا تھا اور اسی کے ذریعہ سے سلطان اور وزرا کے درمیان تمام

---

(۱) سعید پاشا نے چوں کہ انگلستان جا کر تعلیم حاصل کی تھی اس لیے "انگلیز" کا اضافہ اس کے نام میں کر دیا گیا تھا اور وہ اسی امتیاز کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔

مراسلت ہوا کرتی تھی، چوں کہ وہ برابر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اس لیے اس کی اہمیت غیر معمولی تھی، اس کا عہدہ صدر اعظم کے عہدہ کے برابر اہم سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مدحت پاشا نے عبدالحمید سے شروع ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اس جگہ پر سعد اللہ بے کو مقرر کرے گا، لیکن اس نے بجائے سعد اللہ بے کے سعید بے کو (جو محمود پاشا کا آدمی تھا) چیف سکریٹری مقرر کر دیا۔ مدحت پاشا نے تمام وزیروں کی طرف سے اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی باصرار درخواست کی لیکن عبدالحمید نے اپنا حکم نہ بدلا۔

صدارت مدحت پاشا: دسمبر ۱۸۷۶ء میں سلطان نے مدحت پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، پہلی ہی مجلس وزارت میں جو ان کے زیر صدارت محمود پاشا کے مکان پر منعقد ہوئی مخالف پارٹی کے ممبروں کی نیت ظاہر ہو گئی، جب قانون اساسی اور اس کے اعلان کا مسئلہ زیر بحث آیا تو جودت پاشا وزیر عدل نے جو محمود پاشا کی پارٹی میں خفیہ طور پر شامل تھا یہ تجویز پیش کی کہ دستور کا مسئلہ فی الحال ملتوی کر دیا جائے کیوں کہ نئے سلطان کی تخت نشینی کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، مدحت پاشا کو اس پر سخت غصہ آیا اور انھوں نے جواب دیا کہ مراد کو معزول کرنے اور عبدالحمید کو تخت پر لانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ دستور اساسی کا اعلان جلد سے جلد کر دیا جائے، انھوں نے محمود، جودت اور ان کی پارٹی کے ممبروں کو صاف الفاظ میں متنبہ کر دیا کہ اگر اس بنیادی مسئلہ کے طے کرنے میں کچھ بھی پس و پیش کیا گیا تو وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائیں گے، مصلحت دیکھ کر مخالفین اس وقت خاموش ہو گئے۔

ملک میں دستور کے اعلان کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا، اسی اثنا میں اخبار استقبال میں چند مضامین شائع ہوئے جن سے دستور کی اشاعت کے متعلق سلطان کے خلوص نیت میں شبہ کا اظہار ہوتا تھا، یہ مضامین قصر سلطانی میں سخت ناگواری کی نظر سے دیکھے گئے اور یہ خیال کیا گیا کہ ان کا لکھنے والا ضیا بے کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے، چنانچہ سلطان نے ضیا بے کو قسطنطنیہ سے ہٹا دینے کا عزم کر لیا اور اسے بحیثیت سفیر کے

برلن بھیجنے کا حکم صادر کیا، اس سے یہ غرض بھی تھی کہ اہل قسطنطنیہ ضیا بے کو آیندہ پارلیمنٹ میں ممبر منتخب نہ کرسکیں جیسا کہ انھوں نے فیصلہ کرلیا تھا، اس کے بعد سلطان نے استقبال کی اشاعت بھی بند کردی۔

دستور اساسی کا اعلان: بالآخر ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو دستور اساسی کا اعلان کیا گیا، باب عالی کے سامنے کھلے میدان میں ایک وسیع شہ نشین بنا کر اسے پھولوں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا، وہاں تمام اعیان حکومت، علما اور وزرا جدید دستور کا اعلان سننے کے لیے جمع ہوئے، جس کی نسبت یہ توقع قائم کی گئی تھی کہ سلطنت عثمانیہ کے ایک نئے دور کا افتتاح کرے گا، سڑک پر دو رویہ فوجوں کی قطار تھی، فوجی بینڈ کی آواز پر مجمع کی نگاہیں ادھر اٹھیں اور سعید پاشا پورے یونیفارم میں آتا ہوا دکھائی دیا، اس نے سلطان کا خط ہمایوں، جو صدر اعظم کے نام تھا اور جس کے ساتھ دستور اساسی کا مسودہ بھی تھا، لاکر مدحت پاشا کو دیا، خط ہمایوں اور دستور کا مسودہ حاضرین کو پڑھ کر سنایا گیا اور اسی وقت دستور کی ہزاروں چھپی ہوئی نقلیں مجمع میں تقسیم کی گئیں، اس کے بعد مدحت پاشا نے تقریر کی جس میں سلطان کا شکریہ ادا کیا اور اس دستور کی اہمیت حاضرین کو سمجھائی، جب انھوں نے تقریر ختم کی تو مفتی اورنہ نے دعا مانگی اور سب نے آمین کہی اور ایک سو ایک توپوں کی سلامی کے ذریعہ قسطنطنیہ کے تمام باشندوں کو اطلاع دی گئی کہ دستور اساسی کا اعلان ہوگیا۔

اس دستور کے رو سے ایک پارلیمنٹ قائم کی گئی جو دو ایوانوں پر مشتمل تھی: دار الاعیان اور دار المبعوثین، دار الاعیان کے ممبروں کا انتخاب نامزدگی کے ذریعہ اور دار المبعوثین کے ممبروں کا کثرت رائے سے ہونا قرار پایا، پارلیمنٹ کے ماتحت ایک کابینہ وزارت بھی قائم کی گئی، سلطان کی تمام رعایا کو بلا امتیاز مذہب و ملت برابر حقوق دیے گئے اور حکومت کے عہدے سب کے لیے یکساں طور پر کھول دیے گئے، دستور میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا کہ سلطنت کے تمام باشندوں کے لیے ایک مشترک قانون نافذ کیا جائے اور ان سب کا سرکاری نام خواہ وہ کسی قوم یا فرقہ سے تعلق

رکھتے ہوں 'عثمانی' قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ فرمان میں جلسوں اور پریس کی آزادی، عدل وانصاف کے قیام اور جبری تعلیم کا بھی وعدہ کیا گیا۔

دستور اساسی کے اعلان پر ملک کے ہر طبقے نے مسرت کا اظہار کیا، علما شیخ الاسلام خیر اللہ آفندی کی قیادت میں، عیسائی پادری اپنے بطریقوں کے ساتھ، شاکر آفندی جو قسطنطنیہ کے کبار علما میں تھے طلبہ کی جماعت لے کر اور دارالسلطنت کے عام باشندے جھنڈے لیے ہوئے جن پر 'آزادی' کا لفظ منقوش تھا، مدحت پاشا کے مکان پر مبارک باد دینے کے لیے آئے، شام کے وقت تمام مسجدوں میں چراغاں کیا گیا، لوگ مشعلیں لیے ہوئے سڑکوں پر گشت کرتے تھے اور "سلطان زندہ باد" اور "مدحت پاشا زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے، سلطنت کے تمام صوبوں سے مبارک باد کے تار آئے، جن میں مسرت کا اظہار کیا گیا تھا، دوسرے روز صبح کو مدحت پاشا یونانی اور آرمینی بطریقوں اور یہود کے بڑے ربی کے پاس گئے۔ ان کی مبارک باد کا شکریہ ادا کیا اور انھیں ترغیب دی کہ ملک کی فلاح وبہبود کے لیے ایک علم کے نیچے متحد ہوکر کام کریں، بطریقوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا، مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ مسلمان اور عیسائیوں میں کوئی فرق نہیں کرتے کیوں کہ دونوں ایک ہی ملک کے باشندے ہیں۔

ایک بدگمانی: عیسائی رعایا کے لیے دستور اساسی کا اعلان خواہ کتنی ہی مسرت کا باعث ہوا ہو، یوروپین حکومتوں خصوصاً برطانیہ کو یہ چیز پسند نہ آئی کیوں کہ اس سے دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں ان کی مداخلت کا بہت کچھ سد باب ہو رہا تھا، چنانچہ سب سے پہلا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس دستور کا مقصد محض دول یورپ کی اس کانفرنس کو شکست دینا تھا جو عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے قسطنطنیہ میں منعقد ہونے والی تھی، یہ صحیح ہے کہ دستور کا اعلان اسی روز ہوا جس روز کانفرنس منعقد ہوئی لیکن اس کے لیے مدحت پاشا اور ان کے ساتھی ایک سال سے کوشش کر رہے تھے جیسا کہ سرہنری ایلیٹ سفیر برطانیہ کے ایک خط سے صاف معلوم ہوتا ہے، جو رسالہ نائنٹینتھ سنچری (Ninteenth Century)

بابت فروری ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا مسٹر ہنری لکھتے ہیں:

"دسمبر ۱۸۷۵ء کے شروع میں مجھ سے مدحت پاشا کے ایک ساتھی نے بیان کیا جو سلطنت کے بعض اعلیٰ ترین عہدوں پر مامور رہ چکا تھا کہ مدحت پاشا کی پارٹی کا مقصد ایک دستور اساسی حاصل کرنا تھا، یہ واقعہ دستور کے اعلان سے ایک سال سے زیادہ پہلے کا ہے، جبکہ یہ کہا گیا کہ دستور کا اعلان محض اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کانفرنس کو شکست دی جائے جو اس وقت قسطنطنیہ میں منعقد کی گئی تھی۔ چند دنوں کے بعد مدحت پاشا خود مجھ سے ملنے آئے اور اپنے خیالات کو اس تفصیل سے بیان کیا کہ اس سے پہلے کبھی اس طرح بیان نہیں کیا تھا، گو میں ان خیالات کے عام منشا سے واقف تھا، انھوں نے بیان کیا کہ سلطنت تیزی کے ساتھ بربادی کی طرف اڑی جا رہی ہے، رشوت ستانی اور دوسری بے عنوانیاں جس حد تک پہونچ چکی ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں پہونچی تھیں، سرکاری محکمے روپے سے بالکل خالی ہیں، لیکن کروڑوں روپے قصر سلطانی میں پہونچ رہے ہیں، صوبے گورنروں کی بے روک ٹوک سے جنھوں نے اپنے عہدے قصر سلطانی سے خریدے ہیں برباد ہو رہے ہیں، جب تک پورا نظام نہ بدل دیا جائے کوئی چیز سلطنت کو بچا نہیں سکتی، مدحت پاشا کے نزدیک اس کا واحد علاج یہ تھا کہ پہلے سلطان پر قابو حاصل کیا جائے، اس طرح کہ وزرا کو ذمہ دار بنا کر بالخصوص مالیات میں ایک قومی مجلس شوریٰ کا جواب دہ بنا دیا جائے، دوسرے یہ کہ اس مجلس کو حقیقی طور پر قومی بنایا جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ مختلف طبقوں اور مذہبوں کے تمام امتیازات مٹا دیے جائیں اور عیسائیوں کو بالکل مسلمانوں کے مساوی حقوق دے دیے جائیں،

تیسرے یہ کہ مرکزیت توڑ کر مقامی حکومت قایم کردی جائے اور گورنروں کو صوبہ جاتی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے، یقیناً اسے تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ خیالات روشن خیالی پر مبنی اور مدبرانہ تھے اور حوصلہ افزائی کے مستحق تھے، مدحت پاشا نے بار بار اس کا ذکر کیا کہ انگریز قوم کی ہمدردی مصلحین کے لیے کس قدر قیمتی ہوگی اور کس طرح ان کے ہم وطن انگلستان کی مثال کو سامنے رکھ کر اس کی تقلید کرنی چاہتے ہیں، میں نے جواب دیا کہ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ ان کے قایم کیے ہوئے اصولوں پر جو تجویزیں مرتب کی جائیں گی، انہیں ہر انگریز جو میری طرح مطلقیت کے بجائے دستوری حکومت کی پابندیوں کے فوائد کا قائل ہے ضرور پسند کرے گا اور ان کی کامیابی چاہے گا، میں نے دیانت داری کے ساتھ انہیں اس کا یقین دلایا تھا کیوں کہ بلاشبہ سب سے آخری چیز جس کی میں توقع کرسکتا تھا یہ تھی کہ جو لوگ اس ملک میں دستوری اصولوں کے لیے اپنی سرگرمی کا سب سے زیادہ مظاہرہ کرتے ہیں وہی سب سے پہلے ان لوگوں کی تحقیر و تذلیل اور ان کی تجویزوں کا استہزا کریں گے جو ان اصولوں کو اپنے ملک میں رائج کرنے کی کوشش کررہے تھے۔"(۱)

اس موقع پر برٹش پارلیمنٹ کے ایک ممبر جوزف کاوین (Joseph Cowen) کی ایک تقریر کا اقتباس بھی بے محل نہ ہوگا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ کے ارباب حکومت ترکی میں دستوری حکومت کے قیام کو کس نظر سے دیکھتے تھے، مسٹر کاوین ۳۱ر جنوری ۱۸۸۰ء کو انگلستان کی خارجی پالیسی پر تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ترکی میں سالوں سے ایک سرگرم اور محب وطن پارٹی

---

(۱) سوانح مدحت پاشا

> موجود ہے، جو اپنے ادارت کو مغربی طرز زندگی اور یورپین ضروریات کے مطابق بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس پارٹی کا سیدھا سادا پروگرام یہ ہے کہ اس جزیرہ نما کی مختلف قوموں کو باہم ملا کر ایک متحدہ حکومت قائم کی جائے، جس کی بنیاد سب کی مذہبی اور سیاسی مساوات پر ہو، فواد پاشا اور عالی پاشا نے ان اصولوں کے لیے مدت تک جدوجہد کی اور اب انہی اصولوں کو اسی خلوص کے ساتھ مدحت پاشا اور ان کے حامی پیش کر رہے ہیں، ہر مذہب اور قوم کے لوگ ایک ہی سطح پر رکھے جائیں گے، اس پروگرام کی تائید عیسائی اور مسلمان دونوں یکساں طور پر کر رہے ہیں مگر ان ترک مصلحین کی مخلصانہ کوششوں کا ذکر جس حقارت کے ساتھ انگلستان کے لبرل سیاست داں کرتے تھے وہ اس بحث کے منجملہ دیگر قابل افسوس واقعات کے ایک نہایت تکلیف دہ اور افسوس ناک واقعہ تھا۔ جو بھی ترکی دستور پر آوازے کستے یقیناً یہ لبرل گورنمنٹ کے حامیوں کا کام نہ تھا کہ وہ اس کے لیے تحقیر و استہزا کا طریقہ اختیار کرتے۔ بلا شبہ ایسی حکومت کے قیام کا تصور ناممکن نہیں ہے جس میں مسلمان اور عیسائی دونوں متحد ہوں اور جو مہلک اثر اس وقت قسطنطنیہ پر غالب ہے، وہ ترکی کی سیاسی زندگی سے دور کر دیا جائے۔“(۱)

قسطنطنیہ کی کانفرنس: ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو جس روز قانون اساسی کا اعلان ہوا قسطنطنیہ میں دول عظمیٰ کے نمائندوں کی کانفرنس منعقد ہوئی، ابتدائی کارروائی مشکل سے ختم ہوئی تھی کہ باسفورس کے دوسرے کنارہ سے توپوں کی آواز آنے لگی، صفوت پاشا وزیر خارجہ دولت عثمانیہ نے کھڑے ہو کر ارکان مجلس کو مخاطب کیا اور کہا کہ ”ان توپوں کی

---

(۱) تقریرات جارف کاڈن مطبوعہ لندن ۱۹۰۹ء

آواز جو آپ سن رہے ہیں وہ سلطان المعظم کی طرف سے اعلانِ قانونِ اساسی کی دلیل ہے اور یہ قانون بلا استثنا سلطنت کی تمام رعایا کے حقوق وحریت کا کفیل ہے، کانفرنس کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا، اب اس کا انعقاد اور اس کی کارروائیاں فضول ہیں، صفوت پاشا کی تقریر سے مجلس پر سناٹا چھا گیا، چند لمحوں کے بعد اگناتیف نے مہر خاموشی توڑی اور یہ تجویز پیش کی کہ کانفرنس کو اپنا کام شروع کرنا چاہیے، دول عظمیٰ کے وکلا ایک مہینہ سے قسطنطنیہ میں مقیم تھے اور باہم جلسے کر رہے تھے، ان جلسوں میں ترک مندوبین عمداً شریک نہیں کیے گئے تھے، ۲۳؍ دسمبر کے باضابطہ اجلاس سے پہلے وہ لائحہ عمل جو دولت علیہ کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا طے کر لیا گیا تھا، اس غیر معمولی کارروائی کا مقصد باب عالی کو یہ یقین دلانا تھا کہ کانفرنس جو فیصلہ کرے گی وہ دول یورپ کا متفقہ فیصلہ ہوگا اور باب عالی کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ وہ دول عظمیٰ کی رقابتوں سے کچھ فائدہ اٹھا سکے گا چونکہ تمام معاملات حقیقتاً پہلے ہی طے کر لیے گئے تھے اس لیے کانفرنس کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ اپنے فیصلوں کو باضابطہ طور پر مرتب کر دے، چنانچہ کانفرنس کی کارروائی روسی سفیر کی اس تجویز سے شروع ہوئی کہ صوبہ بلغاریا کو حکومت خود اختیاری دے دی جائے، وہاں ایک عیسائی والی مقرر کیا جائے، ایک قومی ردیف قائم کی جائے اور ترکی فوجیں صرف چند متعین قلعوں میں باقی رکھی جائیں، ترک مندوبین کے اس جواب پر کہ یہ امور دائرۂ بحث سے بالکل خارج اور قطعاً ناقابل قبول ہیں، یہ تجویز یوں ترمیم کر دی گئی کہ بلغاریا کو ایک خاص رعایتی گورنمنٹ دے دی جائے، ایک بین الاقوامی کمیشن اس کے انتظامات کی نگرانی کے لیے مقرر کر دیا جائے اور اس کے گورنر کا تقرر دول عظمیٰ کی منظوری سے ہوا کرے، اگناتیف نے یہ تجویز کم سے کم مطالبہ کے طور پر پیش کی تھی، ترک مندوبین نے اس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ سرویا اور رومانیا کی مثالیں سامنے ہیں، جن کو مخصوص رعایتی حکومتیں دی گئی تھیں اور وہی خاص انتظامات ان کے لیے بھی کیے گئے تھے جو بلغاریہ کے لیے تجویز ہو رہے ہیں لیکن نتیجہ کو دیکھتے ہوئے اسی تجویز کو بلغاریا میں

دہرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا، انھوں نے بتایا کہ سرویا اور رومانیا کی مسلمان آبادی کے ساتھ رواداری اور مساوات کا وہ سلوک نہیں کیا گیا جس کا وعدہ کیا گیا تھا اور جو بطور شرط کے منظور کیا گیا تھا، برخلاف اس کے وہاں کے مسلمان باشندے ترک وطن پر مجبور ہوئے، علاوہ بریں یہ ریاستیں زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کے بعد بھی جب کہ انھیں کسی قسم کی شکایت کا موقع باقی نہ رہ گیا، سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں سے اتحاد کرنے یا اس کے خلاف سازش کرنے سے بھی باز نہ آئیں، بالآخر طویل بحث ومباحثہ کے بعد دول عظمیٰ کے نمایندوں کی طرف سے کم سے کم مطالبہ یہ پیش کیا گیا جس میں ب کسی تخفیف کی گنجائش نہ تھی کہ مقامی حکام کی مدد کے لیے ایک قنصلی کمیشن مقرر کر دیا جائے اور بلغاریا، ہرزیگووینا اور بوسنیا کے صوبوں کے والی پہلے پانچ سال تک دول عظمیٰ کی منظوری سے مقرر کیے جائیں، ترک مندوبین اس تجویز سے بھی اتفاق نہ کر سکے، انھوں نے کہا کہ قنصلی کمیشن کا تقرر قوم کے حقوق خاص میں رخنہ اندازی کا باعث ہوگا، جسے منظور کرنا ہمارے اختیارات سے باہر ہے، اس کے علاوہ ایک عملی دشواری یہ بھی ہے کہ ان صوبوں کے لیے کوئی مخصوص انتظام کر دینے سے سلطنت کے دوسرے صوبوں میں بے اطمینانی پیدا ہو جانے کی اور غالب ہے کہ بعض میں شورش بھی رونما ہو جائے، انھوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ یہ سوچ سلطنت کے کسی ایک حصہ کے لیے مخصوص مراعات حاصل کرنے کا نہیں ہے جب کہ سلطان کی طرف سے ایک ایسے دستور کا اعلان کر دیا گیا ہے، جس میں بلا امتیاز تمام رعایا کو سلطنت کے ہر حصہ میں زیادہ سے زیادہ امکانی آزادی اور مساوی حقوق دے گئے ہیں، اس پر جنرل اگناتیف نے ایک نہایت سخت تقریر کی جس کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا اور ارکان مجلس نے ترک مندوبوں کی اس احتجاجی تقریر کے سننے کا بھی انتظار نہیں کیا جو اگناتیف کی تقریر کے جواب میں وہ کرنا چاہتے تھے۔ (۱)

---

(۱) سوانح مدحت پاشا ص ۱۳۳-۳۵

مجلس عالیہ کا فیصلہ: بہرحال یہ آخری ترمیم شدہ تجویز دول عظمیٰ کے نمایندوں نے ایک الٹی میٹم کی شکل میں باب عالی میں بھیجی اور یہ دھمکی دی کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اس کا جواب قابل اطمینان نہ آیا تو ہم قسطنطنیہ سے روانہ ہو جائیں گے، مدحت پاشا نے سلطان کے حکم سے ایک مجلس عالیہ منعقد کی جس میں سلطنت کی تمام قوموں کے نمایندے شریک کیے گئے اور ان کے سامنے کانفرنس کی یہ آخری تجویز پیش کی گئی، مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں صاف صاف بتادیا کہ اگر یہ تجویز مسترد کردی گئی تو جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں، اس کے بعد حاضرین نے پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا، رؤف بے بن رفعت پاشا نے کہا کہ لڑائی مثل بخار کی بیماری کے ہے جس سے بچنا ممکن ہے لیکن کانفرنس کی تجویز مثل پھیپھڑوں کی دق کے ہے جس کا لازمی نتیجہ قبر ہے، صادا پاشا نے ایک طویل خطبہ میں کہا کہ ہم اپنی عزت کی اہانت پر موت کو ترجیح دیتے ہیں، وکیل بطریق ارمنی نے بھی ایک لمبی تقریر کی جس میں کانفرنس کے مطالبات کے مسترد کرنے پر زور دیا(۱) غرض مجلس نے متفقہ طور پر دول عظمیٰ کے مطالبات منظور کرنے سے انکار کردیا، دول عظمیٰ کے الٹی میٹم کے خلاف مجلس عالیہ کا یہ فیصلہ یقیناً تعجب خیز تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز وہ اتفاق واتحاد تھا جو اس نازک موقع پر وطن کی محبت اور عزت کے لیے مجلس کے مسلمان، عیسائی اور یہودی ممبروں میں ظاہر ہو رہا تھا، یونانی اور کیتھولک آرمینی ممبروں کا جوش خصوصیت کے ساتھ بہت نمایاں تھا، باب عالی نے مجلس کے اس فیصلہ کی اطلاع دول عظمیٰ کے نمایندوں کو دے دی، چنانچہ ۲۰ رجنوری ۱۸۷۷ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہوگئے اور کانفرنس برخاست ہوگئی۔

روس سے جنگ: روس نے جنگ کی تیاری شروع کردی، ۱۶راپریل ۱۸۷۷ء کو اس نے رومانیا کے ساتھ اس شرط پر کہ اس کی آزادی اور خودمختاری تسلیم کرلی جائے گی ایک معاہدہ کرلیا جس کے مطابق روسی فوجوں کو رومانیا کے علاقوں سے گذرنے کی اجازت مل

---

(۱) اسباب الانقلاب العثمانی از محمد روحی بک الخالدی مطبوعہ مصر ۱۳۲۶ھ

گئی، اس کے بعد ۲۴/ اپریل کو روس نے دولت عثمانیہ کے خلاف باضابطہ اعلان جنگ کر کے اپنی فوجوں کو عثمانی سرحدوں کے عبور کرنے کا حکم دیا اور پانچ روز کے بعد مونٹی نیگرو نے بھی صلح توڑ کر از سر نو جنگ شروع کر دی۔

روس نے پہلے ہی کافی تیاری کر لی تھی، رومانیا کے علاوہ اس نے آسٹریا کی طرف سے بھی اطمینان کر لیا تھا، زار نے رائشتاٹ (Reichstadt) میں شہنشاہ آسٹریا سے خود ملاقات کر کے اسے مطمئن کر دیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا مطلق ارادہ نہیں رکھتا، نیز یہ معاہدہ بھی کر لیا تھا کہ اگر اس جنگ میں آسٹریا غیر جانبدار رہا تو بصورت فتح بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے اس کے حوالہ کر دیے جائیں گے، جنگ شروع کرنے کے چند دنوں بعد (۸/ جون ۱۸۷۷ء) روس نے انگلستان کی غیر جانبداری بھی اسی قسم کے ایک معاہدہ سے حاصل کر لی اور وعدہ کیا کہ مصر اور نہر سویز سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور نہ قسطنطنیہ یا آبنائے باسفورس پر حملہ ہوگا۔

بحر اسود پر ترکی بیڑا قابض تھا، اس لیے روسیوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ رومانیا کی راہ سے حملہ آور ہوں، اہل رومانیہ نے نہ صرف روسی فوجوں کو اپنے ملک سے گذرنے کی اجازت دی بلکہ ان کے امیر شہزادہ چارلس اور وزیر اعظم نے ملکی پارلیمنٹ پر دباؤ ڈال کر یہ تجویز بھی منظور کرالی کہ روس کی حمایت میں رومانی فوجیں بھی میدان جنگ میں روانہ کر دی جائیں لیکن روسی جنرل گورچاکوف (Gortchakoff) نے رومانی فوجوں کی خدمات قبول کرنے سے حقارت کے ساتھ انکار کر دیا، باب عالی نے رومانیا کا یہ طرز عمل دیکھ کر جو دولت علیہ کی ایک باج گذار ریاست تھی، رومانی شہر کلفات (Kalafat) پر گولہ باری کا حکم دیا، رومانیا نے اس کے بعد باضابطہ طور پر اعلان جنگ کر کے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

۲۲/ جون ۱۸۷۷ء کو روسی فوجوں نے دریائے ڈینوب کو عبور کر لیا اور اب بلغاریا میدان جنگ بن گیا، ۲۷/ جون کو انھوں نے سستوا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر

۷؍ جولائی کو ترنوو پر جو بلغاریا کا قدیم پایہ تخت تھا قبضہ کر لیا، اس کے بعد جنرل گورکو کوہ بلقان کو طے کرتا ہوا درۂ شپکہ پر حملہ آور ہوا اور اسے ترکوں سے لے لیا، روس کے لیے اب ادرنہ اور وہاں سے قسطنطنیہ کا راستہ کھلا ہوا تھا، اس نازک موقع پر سلطان نے فرانسیسی نومسلم محمد علی کو جو کریٹ کا گورنر جنرل تھا، تمام عثمانی افواج کا سپہ سالار اعظم مقرر کر کے روسیوں کے مقابلہ میں روانہ کیا، محمد علی کے پہنچتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا، جنرل گورکو اپنے بلغاری حلیفوں کی مدد کے باوجود ستارا زگورا میں شکست کھا کر کوہ بلقان کی طرف بھاگا، اسی اثنا میں عثمان پاشا ودین سے نکل کر پلونا میں آ گئے تھے، جو دریائے ڈینوب کے جنوب میں بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے، جنرل شلدر نے حملہ کرنے میں عجلت کی مگر اس کی فوج کو نہایت بے ترتیبی کے ساتھ پسپا ہو کر نکوپلس میں پناہ لینی پڑی، اس کے بعد ایک دوسری روسی فوج جنرل کروڈنر کی قیادت میں آگے بڑھی لیکن اسے بھی اپنے تین ہزار مقتول میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا، پلونا کا چھوٹا سا شہر روسی فتوحات کے لیے سب سے بڑا سنگ راہ ثابت ہوا۔

پلونا: مسٹر ایلیسن فلپس اس موقع پر لکھتے ہیں: ''اب جنگ کا سارا نقشہ یک بیک بدل گیا تھا، زار یا گرینڈ قسطنطنیہ پر فاتحانہ شوکت و اجلال کے ساتھ پیش قدمی کرنے کا وہ خواب جو باوجود گذشتہ تلخ تجربات کے روسی اب تک دیکھ رہے تھے نسیاً منسیاً ہو گیا، فی الحال تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ نہیں بلکہ روسی سلطنت موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور تمام یورپ کی نظریں انتہائی بیم و رجا کے ساتھ اس محاربہ پر لگی ہوئی تھیں، جو بلغاریا کے ایک معمولی شہر کے گرد ہو رہا تھا اور جس کے انجام سے سارے مشرق کی قسمت وابستہ تھی، روسی مستقر جنگی میں اس خطرہ کا پورا احساس تھا، گرینڈ ڈیوک نکولس نے محمد علی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے فوج کا ایک حصہ چھوڑا اور فوج کے اصلی حصہ کو جس کی تعداد ستر ہزار تھی ہمراہ لے کر بسرعت تمام پلونا پہنچا، وہاں پہنچ کر ۱۱ ستمبر کو اس نے ایک زبردست حملہ کیا جس کے متعلق امید واثق تھی کہ وہ پچھلی ناکامیوں کی کافی سے زیادہ

تلافی کر دے گا، اس کا انجام سنگین تر ہوا، اس میں شک نہیں کہ داہنے بازو پر رومانیوں اور بائیں بازو پر سکوبلیف نے ترکی مقامات پر قبضہ کر لیا لیکن مرکزی حملہ خوفناک خوں ریزی کے ساتھ جس میں سولہ ہزار مقتول و مجروح ہوئے پسپا کر دیا گیا، ان سب سے زیادہ تہلکہ انگیز وہ خبر تھی جو ایشیا سے موصول ہوئی جہاں مختار پاشا نے روسی حملہ آوروں کو جو میلیکاف کے زیر کمان تھے سرحد پار بھگا کر غازی کا لقب اختیار کر لیا تھا۔"(۱)

پے در پے تین حملوں میں ہزیمت اٹھانے کے بعد روسیوں کو اندازہ ہو گیا کہ پلونا کو فتح کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کا محاصرہ سختی سے کر لیا جائے، یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی، تقریباً پانچ ماہ تک حیرت انگیز استقلال اور جاں بازی کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار روسیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد جب سامانِ رسد بالکل ختم ہو گیا تو عثمان پاشا اپنے چھبیس ہزار قافلہ کش سپاہیوں کو لے کر قلعہ سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور اس مہم کے آخر معرکہ میں شجاعت کے انتہائی جوہر دکھا کر ۱۰؍دسمبر ۱۸۷۷ء کو انھیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

ایشیا میں بھی ترکوں کو متعدد شکستیں ہوئیں، روسیوں نے دوبارہ سرحد عبور کر کے قارص، ارض روم اور طرابزون پر قبضہ کر لیا، سرویا کو یہ موقع بہت غنیمت معلوم ہوا، اس نے دولت علیہ کے خلاف اعلان جنگ کر کے نیش کے اہم شہر کو فتح کر لیا، دوسری طرف مونٹی نگرو، اسپیز اور ڈسینو پر قابض ہو گیا۔

پلونا کی تسخیر کے بعد جنرل گورکو روسی فوج کے بڑے حصہ کو لے کر صوفیا کی طرف بڑھا اور ۵؍جنوری کو اس پر قبضہ کر لیا، ۲۸؍جنوری کو گرانڈ ڈیوک نکولس جو تمام افواج روس کا سپہ سالار اعظم تھا، فاتحانہ شان سے ادرنہ میں داخل ہوا۔

سقوط ادرنہ کی خبر سے انگلستان اور آسٹریا میں سخت بے چینی پیدا ہوئی، روس نے شروع ہی میں ان دونوں حکومتوں سے وعدہ کر لیا تھا کہ بوسنیا اور قسطنطنیہ سے کوئی تعرض

---

(۱) تاریخ یورپ جدید از ایلیسن فلپس مترجمہ رشید احمد صدیقی

نہ دیا جائے گا لیکن اب سوال یہ تھا کہ ان فتوحات کے بعد بھی وہ اپنے وعدہ پر قائم رہے گا اسی شبہ اہمیت میں آسٹریا نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک فوج کوہ کارپتھین میں تعینات کر دی اور انگلستان نے ایک بحری بیڑہ خلیج بسیکا میں روانہ کیا، جو دردانیال کے دہانہ پر واقع ہے۔ انگلستان کو یہ خطرہ تھا کہ ادرنہ کی فتح کے بعد جب کہ ترکوں کی فوجی قوت ٹوٹ چکی ہے، خود قسطنطنیہ کا مسخر ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جن لوگوں نے ابتدائے جنگ میں وزیر اعظم لارڈ بیکنس فیلڈ کی مخالفت کی تھی اور روس کے مقابلہ میں سلطنت عثمانیہ کی حمایت کے لیے آمادہ نہیں ہوئے تھے، انھوں نے بھی اب اپنی رائے بدل دی اور قسطنطنیہ پر روسی قبضہ کے خلاف خواہ وہ عارضی کیوں نہ ہو شدت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی، اسی شورش کا نتیجہ تھا کہ حکومت برطانیہ نے اپنے بحری بیڑے کو خلیج بسیکا سے نکل کر دردانیال میں داخل ہونے کا حکم دیا اور اس اندیشہ سے کہ اب روس سے جنگ چھڑ جانا یقینی ہے، پارلیمنٹ سے مصارف جنگ کے لیے ساٹھ لاکھ پونڈ کی منظوری کی درخواست کی، علاوہ بریں حکومت برطانیہ نے روس کو متنبہ کر دیا کہ اگر اس نے قسطنطنیہ کی طرف کوئی قدم اٹھایا تو یہ اقدام برطانیہ کے ساتھ جنگ کا اعلان سمجھا جائے گا۔

مضبطہ ادرنہ: اس اثنا میں روس اور دولت علیہ کے درمیان صلح کی گفتگو ہوتی رہی اور ۳۱ جنوری ۱۸۷۸ء کو فریقین کے نمایندوں نے عارضی صلح کے لیے ادرنہ میں ایک نوشتہ پر دستخط کر دیے، جو ”مضبط ادرنہ“ کے نام سے مشہور ہے، اس تحریر کے رو سے باسفورس اور دردانیال میں روسی حقوق کی توثیق کی گئی اور طے پایا کہ تاوان جنگ میں جس کی نوعیت بعد کو متعین ہوگی، روس کو ادا کیا جائے گا، یہ بھی طے پایا کہ بلغاریا ایک خودمختار اور باج گذار ریاست بنا دی جائے گی اور اس کی حکومت قومی و عیسائی ہوگی، نیز اس میں ایک قومی پولیس تعینات رہے گی، مونٹی نیگرو، رومانیا اور سرویا کو خودمختاری دی جائے گی، مونٹی نیگرو کے مقبوضات وسیع کیے جائیں گے، رومانیا کو تاوان جنگ مقبوضات کی شکل میں

او ہو نے کہ سرویا و مونٹی نیگرو کی سرحدیں از سر نو درست کی جائیں گی، بوسنیا اور ہرزیگووینا کو اپنے معاملات میں آزادی دے دی جائے گی اور ترکی ان اصلاحات کو دوسرے عیسائی صوبوں میں بھی نافذ کرے گی، اس صلح نامہ کی رو سے ترکی سلسٹریا اور ودین کے قلعے روس کے حوالہ کر دیے گئے اور بلغاریہ میں ترکوں کا قبضہ صرف وارنا کے ضلع پر باقی رکھا گیا۔

اس عارضی صلح کے بعد گرانڈ ڈیوک نکولس نے اپنا فوجی مستقر بحر مرمرہ کے ساحل پر سان اسٹیفانو میں قائم کیا، جہاں سے قسطنطنیہ کے منارے نظر آتے تھے، برطانیہ نے اپنے جنگی جہازوں کو جزائر امراء کے قریب سمندر پر جہاں سے قسطنطنیہ نظر آتا تھا، مستعد رہنے کا حکم دیا، خدشہ تھا کہ روس اور برطانیہ میں عنقریب جنگ چھڑ جائے گی، آسٹریا بھی آمادۂ پیکار نظر آتا تھا، کونٹ اندراسی نے علی الاعلان اس امر کا اظہار کر دیا تھا کہ جو شرائط ایڈریانوپل میں طے ہوئے ہیں وہ آسٹریا ہنگری کے اغراض و مقاصد کے خلاف ہیں۔

معاہدۂ سان اسٹیفانو: اس درمیان میں ۳ مارچ ۱۸۷۸ء کو روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان "معاہدۂ سان اسٹیفانو" پر دستخط ہو گئے، جس کے شرائط ایڈریانوپل میں پہلے ہی طے ہو چکے تھے، اس معاہدہ کے رو سے قسطنطنیہ، تھریس اور مقدونیہ ترکوں کے قبضہ میں رہنے دیے گئے، سرویا، رومانیا اور مونٹی نیگرو خود مختار ممالک قرار دیے گئے اور ان کے رقبوں میں اضافہ کر دیا گیا، سرویا کو نش اور متروویتزا کے اضلاع دے دیے گئے اور مونٹی نیگرو میں بوسنیا کے کچھ ٹکڑے اور اسپیزا، انٹی واری اور دلسینو کی بندرگاہیں جو ساحل ایڈریاٹک پر واقع ہیں شامل کر دی گئیں، روس اور آسٹریا کی نگرانی میں بوسنیا اور ہرزیگووینا میں ان اصلاحات کے فوراً نافذ کیے جانے کا وعدہ کیا گیا، جو قسطنطنیہ کی کانفرنس میں پیش کی گئی تھیں، رومانیا کو جو حصہ ملا وہ اس کی توقع سے بہت کم تھا، اسے صرف دوبروجا کا علاقہ دیا گیا جو ایک غیر زرخیز علاقہ تھا اور اس میں جو تھوڑی بہت آبادی تھی وہ بھی بلغاریوں اور ترکوں پر مشتمل تھی یعنی دوبروجا کے معاوضہ میں بسارابیا کا وہ حصہ جس میں رومانیوں کی آبادی کثرت سے تھی اور جو صلح نامہ پیرس کے رو سے علاحدہ کر کے مولڈیویا میں شامل کر دیا گیا تھا، پھر

زار کو واپس کر دیا گیا اور اس میں ایک چھوٹے سے علاقہ کا اور بھی اضافہ کر دیا گیا، جس سے روس کی سلطنت دریائے ڈینوب تک پہنچ گئی، اس صلح نامہ کی سب سے اہم دفعہ بلغاریا سے متعلق تھی، بلغاریا کو ایک باج گزار خود مختار ولایت بنا کر اس کا رقبہ دریائے ڈینوب سے بحر ایجین اور بحر اسود تک وسیع کر دیا گیا اور اس میں مشرقی رومیلیا اور مقدونیا کے علاقے بھی شامل کر دیے گئے، طے پایا کہ اس کے لیے ایک عیسائی حکمراں خود وہیں کے باشندے منتخب کریں، جس کا تقرر روسی کمشنر کی نگرانی میں دو سال کے لیے ہو، نیز پچاس ہزار سپاہیوں کی ایک قومی ردیف (ملیشیا) مقرر کی جائے، بلغاریا کی اس جدید ولایت کے قائم کرنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ باب عالی سے اس کے دوسرے صوبوں مثلاً مقدونیا، اپائرس اور البانیا کا براہ راست تعلق منقطع ہو جائے، مندرجہ بالا تبدیلیوں کے علاوہ باب عالی کی طرف سے بلقان کے دوسرے صوبوں میں اصلاحات کے جاری کرنے کا وعدہ کیا گیا، یونان کے رقبہ میں کوئی اضافہ نہیں منظور ہوا، البتہ تھسلی، اپائرس اور کریٹ میں بھی اصلاحات کا وعدہ کیا گیا، ایشیا میں قارص، اردہان، بایزید اور باطوم کے ضلعے روس کو ملے، ارض روم دولت علیہ کو واپس کر دیا گیا، یہ بھی طے پایا کہ سواحل ڈینوب کے سارے قلعے منہدم کر دیے جائیں، اس کے علاوہ سلطنت عثمانیہ پر ایک کروڑ بیس لاکھ پونڈ تاوان جنگ بھی عاید کیا گیا۔

اس معاہدہ کی مخالفت: معاہدۂ سان اسٹیفنو کے شائع ہوتے ہی ہر طرف سے احتجاج کی آواز بلند ہوئی، یونان نے حکومت برطانیہ سے اپیل کی کہ اس کے حقوق کی مطلق پروا نہیں کی گئی، سرویا نے شکایت کی کہ اس کے بعض علاقے بلغاریا میں شامل کر دیے گئے، اہل البانیا نے ایک انجمن قائم کر کے عہد کیا کہ اپنے ملک کا کوئی ٹکڑا علاحدہ نہ ہونے دیں گے اور اس کے لیے "آخر دم تک مقابلہ کریں گے"، رومانیا نے اس معاوضہ پر جو اس کی خدمات کے صلہ میں اسے دیا گیا تھا، روس کو سخت لعنت ملامت کی اور احتجاج کیا کہ جب تک ان تمام حکومتوں کی منظوری حاصل نہ ہو جائے، جنھوں نے "عہد نامۂ پیرس"

میں اس کے حقوق متعین کردئے تھے، محض روس اور باب عالی کی باہمی مفاہمت سے اس کے مقبوضات میں کوئی ترمیم جائز نہیں ہوسکتی، حکومت برطانیہ نے یونان اور رومانیا دونوں کو اطمینان دلایا کہ آئندہ کانگریس میں ان کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے گا لیکن برطانیہ کے نزدیک معاہدۂ سان اسٹیفانو کی مخالفت سب سے زیادہ اس لیے ضروری تھی کہ جدید بلغاریہ محض ایک روسی صوبہ بن کر رہ جائے گا اور روس کے لیے قسطنطنیہ کی راہ پھر کھلی رہے گی، روس کی گزشتہ تاریخ سے اس امر کا کافی ثبوت ملتا تھا کہ مشرقی عیسائیوں کے ساتھ اس کی ہمدردی بے لاگ نہ تھی، جدید بلغاریہ کو اگرچہ معاہدۂ مذکور کی رو سے ایک خود مختار مملکت قرار دیا گیا تھا، تاہم آئندہ دستور حکومت کے لیے یہ پابندی کہ وہ ایک شاہی روسی کمشنر کے زیر نگرانی مرتب کیا جائے گا اور اس پر عمل درآمد بھی دو سال تک روس ہی کی نگرانی میں ہوگا، صاف طور پر بتا رہی تھی کہ اس خود مختار مملکت کی حیثیت روس کے ایک صوبہ سے زیادہ نہ ہوگی، برطانیہ اس کو کسی طرح منظور نہیں کر سکتا تھا، لیکن صرف برطانیہ ہی معاہدۂ سان اسٹیفانو کا مخالف نہ تھا، آسٹریا کو بھی اس سے شدید اختلاف تھا، رائشٹاٹ (Reichstadt) میں جو معاہدہ شہنشاہ اور زار کے درمیان ہو چکا تھا، اس کی رو سے آسٹریا بوسنیا اور ہرزیگووینا پر فوجی قبضہ رکھنے کا دعویدار تھا، فرانس بھی اپنے مصالح کی بنا پر اس معاہدہ کا مخالف تھا۔

روس اور برطانیہ کا خفیہ معاہدہ: غرض ہر طرف سے معاہدۂ سان اسٹیفانو کی مخالفت شروع ہوئی اور ایک جدید بین الاقوامی کانگریس کا مطالبہ کیا جانے لگا، پرشیا کے وزیر اعظم بسمارک نے کانگریس کے انعقاد کے لیے برلن کو مقام تجویز کیا اور ایک "ایماندار دلال" کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کیں، روس نے کانگریس کی شرکت کے لیے آمادگی ظاہر کی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ معاہدۂ اسٹیفانو کے صرف وہی دفعات کانگریس کے سامنے رکھے جائیں جن کو پیش کرنا روس مناسب خیال کرے، حکومت برطانیہ کو اصرار تھا کہ تمام دفعات پیش کیے جائیں، اس مسئلہ پر برطانوی وزارت میں اختلاف پیدا ہو گیا اور

لارڈ ڈربی نے استعفا دے کر وزارت خارجہ لارڈ سالسبری کے سپرد کر دی، جو ترکی سیاست سے پوری طرح واقف تھا اور ہی روز پیشتر قسطنطنیہ کی کانفرنس میں شرکت کر کے انگلستان واپس آیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ اور روس میں جنگ قریب چھڑ جائے گی، چنانچہ لارڈ بیکنس فیلڈ وزیر اعظم نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ہندوستانی فوجیں مالٹا روانہ کر دی گئیں، دوسری طرف وزیر خارجہ نے ایک مخفی مراسلہ دوسری دول عظمیٰ کے پاس بھیج کر ان اعتراضات کو واضح کر دیا جو حکومت برطانیہ کو معاہدۂ سان اسٹیفانو پر تھے، روس نے یہ دیکھ کر کہ آسٹریا بھی جنگ کے لیے آمادہ ہے اور دنیا میں بھی روس کی بے وفائی کے خلاف سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے، علاوہ بریں خود اس کی سلطنت میں بھی بے اطمینانی کے آثار نمایاں تھے، ان حالات سے مجبور ہو کر اس نے برطانیہ کی خواہش کے مطابق کانگرس کا انعقاد منظور کر لیا، دونوں حکومتوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس میں وزارت برطانیہ نے وعدہ کیا کہ وہ کانگرس میں صلح نامہ سان اسٹیفانو کے تمام اہم دفعات سے متفق ہو کر روس کی حمایت کرے گی، اس شرط کے ساتھ کہ جدید بلغاریہ کی قطع و برید میں روس برطانیہ کا ساتھ دے گا، یہ معاہدہ بالکل خفیہ تھا لیکن وزارت خارجہ کے ایک ملازم کی غلطی سے اس کی اطلاع پریس کو ہو گئی، اس معاہدہ کے رو سے جدید بلغاریہ کے تین حصے کیے جانے والے تھے، جو حصہ دریائے ڈینوب اور سلسلہ کوہ بلقان کے درمیان پڑتا تھا اس کا انتظام سان اسٹیفانو کی تجویز کے مطابق قائم رکھا گیا یعنی سلطان کے زیر سیادت یہ ایک خود مختار مملکت قرار پایا اور اس کے فرمانروا کے انتخاب کا حق وہیں کے باشندوں کو دیا گیا، دوسرے حصہ کو بھی جو کوہ بلقان کے جنوب میں واقع تھا حکومت خود اختیاری کے حقوق دیے گئے لیکن اس پر باب عالی کی نگرانی بہ نسبت پہلے حصہ کے زیادہ رکھی گئی، یہ حصہ مشرقی رومیلیا کے نام سے موسوم ہوا، تیسرے حصے کے متعلق جو بحر ایجین کے ساحل پر واقع تھا اور جس کی آبادی میں بلغاری، سروی، یونانی اور مسلمان سب شامل تھے، یہ طے پایا کہ دولت عثمانیہ کو واپس کر دیا جائے، اس

شرط کے ساتھ کہ دوسرے یوروپین صوبوں کی طرح باب عالی کی طرف سے اس میں بھی اصلاحات جاری کر دی جائیں گی، یہ حصہ اس وقت سے مقدونیہ کہا جاتا ہے۔

برلن کانگریس: اس معاہدہ کے طے ہو جانے کے بعد ۱۳؍ جون ۱۸۷۸ء کو دول عظمیٰ کے نمائندوں کی ایک عظیم الشان کانگریس بسمارک کے زیر صدارت برلن میں منعقد ہوئی، ویانا کی کانگریس کے بعد جو ۱۸۱۵ء میں منعقد ہوئی تھی یہ اپنی قسم کی سب سے زیادہ اہم یوروپین کانگریس تھی، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس کو ان تمام مسائل پر از سر نو بحث و تصفیہ کا حق حاصل ہے، جو "معاہدۂ سان اسٹیفنو" میں مذکور تھے لیکن بہت جلد یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ روس اور برطانیہ کے خفیہ معاہدہ کی وجہ سے کانگریس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے کیوں کہ صدارت کی کرسی پر اگرچہ بسمارک متمکن تھے لیکن کانگریس میں لارڈ بیکنس فیلڈ ہی کی شخصیت چھائی ہوئی تھی، ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد جس میں اکثر یہ اندیشہ ہونے لگتا تھا کہ ساری گفت و شنید درہم برہم ہو جائے گی ۱۳؍ جولائی کو ایک معاہدہ مرتب ہو گیا اور ارکان کانگریس نے اس پر دستخط کر دیے۔

عہد نامۂ برلن: عہد نامۂ برلن کی رو سے معاہدۂ سان اسٹیفانو کے وہ شرائط جو اپنے اثرات کے اعتبار سے نہایت دوررس تھے بہت کچھ معتدل کر دیے گئے سب سے زیادہ اہم مسئلہ بلغاری مملکت کی تکوین کا تھا، اب بجائے اس کے کہ ایک ایسا بلغاریا معرض وجود میں آتا جو اپنی وسعت کے لحاظ سے دریائے ڈینوب سے مجمع الجزائر تک پھیلا ہوتا، جدید خودمختار ولایت کی جنوبی سرحد بلقان سے محدود کر دی گئی، جنوبی بلغاریا کو جو مشرقی رومیلیا کے نام سے موسوم ہوا حکومت خوداختیاری کے حقوق دے گئے لیکن یہ طے پایا کہ اس کے والی کی تقرری باب عالی کی طرف سے ہوگی، روس کو بسرابیا کا وہ حصہ دیا گیا جو ۱۸۵۶ء میں رومانیا کو ملا تھا، ایشیا میں باطوم، اردہان اور قارص پر اس کا قبضہ باقی رکھا گیا، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے ایک غیر متعین مدت کے لیے آسٹریا کے حوالہ کر دیے گئے، جسے نووی بازار کے سنجق پر بھی فوجی قبضہ رکھنے کی اجازت دی گئی،

رومانیا کو دوبروجا کے ساتھ بحر اسود پر بندرگاہ قسطنجہ بھی دی گئی۔ بلغاریا کا ایک حصہ نکال کر سرویا میں شامل کر دیا گیا، تھسلی اور مقدونیہ کے متعلق یونان کے جو مطالبات تھے وہ مسموع ہوئے لیکن منظور نہ ہوئے، ایک خفیہ معاہدہ کے رو سے جو ۴ جون کو حکومت برطانیہ اور باب عالی کے درمیان طے ہوا تھا لیکن ۹ جولائی کو کانگریس کے سامنے پیش ہوا، جزیرہ قبرص انگلستان کے حوالے کر دیا گیا، اس شرط کے ساتھ کہ سالانہ خراج پابندی سے باب عالی میں پیش ہوتا رہے گا، روس کو وہ تمام مفتوحات دے دی گئیں جن کا وعدہ معاہدۂ سان اسٹیفانو میں کیا گیا تھا، یہ علاقہ پہلے سے آزاد تھا، عہد نامۂ برلن میں ان کی آزادی کا اعلان از سر نو کر دیا گیا تاکہ اسے بین الاقوامی ضمانت حاصل ہو جائے۔

غرض عہد نامۂ برلن نے معاہدۂ سان اسٹیفانو کو تقریباً تمام تر باطل کر دیا، بلغاریہ عظمیٰ کے بجائے جو ڈینوب سے بحر ایجین تک اور بحر اسود سے مقدونیا کی جھیلوں تک پھیلی ہوئی سلطان کی فرماں روائی میں ایک چھوٹی سی خود مختار باج گزار حکومت قائم کر دی گئی، جس کی سرحدیں ڈینوب، کوہ بلقان، بحر اسود، سرویا اور مقدونیہ کی سرحدوں سے محدود کر دی گئیں، کوہ بلقان کے جنوب میں 'مشرقی رومیلیا' کے نام سے ایک خود مختار صوبہ قائم کیا گیا، جو براہ راست سلطان کی سیاسی اور فوجی حکومت کے تحت میں رکھا گیا، لیکن اس کا انتظام ایک عیسائی گورنر جنرل کے سپرد ہوا، جس کے تقرر کے لیے یہ طے پایا کہ باب عالی کی نامزدگی اور دول یورپ کی منظوری سے پانچ سال کے لیے ہوا کرے، یہ بھی قرار پایا کہ بلغاریہ کے فرماں روا کا انتخاب وہاں کے باشندے خود کریں اور اس کا تقرر دول عظمیٰ کی منظوری کے بعد باب عالی کی طرف سے عمل میں آئے لیکن ان بڑے شاہی خاندانوں کے ارکان کے لیے جو اس وقت برسر حکومت تھے، اس عہدہ کی امیدواری ممنوع قرار دی گئی، طے پایا کہ جب تک بلغاریہ کی مجلس اعیان دستور حکومت مرتب نہ کرے حکومت کا انتظام ایک روسی کمشنر کے سپرد کر دیا جائے مگر اس عارضی انتظام کی مدت صرف نو ماہ کے لیے محدود کر دی گئی، مشرقی رومیلیا کی تنظیم ایک یورپین کمیشن کو

تفویض ہوئی اور اس کے لیے تین ماہ کی مدت متعین کی گئی۔ بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے آسٹریا ہنگری کے قبضہ و انتظام میں دے دیے گئے، لیکن ایک خفیہ معاہدہ کی رو سے جو آسٹریا اور باب عالی کے درمیان ۱۳ جولائی ۱۸۷۸ء کو طے ہوا، یہ تسلیم کر دیا گیا کہ یہ قبضہ عارضی سمجھا جائے گا۔ رومانیا کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا، اس کی آزادی کے لیے یہ شرط قرار پائی کہ جنوبی بسارابیا کا علاقہ روس کے حوالے کر دیا جائے اور اس کے معاوضہ میں رومانیا جنوبی دوبروجا کے لیے پر قناعت کرے۔ یونان نے کریٹ اور ان عثمانی صوبوں کا مطالبہ کیا تھا جو یونانی حکومت کی سرحد پر واقع تھے، فرانس کے نمائندہ ویڈنگٹن (Waddington) نے کانگرس سے اس کی پرزور سفارش کی، لیکن لارڈ بیکنس فیلڈ نے ان مطالبات کی مخالفت کی اور کانگرس نے صرف اس قدر کیا کہ باب عالی سے سفارش کر دی کہ یونان میں تھسلی اور اپیرس کا ایک حصہ شامل کر دیا جائے۔ معاہدہ برلن کی دفعہ (۶۱) کی رو سے باب عالی نے آرمینیا کے مسیحیوں کی مقامی ضروریات کے مطابق جلد سے جلد اصلاحات جاری کر دینے کا وعدہ کیا نیز اس بات کی ضمانت کی کہ آرمینی عیسائی چرکسوں اور کردوں کی دست برد سے محفوظ رکھے جائیں گے، باب عالی نے اس کا بھی وعدہ کیا کہ ان اصلاحات کی اطلاع متعین وقفوں کے بعد دول عظمیٰ کو دی جاتی رہے گی۔ معاہدہ قبرص کے ذریعے سے برطانیہ نے آرمینیوں کے تحفظ کی ذمہ داری خاص طور پر اپنے سر لے لی اور اصلاحات کے وعدے کے عوض میں جو سلطان کی طرف سے کیا گیا تھا، دولت عثمانیہ کے ایشیائی مقبوضات کو روس کے آئندہ حملوں سے محفوظ رکھنے کا عہد کیا۔ جزیرہ قبرص اس وقت تک کے لیے برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا جب تک روس گذشتہ جنگ کی ایشیائی فتوحات سے اپنا قبضہ نہ اٹھا لے، یہ جزیرہ برطانیہ کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ وہ روس کے مقابلہ کے لیے وہاں سامان جنگ تیار رکھ سکے، سلطان کی فرماں روائی کا حق قائم رکھنے کے لیے سالانہ خراج کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی۔

عہد نامہ برلن نے یورپ میں سلطنت عثمانیہ کو [illegible] بلقانی صوبوں کے جن سے یونان، رومانیہ، سرویہ، مونٹی نیگرو اور بلغاریہ کی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں، جن کا تعلق باب عالی سے [illegible] ان کی صف میں [illegible] جو صوبے براہ راست باب عالی کے زیر حکومت رہ گئے ان میں بھی آزادی کی تحریک پیدا ہو چکی تھی، چنانچہ باوجود اس کے کہ ۱۸۷۸ء کے بعد سے سلطان عبد الحمید خاں ثانی کے آخر عہد حکومت تک کسی بیرونی سلطنت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی، دولت عثمانیہ کو مسلسل مختلف صوبوں کے اندرونی ہنگاموں اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف رہنا پڑا [illegible] خود مختار سلطنتوں کی طرف سے بھی کوئی نہ کوئی [illegible] اور دوسری [illegible] جس [illegible] کر دولت عثمانیہ کو شکست [illegible] کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

مونٹی نیگرو کی نزاع: سب سے پہلی نزاع مونٹی نیگرو سے پیش آئی، عہد نامہ برلن کی رو سے مونٹی نیگرو کا رقبہ عہد نامہ سان اسٹیفانو کے مقابلہ میں دو چند سے زیادہ ہو گیا تھا اور اس کی آبادی ایک لاکھ چھیانوے ہزار سے بڑھ کر دو لاکھ اسی ہزار تک پہنچ گئی تھی، چند اہم مقامات اس میں شامل کر دیے گئے تھے، جن کی واپسی کا مطالبہ [illegible] حوالہ کر دیے گئے تھے، لیکن شرط یہ تھی کہ [illegible] کے [illegible] کے لیے [illegible] دولت عثمانیہ کو واپس کر دی جائے اور [illegible] (Spica) کا [illegible] دولت عثمانیہ [illegible] مونٹی نیگرو سے [illegible] ہنگری کی سلطنت میں شامل کر دیا تھا اس کے معاوضہ میں [illegible] مونٹی نیگرو کو دے دیے گئے تھے، باب عالی نے مونٹی نیگرو کی آزادی تسلیم کر لی اور مونٹی نیگرو [illegible] سلطنت عثمانیہ سے [illegible] لیکن [illegible] کے [illegible] فیصلے سے ناخوش تھے [illegible] انھوں نے [illegible] مونٹی نیگرو میں شامل ہونے سے روکنے کے لیے ایک البانی لیگ قائم کی اور دونوں قوموں

میں جنگ شروع ہوگئی، بالآخر دول یورپ نے یہ فیصلہ کیا کہ گوشنجہ اور پلاوا سلطنت عثمانیہ کو واپس کر دیے جائیں اور ان کے معاوضہ میں ڈلسنو کا علاقہ اور بندرگاہ بھی مونٹی نیگرو کو دے دیا جائے، باب عالی نے اس فیصلہ کو نامنظور کر دیا، لیکن برطانیہ کی تحریک پر جس کی عنان وزارت گلیڈسٹن کے ہاتھ میں آچکی تھی دول یورپ کا ایک جنگی بیڑا ستمبر ۱۸۸۰ء کو ڈلسنو کے سامنے نمودار ہوا اور باب عالی کو مجبور ہو جانا پڑا۔

یونان کا قضیہ: یونان کا مسئلہ مونٹی نیگرو سے بھی زیادہ دشوار تھا، عہد نامہ برلن میں اس کے رقبہ کی توسیع کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا، دول عظمیٰ نے صرف اتنا کیا تھا کہ اپارس اور تھسلی کے الحاق سے متعلق باب عالی سے یونان کی سفارش کر دی تھی، عہد نامہ مذکور کے تصفیہ کے بعد تین سال تک دول عظمیٰ ریاستہائے بلقان کی جدید سرحدوں کے متعین کرنے میں مصروف رہیں اور جب رومانیا، بلغاریا، سرویا اور مونٹی نیگرو کی سرحدوں کا تعین ہو چکا تو یونان نے بھی اپارس اور تھسلی کا مطالبہ پیش کر کے بین الاقوامی تصدیق حاصل کرنی چاہی، چنانچہ برلن میں دول عظمیٰ کی ایک کانفرنس نے اس مطالبہ کی سماعت کر کے باب عالی سے سفارش کی کہ تھسلی اور اپارس کا پورا علاقہ مملکت یونان میں شامل کر دیا جائے لیکن سلطان نے اسے نامنظور کیا اور چوں کہ دول عظمیٰ یونان کی خاطر اس وقت دولت علیہ سے جنگ چھیڑنے پر آمادہ نہ تھیں، اس لیے یہ مسئلہ بدستور قائم رہا، پھر بھی گفت و شنید کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا اور دو سال کی جدوجہد کے بعد بالآخر ۱۸۸۱ء میں یہ طے پایا کہ تھسلی کا تقریباً پورا علاقہ اور اپارس کا ایک ثلث یونان میں شامل کر دیا جائے، یانینا اور دوسرے اضلاع جس میں مسلمانوں کی آبادی تھی، یونانی سرحد سے باہر رکھے گئے۔

مشرقی رومیلیا اور بلغاریا کا اتحاد: عہد نامہ برلن کے مطابق بلغاریا کے عضوی قانون کی ترتیب و تکمیل تک انصرام حکومت ایک روسی کمشنر کے سپرد کر دیا گیا تھا، دسمبر ۱۸۷۸ء میں مجلس وضع دستور (Conatitunt Assembly) کے ارکان کا انتخاب عمل میں آیا اور ۲۶ فروری ۱۸۷۹ء کو کمشنر مذکور نے اس مجلس کو طلب کر کے عضوی قانون کی

ترتیب کا مسئلہ پیش کیا، خود کمشنر نے دستورِ حکومت کا جو مسودہ تیار کیا تھا اسے نوجوان ارکانِ مجلس نے ترمیم و تنسیخ کے بعد ایک حد درجہ جمہوری دستور بنا دیا، اس دستور کے مطابق مجلس قانون ساز میں صرف ایک ہی ایوان رکھا گیا، ہر شخص جس کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی اور جو لکھنا پڑھنا جانتا تھا بشرطیکہ وہ کوئی پادری یا فوجی سپاہی نہ ہو یا ملکی حقوق سے محروم نہ کر دیا گیا ہو، اس مجلس کے لیے منتخب ہونے کا حق رکھتا تھا، ملک کے تمام مرد اس کے رائے دہندہ بنائے گئے، جماعتِ عاملہ کا کام آٹھ وزیروں کی ایک مجلس کے سپرد کیا گیا، ان کی نامزدگی حکمران کے ہاتھ میں رکھی گئی، لیکن جواب دہ مجلس ملیہ کے ٹھہرائے گئے، ارکانِ مجلس کے انتخاب کے بعد حکمرانِ مملکت کے انتخاب کی باری آئی، عام رائے پرنس الکزنڈر آف بیٹن برگ (Alexander of Batten Berg) کے موافق تھی، مجلس ملیہ کے نزدیک اس کے انتخاب کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ تھی کہ وہ زار الکزنڈر دوم کا عزیز تھا اور زار اسے بلغاریا کا حکمران منتخب کرانا چاہتا تھا، چنانچہ اپریل ۱۸۷۹ء میں اس کا انتخاب بلا کسی اختلافِ رائے کے ہو گیا اور اس نے بلغاریا پہنچ کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد الکزنڈر اور بلغاریا کی مجلس ملیہ میں اختلافات شروع ہو گئے، الکزنڈر اگرچہ ملک کی خدمت کا پورا ولولہ اپنے اندر رکھتا تھا، تاہم وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ روس کا آدمی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ وزارتیں سرعت کے ساتھ تبدیل ہونے لگیں اور بہت جلد الکزنڈر اور اس کے روسی مددگاروں کو معلوم ہو گیا کہ یہ دستورِ حکومت کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا، چنانچہ ۱۸۸۱ء میں الکزنڈر نے اس دستور کو منسوخ کر دیا اور دو سال تک بغیر کسی قومی مجلس کے حکومت کرتا رہا، دو روسی جنرل اس کی حمایت کے لیے پیٹروگراڈ سے بھیجے گئے، انھوں نے وزارت پر اپنا اقتدار بہت جلد قائم کر لیا اور الکزنڈر کو محسوس ہونے لگا کہ اس کی حیثیت محض ایک نام کے فرماں روا کی ہے، اس کے لیے دستورِ حکومت کو دوبارہ نافذ کر دینے کے علاوہ اب اور کوئی صورت نہ تھی،

چنانچہ ۱۸۸۳ء میں اس نے مجلس ملیہ پھر طلب کی، ملک میں جو برہمی اس کے خلاف پھیلی ہوئی تھی وہ دستور کے جاری ہوتے ہی جاتی رہی لیکن اب روس کے تیور بدل گئے، دونوں روسی جنرل بلغاریہ سے روانہ ہوگئے اور نئے زار الکزنڈر سوم نے اپنے عزیز کے خلاف توقع رویہ پر ناراضگی ظاہر کی، شہزادہ الکزنڈر نے بہت کوشش کی کہ روس سے مخالفت کی نوبت نہ آئے لیکن جن لوگوں نے اسے اپنا فرماں روا منتخب کیا تھا، ان کے سیاسی حوصلوں سے متفق ہونے کے بعد محال تھا کہ وہ روس کو بھی راضی رکھ سکے، اس وقت اہل بلغاریا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مشرقی رومیلیا کا صوبہ جو برلن کانگریس کے فیصلہ کے مطابق باب عالی کو واپس کردیا گیا تھا، اپنی مملکت میں شامل کرلیں، مشرقی رومیلیا کا نظام حکومت دول عظمیٰ کے ایک کمیشن نے اس طرز پر مرتب کیا تھا کہ وہ بھی بلغاریہ کا ایک 'ناقص مثنیٰ' نظر آتا تھا اور دونوں میں نمایاں فرق صرف یہ تھا کہ ایک کا حکمراں خود اسی کا منتخب کردہ تھا اور دوسرے کی حکومت ایک عیسائی گورنر کے سپرد تھی، جس کا تقرر پانچ سال کے لیے باب عالی کی طرف سے ہوا تھا۔

ابتدا ہی سے کوہ بلقان کے ہر دو سمت کے بلغاریوں کی خواہش تھی کہ یہ دونوں ولایتیں متحد کردی جائیں، چنانچہ ستمبر ۱۸۸۵ء میں مشرقی رومیلیا کے پایہ تخت فلپو پولیس کے باشندوں نے اسی غرض سے علم بغاوت بلند کرکے بلغاریا سے اتحاد کا اعلان کردیا اور ان رومیلیا کے ایک وفد نے شہزادہ الکزنڈر کی خدمت میں حاضر ہوکر اسے فلپو پولیس آنے کی دعوت دی، الکزنڈر کا تامل دیکھ کر ایک بلغاری مدبر اسٹامبولوف (Stambuloff) نے صاف الفاظ میں اس سے کہا کہ یا تو حضور فلپو پولیس کی دعوت قبول فرمائیں یا خاموشی کے ساتھ اپنے جرمن وطن کو واپس تشریف لے جائیں، الکزنڈر نے پہلی صورت کو ترجیح دی، فلپو پولیس میں متحدہ بلغاریا کے فرماں روا کی حیثیت سے اس کا استقبال شاندار طریقہ پر کیا گیا۔

سرویا اور بلغاریا کی جنگ: لیکن یہ معاملہ معاہدہ برلن کی صریح خلاف ورزی تھا،

باب عالی کے علاوہ دول عظمیٰ بھی الکزنڈر کی اس خودسری پر برافروختہ ہوئیں اور انھوں نے اس کے متعلق آپس میں مراسلت شروع کر دی مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی عملی قدم بڑھا سکیں، بلغاریا پر سرویا کے غیر متوقع حملہ نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا، سرویا کا جذبۂ رشک بلغاریا کے اس اقدام سے بھڑک اٹھا تھا، جزیرہ نمائے بلقان میں توازنِ قوت کو برقرار رکھنے کے لیے اسے اپنی مملکت کی توسیع ضروری معلوم ہوئی، چنانچہ اس غرض سے پہلے تو اس نے عثمانی مقبوضات پر دست درازی کے لیے فوجیں اکٹھا کیں لیکن پھر دولت علیہ کی قوت سے خائف ہو کر اچانک ۱۴؍ نومبر ۱۸۸۵ء کو بلغاریا کی سرحد پر حملہ کر دیا۔ اہل بلغاریا نے جو قومی جوش سے سرشار ہو رہے تھے نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا اور ۱۹؍ نومبر کو سلیونزا (Slivintza) کے معرکہ میں حملہ آوروں کو زبردست شکست دی۔ ان کی اس خلاف توقع کامیابی نے سارے یورپ کو حیرت میں ڈال دیا، کیوں کہ سرویا ایک طاقتور حکومت تھی اور بلغاریا سے بہت پہلے آزاد ہو چکی تھی، علاوہ بریں بلغاریا اور مشرقی رومیلیا کے اتحاد سے زار اس درجہ برافروختہ ہوا تھا کہ اس نے جنگ شروع ہونے سے قبل ہی تمام روسی افسروں کو جو بلغاریا کی فوج میں تھے روس واپس بلا لیا تھا، بہرحال سلیونزا کی فتح کے بعد بلغاری فوج نے حملہ آوروں کا تعاقب کیا اور سرویا کی سرحد عبور کر کے آگے بڑھی، بلغراد کا راستہ اب کھلا ہوا تھا لیکن عین اس وقت دول عظمیٰ نے مداخلت کی اور حکومت آسٹریا نے الٹی میٹم دے دیا کہ بلغاری فوج ذرا بھی آگے بڑھے گی تو آسٹریا کی طرف سے اعلانِ جنگ کر دیا جائے گا، دول عظمیٰ کے دباؤ سے مجبور ہو کر بلغاریا کو صلح کر لینی پڑی اور اسے اپنی فتوحات سے دست بردار ہو جانا پڑا، سرویا تاوانِ جنگ سے بھی بری کر دیا گیا۔

اتحادِ بلغاریا کی تکمیل: لیکن اس جنگ سے بلغاریا کو ایک نمایاں فائدہ یہ پہنچا کہ مشرقی رومیلیا کے اتحاد کی بنا پر دول عظمیٰ میں اس کے خلاف جو مراسلت شروع ہوئی تھی وہ موقوف ہوئی اور بلغاریا اور مشرقی رومیلیا کا اتحاد تسلیم کر لیا گیا، البتہ زار نے اس کی

شدید مخالفت کی، حالاں کہ برلن کانگریس میں اسی کی طرف سے اتحاد پر سب سے زیادہ زور دیا جا رہا تھا۔ ایسا ہی تعجب خیز برطانیہ کا طرزِ عمل تھا، جس نے نہ صرف اس اتحاد کی موافقت کی بلکہ اپنے اثر سے سلطان کو بھی اسے منظور کر لینے پر راضی کر لیا۔ معاہدہ برلن میں یہ طے ہوا تھا کہ شرقی روملیا کا گورنر باب عالی کی طرف سے مقرر ہوگا۔ اس دشواری کو حل کرنے کے لیے سلطان نے اپریل ۱۸۸۶ء میں شہزادہ الگزنڈر ہی کو اس صوبہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس کے بعد دونوں ولایتوں کا اتحاد مکمل ہو گیا، روس کو بھی بدرجۂ مجبوری یہ اتحاد تسلیم کرنا پڑا لیکن زار نے الگزنڈر کی یہ خود سری معاف نہیں کی، بلغاریہ میں ایک سازش کرنے والی روسی جماعت اب بھی موجود تھی، اس نے رات کے وقت الگزنڈر کے محل میں گھس کر اسے گرفتار کر لیا اور تاج و تخت سے دست برداری کی ایک تحریر جبراً اس سے حاصل کر لی۔ اس کے بعد اس جماعت نے اسے سرحد پر سلطنت روس میں پہنچا دیا۔ اس واقعہ سے بلغاریا میں روس کے خلاف سخت شورش برپا ہوئی، جماعت ملی نے اسٹمبولوف کی رہبری میں روسی جماعت کو ملک سے باہر نکال دیا اور پھر شہزادہ الگزنڈر کو واپس آنے کی دعوت دی، چنانچہ وہ فاتحانہ تزک و احتشام کے ساتھ دوبارہ صوفیا میں داخل ہوا لیکن اب کی بار وہ روس کی مخاصمت اور زار کی خفگی کا مقابلہ نہ کر سکا اور باوجود اس کے کہ بلغاریا کی جماعت ملی اس کی حمایت کے لیے ہر طرح مستعد تھی، ۷ ستمبر ۱۸۸۶ء کو وہ زار کی خواہش کے مطابق تاج و تخت سے دست بردار ہو گیا۔ اس کی جگہ شہزادہ فرڈینینڈ آف سیکس کوبرگ (Ferdinand of saxf coburg) سلطان کے زیر سیادت متحدہ بلغاریا کا حکمراں منتخب کیا گیا۔

دول یورپ کی مداخلت: سلطان عبدالحمید ثانی کے عہد حکومت میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں یورپین حکومتوں کی مداخلت ہے، حالاں کہ عہد نامہ برلن میں جس چیز پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا گیا تھا، وہ یہی تھی کہ دولت علیہ کے حقوق فرماں روائی غیروں کی دست برد سے محفوظ رکھے

جائیں گے، مداخلت کے لیے کسی حیلہ کا ہاتھ آ جانا بہت آسان تھا، عیسائی رعایا کے حقوق کی حفاظت کا عذر ایک ایسا عذر تھا جس کی معقولیت میں کلام ممکن ہی نہ تھا، چنانچہ اسی عذر کی بنا پر مغربی حکومتوں نے ان صوبوں کے آزاد کرانے میں ہر طرح کی کوشش کی، جن میں عیسائیوں کی آبادی مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ تھی، دولت عثمانیہ کے جس صوبہ نے علم بغاوت بلند کیا اسے یورپ کی کسی نہ کسی حکومت کی حمایت ضرور حاصل تھی، مشرقی رومیلیا نے جب بلغاریا سے اتحاد کا مطالبہ پیش کیا تو انہی حکومتوں نے جن کی طرف سے برلن میں اس اتحاد کی شدید مخالفت کی گئی تھی، سلطان پر دباؤ ڈال کر اس مطالبہ کو منظور کرایا اور پھر چند سالوں کے بعد وہی حکومتیں ایک دوسرے صوبہ کی آزادی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

کریٹ: کریٹ یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا آخری مفتوحہ تھا، یہ ۱۶۶۹ء میں جمہوریہ وینس کی حکومت سے نکل کر باب عالی کے زیر نگیں آیا تھا، اس کے یونانی باشندے ابتدا ہی سے شورش پسند تھے اور دولت عثمانیہ کے خلاف وقتاً فوقتاً بغاوتیں برپا کرتے رہتے تھے، ۱۸۳۰ء میں یہ جزیرہ ان خدمات کے صلہ میں جو محمد علی پاشا نے بغاوت یونان کے فرو کرنے میں انجام دی تھیں، ولایت مصر میں شامل کر دیا گیا تھا لیکن دس سال بعد معاہدۂ لندن کی رو سے ۱۸۴۰ء میں یہ پھر دولت عثمانیہ کو واپس کر دیا گیا، ۱۸۳۰ء سے ۱۹۱۴ء تک جب تک کریٹ مملکت یونان میں شامل نہ ہو گیا اس کے باشندوں نے حکومت کے خلاف چودہ بغاوتیں کیں(۱) اور ان تمام بغاوتوں کا مقصد صرف ایک تھا یعنی یونان سے الحاق، چنانچہ ۱۸۶۶ء میں بھی جزیرہ والوں نے حسب دستور بغاوت برپا کی اور ایک مجلس عمومی منعقد کر کے ۲ ستمبر کو سلطنت عثمانیہ سے آزادی اور مملکت یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا، تین سال تک بغاوت جاری رہی بالآخر ۱۸۶۸ء میں سلطان نے کریٹ کے دستور حکومت میں چند اہم اصلاحات نافذ کر کے اس بغاوت کا خاتمہ کر دیا،

---

(۱) میریٹ ص ۴۲۷

جدید دستور، قانون عضوی (Organic Statute) کے نام سے مشہور ہے، کریٹ کے عیسائیوں کو پہلے سے جو حقوق حاصل تھے جدید دستور کی رو سے وہ از سرِ نو مستقل کر دیے گئے، علاوہ بریں بعض نئی اصلاحات بھی جاری کی گئیں: گورنر جنرل کی مدد کے لیے دو ناظم مقرر کیے گئے جن میں سے ایک عیسائی اور دوسرا مسلمان تھا، جزیرہ کو دس صوبوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر صوبہ میں ایک گورنر مقرر کیا گیا، مسلمان گورنر کے ساتھ عیسائی ناظم اور عیسائی گورنر کے ساتھ مسلمان ناظم رکھا گیا، گورنر جنرل کو مشورہ دینے کے لیے ایک مرکزی مجلس انتظامیہ قائم کی گئی، اسی طرح ایک مقامی مجلس ہر صوبہ کے لیے مقرر ہوئی۔ پورے جزیرہ کے لیے ایک مجلس نمائندگان تجویز ہوئی، عدالتوں میں عیسائی اور مسلمان دونوں فرقوں کے جج مقرر ہوئے، عیسائیوں کو مذہبی آزادی اور ٹیکسوں کی زیادتی کی جو شکایت تھی اس کا تدارک کر دیا گیا۔

لیکن اس دستور کی رو سے کریٹ کے مسلمانوں نے ایسے حقوق بھی کھو دیے جو پہلے حاصل تھے لیکن اس سے عیسائیوں کی آزادی کی خواہش پوری نہ ہوا اور انھوں نے یونان سے الحاق کے لیے پھر کوشش شروع کی، چنانچہ ۱۸۷۷ء میں جب روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو کریٹ کے عیسائیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی، پہلے ایک مجلس قائم کر کے انھوں نے باب عالی سے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کیا اور جب باب عالی نے انکار کیا تو کریٹ نے دول عظمیٰ سے اپیل کی۔ ترکی نے اس اپیل کے جواب میں صرف یہ وعدہ کیا کہ قانون عضوی کی اصلاحات میں اضافہ کر کے انھیں پوری پابندی کے ساتھ نافذ کر دیا جائے گا، چنانچہ اس وعدہ کے مطابق برطانوی سفیر کی وساطت سے قانون عضوی میں اضافہ کر کے معاہدہ ہلیپا (Halepa Pact) مرتب کیا گیا، اس معاہدہ کی رو سے مجلس نمائندگان کی بجائے باقاعدہ طور پر ایک مجلس عمومی (جنرل اسمبلی) تجویز ہوئی جس کے ارکان میں انچاس عیسائی اور اکتیس مسلمان رکھے گئے، جزیرہ کے ملکی

باشندے (یعنی عیسائی) سرکاری عہدوں کے لیے زیادہ مستحق قرار دیے گئے اور سرکاری زبان اسمبلی اور عدالت دونوں میں یونانی قرار پائی، مال گذاری کی تنظیم اس طرح کی گئی کہ پبلک ورکس کے لیے کافی روپیہ بچ سکے، کاغذی سکوں کا اجرا روک دیا گیا اور پریس کو آزادی دی گئی، چند دنوں کے لیے ان شورش پسندوں کی زبان بندی ہوگئی لیکن ان کا اصلی مقصد یعنی یونان سے الحاق ابھی تک حاصل نہ ہوا تھا اور کچھ عرصے کے بعد انھوں نے پھر ہنگامہ برپا کیا۔

معاہدۂ ہلیپا کے رو سے کریٹ میں دستوری حکومت قائم ہوگئی تھی، اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں کے لیے عیسائیوں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ کشمکش موقوف ہوگئی اور بجائے اس کے پارلیمنٹری جنگ خود عیسائیوں میں شروع ہوگئی جو مجلسِ عمومی میں اکثریت رکھتے تھے، اس جنگ میں ملکی مفاد کو بالکل پس پشت ڈال دیا گیا اور عیسائیوں کی مخالف پارٹیاں ایک دوسرے کو شکست دے کر سرکاری عہدے اور اقتدار حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوگئیں، مالیات کا نظام درہم برہم ہونے لگا، جس پارٹی کو شکست ہوتی وہ موجودہ گورنر جنرل کے خلاف سازشیں کرتی اور قسطنطنیہ میں گورنر جنرل کے دشمنوں سے مل کر اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی، اس جنگ میں قدامت پسند (کنزرویٹیو) پارٹی کو ۱۸۸۹ء میں شکست ہوئی اور اس کے لیڈروں نے ہتھیار سنبھال کر پہاڑوں کی راہ لی، اگرچہ اس معاملہ کو مذہبی عناد سے کوئی تعلق نہ تھا، تاہم حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ دونوں فرقوں کے مذہبی جذبات جلد برانگیختہ ہوگئے اور جزیرہ میں قتل و غارت کا ہنگامہ پھر برپا ہوگیا، اس سے پیشتر کی دو شورشوں میں غلبہ عیسائیوں کو حاصل ہوا تھا مگر اب کی بار مسلمان غالب آئے، بابِ عالی نے ہنگامہ فرو کرنے کے لیے ایک فوجی گورنر کریٹ کو روانہ کیا اور وہاں فوجی قانون جاری کر کے ایک فرمان کے ذریعہ معاہدۂ ہلیپا کی بعض اہم دفعات کو منسوخ کر دیا مثلاً مجلسِ عمومی کے انتخاب کا طریقہ بدل دیا گیا، اس کے ارکان کی تعداد کم کر دی گئی اور محصول درآمد و برآمد کی آمدنی جو اب تک قسطنطنیہ

اور کریٹ کے خزانوں میں تقسیم ہوتی آئی تھی، کل کی کل باب عالی میں طلب کر لی گئی، اس کے بعد جدید نظام کے مطابق جو انتخابات ہوئے ان میں عیسائیوں نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ پانچ سال تک کریٹ میں مسلمان والیوں کی حکومت رہی، ۱۸۹۴ء میں باب عالی نے دول عظمیٰ کی تحریک پر ایک عیسائی قرہ تھیوڈوری پاشا (Kara Theodory Pasha) کو کریٹ کا گورنر بنا کر بھیجا، عیسائی اب مجلس عمومی میں شرکت کرنے پر راضی ہو گئے، لیکن بہت جلد مالیات کا مسئلہ نئی دشواریوں کا سبب بن گیا باب عالی نے ان رقوم کی واپسی سے انکار کر دیا جو پچھلے ہنگامے کے دوران میں کریٹ کے خزانہ سے نکال کر قسطنطنیہ منتقل کر دی گئی تھیں، قرہ تھیوڈوری پاشا حالات کو درست نہ کر سکا، اس لیے باب عالی نے اسے واپس بلا لیا، اس پر عیسائیوں میں سخت برہمی پیدا ہوئی، لیکن اس واقعہ سے قبل ہی انجمن اصلاح (Committe of Reform) کے نام سے ایک جماعت انھوں نے قائم کر لی تھی، اس انجمن کی ابتدا دراصل یوں ہوئی تھی کہ چند شکست خوردہ لیڈروں نے جو پارٹیوں کی گذشتہ کشمکش میں قوت و اقتدار حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے، اپنے حریفوں کے مقابلہ کے لیے پہاڑوں میں ایک مسلح جماعت تیار کی تھی، کبھی کبھی اس جماعت کو بعض ترک سپاہیوں سے لڑنے کی نوبت آئی اور ان آویزشوں میں اسے ایک حد تک کامیابی ہوئی، یہ دیکھ کر ہزاروں مسلح عیسائی اس جماعت میں شامل ہو گئے، اپریل ۱۸۹۶ء تک اس نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ واموس (Vamos) کے اہم شہر کا محاصرہ کر لیا، خانہ جنگی پھر شروع ہو گئی، دول عظمیٰ نے دباؤ ڈال کر باب عالی سے چند خاص مراعات اس شورش کو فرو کرنے کے لیے منظور کرائیں، چنانچہ معاہدۂ ہلیپا از سر نو نافذ کر دیا گیا، ترکی فوجیں واپس بلائی گئیں، مالی مدد کا وعدہ کیا گیا اور ایک عیسائی گورنر جنرل مقرر ہوا، عیسائی لیڈروں نے معاہدۂ ہلیپا کی بنا پر اصلاحات کا ایک نظام مرتب کیا جسے دول عظمیٰ کی سفارش سے باب عالی نے منظور کر لیا۔

اس درمیان میں ایک قومی تحریک یونان میں شروع ہوئی تھی، جس کی ایک

ایک خفیہ سوسائٹی (Ethnike Hetareia) کے نام سے ۱۸۹۴ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس سوسائٹی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کریٹ اور یونان کے الحاق میں مدد کی جائے لیکن اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ مقدونیہ کے حصوں کے لیے ترکی سے جنگ کی جائے۔ ان سازشی تدبیروں کی کامیابی کے لیے کریٹ کے عیسائیوں کی حالت جو ۱۸۹۲ء کی اصلاحات سے بھی غیر مطمئن ہو رہے تھے بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے کارندے کریٹ میں بھیجے اور ان کی ایک جماعت مقدونیہ بھی پہنچ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۶ء کی ابتدا ہی میں عیسائیوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ فروری ۱۸۹۷ء میں کنیا (Canea) میں جنگ شروع ہوگئی اور باغیوں نے یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ اب سوسائٹی کا مقصد پورا ہوتا نظر آرہا تھا۔ تمام یونانیوں نے ان باغیوں کی حمایت میں مظاہرے شروع کر دیے۔ ایتھنز میں ان کا جوش و خروش سب سے زیادہ تھا۔ حکومت یونان جو اب تک دول عظمیٰ کے مصالح کی بنا پر اہل کریٹ کو عملی مدد دینے سے جھجکتی تھی اس قومی جوش سے اپنی مجبوری کا اعلان کرنے لگی۔ ۱۰ فروری ۱۸۹۷ء کو بادشاہ نے اپنے شہزادہ جارج کو چند جہازوں کے ساتھ روانہ کیا اور چند دنوں بعد کرنل واسوس (Vassos) کی سرکردگی میں ایک یونانی فوج کریٹ پہنچ گئی۔ حکومت یونان کا یہ اقدام گویا سلطنت عثمانیہ سے جنگ کا اعلان تھا۔ دول عظمیٰ نے اگرچہ جنگ کو اس وقت روکنا چاہا لیکن انہوں نے فوراً اپنے جنگی جہاز اور فوجیں روانہ کیں اور کریٹ کے ساحلی قلعوں پر قبضہ کر کے باغیوں کی اصلی قوت ختم کر دی اور ایتھنز باب عالی سے صلح کے لیے تیار تھی۔ حکومت یونان نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مصالحت کی شرائط ... کریٹ سے یونانی حمایت سے دست کش ہونے پر اپنی فوجیں ہٹانے سے اس وقت تک کے لیے انکار کر دیا جب تک خود اہل کریٹ کو اپنے وطن کے مستقبل کی نسبت استصواب کے ذریعہ فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دے دی جائے۔ باغیوں کے لیے یہ شرط تھی کہ انہوں نے بھی ہتھیار رکھ

سے انکار کر دیا اور دوسری طرف دول عظمیٰ کے جہازوں نے کریٹ کی بندرگاہوں پر قبضہ کر کے پورے جزیرہ کی ناکہ بندی کر دی اور ایک اعلان اس مضمون کا شائع کیا کہ آیندہ یہ جزیرہ دول یورپ کے سایۂ عاطفت میں رہے گا جو اس کی حکومت خود اختیاری کی ضامن ہوں گی۔ (۱)

جنگ یونان: تاہم کریٹ کی ناکہ بندی اور دول یورپ کا یہ اعلان یونان اور دولت علیہ کی جنگ کو روک نہ سکا، نیشنل سوسائٹی نے اہل یونان کو توسیعات ملکی کی جو شراب پلائی تھی اس کے نشہ سے وہ بدمست ہو رہے تھے، یونانیوں نے سرحد عبور کر کے مقدونیا کے بعض علاقوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا، باب عالی کے لیے مدافعت ناگزیر تھی، چنانچہ ۱۷ اپریل ۱۸۹۷ء کو ادھر سے بھی اعلان جنگ ہوا، عثمانی فوجیں حال ہی میں جرمن افسروں کے زیر نگرانی اعلیٰ تربیت اور تنظیم حاصل کر چکی تھیں، جس کے باعث ان کی قوت یونانی فوجوں سے بڑھی ہوئی تھی، ترکوں کے پہلے ہی حملہ میں یونانیوں کا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ بدحواس ہو کر بھاگے، ایک مہینہ کے اندر اس جنگ کا جس کے لیے یونانی اس درجہ بے قرار تھے خاتمہ ہو گیا، ترک ان کا پیچھا کرتے ہوئے تھسلی میں داخل ہو گئے اور قریب تھا کہ ایتھنز پہنچ جائیں مگر عین اس وقت دول عظمیٰ کی مزاحمت نے حسب دستور قدیم ترکوں کی راہ روک لی اور ۲۰ مئی کو انھیں مجبوراً ایک عارضی صلح کے لیے راضی ہونا پڑا، دسمبر میں اس عارضی صلح کو مستقل کر دیا گیا، یونان کو تھسلی کے ایک حصہ سے جو سلطنت عثمانیہ کی سرحد پر واقع تھا دست بردار ہونا پڑا، علاوہ بریں اس پر تخمیناً چالیس لاکھ پونڈ تاوان جنگ بھی عاید کیا گیا، ترکوں نے اس کے بعد تھسلی کو خالی کر دیا۔

یونان سے کریٹ کا الحاق: لیکن یہ جنگ یونان کے لیے خواہ کتنی ہی نقصان رساں رہی ہو کریٹ کے حق میں مفید ہی ثابت ہوئی، دول عظمیٰ کی جمعیت سے جرمنی اور آسٹریا ہنگری نے ذاتی مصالح کی بنا پر علاحدگی اختیار کر لی تھی، تاہم انگلستان، اٹلی، روس اور

---

(۱) میریٹ ص ۳۰۱-۳۰۰

فرانس نے مشترکہ طور پر دباؤ ڈال کر باب عالی کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ کریٹ سے عثمانی فوجوں اور ترکی عہدہ داروں کو واپس بلا لے اور محض خراج قبول کرنے پر قناعت کرے۔ اس کے بعد ۲۱ دسمبر ۱۸۹۸ء کو انھوں نے یونان کے شہزادہ جارج کو بلا کر آٹھ سال کے لیے کریٹ کا ہائی کمشنر مقرر کیا، ایک جدید دستور حکومت مرتب کیا گیا، جس پر ۱۹۰۵ء تک کامیابی کے ساتھ عمل درآمد ہوتا رہا لیکن ۱۹۰۵ء میں کریٹ کے عیسائیوں نے پھر شورش برپا کی اور یونان سے اتحاد کا مطالبہ از سر نو پیش کیا، شہزادہ جارج کے تقرر سے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ دول عظمیٰ اس الحاق کی حامی ہیں کیوں کہ یونان کے شاہی خاندان کے ایک فرد کو ہائی کمشنر مقرر کرنے کے معنی ہی یہ تھے کہ یونان اور کریٹ کا الحاق پیش نظر ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ شہزادہ کی آمد کے بعد بھی سالوں گزر گئے اور یہ مقصد حاصل نہ ہوا، ان میں بے چینی پیدا ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں وینزیلوس (M. Venizelos) کی سرکردگی میں انھوں نے علم بغاوت بلند کر کے یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا، دول عظمیٰ کو پھر مداخلت کا موقع ملا، شہزادہ جارج نے اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا اور شاہ یونان نے دول عظمیٰ کی اجازت سے زئیمس (M. Zaimis) نامی ایک یونانی کو ہائی کمشنر مقرر کیا، تین سال تک دول عظمیٰ کے فوجی دستے قیام امن کے خیال سے کریٹ میں مقیم رہے لیکن زئیمس کے حسن انتظام نے ان کی ضرورت باقی نہیں رکھی اور ۱۹۰۸ء میں وہ واپس بلا لیے گئے۔

۱۹۰۸ء میں جب بلغاریہ نے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور نوجوان ترکوں کے انقلاب کے بعد آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزگووینا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو کریٹ نے پھر الحاق کا مطالبہ پیش کیا اور ایک عارضی حکومت قائم کر کے وینزیلوس کو وزیر عدالت و امور خارجہ مقرر کیا، دول عظمیٰ نے باضابطہ طور پر اس عارضی حکومت کو تسلیم تو نہیں کیا لیکن عملاً اس سے تعلقات قائم کر لیے، چند ہی سالوں میں یونان اور کریٹ کا باضابطہ الحاق بھی عمل میں آ گیا اور سلطنت عثمانیہ کا ایک اور صوبہ دول عظمیٰ کی سرپرستی میں آزاد کر دیا گیا، کریٹ کی آزادی بھی دول عظمیٰ کی اسی حد تک رہین منت ہے جس حد تک یونان کی، اگرچہ

کریٹ کے معاملہ میں ان مغربی حکومتوں نے باغیوں کی حمایت علانیہ اس طرح نہیں کی جس طرح یونان کی کی تھی، یہ احتیاط کسی خوش نیتی پر مبنی نہ تھی بلکہ خطرہ یہ تھا کہ علانیہ مدد کرنے سے دولت عثمانیہ سے جنگ چھڑ جائے گی اور چونکہ جرمنی اور آسٹریا ہنگری ان کی جمعیت سے علاحدہ ہو گئے تھے اور جرمنی کے استعماری مقاصد روز بروز دولت علیہ سے زیادہ قریب لاتے جا رہے تھے، اس لیے جنگ میں خود مغربی حکومتوں کا باہم دگر مقابل ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا، یہی وہ خطرہ تھا جس کے سبب باغیان کریٹ کی علانیہ مدد سے اجتناب کیا جا سکتا تھا، خصوصاً جب مقصد ایسی مدد کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا تھا۔

مسئلہ آرمینیا: سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں دخل دینے کے لیے دول عظمیٰ کو کسی خاص حیلہ کے تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی، عیسائی رعایا کے حقوق کا تحفظ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ہر مداخلت کے لیے کافی عذر ہو سکتا تھا، تمام یورپین حکومتوں نے اپنی جگہ یہ فرض کر لیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں کے ساتھ بے انتہا مظالم ہو رہے ہیں اور ان مظالم کے تدارک کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ عیسائیوں کو دولت علیہ کی فرماں روائی سے آزاد کر دیا جائے اور ان کی خود مختار حکومتیں قائم کر دی جائیں، یونان، سرویہ، بلغاریہ، رومانیا، کریٹ یہ تمام صوبے اسی مقصد کے ماتحت اور دول عظمیٰ کی سرپرستی میں سلطنت عثمانیہ سے علاحدہ کر دیے گئے تھے، اب صرف دو علاقے اور رہ گئے تھے جن میں عیسائیوں کی آبادی مسلمانوں سے زیادہ تھی، آرمینیا اور مقدونیا، یورپ کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ ان "مظلوموں" کو بھی ترکوں کے پنجے سے آزاد کرائے۔

آرمینی قوم نہایت قدیم زمانہ سے ایشیائے کوچک کے ان کوہستانی علاقوں میں رہتی آئی تھی جو شمال مشرق میں واقع ہیں، اس نے بہت پہلے عیسائیت قبول کر لی تھی اور سب سے قدیم کلیسا کی تابع تھی، جس کی بنا سینٹ گریگوری (متوفی ۳۳۲ء) نے رکھی تھی، آرمینی کلیسا یونانی کلیسا سے اکثر باتوں میں مشابہ ہونے کے باوجود اپنی ایک مستقل اور جداگانہ ہستی رکھتا ہے، اس کا پیشوا کیتھولیکس (Catholicus) کہلاتا ہے، لیکن

باوجود اس کے کہ یہ قوم زمانہ قدیم سے آباد ہے اور اس کا ایک مستقل کلیسا بھی ہے جہاں تک جغرافی رقبہ کا تعلق ہے، اس کے حدود مستقل اور متعین نہیں، یہ قوم جن علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے، وہ بحر کاسپین، بحر اسود، کوہ کاف اور کردستان سے گھرے ہوئے ہیں اور روس، ترکی اور ایران کی سلطنتوں میں تقسیم ہیں۔

سلطنت عثمانیہ میں آرمینیوں کی حالت ابتدا ہی سے اچھی تھی، تجارت ان کا خاص پیشہ تھا اور اس حیثیت سے وہ قسطنطنیہ اور سلطنت کے تمام دوسرے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس پیشہ میں یہاں تک فروغ حاصل کیا کہ مشرق ادنیٰ کی تجارتی قوموں میں وہ یونانیوں اور یہودیوں کے مد مقابل ہو گئے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جب مغربی تہذیب وتمدن نے سلطنت عثمانیہ میں بار پانا شروع کیا تو آرمنی بھی جدید خیالات سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنی قوم میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے یورپ کے جدید نظام تعلیم کے مطابق مدرسے قائم کیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد وہ اپنی ہمسایہ قوموں سے تعلیم میں آگے بڑھ گئے۔

تعلیم کی ترقی کے ساتھ سیاسی خیالات بھی پھیلنا شروع ہوئے اور ریاستہائے بلقان کی مثالیں دیکھ کر آرمینیوں میں بھی حصول آزادی کا جذبہ پیدا ہوا، لیکن اس راہ میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ کوئی متعین علاقہ ایسا نہ تھا جس میں آرمینیوں کی اکثریت ہو، علاوہ بریں تمام آرمنی سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں بھی نہ تھے، ان میں سے کچھ روس اور کچھ ایران کی سلطنت میں آباد تھے، اکثریت جو تقریباً بارہ لاکھ افراد پر مشتمل تھی، سلطنت عثمانیہ کی چھ ولایتوں، سیواس، بطلیس، ارض روم، خارپت، دیار بکر اور وان میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن ان میں سے کسی ولایت میں ان کی تعداد وہاں کے دوسرے باشندوں یعنی ترک، یونانی اور کرد سے زیادہ نہ تھی (۱) ۱۸۶۳ء میں باب عالی نے ایک ”آرمنی دستور“ عطا کیا تھا جس کی رو سے آرمینیوں کے تمام ملکی اور مذہبی معاملات ایک ”قومی مجلس عامہ“ کو تفویض کر دیے گئے تھے، اس مجلس کا صدر آرمنی کلیسا کا پیشوا تھا اور اس

---

(۱) ”جزیرہ نمائے بلقان اور مشرق ادنیٰ“ از شیویل، ص ۴۳۶

کے ماتحت دو چھوٹی مجالس تھیں جن میں علاحدہ علاحدہ ملکی و مذہبی امور طے ہوتے تھے۔(۱)

سلطان عبدالحمید ثانی کی تخت نشینی کے وقت آرمینیوں کی حالت پہلے سے بہتر تھی، لیکن روس اور ترکی کی جنگ (۱۸۷۷ء تا ۱۸۷۸ء) کے بعد ہی "مسئلہ آرمینیا" پیدا کر دیا گیا اور سب سے پہلے معاہدۂ سان اسٹیفانو میں روس نے باب عالی سے یہ وعدہ لیا کہ جن صوبوں میں آرمنی آباد ہیں ان میں اصلاحات جاری کر دی جائیں گی اور انھیں کردوں اور چرکسوں کے دست برد سے محفوظ رکھا جائے گا پھر جب معاہدۂ سان اسٹیفانو کی منسوخی کے بعد ۱۳/ جولائی ۱۸۷۸ء کو صلح نامہ برلن مرتب ہوا تو باب عالی نے یہی وعدہ تمام دول عظمٰی سے کیا، اس سے قبل معاہدۂ سائپرس میں بھی جو ۴/ جون ۱۸۷۸ء کو باب عالی اور برطانیہ کے درمیان طے ہوا تھا، سلطان نے اپنے ایشیائی علاقوں کی عیسائی رعایا کے لیے ضروری اصلاحات اور تحفظ کا وعدہ کیا تھا، اس طرح ۱۸۷۸ء کے بعد آرمنی اپنے کو دول عظمٰی اور خصوصاً برطانیہ کے زیر حمایت سمجھنے لگے، معاہدۂ سائپرس میں آرمنیوں کا ذکر اگرچہ تصریح کے ساتھ نہیں آیا تھا، تاہم عیسائی ہونے کے علاوہ انھیں برطانیہ کی مخصوص حمایت کا یقین جس وجہ سے ہوا وہ یہ تھی کہ معاہدۂ برلن میں برطانیہ نے اس بات پر زور دیا تھا کہ روس سلطان کے وعدہ پر اعتماد کر کے اپنی ایشیائی مفتوحات سے قبضہ اٹھا لے اور ان اصلاحات کے اجرا کا انتظار کرے۔

غرض ۱۸۷۸ء کے بعد آرمنی قوم نے مسیحی یورپ کی حمایت پر اعتماد کرنا شروع کیا اور معاہدۂ برلن میں جن اصلاحات کا وعدہ کیا گیا تھا انھیں حکومت خود اختیاری کا زینہ قرار دے کر ان کے حصول کے لیے ایجی ٹیشن کرنے لگی، یہ صورت حال باب عالی کے لیے تشویشناک تھی کیوں کہ دول عظمٰی کی ایسی ہی حمایت اور ایجی ٹیشن کی یہی شکل اس سے قبل عیسائی صوبوں کی آزادی کا باعث ہو چکی تھی، بوسنیا، سرویا اور بلغاریا میں جو ہنگامے دول عظمٰی کی سرپرستی میں کامیاب ہو چکے تھے، وہ آرمینیا کی حوصلہ افزائی کے لیے

---

(۱) "سلطنت عثمانیہ اور اس کے جانشین" از طرص ۳۲۸

کافی تھے، باب عالی کے لیے آرمینیوں کی شورش اس وجہ سے بھی زیادہ تشویش ناک تھی کہ ان میں اعدامیت (Nihilism) کی تحریک رونما ہو چکی تھی، جو ایک نہایت شدید انقلابی تحریک تھی اور موجودہ نظام حکومت کو درہم برہم کر دینا چاہتی تھی، یہ تحریک کسی خاص مذہب سے وابستہ نہ تھی، بلکہ اس کے انقلابی مقاصد کے سامنے اسلامی اور مسیحی سلطنتوں میں کوئی فرق و امتیاز نہ تھا، چنانچہ یہ اعدامی سازش ہی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۸۱ء میں زار الکزنڈر ثانی قتل کیا گیا، اس تحریک کا خوف سلطان عبدالحمید ثانی اور زار الکزنڈر ثالث دونوں پر یکساں طاری تھا، ۱۸۸۵ء میں بھی اس جماعت نے ایک شورش برپا کی تھی لیکن باب عالی نے اسے آسانی کے ساتھ فرو کر دیا تھا، آرمینیوں کو بحیثیت عیسائی ہونے کے روس کی جو سرپرستی حاصل تھی وہ ۱۸۸۱ء میں زار الکزنڈر ثانی کے قتل کے بعد جاتی رہی، حکومت روس نے ان کے مدرسے بند کرا دیے، آرمینی زبان دبائی جانے لگی اور آرمینیوں کو روسی کلیسا میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی، مسیحی روس کی سرپرستی میں حکومت خود اختیاری کی جو توقعات تھیں وہ ان کارروائیوں سے مفقود ہو گئیں، تفلس کے آرمینیوں نے اس کے بعد ترکی آرمینیوں کی طرف توجہ کی، وہ ریاستہائے بلقان میں سلاوی شورشوں کی کامیابی دیکھ چکے تھے، اسی قسم کے ہنگامے انھوں نے آرمینیا میں برپا کرنے شروع کیے۔(۱)

روس کی حمایت سے محروم ہو جانے کے بعد آرمینیوں کی انقلابی جماعت نے جس میں سے بعض یورپ کے تعلیم یافتہ اور وہاں کی آزاد خیالی اور تحریک اعدامیت سے حد درجہ متاثر تھے، اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہی تدبیریں اختیار کیں جو بلغاریا میں کامیاب ہو چکی تھیں، چنانچہ انقلابی رسالوں اور اخباروں کی اشاعت کے لیے تفلس نیز متعدد یوروپین پایہ تختوں میں انجمنیں قایم کی گئیں اور خفیہ سوسائٹیاں انقلابی تجاویز کو عمل میں لانے کی غرض سے بنائی گئیں، گماشتوں کے ذریعہ ترکی آرمینیا میں پروپگنڈا جاری کیا گیا، اسلحہ اور بم وغیرہ بھجوائے گئے اور حکومت عثمانیہ کی معمولی بدنظمی کے واقعات

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۵۶۷

کو یورپ کے سامنے شدید مظالم کی صورت میں پیش کیا گیا، اس انقلابی تحریک میں کچھ نوجوان بھی شریک ہو گئے، جنھوں نے ابتدائی اصول کی بنا پر مقامی کمیٹیاں قائم کیں، لیکن آرمینی پادری اور امریکن مشنری اس سے علاحدہ رہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ اس تحریک کا رجحان مذہب کے خلاف تھا، مخالف مذہب ہونے کے باعث نیز اس وجہ سے کہ اس میں لیڈروں کے ذاتی اغراض کو بہت کچھ دخل تھا یہ تحریک عوام میں مقبول نہ ہو سکی، اپنی تدبیروں میں ناکام ہو کر آرمینی گماشتوں نے افراد پر حملے کرنے شروع کیے۔ لوگوں کے نام تہدیدی خطوط بھیجے اور مشنریوں کو حکومت کی نظر میں مشکوک بنانے کے لیے ۵/ جنوری ۱۸۹۳ء کو مارسیوان (Marsivan) میں امریکن کالج کی دیواروں پر انقلابی اشتہارات چسپاں کر دیے، یہ آخری تدبیر کارگر ہوئی، اشتہارات کی اشاعت کا الزام امریکن مشنریوں پر عاید کیا گیا اور دو آرمینی پروفیسر قید کر دیے گئے، اس کے بعد قیصاریہ اور دوسرے مقامات پر بلوے ہوئے جو آسانی سے فرو کر دیے گئے۔

انقلابیوں کا ایک مقصد یہ تھا کہ دارون (Daron) کے قدیم شہر کو جدید آرمینیا کا پایہ تخت بنائیں، ۱۸۹۳ء کے موسم گرما میں ایک انقلابی گماشتہ موش کے قریب گرفتار ہوا، اس خیال سے کہ ممکن ہے اور گماشتے بھی ہاتھ آجائیں گورنر نے کرد سواروں کے بے ضابطہ دستے کو وہاں کے پہاڑی علاقے پر حملہ کرنے کا حکم دیا، آرمینیوں نے کردوں کو بھگا دیا اور دوسرے سال موسم بہار میں جب دوبارہ حملہ کیا گیا تو پھر آرمینی مغلوب نہ ہوئے، انقلابی جماعت کی باغیانہ کوششوں کو دیکھتے ہوئے اس فتنہ کا استیصال ضروری تھا، چنانچہ صوبہ کے والی نے باضابطہ فوجیں روانہ کیں، اب کی بار آرمینی مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکے اور کثرت سے مارے گئے، اس واقعہ کی خبر جب یورپ پہنچی تو مسیحی حکومتوں نے ایک قیامت برپا کر دی اور باغیوں کی سزا کو جو حکومت عثمانیہ کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے تھے، بے گناہوں کے قتل عام سے تعبیر کر کے ایک تحقیقاتی کمیشن کا مطالبہ کیا، نومبر ۱۸۹۳ء میں یہ کمیشن آرمینیا بھیجا گیا، برطانیہ، فرانس اور روس کے قنصل اس کے ممبر

بنائے گئے، تحقیقات کے بعد کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ آرمینیا میں اصلاحات کے نافذ کرنے کی سخت ضرورت ہے، چنانچہ متفقہ طور پر برطانیہ، فرانس اور روس کی طرف سے ۱۱ مئی ۱۸۹۵ء کو اصلاحات کی ایک تجویز باب عالی کے سامنے پیش کی گئی۔

لیکن اس درمیان میں آرمینیوں کی خفیہ انجمنیں اپنا کام کرتی رہیں، مختلف حصوں میں ہنگامے برپا ہوئے اور جو آرمینی اس قومی تحریک میں شریک نہیں ہوئے تھے قتل کر دیے گئے، خفیہ انجمنوں کے کارکنوں نے خود آرمینی کلیسا کے پیشواؤں کو قتل کی دھمکی دی اور یہ خبر مشہور ہو رہی تھی کہ برطانوی سفیر چاہتا ہے کہ چند آرمینی قتل کر دیے جائیں تاکہ اسے جنگی بیڑا قسطنطنیہ کے سامنے لانے کے لیے بہانہ ہاتھ آئے (۱)، یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء کو آرمینیوں کا ایک جلوس جس میں کئی ہزار آدمی تھے، اپنے مطالبات لے کر باب عالی میں حاضر ہوا، باب عالی کی طرف سے غور کر کے جواب دینے کا وعدہ کیا گیا، لیکن آرمینیوں نے مطالبات کے اسی وقت منظور کیے جانے پر اصرار کیا اور جب پولیس نے ان کو منتشر کرنا چاہا تو جھگڑا شروع ہو گیا، دونوں طرف سے گولیاں چلیں اور فریقین میں سے کچھ ہلاک ہوئے، اس کے بعد برطانیہ نے اصلاحات کی منظوری پر پھر زور دیا اور ۱۷ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو سلطان نے تجویز اصلاحات کو منظور کر لیا، لیکن قبل اس کے کہ اصلاحات نافذ کی جاسکیں آرمینیا کی شورشوں سے مجبور ہو کر باب عالی کو ادھر فوجیں روانہ کرنی پڑیں، باغیوں نے مقابلہ کیا اور اکتوبر و نومبر ۱۸۹۵ء میں ان کی ایک بڑی تعداد قتل کر دی گئی، بغاوت کے فرو کرنے سے پہلے اصلاحات کا نفاذ ممکن نہ تھا، خفیہ انجمنوں کی کوشش سے یہ شورش اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اس کے استیصال کے لیے باضابطہ فوجوں کی مدد کے بغیر چارہ نہ تھا، ۲۶ اگست ۱۸۹۶ء کو قسطنطنیہ کے آرمینیوں نے بینک عثمانی پر قبضہ کر لیا، باب عالی نے فوراً اس کا تدارک کیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر یہ بغاوت فرو کر دی گئی، بعض انگریز مورخین کا بیان ہے کہ قسطنطنیہ کے ہنگامہ میں چھ ہزار آرمینی قتل کیے گئے، لیکن وہ

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲، ص ۵۴۸

بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس قتل عام میں مذہبی تعصب کو مطلق دخل نہ تھا، میریٹ لکھتا ہے: ”صرف گریگورین کلیسا کے آرمنی قتل کیے گئے، شاید ہی کسی کیتھولک کو ہاتھ بھی لگایا گیا ہو، قسطنطنیہ میں فساد کی ابتدا آرمینیوں ہی نے کی، ترک مسلح بغاوت کے فرو کرنے میں بالکل حق بجانب تھے“ (۱) ملر لکھتا ہے کہ ”شاید ہی کوئی غیر آرمنی قتل کیا گیا ہو“ (۲) قسطنطنیہ کے علاوہ مقتولین کی مجموعی تعداد بیس سے پچیس ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ (۳)

آرمینیوں کے ”قتل عام“ کا پروپگنڈا یورپ میں اس کثرت اور مبالغہ سے کیا گیا ہے کہ اب تک محض اس کا اشارہ ترکوں کے خلاف انتہائی نفرت اور غصہ کے جذبات برانگیختہ کر دینے کے لیے کافی ہے، سلطان عبدالحمید ثانی کی فرد جرائم میں جو مدبرین یورپ کے قلم سے مرتب ہو کر تمام دنیا میں شائع ہو چکی ہے، سب سے بڑا جرم یہی آرمینیوں کا ”قتل عام“ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس ”قتل عام“ کی نوعیت وہی تھی جو بیان کی جاتی ہے تو مسیحی یورپ کی وہ حکومتیں کیوں خاموش تھیں جن کا جذبہ دینی اس سے پیشتر بھی دولت عثمانیہ کے مقابلہ میں برانگیختہ ہونے سے قاصر نہیں رہا اور جنھوں نے رعایا کو باب عالی کی ”مطلق العنانی“ سے آزاد کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، سرویا اور یونان کی آزادی جن حکومتوں کی رہین منت تھی، رومانیہ کا استقلال جن کی کوششوں سے عمل میں آیا، بلغاریہ نے جن کی حمایت میں خود مختاری کا اعلان کیا، وہ حکومتیں یورپ میں اس وقت بھی موجود تھیں اور ان میں سے ایک بھی دائرہ مسیحیت سے نکل کر اسلام کی حلقہ بگوش نہیں ہوئی تھی، پھر کیا وجہ تھی کہ سرویا، یونان، رومانیا اور بلغاریا کے عیسائیوں کی مدد کے لیے جن کی ”مظلومیت“ یقیناً اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی جو آرمینیا کے مقتولین کی نسبت بیان کیا جاتا ہے، سارا یورپ متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ پر ٹوٹ پڑا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے میں جہاں تک ممکن تھا کوئی کسر اٹھا نہیں رکھا، لیکن جب آرمینیا کے

---

(۱) میریٹ ص ۴۰۱ (۲) سلطنت عثمانیہ اور اس کے جانشین از ملر ص ۴۳۰ (۳) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۵۶۸

عیسائیوں نے ان حقوق کا مطالبہ کیا جن کی ضمانت تمام دول عظمیٰ نے معاہدۂ برلن میں دی تھی اور اس مطالبہ پر باب عالی کی طرف سے قتل عام کا نعرہ دے دیا گیا تو ان مدعیان حق وانصاف میں سے کسی ایک کا ہاتھ بھی مظلوموں کی حمایت کے لیے نہیں اٹھا؟ یہ وہ حقوق کے مطالبہ کرنے پر آرمینیوں کا قتل عام ضروری سمجھا گیا تو یہی مطالبہ تو کریٹ کے عیسائیوں نے بھی کیا تھا اور انھوں نے نہ صرف وفدوں کے ذریعہ اپنے مطالبات پیش کیے تھے بلکہ سالہا سال تک شورشوں اور بغاوتوں کا ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ جس کا سلسلہ ۱۹۱۳ء میں اس وقت منقطع ہوا جب کریٹ اور یونان کا الحاق عمل میں آ گیا۔ لیکن کیا ایسا ہی قتل عام کریٹ میں بھی جاری کر دیا گیا تھا؟ جبکہ ان کے وہاں تو یہ صورت پیش آئی کہ بغاوتوں کے فرو کرنے کے لیے جب عثمانی فوجیں پہنچیں تو فوراً ہی دول عظمیٰ کے جنگی بیڑوں نے کریٹ کی ناکہ بندی کر دی اور بالآخر سلطان کو مجبور ہو کر اپنی تمام فوجیں وہاں سے واپس کرنی پڑیں۔

اصل یہ ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کے ابتدائی دور میں آرمینیوں میں ایک انقلابی جماعت پیدا ہو گئی تھی، جو اصول اعدامیت (Nihilism) سے بغایت متاثر تھی اور موجودہ نظام کو خواہ وہ حکومت کا نظام ہو خواہ مذہب و معاشرت کا درہم برہم کر دینا چاہتی تھی، جہاں تک اصول کا تعلق تھا اس جماعت کے نزدیک روس کی مسیحی حکومت اور ترکی کی اسلامی حکومت میں کوئی امتیاز نہ تھا، چنانچہ ۱۸۸۱ء میں زار الگزنڈر ثانی کا قتل اسی جماعت کی سازش کا نتیجہ تھا، جس کے بعد ہی آرمینیوں کے ساتھ روس کی ساری ہمدردی کا خاتمہ ہو گیا اور حکومت روس آرمینیوں کی شدید مخالف ہو گئی جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ یہ اسی مخالفت کا نتیجہ تھا کہ آرمینیوں کے مدارس بند کر دیے گئے، آرمینی زبان کا استعمال روکا جانے لگا اور آرمینیوں کو روسی بنانے اور روسی کلیسا میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی، آرمینی بہرحال عیسائی تھے اور بالکل سرحد پر آباد ہونے کی وجہ سے سلطنت روس پر ہمسائگی کا حق بھی رکھتے تھے، روس کو دولت عثمانیہ سے جو بغض سترھویں صدی سے

چلا آتا تھا وہ پوشیدہ نہیں۔ اس طویل مدت میں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے اور اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع اس نے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا، پھر اس مقصد کے لیے اس سے بہتر موقع کیا مل سکتا تھا کہ ایک عیسائی قوم جس کے لاکھوں افراد خود اس کی سلطنت میں بھی آباد تھے، عین سرحد پر قتل کی جا رہی تھی اور اشتراک مذہب اور حق ہمسائگی کے علاوہ اس معاہدہ کی بنا پر بھی حمایت کا مطالبہ کر رہی تھی، جو برلن کی مجلس اقوام میں مرتب ہوا تھا، لیکن نہ صرف یہ کہ روس نے خود کوئی مداخلت نہ کی بلکہ جب برطانیہ نے ترکی آرمینیوں کی حمایت میں عملی قدم اٹھانا چاہا تو ۱۸۸۴ء کے بعد سے برابر اس کی پرزور مخالفت کرتی رہی (۱) ظاہر ہے کہ جس فتنہ کا استیصال سلطان کے نزدیک ضروری تھا، اس کا خوف زار پر بھی پوری طرح مسلط تھا، آرمینیوں کی خفیہ انقلابی انجمنوں کا قیام پہلے روس ہی میں ہوا اور وہیں سے ان کے گماشتے ترکی آرمینیا میں پروپیگنڈا کرنے اور اسلحہ، بم وغیرہ تقسیم کرنے کے لیے روانہ کیے گئے، روس کے علاوہ جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور اٹلی کی طرف سے بھی ان باغیوں کی حمایت میں کوئی آواز نہیں اٹھی، حالانکہ یہ حکومتیں بھی معاہدۂ برلن میں شریک تھیں جس میں آرمینیا کے حقوق و اصلاحات کا وعدہ کیا گیا تھا، برخلاف اس کے ۱۸۸۳ء میں بسمارک نے حکومت برطانیہ کو مطلع کر دیا تھا کہ جرمنی کو آرمینیا کی اصلاحات کی مطلق پروا نہیں ہے اور یہ مشورہ دیا تھا کہ بہتر ہے کہ اس قصہ کو چھوڑ ہی دیا جائے (۲) ۱۸۹۴ء کے قتل عام کے بعد جو تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا، اس میں روس، برطانیہ اور فرانس کے قونصل تو شریک ہوئے لیکن دوسری حکومتوں نے کوئی حصہ نہیں لیا، اگر یہ قتل عام اتنے ہی بڑے پیمانہ پر تھا جتنا برطانوی مورخین بیان کرتے ہیں تو کم از کم یہ عیسائی حکومتیں اپنے نمائندوں کو تحقیق حال کے لیے تو روانہ کر سکتی تھیں، دفع دخل مقدر کے طور پر یہ کہا گیا ہے کہ دول عظمیٰ کی باہمی رقابتوں کے باعث باب عالی پر کافی دباؤ ڈالا نہ جا سکا (۳) قیصر جرمنی اپنے اقتصادی مقاصد کی خاطر جنھیں وہ ایشیائے کوچک میں

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۵۶۷ (۲) انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ ص ۵۶۷ (۳) میریٹ ص ۳۹۷

حاصل کرنا چاہتا تھا سلطان کا دوست بنا رہا، آسٹریا ہنگری کے بلقانی مصالح اسے جنگ کی اجازت نہیں دیتے تھے، روس نے اعلان کر دیا تھا کہ یورپ کے پچھلے تجربات کی بنا پر وہ اب ایشیائے کوچک میں کوئی دوسرا بلغاریا پیدا کرنا نہیں چاہتا (۱) لیکن جرمنی اور آسٹریا ہنگری کے مقاصد و مصالح اور روس کا پچھلے تجربات کی بنا پر آرمینیوں کی مدد سے صاف انکار کر دینا اگر باہمی رقابتوں کا سبب بن سکتا تھا جس کے باعث باب عالی پر متحدہ دباؤ ڈالنا ممکن نہ تھا تو عین اسی زمانہ اور انہی رقابتوں کی موجودگی میں برطانیہ، فرانس اور روس کے جنگی بیڑے کریٹ کی ناکہ بندی کیوں کر رہے تھے اور پھر جب یونان نے سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیا اور عثمانی فوجیں ان حملہ آوروں کے مقابلہ میں آگے بڑھیں تو باہمی رقابتیں کیوں مفقود ہو گئیں اور ایتھنز کو خطرہ سے بچانے کے لیے ان حکومتوں نے باب عالی کو صلح پر کیوں کر مجبور کیا؟

مقتولین کی تعداد کے تعین میں بھی مغربی مورخین پروپگنڈے کے جوش میں کہیں سے کہیں نکل گئے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار بیس سے پچیس ہزار تک تخمینہ کرتا ہے، علاوہ ان کے جو قسطنطنیہ میں مارے گئے اور جن کی مجموعی تعداد چھ ہزار بتائی جاتی ہے، میریٹ کے نزدیک قسطنطنیہ کے مقتولین کے علاوہ مجموعی تعداد غالباً پچیس ہزار تھی، ایک دوسرے تخمینہ کے رو سے جو امریکہ کے محققین نے کیا ہے، یہ تعداد پچھتر ہزار تھی (۲)، امریکہ ہی کا ایک اور محقق پروفیسر فرڈی نینڈ شیول (Ferdinand Schevill) اپنی کتاب "جزیرہ نمائے بلقان اور مشرق ادنیٰ" میں لکھتا ہے کہ غالباً ایک لاکھ مرد، عورتیں اور بچے بے دردی سے قتل کر دیے گئے، علاوہ ان ہزاروں کے جو پہاڑوں میں بھاگ گئے اور وہاں فاقہ کشی اور بیماریوں سے ہلاک ہو گئے (۳۲۸) میریٹ نے ضلع ساسون کے قتل عام کے ذکر میں الیسٹ (Elist) کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابتدائی اطلاعات کے رو سے وہاں کے مقتولین کی تعداد سات آٹھ ہزار تھی

---

(۱) مرص ۳۲۱ (۲) میریٹ ص ۳۰۰، فٹ نوٹ

لیکن سرکاری توثیق سے نوازی گئی۔ (۱)

آرمینیا میں اعدامیت کی شورش جس تیزی سے پھیل رہی تھی، اس سے ہر موجودہ انتظام کو خطرہ تھا۔ حسن بن صباح کا فرقہ باطنیہ اس قدر خطرناک نہ تھا جس قدر آرمینیا کا فرقہ اعدامیہ، اس لیے کہ باطنیوں کا وار صرف افراد پر پڑتا تھا اور اعدامیوں کی زد میں افراد اور موجودہ نظام سب آتے تھے، روس کو الکزنڈر ثانی کے قتل سے اس خطرناک تحریک کا پورا تجربہ ہو گیا تھا، اس لیے باوجود اس کے کہ سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کا بہت اچھا موقع سامنے تھا وہ بھی آرمینیوں کی حمایت کے لیے تیار نہ ہوا بلکہ برطانیہ کو بھی ان کی عملی ہمدردی سے روکنے کی کوشش کرتا رہا، جرمنی اور آسٹریا ہنگری کو ان کے ذاتی اغراض نے دولت علیہ کی مخالفت سے روک رکھا ہو مگر برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ تو کھلے ہوئے تھے اور کریٹ میں ان کے متعدد بیڑے باغیوں کی حمایت کر رہے تھے، لیکن یہ دونوں حکومتیں بھی خوب واقف تھیں کہ آرمینیا میں جس فتنے کے استیصال کی کوشش ہو رہی ہے وہ تمام حکومتوں کے لیے یکساں طور پر خطرناک ہے، یہی سبب تھا کہ زبان اور قلم سے تو ان حکومتوں نے باب عالی پر دباؤ ڈالنے کی بہت کوشش کی مگر کبھی ان دھمکیوں کو عمل میں لانے کی جرأت نہیں ہوئی، حالانکہ کریٹ اور یونان میں ان کے جنگی بیڑے اور فوجیں فوراً پہنچ گئیں، یہ زبانی دھمکیاں بھی جو برطانیہ اور فرانس برابر دیتے رہے اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ آرمینیوں نے اپنی مظلومیت کا پروپیگنڈا تمام یورپ میں نہایت کثرت سے کیا تھا اور مغربی اقوام کو یقین ہو گیا تھا کہ ترک اپنے مشرقی بھائیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ باب عالی کی معمولی جھڑپوں کو شدید مظالم کا رنگ دے کر یورپین قوموں کے سامنے پیش کرنا آرمینیوں کا عام شیوہ تھا اور اس میں انھیں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ ترکوں کے خلاف نفرت اور غصے کے جذبات یورپ میں مدت سے پھیلے ہوئے تھے اور بقول مسٹر [illegible] ان کے خلاف ہر بیان خواہ وہ کس قدر مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو بے چون و چرا

---

(۱) میریٹ ص ۳۹۹ فٹ نوٹ

تسلیم کر لیا جاتا تھا (۱) ایسی صورت میں آرمینی پروپگنڈے کی کامیابی تعجب خیز نہیں، فرانس اور برطانیہ کی حکومتوں نے اس باب میں جو کچھ کیا وہ قوم کے شدید تقاضوں سے کیا، ورنہ وہ آرمینی انقلابیوں کی خفیہ سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر تھیں۔

تونس: اب تک سلطنت عثمانیہ کے جو صوبے مغربی حکومتوں کے زیر سایہ آزاد ہو چکے تھے، ان میں عیسائیوں کی آبادی بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ تھی اور انہی کے حقوق کا تحفظ دول عظمیٰ کے لیے مداخلت کا حیلہ بن جاتا تھا، لیکن دولت علیہ کے روز افزوں انحطاط نے اب دشمنوں کے اندر اس سے بڑے حوصلے پیدا کر دیے اور انھیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ان صوبوں میں بھی جہاں کی آبادی تقریباً تمام تر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مداخلت سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ایک طرف وہ عیسائی رعایا کی آزادی کے لیے باب عالی پر ہر ممکن طریقہ سے دباؤ ڈال رہے تھے اور دوسری طرف سلطنت کے اسلامی صوبوں پر قبضہ کرنے کے لیے صرف موقع کے منتظر تھے، ۱۸۲۹ء میں معاہدۂ اورنہ کے رو سے یونان کی آزادی تسلیم کی گئی اور برطانیہ، روس اور فرانس نے اپنی متحدہ سرپرستی میں یونان کی خود مختار حکومت قائم کر دی، لیکن دوسرے ہی سال ۱۸۳۰ء میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا اور جب قبائل عرب نے اپنے ملک کے لیے ہتھیار اٹھائے تو حکومت فرانس کی پوری قوت ان کے مقابلہ میں صرف کر دی گئی اور چالیس سال تک فرانسیسی سپاہیوں نے الجزائر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھا، الجزائر کے بعد نگاہیں تونس کی طرف اٹھیں، یہ بھی سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا اور موقع کے لحاظ سے فرانس کے استعماری مقاصد کے لیے نہایت اہمیت رکھتا تھا لیکن وقت یہ تھی کہ اس پر قبضہ کرنے کے لیے ویسا خفیف عذر بھی نہ تھا جیسا الجزائر پر حملہ کے لیے ہاتھ آ گیا تھا، اس مشکل کا حل فرانس کی خوش قسمتی سے برلن کانگریس میں مل گیا، کانگریس ۱۳؍ جون ۱۸۷۸ء کو منعقد ہوئی مگر اس سے قبل ہی انگلستان اور باب عالی کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ

---

(۱) بیداری ترکی از نائٹ ص 17- The Awakening of Turkey by Knight

سائپرس کے متعلق ہو گیا تھا جس کی اطلاع اس وقت تک دوسرے دول عظمیٰ کو نہ تھی، چونکہ اس کانگریس میں نہایت اہم مسائل پیش ہونے والے تھے اور اندیشہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ بھی سامنے ہوگا، اس لیے مغربی حکومتوں کے نمائندے ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ہر ایک کو یہ بدگمانی تھی کہ ممکن ہے دوسرے نے باب عالی سے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے کر رکھا ہو، اس بدگمانی کو دور کرنے کے لیے کانگریس کے افتتاح کے وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہر سفیر اس امر کا اعلان کرے کہ مسائل زیر بحث کے متعلق اس کی حکومت نے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے نہیں کر رکھا ہے، بیکنس فیلڈ اور سالسبری جو حکومت برطانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے، اس تجویز سے نہایت سراسیمہ ہوئے لیکن انہیں اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور ان دونوں کو بھی دوسری حکومتوں کے نمائندوں کی طرح مذکورہ بالا اعلان کرنا پڑا، ابھی کانگریس کا اجلاس ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ۹ر جون کو لندن کے ایک اخبار گلوب (Globe) میں معاہدۂ سائپرس کا مسودہ شائع ہو گیا، واقعہ یہ تھا کہ ماروین (Marvin) نامی ایک شخص جو مشرقی ممالک میں سیاحت کر چکا تھا اور مختلف مشرقی زبانوں سے واقف تھا، برطانیہ کی وزارت خارجہ کی طرف سے معاہدۂ مذکور کا ترکی مسودہ ترجمے کے لیے دیا گیا تھا، حالانکہ دفتر وزارت میں وہ کسی عہدہ پر مامور نہ تھا، اس شخص نے ایک بڑی رقم کے عوض گلوب کے ہاتھ ترجمہ کی ایک نقل فروخت کر ڈالی، بہرحال معاہدۂ سائپرس کی اشاعت سے برلن میں برطانوی سفارت پر گویا بجلی سی گر پڑی اور اگرچہ لندن میں فوراً مسودہ کی صحت سے انکار کیا گیا تاہم برلن میں حقیقت حال زیادہ دنوں پوشیدہ نہ رہ سکی، برطانوی نمائندوں کی بددیانتی سے کانگریس میں اس قدر برہمی پھیلی کہ اس کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا، پرنس گورچاکوف اور وڈنگٹن نے جو روس اور فرانس کی نمائندگی کر رہے تھے، علانیہ اپنے غصہ کا اظہار کیا، معاملہ نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی تھی اور اس کی مزید بدنمائی صرف بسمارک کی کوششوں سے رفع کی جا سکی، بسمارک نے ایماندار دلال کی حیثیت

سے فرانس اور برطانیہ کے درمیان مندرجہ ذیل مصالحت طے کرادی، جس کے بعد ویڈنگٹن کا سارا قصہ جاتا رہا۔ فرانسیسی اور برطانوی نمائندوں کے درمیان یہ طے پایا کہ

(۱) انگلستان نے سائپرس کو جس طرح (خفیہ طریقہ سے) حاصل کرلیا ہے اس کی تلافی کے لیے فرانس کو اجازت دی جائے کہ وہ جس وقت کوئی مناسب موقع ہاتھ آئے تونس پر قبضہ کرلے، انگلستان کی طرف سے کوئی مخالفت نہ ہوگی۔

(۲) مصر میں جو مالیاتی انتظامات ہو رہے ہیں، ان میں فرانس کو بھی انگلستان کے برابر دخل دیا جائے۔

(۳) شام کے رومن کیتھولک عیسائیوں کے تحفظ کا جو دعویٰ فرانس زمانہ قدیم سے کرتا آیا ہے برطانیہ اسے تسلیم کرلے۔(۱)

اس معاہدہ کے بعد فرانس کو انگلستان کی طرف سے اطمینان ہوگیا اور وہ صرف مناسب وقت کا منتظر رہا لیکن جب حملہ کے لیے کوئی معقول حیلہ نظر نہ آیا تو تونس کے فرانسیسی نمائندہ تھیوڈور روستان (Theodore Roustan) نے بے بنیاد غارتی شکایات تصنیف کرکے والی تونس محمد الصادق کے سامنے ایسے بے ہودہ مطالبات پیش کیے جن کو تسلیم کرلینا گویا اس علاقہ کو فرانس کے حوالہ کردینا تھا، اس کے بعد جو ہوا اسے اسٹینلی لین پول اپنی کتاب بربری قزاق میں یوں بیان کرتا ہے: ''ان باتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طاقت ور حکومت نے جس پر متمدل کی مضبوط حکومتوں کی طرف سے کوئی روک نہ تھی ایک نہایت کمزور لیکن دیانتدار مملکت کے خلاف خفیہ طور پر اپنی جارحانہ کارروائیاں شروع کردیں اور بالآخر الجزائر کی سرحد سے متصل بعض قبائل کے ہنگاموں کو عذر قرار دے کر جو ایک مضحکہ خیز عذر تھا تونس پر حملہ کا فیصلہ کرلیا، بے فائدہ محمد الصادق نے روستان کو یقین دلایا کہ قبائل میں امن وامان قائم کردیا گیا ہے، بے فائدہ اس نے

---

(۱) تاریخ ''قبضہ مصر'' از ولفریڈ بلنٹ ص ۲۸-۲۷

Secret History of the British Occupation of Egypt by Wilfred Blunt

تمام حکومتوں اور خصوصاً انگلستان سے اپیل کی، لارڈ گرانویل (وزیر خارجہ انگلستان) نے حکومت فرانس کے اس بیان پر یقین کر لیا کہ ''الجزائر اور تونس کے درمیان سرحدی علاقہ میں جو فوجی نقل و حرکت عنقریب شروع ہونے والی ہے، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ الجزائر کے علاقہ میں سرحدی قبائل کی جو یورشیں برابر ہوا کرتی ہیں، ان کا خاتمہ کر دیا جائے، بے (محمد الصادق) کی آزادی اور اس کے علاقہ کا استقلال کسی طرح خطرہ میں نہیں ہے۔''(1)

ان تصریحات کے باوجود اپریل ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی فوجوں نے تونس پر حملہ کر دیا اور ۱۲ مئی کو محمد الصادق نے بالکل مجبور ہو کر معاہدۂ قصر السعید پر دستخط کر دیے، اس معاہدہ کے رو سے تونس پر فرانسیسی تسلط قائم ہو گیا، اگرچہ حکومت نام کے لیے محمد الصادق کی رہی، محمد الصادق کے انتقال کے بعد سیدی علی بے حاکم مقرر ہوا، لیکن اس کی حیثیت بھی فرانسیسی محمیہ (Profectorate) کے ایک عہدہ دار سے زیادہ نہ تھی۔

قبائل نے معاہدۂ قصر السعید کے بعد بھی ہتھیار نہیں ڈالے، تونس کے جنوبی صوبوں نے علانیہ بغاوت کر دی اور کچھ دنوں تک ان صوبوں میں ہر طرف بدامنی پھیلی رہی، اس کے استیصال میں فرانسیسی فوجوں نے اپنی سابق روایات کے مطابق پوری سرگرمی دکھائی، فاس پر بے دردی کے ساتھ گولہ باری کر کے اسے لوٹ لیا گیا، مکانات مع باشندوں کے جلا دیے گئے، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا اور جو کچھ اس سے قبل الجزائر میں ہو چکا تھا وہ سب تونس میں دہرایا جانے لگا، کچھ دنوں کے بعد بتدریج حالات روبہ اصلاح ہونے لگے، خصوصاً جب روستان وہاں سے واپس بلا لیا گیا تو امن و امان قائم کرنے میں نسبتاً زیادہ آسانی ہوگئی۔

فرانس نے تونس کے ساتھ جو معاملہ کیا، اس کے متعلق لین پول نے ایک فرانسیسی فاضل ہنری ڈی روشفورٹ (Henri de Rochfort) کا مندرجہ ذیل قول نقل

---

(1) بربری قزاق ص ۳۰۸ The Barbary Corsairs by S. Lanepoole –

کر کے اصل حقیقت واضح کر دی ہے، روشفورٹ لکھتا ہے: "ہم نے تونس کی مہم کو ایک معمولی قریب سے تشبیہ دی تھی یہ صحیح نہ تھا، تونس کا معاملہ مثل قزاقی کے ہے، جس کی شدت قتل کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔"(۱)

'برلن کانگریس' میں سلطنت عثمانیہ کی حمایت کا مظاہرہ سب سے زیادہ جس طاقت نے کیا تھا وہ برطانیہ تھی، لیکن معاہدۂ سائپرس کے افشا کے بعد تونس کے متعلق جو معاہدہ برطانیہ اور فرانس کے نمایندوں میں ہوا اور جس کی بنا پر تونس کو جو اس وقت تک دولت علیہ کی فرماں روائی میں داخل تھا فرانسیسی عسکریت کا شکار بنا کر آگ اور خون کی راہ سے حکومت فرانس کے قبضہ واقتدار میں لایا گیا، وہ برطانیہ کی دوستی کی حقیقت واضح کرنے کے لیے بالکل کافی ہے، کانگریس میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ برطانیہ کے لیے نہایت تشویش ناک تھا، روس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور جنگ کے آخری ایام میں خود قسطنطنیہ اس کی زد میں آ گیا تھا، ایسی صورت میں برطانیہ کی مداخلت اور کانگریس کے اجلاس میں سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کے تحفظ پر زور دینا کچھ اس سبب سے نہ تھا کہ وہ دولت علیہ سے حقیقی ہمدردی رکھتا ہے بلکہ محض اس خوف سے تھا کہ اگر روس کو آگے بڑھنے سے روکا نہ گیا تو مشرقِ ادنیٰ میں اس کا تسلط قائم ہو جائے گا جو برطانوی مصالح کے لیے حد درجہ خطرناک ثابت ہوگا اتنا ہی نہیں بلکہ برطانیہ کے اس طرز عمل کا مقصود یہ بھی تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے جو فائدہ دوسری حکومتیں اٹھانا چاہتی ہیں اسے خود اپنے لیے محفوظ کر لے، چنانچہ عین اس وقت جب 'برلن کانگریس' میں برطانیہ کا وزیر اعظم لارڈ بیکنس فیلڈ عثمانی مقبوضات کے تحفظ پر نہایت پرجوش تقریریں کر رہا تھا اور اپنی ترکی دوستی سے یوروپین قوموں کا نشانہ ملامت بنا ہوا تھا، معاہدۂ سائپرس پر کامل رازداری کے ساتھ باب عالی کے نمایندوں کے دستخط لیے جا رہے تھے اور پھر جب کانگریس کے اختتام سے قبل ہی یہ راز منظر عام پر آ گیا اور دوسری حکومتوں کو برطانیہ کی

---

(۱) بربری قزاق ص ۳۰۹ – The Barbary Corsairs by S. Lanepoole

بد دیانتی پر طیش آیا تو سلطنت عثمانیہ ہی کے ایک دوسرے صوبہ (تونس) کو فرانس کے حوالہ کر کے جس کی برہمی سے ساری کانگریس اور اس کے ساتھ مشرق ادنیٰ کے تمام برطانوی مصالح کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ تھا، اس دوستی کا حق ادا کیا گیا، لیکن یہ حق سالسبری اور تونس کے معاہدوں کے بعد بھی پوری طرح ادا نہ ہوا، اس کے لیے کسی اور موقع کا انتظار تھا، خوش قسمتی سے مصر نے یہ موقع بہت جلد بہم پہنچا دیا۔

مصر: سلطان عبدالحمید ثانی کی تخت نشینی کے وقت مصر کا والی اسمٰعیل پاشا تھا، محمد علی پاشا کے جانشینوں میں وہ پہلا شخص تھا، جس نے خدیو مصر کا لقب حاصل کیا ہے، یہ لقب اسے سلطان عبدالعزیز نے ۱۸۶۷ء میں عطا کیا تھا، نیز اسمٰعیل کی درخواست پر سلطان کی طرف سے ولایت مصر کے قانون وراثت میں اس تبدیلی کی اجازت بھی دی گئی تھی کہ آیندہ ولایت کا حقدار باپ کے بعد بیٹا ہوا کرے، بجائے اس کے کہ حکومت خاندان کے سب سے بڑے فرد کو سپرد کی جائے جیسا کہ سلطنت عثمانیہ میں دستور تھا، اس اہم تبدیلی کے معاوضہ میں اسمٰعیل نے مصر کے سالانہ خراج کی رقم جو باب عالی میں پیش کی جاتی تھی تین لاکھ چھہتر ہزار پونڈ سے بڑھا کر سات لاکھ بیس ہزار پونڈ کر دی تھی، ۱۸۷۳ء میں ایک دوسرے فرمان سلطانی کے رو سے اسمٰعیل کو بعض اور حقوق تفویض ہوئے جن کی بنا پر اس کی حیثیت بہت کچھ ایک خود مختار فرماں روا کی ہو گئی۔

ترقی و اصلاحات: اسمٰعیل ایک روشن خیال فرماں روا تھا اور اس کے پیش نظر اصلاحات کا ایک وسیع نظام تھا، اس نے محصول درآمد و برآمد کا نظام از سر نو مرتب کیا، ایک ڈاک خانہ قائم کیا، قاہرہ، سویز اور اسکندریہ میں گیس، پانی کی کلیں اور دوسری اصلاحات جاری کیں، شکر سازی کو رواج دیا اور ریلوے اور تار میں توسیع کر کے نیز بندرگاہیں اور نہریں تعمیر کر کے تجارت اور زراعت کو فروغ دیا، اس نے تعلیم کو ترقی دی، لڑکیوں کے لیے مدرسے قائم کیے جو مصر میں تعلیم نسواں کے پہلے مدارس تھے، فوجی افسروں کے لیے مختلف فنون حرب کا ایک مدرسہ اور اہل مصر کے لیے ایک طبیہ کالج قائم

کیا۔ ۱۸۶۳ء میں جب عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آئی تھی مصر میں صرف (۱۸۵) پبلک اسکول تھے۔ لیکن اس نے اپنے عہد میں ان مدارس کی تعداد (۴۵۱۷) تک پہنچا دی، ۱۸۶۹ء میں اس نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ نہر سویز کا افتتاح کیا اور اس تقریب میں یورپ کے متعدد حکمرانوں کو شریک کرکے اہل مصر کی نگاہوں میں بڑی عزت حاصل کی۔ لیکن یہی تقریب بعد میں اس کے زوال اور مصر کی غلامی کا باعث ہوئی، ۱۸۷۵ء تک مصر میں یہ دستور تھا کہ غیر ملکی باشندوں کے مقدمات دیوانی ان کے قنصلوں کی عدالتوں میں پیش ہوا کرتے تھے۔ اسماعیل نے اس دستور کو منسوخ کرکے مخلوط عدالتیں قائم کردیں۔(۱)

ملکی قرضہ کا بار: لیکن یہ اصلاحات اور ترقیاں مصر کے حق میں تباہ کن ثابت ہوئیں، سابق والی سعید پاشا کی وفات کے وقت مصر ایک نہایت خوش حال ملک تھا، کاشتکاروں کی حالت پہلے کی بہ نسبت کہیں بہتر تھی، وہ تمام دولت مند تھے، مصر پر کسی ملکی قرضہ کا بار نہ تھا، لیکن اسماعیل پاشا کے آتے ہی نقشہ بدل گیا، ان اصلاحات میں نہ صرف خزانہ خالی ہوگیا بلکہ قرضہ لینے کی نوبت بھی آگئی، ۱۸/ نومبر ۱۸۷۶ء تک مصر کے ملکی قرضہ کی مقدار گیارہ کروڑ چھتیس لاکھ بہتر ہزار تین سو ایک پونڈ تک پہنچ گئی۔(۲)

نہر سویز کے حصوں کی فروخت: قرضہ کا بار ملک کے اندرونی مصارف کے علاوہ بیرونی فتوحات کی کوشش میں بھی بڑھتا گیا، سوڈان اور ابی سینا کی مہموں میں ہزاروں جانیں اور لاکھوں روپے ضائع ہوئے، سوڈان کی مہم تو ایک حد تک کامیاب رہی اور دارفور پر قبضہ ہوگیا لیکن ابی سینیا میں اسماعیل کی فوجوں کو سخت شکست ہوئی اور خود اس کا لڑکا دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوگیا، ان غیر معمولی مصارف کے لیے ایک طرف قرضہ کی مقدار میں اضافہ ہوتا گیا اور دوسری طرف کاشت کاروں پر بیش از بیش محصول عاید کیے جانے لگے پھر بھی حکومت کے معمولی اخراجات کے لیے روپیہ کافی نہ ہوتا اور اسماعیل

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص ۵۴۸ (۲) ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲۴ ص ۴۵۷

کو مزید قرضوں سے چارہ نہ تھا۔ یورپ کے ساہوکاروں نے مصر کی مالی حالت دیکھ کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ برطانیہ کے لیے مصر پر اپنا تسلط قائم کرنے کا یہ ایک نہایت زریں موقع تھا۔ لارڈ بیکنس فیلڈ نے جو اس وقت وزیر اعظم تھا اپنے خفیہ گماشتوں کے ذریعہ نہر سویز میں اسماعیل کے تمام حصے جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چھہتر ہزار چھ سو دو تھی، خاموشی کے ساتھ انتالیس لاکھ چھہتر ہزار پانچ سو بیاسی پونڈ میں خرید لیے(۱) اسماعیل اس معاملہ کے مہلک نتائج سے ناواقف نہ تھا لیکن اپنی فضول خرچیوں سے مجبور تھا اور نہر سویز کے حصوں کو فروخت کر دینے کے علاوہ روپیہ حاصل کرنے کی اور کوئی صورت اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

نہر سویز کی اہمیت: نہر سویز کی تعمیر ایک فرانسیسی انجینئر ڈی لیسیپس (Delesse) کی تجویز سے ہوئی تھی۔ اسی نے اسماعیل کو نہر کی تجارتی اہمیت دکھا کر تعمیر پر آمادہ کیا تھا اور اول اول اس میں زیادہ تر فرانسیسی سرمایہ داروں کے حصے تھے، برطانیہ نے کوئی حصہ نہ لیا مگر جب ۱۸۶۹ء میں یہ نہر بن کر تیار ہوئی اور نہایت عظیم الشان پیمانہ پر اس کی رسم افتتاح ادا کی گئی تو برطانیہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نہر کے کھل جانے سے مشرق کا بحری راستہ جو اس وقت تک راس امید سے ہو کر گزرتا تھا مسافت میں بہت کم ہو گیا اور اسی اعتبار سے اخراجات بھی بہت گھٹ گئے، علاوہ بریں اس سے خود مصر کی اہمیت حد درجہ بڑھ گئی اور وہ ملک جو اب تک بین الاقوامی اعتبار سے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا، دنیا کے اہم ترین تجارتی راستوں میں سے ایک کا مالک بن گیا لیکن یہی چیز اس کی سیاسی بربادی کا باعث ہوئی چونکہ نہر سویز میں زیادہ تر اہل فرانس کے حصے تھے۔ اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے کا حق بھی زیادہ تر فرانس ہی کو پہنچتا تھا۔ لیکن اپنے ایشیائی مقبوضات اور مقاصد کی بناء پر انگلستان کے لیے اس نہر پر تسلط قائم کرنا نہایت ضروری تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ برطانوی مدبرین نے شروع میں نہر سویز کی تجویز سے کوئی دلچسپی نہیں لی اور

---

(۱) ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲۴ ص ۳۵۷ (۱) ترکی ماضی، حال و مستقبل از ظفر زواو ص ۲۵

Turkey Yesterday, today & Tomorrow by T. Waugh

وہ اس کی تعمیر کو ایک ناممکن شے خیال کرتے رہے، مگر جب ۱۸۶۹ء میں ڈی لیسپس نے اسے بنا کر تیار کر دیا اور ساری دنیا نے اس تجویز کی کامیابی اپنی نظروں سے دیکھ لی تو برطانیہ کی بھی آنکھیں کھلیں، اس کی خوش قسمتی سے وزارت اس وقت لارڈ بیکنس فیلڈ کے ہاتھ میں تھی، جو اپنے ارادوں کی تکمیل میں دوسرے وزراء کی مخالفت کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا اس نے خفیہ طور پر اسماعیل سے معاملت شروع کر دی اور چونکہ اسماعیل کو روپیوں کی شدید ضرورت تھی اور کہیں سے قرض مل نہیں رہا تھا، اس لیے بیکنس فیلڈ کی کوششیں بالآخر کامیاب ہوئیں اور اسماعیل کے تمام حصے برطانیہ کے ہاتھ فروخت ہو گئے۔

مصر میں فرانسیسی اور برطانوی اقتدار: لیکن ان حصوں کی فروخت سے بھی اسماعیل کے اخراجات پورے نہ ہو سکے اور اسے مزید قرض کی ضرورت محسوس ہوئی، ادھر یورپ کے ساہوکاروں نے اپنی رقموں کی ادائگی کے لیے شدید تقاضے شروع کیے، اسماعیل ان کو ادا کرنے سے بالکل قاصر تھا، اس کی یہ تدبیر کہ پرانے قرضوں کے ادا کرنے کے لیے سنگین شرح سود پر اور قرضے لیے جائیں، بقول ایلیسن فلپس ایک جرعہ لطیف کی حیثیت رکھتی تھی، جو مرض کی مزید ترقی کا باعث ہوا، اس کے سامنے اب صرف دو راہیں تھیں یا تو اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دے یا یوروپین حکومتوں کی مداخلت منظور کرے، جس کی وجہ سے نہ صرف مغربی ساہوکاروں کے بے ہنگام تقاضوں کی روک تھام کی امید تھی بلکہ یہ توقع بھی تھی کہ مزید قرضے مل سکیں گے، چنانچہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اسماعیل نے دیوالیہ ہونے کا اعلان کرنے کے بجائے دوسری صورت اختیار کی اور حکومت برطانیہ سے ایک ماہر مالیات کی درخواست کی جو مصر کے صیغۂ مالیات کا معاینہ کر کے اس کے متعلق صحیح رپورٹ پیش کر سکے، اس درخواست پر دسمبر ۱۸۷۵ء میں مسٹر اسٹیفن کیو (Stephen Cave) حکومت برطانیہ کی طرف سے مصر بھیجے گئے اور ان کی رپورٹ اپریل ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی، رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ مصر کی مالی ساکھ قائم رکھنے کے لیے یوروپین حکومتوں کی مداخلت ضروری ہے، بغیر اس کے دیوالہ نکلنے سے مفر نہیں

اس کے بعد دوسرے تحقیقی کمیشن مقرر ہوئے اور ان میں سے ہر ایک اسماعیل کو اور زیادہ یورپ کے قبضہ میں لاتا گیا، نومبر ۱۸۷۶ء میں برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کی طرف سے گوشن (Goschen) اور جوبرٹ (Joubert) کا مشن آیا، جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کا صیغۂ مالیات مشترکہ طور پر فرانس اور انگلستان کی نگرانی میں آگیا، پھر ۱۸۷۸ء میں ایک اور تحقیقی کمیشن پہنچا، اس کمیشن کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور انگلستان کی نگرانی صیغۂ مالیات کے علاوہ خدیو مصر کی ذمہ داری پر بھی قائم کردی گئی، اس وقت سے مصر گویا بالکل دائنین کے ہاتھوں رہن ہوگیا اور ملک کے تمام ذرائع آمدنی ان عظیم قرضوں کی ادائیگی کی نذر ہونے لگے، جس کا ذمہ دار صرف اسماعیل تھا، چند دنوں کے بعد فرانس اور انگلستان کی مشترکہ نگرانی کی بجائے اسماعیل کو ایک ایسی وزارت قائم کرنے پر مجبور کیا گیا جس میں ان دونوں حکومتوں کے نمائندے بحیثیت رکن کے مقرر کیے گئے، چنانچہ ستمبر ۱۸۷۸ء میں نوبار پاشا کی صدارت میں جو وزارت قائم ہوئی اس میں مالیات کا وزیر ریورس ولسن (Rivers Wilson) اور پبلک ورکس کا بلنییر (Blignieres) مقرر ہوا، یہ گویا ملک کی حکومت برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ میں دے دینا تھا، اس سے سخت برہمی پھیلی اور فوج نے عرابی پاشا کی سرکردگی میں بغاوت کردی، اسماعیل کے لیے بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں رہی کہ برطانوی اور فرانسیسی وزراء کو برخاست کرکے اس یورپین وزارت کا خاتمہ کردے، برطانیہ اور فرانس کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے باب عالی پر دباؤ ڈال کر اسماعیل کو خدیو کے عہدہ سے معزول کرا دیا، ۲۶؍جون ۱۸۷۹ء کو باب عالی کا ایک تار اسماعیل کو ملا، جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ معزول کیا گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا توفیق خدیو مقرر کیا گیا۔

توفیق پاشا: عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے سے پہلے توفیق، سید جمال الدین افغانی اور جامع ازہر کے ان مصلحین کے زیر اثر آچکا تھا جو مصر میں قومی تحریک کے بانی اور دستوری حکومت کے اولین محرک تھے اور اس نے سید جمال الدین افغانی کے توسط سے بار بار یہ

معاہدہ شیوخ ازہر سے کیا تھا کہ اگر کبھی اسے مصر کے تخت پر بیٹھنا نصیب ہوا تو وہ تمام تر دستوری اصولوں کے مطابق حکومت کرے گا، یہی تھی کہ توفیق کے تقرر کو اس جماعت نے ملک کی خوش نصیبی خیال کیا لیکن ان کی مسرت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور تخت نشینی کے بعد بمشکل ایک مہینہ گذرا تھا کہ وہ اپنے وعدوں کو بھول گیا اور اپنے سابق دوستوں سے غداری کرنے لگا۔

توفیق کے سامنے دو قوتیں تھیں، جن کے اغراض ومقاصد ایک دوسرے کے بالکل مخالف تھے، ایک طرف اس کے اصلاح پسند دوستوں کی جماعت تھی جو اسے دستوری حکومت کے قدیم وعدے یاد دلا رہے تھے، دوسری طرف یوروپین قنصلوں کی قوت تھی جو اسے دستوری حکومت سے روک رہے تھے اور اس بات پر زور دے رہے تھے کہ وہ اپنے اختیارات کے کسی حصہ سے بھی دست کش نہ ہوتا کہ وہ خود اس کے نام سے مصر پر حکومت کرتے رہیں، پہلی قوت سے متاثر ہو کر شروع میں تو اس نے اپنے وزیر شریف پاشا کے مشورہ کے مطابق دستوری حکومت کا قیام منظور کر لیا اور ایک فرمان کے ذریعہ اس کی اشاعت کی اجازت دے دی لیکن جب دوسری طرف سے زور پڑا تو اس فرمان پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا، اس واقعہ پر شریف پاشا نے استعفا دے دیا اور توفیق نے قنصلوں کی تجویز سے ریاض پاشا کو وزیر مقرر کیا جو یوروپین حکومتوں کے زیر اثر تھا، توفیق نے اپنے دور حکومت کے پہلے ہی اہم معاملہ میں جو کمزوری دکھائی، وہ اس کی تمام آیندہ مشکلات کا سبب بن گئی، اگر اس نے اپنے وعدوں کے مطابق اس وقت ایک مجلس اعیان طلب کر لی ہوتی تو اس کی تمام رعایا اس کے ساتھ ہو جاتی اور وہ سازشیں وجود میں نہ آتیں جو دو سال تک ملک کو بے چینی میں مبتلا رکھنے کے بعد بالآخر ۱۸۸۲ء کے انقلاب کا باعث ہوئیں۔

دستوری حکومت کا اعلان: توفیق کی کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت حقیقتاً یوروپین سفیروں کے ہاتھ میں آ گئی اور انگلستان اور فرانس نے اپنی مشترک نگرانی پھر قائم کر لی،

یوروپین عہدہ داروں کی ایک کثیر تعداد نے پہنچ کر ملک کو لوٹنا شروع کیا، اہل مصر میں سخت برہمی پھیلی، خصوصاً جب مصری فوج کی تعداد پچاس ہزار سے گھٹا کر صرف پندرہ ہزار کر دی گئی تو ان کے غصہ کی انتہا نہ رہی، توفیق اپنے یوروپین مشیروں کے ہاتھ میں ایسا بے بس تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کر نہیں سکتا تھا، اہل مصر کے لیے موجودہ نظام حکومت کے خلاف بغاوت ناگزیر ہو گئی اور مصری فوج نے احمد عرابی پاشا کے زیر علم جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی: "مصر مصریوں کے لیے" ستمبر ۱۸۸۱ء میں بغاوت کر دی اور دستوری حکومت کا مطالبہ پیش کیا، توفیق ملک کے اس متفقہ مطالبہ کو مسترد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، اسے مجبوراً دستوری حکومت کا مطالبہ منظور کرنا پڑا۔ مصری فوج کی تعداد بھی جو یوروپین مشیروں کی رائے کے مطابق گھٹا دی گئی تھی پھر بدستور سابق کر دی گئی، دستوری حکومت کا فرمان اہل مصر کے لیے ویسی ہی مسرت کا باعث ہوا جیسی مسرت قیدیوں کو مژدۂ رہائی سے پہنچ سکتی ہے، تمام ملک میں جشن کے شادیانے بجنے لگے اور توفیق کے خلاف جو شکایتیں قائم ہوئی تھیں وہ یک قلم رفع ہو گئیں، اس دستوری حکومت میں یوروپین قنصلوں کے شدید اختلاف کے باوجود عرابی پاشا وزیر جنگ مقرر ہوئے اور توفیق نے اس قانون پر دستخط کر دیے جس کی رو سے جدید قانونوں کے لیے مجلس اعیان کی منظوری لازمی قرار دی گئی۔

انگلستان اور فرانس کا طرز عمل: اہل مصر کی بیداری یوروپین حکومتوں کے مقاصد کے لیے نہایت مضر تھی کیوں کہ انھوں نے بتدریج مصر پر اپنا تسلط قائم کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ انگلستان اور فرانس نے ایک متفقہ مراسلہ مورخہ ۶ جنوری ۱۸۸۲ء توفیق پاشا کے پاس بھیجا جس میں اپنی سرپرستی کا یقین دلاتے ہوئے قومی جماعت کے خلاف پوری مدد کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس مراسلے کے مضمون نے مصریوں کو اور بھی برافروختہ کر دیا، خصوصاً جب سلطان نے بھی انگلستان اور فرانس کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا اور اپنے سفیروں کے ذریعہ جو لندن اور پیرس میں مقیم تھے انھیں مطلع کیا کہ مصر سلطنت

عثمانیہ کا ایک صوبہ ہے اس لیے حکومت مصر سے کوئی معاملات باب عالی کے توسط کے بغیر نہیں ہونی چاہیے تو وطنی جماعت کے حوصلے اور بڑھ گئے، انگلستان اور فرانس نے اس کو یہ جواب دیا کہ ایک متحدہ جنگی بیڑا اسکندریہ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور یہ دھمکی دی کہ اگر عرابی پاشا کو مصر سے نکال نہ دیا جائے گا اور ان کی وزارت توڑ نہ دی جائے گی تو جنگی بیڑے کے ذریعہ یہ مطالبات پورے کرائے جائیں گے، توفیق نے تو یہ باتیں منظور کر لیں لیکن قومی جماعت پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا، برخلاف اس کے اس نے خود توفیق کو معزول کر دینے کی دھمکی دی اور اسے مجبور کر کے عرابی پاشا کو پھر وزیر جنگ مقرر کرایا۔ اس کے بعد مصری حکومت عملاً عرابی پاشا کے ہاتھ میں آ گئی۔

اس موقع پر فرانس کی تجویز سے مغربی حکومتوں کے سفراء کی ایک کانفرنس قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی، جس میں حکومت مصر کے معاملات سے متعلق باب عالی کو مشورے دیے گئے اور ان مشوروں کے مطابق مداخلت کرنے کی درخواست کی گئی، سلطان نے اپنی سلطنت کے اندرونی معاملات میں غیر حکومتوں کی مداخلت پر عمل کرنے سے انکار کر دیا، بجائے اس کے اس نے توفیق اور قومی جماعت کی استدعا پر مصر کے لیے ایک کمشنر کا تقرر منظور کیا اور درویش پاشا کو مقرر کر کے روانہ کیا۔

درویش پاشا: درویش پاشا نے قاہرہ پہنچ کر حالات کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کی، لیکن توفیق نے پچاس ہزار پونڈ نقد اور پچیس ہزار پونڈ کے جواہرات نذر کر کے اسے اپنا طرفدار بنا لیا(۱) نتیجہ یہ ہوا کہ جب شیوخ ازہر کا وفد اس سے ملنے آیا اور اس نے ملکی جذبات کی پوری ترجمانی کر کے درویش پاشا کے سامنے قوم کے مطالبات پیش کیے تو درویش پاشا نے یہ جواب دے کر وفد کو رخصت کر دیا کہ "میں حکم دینے آیا ہوں تم سے مشورہ کرنے کے لیے نہیں آیا۔" شیوخ نہایت برہمی کی حالت میں واپس ہوئے اور جو برتاؤ ان کے ساتھ درویش پاشا نے کیا تھا اس کی خبر بہت جلد تمام ملک میں پھیل گئی،

---

(۱) تاریخ قبضہ مصر از بلنٹ ص ۲۳۳

طرف سے جتنی بھی چالیں دور دشمنوں سے ہوئے تھے، وہ حکومت کی مخالف کوششوں کے باوجود درویش پاشا وفد کے رئیس کی حیثیت سے متعین ہوا، معاملات پر قابو پانے کے لیے اس نے عرابی پاشا کو بلا کر بہت گفتگو کی اور ان پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا رہا کہ عرابی پاشا بطور خود وزارت جنگ سے دست بردار ہو کر قسطنطنیہ روانہ ہو جائیں لیکن عرابی پاشا نے جواب دیا کہ چوں کہ اس وقت ملک کی حالت نازک ہے اور امن و امان کا ذمہ دار میں ہوں اس لیے جب تک مجھے باقاعدہ تحریری حکم نہ ملے گا میں اپنے عہدے سے دست بردار نہیں ہو سکتا درویش پاشا کے لیے یہ جواب خلاف توقع تھا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ترکی وزارت نے یورپین قونصلوں کے لیے عرابی پاشا کے خلاف ایک عمدہ موقع ہاتھ آ گیا اور اس شورش کا مواد پہلے سے فراہم کر لیا گیا تھا اسے فوراً درویش پاشا کی موجودگی ہی میں برپا کر دیا گیا تاکہ سب ملکی غیر ملکی پر عرابی کے انتظام کی حقیقت کھل جائے۔

اسکندریہ کا بلوہ: اسکندریہ میں اتفاق سے ایک مصری گدھے والے اور ایک مالٹی کے درمیان ایک روپیہ کا جھگڑا ہو گیا، جس نے فوراً ہی ایک سخت ہنگامے کی شکل اختیار کر لی۔ تقریباً پچاس آدمی مارے گئے جن میں آدھے یورپین تھے۔ برطانوی قونصل مسٹر کوکسن (Cookson) کو سخت چوٹ آئی اور اطالوی اور یونانی قونصل بھی کسی قدر زخمی ہوئے۔ ان کے علاوہ اسی (۸۰) نوے (۹۰) یورپین زخمی ہوئے۔ یہ ہنگامہ ایک بجے دن سے لے کر پانچ بجے شام تک جاری رہا۔ آخر اسکندریہ کی پولیس جو وہاں کے گورنر عمر پاشا لطفی کے زیر حکم تھی، اسے فرو کرنے سے قاصر رہی اور جب تک فوجی دستہ طلب نہ کیا گیا کشت و خون ہوتا رہا۔

حقیقت حال: اس ہنگامے کی ذمہ داری تحقیق کی رو سے کس پر عائد ہوتی ہے اس کا اظہار مسٹر بلنٹ نے نہایت صفائی اور دیانت داری کے ساتھ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: "چوں کہ اس معاملے کی ذمہ داری جو مصر کی قومی تحریک کے لیے ایسا افسوس ناک تھا اس شخص پر عاید کی گئی ہے جس کو اس سے سب سے زیادہ نقصان پہنچا یعنی عرابی اور چوں کہ اس واقعہ نیز دوسرے حادثات کو جو اس سے کم غیر معقول نہ تھے، ہماری وزارت خارجہ و بحریہ نے

یہ عذر پیش کر کے کہ مصر یقینی طور پر بدامنی کی حالت میں ہے، اسکندریہ پر گولہ باری کرنے اور اس کے بعد کی جنگ کا حیلہ بنالیا تھا، اس لیے مناسب ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہاں بتادیں کہ اس پورے واقعہ کے جرم کی ذمہ داری صحیح طور پر کن لوگوں پر عاید ہوتی ہے، جب میں نے اس کی خبر لندن میں سنی تو میرا پہلا خیال یہ ہوا کہ یہ واقعہ اس سازش کا ایک جزء ہے جو میں جانتا تھا کہ درویش پاشا کے ذریعہ سے وزارت خارجیہ میں مرتب کی گئی ہے، تاکہ عرابی کو اس کے جال میں پھانسا جائے لیکن اس کے متعلق پوری تفصیلات مجھے لڑائی کے بعد معلوم ہوئیں اور اسی وقت میں اس قابل ہوا کہ قوم پروروں کے خلاف جو غلط الزامات لگائے جاتے تھے کہ یہ ہنگامہ انہی کا تجویز اور پیدا کیا ہوا ہے، ان کی تردید کر سکوں، اس وقت ظاہر ہوا کہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس تھی جیسا کہ ہم لوگ جو اس وقت کے رازوں سے باخبر ہیں جانتے ہیں، یہ بلوہ اگرچہ اس کی ابتدا غالباً اتفاقی طور پر ہوگئی، چند ہفتے قبل سے درباری جماعت کے زیر تجویز تھا اور وہ اسے کسی مناسب موقع پر عرابی کو بدنام کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتی تھی کہ یہ شخص ملک میں امن وامان قائم رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

اسکندریہ کی صورت حال یہ تھی، مصر کے دوسرے شہروں کی بہ نسبت اسکندریہ بڑی حد تک ایک یوروپین شہر تھا، جس میں اسلامی آبادی کے علاوہ یونانی، اطالوی اور مالٹی نوآبادیاں قائم تھیں، یہ سب لوگ تجارت کرتے تھے اور ان میں سے بیشتر مہاجنی پیشہ تھے، دونوں جماعتوں کے باہمی تعلقات کبھی بھی بہت اچھے نہ تھے اور پھر جنگی بیڑہ کے پہنچنے کے بعد جو علانیہ یوروپین اغراض کے تحفظ کے لیے آیا تھا کشیدگی بہت بڑھ گئی تھی، امن قائم رکھنے کے لیے شہر کے گورنر کو بہت وفادار مضبوط اور سمجھدار ہونا ضروری تھا، نیز جنگی بیڑہ کے لیے بھی بہت سوچ سمجھ کر کام کرنے کی ضرورت تھی، بدقسمتی سے گورنر عمر لطفی پاشا نیشنلسٹ منسٹری کا بالکل مخالف تھا، وہ چرکس تھا، درباری پارٹی کا ممبر تھا اور سابق خدیو اسمٰعیل کا طرفدار تھا اور چرکسی سازش کے موقع پر اس نے مغرب کے

بدوؤں کو خدیو توفیق کا حامی بنا کر اس کی بڑی مدد کی تھی، اس بنا پر اس نے بجائے دبانے کے مسلمان آبادی میں شورش کرنے والوں کو اور ابھار دیا تھا، دوسری طرف یونانی اپنی جماعت کے سردار امبرائز سیناڈینو (Ambroise Sinadino) کی مدد سے جو ایک دولت مند ساہوکار اور مصر میں روتھس چائلڈز (Rothschilds) کا ایجنٹ بھی تھا، مسلح ہونے لگے تھے اور مالٹیوں نے بھی جن کی تعداد زیادہ تھی انگریزی قنصل کوکسن (Cookson) کے اشارہ سے اپنے کو مسلح کر لیا تھا، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مئی کے آخری ہفتہ میں بلوہ کے لیے تیاریاں ہو گئی تھیں۔ (۱)

اسکندریہ کی گولہ باری: ۱۔ بلوہ کی تیاری جیسا کہ مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے درویش پاشا کے اسکندریہ پہنچنے (۸ جون) سے قبل ہو چکی تھی اور اس کا مقصد درویش پاشا پر یہ ظاہر کر دینا تھا کہ عرابی پاشا ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی اہمیت اور قوت نہیں رکھتا، مسٹر بلنٹ کا خیال ہے کہ درویش پاشا اس سازش سے بے خبر نہ تھا اور اگر عرابی پاشا اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے تھے جیسا کہ درویش پاشا نے زور دیا تھا تو یہ بلوہ روک دیا جاتا، بہر حال جس مقصد سے یہ بلوہ کرایا گیا تھا نتیجہ اس کے برخلاف نکلا، اس کے ترتیب دینے والوں نے جس پیمانہ پر اسے کرانا چاہا تھا یہ اس سے بہت بڑھ گیا اور پھر مجبوراً اسے فرو کرنے کے لیے فوجی مدد منگانی پڑی، بجائے اس کے کہ عرابی پاشا کی پوزیشن کو اس سے نقصان پہنچے اسکندریہ کی عیسائی آبادی انھیں اپنا محافظ سمجھنے لگی، فوج نے اس کے بعد اسکندریہ اور قاہرہ میں پوری طرح امن قائم کر لیا، جس کی وجہ سے عرابی پاشا کا اثر و اقتدار اور زیادہ بڑھ گیا، یہ موقع عرابی پاشا کے لیے بہت اچھا تھا، وہ اگر تدبر اور قوت سے کام لیتے تو وطنی تحریک کے دشمنوں کو بھی قابو میں لا سکتے تھے اور عیسائیوں کو بھی مطمئن کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس قیمتی موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور چوں کہ یورپ کی سیاسی چالوں سے ناواقف تھے، اس لیے آسانی کے ساتھ میلٹ (Malet) اور کالون

---

(۱) بلنٹ ص ۲۳۶-۲۳۵

(Colvin) کے قریب میں آ گئے، جو ایک طرف تو ان سے امن قائم رکھنے کی تاکید کر رہے تھے اور دوسری طرف برطانوی جنگی بیڑہ کو اسکندریہ پر گولہ باری کرنے کے لیے آمادہ اور تیار کر رہے تھے(۱) برطانوی امیر البحر سیمور (Seymour) کے لیے گولہ باری کا عذر پیدا کر لینا کوئی بڑی بات نہ تھی، گذشتہ بلوہ میں اس کا ایک ملازم بھی مارا گیا تھا، اس نے قسم کھائی تھی کہ اس قیمتی جان کا خون بہا اسکندریہ والوں سے لے کر رہوں گا، عرابی پاشا کو بھی اب اصلی خطرہ کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور انھوں نے اسکندریہ کی قلعہ بندی کا کام شروع کر دیا تھا، سیمور نے ان کو قلعہ بندی کے کام سے روکنا چاہا لیکن عرابی پاشا نے انکار کر دیا، یہ عذر برطانوی امیر البحر کے لیے بہت کافی تھا اور اس نے فوراً ہی اسکندریہ پر گولہ باری شروع کر دی (۱۱ر جولائی ۱۸۸۲ء) شہر کا ایک بڑا حصہ مسمار ہو گیا، مصری فوج کو قلعہ چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا اور اسکندریہ پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا۔

جنگ آزادی: اسکندریہ کی گولہ باری مصر پر انگریزی قبضہ کا مقدمہ تھی، دو ماہ تک اہل مصر عرابی پاشا کی سرکردگی میں انگریز حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے لیکن بالآخر خود اپنوں نے غداری کی اور تل کبیر کی شکست نے قومی جماعت کے بازو توڑ دیے، مسٹر بلنٹ نے جو مصری وطنی تحریک میں شروع سے شریک تھے اور اس کی کامیابی کے لیے کسی امکانی کوشش سے باز نہ آئے، اس جنگ آزادی کے سچے واقعات اپنی کتاب 'مصر پر انگریزی قبضہ کی مخفی تاریخ' کے سولہویں باب میں تفصیل کے ساتھ درج کر دیے ہیں، ہم اس کا خلاصہ اور اہم اقتباسات ذیل میں پیش کرتے ہیں، مسٹر بلنٹ لکھتے ہیں:

> "اس جنگ کا کوئی صحیح بیان کسی انگریز مصنف کی کتابوں میں نہیں ملے گا اور فرانسیسی بیانات میں تو سچائی اس سے بھی کم پائی جاتی ہے، انگریزی فوجی دستوں کی سرپرستی میں خدیو اور ترکی چرکسی حکومت کے قاہرہ میں دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایک سال یا اس سے

---

(۱) بلنٹ ص ۲۳۰

زیادہ عرصہ تک جس عہد دہشت کا قیام رہا۔ اس نے کافی طور پر اہل مصر کی زبان بندی کردی، جس کی وجہ سے وہ ان واقعات کو بیان نہ کر سکے جو خدیو کی غیر موجودگی کے زمانہ میں وہاں پیش آئے تھے اور گو عرابی کے مقدمہ کی شہرت سے عارضی طور پر کچھ روشنی ان واقعات پر پڑ گئی تاہم ملکی پریس کے کسی جریدہ میں اتنی جرأت نہیں پائی گئی کہ وہ سرکاری بیان سے ہٹ کر ان واقعات کو بیان کر سکے پھر اس کے بعد جب فرانس کی سرپرستی میں قومی اخباروں میں کچھ ہمت پیدا ہوئی تو اس وقت تک چند غلط روایتیں مشہور ہو چکی تھیں، جو آج بھی بڑی حد تک مصر کے تعلیم یافتہ طبقہ پر اثر انداز ہیں۔

پہلی بات جسے واضح کر دینا ضروری ہے، کیوں کہ یہ پارلیمنٹ کی رپورٹوں (Blue Books) میں مسخ کر کے پیش کی گئی ہے اور تمام انگریز مصنفوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے، یہ ہے کہ انگریزی حملہ کے مقابلہ میں جو مدافعت مصر کی طرف سے پیش کی گئی وہ اصلاً ایک قومی مدافعت تھی۔ سرکاری بیان یہ ہے کہ صرف فوج نے گولہ باری کے وقت سیمور کے ناممکن مطالبات کا اور پھر اولزلے (Wolseley) کے بری حملہ کا مقابلہ کیا، یہ محض اس سیاسی افسانہ کا تسلسل ہے جو وزارت خارجہ میں اس غرض سے مرتب کیا گیا تھا کہ مصر کی مالیات میں مداخلت کرنے کا عذر ہاتھ آجائے اور یہ افسانہ جھوٹ کی ایک حد درجہ مسخ شدہ صورت میں لارڈ ڈفرن کی افتتاحی تقریر میں پڑھا جا سکتا ہے، جو انھوں نے قسطنطنیہ کی یوروپین کانفرنس میں کی تھی، انگریزی سفیر (ڈفرن) کے بیان کے مطابق مصر گولہ باری سے قبل بدامنی کی حالت میں تھا، جہاں لوگوں کی جان و مال کا کوئی تحفظ نہ تھا اور قتل عام جاری

> تھا اور اس کی ذمہ دار فوج تھی جو عرابی پاشا اور دوسرے باغی افسروں کی سرکردگی میں کام کر رہی تھی اور جس کی وجہ سے حکومت کو چلانا اور امن و امان اور سیاسی استواری قائم رکھنا ناممکن تھا، میں اس سے قبل کافی طور پر واضح کر چکا ہوں کہ یہ بیان سیاسی صورت حال کا کس قدر شدید مبالغہ آمیز نقشہ تھا نیز یہ کہ کس طرح رفتہ رفتہ اسے دروغ اور اختراعات کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔"(۱)

مئی میں جنگی بیڑہ کے اسکندریہ پہونچ جانے کے بعد اہل مصر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یورپین حکومتوں نے جو سلوک تونس کے ساتھ کیا ہے وہی ان کے ملک کے ساتھ بھی کیا جانے والا ہے، تونس پر قبضہ کرنے سے پہلے غلط طور پر مشہور کیا گیا تھا کہ وہاں بدامنی اور بغاوت پھیلی ہوئی ہے، جس سے یورپین باشندوں کی جان و مال خطرہ میں ہے اور ان کے تحفظ کے لیے مداخلت ضروری ہے، اس کے بعد یہ ظاہر کیا گیا کہ وہاں کے فرماں روا کو اس کی باغی رعایا سے بچانے کی ضرورت ہے اور اسی عذر کی بنا پر اسے قبضہ میں کر لیا گیا پھر اسے مجبور کیا گیا کہ اپنے لیے ایک 'فوجی تحفظ' منظور کرے یعنی اپنے کو تمام تر حملہ آوروں کے حوالہ کر دے، یہ سب کچھ فرانس نے تونس میں کیا تھا اور اب بالکل یہی نقشہ انگریزوں نے مصر کے لیے تیار کیا تھا، قلعہ بندی کا کام روکنے کے لیے جب سیمور کا حکم نامہ عرابی پاشا کے پاس پہنچا تو یہ نقشہ ہر مصری کی آنکھوں کے سامنے تھا اور کسی کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ جو تلوار وطن کی حفاظت کے لیے ہاتھ میں لی گئی ہے اسے حملہ آوروں کے خون سے رنگین کرنے سے پہلے خاموشی سے حوالہ کر دیا جائے، اس میں شبہ نہیں کہ ۱۰/ جولائی کو جس فیصلہ کی بنا پر سیمور کے مطالبات مسترد کر دیے گئے تھے اس میں عرابی پاشا کی رائے کو بہت کچھ دخل تھا، تاہم مجلس شوریٰ کے تمام ارکان اس امر پر متفق تھے کہ جنگ یا فرمان سلطانی کے بغیر سرزمین مصر کا کوئی حصہ کسی اجنبی کے

---

(۱) بلنٹ ص ۲۸۲ - ۲۸۵

حوالہ کر دینا خدیو کے قانونی اختیارات سے باہر تھا، خدیو کی خود بھی یہی رائے تھی، ہر شخص نے یہ رائے دی کہ قلعوں کا بچانا ضروری ہے، اس مجلس میں جو خاص طور پر اسی مسئلہ کے لیے منعقد کی گئی تھی، درویش پاشا بھی موجود تھا اور اس نے بھی دوسرے ارکان کی رائے سے اتفاق کیا، مسٹر بلنٹ لکھتے ہیں کہ کسی مسلمان کو بھی اس فیصلہ سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، اس متفقہ فیصلہ کی بنا پر خدیو نے عرابی پاشا کو جو وزیر جنگ اور وزیر بحریہ تھا حکم دیا کہ جس وقت برطانوی بیڑہ گولہ باری شروع کرے، مصری توپخانوں سے اس کا جواب دیا جائے اور ۱۰ر جولائی کو شام کے وقت نائب وزیر جنگ کو قاہرہ میں اطلاع دی گئی کہ تمام صوبوں میں اعلان کر دیا جائے کہ جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس کو ہدایت کی گئی کہ فوجیں تیار رکھے اور نئے دستوں کے لیے سپاہی بھرتی کرے۔ (۱)

خدیو کی وطن دشمنی: لیکن ان احکام کے باوجود توفیق پاشا انگریزوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار نہ تھا، وہ خفیہ طور پر سیمور سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کیے ہوئے تھا اور ۹ر جولائی کو اسے انگریزوں کی طرف سے اطلاع دے دی گئی تھی کہ اسکندریہ پر گولہ باری ہو کر رہے گی نیز اس سے باصرار کہا گیا تھا کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے کسی انگریزی جہاز پر منتقل ہو جائے لیکن چونکہ وہ علانیہ اہل مصر سے غداری کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اس لیے اس نے یہ دعوت قبول نہ کی اور مصر سے باہر جانے پر راضی نہ ہوا لیکن گولہ باری شروع ہونے سے پہلے وہ رملہ چلا گیا جو اسکندریہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے اور وہاں بیٹھا ہوا امید و بیم کی حالت میں اس جنگ کے نتیجہ کا انتظار کرتا رہا، مصر میں عام طور پر یہ امید کی جاتی تھی کہ اسکندریہ کی توپیں انگریزی بیڑہ کو غرق کر دیں گی، گولہ باری کے روز توفیق رملہ میں تھا اور ہر نصف گھنٹہ کے بعد دوڑ کر اپنے محل کی چھت پر جاتا تھا کہ جنگ کا انجام معلوم کرے، شام تک اسے معلوم ہو گیا کہ قلعہ کی توپیں خاموش ہو گئیں اور انگریزی

---

(۱) بلنٹ ص ۲۸۷

بیڑہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اس کے بعد اس کا تذبذب بھی جاتا رہا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے کو سیمور کی حفاظت میں دے دے۔(۱)

قومی حکومت: قاہرہ میں جس وقت یہ خبر پہنچی کہ توفیق انگریزوں کے زیر اثر آ گیا، فوراً ایک مجلس عمومی منعقد کی گئی تاکہ صورت حال پر غور کر کے آئندہ کے لیے کوئی فیصلہ کیا جائے۔ اس مجلس میں نمایاں حصہ فوجی لوگوں سے زیادہ مذہبی اور ملکی عمائدین نے لیا، ملک کی ہر جماعت کے نمائندوں نے اس میں شرکت کی، یہاں تک کہ قبطیوں کا مذہبی پیشوا اور یہودیوں کا ربی بھی شریک ہوا، مجلس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ توفیق انگریزوں کے ہاتھ میں ہے، اس لیے قانوناً اس کے احکام قابل تعمیل نہیں ہو سکتے، چنانچہ انگریزوں کی حمایت اختیار کرنے کے بعد توفیق نے عرابی پاشا کو وزارت جنگ سے برخاست کرنے کا جو حکم صادر کیا تھا مجلس نے اس کے خلاف حکم صادر کیا اور عرابی پاشا کو ہدایت کی کہ وہ بدستور اپنے عہدہ پر قائم رہ کر ملک کی مدافعت کرتے رہیں، عرابی پاشا کی مدد کے لیے ایک مجلس مدافعت مقرر کی گئی جس کے صدر یعقوب پاشا سامی، نائب ناظم جنگ مقرر ہوئے ملکی انتظامات بدستور قائم رکھے گئے اور راغب پاشا اور دوسرے وزرا کی غیر حاضری کے باوجود جنھیں توفیق اور اس کے انگریز محافظین نے بحیرا اسکندریہ میں روک رکھا تھا، حکومت کے تمام کام بغیر کسی ہرج یا نقصان کے انجام پاتے رہے، مسٹر بلنٹ لکھتے ہیں کہ دوران جنگ میں قومی حکومت کے انتظامات اتنے عمدہ تھے کہ مصر میں کبھی کسی حکومت نے اس سے بہتر طریقہ پر انتظامات نہیں کیے، پھر لکھتے ہیں کہ لارڈ ڈفرن کے اس قول سے زیادہ غلط بات کوئی نہیں ہو سکتی، جس کا ذکر انھوں نے قسطنطنیہ کی کانفرنس میں بار بار کیا کہ مصر میں عیسائیوں کا قتل عام روز ہوتا رہتا ہے۔"(۲)

کفر دوار: اسکندریہ کی گولہ باری کے بعد عرابی پاشا کو اپنی فوجیں قلعہ سے نکال لینی پڑیں، اب انھوں نے مدافعت کے لیے کفر دوار کا مقام منتخب کیا جو قاہرہ کی ریلوے

---

(۱) بلنٹ ص ۲۸۹ (۲) ایضاً ص ۲۹۱

ہی پر واقع تھا اور بہت محفوظ اور مضبوط مقام تھا، یہ سمندری توپوں کی زد سے باہر تھا، یہاں مصری فوجیں پیچھے ہٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کرتی رہیں اور ابھی انھیں شکست دے کر اسکندریہ کے قریب تک بھگا دیتی تھیں یہاں سے ان کے مصر میں داخل ہونے کا تنہا یہی ایک راستہ تھا اور برطانوی سیاست نے نہ صرف خدیو کو انگریزوں کا حامی بنا لیا تھا بلکہ رشوت ستانی کے ذریعہ قبائل عرب کی ہمدردی اور مدد بھی حاصل کر لی تھی، اس لیے مصری فوجیں زیادہ دنوں تک مقابلہ نہ کر سکیں، عرابی پاشا کی شکست کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ خود ان کے افسروں نے انگریزوں سے رشوت لے کر عین وقت پر غداری کی۔ اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اسماعیلیہ: ۱۵ / اگست کو ولزلے ایک تازہ دم انگریزی فوج کے ساتھ اسکندریہ پہنچا اور یہ دیکھ کر کہ کفر دوار کی طرف سے آگے بڑھنا ممکن نہیں، اس نے نہر سویز کی جانب رخ کیا، یہ خطرہ قاہرہ کی مجلس حربی نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور ارکان مجلس کی یہ قطعی رائے تھی کہ سویز کی ناکہ بندی کر کے انگریزی فوج کا اقدام روک دیا جائے، اس درمیان میں ڈی لیسپس اسکندریہ پہنچ گیا تھا، وہاں اسے معلوم ہوا کہ انگریز نہر سویز کی راہ سے مصر پر حملہ کرنا چاہتے ہیں چونکہ ایسا کرنے سے نہر کے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا، ڈی لیسپس پورٹ سعید پہنچا اور اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ نہر پر جنگ نہ ہونے پائے، یہ اسی کوشش کا نتیجہ تھا کہ مجلس حربی کے فیصلے کے باوجود عرابی پاشا سویز کی ناکہ بندی کے لیے تیار نہ ہوئے، ڈی لیسپس نے انھیں یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے اثر سے انگریزوں کو بھی نہر کے استعمال سے باز رکھے گا، عرابی پاشا کا ڈی لیسپس کے وعدہ پر بھروسا کر کے سویز کی ناکہ بندی سے ہاتھ اٹھا لینا فوجی نقطہ نظر سے ایک ایسی شدید غلطی تھی جس کی تلافی آخر وقت تک نہ ہو سکی، انگریزوں نے ڈی لیسپس کے اس مفروضہ منطق کی پروا نہ کی کہ نہر سویز کا علاقہ ایک غیر جانبدار علاقہ ہے جس میں جنگ نہ ہونی چاہیے اور عرابی پاشا کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ۲۱ / اگست کو انگریزی فوج اسمعیلیہ میں اتار دی، اسماعیلیہ پر قابض ہو جانے کے بعد قاہرہ

کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ ادھر تل کبیر کی نامکمل خندقیں حائل تھیں۔ انگریزی فوج کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ تھی، اس کے مقابلہ میں اعرابی کی مصری فوج آٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی اور پورے مصر میں باقاعدہ فوج کا شمار تیرہ ہزار سے زیادہ نہ تھا۔ عین وقت پر جو سپاہی بھرتی کیے گئے تھے، وہ بالکل ناتجربہ کار تھے اور صرف خندق وغیرہ کھودنے کے کام آسکتے تھے۔(۱)

پروفیسر پامر کی خفیہ مہم: لیکن حکومت برطانیہ نے محض فوجی دستوں پر قناعت نہیں کی اس نے اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے پہلے ہی وہ مخفی ذرائع اختیار کر لیے تھے، جو بقول مسٹر بلنٹ زمانہ حال کی جنگوں میں ہمیشہ استعمال کیے جاتے ہیں لیکن کبھی ان کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔ نہر سویز کی راہ سے مصر پر حملہ کرنے کا فیصلہ برطانوی وزارت جنگ و بحریہ نے شروع سال ہی میں کر لیا تھا اور وسط جون میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ رشوت کے ذریعہ سے عرب قبائل خصوصاً مشرقی بدویوں کو ہموار کر لیا جائے، لیکن دقت یہ تھی کہ اس وقت بمشکل کوئی انگریز ایسا مل سکتا تھا جو عربی زبان بول سکتا ہو، اس مشکل میں لارڈ نارتھ بروک (North Brook) وزیر بحریہ کی نظر ایڈورڈ پامر (Edward Palmar) پر پڑی جو کیمبرج یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر تھے، پروفیسر مذکور ایک زمانہ میں فلسطین کی مجلس تحقیق ارضی (Palistin Exploration Society) کے رکن بھی رہ چکے تھے اور اس وجہ سے نہر سویز کے مشرقی علاقوں سے جہاں کے عرب قبائل پر رشوت کا عمل کیا جانے والا تھا کچھ واقف تھے، چنانچہ ۲۳ جون کو لارڈ نارتھ بروک نے پامر کو اپنے ہاں ناشتہ پر مدعو کیا اور ان کے سپرد یہ خدمت کی کہ فوراً سویز کے مشرقی علاقوں میں جا کر بدوی قبائل کو انگریزی فوج کا حامی بنانے کی کوشش کریں، پانچ سو پونڈ تو ابتدائی اخراجات کے لیے نارتھ بروک نے اسی وقت دے دیے اور آئندہ کے لیے وعدہ کیا کہ بشرط کامیابی ایک بہت بڑی رقم انعام کے طور پر دی جائے گی، روانگی سے قبل ۲۶ جون کو پامر صاحب مسٹر بلنٹ سے ملے اور ان سے یہ بیان کیا کہ میں اخبار اسٹینڈرڈ (Standard) کا نامہ نگار بن کر اسکندریہ جا رہا ہوں اور مجھے وطنی تحریک کے ساتھ بڑی

---

(۱) بلنٹ ص ۳۰۲

ہمدردی ہے اور میں اس اخبار میں اس تحریک کی حمایت میں مضامین لکھتا رہوں گا، پھر مسٹر بلنٹ سے خواہش کی کہ اپنے نیشنلسٹ مصری دوستوں کے نام تعارف کے خطوط دے دیجئے، پامر نے اپنے اصلی مشن کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا، بہر حال مسٹر بلنٹ نے مصر کے چند ممتاز آدمیوں کے نام تعارف کے خطوط لکھ کر ان کے حوالہ کر دیے۔

پروفیسر پامر پہلے اسکندریہ پہنچے اور وہاں سیمور سے مل کر یافہ کے لیے روانہ ہو گئے، یافہ میں وہ برطانوی قنصل کے ہاں مقیم ہوئے، وہاں عربی پوشاک زیب تن کر کے بظاہر پورے عرب بنے ہوئے قبائل تیاحہ وطرابین کے شیوخ پر ڈورے ڈالنے کے لیے روانہ ہوئے، پامر کے روز نامچے کے بعض حصے شائع ہو گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنے مشن میں بہت کچھ کامیابی ہوئی، قبیلہ تیاحہ کے شیخ نے جو ان علاقوں میں سب سے زیادہ اہم اور طاقتور قبیلہ تھا، انگریزوں کی حمایت کا وعدہ کیا، پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ بیس ہزار پونڈ صرف کرنے سے چالیس ہزار عرب ہاتھ آجائیں گے، یہ روز نامچہ نہایت دلچسپ ہے اور ان خفیہ ذرائع پر کافی روشنی ڈالتا ہے جو حکومت برطانیہ نے مصر کی قومی تحریک کو فنا کرنے کے لیے استعمال کیے تھے، اس کے بعض حصے جو مسٹر بلنٹ نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں کیمبرج یونی ورسٹی کے فاضل پروفیسر کی سیرت کو بھی واضح اور نمایاں کرتے ہیں، پروفیسر موصوف دولت وشہرت کے خواب میں مدہوش ہیں، اپنی اہلیہ کو لکھتے ہیں کہ ”میرے اختیارات کی انتہا نہیں، جو چاہوں سو کروں، اگر میں ایک درجن گھوڑے بھی دیکھوں تو انھیں فوراً خرید سکتا ہوں، کل میں نے تین اونٹ دیکھے اور تین سو ساٹھ پونڈ میں اسی وقت خرید لیے، میرے ماتحت ملازمین ہیں، کلرک ہیں، ترجمان ہیں اور یہ سب میرے اشاروں پر چلتے ہیں، مختصر یہ کہ میں اس سے زیادہ بلند مرتبہ تک پہنچ نہیں سکتا تھا، امیر البحر بہت عمدہ آدمی ہے، لوگوں کا بیان ہے کہ وہ اپنے افسروں کو کبھی نہیں بھولتا اور انہیں برابر ترقی دیتا رہتا ہے، اس نے مجھ سے کہا ہے کہ مجھے ”ستارۂ ہند“ ضرور ملے گا۔“(۱)

---

(۱) بلنٹ ص ۳۰۸

لیکن پامر کی یہ تمام امیدیں ایک خواب پریشاں ثابت ہوئیں، ۷/ اگست کو وہ دو انگریز افسروں گل (Gill) اور کیرنگٹن (Charrington) کے ساتھ سویز سے روانہ ہوا، ان افسروں کا مقصد یہ تھا کہ مصر اور شام کے درمیان تار کا سلسلہ منقطع کر دیں، اس کے لیے انھوں نے ڈائنامائٹ کا ایک بکس اپنے ساتھ لے لیا تھا، پامر نے اپنے سفر کا مقصد اونٹوں کی خریداری ظاہر کیا تھا، تینوں عربی لباس میں تھے، ابھی چند ہی میل سفر طے کیا ہوگا کہ قبیلہ حیوجیہ اور حوتیہ کے بدوؤں کو معلوم ہوا کہ یہ عرب نما مسافر اپنے ساتھ قبیلہ تیاحہ کے لیے ایک بڑی رقم لیے جا رہے ہیں، ان بدوؤں نے حملہ کر کے ان کو گرفتار کر لیا اور ان کا سارا سامان لوٹ لیا، جس میں وہ رقم بھی تھی جو پامر حسب وعدہ قبیلہ تیاحہ کے لیے لے جا رہا تھا اور آخر میں تینوں کو گولی مار دی، اس رقم کے متعلق تین ہزار پونڈ سے لے کر آٹھ ہزار پونڈ تک مختلف بیانات ہیں، قبیلہ مذکور میں تقسیم کرنے کے لیے پامر کو بیس ہزار پونڈ منظور ہوئے تھے اور وہ پوری رقم اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، لیکن امیر البحر نے مخالفت کی جس کی وجہ سے اس رقم کا بڑا حصہ بدوؤں کے ہاتھ آنے سے بچ گیا، اس حادثہ کی خبر جب انگلستان پہنچی تو پارلیمنٹ میں اس کے متعلق حکومت سے سوالات کیے گئے، حکومت نے پوری سنجیدگی اور اپنی روایتی صداقت کے ساتھ اعلان کیا کہ پامر کے سفر کا مقصد اونٹوں کی خریداری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

پامر کے روزنامچہ کی تصدیق گل کی ڈائری سے بھی ہوتی ہے، رشوت کے ذریعہ سے بدوی قبائل کو حامی بنانے کی جو خدمت نہر سویز کے مشرقی علاقوں میں پامر کو سپرد ہوئی تھی وہی نہر کے مغربی علاقوں میں کیپٹن گل سے متعلق تھی، وہ اپنی ڈائری میں اس کے متعلق واضح طور پر بیان کرتا ہے، ان تحریری شہادتوں کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ تل کبیر کی جنگ سے پیشتر حکومت برطانیہ نے رشوت کے زہر سے مصریوں کی قوت کو بہت کچھ فنا کر دیا تھا۔ (۱)

---

(۱) بلنٹ ص ۳۰۹-۳۱۰

خدیو کی غداری: اس باب میں پامر اور گل سے زیادہ خود توفیق نے انگریزوں کو مدد پہنچائی، بدوی قبائل کا ایک ممتاز شیخ مسعود الطحاوی عرابی پاشا کا معتمد علیہ تھا، سب سے زیادہ اسی نے غداری کا ثبوت دیا، توفیق نے اسے پانچ ہزار کراؤن (۱) کے عوض عرابی پاشا کے لشکر میں بحیثیت ایک جاسوس کے مقرر کر رکھا تھا، اس کا اعتراف مسعود الطحاوی نے خود مسٹر بلنٹ سے ۱۸۸۷ء میں کیا (۲) توفیق نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ رشوت کے ذریعہ اور ترقی کی امیدیں دلا کر عرابی پاشا کے بہت سے فوجی افسروں کو غداری پر آمادہ کرلیا، عرابی پاشا کی قوت کو سب سے زیادہ اسی چیز نے نقصان پہنچایا، توفیق کے جاسوس جن کا صدر خود اس کا ایڈی کانگ عثمان بے رفعت تھا، افسروں میں بددلی پھیلانے کی کوشش کرتے اور ان کی باہمی رقابتوں کو برانگیختہ کرتے، وہ ان افسروں خصوصاً چرکسی نسل والوں سے کہتے کہ خدیو سے مقابلہ زیادہ دنوں تک نہیں کیا جاسکتا، بہتر یہ ہے کہ شکست سے پہلے ہی باز آجاؤ اور اس کی خوشنودی حاصل کر کے انعام و اکرام کے مستحق بن جاؤ، ورنہ جب وقت گذر جائے گا اور میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے گرفتار کیے جاؤ گے تو اس سزا سے مفر نہ ہوگا جو باغیوں کے لیے مقرر ہو چکی ہے، وہ یہ بھی سمجھاتے کہ اولزلے اور اس کے انگریز سپاہی حقیقتاً خدیو کے ملازم ہیں جو ملک کی موجودہ بغاوت فرو کرنے کے لیے بلائے گئے ہیں، علاوہ بریں خود سلطان بھی جس نے عرابی پاشا کو باغی قرار دے دیا ہے، عنقریب خدیو کی مدد کے لیے فوج روانہ کرنے والا ہے، یہ دلائل چرکسی افسروں پر کارگر ثابت ہوئے، دوسروں کے سامنے دلیلوں کے علاوہ نقد بھی پیش کیا گیا، بعض افسر جو فوجی قابلیت میں عرابی پاشا سے بڑھے ہوئے تھے پہلے ہی سے بددل تھے کیوں کہ عرابی پاشا نے ان کے مشورہ کے خلاف نہر سویز کی ناکہ بندی نہ ہونے دی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی فوج اسماعیلیہ میں اتر آئی تھی اور اب اس کو آگے بڑھنے سے روکنا نہایت دشوار تھا۔

---

(۱) ایضاً ۲۱۲ (۲) کراؤن ایک انگریزی سکہ = پانچ شلنگ

وطنی جماعت کے غیر فوجی سرداروں کو قومی تحریک سے برگشتہ کرنے کے لیے توفیق نے سلطان پاشا کو مقرر کیا تھا جو پہلے اس تحریک کا ایک نہایت ممتاز لیڈر رہ چکا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے تمام تر انگریزوں کا حامی اور حلیف تھا، اس کے اثر سے قاہرہ کے بہت سے سربرآوردہ اشخاص خدیو کے حامی ہو گئے۔

وطنی فوج کی بدقسمتی: ان کمزوریوں کے باوجود عرابی پاشا کی فوج انگریزوں کا مقابلہ زیادہ دنوں تک کر سکتی تھی، اگر جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی اسے بعض ناقابل تلافی نقصانات نہ پہنچ گئے ہوتے۔ جس وقت یہ معلوم ہو گیا کہ حملہ مشرق کی طرف سے ہو گا محمود فہمی جو عرابی پاشا کے سب سے زیادہ لائق افسر اور ایک نہایت ہوشیار انجینئر تھے فوراً تل الکبیر روانہ کیے گئے تاکہ وہاں کی خندقوں کو مکمل کرا دیں لیکن تل الکبیر پہنچنے سے قبل ہی راستہ میں ایک انگریزی دستہ نے ان کو گرفتار کر لیا۔ یہ واقعہ ایک عجیب وغریب اتفاق سے پیش آیا، اثنائے راہ میں محمود فہمی ایک گاؤں میں اتر گئے تھے، قریب ہی ایک ٹیلہ تھا، تفریح کے لیے یا بلندی سے گردوپیش کے مقامات کا معاینہ کرنے کے لیے اس ٹیلے پر چلے گئے، اتفاق سے بالکل تنہا تھے اور سادہ لباس پہنے ہوئے تھے اسی وقت ایک انگریزی دستہ بھی ادھر سے گزر رہا تھا اس نے ان کو گرفتار کر لیا لیکن چونکہ یہ فوجی وردی میں نہ تھے اس لیے کرنل ٹالبٹ (Col. Talbot) جو اس دستہ کا افسر تھا ان کے رتبے کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر سکا اور اپنے ساتھ انھیں انگریزی فوج کے مرکز پر لیتا گیا، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ قیدی کتنا قیمتی ہے، محمود فہمی کی گرفتاری سے تل الکبیر کی مدافعت کو اتنا شدید صدمہ پہنچا کہ اس کی تلافی نہ ہو سکی۔

معرکہ قصاصین: تل الکبیر سے پہلے ہی قصاصین کے مقام پر عرابی پاشا کی فوج کے ایک دستہ سے جو آگے بڑھ کر دشمن کی نقل وحرکت معلوم کرنا چاہتا تھا اولزلے کی فوج کا مقابلہ ہو گیا، انگریزوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کا یہ بہترین اور آخری موقع تھا اور قریب تھا کہ اس میں مصری دستہ کامیاب ہو جائے، وہ اچانک انگریزی دستہ پر ٹوٹ پڑا

تھا لڑائی دیر تک ہوتی رہی اور رن ایسے گھمسان کا تھا کہ ڈیوک آف کناٹ (Duke of Connaught) جو اس معرکہ میں شریک تھا ایک بار گرفتار ہوتے ہوتے رہ گیا، اگر یہ شہزادہ گرفتار ہو گیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ جنگ کا سارا نقشہ ہی بدل جاتا اور وطنی تحریک کامیاب ہو جاتی کیونکہ بقول مسٹر بلنٹ انگلستان کی رائے عامہ میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی اور ان مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے سے جو اپنے ملک کو قدیم مظالم سے آزاد کرانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اہل برطانیہ کو شرم محسوس ہونے لگی تھی لیکن اس معرکہ میں دو مصری جنرل علی فہمی اور راشد پاشا بہت بری طرح زخمی ہو گئے اور پھر کوئی تجربہ کار افسر ان کا قائم مقام نہ ہو سکا۔ علاوہ بریں مصری فوج کے ایک دوسرے جنرل علی بے یوسف نے عین وقت پر دشمن سے مل کر شکست کو یقینی بنا دیا۔

تل الکبیر: قصاصین کی ہزیمت کے بعد تل الکبیر کی مدافعت بہت کمزور ہو گئی، عرابی پاشا کے بہترین جنرل گرفتار یا زخمی ہو چکے تھے، جو باقی رہ گئے تھے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا، توفیق کے جاسوسوں نے فوج میں ہر طرف رخنے پیدا کر دیے تھے، بدقسمتی سے عرابی پاشا کو اب بھی سعود الطحاوی پر پورا اعتماد تھا اور اس نے یقین دلا رکھا تھا کہ انگریز آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ تل الکبیر میں جو فوج تھی وہ حد درجہ ناقص اور بے نظم تھی۔ باقاعدہ پیدل فوج کی تعداد چھ سات ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ سوار فوج دو ہزار تھی اور اسے نو توپیں تھیں، بقیہ رنگروٹوں کی ایک بھیڑ تھی جن کے پاس اتنا لباس بھی نہ تھا کہ اپنا پورا جسم چھپا سکتے، یہ غریب سیدھے سادے فلاحین تھے جو اپنی خوشی سے آ کر قومی فوج میں بھرتی ہوئے تھے اور خندق وغیرہ کے کھودنے میں بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے لیکن لڑائی کے کام کے بالکل نہ تھے ان کی مجموعی تعداد بیس ہزار رہی ہوگی۔

دفعۃً ۱۳؍ستمبر کو علی الصباح انگریزی فوج نے حملہ کر دیا، خود عرابی پاشا کے دو افسروں نے حملہ آوروں کی رہنمائی کی۔ یہ دونوں چند روز قبل خدیو کے آدمیوں سے رشوت قبول کر چکے تھے، ان میں سے ایک عبدالرحمٰن بے حسن تھا جو خندقوں کے باہر

[illegible] ملاحظہ ہے

مشرقی سمت سے وادی طمیلات کی طرف پیش قدمی کے لئے تمام تیاریاں ہو چکی تھیں [illegible]
اس رات میں [illegible] انگریزی فوج تل الکبیر کی طرف آگے بڑھی [illegible]
[illegible] ہیں جب [illegible] قاصد پہنچا کہ انگریزوں نے پیش قدمی کر دی ہے [illegible]
[illegible] تھا [illegible] ہے بدوؤں نے ایک ایسے [illegible] پر [illegible]
جو [illegible] اس کے مصرف [illegible] رات کو [illegible] وہاں سے [illegible]
اشارہ [illegible] انھیں قتل کر دیں اس غداری کے صلہ میں اس کو ایک [illegible]
سے قتل [illegible] گئے تھے [illegible] قتل [illegible] کے بعد [illegible]
خدمت [illegible] کے ہاتھ میں [illegible] سعود [illegible] کے [illegible]
چونکہ [illegible] مصر [illegible] کی [illegible] کے [illegible] سے [illegible] (1)

سعود الطحاوی نے عرابی پاشا کو [illegible] سے متعلق پورا اطمینان دلا رکھا
تھا کہ انگریز حملہ آور نہیں ہوں گے [illegible] عرابی پاشا اور فوج کے سپاہی غافل
سو رہے تھے [illegible] انگریزی فوج خندق [illegible] سے [illegible]
[illegible] پہنچے [illegible] سے مقابلہ [illegible]
[illegible] تھے [illegible]
[illegible] آنکھیں [illegible] تھے اور [illegible] دھیان [illegible] تھے [illegible]
ان کو قتل [illegible] باقی [illegible] اور مقابلہ [illegible]
[illegible] حملہ اس قدر [illegible] اور [illegible] اس قدر [illegible] مصری [illegible]
[illegible] میدان میں [illegible] عرابی پاشا کا خیمہ وہاں سے [illegible]
قدر دور [illegible] توپوں کی [illegible] اور فوراً [illegible] گھوڑے پر [illegible]
[illegible] تو دیکھا کہ شکست خوردہ سپاہیوں کی ایک ٹولی بھاگی ہوئی آ رہی ہے ان
لوگوں نے بیان کیا کہ لڑائی حقیقتاً ختم ہو گئی اور یہ مقابلہ [illegible] سعود الطحاوی کے

---

(1) ایضاً، ص ۲۱۸

بدوی سپاہی اپنے کمانڈر سے زیادہ انگریزوں کے وفادار تھے، جس سے اور زیادہ نقصان پہنچا۔ عرابی پاشا نے سپاہیوں کو ٹھہرانے کی کوشش کی لیکن وہ اس قدر سراسیمہ تھے کہ کسی طرح قابو میں نہ آئے۔ مجبوراً عرابی پاشا کو بھی میدان چھوڑنا پڑا۔ ایک گھنٹے کے اندر جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ وطنی تحریک کا انجام تل الکبیر کے صحرا میں دفن کر دیا گیا۔

عرابی پاشا قاہرہ پہنچے لیکن توفیق کی سازشیں وہاں بھی اپنا کام کر چکی تھیں۔ سلطان کی طرف سے عرابی پاشا کے باغی قرار دئے جانے سے صورت حال اور بگڑ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ مدافعت اب بے سود ہے عرابی پاشا نے مناسب سمجھا کہ بحیثیت ایک فوجی قیدی کے اپنی تلوار انگریزی جنرل کے حوالے کر دی، جو تل الکبیر میں دفن ہو گیا تھا۔ اس کی تربت کا آخری پھول تھا۔

مصر پر انگریزوں کا قبضہ: توفیق پھر سنگینوں کے سایہ میں استبداد سے قائم ہو گیا۔ برطانیہ کی سرپرستی میں عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ شریف پاشا نے وزارت قائم کی۔ اس دور کا افتتاح یوں ہوا کہ وطنی تحریک کے ممبر باغیوں کی حیثیت سے عدالت میں لائے گئے۔ عرابی پاشا کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی لیکن مسٹر بلنٹ نے ایک بڑی رقم اپنی جیب خاص سے خرچ کر کے اس مقدمہ کی پیروی جس انگریز بیرسٹر سے کرائی تھی اس نے صفائی میں ایسی شہادتیں پیش کیں کہ خدیو کو موت کی سزا منسوخ کرنی پڑی۔ تاہم عرابی پاشا تمام عمر کے لیے جلا وطن کر کے سیلون بھیج دئے گئے۔

انگریزوں نے جس آسانی کے ساتھ مصر پر قبضہ پا لیا تھا، اس کے لحاظ سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ملک کی حکومت توفیق کے حوالے کر کے خود واپس چلے جائیں گے۔ تل الکبیر کے بعد ہی انھوں نے مصر پر اپنا تسلط قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ مالیاتی امور کے انتظام میں بھی فرانس کو شریک کرنے پر تیار نہ تھے۔ توفیق ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہا تھا۔ اس نے ایک انگریز کالون (Colvin) کو اپنی حکومت کا تنہا مشیر مالیات مقرر کیا۔ لارڈ ڈفرن جو اس وقت قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر تھا،

بحیثیت ہائی کمشنر کے مصر آیا اور حکومت کے آئندہ انتظام کا خاکہ مرتب کر گیا، اس خاکہ کی تفصیلی خانہ پری سر ایولین بیرنگ (Sir Evelyn Baring) کے سپرد ہوئی جس نے جنوری ۱۸۸۴ء میں بحیثیت قنصل جنرل کے چارج لیا، یہی شخص ہے جو بعد میں لارڈ کرومر (Croumer) کے نام سے مشہور ہوا، اس کے آنے کے بعد مصر گویا سلطنت برطانیہ کا ایک صوبہ بن گیا، ملک کے ہر معاملہ میں برٹش قنصل جنرل کی رائے فیصلہ کن تھی، مصری فوجیں انگریزی افسروں کے زیر کمان کر دی گئیں، انگریزی فوجیں جن کی تعداد چھ ہزار تھی، پورے ملک پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھیں، برطانیہ نے اعلان کیا کہ مصر کی مالی حالت کے درست ہو جانے کے بعد انگریزی فوجیں واپس بلا لی جائیں گی، لیکن مالی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی گئی اور حکومت برطانیہ کی فرض شناسی نے کسی طرح گوارا نہ کیا کہ غریب مصریوں کو اپنے سایہ عاطفت سے محروم کر دے۔

جرمنی کا فوجی اور اقتصادی اثر: دولت عثمانیہ کے انحطاط سے جس سلطنت نے اب تک فائدہ نہیں اٹھایا تھا وہ جرمنی کی سلطنت تھی، ۱۸۷۱ء تک تو جرمنی میں اتنی طاقت نہیں آئی تھی کہ وہ کسی دوسری مملکت پر دست درازی کا حوصلہ کر سکے، لیکن اتحاد کے بعد جب فرانس سے جنگ کی نوبت آئی اور اس میں اسے شاندار فتح نصیب ہوئی تو پھر توسیع سلطنت کا حوصلہ بھی پیدا ہوا اور اس ملک کی طرف نگاہ اٹھی جسے یورپ کی دوسری حکومتیں بہت پہلے سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں، لیکن دقت یہ تھی کہ ان حکومتوں نے جرمنی کے لیے کوئی ایسا میدان نہیں چھوڑا تھا کہ اس پر فوجی تسلط قائم کیا جا سکے، تونس پر فرانس کا قبضہ تھا، مصر برطانیہ کے زیر نگیں آ چکا تھا اور طرابلس پر اٹلی کا حق یورپ کے سیاسی حلقوں میں تسلیم کیا جا چکا تھا، اگرچہ ابھی تک وہ باب عالی کی فرماں روائی سے خارج نہیں ہوا تھا اور عرب قبائل دولت عثمانیہ کے نمائندوں کی حیثیت سے اس پر حکمران تھے، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے جو برلن کانگریس میں عارضی طور پر آسٹریا کی نگرانی میں دے دئے گئے تھے، آسٹریا انہیں مستقل طور پر اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کر رہا تھا،

سب سے بڑھ کر روس کی ریشہ دوانیاں تھیں جن کا سلسلہ ایک صدی سے بلقان میں جاری تھا اور جن کا اصلی مقصد آبنائے باسفورس اور دردانیال پر قبضہ کر لینا تھا۔

ان حالات میں جرمنی کے لیے ایشیائے کوچک کے علاوہ کوئی دوسرا میدان باقی نہ رہ گیا تھا، خوش قسمتی سے جرمنی کو باب عالی میں اپنا اثر قائم کرنے کے لیے ایک اچھا موقع بھی ہاتھ آ گیا، روس اپنے بلقانی شاگردوں کی ناشکر گذاری سے دل برداشتہ ہو کر مشرق بعید کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اور وہاں جاپان سے قوت آزمائی میں مصروف تھا، برطانیہ مصر میں غیر متوقع کامیابی حاصل کرنے کے بعد جس نے بحر روم میں اس کے اقتدار کو حد درجہ غالب کر دیا تھا، دولت عثمانیہ کی دوستی سے بے پروا ہو گیا تھا اور جو باہمی تعلقات انیسویں صدی کے دوران میں استوار ہوئے تھے ان میں بہت کچھ کمزوری پیدا ہو گئی تھی، جرمنی نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا، باب عالی کی دعوت پر ایک جرمن فوجی مشن جنرل فان ڈر گولٹز (Vonder Golly) کی سر کردگی میں عثمانی فوجوں کی تنظیم و اصلاح کے لیے قسطنطنیہ پہنچا، ساتھ ہی ساتھ جرمن تاجر کثیر تعداد میں آ گئے اور پھر جرمن بنکوں نے سلطنت عثمانیہ کے بڑے بڑے شہروں میں اپنی شاخیں کھول دیں، ۱۸۹۰ء میں قیصر ولیم ثانی جس نے حال ہی میں عنان سلطنت ہاتھ میں لی تھی، ایک دوست کی حیثیت سے سلطان عبدالحمید خاں سے ملنے قسطنطنیہ آیا، قیصر کی آمد کے بعد سلطان نے جرمن تاجروں کے ساتھ مزید مراعات کرنی شروع کیں، یہ ترکی جرمن اتحاد کا پہلا قدم تھا۔

بغداد ریلوے: قیصر کے سفر قسطنطنیہ کے بعد سلطنت عثمانیہ میں جرمنی کی سرگرمیاں ہر طرف پھیلنے لگیں لیکن سب سے زیادہ توجہ ایشیائے کوچک میں ریلوے لائن کی تعمیر پر تھی جدید ذرائع حمل و نقل کی عدم موجودگی کے باعث ایشیائے کوچک کے وسیع اور زرخیز صوبہ میں سفر اور تجارت کی دشواریاں بہت زیادہ تھیں، یہ صحیح ہے کہ اس سے قبل ایک انگریز کمپنی کو سمرنا کے قریب ایک چھوٹی سی ریلوے لائن قائم کرنے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن قسطنطنیہ سے ایشیائے کوچک میں جانے کے لیے کوئی لائن نہ تھی، اب ایک جرمن کمپنی

نے ایک ریلوے لائن حیدر پاشا سے جو استنبول کے مقابل واقع ہے، انگورہ تک تعمیر کی اور ۱۸۹۲ء میں اسے جنوب مشرق کی طرف بڑھا کر سلجوقیوں کے قدیم پایۂ تخت قونیہ تک پہنچا دیا، ان لائنوں کی تعمیر سے سفر اور تجارت کے لیے بڑی سہولت پیدا ہوئی اور سلطان نے ان کو ایشیائے کوچک سے بڑھا کر میسوپوٹامیا تک جاری کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ جرمن سرمایہ دار جن کو سلطان کی سرپرستی حاصل تھی، اس کے لیے پہلے سے تیار تھے اور ٹھیکہ انہیں کو دے دیا گیا۔ ۱۸۹۸ء میں قیصر ولیم دوبارہ قسطنطنیہ آیا، جو تعلقات اس کی پہلی آمد سے قائم ہو گئے تھے وہ اور زیادہ مضبوط ہو گئے اور بغداد تک ریلوے لائن بنانے کی پہلی شاہی سند ایک جرمن کمپنی کو ۱۸۹۹ء میں عطا کی گئی، اس سند میں کئی بار ترمیمیں ہوئیں اور بالآخر ۱۹۰۳ء میں یہ آخری طور پر مکمل کر دی گئی اور تعمیر کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا۔ ریلوے لائن قونیہ سے جنوب مشرق کی طرف تیزی کے ساتھ ترقی کی، یہاں تک کہ طورس تک پہنچنے کے بعد پہاڑ کاٹنے کی وجہ سے کام کی رفتار سست ہو گئی اور بعض دشواریوں کے رفع کرنے میں اتنی دیر ہوئی کہ آخری سرنگ جنگ عظیم کے شروع ہونے تک مکمل نہ ہو سکی۔

بغداد ریلوے کی اہمیت: فرانس اور انگلستان کے پریس اور پارلیمنٹ میں بغداد ریلوے کی تعمیر سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اس کا سبب یہ تھا کہ جرمن ریلوے اسکیم کا مقصد محض ایشیائے کوچک میں اقتصادی تسلط قائم کرنا نہ تھا بلکہ اس کے پیش نظر میسوپوٹامیا اور خلیج فارس کی اقتصادی تسخیر بھی تھی، بغداد ریلوے کی تعمیر کے بعد وہ شاہراہ پھر کھل جاتی تھی جو تہذیب و تمدن کی ابتدا سے یورپ اور ایشیا کے درمیان قائم تھی، لیکن کچھ مدت سے بند ہو گئی تھی، ''بغداد ریلوے'' کے جاری ہو جانے سے جرمن تجار نہ صرف مشرق ادنیٰ کے بازاروں پر قابض ہو جاتے بلکہ جنوبی اور مشرقی ایشیا تک بھی پہنچ سکتے تھے، ''بغداد ریلوے'' اسکیم نے انگریز تاجروں کی نظر میں نہر سویز کے راستہ کی اہمیت بھی کم کر دی کیونکہ اس راستے کے ذریعہ بہ نسبت نہر سویز کے راستے کے جرمنی کے مسافر اور وہاں کی تجارتی اشیا بہت کم وقت میں خلیج فارس تک پہنچ سکتی تھیں، برطانیہ کے لیے اس سے بھی زیادہ تشویشناک

یہ چیز تھی کہ ممکن ہے آیندہ کسی زمانہ میں حکومت جرمنی ''جرمن ریلوے کمپنی'' کے اختیارات پر قابض ہو جائے تو اس وقت یہ اقتصادی چیز ایک سیاسی حربہ بن جائے گی، جس سے نہ صرف ہندوستان کا بازار بلکہ خود ہندوستان خطرہ میں پڑ جائے گا۔

اتحاد ثلاثہ: ''بغداد ریلوے'' کی تعمیر سے جو نزاع جرمنی اور فرانس و انگلستان کے درمیان پیدا ہوگئی تھی، روس مشرق اقصیٰ کی مصروفیتوں کی وجہ سے ابتداءً اس سے علاحدہ تھا، لیکن جب ۱۹۰۵ء میں اس نے جاپان کے مقابلہ میں شکست کھائی تو مجبوراً بلقان کی طرف پھر توجہ کرنی پڑی، اس درمیان میں یہاں کا نقشہ بدل چکا تھا، زار کو یہ دیکھ کر بہت اندیشہ ہوا کہ جرمنی کا اثر قسطنطنیہ میں روز بروز بڑھتا جارہا ہے، اسے یہ خطرہ ہونے لگا کہ ممکن ہے آیندہ روسی جہازوں کے لیے درۂ دانیال کی گذرگاہ بند کردی جائے، چوں کہ اس وقت پیرس اور لندن کی حکومتیں جرمنی کی مخالف تھیں اس لیے قدرۃً روس انہی کی جانب مائل ہوا اور مختلف عہد ناموں کی بنا پر جو ۱۹۰۴ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک مرتب ہوئے، تینوں حکومتوں کے درمیان ایک اتحاد قائم ہوگیا جس کی بنیاد حقیقتاً یہ قرار پائی کہ جہاں تک ممکن ہو اسلامی سلطنتوں کے ٹکڑے کر کے ان پر قبضہ کرلیا جائے، چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جو معاہدہ فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوا اس میں فرانس کو اجازت دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے مراکش پر قبضہ کرلے، اس کے معاوضہ میں فرانس ان تمام حقوق سے دست بردار ہوگیا جو بزعم خود اسے حکومت مصر کی نگرانی میں حاصل تھے اور مصر کی فرماں روائی تمام تر انگلستان کے سپرد کردی، اس کے بعد فرانس کی وساطت سے انگلستان اور روس کا جھگڑا جو مدت سے ایران کی نسبت چلا آتا تھا، ۱۹۰۷ء میں یوں ختم ہوا کہ ایران کی سلطنت معاہدہ کے رو سے دو حصوں میں تقسیم کردی گئی، جن میں سے ایک پر روس نے اور دوسرے پر انگلستان نے اپنا تسلط قائم کرلیا۔ (۱)

اندرونی اور بیرونی سازشیں: یوروپین حکومتوں کی سرگرمیاں یہیں تک محدود نہ تھیں۔

---

(۱) شیرول ص ۲۵۰

انھوں نے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبوں پر قبضہ کرلیا بلکہ جو صوبے اس کی فرماں روائی میں باقی رہ گئے تھے، ان کے اندر بھی ہر امکانی ذریعہ سے بدامنی اور بغاوت پھیلانے کی کوشش کی، ستم یہ تھا کہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی شورشوں کو عذر قرار دے کر یہ حکومتیں عیسائی رعایا کے حقوق کے تحفظ کی خاطر دولت علیہ کے اندرونی اور انتظامی معاملات میں مداخلت کرتیں اور جہاں تک بس میں ہوتا سلطنت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتیں۔ بلقانی صوبوں کی بغاوت اور آزادی انھی حکومتوں کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کی رہین منت تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان عبدالحمید کے استبداد نے سلطنت کے ہر طبقہ میں بیزاری پیدا کردی تھی، خصوصاً دستوری حکومت کا اعلان کرنے کے بعد پارلیمنٹ کو برخاست اور دستور کو عملاً منسوخ کرنے سے تمام رعایا برہم تھی، لیکن یوروپین حکومتوں اور بالخصوص روس اور آسٹریا نے اس عام برگشتگی کو خوب بھڑکایا، اگر ایک طرف ان کی فوجیں سلطنت عثمانیہ کی سرحدوں پر حملہ آور ہوتی رہیں تو دوسری طرف ان کے گماشتے عیسائی رعایا کو مسلسل بغاوت کے لیے آمادہ کرتے رہے، مسٹر نائٹ جو تیس سال تک ترکی میں رہ کر وہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کرچکے ہیں اپنی کتاب بیداری ترکی (Awakening of Turkey) میں لکھتے ہیں:

> ”ایک مقولہ ہے کہ ہر قوم کو وہی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے، یہ مقولہ صحیح ہوسکتا ہے اگر کوئی قوم اپنے حسب خواہش نظام حکومت قائم کرنے کی آزادی رکھتی ہو لیکن جہاں تک ترکی کا تعلق ہے، اس کے باشندوں کو کوئی موقع اس حکومت کے حاصل کرنے کا نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے کیوں کہ ترکی کے طاقت ور دشمنوں کی غرض یہ تھی کہ استبدادی حکومت کی برائیاں قائم رکھی جائیں اور جب کبھی ترکوں نے اپنے اندرونی معاملات کو درست کرنے کی کوشش

کی ہوئی نہ کوئی مسیحی طاقت اس خوف سے کہ ممکن ہے ایک اصلاح شدہ ترکی ایک قوی ترکی ثابت ہو یا تو مسیحی قوموں کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑی یا مجوزہ اصلاحی تبدیلیوں کی راہ میں مزاحم ہوتی، علاوہ بریں جو طاقتیں ترکی مقبوضات کو اپنی مملکت میں شامل کرنے کے درپے تھیں وہ اس بات کی کوشش کرتی رہتی تھیں کہ ترکی کے صوبوں میں امن نہ رہنے پائے اور وہ اس غرض سے شورشیں برپا کرتی رہتی تھیں۔ وہ عیسائی کسانوں کو بغاوت کے لیے ابھارتیں اور ہنگامے برپا کراتیں تاکہ مداخلت کرنے اور ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا موقع ہاتھ آئے، یہ طاقتیں اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی طریقہ کے اختیار کرنے میں تامل نہ کرتیں مثلاً اجرتی فساد پھیلانے والوں (Agents Provocaters) میں سے ایک درویش شیخ تھا جو روس کا تنخواہ دار ایجنٹ تھا، چند سال ہوئے اس نے روس کی ہدایت کے مطابق ایشیائے کوچک میں کافروں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کی اور مسلمانوں کو عیسائی باشندوں پر حملہ کرنے کے لیے برانگیختہ کیا، اس قسم کے بہت سے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے دشمنان ترکی کی دغابازی اور ترکی کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا ہے اس کی ناانصافی ظاہر ہوتی ہے۔"(۱)

مقدونیا کی بدامنی: ان فتنہ انگیزیوں کے لیے سب سے زیادہ مناسب سرزمین مقدونیا کی تھی، مقدونیا سلطنت عثمانیہ کا وہ صوبہ تھا جس میں بلغاری، سروی، یونانی اور ترک سب ہی آباد تھے، چوں کہ بلغاریہ، سرویا اور یونان کی آزاد ریاستیں بالکل سرحد پر واقع تھیں اس لیے ان میں سے ہر ایک مقدونیا کے اس حصہ کو جہاں اس کی ہم قوم آبادی

---

(۱) "بیداری ترکی" از ثروت ص ۲-۳

زیادہ تھی اپنے اندر شامل کر لینا چاہتی تھی، دول عظمیٰ کی طرح ان ریاستوں کو بھی یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ عنقریب فنا ہو جائے گی اور چونکہ اس کے ترکہ کی تقسیم کے وقت مقدونیا کی سب سے زیادہ حقدار یہی تین ریاستیں تھیں، اس لیے ہر ایک اپنا حصہ پہلے ہی سے محفوظ کر لینا چاہتی تھی، پروپگنڈا اور ہنگامہ پروری کا نہایت کامیاب تجربہ اس سے قبل ہو چکا تھا، جس کی بنا پر پورا اطمینان تھا کہ یورپ کی بڑی طاقتیں اپنے چھوٹے بچوں کی حوصلہ افزائی میں مطلق دریغ نہ کریں گی، چنانچہ بلغاریہ، سرویا اور یونان نے اپنی ہم قوم آبادی کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے مقدونیا میں پہلے خفیہ ایجنٹ بھیجنا شروع کیے اور پھر یہ دیکھ کر کہ مخفی تدبیریں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتیں مسلح جتھے روانہ کیے، ان جتھوں نے پورے صوبہ میں ایک قیامت برپا کر دی، قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا، گاؤں کے گاؤں جلائے جانے لگے، ان غارت گروں نے عیسائیوں اور ترکوں کی تمیز بھی اٹھا دی تھی، وہ اپنے علاوہ تمام دوسرے فرقوں کے ساتھ یکساں مظالم کرتے تھے، چنانچہ اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک بلغاری جتھے نے ایک یونانی پادری کو زندہ جلا دیا، مسٹر ناٹ لکھتے ہیں: ''اس واقعہ پر کسی نے کچھ نہیں کہا، اگر یہی چیز مسلمانوں نے کی ہوتی تو کیا واویلا مچتا''(۱)، اصل یہ ہے کہ یہ ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ بھی شدید عداوت رکھتی تھیں ان کے جتھے جس قدر ترکوں کو نقصان پہنچاتے تھے، اسی قدر آپس میں بھی قتل و خون کرتے رہتے تھے، یونانی جتھے مقدونیا کی بلغاری اور سروی آبادی کو فنا کر ڈالنا چاہتے تھے تاکہ مقدونیا کا زیادہ سے زیادہ حصہ یونان میں شامل کیا جا سکے، یہی جذبہ بلغاری اور سروی جتھوں کا تھا، بلغاری جتھوں کی سرگرمیاں سب سے بڑھی ہوئی تھیں، ان ہنگاموں سے بلغاریا کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دول عظمیٰ کو مقدونیا کی جانب متوجہ کرے اور ان کی مداخلت سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔

مرزتگ پروگرام: دول عظمیٰ کو اسی دعوت کا انتظار تھا، انھوں نے آپس میں مشورہ کیا

---

(۱) ناٹ ص ۱۹-۲۰

اور تمام یورپ کی طرف سے روس اور آسٹریا کو نمایندہ مقرر کر کے مقدونیا کے لیے ایک نظام اصلاح مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی، اس کام کے لیے ان سے بہتر انتخاب ممکن نہ تھا، چنانچہ ۱۹۰۳ء میں روس اور آسٹریا کی تیار کردہ اسکیم جو مرزشٹیگ پروگرام (Murzsteg Programme) کے نام سے مشہور ہے، منظور کر لی گئی اور مقدونیہ میں اصلاحات کا کام شروع ہوا، سلطان عبد الحمید کو بھی یورپ کی متحدہ قوت سے دب کر یہ مداخلت تسلیم کرنی پڑی، بلغاری فوجیں جس قتل و خون، آتش زنی و غارت گری کے ساتھ ان میں ناکام ثابت ہوئی تھیں اسے ختم کرنے کے بجائے یورپی حکومتوں نے انھیں کی شہ پر یہ قیامت برپا کی تھی، مقدونیا کا صوبہ تین ولایتوں اسکوب، سالونیکا اور موناستر پر مشتمل تھا، ان ولایتوں کے لیے ایک ترکی انسپکٹر جنرل (حسین حلمی پاشا) مقرر کیا گیا اور اس کی نگرانی کے لیے روس اور آسٹریا کے نمایندے مقرر ہوئے، امن و امان قائم رکھنے کی خدمت ایک بین الاقوامی پولیس کو تفویض ہوئی جس کا افسر اعلیٰ ایک یورپین تھا، تینوں ولایتیں روس، آسٹریا، انگلستان، فرانس اور اٹلی کے درمیان اس طرح تقسیم کر دی گئیں کہ ہر حکومت اپنے حصہ کے امن و امان کی ذمہ دار قرار پائی لیکن مجموعی طور پر نگرانی ایک مرکزی مجلس کے سپرد ہوئی۔

اس نظام کے جاری کرنے کے کچھ دنوں بعد دول عظمیٰ نے مقدونیا کی مالیات کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن بھی مقرر کر دیا، یوں فوجی اور مالی دونوں شعبے دولت علیہ کے ہاتھ سے حقیقتاً نکل گئے لیکن مقدونیا کی حالت میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا، امن و امان قائم کرنے میں بین الاقوامی پولیس بھی ویسی ہی ناکام ثابت ہوئی جیسی عثمانی فوج اس سے پہلے ہو چکی تھی، یونانی اور بلغاری جتھوں کی غارت گری برابر جاری رہی، شیویل لکھتا ہے کہ نسلی جماعتوں کی باہمی عداوتیں خصوصاً یونانیوں اور بلغاریوں کی اور پھر اس سے کسی قدر کم سرویوں، ولاچیوں اور البانیوں کی دشمنیاں اس درجہ قابو سے باہر ہو گئی تھیں کہ عقل و خرد کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا اور پوری آبادی اپنے کو ہلاک

کرنے پر تلی ہوئی تھی، جو ریاستیں مقدونیا کی سرحد پر واقع تھیں، وہ ان غارت گروں کی پوری طرح مدد کر رہی تھیں، جنھوں نے سلطان کے بعد مقدونیا کی وراثت پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔(۱)

مقدونیا کی تقسیم کے منصوبے: "مرزتگ پروگرام" اور مالیاتی کمیشن کا تقرر ترکوں کی غیرت ملی کے لیے ایک سخت تازیانہ تھا، ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ بین الاقوامی مداخلت کی باگ روس اور آسٹریا کے ہاتھوں میں دے دی گئی تھی جب کہ یہ دونوں سلطنتیں دولت عثمانیہ کی شدید ترین دشمن تھیں، چنانچہ ترکوں کا خیال تھا اور بقول مسٹر نائٹ غیر جنبدار اشخاص کے بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ روس اور آسٹریا نے بالقصد اس پروگرام کو ناکام بنایا اور ان کے نمایندوں نے اس کا نفاذ ایسے طریقہ پر کیا کہ اس سے عیسائیوں میں ہنگامہ و فساد کی آگ بھڑکتی ہی گئی، اس سے غرض یہ تھی کہ یورپین ترکی کو ٹکڑے کرنے کی تجویز آگے بڑھائی جائے(۲)، ۱۹۰۴ء کے بعد انگلستان، روس اور فرانس نے 'مرد بیمار' کے مال کے حصے بخرے کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا تھا اور ۱۹۰۵ء کے آخر میں لارڈ لینس ڈاؤن (Lord Lansdowne) کے زیر قیادت دول عظمیٰ کے متحدہ جنگی بیڑوں کا مظاہرہ ایک ایسا کھلا ہوا اشارہ تھا جسے ہر ترک سمجھ سکتا تھا، مسٹر بکسٹن (C.B. Buxton) جو 'بلقان کمیٹی' میں انگلستان کے نمایندہ تھے، اعتراف کرتے ہیں کہ "ترکی حکومت کے دشمن خواہ ذاتی اغراض کی بنا پر یا نوع انسانی کی ہمدردی کے خیال سے بھر حملہ آور ہو رہے تھے، یہ گفتگو بھی تھی کہ مقدونیا کو تقسیم کر دیا جائے۔"(۳)

جون ۱۹۰۸ء میں شاہ ایڈورڈ اور زار نکولس نے ریوال میں ملاقات کی اور مقدونیا میں امن قائم کرنے کے لیے ایک جدید پروگرام مرتب کیا، ترک مرزتگ پروگرام

---

(۱) شیول ص ۳۳۶ (۲) نائٹ ص ۹۶ (۳) "ترکی حالت انقلاب میں" از چارلس بکسٹن ص ۲۴

Turkey in revolution by C B. Buxton

کا نتیجہ دیکھ رہے تھے، ان میں اب کسی نئے تجربہ کی برداشت کی طاقت نہ تھی، اس میں شبہ نہیں کہ انگلستان اور روس کی یہ متحدہ سرگرمی سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی اگر نوجوان ترکوں نے عجلت سے کام لے کر علم انقلاب نہ بلند کر دیا ہوتا، جس سے نہ صرف سلطان عبدالحمید کی استبدادی حکومت کا خاتمہ ہو گیا بلکہ دول عظمیٰ کے سارے منصوبے بھی دفعۃً خاک میں مل گئے۔

عبدالحمید کا استبداد: عبدالحمید ایک استبداد پسند سلطان تھا اور اس کا استبداد مطلق العنانی کی حد تک پہنچا ہوا تھا، لیکن عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد ہی بادشاہ کے منصب پر اسے دول عظمیٰ کے متفقہ مطالبے کے سامنے سر جھکانا پڑا اور عین اس وقت جب یورپین طاقتوں کے نمائندے قسطنطنیہ میں مجتمع ہو کر عیسائی رعایا کے لیے اصلاحات کی تجویزوں پر غور کر رہے تھے عبدالحمید نے مدحت پاشا کے تیار کردہ دستور کو جس کا نفاذ سلطان عبدالعزیز کے عہد میں نہ ہو سکا تھا، نافذ کر کے یہ اعلان کر دیا کہ آئندہ دولت عثمانیہ کی تمام رعایا بلا امتیاز مذہب و ملت قانون کی نگاہ میں یکساں خیال کی جائے گی، ساتھ ہی پارلیمنٹ کا افتتاح کر کے گویا دستوری حکومت قائم کر دی، عبدالحمید نے اس کارروائی سے یورپین طاقتوں اور مدحت پاشا کی حزب الاصلاح (رفارم پارٹی) دونوں کے مطالبات بظاہر پورے کر دیے مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ دستوری حکومت کا شدید مخالف تھا، چنانچہ جب دستور کے اعلان کے بعد قسطنطنیہ کی کانفرنس منتشر ہو گئی تو چند ہی دنوں میں عبدالحمید نے عثمانی پارلیمنٹ کو بھی برخاست کر دیا اور دستور کے اصلی محرک اور مصنف مدحت پاشا کو جلاوطن کر دیا، مدحت پاشا جلاوطن کر دیے گئے لیکن ان کے پیدا کردہ خیالات قوم کے دلوں سے نہ نکل سکے، یہ دیکھ کر عبدالحمید نے مدحت پاشا کو الطاف خسروانہ کا یقین دلا کر واپس بلا لیا اور چند مہینے شام اور اس کے بعد سمرنا کی ولایت پر مامور کرنے کے بعد ان پر سلطان عبدالعزیز کے قتل میں شریک ہونے کا الزام لگایا اور عدالت عالیہ کو اس جرم کی تحقیقات کا حکم دیا، بقول خالدہ ادیب خانم تحقیقات کیا تھی

سمرو ریا کا ایک نظر فریب منظر تھا، مدحت پاشا کو قتل کی سزا تجویز ہوئی لیکن عبدالحمید نے سزا میں تخفیف کر کے اسے حبس دوام سے بدل دیا، یہ محض دکھانے کے لیے تھا، مدحت پاشا طائف میں قید کیے گئے اور چند دنوں بعد کچھ اور آدمیوں کے ساتھ وہیں قید خانے میں انھیں پھانسی دے دی گئی، مدحت پاشا سلطنت عثمانیہ کے آخری صدر اعظم تھے جنھیں موت کی سزا دی گئی۔

لیکن مدحت پاشا کی موت سے آزادی کے وہ خیالات فنا نہیں ہوئے جو دور تنظیمات سے ترکوں کے اندر پرورش پا رہے تھے، عبدالحمید ان خیالات سے بے خبر نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یورپ کی آزاد خیالی ترکی میں پھیلتی جا رہی ہے، اس نے سب سے پہلے انھی خیالات کی اشاعت روکنے کی کوشش کی، چوں کہ یہ خیالات زیادہ تر مغربی تعلیم اور یورپ کے سفر کا نتیجہ ہوتے تھے، اس لیے عبدالحمید نے ان دونوں چیزوں پر سخت پابندیاں عاید کر دیں، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں: "عبدالحمید اپنی مسلمان رعایا کو جاہل رکھنا چاہتا تھا کہ بحیثیت بادشاہ اس کی اطاعت آنکھ بند کر کے ہوتی رہے، وہ جانتا تھا کہ جدید یورپ کی آزاد خیالی کا پودا ترکی میں نصب کر دیا گیا ہے اور اس نے عزم کر لیا تھا کہ اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ دے گا یا کم سے کم اسے بڑھنے نہ دے گا، اس نے مغربی ترقی کے اثر سے ترکی کو الگ کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا، چند مستثنیات کے علاوہ اس کی رعایا کو غیر ملکوں میں سفر کرنے کی اجازت نہ تھی اور سلطنت کے اندر بھی لوگوں کی نقل و حرکت شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی تھی (۱) عبدالحمید نے مدحت پاشا اور ان کے پیروؤں کی تصنیفات کو ممنوع قرار دے دیا تھا، جس کسی کے پاس تنظیمات کے متعلق کوئی کتاب پکڑی جاتی تھی اسے بہت سخت سزا ملتی تھی، ایسی کتابوں کا ایک صفحہ بھی پڑھنا بغاوت میں داخل تھا، آزادی، دستور، حب وطن اور اس قسم کے دوسرے الفاظ لغت کی کتابوں سے نکال ڈالے گئے۔" (۲) عبدالحمید پر سازشوں کا

---

(۱) نائٹ ص ۳۳ (۲) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش از خالدہ ادیب خانم ص ۶۰

خوف اس قدر طاری رہتا تھا کہ اس کی احتیاطی تدبیریں بعض اوقات حد سے متجاوز ہو جاتی تھیں مثلاً اس خطرہ سے کہ ٹائپ رائٹر اور ٹیلی فون سازش کرنے والوں کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں، اس نے ترکی میں ان چیزوں کی درآمد ممنوع قرار دے دی تھی، پریس کو مطلق آزادی نہ تھی۔ باہر سے چھپ کر جو چیز بھی ترکی میں آتی تھی اس پر نہایت سخت نظر رکھی جاتی تھی، اگر کسی شخص کے پاس ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) کی کوئی تصنیف پائی جاتی تو اسے قید کر لیا جاتا، نگرانی اتنی سخت تھی کہ تھیٹر میں ہیملٹ (Hamlet) کا ڈراما کرنے کی اجازت نہیں دی گئی کیوں کہ اس میں ایک بادشاہ کے قتل کیے جانے کا واقعہ دکھایا گیا ہے۔(۱)

فوج کی تعلیم: تاہم یورپ کے اثر سے عبدالحمید فوج کو محفوظ نہ رکھ سکا، وہ جانتا تھا کہ سلطنت کی بقا اس بات پر منحصر ہے کہ فوج کی تربیت اور تنظیم یورپ کے جدید اصولوں کے مطابق کی جائے، اس لیے مجبوراً اس نے فوجی مدارس قائم کیے جہاں یورپ کے ماہرین حرب ترک نوجوانوں کو تعلیم دیتے تھے، ہزاروں فوجی افسر انہی مدرسوں سے تعلیم حاصل کر کے نکلے اور اپنے ساتھ یورپ کے فوجی اصولوں کے علاوہ سیاسی خیالات بھی لائے، اعلیٰ تعلیم کے لیے عبدالحمید نے بہت سے فوجی افسروں کو جرمنی اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی روانہ کیا، یہ افسر جب واپس ہوئے تو ایک بنیادی انقلاب کی ضرورت کا احساس لے کر آئے، عبدالحمید ان جدید تعلیم یافتہ افسروں سے مطمئن نہ تھا بلکہ انھیں اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا، اسی لیے انھیں قسطنطنیہ میں نہیں رہنے دیتا تھا بلکہ سلطنت کے مختلف صوبوں اور دور دراز مقامات میں بھیج دیا کرتا تھا تاکہ دارالسلطنت ان کے خیالات سے متاثر نہ ہونے پائے۔

نظامِ جاسوسی: آزاد خیالی کی روک تھام کے لیے عبدالحمید نے جاسوسی کا ایک زبردست محکمہ قائم کیا تھا، جس کی سرگرمیاں ترکوں کا گلا گھونٹ رہی تھیں، کوئی گھر جاسوسوں کی دست برد سے محفوظ نہ تھا، ممنوع الاشاعت لٹریچر کی تلاش میں پولیس اکثر

---

(۱) ہائٹ ص ۲۴۴۔

تعلیم یافتہ ترکوں کے مکانات میں بے تامل داخل ہو جایا کرتی تھی، خاص اجازت کے بغیر کوئی جلسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، اس میں اتنی سختی برتی جاتی تھی کہ تین چار دوستوں کا کسی قہوہ خانہ میں بیٹھ کر بات چیت کرنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا، کوئی ترک خود اپنے گھر میں بھی احباب کی ضیافت نہیں کر سکتا تھا، جب تک حکام بالا سے اجازت نہ حاصل کر لے اور اجازت کے بعد بھی اکثر کوئی پولیس کا سپاہی اس کے ہاں بھیج دیا جاتا تھا کہ مہمانوں کی گفتگو سنتا رہے اور اندازہ کرے کہ دعوت کسی سازش کے سلسلہ میں تو نہیں ہے، یہ ناخواندہ مہمان صحبت کا سارا لطف خاک میں ملا دیتا تھا۔ (۱)

جو لوگ اپنی خاندانی وجاہت، روشن خیالی، حب الوطنی یا شرافت نفس کی وجہ سے ممتاز تھے ان پر خاص طور سے نظر رکھی جاتی تھی، جاسوسی کی شدت نے ان کی زندگی دوبھر کر رکھی تھی، جاسوسی کا نظام اتنا وسیع تھا کہ اس پر اوسطاً بیس لاکھ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا تھا، کوئی مقام، کوئی طبقہ، کوئی گھر جاسوسوں کی زد سے باہر نہ تھا، غضب یہ تھا کہ خود وزرا ایک دوسرے کی جاسوسی کرتے تھے، ملازمین اپنے آقا کے جاسوس تھے، بعض اوقات خود اپنے اعزہ اور رشتہ دار جاسوسی کرتے تھے، خاندان، فوج، بحریہ کوئی بھی اس کے مہلک اثرات سے محفوظ نہ تھا، اجتماعی زندگی کا سارا اعتماد جاتا رہا تھا، کوئی کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا، ہر شخص دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا، تمام فضا خوف اور بے اعتباری سے بھری ہوئی تھی طرہ یہ تھا کہ خود ان جاسوسوں پر بھی جاسوس مقرر کیے گئے تھے، عبدالحمید کے جاسوس یورپ کے ہر پایہ تخت میں تھے، جاسوسوں کی یہ زبردست فوج جو سلطنت کے چپہ چپہ میں پھیلی ہوئی تھی، اپنی رپورٹیں سلطان کے پاس بھیجتی رہتی تھی اور ان رپورٹوں کی بنا پر ہزاروں آدمیوں کو قید، جلاوطنی اور قتل کی سزا ملتی تھی، جاسوس جن لوگوں کو نامزد کر دیتے تھے انھیں اکثر بغیر اس کے کہ عدالت میں صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے سزا دے دی جاتی تھی، ملک کے بعض بہترین افراد اپنے گھروں سے

---

(۱) ٹائمس ص ۳۵

دفعۃً غائب ہوگئے اور پھر پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے، یہ لوگ قصر سلطانی میں بلائے جاتے تھے اور وہاں خاموشی کے ساتھ قتل کرکے باسفورس میں ڈال دیے جاتے تھے، باسفورس کی مچھلیاں قصر سلطانی کے ان الوانِ نعمت کی منتظر رہا کرتی تھیں، جلاوطنی یا قید کی سزا تو معمولی جرائم کے لیے مقرر تھی مثلاً باب عالی کے طرزِ حکومت سے اختلاف کا اظہار یا کسی آزاد خیال غیر ملکی اخبار کا اپنے پاس رکھنا، لوگ باب عالی میں بلائے جاتے تھے اور انھیں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے خلاف بیان دینے پر مجبور کیا جاتا تھا، دستوری حکومت کے اعلان کے بعد تقریباً ستر ہزار آدمی جو سلطنت کے دور دراز مقامات مثلاً طرابلس اور یمن اور غیر ممالک میں جلاوطن کردیے گئے تھے، ترکی میں واپس آئے، جو قتل کردیے گئے تھے یا جو قید کی حالت میں مرگئے ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ (۱)

اس نظام کی زد تقریباً تمام ترکوں اور خصوصاً تعلیم یافتہ ترکوں پر تھی، کیوں کہ عبدالحمید کو انہی کی طرف سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا، عیسائی رعایا اور دوسرے مسلمان نسبتاً آزاد تھے، عیسائیوں کو ایک بڑی آزادی یہ بھی حاصل تھی کہ سابق معاہدوں کی بنا پر حکومت ان کے تعلیمی نظام میں مداخلت نہیں کرسکتی تھی، برخلاف اس کے ترکوں کے مدارس کی نگرانی نہایت سختی سے ہوتی تھی، عبدالحمید نے اپنی رعایا میں سے ترکوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو اپنا حامی بنانے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب ہوا، اس نے کرد، عرب اور البانی رئیسوں پر لطف و کرم کا مینہ برسا دیا اور انھیں اپنے مقربین میں داخل کرلیا۔ تنظیمات کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ترکی زبان میں تھا اور دوسرے مسلمانوں پر ان خیالات کا اثر نہیں ہوا تھا، اس لیے ان پر اس دورِ استبداد میں اتنی سختیاں نہیں ہوئیں جتنی ترکوں پر کی گئیں اور ابھی ان میں اس بات کے سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ یہ مرحمت خسروانہ محض رشوت ہے جو انھیں اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ ترقی نہ کرسکیں اور انھیں نئے خیالات کی ہوا تک نہ لگنے پائے۔" (۲)

---

(۱) ج ۲ ص ۳۴۳-۳۴۸ (۲) خلافۃ تا ختم ص ۱۹

عوام کی بیزاری: عوام میں بھی عبدالحمید کے استبداد نے بیزاری پھیلا رکھی تھی، دیہاتی علاقوں کے سیدھے سادے ترک سلطان کو نہ صرف اپنا فرماں روا بلکہ مذہبی پیشوا بھی سمجھتے تھے اور اس کے احکام کی تعمیل کو اپنا اولین فرض خیال کرتے تھے لیکن باب عالی کی بدنظمیوں سے ان پر جو مظالم ہو رہے تھے ان سے خود سلطان کے خلاف برگشتگی پیدا ہو گئی تھی ترک کسانوں کو بھی بڑے بڑے ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے، یہ غریب سال بھر کی جفاکشی اور کفایت شعاری سے جو سرمایہ جمع کرتے، اس کا بڑا حصہ ٹیکس جمع کرنے والوں کی نذر ہو جاتا، قانونی طور پر جو ٹیکس نافذ تھے وہ زیادہ سخت نہ تھے، لیکن باب عالی کے عمال کی سختیاں حد سے بڑھ گئی تھیں اور غریب کسانوں کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور امراء رشوت دے کر کبھی کبھی ٹیکس سے بری ہو جاتے تھے اور ان کا بار بھی غریبوں ہی پر پڑتا تھا، کسان یہ بھی دیکھتے تھے کہ جو کثیر رقم ان سے بجبر وصول کی جاتی ہے، اس سے خود انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بڑے بڑے عہدہ داروں کی جیبیں پر ہوتی ہیں مثلاً باب عالی میں ایک شعبہ نظارات نافعہ (پبلک ورکس) کا تھا جس کے سپرد سڑکوں اور نہروں کی تعمیر تھی لیکن یہ چیزیں بہت کم تعمیر ہوتی تھیں حالانکہ ان کے لیے ٹیکس ہر سال ادا کیا جاتا تھا، ایک وزارت پولیس کی تھی لیکن جان و مال کے تحفظ کا کوئی معقول انتظام نہ تھا، وزارت عدل بھی تھی لیکن عدل و انصاف نہ تھا اور وزارت حرب کے باوجود فوجیں بھوکوں مر رہی تھی۔

تاہم ان تمام شکایتوں کے باوجود ترک کسانوں کو جو عقیدت سلطان کی ذات سے تھی وہ کبھی بغاوت کی اجازت نہ دیتی، اگر عبدالحمید کے وزراء نے فوج کی زبوں حالی کا کچھ بھی خیال کیا ہوتا، فوج کا بڑا حصہ انہی کسانوں کے لڑکوں پر مشتمل تھا اور علاوہ البانی اور بعض دوسرے دستوں کے جو سلطان کی ذات کے تحفظ اور دارالسلطنت کو خوف زدہ رکھنے کے لیے قسطنطنیہ میں مقیم تھے اور جن کی نگہداشت عبدالحمید خود کرتا تھا، بقیہ تمام فوج کا انتظام حقیقتاً مقربین سلطانی کے ہاتھوں میں تھا جو سپاہیوں کی تکلیف و احتیاج سے قطعاً بے پروا ہو کر دولت کے ڈھیر لگا رہے تھے، غریب سپاہی ہر سختی کو پوری وفاداری اور صبر

کے ساتھ برداشت کرتے تھے لیکن ایک چیز سے ان کے صبر کا پیمانہ بھی آخر کار چھلک ہی گیا۔ عثمانی فوج کا دستور تھا کہ سپاہیوں کو چار سال تک اپنے دستے میں رہنا پڑتا تھا اس کے بعد وہ گھر واپس آ جاتے تھے اور پھر وقتاً فوقتاً معینہ فوجی تربیت کے لیے بلائے جاتے تھے۔ عبدالحمید کے زمانہ میں یہ قاعدہ توڑ دیا گیا چار سال کی مقررہ مدت کے بعد بھی سپاہی کئی کئی سال تک روک لیے جاتے تھے اور جن کو گھر واپس جانے کی اجازت بھی ملتی تھی وہ بھی جب چند دنوں کے بعد جنگ کے لیے بلائے جاتے تو اکثر ان کو سلطنت کے دور دراز مقامات میں بھیج دیا جاتا جہاں انھیں غیر معین مدت تک فوجی خدمت انجام دینی پڑتی، جو دستے یمن یا حجاز بھیجے جاتے ان کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی، ذرائع حمل و نقل کی کمی سے رسد کی فراہمی کافی طور پر نہ ہو سکتی اور ان فوجوں کو خوراک اور لباس کی تکلیف کے علاوہ اکثر اسلحہ کی کمی کی شکایت بھی رہتی، ان حالات میں عربوں کی بغاوت کو فرو کرنا آسان نہ تھا، ترکی دستوں کو اکثر شکستیں ہوتیں اور عرب باب عالی کی جنگ کی وجہ سے سینکڑوں ہزاروں سپاہی قتل ہو جاتے۔

مسٹر ایلیٹ لکھتے ہیں: ”ترکی میں فوجی خدمت کا بار تمام تر مسلمان آبادی پر ہے عیسائی اس وقت تک اس سے بالکل بری ہیں۔ اس کے عوض وہ صرف ایک خفیف ٹیکس دیتے ہیں، ترک سپاہی اپنی جفاکشی اور شجاعت کے لحاظ سے دنیا کے بہترین سپاہیوں میں ہے، وہ بڑی بڑی سختیوں کو بغیر شکایت کے برداشت کرتے ہیں تاہم اس کی برداشت کی بھی ایک حد ہے، سابق دور حکومت میں ان کی اعلیٰ درجہ کی فوجوں کو جو قابل رحم حالت میں تھے قلعوں اور فوجی چوکیوں میں دیکھی اس کے بیان میں مبالغہ مشکل سے ہو سکتا ہے، ان فوجوں کو پورا راشن کبھی نہیں ملتا تھا، بعض اوقات ان پر فاقے گذر جاتے تھے، بلقان کی شدید سردیوں کے زمانہ میں بھی جب وہ سرحد کی حفاظت پر تعینات رہتیں انھیں کافی لباس میسر نہ تھا، اکثر ان کی وردیاں پرانی ہو کر چیتھڑے ہو جاتی تھیں اور نہ کوئی لباس بھی مل سکتا، وہ اسی کو پہن کر بسر کر لیتیں، ان کی قلیل تنخواہ ہمیشہ بقایا میں پڑی رہتی۔

وہ فوجی تربیت اور تنظیم سے بھی محروم تھیں یعنی یورپ کا بہترین فوجی جوہر افسوس ناک طریقہ پر ضائع ہو رہا تھا، خود افسروں کی تنخواہ بھی باقاعدہ نہ ملتی تھی، انھیں اتنی استطاعت نہ تھی کہ صاف ستھری زندگی کا سامان فراہم کر سکتے، نفرت انگیز نظامِ جاسوسی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے بھی کشیدہ رہتے تھے، ان حالات میں وہ اپنے سپاہیوں کے اندر وہ بلند فوجی روح نہیں پیدا کر سکتے تھے جو پہلے ترکی فوج کا طرۂ امتیاز تھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب لڑائی کا موقع آتا تھا تو یہ لوگ یاد رکھتے تھے کہ ہم ترک سپاہی ہیں اور خوب لڑتے تھے۔ (۱)

عام بیزاری: مذکورہ بالا حالات نے سلطنت کے ہر حصہ میں بیزاری پھیلا رکھی تھی اور انقلاب کے جذبات رعایا کے ہر طبقہ میں پرورش پا رہے تھے، ان جذبات کو دبانے اور فنا کرنے کے لیے عبدالحمید نے جو تدبیریں اختیار کیں وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے الٹی ثابت ہوئیں، چوں کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ترک ہمیشہ جاسوسوں کی نظر میں رہتے تھے اور ان کے لیے ایک دوسرے سے آزادی کے ساتھ ملنا خطرہ سے خالی نہ تھا، اس لیے وہ اپنی زندگی کی بے لطفی دور کرنے کی غرض سے زیادہ تر فلسفہ، تاریخ، قانون اور دوسرے مضامین کی کتابیں جو مغربی ممالک سے پوشیدہ طور پر ترکی میں لائی جاتی تھیں پڑھتے رہتے تھے، یہ کتابیں ترک جلاوطن بہت خفیہ طور پر اپنے دوستوں اور ہم خیالوں کو بھیجا کرتے تھے، شروع میں اس ممنوع الاشاعت لٹریچر کی تعداد بہت قلیل تھی، اکثر ایک ہی کتاب یکے بعد دیگرے سیکڑوں اشخاص تک منتقل ہوتی رہتی بعض پرجوش نوجوان موٹی موٹی کتابوں کو اپنے ہاتھ سے نقل کر ڈالتے۔ سلطان نے آزاد خیالی کی روک تھام کے لیے ہزاروں آدمیوں کو قسطنطنیہ سے جلاوطن کر کے سلطنت کے مختلف صوبوں میں نظر بند کر دیا تھا مگر اس کی یہ تدبیر بھی غلط ثابت ہوئی، ان لوگوں نے صوبوں میں پہنچ کر روشن خیالی، حریت پسندی اور سیاسی بے اطمینانی پھیلانی شروع کی، جو لوگ غیر ملکوں میں جلاوطن

---

(۱) یٹ ص ۵۵

کیے گئے تھے اور پیرس یا یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں میں رہتے تھے وہ براہ راست جدید خیالات کے زیر اثر آتے گئے اور یہی خیالات انھوں نے ترکی میں اپنے دوستوں کو پہنچانے شروع کیے، ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری سلطنت میں سلطان کی حکومت کے خلاف ایک عام ناراضی پھیل گئی اور زمین روز بروز انقلاب کے لیے تیار ہوتی گئی۔

انجمن اتحاد و ترقی: مدحت پاشا کے قتل کے بعد دستوری حکومت کا از سرنو قیام اگرچہ ایک امر محال معلوم ہوتا تھا لیکن بہت سے محب وطن ترک جو یوروپین ممالک میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس مقصد سے غافل نہ تھے، خصوصاً پیرس میں نوجوان ترکوں کی ایک سرگرم جماعت سلطنت عثمانیہ میں دستوری حکومت کی تحریک کو ترقی دینے کے لیے منظم کوشش کر رہی تھی، ۱۸۷۸ء سے لے کر جب کہ سلطان عبدالحمید نے دستور اساسی کو معطل کر دیا تھا، ۱۸۹۱ء تک ترکوں کی کسی انجمن کا پتہ نہیں چلتا، اگرچہ ایسے اشخاص کی تعداد جو حکومت کے استبداد سے آزادی حاصل کرنی چاہتے تھے روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، سب سے پہلے ۱۸۹۱ء میں جنیوا (Geneva) میں جو صدیوں سے بیکسوں اور حکومت کے باغیوں کا مامن بنا ہوا تھا، ترک جلاوطنوں اور پناہ گزینوں کی ایک جماعت نے ایک انجمن کی بنیاد رکھی جو بعد میں 'عثمانی انجمن اتحاد و ترقی' کے نام سے مشہور ہوئی، اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ترکی حکومت اور سلطان پر دباؤ ڈال کر ملک میں اصلاحات جاری کرانے کی سعی کی جائے، شروع میں انجمن اپنے کو اتنا طاقتور نہیں محسوس کرتی تھی کہ اگر سلطان اپنی ضد پر قائم رہتا تو اسے تخت سے اتارنے کی تدبیر اختیار کرتی، کچھ دنوں کے بعد انجمن کا صدر دفتر جنیوا سے پیرس کو منتقل کر دیا گیا اور اس کی شاخیں لندن اور دوسرے یوروپین دارالحکومتوں میں قائم کر دی گئیں، سلطان نوجوان ترکوں کی ان سرگرمیوں سے بے خبر نہ تھا، عثمانی سفیر مقیم پیرس کو ہدایت کی گئی کہ وہ انجمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھے اور قسطنطنیہ سے جاسوس روانہ کیے گئے کہ انجمن کے متعلق جو معلومات بھی فراہم کر سکیں ان سے براہ راست قصر یلدیز کو مطلع کریں، خود ترکی میں

جاسوسی کا نظام اور بھی سخت کر دیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے دشمنوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ملک کے بہترین اشخاص بھاگ بھاگ کر پیرس پہنچنے لگے اور نوجوان ترکوں کی جماعت میں شامل ہوتے گئے، انجمن ایک اخبار 'مشورت' اور متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے پیرس سے شائع کرتی تھی، جنیوا سے اس کا دوسرا اخبار 'ہلال' نکلتا تھا، ان اخباروں اور رسالوں میں دور حمیدی کے مظالم کا ذکر ہوتا اور سلطان کو معزول کرنے کی تجویز پیش کی جاتی، نظام جاسوسی کی شدت کے باوجود یہ اخبارات اور رسالے خفیہ طور پر ترکی میں لائے جاتے اور کثرت سے لوگ ان کو پڑھتے، قسطنطنیہ میں انجمن کے ایجنٹ انقلابی اپیلیں رات کی تاریکی میں دیواروں پر چسپاں کر دیتے اور باغیانہ پوسٹر جن میں سلطان کی جان کی دھمکی ہوتی خود قصر یلدیز کی دیواروں پر چسپاں کر دیے جاتے۔

غیر اسلامی انجمنوں سے مفاہمت: نوجوان ترک اپنے ممتاز پیش رو مدحت پاشا کی طرح یہ خوب سمجھتے تھے کہ سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اس کی تمام قوموں اور مذہبی فرقوں کو یکساں حقوق دے دیے جائیں، چنانچہ انھوں نے آرمینی، بلغاری اور دوسری غیر مسلم انقلابی انجمنوں سے جو پیرس میں تھیں اتحاد عمل پیدا کرنے کی کوشش شروع کی، سب سے پہلے آرمینی کمیٹیوں نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور فریقین کے درمیان ۱۹۰۳ء میں جو معاہدہ پیرس میں ہوا وہ آخر تک قائم رہا، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں: ''نوجوان ترکوں اور آرمینی انقلابیوں کے درمیان مفاہمت کی راہ میں سیاسی دشواریاں بہت کم تھیں، یہ مسئلہ ایسا نہ تھا جیسا کہ مقدونیا میں یونانیوں اور سلافیوں کا مسئلہ جن کی ہم قوم خود مختار حکومتیں سرحد پر موجود تھیں جن کی مدد وہ حاصل کر سکتے تھے اور جن سے حمایت اور اگر اتفاق نے مساعدت کی تو الحاق کی امید بھی کر سکتے تھے، کیوں کہ آرمینیا اب صرف ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور قدیم آرمینیا، ترکی، روس اور ایران کے درمیان تقسیم ہو چکا ہے، ترکی آرمینیا میں، ارمنوں سے بہت زیادہ مسلمانوں کی تعداد ہے اور ایک خود مختار آرمینی علاقہ پیدا کرنا جیسا کہ انقلابیوں کی

ایک جماعت کی خواہش تھی ظاہر ہے کہ یہ ناقابل عمل اسکیم تھی، چنانچہ ارمنوں میں جو لوگ زیادہ سمجھ دار تھے انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ترکی حکومت کا واحد بدل روسی حکومت ہو سکتی ہے اور سرحد پار ان کے بھائیوں کے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان دونوں میں ترکی حکومت قابل ترجیح ہے، کیوں کہ اس کے ماتحت ان کو ایک حد تک نسلی خود مختاری اور مختلف رعایتیں حاصل تھیں، یہ سچ ہے کہ عبدالحمید کے استبداد سے یہ رعایتیں بہت محدود ہو گئی تھیں، لیکن حکومت روس جو ہمیشہ اپنی ماتحت قوموں کو روسی بنانے پر تلی رہتی تھی، ہرگز یہ مراعات انھیں نہ دیتی۔"(۱)

اس کے بعد نوجوان ترک دوسری غیر اسلامی انقلابی کمیٹیوں کی طرف متوجہ ہوئے، ارمنوں کی طرح یہودیوں کا تعاون حاصل کرنے میں بھی انھیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی، کیوں کہ یہود کا بھی کوئی خاص وطن نہ تھا اور قومی اور وطنی آزادی کا مسئلہ ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، لیکن مقدونیا کے بلغاریوں، سرویوں اور یونانیوں کے ساتھ مفاہمت کرنے میں سخت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ قومیں بیرونی حکومتوں کی مدد پر اعتماد کرتی تھیں، نوجوان ترکوں نے انھیں سمجھایا کہ دول عظمیٰ جو ایک دوسرے کو حسد کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اگر مقدونیا میں مداخلت پر آمادہ بھی ہوں تو بھی اس کی امید نہیں کہ وہاں کے عیسائیوں کے سیاسی حوصلے پورے ہو سکیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ مقدونیا کے خلفشار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا بڑا حصہ سلطنت آسٹریا ہنگری اپنے اندر شامل کر لے گی، ایسی صورت میں مقدونیا کے عیسائیوں کے لیے مفید یہی ہے کہ سلطنت عثمانیہ سے علاحدہ ہونے کا خیال ترک کرکے نوجوان ترکوں کا ساتھ دیں جن کا مقصد سلطنت میں اتحاد پیدا کرنا اور ان کی تمام قوموں کو مساوی حقوق دینا ہے، چار سال کی مسلسل کوشش کے بعد بالآخر ۱۹۰۷ء میں مقدونیا کی انقلابی کمیٹیوں نے پیرس میں ایک پروگرام مرتب کیا، جو سب کے لیے قابل قبول تھا، اس وقت تک نوجوان ترکوں نے مقدونیا میں اپنی خفیہ

---

(۱) بیداری ترکی ص ۸۸

سوسائٹی قایم کرلی تھی اور ترکی فوج کے بڑے حصہ کو اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔

پیرس کی انقلابی کانگریس: دسمبر ۱۹۰۷ء میں سلطنت عثمانیہ کے انقلابیوں کی ایک کانگریس احمد رضا بے کے زیر صدارت جو پیرس کی مرکزی انجمن کا صدر تھا پیرس میں منعقد ہوئی جس میں عثمانی انجمن اتحاد و ترقی، ارمنی، بلغاری، یہودی، عرب، البانی اور دوسری کمیٹیاں شریک ہوئیں اور تمام مندوبین نے مندرجہ ذیل امور کے قبول کرنے پر اتفاق کیا

(۱) سلطان عبدالحمید معزول کردیے جائیں۔

(۲) سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کا تحفظ کیا جائے۔

(۳) قانون کی نگاہ میں تمام نسلوں اور مذہبوں کو کامل مساوات حاصل ہو۔

(۴) مدحت پاشا کے بنائے ہوئے دستور اساسی کی بنیاد پر دستوری حکومت قایم کردی جائے۔

مقدونیا کا انتخاب: اس کانگریس سے ایک سال قبل 'انجمن اتحاد و ترقی' نے اپنا صدر دفتر مقدونیا میں منتقل کردیا تھا، مقدونیا کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کے مختلف اسباب تھے، اول یہ کہ وہیں وہ قوتیں کام کررہی تھیں جن سے سلطنت عثمانیہ کے جلد ٹکڑے ہوجانے کا اندیشہ تھا، سیاسی ڈاکووں کے خون آشام جتھے جن کو ترکی کے دشمنوں سے برابر مدد ملتی رہتی تھی، اس علاقہ کو بری طرح تباہ و برباد کررہے تھے، اس کی وجہ سے مقدونیا کے داخلی معاملات میں دول عظمیٰ کو مداخلت کا موقع ہاتھ آگیا تھا اور یہ چیز ہر محب وطن ترک کے لیے نہایت شرمناک تھی، چنانچہ مقدونیا کے ملکی انتظامات کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی مالیاتی کمیشن کا تقرر اور ایک بین الاقوامی فوجی پولیس کی تشکیل جس کی تربیت اور کمان یوروپین افسروں کے ہاتھ میں تھی، دول عظمیٰ نے سلطان پر فوجی طاقت کا دباؤ ڈال کر منظور کرائی تھی، نوجوان ترک اس مداخلت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی وجہ سے حمیدی نظام حکومت کے خلاف ان کی بیزاری اور بھی شدید ہوگئی تھی، اس مداخلت کا ایک پہلو ترکوں کو خاص طور پر ناگوار تھا اور وہ 'مرزتگ پروگرام' تھا جس کے رو

سے دول عظمیٰ نے آسٹریا اور روس کو جو دولت علیہ کی شدید ترین دشمن سلطنتیں تھیں مقدونیا میں اپنا اصلاحی پروگرام جاری کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ اس پروگرام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدونیہ کی حالت روز بروز بدتر ہوتی گئی اور یہ عام طور پر محسوس کیا جانے لگا کہ جب تک نظامِ حکومت میں بنیادی اصلاحات نہ کی جائیں گی غیر ملکوں کی گرفت اور بھی سخت ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ سلطنت عثمانیہ ایک روز اپنی آزادی بالکل کھو بیٹھے گی۔ چنانچہ تمام مقدونیا میں موجودہ حالات کے خلاف جو شدید بیزاری پھیلی ہوئی تھی، اس نے نوجوان ترکوں کی خفیہ سرگرمیوں کے لیے زمین تیار کر دی تھی۔

اس سلسلہ میں پہلا کام فوج کو اپنا ہم خیال بنانا تھا۔ مقدونیا کی فوجیں سلطنت کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت بغاوت کے لیے زیادہ آمادہ تھیں، ان فوجوں کو نہ اچھا کپڑا ملتا تھا نہ اچھا کھانا، تنخواہیں بھی شاذ و نادر ہی ملتی تھیں، سالہا سال سے یہ فوجیں عیسائی باغی جتھوں سے بے قاعدہ لڑائیوں میں مصروف تھیں، جو ایک قسم کا پولیس کا کام تھا اور فوجی سپاہیوں کو مرغوب خاطر نہ تھا، ان کی بے اطمینانی اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ وہ دیکھتی تھیں کہ ان ہی کے بھائی جو بین الاقوامی پولیس میں تھے ان کی حالت کتنی بہتر تھی، ان کی فوجی تربیت بھی بہتر تھی، عمدہ کھانا اور عمدہ کپڑا بھی ملتا تھا اور ان کی تنخواہیں بھی باقاعدہ برابر ملتی تھیں، ان کو دیکھ کر مقدونیا کی فوج کے افسروں اور سپاہیوں دونوں کو اپنی زبوں حالی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا تھا اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس صورت حال کا ذمہ دار قصر یلدیز ہے۔

نظامِ جاسوسی کی شدت بھی سلطنت کے اور حصوں کی بہ نسبت مقدونیا میں زیادہ تھی، جس سے وہاں کے نوجوان فوجی افسر جن کی تعلیم و تربیت یوروپین اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی تھی سخت بیزار تھے، انھیں قدرۃً نوجوان ترکوں کی تحریک سے ہمدردی پیدا ہو گئی، ان کی بیزاری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ سے قصر یلدیز کے متوسلین جن میں مطلق فوجی قابلیت نہیں ہوتی تھی مقدونیا میں بھیجے جاتے تھے اور انھیں ان

افسروں کے اوپر کمان دی جاتی تھی جو مدارس حربیہ کے تعلیم یافتہ تھے، جنھوں نے سلطنت کی جنگوں میں نمایاں حصہ لیا تھا اور جو سالوں سے مقدونیا کے پہاڑوں میں باغی جتھوں سے لڑتے آئے تھے، وہ دیکھتے تھے کہ ترقی کا مدار حسن خدمت پر نہیں بلکہ قصر سلطانی کی سفارش گردیوں پر تھا۔

مذکورہ بالا حالات میں نوجوان ترکوں کو اپنی تحریک کے پھیلانے میں بڑی مدد ملی، انجمن کی غیر معمولی سرگرمیوں کے باعث تھوڑے ہی عرصہ میں انقلابی خیالات مقدونیا کی پوری فوج میں پھیل گئے۔ انجمن کے ارکان درویشوں اور سوداگروں کے بھیس میں فوجی دستوں میں جاتے اور بڑی ہوشیاری اور خاموشی کے ساتھ تحریک آزادی کی تبلیغ کرتے، سپاہیوں اور افسروں کو حکومت کی طرف سے جو شکایتیں تھیں ان کی وجہ سے یہ خفیہ کوششیں کامیاب ہوتی گئیں، اس کے بعد دوسری فوجوں میں بھی کام شروع کیا گیا، چوں کہ دارالسلطنت کی فوج سب سے زیادہ طاقتور اور وفادار تھی، اس لیے انجمن نے مقدونیہ میں اپنی کامیابی کے بعد سب سے زیادہ کوشش اسی فوج کی ہمدردی حاصل کرنے میں کی، دسمبر ۱۹۰۷ء تک مقدونیا کی تقریباً پوری فوج نے دستوری حکومت کی حمایت کا حلف لے لیا تھا، ادرنہ اور قسطنطنیہ کی فوجوں نے بھی اس تحریک سے ہمدردی ظاہر کردی تھی اس کے علاوہ ڈاکٹر ناظم بے کی کوششوں سے اناطولیہ کی فوج کا بڑا حصہ بھی نوجوان ترکوں کا طرفدار ہوگیا تھا۔

مقدونیا میں 'انجمن اتحاد و ترقی' نے اپنی خفیہ سوسائٹی کا صدر دفتر سالونیکا میں قائم کیا، یہ شہر خفیہ سوسائٹیوں کے لیے خاص طور پر موزوں تھا، اس میں بہت سی نسلوں اور قوموں کے لوگ آباد تھے، جو مختلف زبانیں بولتے تھے، اس کی گھنی آبادی میں بھیس بدل کر جاسوسوں کی نظر سے بچتے رہنا آسان تھا، برخلاف اس کے جاسوسوں کے لیے سازشوں اور خفیہ سوسائٹیوں کا پتہ چلانا بہ نسبت اور شہروں کے یہاں زیادہ مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ترکوں کی خفیہ سوسائٹی سے پہلے بھی وہاں اس قسم کی کئی سوسائٹیاں قائم تھیں،

چنانچہ مقدونی داخلی انجمن کا صدر دفتر وہاں ۱۸۹۵ء سے موجود تھا۔

انجمن کی احتیاطی تدبیر: جیسا کہ اوپر بیان ہوا قصر یلدیز انجمن اتحاد و ترقی کی سرگرمیوں سے باخبر تھا اور سلطان کے جاسوس اس کے ممبروں کا سراغ لگانے میں پوری طرح کوشاں تھے، یہی وجہ تھی کہ ممبروں کا داخلہ بڑی چھان بین اور انتہائی احتیاط کے ساتھ ہوتا تھا، جن لوگوں نے انجمن کے قواعد وضوابط مرتب کیے تھے انھوں نے اطالوی خفیہ سوسائٹیوں کا طریقہ اختیار کیا تھا، جس میں ہر ایک ممبر کا تعارف سوسائٹی کے صرف دو یا تین ممبروں سے کرایا جاتا تھا تاکہ اگر وہ کبھی غدار بھی ثابت ہو تو اس تعداد سے زیادہ کے نام نہ بتا سکے، تین ممبروں کی ایک خفیہ کونسل پیرس میں تھی اور دس ممبروں کی سالونیکا میں، یہ کونسلیں مجلس عاملہ کا کام کرتی تھیں، ان دونوں کونسلوں کے ممبروں کا انتخاب مخفی طریقے کے ووٹ سے ہوتا تھا اور وہ اکثر تبدیل ہوتے رہتے تھے، مقدونیا میں انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان کی تعداد پندرہ ہزار اور تمام ترکی میں اسی ہزار تک پہنچ گئی تھی، یہ لوگ زیادہ تر ڈیڑھ ڈیڑھ سو آدمیوں کی جماعتوں میں تقسیم تھے، ان جماعتوں کی نقل و حرکت کی نگرانی و رہنمائی دو ایجنٹوں کے سپرد تھی جن میں سے ایک کا تعلق سالونیکا کی دس ممبروں والی خفیہ کونسل سے تھا اور دوسرا پیسے کی نگرانی کے لیے مقرر تھا، پھر یہ جماعتیں پانچ پانچ آدمیوں کی ٹولیوں میں بٹی ہوئی تھیں اور کوئی ممبر اپنی ٹولی کے چار آدمیوں کے سوا کسی دوسرے ممبر سے واقف نہ تھا، اس احتیاط کا مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی ممبر غداری بھی کرے تو چار آدمیوں سے زیادہ کے نام حکومت کو نہ بتا سکے، انجمن کے ممبروں میں ترکوں کے علاوہ عیسائیوں اور یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جس کی وجہ سے غداری کے اکثر مواقع پیش آتے ہوں گے، لیکن یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ کسی ممبر نے کبھی دھوکا نہیں دیا، ہسٹن لکھتا ہے کہ ”وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے لوگوں کی گرفتاریاں عمل میں آتی رہتی تھیں، اس کے بعد قید اور قتل کی سزائیں دی جاتیں، شدید ایذاؤں کے ذریعہ ایسی شہادتیں حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی جن سے ممبروں کا سراغ لگ سکے لیکن کسی ایک

ممبر کی غداری کا ثبوت بھی نہیں ملتا۔" (۱)

عورتوں کی خدمات: تحریک انقلاب کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ترک عورتوں نے بھی بہت کچھ حصہ لیا، ان کے سپرد زیادہ تر پیغام رسانی اور کاغذات کو ایک ممبر کے پاس سے دوسرے ممبر کے پاس لے جانے کی خدمت تھی، انجمن کے ممبروں کی بیویاں ایک دوسرے سے مل کر یہ خدمت آسانی کے ساتھ انجام دیتی تھیں، ترکی میں عورتوں کو جو عزت و احترام حاصل تھا، اس کے لحاظ سے وہ تلاشی سے محفوظ و مامون تھیں اور کوئی غیر شخص خواہ وہ کسی رتبہ کا آدمی ہو بلا اجازت حرم میں داخل نہیں ہو سکتا تھا، کسی پولیس افسر کی مجال نہ تھی کہ بغیر کسی نہایت ہی اہم سبب کے وہ اس مقبول عام دستور کی خلاف ورزی کر سکے۔ (۲)

خفیہ جلسے اور نئے ممبروں کا داخلہ: عورتیں جلسوں کے انعقاد میں بھی مدد دیتی تھیں، ممبروں کو زبانی پیغامات کے ذریعہ اطلاع دی جاتی تھی، یہ جلسے نہایت خفیہ طور پر منعقد کیے جاتے تھے اور افشائے راز کے خوف سے اکثر جنگلوں میں ہوتے تھے، شریک ہونے والے نقاب پوش آتے، جب کوئی نیا ممبر انجمن میں داخل کیا جاتا تو پہلے اس سے قسم لی جاتی کہ وہ کسی حالت میں انجمن کا راز ظاہر نہ کرے گا، خواہ آئندہ وہ اپنی رائے بدل کر انجمن کی رکنیت سے علاحدہ بھی ہو جائے، اس کے بعد ایک شخص جس سے وہ ناواقف ہوتا اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک مقام پر اسے لے جاتا اور وہاں اس کے سامنے انجمن کے اغراض اور ترکی کو موجودہ مظالم سے آزاد کرانے کے طریقے بیان کیے جاتے پھر اسے قرآن شریف (۳) کو ہاتھ میں لے کر اخفائے راز اور وفاداری کی قسم کھانی پڑتی، قسم کے بعد وہ عارضی طور پر انجمن کا ممبر مقرر کیا جاتا اور ایک مدت تک اس کی وفاداری کا امتحان مختلف طریقوں سے لیا جاتا، اس کے پاس پر اسرار ذرائع سے ہدایتیں پہنچتی رہتیں،

---

(۱) ترکی حالت انقلاب میں ص ۴۸ (۲) بیداری ترکی از نائٹ ص ۱۴۳ (۳) عیسائیوں اور یہودیوں کو انجیل و تورات ہاتھ میں لے کر قسم کھانی پڑتی تھی۔

جن کی تعمیل اسے بے چون و چرا کرنی پڑتی، اگر ان امتحانات میں وہ پورا اترتا تو دوبارہ اسے ایک مخفی مقام پر لے جاتے اور وہاں وہ باقاعدہ طور پر چار ممبروں کی ایک ٹولی میں داخل کر دیا جاتا، لیکن اس کے بعد بھی اس کے ساتھیوں کی شخصیت اس پر ظاہر نہ کی جاتی، حلف دینے کا طریقہ یہ تھا کہ قرآن مجید پر ایک ریوالور اور ایک تلوار رکھ کر ممبر کو متنبہ کر دیا جاتا کہ اس نے اپنا جسم و جان انجمن کے حوالے کر دیا ہے اور اگر انجمن حکم دے تو اسے اپنے حقیقی بھائی کو بھی قتل کر دینا پڑے گا، اس کے بعد ممبر یہ حلف لیتا "میں خدا اور حضرت محمد ﷺ کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی رہے گا میں قومیت، آزادی اور صداقت کے لیے جنگ کرتا رہوں گا"، حلف لینے کے بعد ممبر اپنی رکنیت کا ٹیکس ادا کرتا جس کی مقدار اس کی آمدنی کا دو فیصدی حصہ تھی، وہ ایک بندوق رکھنے کا عہد کرتا، نیز اس بات کا عہد کرتا کہ جس وقت اسے انجمن کے مقصد کے لیے لڑنے کی خاطر طلب کیا جائے گا، وہ فوراً اپنے بال بچوں، کاروبار اور دوستوں کو چھوڑ کر تیار ہو جائے گا، ممبروں سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا وہ اور دوسرے عطیے اور رقمیں جو انجمن کو حاصل ہوتیں اسلحہ اور سامانِ جنگ کے خریدنے میں صرف کی جاتیں، اس کے بعد جو رقم بچتی وہ ان لوگوں کے اہل و عیال کی مدد کے لیے وقف کر دی جاتی جو دوران انقلاب میں مارے جائیں۔(۱)

سالونیکا کمیٹی: سالونیکا میں صدر دفتر کے منتقل ہونے کے بعد انجمن کی شاخیں مقدونیا اور البانیا کے تقریباً ہر گاؤں میں قائم کر دی گئیں، انقلاب کے برپا ہونے سے پیشتر اس کی شاخیں ایشیائی ترکی کے تمام اہم شہروں میں قائم ہو چکی تھیں، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں کہ "سالونیکا کمیٹی" کے ممبروں میں سے بہتوں سے میں نے ملاقات کی ہے، وہ سب اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لوگ تھے، فوج کے نوجوان افسر تھے، جنھوں نے مدارسِ حربیہ میں تعلیم

---

(۱) "مسائل مشرقِ وسطیٰ" از انگس ہملٹن مطبوعہ لندن ۱۹۰۹ء ص ۳۰-۳۱

Problems of the middle east by Angs Hamilton

پائی تھی اور بیرن فان ڈر گولٹز (Fonder Goltz) کے اعلیٰ نظام کے تربیت یافتہ تھے، وکلا تھے، ڈاکٹر تھے اور چند علما تھے، اونچے درجہ کے افسروں اور ملازمت دیوانی کے اعلیٰ عہدہ داروں میں سے کوئی بھی اس کمیٹی کا ممبر نہ تھا، یہ تمام اشخاص جن میں سے اکثر متوسط عمر سے کم کے تھے جو خفیہ کمیٹی کے ممبر بنے تھے، اپنی شدید اور بے لوث وطن دوستی کے لیے ممتاز تھے، یہ ایسے لوگ تھے کہ جس غیر ملکی شخص کو بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ ان کا احترام اور تعریف و توصیف کرنے پر مجبور ہوا، یہ انقلاب نیچے سے نہیں شروع ہوا یعنی ذلیل شہری مخلوق یا جاہل کسانوں سے بلکہ اوپر سے آیا جو ترکی کا بہترین حصہ تھا۔“(۱)

تحقیقاتی کمیشن: دسمبر ۱۹۰۷ء کی ”پیرس کانفرنس“ کے برخاست ہونے کے بعد جب نوجوان ترک پارٹی کے اخبارات مشورت اور ہلال نے ”انجمن اتحاد و ترقی“ کی کامیابی کا ذکر کیا جو اسے اپنی تحریک کے پھیلانے میں حاصل ہوئی تھی تو سلطان نے معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کر کے انسدادی تدبیریں فوراً اختیار کیں، چنانچہ مارچ ۱۹۰۸ء میں خفیہ پولیس نے مقدونیا اور ادرنہ کے فوجی دستوں کے بعض افسروں پر چھاپے مارے اور تفتیش کے لیے ایک خاص کمیشن قسطنطنیہ سے سالونیکا بھیجا گیا، اس کمیشن کی رپورٹ جب سلطان کے پاس پہنچی تو اسے اور زیادہ خطرہ ہوا اور فوراً ہی اس نے ایک دوسرا کمیشن سالونیکا بھیجا، ان کمیشنوں کی رپورٹ پر بہت سے فوجی افسر گرفتار کر لیے گئے۔

انقلاب میں عجلت: ”انجمن اتحاد و ترقی“ ابھی انقلاب کے اعلان کے لیے پوری طرح تیار نہ تھی، اس کا خیال تھا کہ انقلاب ۳۱/ جولائی ۱۹۰۹ء کو شروع کیا جائے، جو سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی کی سال گرہ کا دن تھا، لیکن ایک طرف تو قصر یلدیز کی انسدادی سرگرمیاں روز بروز زیادہ شدید ہوتی جاتی تھیں اور دوسری طرف مقدونیا کی بڑھتی ہوئی طوائف الملوکی کے باعث بیرونی طاقتوں خصوصاً برطانیہ اور روس کی مداخلت کا خطرہ ہر لحظہ ترقی کر رہا تھا، ریوال میں شاہ ایڈورڈ ہفتم اور زار روس کی ملاقات کے بعد

بیداری ترکی ص ۱۳-۱۴

سالونیکا کمیٹی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ برطانیہ اور روس مل کر مقدونیا میں اصلاحات کی ایک اسکیم جاری کرنی چاہتے ہیں جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہاں کے تمام جتھے خواہ کسی نسل و قوم کے ہوں توڑ دیے جائیں۔ برطانیہ اور روس کا تعاون کمیٹی کی نظر میں دولت عثمانیہ کی شکست و ریخت کا مقدمہ تھا۔ علاوہ بریں وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مقدونیہ میں اجنبی تسلط کے قائم ہو جانے سے اسے اپنی تحریک کو جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ انہی دنوں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ منیر پاشا ترکی سفیر متعینہ پیرس کے دوبارہ ایتھنز جانے کی غرض یہ تھی کہ بلغاریہ کے خلاف یونان سے اتحاد کر کے مقدونیہ کے بعض حصے یونان کے حوالہ کر دیے جائیں۔ اس افواہ سے نوجوان ترکوں میں سخت برہمی پھیلی۔

اعلانِ انقلاب: مذکورہ بالا وجوہ سے کمیٹی نے اعلان انقلاب میں مزید تاخیر اپنے مقصد کے لیے خطرناک سمجھی، چنانچہ اس کی ہدایت کے بموجب ۵ر جولائی ۱۹۰۸ء کو میجر نیازی بے نے دو سو آدمیوں کو ساتھ لے کر رسنا کی پہاڑیوں پر سلطان عبدالحمید کے استبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ انقلاب کے شعلے ہر طرف پھیلنے لگے۔ جس وقت اس کی اطلاع قسطنطنیہ پہنچی سلطان نے فوراً شمسی پاشا کے نام جو مناستر کے فوجی دستہ کا کمانڈر تھا حکم بھیجا کہ اس فتنہ کو جلد سے جلد فرو کر دیا جائے۔ شمسی پاشا باغیوں کے مقابلہ میں روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ۷ر جولائی کو مقدونیا کی فوج کے ایک افسر نے جو "انجمن اتحاد و ترقی" کا ممبر تھا اس پر گولی چلائی اور پاشا اپنی گاڑی کے اندر ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ ۸ر جولائی کو ناظم بے نے سالونیکا کے اڑتالیس فوجی افسروں کو جن کے متعلق معلوم تھا کہ تحریک انقلاب کے حامی ہیں گرفتار کر لیا، دو ہی روز بعد انجمن کے ایک رکن نے اس کا جواب یوں دیا کہ حقی بے کو جو ناظم بے کا دست راست تھا گولی مار کر ختم کر دیا۔ ۱۱ر جولائی کو خود ناظم بے پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا لیکن وہ صرف زخمی ہو کر بچ گیا۔

انقلاب کی رفتار جس قدر تیز ہوتی جاتی تھی اسی قدر اسے فرو کرنے میں

حکومت کی طرف سے سختی بھی بڑھتی جاتی تھی، یہ دیکھ کر "سالونیکی کمیٹی" نے اپنے خفیہ اجلاسوں میں قصر یلدیز کے ان اہل کاروں کے قتل کے احکام صادر کرنا شروع کیے جو تحریک انقلاب کے لیے نہایت خطرناک نظر آتے تھے، ان میں وہ تمام لوگ شامل تھے جو جاسوسی کی خدمت انجام دیتے تھے، مقدونیا کی فوج کے بعض سینیر افسر بھی تھے جن کا قتل کمیٹی کو ضروری معلوم ہوا، اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں لوگ بڑی سے بڑی تنخواہ پر بھی جاسوسی کا کام کرنے پر تیار نہ ہوتے، ہر جاسوس اپنے کو بندوق کا نشانہ سمجھتا تھا، یہ قتل علی الاعلان دن کی روشنی میں گنجان سڑکوں پر فوجی افسروں کے ہاتھوں سے ہوتے اور کوئی شخص بھی ان قاتلوں سے مزاحم نہ ہوتا، سلطان کے نہایت قابل اعتماد افسر جب اس بغاوت کو کچلنے کے لیے بھیجے جاتے تو وہ اپنے سپاہیوں سے باغیوں پر گولیاں چلوانے سے قاصر رہتے اور بعض اوقات خود بھی قتل کر دیے جاتے، بقول مسٹر نائٹ "تاریخ میں پہلی بار بادشاہ کا نام اطاعت شعار عثمانی سپاہیوں کے دلوں میں احترام و اطاعت کا جذبہ پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوا"(۱)

الطاف خسروانہ کا فریب: مقدونیہ میں حکومت کا اقتدار اس حد تک زائل ہو چکا تھا کہ "باب عالی" کے کمشنروں کے لیے ان اشخاص کی گرفتاری دشوار ہوگئی جو بغاوت کے جرم میں نامزد کیے گئے تھے، چنانچہ اب فریب سے کام لینے کی کوشش کی گئی، انور بے اور دوسرے نوجوان افسروں کو جو مقدونیہ کے اندرونی علاقوں میں تحریک انقلاب کو پھیلا رہے تھے، خوشامدانہ خطوط لکھ کر قصر یلدیز آنے کی دعوت دی گئی اور ان سے نہ صرف معافی بلکہ انعام و اکرام اور عہدے کی ترقی کا وعدہ کیا گیا، انور بے اس وقت ولایات مقدونیا کے انسپکٹر جنرل کے اسٹاف کے ایک افسر تھے، سلطان ان کی اہم حیثیت سے واقف تھا، اس لیے انھیں خاص طور پر الطاف خسروانہ کا لالچ دیا گیا اور سلطان کی طرف سے یہ دعوت پیش کی گئی کہ اگر وہ باغیوں کا ساتھ چھوڑ کر فوراً قسطنطنیہ روانہ ہو جائیں

---

(۱) بیداری ترکی ص ۱۳۹

تو بالآخر جنرل کے عہدے پر مامور کر دیے جائیں گے۔ انور بے عبدالحمید کی چالوں سے خوب واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں قسطنطنیہ جانے کے معنی یہ تھے کہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، بہت سے محبان وطن ترقی اور انعام و اکرام کے وعدوں پر اس سے پہلے بھی قسطنطنیہ میں بلائے گئے تھے مگر پھر دنیا کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں اور کیوں کر غائب ہو گئے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ مدحت پاشا کے وقت سے الطاف خسروانہ کا یہ طریقہ دستوری حکومت کے حامیوں کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بجائے قسطنطنیہ کے پہاڑوں کی راہ لی اور وہاں لوگوں کو علانیہ بغاوت کے لیے ابھارنا شروع کیا۔

"انجمن اتحاد و ترقی" اب کھل کر میدان میں آگئی تھی۔ اس کی کوششوں سے مقدونیا اور ادرنہ کی فوجوں کا بڑا حصہ بغاوت میں شریک ہو گیا۔ یہ دیکھ کر باب عالی نے طے کیا کہ اناطولیہ کی فوجوں اور ازمیر سے انتالیس دستے مقدونیا کی بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کیے جائیں، چنانچہ چالیس دستے سمرنا سے سمندر کی راہ سے سالونیکا بھیجے گئے، جہاں ۱۹۰۸ء جولائی کو اترے۔ مگر نیازی بے اور ان کے ساتھیوں کی غیر معمولی سرگرمیوں سے یہ دستے اناطولیہ کو چھوڑنے سے پہلے روانہ ہونے سے قبل ہی انقلابی خیالات سے بڑی حد تک متاثر ہو چکے تھے۔ مقدونیا آنے کے بعد انجمن کے ممبروں نے فوراً ان میں تبلیغ کرانا کا شروع کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جن دستوں نے سالونیکا پہنچ کر جنگ سے انکار کر دیا، جو دستے متاثر ہو کر رہے تھے ان کے ساتھ وہ افسر جو سالونیکا کی انجمن کے رکن تھے، بہت جلد وہاں اور دوسرے مقامات میں متاثر گئے اور وہاں بڑی کوششوں سے تحریک انقلاب کے حامیوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ چنانچہ یہ بات جلد واضح ہو گئی کہ اناطولیہ کی فوج کے آدھے افسر اور سپاہی مقدونیا کے فوجی دستوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان پر گولی چلانے کے لیے ہرگز آمادہ نہ ہوں گے، نہ صرف یہ بلکہ اناطولیہ کے دستوں نے سالونیکا پہنچنے کے چند ہی دنوں بعد "انجمن اتحاد و ترقی" کی

وفاداری کا حلف بھی لے لیا۔

جولائی کے تیسرے ہفتے کی حالت یہ تھی کہ مقدونیا میں سلطان کی فرماں روائی اب بھی برائے نام قائم تھی لیکن حکومت کا اقتدار بھی نہیں رہ گیا تھا۔ خاص فوجی مرکز مناستر میں فوج کی کمان مارشل عثمان فیضی پاشا کے ہاتھ میں تھی جو شمسی پاشا کے قتل کے بعد اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے لیکن وہ اپنے سپاہیوں کا رنگ دیکھ کر کوئی فیصلہ کن قدم بڑھانے میں تامل کرتے تھے۔ مقدونیا اور ادرنہ کے فوجی دستے جو اناطولیہ سے لائے گئے تھے، یا تو انجمن کے طرفدار تھے یا حکومت کی وفاداری میں متزلزل۔ اس کی توقع نہ تھی کہ سپاہیوں کا بڑا حصہ عبدالحمید کا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اپنے ساتھیوں پر گولی چلائے گا۔ بلغاری کسان جن کو انجمن نے اسلحہ دے دیے تھے عام بغاوت میں حصہ لینے کے لیے ہر قسم کے مستعد تھے اور دس ہزار البانی جو استبداد کے حامیوں پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار تھے۔

مناستر پر قبضہ: سلطان نے دیکھا کہ سختی سے کام نہیں چلتا تو اب نرمی کا اظہار شروع کیا، چنانچہ ایک بڑی رقم قرض لے کر سالونیکا کی فوج کی تنخواہ جو مدت سے ادا نہیں کی گئی تھی فوراً دے دی جائے اور مقدونیا کے وہ اڑتالیس فوجی افسر جو ۸ جولائی کو گرفتار کیے گئے تھے رہا کر دیے گئے لیکن یہ تدبیر بھی بے اثر ثابت ہوئی۔ ۲۲ جولائی کو نیازی بے نے ایک ہزار آدمیوں کی جمعیت سے مناستر پر رات کی تاریکی میں دفعۃً قبضہ کر لیا اور عثمان پاشا کو گرفتار کر کے اوخریدا میں نظر بند کر دیا۔ اس کے بعد سالونیکا کمیٹی نے عثمان پاشا کی طرف سے مندرجہ ذیل تار سلطان کی خدمت میں روانہ کیا:

> "میں فوج کے ہاتھ میں ہوں جس نے قسم کھائی ہے کہ اگر دستور فوراً عطا نہ کیا گیا تو وہ قسطنطنیہ پر حملہ کر دے گی اور میں ادب کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ میرا مقصد فوج کی قیادت کرنے کا ہے۔"

اسی روز ایک لاکھ البانیوں نے فیریزووچ (Feerezorvich) کے مقام پر

جذب کر کے نوجوان ترکوں کی تحریک آزادی میں شریک ہونے کو باقاعدہ اعلان کیا اور اسکوب سے براہ راست سلطان کے پاس یہ اطلاع بھیجی گئی کہ انہوں نے دستوری حکومت کی حمایت کا حلف لے لیا ہے۔ (۱)

یلدیز کی سراسیمگی: ان خبروں کے پے در پے پہنچنے سے قصر یلدیز میں سراسیمگی کے آثار نمایاں ہونے لگے، ۲۲ر جولائی کو سلطان نے فرید پاشا کو معزول کر کے اس کی جگہ کوچک سعید پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، اسی روز رات کو مجلس وزرا کا اجلاس ہوا جس میں بغاوت مقدونیہ پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی، لیکن وزرا سلطان کے مزاج سے واقف ہونے کی وجہ سے اپنے اصلی خیالات کے اظہار سے گریز کرتے تھے، آخر دربار کا پرانا عرب نجومی ابوالہدیٰ جو بہت ضعیف اور بیمار تھا پالکی میں لایا گیا، اس نے وہی کہا جسے زبان پر لاتے ہوئے وزراء ڈر رہے تھے یعنی تخت کو محفوظ رکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ بلا تاخیر دستوری حکومت کا اعلان کر دیا جائے۔ سلطان دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا تمام باتیں سن رہا تھا لیکن اب بھی خاموش تھا، ۲۳ر جولائی کو علی الصباح مجلس برخاست ہوئی مگر اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

دستوری حکومت کا اعلان: اسی روز "انجمن اتحاد و ترقی" نے حلمی پاشا کو جو ولایات مقدونیہ کے انسپکٹر جنرل تھے یہ الٹی میٹم دیا کہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر دستوری حکومت کا اعلان نہ کر دیا گیا تو وہ قتل کر دیے جائیں گے، ساتھ ہی انجمن کی طرف سے بذریعہ تار سلطان کو بھی اطلاع دی گئی کہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر دستوری حکومت کا اعلان نہ کیا گیا تو انقلابی فوجیں قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو جائیں گی، ان اطلاعات کے پہنچنے پر معاملہ کی پوری اہمیت سلطان کے سامنے آ گئی، اسے یقین ہو گیا کہ اب یہ شورش دبنے والی نہیں اور اگر انجمن کا مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو خانہ جنگی شروع ہو جائے گی، جس کا نتیجہ خود اس کے حق میں بہت برا ہوگا، چنانچہ ۲۳ر جولائی کو رات کے وقت جب مجلس وزرا کا اجلاس

---

(۱) "مسائل مشرق وسطیٰ" از ہنگٹن جملٹن ص ۳۱-۳۰

پھر منعقد ہوا اور اس میں دستوری حکومت کے اعلان پر سب نے اتفاق کیا تو سعید پاشا یہ عرض داشت لے کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ سلطان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا اور مجلس وزرا کی عرض داشت پیش کرتے وقت اپنی جان کے لیے ڈر رہا تھا لیکن سلطان اب واقعات کی منطق سے قائل ہو چکا تھا، اس نے بلا تامل اس درخواست پر اپنی منظوری تحریر کر دی۔

۲۴/جولائی کو علی الصباح بذریعہ تار ”انجمن اتحاد وترقی“ کو اطلاع دی گئی کہ سلطان نے دستوری حکومت کا قیام منظور فرما لیا، تھوڑی دیر میں پوری سلطنت میں یہ خبر پھیل گئی اور ہر طرف شادیانے بجنے لگے، خصوصاً مقدونیہ میں مسرت کا ایک سمندر لہریں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا، انور بے نے اعلان کیا کہ ”استبدادی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور آج سے ہم سب بھائی بھائی ہیں، اب نہ کوئی بلغاری ہے نہ یونانی، نہ رومانی ہے نہ یہودی، نہ ترک، اس نیلگوں آسمان کے نیچے ہم سب برابر ہیں اور صرف عثمانی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔“

دستوری حکومت کا اعلان ترکوں کے لیے خاص طور پر باعث مسرت تھا، سلطان عبدالحمید کے استبداد کی سختیاں زیادہ تر انہیں کو جھیلنی پڑتی تھیں، عیسائی اور دوسری مسلمان قومیں نسبتاً آزاد تھیں، ترکوں پر ہر وقت ایک خوف طاری رہتا تھا، جس نے ان کی زندگی تلخ کر دی تھی، پکسٹن لکھتا ہے: ”بڑے سے بڑا ترک بھی جاسوسی کی زد سے محفوظ نہ تھا اور چھوٹے سے چھوٹا سخت گیری سے، تعلیم یافتہ طبقوں میں مشکل سے کوئی گھر ایسا تھا جہاں کسی فرد خاندان کی مشتبہ موت کا ماتم یا اس کی ناگہانی جلاوطنی کی یاد تازہ نہ رہی ہو، اب یہ تمام باتیں رخصت ہو گئیں، لوگ آزادی سے سانس لینے لگے، تیس برس کے بعد پہلی مرتبہ وہ کھل کر باتیں کر سکتے تھے، پڑھ سکتے تھے، اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کر سکتے تھے، غیر ملکیوں سے مل جل سکتے تھے اور ادھر ادھر سفر کر سکتے تھے، ایک نوجوان ترک نے مجھ سے بیان کیا کہ ”اب تک میں زندہ تھا ہی نہیں“(۱)

”ترکی کی حالت انقلاب میں“ ص ۱۰۹

لیکن اس جوشِ مسرت میں بھی ترکوں نے اپنی خلقی سنجیدگی اور متانت برابر قائم رکھی، مسٹر نائٹ جو اس انقلاب کے زمانہ میں قسطنطنیہ میں موجود تھے بیان کرتے ہیں: ”قسطنطنیہ نے اپنے انقلاب کی پذیرائی دانشمندانہ طریقہ پر کی، تمام پرانی بندشیں ٹوٹ چکی تھیں، لیکن آزادی نے مطلق العنانی کی صورت نہیں اختیار کی تھی، مطبوعات کا احتساب گو اب نہیں رہ گیا تھا، تاہم ترکی پریس اپنے لب ولہجہ میں باوقار اعتدال برت رہا تھا، دارالسلطنت میں بھیڑ کی بھیڑ سیاسی جلسوں میں شریک ہوتی تھی لیکن نہ کوئی نقضِ امن تھا نہ پولیس یا فوج کی ضرورت تھی، علاوہ اس موقع کے جب یونانیوں نے انتخابات کے دوران میں مظاہرے کیے، یہ لوگ اس وقت تک خوش نہیں رہ سکتے جب تک کوئی حقیقی یا خیالی شکایت شور وغل مچانے کے لیے انھیں حاصل نہ ہو۔“(۱)

خط ہمایوں یکم اگست ۱۹۰۸ء: دستوری حکومت کے اعلان کے ایک ہفتہ بعد یکم اگست ۱۹۰۸ء کو سلطان عبدالحمید نے ایک فرمان شائع کیا، جس میں مندرجہ ذیل امور کی تصریح کی گئی۔

(۱) تمام عثمانی رعایا کو بغیر کسی نسلی امتیاز کے ذاتی آزادی حاصل ہوگی اور حقوق اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے سب برابر ہوں گے۔

(۲) قانونی وجوہ کے بغیر کسی شخص سے نہ جواب طلب کیا جائے گا نہ اسے گرفتار یا قید کیا جائے گا نہ کسی طریقے پر سزا دی جائے گی۔

(۳) غیر معمولی عدالتیں بند کر دی جائیں گی اور عدالت مجاز کے شعبہ سے باہر کوئی شخص قانوناً طلب نہ کیا جائے گا۔

(۴) قانونی صورت کے علاوہ کسی شخص کے مکان میں داخل ہونے یا اس کے مکان کی نگرانی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۵) حکومت کے عہدہ دار بڑے ہوں یا چھوٹے کسی شخص کو قتل کی سزا نہ دیں

---

(۱) بیداری ترکی، ص ۲۲۲

کے بجز اس صورت کے جس کی تصریح قانون نے کر دی ہو۔

(۶) سلطان کی تمام رعایا کو حق حاصل ہوگا کہ جہاں چاہے بود و باش اختیار کرے اور جس سے چاہے میل جول رکھے۔

(۷) پریس کا احتساب منسوخ کر دیا جائے گا، خطوط و اخبارات راستہ میں روکے نہ جائیں گے، پولیس کے جرائم کی تفتیش معمولی عدالتوں میں ہوگی۔

(۸) تعلیم بلا معاوضہ ہوگی۔

(۹) حکومت کے عہدہ دار قانون کے ذمہ دار ہوں گے اور خلاف قانون احکام کی تعمیل پر مجبور نہ کیے جائیں گے۔

(۱۰) شیخ الاسلام، وزیر جنگ اور وزیر بحریہ کے سوا تمام وزیروں کا انتخاب صدر اعظم کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ منظوری کے لیے ان کے نام سلطان کی خدمت میں پیش کرے گا، صدر اعظم ہی سفارت خانے کے عہدہ داروں، والیوں اور کونسل آف اسٹیٹ کے ممبروں کو بھی منتخب کرے گا اور اس انتخاب میں وزیر خارجہ، وزیر داخلہ اور پریذیڈنٹ کونسل آف اسٹیٹ کی منظوری حاصل کرے گا، جہاں تک کہ ان سے تعلق ہوگا۔

دفعات (۱۲،۱۱) میں وہ فرائض مذکور تھے جن کا تعلق صوبوں کے عہدہ داروں سے تھا

دفعہ (۱۳) میزانیہ (بجٹ) سے متعلق تھا اور اس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ بجٹ ہر سال کے شروع میں شائع کر دیا جائے گا۔

(۱۴) وزارتوں اور ولایتوں سے متعلق مروجہ قوانین پر نظر ثانی کرنے کے بعد موجودہ ضروریات کے لحاظ سے ان میں ترمیم کرنے کے لیے تجویزیں مرتب کی جائیں گی تاکہ جب عنقریب مجلس نائبین کا اجلاس ہو تو وہ اس کے سامنے پیش کی جائیں۔

(۱۵) فوج کو ترقی دی جائے اور اسلحہ میں اصلاحات جاری کی جائیں۔(۱)

ایک اعتراض: نوجوان ترکوں نے "خط ہمایوں" کی دفعہ (۱۰) پر یہ اعتراض کیا کہ

---

(۱) "مسائل شرق وسطی" ص ۴۳-۴۲

شیخ الاسلام، وزیر جنگ اور وزیر بحریہ کا انتخاب سلطان نے اپنے ہاتھ میں رکھا، حالاں کہ ۱۸۷۶ء کے دستور اساسی کے مطابق ان کا تقرر بھی صدر اعظم کے حقوق میں داخل تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر شیخ الاسلام جمال الدین آفندی نے ۲ راگست کو اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا، اس کے بعد انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں کا ایک وفد صدر اعظم سعید پاشا کے پاس آیا اور اسے دفعہ زیر بحث کی خرابی کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے بتایا کہ جنگ و بحریہ کے محکمے جن کے افسرانِ اعلیٰ کا تقرر سلطان نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، اصلاح کے سب سے زیادہ محتاج ہیں، اس الزام کے بعد سعید پاشا نے صدارت سے علاحدہ ہو جانا مناسب خیال کیا اور ۵ راگست کو استعفا دے دیا، ساتھ ہی وزارت کے دوسرے ارکان بھی مستعفی ہو گئے، ۶ راگست کو سلطان نے کامل پاشا کو جو ایک معمر اور آزمودہ کار مدبر تھا اور اس سے قبل کئی بار صدر اعظم رہ چکا تھا، سعید پاشا کی جگہ مقرر کر کے ایک نئی وزارت قائم کرنے کا حکم دیا اور دوسرے وزیروں کی طرح وزیر جنگ اور وزیر بحریہ کے انتخاب کا اختیار بھی صدر اعظم ہی کو دے دیا، کامل پاشا نے اپنی کابینہ میں ایک یونانی اور ایک آرمنی وزیر کو بھی داخل کیا۔

نئی وزارت: نئی وزارت نے حکومت کے مختلف شعبوں میں اصلاحات کا کام شروع کر دیا اور اب ہر طرف ایک نئی روح محسوس کی جانے لگی، ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں حکومت کا اعتماد رعایا کے دلوں میں قائم ہو گیا، ”انجمن اتحاد و ترقی“ کے ارکان میں بہت کم ایسے تھے جن کو نظم و نسق، فن سفارت (ڈپلومیسی) یا مالیات کا تجربہ تھا اور وہ اپنی اس کمی سے واقف بھی تھے، چنانچہ اس پر نظر رکھتے ہوئے انھوں نے حکومت کے سابق اعلیٰ عہدہ داروں کو ان کی جگہ پر برقرار رکھا اور ان کی لیاقت اور تجربہ سے فائدہ اٹھایا، البتہ ان عہدہ داروں کو جو رشوت خواری میں مشہور تھے برطرف کر دیا، جو لوگ برقرار رکھے گئے ان کی بھی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور اگر وہ دستور اساسی کے خلاف کچھ بھی کرتے تو فوراً علاحدہ کر دیے جاتے تھے، چوں کہ یہ عہدہ دار حقیقتاً سلطنت کے خیر خواہ

تھے، اس لیے انجمن کو ان سے کام لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس درمیان میں انجمن اپنے ارکان کی ایک جماعت کو انتظامی امور کی تعلیم دے کر حکومت کے مختلف محکموں کے لیے تیار کر رہی تھی، نوجوان ترکوں نے اپنی لیاقت کا سکہ بیرونی حکومتوں پر بھی بٹھا دیا۔ انھوں نے دول عظمیٰ کو لکھ کر مقدونیا میں ان کی نگرانی کی اب مطلق ضرورت نہیں، چنانچہ یوروپین افسر واپس بلا لیے گئے اور بین الاقوامی کمیشن برخاست کر دیا گیا۔

دستور اساسی کے اعلان اور پارلیمنٹ کے افتتاح کے درمیانی چار مہینوں میں ''انجمن اتحاد و ترقی'' سلطنت کی حقیقی فرماں روا تھی، یہ جو احکام چاہتی سلطان سے صادر کراتی، فوجوں کی نقل و حرکت تمام تر اسی کے ہاتھ میں تھی، وزراء، صوبوں کے گورنر اور دوسرے اعلیٰ عہدہ دار اسی کے حکم سے مقرر یا معزول ہوتے تھے، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں کہ ''انجمن کے ان ناتجربہ کار نوجوانوں نے ایک جدید نظام کو بروئے کار لانے اور اپنے ملک کی ان کثیر التعداد خطرات سے حفاظت کرنے میں جن سے نئی حاصل کی ہوئی آزادی بربادی کی زد میں تھی ایسی دانشمندی، موقع شناسی، میانہ روی، فراست اور پیش بینی دکھائی کہ غیر ملکی اشخاص اس کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ رہ گئے، انھوں نے امن و امان کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا اور اس چیز میں خود قوم کے شاندار ضبط نفس اور حب وطن سے انھیں بڑی مدد ملی، اگرچہ وہ خود اور ان کے علاوہ ہزاروں آدمی استبداد اور اس کے کاسہ لیسوں کے مظالم اور غارت گری کا شکار رہ چکے تھے پھر بھی ان کی طرف سے انتقام کا کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوا، انھوں نے صرف ان لوگوں کو سزائیں دیں جن کے جرائم نہایت سخت تھے، انھی لوگوں کو برطرف کیا جنھوں نے اپنے افعال سے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ دستور اساسی کے لیے خطرہ کا باعث ہیں، باقی سب کو صاف دلی سے معاف کر دیا، بیرونی طاقتوں سے ترکی کے تعلقات موقع شناسی اور مدبرانہ سیاست دانی کے ساتھ قائم کیے گئے، ان سے غلطیاں غیر معمولی طور پر کم ہوئیں۔''(۱)

---

(۱) بیداری ترکی ص ۴۴۳-۴۴۴

انجمن اتحاد پر یورپ کا پہلا وار: لیکن نوجوان ترکوں کی صلح جوئی ان طاقتوں کی حرص و آز کو کم نہ کر سکی، جو دولت علیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہر موقع پر تیار رہتی تھیں، دستوری اساسی کے اعلان کے بعد سلطنت کی تمام رعایا کو دستوری آزادی حاصل ہو گئی تھی مگر اس کے دو صوبے بوسنیا اور ہرزی گووینا جو تیس برس سے آسٹریا کی نگرانی میں تھے استبداد کی زنجیروں سے اب بھی رہا نہ ہوئے، حکومت آسٹریا ان صوبوں کو دستوری آزادی دینے پر راضی نہ ہوئی، چنانچہ جب ترکی پریس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ دستور کا نفاذ بوسنیا اور ہرزی گووینا میں بھی کر دیا جائے جو آسٹریا کی نگرانی کے باوجود سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی میں داخل ہیں تو آسٹریا کو سخت تشویش ہوئی اور اس نے یہ دیکھ کر کہ ترکی اس وقت مقابلہ کی قوت نہیں رکھتی اور ''انجمن اتحاد و ترقی'' ایک طاقتور سلطنت سے الجھ کر اپنے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہ کرے گی، ۷/ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو دفعۃً ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر نائٹ لکھتے ہیں: ''یہ وہی پرانا قصہ تھا یعنی ایک رجعت پسند عیسائی حکومت اس خوف سے کہ ایک اصلاح شدہ ترکی کہیں ایک طاقتور ترکی نہ بن جائے، فریب کے ذریعہ سے اس کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی، آسٹریا کے اس فعل نے رجعت پسندوں کو قدیم نظام حکومت کے از سر نو قائم کرنے کا آخری موقع بہم پہنچایا اور انھوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا''(۱)

بوسنیا اور ہرزی گووینا کے الحاق سے دو ہی روز قبل مشرقی رومیلیا کے والی نے جو بلغاریا کا فرماں روا تھا، زار بلغاریا کا قدیم لقب اختیار کر لیا تھا، پھر ۱۲/ اکتوبر کو کریٹ نے بھی مملکت یونان سے اپنے الحاق کا اعلان کر دیا۔

انجمن کا سیاسی پروگرام: اس درمیان میں مجلس ملی (پارلیمنٹ) کے انتخابات کی تیاریاں ہو رہی تھیں، سلطنت کے ہر حصہ میں دستوری حکومت کے استقبال کے لیے انتہائی جوش و خروش کا اظہار کیا جا رہا تھا، انجمن اتحاد و ترقی نے ۲۳/ ستمبر کو اپنا سیاسی پروگرام

---

(۱) بیداری ترکی ص ۲۶۱

شائع کیا جس کی پابندی انجمن کے امیدواروں پر جو منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں جائیں عائد کی گئی۔ اس پروگرام کی اہم دفعات حسب ذیل تھیں:

(۱) کابینہ کو مجلس نائبین (Chamber of Deputies) کا جواب دہ ہونا چاہیے۔

(۲) ترکی زبان بدستور سلطنت کی سرکاری زبان رہے گی۔

(۳) تمام قوموں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

(۴) غیر مسلم بھی فوجی خدمت کے ذمہ دار ہوں گے۔

(۵) فوجی خدمت کی میعاد میں تخفیف کر دی جائے گی۔

(۶) جن کسانوں کے پاس زمینیں نہیں ہیں انھیں زمینوں کے حاصل کرنے میں مدد دی جائے گی مگر اس طرح کہ موجودہ زمینداروں کو نقصان نہ پہنچے۔

(۷) تعلیم بلا معاوضہ اور جبری ہوگی۔ (۱)

پارلیمنٹ کا افتتاح: ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۸ء کو سلطان عبدالحمید نے پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں دستور کے تحفظ کا وعدہ کیا۔ مجلس نائبین میں عیسائی اور دوسری محکوم قوموں کے نمایندے بہت کافی تعداد میں منتخب ہو کر آئے تھے۔ ممبروں نے مجلس کی کارروائیوں اور اپنی تقریروں میں جس قابلیت کا ثبوت دیا، وہ انگلستان کے مدبروں کے لیے خلاف توقع ثابت ہوئی۔ سلطنت عثمانیہ کے باشندے ان کے خیال میں آئینی حکومت کے اہل نہ تھے، ترکی پارلیمنٹ نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا۔

جوابی انقلاب: نوجوان ترکوں نے دستوری حکومت کو کامیاب بنانے کی انتہائی کوشش کی مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد رجعت پسندوں کی سازشیں رنگ لانے لگیں۔ انجمن اتحاد و ترقی نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ جاسوسوں کی زبردست فوج کو جس پر بارہ لاکھ پونڈ سالانہ خرچ ہوتے تھے یک قلم برخاست کر دیا جس سے ہزاروں آدمی دفعۃً بے روزگار ہو گئے۔ یہ لوگ قدرتی طور پر انجمن کی مخالفت میں کوشاں تھے، علاوہ بریں نئی وزارت

---

(۱) بیداری ترکی ص ۲۹۳-۲۹۴

نے مختلف شعبوں کی اصلاح کے سلسلہ میں سیکڑوں آدمیوں کو جو شخصی قصر یلدیز کے زیر اثر مقرر کردیے گئے تھے اور حقیقتاً بے ضرورت اور بے کار تھے نکال دیا تھا، انھوں نے بھی انجمن کی مخالفت پر کمر باندھ لی، ان کو رجعت پسند ملاؤں کی تائید حاصل تھی، ''جمعیۃ محمدیہ'' کے نام سے ایک نئی انجمن چند دنوں سے قائم کرلی گئی تھی، جس کا اثر مسلمانوں میں روز بروز زیادہ پھیلتا جاتا تھا، یہ جمعیۃ اپنے کو دستوری حکومت کا حامی ظاہر کرتی تھی لیکن وہ تمام امور میں صرف شریعت اسلامی کا نفاذ چاہتی تھی اور اصول شریعت کے خلاف کسی قانون کو گوارا نہیں کرتی تھی، یہ انجمن اتحاد و ترقی کی اس بنا پر مخالف تھی کہ اس کے نزدیک انجمن کے ممبر جن میں فوج کے نوجوان افسر بھی شامل تھے، احکام قرآنی کے پابند نہ تھے اور اپنے غیر مذہبی طریقوں سے عوام کے لیے ایک بری مثال قائم کررہے تھے، ایک طاقتور جماعت لبرل یونین کی تھی، جس میں مسلمان، عیسائی اور دوسرے فرقوں کے لوگ شامل تھے، اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر فرقہ کو حکومت خود اختیاری کے حقوق دے دیے جائیں کہ وہ جس طرح چاہے اپنے معاملات کا انتظام کرے، نوجوان ترک جن کا اصلی نصب العین اتحاد تھا، لبرل یونین کے نظریہ کو ملک کے لیے خطرناک سمجھتے تھے، ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے مخالفوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا، جن کو حقیقتاً نہ مذہب سے سروکار تھا نہ ملکی فلاح و بہبود سے بلکہ وہ دستوری حکومت کے اس وجہ سے دشمن تھے کہ اس میں ان کو رشوت ستانی اور مفت خوری کے وہ مواقع حاصل نہ تھے جن سے دور استبداد میں وہ پورا فائدہ اٹھا رہے تھے، نئی وزارت نے ایک غلطی یہ کی تھی کہ نہ صرف ان سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا تھا، جو سلطان کے حکم سے قید کیے گئے تھے بلکہ دوسرے شدید جرائم کے مجرموں کو بھی چھوڑ دیا تھا، یہ جرائم پیشہ گروہ رجعت پسندوں کے لیے ایک اچھا آلۂ کار ثابت ہوا۔

غرض مخالف عناصر تیزی کے ساتھ جمع ہورہے تھے، انجمن اتحاد و ترقی کو فوج پر پورا اعتماد تھا مگر رجعت پسندوں کی خفیہ کوششوں سے وہ بھی قدیم نظام حکومت کی حامی بن چکی تھی، انجمن کو اس کا علم اس وقت ہوا جب ۱۳؍ اپریل ۱۹۰۹ء کو قسطنطنیہ کے فوجی دستوں

میں دفعۃً بغاوت برپا ہوگئی، باغیوں میں کوئی لیڈر ایسا نہ تھا جو خاص شہرت یا اثر رکھتا ہو، سلطان عبدالحمید نے اس شورش میں بظاہر کوئی حصہ نہ لیا، تاہم ابتدا میں باغی کامیاب رہے، وزیروں، پارلیمنٹ کے ممبروں اور انجمن اتحاد و ترقی کے دوسرے ممبروں کو اپنی جان کی خاطر قسطنطنیہ سے بھاگنا پڑا فوج نے پارلیمنٹ ہاؤس پر قبضہ کرلیا اور اپنے متعدد افسروں کو جو انجمن کے ممبر تھے قتل کردیا، وزیر عدالت بھی قتل کردیا گیا، وزیر بحریہ پر بھی گولی چلی مگر وہ زخمی ہوکر بچ گیا، اس کے علاوہ نوجوان ترکوں کی ایک بڑی تعداد ماری گئی، انجمن کے دشمنوں نے اس بغاوت کو مذہبی رنگ دے دیا تھا، خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں کہ "یہ بڑی خونریز اور ناپاک شورش تھی، بہت سے نوجوان محض اس لیے قتل کردیے گئے کہ وہ کالر لگاتے تھے، کالر مذہب کی شدید مخالفت سمجھا جاتا تھا۔"

بغاوت کا استیصال: بغاوت کی خبر جب سالونیکا پہنچی تو انجمن اتحاد و ترقی نے فوراً محمود شوکت پاشا کو جو افواج مقدونیا کے سپہ سالار تھے قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا، سان اسٹیفنو کے مقام پر محمود شوکت کی ان وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے ملاقات ہوئی، جو قسطنطنیہ سے بھاگ کر آئے تھے، وہیں پارلیمنٹ کا اجلاس کیا گیا اور ممبروں نے متفقہ طور پر محمود شوکت پاشا کی یہ تجویزیں منظور کیں کہ فوجی قانون جاری کردیا جائے، باغیوں کو سزائیں دی جائیں اور قسطنطنیہ کا فوجی دستہ توڑ دیا جائے، ۲۵/اپریل کو محمود شوکت پاشا اپنی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوئے، پانچ گھنٹے کی سخت لڑائی کے بعد جس میں توپیں بھی چلیں، باغی فوج مغلوب ہوئی، بغاوت کے بانیوں کو سخت سزائیں ملیں، ان کے چالیس بڑے بڑے لیڈروں کو منظر عام پر پھانسی دے دی گئی۔

سلطان کی معزولی: ۲۷/اپریل کو مجلس ملی کا اجلاس منعقد ہوا اور سب سے پہلے اس کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ سلطان کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے، رائے عامہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اس بغاوت میں در پردہ سلطان کی حمایت بھی شامل تھی، گو بظاہر اس نے باغیوں کو کسی طرح کی مدد نہیں دی تھی، شیخ الاسلام سے استفتا کیا گیا، اس نے معزولی کا فتویٰ دیا،

اس فتوے کے بعد مجلس ملی نے بالاتفاق سلطان کی معزولی کی تجویز منظور کر لی اور اپنے فیصلہ کی اطلاع دینے کے لیے ایک وفد قصر یلدیز کو روانہ کیا۔ جوابی انقلاب کی ناکامی کے بعد سلطان انجمن اتحاد و ترقی کے رحم و کرم پر تھا۔ اس نے مجلس ملی کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور خاموشی کے ساتھ تخت سے علاحدہ ہو گیا۔ دوسرے روز وہ سالونیکا روانہ کر دیا گیا اور وہاں ۱۹۱۸ء میں اپنی وفات تک نظر بند رہا۔ مجلس ملی نے اس کے بھائی شہزادہ محمد رشاد کو جو تیس سال سے نظر بندی کی زندگی بسر کر رہا تھا محمد خامس کے نام سے تخت پر بٹھایا۔

☆ ☆ ☆

نوجوان ترک

دستوری حکومت کے پہلے دو مہینے عثمانی تاریخ میں یادگار رہیں گے، یہ وہ دور تھا جب سلطنت عثمانیہ کی تمام قومیں صرف ایک نصب العین رکھتی تھیں اور ان کے دل اتحاد واخوت کے جذبات سے سرشار تھے، خالدہ ادیب خانم اپنے خطبات میں لکھتی ہیں ”جس شخص نے ترکی کا وہ زمانہ دیکھا ہے اسے یاد کر کے بے چین ہو جاتا ہے، اس میں انقلاب فرانس کی سرمستیاں موجود تھیں مگر وہ خونریزیاں نہ تھیں، لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کے بجائے فرط محبت سے گلے ملتے تھے“(۱) لیکن اخوت ومحبت کا یہ جوش جلد ٹھنڈا ہو گیا اور جب نوجوان ترکوں نے مختلف قوموں کو باہم متحد کر کے ایک عثمانی قوم کی تشکیل کرنی چاہی تو افتراق کے آثار پھر نمایاں ہونے لگے۔

اندرونی مخالفتیں، عیسائی: مخالفت سب سے پہلے عیسائیوں کی طرف سے شروع ہوئی، جدید دستور نے انہیں شہریت کے وہ تمام حقوق دے دیے تھے جو ترکوں کو حاصل تھے اور وہ ان حقوق سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش یہ تھی کہ شہریت کے ساتھ جو فرائض وابستہ ہیں ان سے بچے رہیں، چنانچہ حکومت کی طرف سے فوجی خدمت عیسائیوں پر بھی عائد کی گئی جو صدیوں سے اس سے مستثنیٰ تھے تو ارباب کلیسا نے صدائے احتجاج بلند کی، ایک متحدہ قومیت کے نصب العین کو سامنے رکھ کر انجمن اتحاد وترقی نے ابتدائی مدارس میں ترکی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی تھی، پادریوں نے

---

(۱) ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ص ۵۔

اس پر ایک ہنگامہ برپا کر دیا کہ عیسائی جبر ترک بنائے جا رہے ہیں، اصل یہ ہے کہ انقلاب کی سرمستیوں میں نوجوان ترک عیسائیوں کے حقیقی جذبات کا صحیح اندازہ نہ کر سکے، وہ اس جوش سے متاثر ہو گئے جو دفعۃً انقلاب کے افسوں سے سلطنت کی تمام قوموں میں پھیل گیا تھا، انھوں نے یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ مقدونیا کی عیسائی رعایا میں قومیت کا جذبہ بڑی حد تک پیدا ہو چکا ہے اور یونانی، سروی، بلغاری ہر جماعت میں قومی حکومت قائم کرنے کا حوصلہ پوری طرح موجود ہے، مقدونیا کے سرحدی علاقے جو پہلے سلطنت عثمانیہ کے صوبے تھے اور بتدریج خود مختار ہوتے گئے تھے، ان قوموں کو دولت علیہ کے خلاف برابر ابھارتے رہتے تھے، نہ صرف یہ بلکہ یونان، سرویا اور بلغاریا میں سے ہر ایک مقدونیا کے ان حصوں کو جن میں اس کے ہم قوم آباد تھے اپنی مملکت میں شامل کر لینا چاہتا تھا، انقلاب سے پہلے مقدونیا کی ساری بدامنی انھی حکومتوں کی سازشوں کا نتیجہ تھی، غرض دستوری حکومت کے قیام کے چند ہی ہفتوں بعد عیسائیوں نے از سر نو شورش برپا کر دی اور بلقان کی خود مختار ریاستوں نے انھیں مدد پہنچانی شروع کی۔

غیر ترک مسلمان: عیسائیوں کے علاوہ غیر ترک مسلمان مثلاً عرب، البانی، کرد وغیرہ بھی انجمن اتحاد و ترقی کی حکومت کے خلاف تھے، ان میں بھی اپنی انفرادی قومیت کا قوی احساس موجود تھا اور وہ متحدہ عثمانی قومیت میں ضم ہونے کے لیے تیار نہ تھے، علاوہ بریں چونکہ سلطان سے انھیں بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں اور وہ محصولوں اور فوجی خدمتوں سے بری تھے، اس لیے نئی حکومت کی پالیسی جو سلطنت کی تمام قوموں کو ایک سطح پر رکھنا چاہتی تھی اور حقوق و فرائض میں کوئی تفریق جائز نہیں رکھتی تھی، ان کو نہایت گراں تھی، مخصوص رعایتوں اور شاہانہ عطیوں کی وجہ سے ان کو جو وابستگی تھی وہ سلطان کی ذات سے تھی، چونکہ نئی حکومت نے سلطان کے اختیارات بہت محدود کر دیے تھے اس لیے یہ رعایتیں اور عطیے جاری نہیں رہ سکتے تھے، قدرتاً یہ لوگ حکومت کے مخالف ہو گئے، ذاتی اغراض کی سطح سے بلند ہو کر متحدہ قومیت کے مسئلہ پر نظر کرنے کی اہلیت ان میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

ترک: خود ترکوں میں بھی ایک بڑی تعداد نئی حکومت کی مخالف تھی، ان کا قدامت پسند طبقہ نوجوان ترکوں کی مغربی روش سے بیزار تھا، مذہبی جماعت کی ترجمانی جمعیۃ محمد کررہی تھی، جاسوسوں کا گروہ جو انقلاب کے بعد بے روزگاری اور ذلت میں مبتلا ہوگیا تھا، انجمن اتحاد و ترقی کا دلی دشمن تھا اور یہ ہر اس جماعت کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا جو انجمن کی مخالفت میں قایم کی جائے، یہی حال ان سیکڑوں عہدہ داروں کا تھا جو دستوری حکومت کے قیام کے بعد بے کار محض ہونے کی وجہ سے برطرف کردیے گئے تھے، جوابی انقلاب ان سب جماعتوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا، محمود شوکت پاشا نے باغیوں کو سزائیں دے کر اس شورش کو فرو کردیا تھا لیکن مخالفت کے عناصر اب بھی موجود تھے اور نئی حکومت کو گوناگوں دشواریاں پیش آرہی تھیں۔

بیرونی دشمن: اندرونی مخالفتوں اور سرحدی حکومتوں کی ریشہ دوانیوں کے علاوہ انجمن اتحاد و ترقی کو دول عظمیٰ کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا، ان میں انگلستان کا طرز عمل سب سے زیادہ معاندانہ تھا، انگلستان کے اخباروں نے نئی حکومت کے خلاف زبردست پروپیگنڈا شروع کردیا، حالاں کہ انقلاب سے پہلے تمام مغربی پریس عبدالحمید کی مخالفت اور دستوری حکومت کی تائید میں یک زبان تھا، خالدہ ادیب خانم نے آبرے ہربرٹ کی یہ رائے نقل کی ہے کہ انگلستان کی حریت پسند جماعت اصلاحات کو پسند کرتی ہے مگر اسے انقلاب سے نفرت ہے، وہ لکھتا ہے ''نوجوان ترکوں کی مخالفت میں اتنی قوتیں جمع ہوگئی تھیں کہ اگر ان کے لیڈران بلند اصولوں پر جن کے وہ مدعی تھے استقلال کے ساتھ عمل بھی کرتے، تب بھی اس کا امکان نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ترکی کی تجدید کی کوشش میں کامیاب ہوں گے، یورپ ترکی کو اپنے دست نگر کی حیثیت سے پسند کرتا تھا، مدمقابل کی حیثیت سے نہیں۔''(۱)

روس اور آسٹریا کی اسکیم: مغربی حکومتوں کی روش سے آبرے ہربرٹ کی رائے کی

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۸۰

تصدیق پوری طرح ہوتی ہے، نوجوان ترکوں کے جوشِ عمل سے ان حکومتوں کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں کہیں اتنی قوت پھر نہ پیدا ہو جائے کہ اس کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے یوں ہی رہ جائیں، چنانچہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو روس اور آسٹریا کے وزرائے خارجہ نے مل کر ایک اسکیم مرتب کی جس کے رو سے دردانیال اور آبنائے باسفورس روسی منطقہ میں رکھے گئے اور بلغاریا روسی حلقۂ اثر میں داخل کیا گیا، مقدونیا آسٹریا کے منطقہ میں رکھا گیا اور سرویا آسٹریا کے حلقۂ اثر میں داخل کیا گیا، البانیا اطالوی منطقہ میں رکھا گیا اور یونان اطالوی حلقۂ اثر میں داخل کیا گیا (1)، اس اسکیم کا عملی نتیجہ چند ہی دنوں کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ ۵ر اکتوبر کو پرنس فرڈیننڈ نے جو دولت عثمانیہ کے زیر سیادت اپنے ملک کا حکمراں تھا کامل خودمختاری کا اعلان کر کے زار بلغاریا کا قدیم لقب اختیار کر لیا، اس کے دو روز بعد ۷ر اکتوبر کو آسٹریا ہنگری نے بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے پھر ۱۲ر اکتوبر کو کریٹ کی مجلس ملی نے یونان سے الحاق کی قرارداد منظور کر کے اس کا اعلان کر دیا۔

بلغاریا: معاہدۂ برلن کے رو سے بلغاریا دولت عثمانیہ کی ایک باج گذار مملکت تھی اور اس کے حکمرانوں کا تقرر سلطان کی نامزدگی سے عمل میں آتا تھا لیکن حقیقتاً بلغاریا کی خودمختاری ایک امر واقعہ بن چکی تھی اور ارباب اتحاد و ترقی کو امید نہ تھی کہ وہ اسے دوبارہ سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں لا سکیں گے، انھوں نے حالات کا اندازہ کر کے یہی مناسب خیال کیا کہ معاوضہ لے کر حقوق سیادت سے دست بردار ہو جائیں، باب عالی کی طرف سے جس رقم کا مطالبہ کیا گیا بلغاریا اسے دینے پر راضی نہ تھا، لیکن روس نے جو بلغاریا کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے چکا تھا، اپنے مطالبہ کی رقم سے جو اس کے نزدیک بطور سابق تاوانِ جنگ سلطنت عثمانیہ کے ذمہ واجب الادا تھی، وہ رقم محسوب کر دی جس پر آ کر معاملہ رک گیا تھا اور فریقین میں صلح کرا دی، چنانچہ اپریل ۱۹۰۹ء میں باب عالی اور

---

(1) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، چودھواں اڈیشن ج ۲۰ ص ۲۱۲

بلغاریہ کے درمیان جنگ کا سبب بن گیا ہوتا۔ مگر سلطان نے بلغاریہ کے کل حقوق فرمانروائی تسلیم کر لیے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا: بوسنیا و ہرزیگووینا کے صوبے برلن کانفرنس میں آسٹریا ہنگری نے چھین لیے تھے لیکن انہیں سلطنت میں شامل کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ یہ صوبے عملاً تو آسٹریا ہنگری کے زیر حکومت تھے جب تک عثمانی حکومت سلطان عبدالحمید کے ہاتھ میں رہی یورپ کی تمام دول اس کی سیاسی چالوں سے خائف رہتی تھیں۔ چنانچہ اتنے طویل عرصے کے بعد بھی آسٹریا ہنگری نے ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی جرات نہیں کی لیکن جب نوجوان ترک برسراقتدار ہوئے اور خود ترکی کے اندر انتشار کا زور شروع ہوا تو آسٹریا ہنگری نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دونوں صوبوں کو بے تکلف اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اب عثمانی نے احتجاج کیا لیکن چونکہ فوجی قوت کافی نہ تھی اس لیے بالآخر مصالحت ہو گئی۔ آسٹریا ہنگری نے ترکی کو چند لاکھ معاوضے کے علاوہ نووی بازار کا علاقہ ترکی کے حق میں واگذار کر دیا جس پر ۱۸۷۸ء کے بعد سے اب تک اس کا فوجی قبضہ چلا آتا تھا۔

طرابلس: ان دست درازیوں کا سلسلہ یہیں ختم نہ ہوا۔ انیسویں صدی کا زمانہ یورپ کے صنعتی انقلاب کا زمانہ تھا۔ صنعت و حرفت کی ترقی نے کل مصنوعات کے لیے نئے بازاروں کی ضرورت پیدا کر دی تھی اور افریقہ کی ساحلی حکومتیں جو پہلے سلطنت عثمانیہ میں شامل تھیں لیکن بعد میں سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خود مختار ہو گئی تھیں، اس مقصد کے لیے مغربی حکومتوں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھیں۔ چنانچہ فرانس نے الجزائر اور تونس پر قبضہ کر لیا اور انگلستان نے مصر میں اپنا تسلط قائم کیا ۱۹۰۴ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ انگلستان مصر پر بلا شرکت غیرے قابض رہے گا اور اس کے معاوضہ میں فرانس کو مراکش کی مملکت پر جو اس وقت تک آزاد تھی قبضہ کرنے میں مدد دے گا۔ اب افریقہ کی ساحلی حکومتوں میں صرف طرابلس

رہ گیا تھا جو مغربی طاقت کے پنجے میں نہیں آیا تھا، اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ طرابلس ایک ریگستانی علاقہ تھا، جس میں کہیں کہیں نخلستان نظر آجاتے تھے، اس کے ساحل پر کوئی بندرگاہ نہ تھی اور اس پر حکومت کرنے میں جو مصارف برداشت کرنے پڑتے ان کے معاوضہ کی کچھ زیادہ توقع نہ تھی یہی سبب تھا کہ فرانس اور انگلستان نے کبھی اس کی جانب توجہ نہیں کی، لیکن اٹلی جو نو آبادیات کے میدان میں ان دونوں سلطنتوں سے بہت پیچھے تھا اور ۱۸۸۱ء میں تونس پر فرانس کو قبضہ کرتے ہوئے دیکھ کر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا، اس کی نظر میں طرابلس ہی غنیمت معلوم ہوا، چنانچہ اطالوی وزارتِ خارجہ نے سلطان عبدالحمید کے عہد ہی میں یورپین حکومتوں سے یہ تسلیم کرا لیا تھا کہ جب سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات تقسیم ہونے لگیں گے تو طرابلس اٹلی کو دے دیا جائے گا، اس باب میں اٹلی نے متعدد معاہدوں کی بنا پر اپنا حق یہاں تک تسلیم کرا لیا تھا کہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب عثمانی کے وقت تمام یوروپین طاقتوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اسے جس وقت موقع ملے گا وہ فوراً طرابلس پر قبضہ کرلے گا اور یورپ کی کوئی حکومت اعتراض نہ کرے گی۔ (۱)

بیسویں صدی کے آغاز میں طرابلس سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا اور براہ راست باب عالی کے زیر حکومت تھا، اس کو حکومت خود اختیاری کے حقوق بھی حاصل نہ تھے جیسا کہ افریقہ کے دوسرے صوبوں نے حاصل کر لیے تھے، اس کی آبادی تمام تر مسلمانوں پر مشتمل تھی، شہر طرابلس اور دوسرے ساحلی مقامات پر ترک اور عرب آباد تھے اور اندرونی علاقوں میں نیم آزاد عرب قبائل تھے، یہاں کے باشندوں نے حکومت کی تبدیلی کی کبھی خواہش نہیں کی اور اٹلی کو ان کی طرف سے کسی شکایت کا موقع نہیں ملا، لارڈ ایورسلے جس کے قلم سے ترکوں کی حمایت میں ایک لفظ بھی مشکل سے نکلتا ہے اعتراف کرتا ہے کہ "طرابلس پر اٹلی کا حملہ تمام تر ایک جارحانہ فعل تھا، جس کی تحریک اس وجہ سے ہوئی کہ فرانس نے تونس پر قبضہ کر لیا تھا، جس پر جغرافیائی اور معاشیاتی دونوں

---

(۱) شیویل ص ۳۶۸

حیثیتوں سے اٹلی کا حق زیادہ مضبوط تھا، لیکن جمہوریہ فرانس اور برطانیہ عظمیٰ اٹلی کے اس فعل سے متفق ہو گئیں اور (یورپ کی) دونوں مرکزی سلطنتیں بھی اس وقت تک اٹلی کی حلیف تھیں۔"(۱)

جنگ طرابلس: ۱۹۱۰ء کے اختتام تک حکومت اٹلی برابر یہ اعلان کرتی آئی تھی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کے کسی حصہ کی خواہش مند نہیں ہے، جب یہ افواہ پھیلی کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو اس کے وزیر خارجہ نے ۲؍دسمبر ۱۹۱۰ء کو اطالوی پارلیمنٹ میں اس کی پرزور تردید کی اور کہا کہ "ہم سلطنت عثمانیہ کی بقاء وسلامتی کے خواہش مند ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ طرابلس ہمیشہ ترکوں کے قبضہ میں رہے۔" لیکن اس اعلان پر دس مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ حکومت اٹلی نے دفعۃً باب عالی کو الٹی میٹم دے دیا حالانکہ اس درمیان میں فریقین کے تعلقات میں مطلق کشیدگی نہیں پیدا ہوئی تھی اور جواب کا انتظار کیے بغیر پچاس ہزار فوج طرابلس پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کردی، اس کے جنگی جہازوں نے پریویسا کے شہر پر گولہ باری شروع کردی جو بحر ایڈریاٹک کے ساحل پر ترکوں کا مقبوضہ تھا اور بحر ایجین کے متعدد جزیروں پر قبضہ کرلیا، ترکی جہازوں نے دردانیال میں پناہ لی"۔ اٹلی کے مقابلہ میں ترکی جہازوں کی حیرت انگیز شکست کا سبب یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید نے اپنے عہد حکومت میں بحریہ کی طرف مطلق توجہ نہیں کی تھی اور چونکہ ۱۸۷۷ء کے بعد سے کسی بحری طاقت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لیے مدت سے ترکی جہاز شاخ زریں سے باہر بھی نہیں نکلے تھے، اگر عبدالحمید نے بحریہ کی طرف کچھ بھی توجہ کی ہوتی تو اٹلی کا طرابلس پر قابض ہونا قطعاً ناممکن تھا، کیوں کہ سلطان عبدالعزیز نے عثمانی بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ وہ اس زمانہ میں یورپ میں تیسرے نمبر پر شمار ہوتا تھا، طرابلس کے فوجی دستہ کی تعداد صرف بیس ہزار تھی، چونکہ سمندر پر اطالوی جہازوں کا قبضہ تھا، اس لیے جنگ شروع ہو جانے کے بعد بحری راستہ سے فوجی کمک بھی نہیں

---

(۱) ترکی سلطنت از ادوارڈ ایورسلے ص ۴۵۵

پہنچائی جاسکتی تھی، بری راستہ مصر کا تھا جو اس وقت تک سلطنت عثمانیہ کے زیر سیادت اور اس کا باج گذار تھا، لیکن مصر پر انگریزی تسلط قائم ہو چکا تھا اور حکومت برطانیہ نے ان سابق معاہدوں کی بنا پر جو طرابلس کی نسبت اٹلی سے ہو چکے تھے، مصر کی غیر جانبداری کا اعلان کر کے اس کی راہ سے ترکی فوجوں کو طرابلس جانے سے روک دیا، ان تمام مشکلات کے باوجود نوجوان ترکوں نے ایسی شجاعت سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا کہ وہ سراسیمہ ہو گئے، عرب قبائل جس جاں فروشی کے ساتھ وطن کی ایک ایک انچ زمین کے لیے آخر تک لڑتے رہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گی، اگرچہ بیرونی امداد کی تمام راہیں مسدود تھیں، تاہم اعلان جنگ کے چند ہی دنوں بعد انور بے کسی طرح پوشیدہ طور پر طرابلس پہنچ گئے تھے اور انھوں نے اپنی حیرت انگیز قابلیت سے پورے ملک کو فوجی کیمپ بنا دیا تھا، الہلال کلکتہ نے ان کے عجیب و غریب کارناموں کی جو تفصیل بیان کی ہے، اس کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج ہے۔

انور بے: انور بے نے طرابلس میں قدم رکھنے کے بعد اطراف و جوانب کے قبائل میں دعوت جہاد شروع کردی اور چند دنوں کے بعد خود انہی کی عظیم الشان صفیں اس کے یمین و یسار نیزے بلند کیے ہوئے جنگ آزما تھیں، وہی تن تنہا فرد مقدس دشمن کے بے شمار لشکر کے سامنے حریف نبرد و مصاف آکر کھڑا ہو گیا اور پھر پورے نو مہینوں کے اندر ایک دن بھی شکست و ہزیمت اس کے دامن عزت پر دھبہ نہ لگا سکی، تمام اہل عرب جن کو عثمانی خلافت کا قدیمی مخالف سمجھا جاتا تھا اوامر سلطانی کے آگے پوری اطاعت وفرماں برداری کے ساتھ جھک گئے اور آج عثمانی فوج کے مفہوم میں بلا کسی اختلاف وشبہ کے عربی افواج داخل ہیں، عربی فوج کے مرتب کرنے میں جو مشکلیں اجتماع کے بعد پیش آئیں وہ ابتدائی مشکلات سے کم نہ تھیں، سب سے پہلی مشکل مختلف قبائل کی عربی عصبیت اور ان کی باہمی بغض و مخالفت تھی، جو نسلاً بعد نسل قدیم سے چلی آتی ہے، انور بے نے تمام قبیلوں کو مختلف موثر اور دل میں اتر جانے والے طریقہ سے سمجھا کر (جو اس اعجاز آفریں سحر بیان کا

وصف مخصوص ہے) ان میں باہم رشتہ داریاں قائم کرا دیں اور اس طرح آتش دعوت جہاد کی بدولت صدیوں کی عداوت اور دشمنیاں عہد اخوت و مودت سے بدل گئیں، دوسری مشکل قبائل کی بے نظمی اور اصول جنگ سے ناواقفیت تھی۔ غازی انور بے نے بغیر اس کے کہ ایک لمحہ بھی فکر و تردد میں ضائع کرتے فوراً تمام قبائل کو چند پلٹنوں میں تقسیم کر دیا اور ہر پلٹن کی تعلیم کے لیے ایک افسر مقرر کر کے شب و روز قواعد کرانی شروع کرا دی۔ خود عربوں نے جب معلوم کر لیا کہ بغیر ان قواعد کے سیکھے ہم دشمنوں کے حملہ کا جواب نہ دے سکیں گے اور ان کی ابتدائی دست برد کا مقابلہ نہیں کیا جا سکے گا تو خود ان کے اندر جوش و غیرت نے ایک ایسی خارق عادت ذہانت اور قوت اخذ و تحصیل پیدا کر دی کہ مہینوں کی مشق ایک چوبیس گھنٹے کے اندر حاصل کرنے لگے۔ قبائل کی باہمی رقابت نے بھی اس موقع پر بڑی مدد کی، انور بے نے اعلان کر دیا کہ جو قبیلہ پہلے قواعد جنگ کے امتحان میں کامیاب ثابت ہو گا اس کو عزت و ناموری کے نشان کے طور پر ایک طلاکار اطلس کا علم دیا جائے گا، یہ سنتے ہی ہر قبیلہ مسابقت کی کوشش کرنے لگا، اور شب و روز پورا وقت فوجی نقل و حرکت اور قواعد کے سیکھنے اور مشق میں صرف ہونے لگا، اسی اثنا میں جب اطالویوں کی براتوں نے ایک دو قدم آگے بڑھانے اور بم کے گولے بکثرت آنے لگے تو قبیلہ حسا نے ایک دم ہجوم کر کے حملہ کر دیا اور سینکڑوں اطالویوں کو تلوار کے گھاٹ اتار کر بقیۃ السیف کو کوسوں دور بھگا دیا، انور بے نے اس کارنامہ کی بڑی قدر کی اور اس قبیلہ کو اپنا وضع کردہ نشان عزت (اطلسی علم) عطا فرمایا، دوسرے قبائل نے جب قبیلہ حسا کے خیموں پر اس طلاکار علم کو لہراتے دیکھا تو انور بے کے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ ہم کو بھی موقع دیا جائے کہ اس علم کے لینے کا استحقاق ثابت کریں، رات کے وقت جب اٹالین کیمپ طرابلس پر قابض ہونے کی خوشی میں بکثرت شراب پی کر بدمست پڑا تھا یکایک عرب قبائل کے صحرائی نعروں کی گونج سے ایک زلزلۂ عظیم محسوس ہوا چند لمحوں کے اندر بے تحاشا بھاگ گئے اور پورا اٹالین کیمپ خالی ہو گیا، اطالویوں کے

جبن و نامردی نے اہلِ عرب کو ان کے ابتدائی حملوں ہی میں فتح و نصرت کی ایسی چاٹ لگا دی کہ اب میدانِ قتال ان کے لیے بچوں کا کھیل بن کر رہ گیا۔ بغیر کسی نقصان کے انھوں نے کھیلتے کودتے ایک پوری اطالین پلٹن برباد کر دی اور بکثرت مالِ غنیمت ساتھ لیے ہوئے اور وطنی گیت گاتے ہوئے عثمانی کیمپ میں واپس آ کر اپنی فتوحات ڈھیر کر دیں۔ اس مالِ غنیمت میں آٹھ سو سے زیادہ تو بندوقیں تھیں اور اور قسم کی اشیا اس کے علاوہ۔ ان بندوقوں کی لوٹ سے انور بے بہت خوش ہوئے، کیوں کہ عدم اسلحہ کی کیمپ میں بہت کمی تھی۔ انور بے نے حکومت کے نام سے فوراً ان کا نیلام کر دیا اور وہ دو دو قرشی پر فروخت کر دی گئیں۔ اس خدمت کے صلہ میں ان کی آرزوئے دلی کے مطابق جانبازی کا خصوصی علم ان کو عطا کیا گیا۔ اس کے بعد تو ہر قبیلہ اس علم کے لیے اٹھنے لگا اور دشمن پر برقِ ہلاکت بن کر گرنے لگا، ہر قبیلہ کی کوشش ہوتی کہ دوسروں سے زیادہ تعداد میں دشمنوں کو قتل کریں اور سب سے زیادہ مالِ غنیمت انور بے کے سامنے انبار کریں تا کہ شجاعت و وطن پرستی کا اعلیٰ سے اعلیٰ نشان اور تمغہ صرف انہیں کو حاصل ہو، یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے کے اندر عثمانی کیمپ میں پندرہ ہزار سے زیادہ قیمتی اور جدید اطالوی بندوقیں جمع ہو گئیں۔“(۱)

صلح نامہ لوزان: اطالوی اس صورتِ حال سے بدحواس ہو گئے۔ انھوں نے شجاعت کا جواب درندگی سے دینا شروع کیا اور ایسے مظالم کیے کہ خود یورپین نامہ نگاروں نے جو اطالین فوج کے ساتھ طرابلس میں تھے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو وہ زیادہ زور بحری جنگ پر دینے لگے، چنانچہ مئی ۱۹۱۲ء میں روڈس اور بعض دوسرے جزائر ایجین پر قبضہ کر لیا، انھیں توقع تھی کہ ترک اب آسانی کے ساتھ صلح کے لیے راضی ہو جائیں گے، لیکن ترکوں نے صلح کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا، وہ اس وقت تک جنگ کو جاری رکھنے کا عزم کر چکے تھے جب تک دشمنوں کو شکست دے کر بھگا نہ دیں، لیکن بدقسمتی سے اس درمیان میں البانیا میں بغاوت برپا ہو گئی

---

(۱) الہلال کلکتہ

اور پھر بلقان کے افق سے ایک متحدہ اور خوفناک جنگ کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ان حالات کے پیش نظر باب عالی نے بادل ناخواستہ صلح کی گفتگو شروع کی اور ۱۸/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو صلح نامہ "اوزان" پر مخاربین کے دستخط ہو گئے۔ طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا، اٹلی نے وعدہ کیا کہ بحر ایجین کے مفتوحہ جزائر دولت علیہ کو واپس کر دے گا لیکن یہ وعدہ بھی شرمندہ ایفا نہ ہوا۔

بلقانی ریاستوں کا اتحاد: جس خطرہ کو محسوس کر کے ترکوں نے اٹلی سے صلح کی تھی وہ بہت جلد سامنے آ گیا، ریاستہائے بلقان نے تاریخ میں پہلی بار متحدہ ہو کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ "جنگ بلقان" بقول خالدہ ادیب خانم "گویا جنگ عظیم کی ایک مشق تھی، دونوں کی تیاری اور تحریک میں روس کے وزیر خارجہ اسوونسکی کی عقل شیطانی کارفرما تھی۔"

بلقان کی مسیحی ریاستوں کو متحد کرنے کی کوشش "صلح نامہ برلن" کے بعد کئی بار کی جا چکی تھی، لیکن ان کی باہمی رقابتوں نے کبھی اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ ۱۸۸۵ء میں بلغاریا کی توسیع مملکت پر سرویا کی آتش حسد اور بھی مشتعل ہو گئی تھی، جو میدان جنگ میں شکست کھانے کے بعد بدستور قائم رہی۔ ۱۸۹۱ء میں یونانی وزیر اعظم ترِکوپیس نے بلغراد اور صوفیا جا کر دونوں ریاستوں میں اتحاد کی پھر کوشش کی اور سرویا میں اس کی تجویز پسند کی گئی لیکن بلغاریا کا وزیر اعظم استامبولوف باب عالی سے لڑنے پر آمادہ نہ ہوا جس کی وجہ سے یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی، ریاستہائے بلقان کے اتحاد میں سب سے بڑی رکاوٹ ان رقیبانہ اغراض سے پیدا ہوتی تھی، جن کا تعلق مقدونیا سے تھا۔ مقدونیا میں بلغاری، سروی اور یونانی عیسائی کثرت سے آباد تھے، یہ ریاستیں مقدونیا کے ان حصوں پر قبضہ کر لینا چاہتی تھیں، جہاں کے باشندے ان کے ہم قوم تھے، بلغاریا چاہتا تھا کہ مقدونیا میں حکومت خود اختیاری قائم کر دی جائے، اسے امید تھی کہ ایسا ہو جانے سے بالآخر مقدونیہ کا بڑا حصہ اس کی مملکت میں شامل کیا جا سکے گا، سرویا اور یونان مقدونیا کی تقسیم کے

خواہاں تھے کیوں کہ بلغاریا کے مقابلہ میں ان کو مقدونیا کے کسی بڑے حصہ کے ملنے کی توقع نہ تھی۔ (۱)

نوجوان ترکوں نے دستوری حکومت قائم کرنے کے بعد سلطنت کی تمام قوموں کو مساوی حقوق دے دیے تھے، انھوں نے ترک و عرب، یونانی و بلغاری، سروی والبانی مسلمان و عیسائی کی تفریق مٹا دینی چاہی اور ان سب کے بجائے ایک متحدہ عثمانی قومیت پیدا کرنے کی کوشش کی، انقلاب سے پہلے انجمن اتحاد و ترقی کا یہ نصب العین عیسائی رعایا کی نگاہوں کو بھی خیرہ کر رہا تھا اور سلطان عبدالحمید کے استبداد کو ختم کرکے جب دستوری حکومت کا اعلان کیا گیا تو عیسائیوں نے ترکوں سے بھی زیادہ جوش و مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ظاہر ہو گیا کہ ان کی اصلی غرض و غایت کیا ہے، وہ حقوق کے لینے کے لیے تو سب سے پہلے بڑھے مگر جب فرائض کی انجام دہی کا وقت آیا جو حقوق کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ تھے تو گریز کرنے لگے، چنانچہ نئی حکومت نے فوجی خدمت جب عیسائیوں پر بھی عاید کی جس سے اب تک وہ بری تھے تو انھوں نے اسے جبر و تشدد سے تعبیر کیا اور مسیحی طاقتوں کو مدد کے لیے پکارنا شروع کیا۔

روس کی سازشیں: سلطنت عثمانیہ کے خلاف ہر اقدام کے لیے روس ہمیشہ تیار رہتا تھا مقدونیا کی روش اور بلقانی ریاستوں کے حوصلوں نے اس کے۔ یہ ایک امید افزا موقع بہم پہنچایا، اس کا وزیر خارجہ اسوولسکی اس بات پر زور دے رہا تھا کہ روس بلقان میں پیش قدمی کرکے آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرلے مگر اس کے لیے برطانیہ اور فرانس کی رضامندی ضروری تھی، چنانچہ برطانیہ کو راضی کرنے کے لیے اس نے ۱۹۰۷ء میں جاپان سے صلح کرلی، اسی سال افغانستان، تبت اور ایران کے بارے میں بھی روس اور برطانیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا جس میں یہ طے پایا کہ افغانستان اور تبت سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور ایران کو دو دائروں میں تقسیم کرکے ایک میں روس اور دوسرے میں برطانیہ کا

---

(۱) میریٹ ص ۴۴۴

اور تقسیم کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ روس اس بات پر بھی راضی ہو گیا کہ برطانیہ بھی روس کی طرح جرمنی کو ہر طرف سے گھیرے لیکن ان سب کے باوجود آبنائے باسفورس کے قبضہ پر برطانیہ کو راضی نہ کر سکا ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک اسوولسکی نے آسٹریا کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کی اور ۱۹۰۸ء میں آسٹریا کے وزیر خارجہ کاؤنٹ ارنتھال سے ملاقات کر کے یہ تجویز پیش کی کہ اگر آسٹریا روس کو آبنائے باسفورس پر قبضہ کر لینے دے تو روس آسٹریا کا قبضہ بوسنیا اور ہرزیگووینا پر تسلیم کر لے گا۔ ارنتھال نے یہ تجویز اس شرط پر منظور کر لی کہ بلغاریہ اور رومانیہ کو بھی باسفورس میں حقوق دیے جائیں۔ اٹلی سے طرابلس پر معاہدہ ہو گیا۔ اسوولسکی کی یہ تجویزیں ابھی یورپین وزارتوں کے زیر غور تھیں کہ آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزیگووینا پر اور اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ یہ حکومتیں آبنائے باسفورس پر روسی قبضہ کی مخالفت نہ کریں گی لیکن چونکہ برطانیہ اور فرانس کی منظوری کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور یہ دونوں کسی طرح راضی نہیں ہوتے تھے، اس لیے اسوولسکی نے اب یہ تدبیر سوچی کہ بلقانی ریاستوں کو متحد کر کے ترکوں کو بلقان سے نکال دے اور پھر خود آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے (۱) چنانچہ اس کی کوشش سے مارچ ۱۹۱۲ء میں سرویا اور بلغاریہ میں ترکی کے خلاف ایک معاہدہ ہوا۔ اسوولسکی نے اس معاہدہ کی اطلاع فرانسیسی وزیر خارجہ موسیو پوانکارے کو دی اور کہا کہ ابھی یہ کسی پر ظاہر نہ کیا جائے، بلغاریہ کو ہتھیار وغیرہ اور سامان جنگ فراہم کرنے کے لیے قرض دیا گیا (۲) اس معاہدہ کی ایک خفیہ دفعہ کی رو سے یہ طے پایا کہ اگر مقدونیہ کا کوئی حصہ فتح ہو جائے تو جو علاقے ان دونوں ریاستوں سے متصل واقع ہیں، وہ ان میں شامل کر دیے جائیں اور درمیانی علاقوں کی تقسیم روس کے فیصلہ پر چھوڑ دی جائے (۳) روس ہی کی وساطت سے مئی ۱۹۱۲ء میں یونان اور بلغاریہ کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہو گیا، یہ سرویا اور بلغاریہ کے معاہدہ سے ایک خاص امر میں مختلف تھا یعنی اس میں مقدونیہ

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۸۲ (۲) ایضاً ص ۸۳ (۳) الیورسے ص ۳۵۷

کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا(۱) پھر ستمبر ۱۹۱۲ء میں سرویا اور مونٹی نگرو کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ فریقین ترکی سے علاحدہ علاحدہ جنگ کریں اور کسی ترکی شہر یا گاؤں پر سرویا اور مونٹی نگرو کی فوجیں متحدہ طور پر قابض نہ ہوں۔

البانیا کی بغاوت: ان معاہدوں کے بعد اتحادی چاہتے تھے کہ جنگ جلد از جلد شروع کر دیں، طرابلس کی جنگ جاری تھی اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، دوسری طرف البانیا کی بغاوت سے مقدونیا کی تقسیم کا مسئلہ جو اس اتحاد کی اصلی غرض وغایت تھی بہت مشکل ہوتا نظر آرہا تھا، البانیا کا مطالبہ حکومت خود اختیاری تھا، وہ سقوطری، یانینا، مناستر اور قوصوہ کی ولایتوں کو متحد کر کے دولت علیہ کے زیر سیادت ایک خودمختار مملکت قائم کرنا چاہتا تھا، ابتدا میں انجمن اتحاد وترقی نے البانیا کی بغاوت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی، لیکن جب سلطنت کی فوج نے بھی جو البانیا میں تھی باغیوں کا ساتھ دینا شروع کیا اور جون ۱۹۱۲ء میں مناستر کے فوجی دستے نے علانیہ بغاوت کر دی اور موجودہ وزارت کے توڑ دینے کا مطالبہ کیا تو البانیا کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ حکومت کے سامنے آیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جولائی میں محمود شوکت پاشا نے استعفا دے دیا اور ان کی جگہ ناظم پاشا جو انجمن اتحاد وترقی کا شدید مخالف تھا وزیر جنگ مقرر ہوا، اگست میں حلمی پاشا صدر اعظم کو بھی استعفا دینا پڑا، باغیوں کی یہ کامیابی دیکھ کر بلقانی ریاستوں کو یہ خطرہ ہوا کہ ممکن ہے البانیا ایک خودمختار مملکت تسلیم کر لی جائے اور سقوطری، یانینا، مناستر اور قوصوہ کی ولایتیں اس میں شامل کر دی جائیں، اگر ایسا ہوا تو ان ریاستوں میں سے ہر ایک کو اس علاقہ سے محروم ہونا پڑے گا جس کی وہ خصوصیت کے ساتھ خواہش مند تھی، چنانچہ اس خوف سے کہ کہیں یہ موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے انھوں نے عجلت کی اور ۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شاہ نکولس والیٔ مونٹی نگرو نے باب عالی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

ترکی کی اندرونی حالت: ترکی کی اندرونی حالت اس وقت بہت نازک تھی، قدامت پسند

---

(۱) میریٹ ص ۲۳۷

گروہ نوجوان ترکوں کی انتہاپسندی کا مخالف تھا، خود حکمران جماعت میں پھوٹ پڑ گئی تھی، فوج کے اس حصہ کو جو قدامت پسند تھا غلبہ حاصل ہو گیا تھا، محمود شوکت پاشا کے استعفیٰ دینے کے بعد فوج کی تنظیم بوڑھے افسروں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی جو قابلیت میں نوجوان ترکوں سے بہت کم تھے۔ کامل پاشا صدر اعظم تھا اور اسے انگلستان کی حمایت پر اس قدر بھروسا تھا کہ وہ بلقان کے خطرہ کو زیادہ اہمیت نہیں خیال کرتا تھا، اسے یقین تھا کہ انگلستان بلقان پر حملہ نہ ہونے دے گا۔ اسی یقین کی بنا پر اس نے ۱۹۱۲ء میں ۷۵ ہزار تربیت یافتہ فوج کو جو بلقان کی سرحد پر متعین تھی منتشر کر دیا لیکن جب جنگ کے چھڑ جانے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی تو یورپین حکومتوں سے مداخلت کی درخواست کی، چنانچہ نتیجہ میں روس اور آسٹریا نے دول عظمیٰ کی طرف سے ایک احتجاجی نوٹ اتحادیوں کے پاس بھیجا، ظاہر ہے کہ انھی دونوں کی سازشوں کے بعد اس احتجاج کا اثر کیا ہو سکتا تھا، یہ دیکھ کر کہ دولت علیہ اپنی کمزوری محسوس کر رہی ہے پہلے مونٹی نگرو اور پھر دوسری ریاستوں نے اعلان جنگ کر دیا، ترکی کے پاس ایک لاکھ فوج تھی اور وہ بھی زیادہ تر نئے رنگروٹوں کی۔ بلغاریہ کی فوج ایک لاکھ اسی ہزار تھی، سرویا کی اسی ہزار، یونان کی پچاس ہزار (۱)، ان ریاستوں نے سلطنت عثمانیہ سے علاحدہ ہونے کے بعد اپنی تنظیم یورپین حکومتوں کے طرز پر کی تھی اور ان کی فوجیں یورپ کے فوجی نظام کے مطابق تربیت یافتہ تھیں، برخلاف اس کے نوجوان ترک ملک کی اصلاحات کافی طور پر نہ کر سکے تھے، جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انھیں عنان حکومت ہاتھ میں لیے ہوئے صرف چار ہی سال گزرے تھے اور دوسری بڑی وجہ قدامت پسند گروہ کی مخالفت تھی، نئے قانون کے مطابق ترکی فوج میں عیسائی اور یہودی بھی بھرتی کیے گئے تھے، ان کی فوجی خدمت جس سے وہ اب تک بالکل بری تھے نہایت شاق تھی، چنانچہ جب لڑائی شروع ہوئی تو انھی عیسائی اور یہودی سپاہیوں نے دھوکا دیا اور سب سے پہلے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے، ایک تو

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۸۹

عثمانی فوجوں کی تعداد اتحادیوں کے مقابلہ میں یوں ہی کم تھی، دوسرے عیسائیوں اور یہودیوں کی غداری سے اور زیادہ نقصان پہنچا۔

جنگ بلقان: اتحادیوں نے جنگ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کے عیسائی صوبوں کی اصلاح حال ظاہر کیا تھا مگر حقیقتاً ان کے پیش نظر ذاتی اغراض تھیں، چنانچہ یونان کریٹ اور بحر ایجین کے دوسرے جزیروں پر قبضہ کرنے کے علاوہ خود بر اعظم پر بھی اپنی سرحدوں کی توسیع کا خواہش مند تھا، بلغاریا کو اس بلغاریا عظمیٰ کی آرزو تھی، جس کا نقشہ صلح نامہ سان اسٹیفانو میں مرتب کیا گیا تھا، سرویا ان تمام علاقوں کو اپنے اندر شامل کر لینا چاہتا تھا جو اسٹیفن ڈوشن (Stephan Dushan) کے زمانہ میں اس کی قدیم سلطنت کے جزو تھے، وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی مملکت کے حدود بحر ایجین اور بحر ایڈریاٹک کے ساحلوں تک پہنچ جائیں، مونٹی نگرو کی نظر البانیا کے ایک حصہ پر تھی۔ (۱)

۸/ اکتوبر کو مونٹی نگرو نے اعلان جنگ کر دیا تھا، بقیہ ریاستوں نے بھی ۱۸/ اکتوبر کو اعلان کر کے اسی روز اپنی فوجیں عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ کیں، حملہ کا سب سے زیادہ زور بلغاریا کی طرف سے تھا، جس کا مقصد خود قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا تھا، چنانچہ ۱۸/ اکتوبر کو بلغاری فوجیں تھریس میں داخل ہوئیں اور ۲۲/ اکتوبر کو قرق کلیسہ اور ۲۸/ کو لولو برگاس کے معرکوں میں ترکوں کو شکست دی، عثمانی فوج نے شتلجہ کے حصار میں پناہ لی جو قسطنطنیہ سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے، بلغاریوں نے شتلجہ پر کئی حملے کیے مگر نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا، وسط نومبر تک ادرنہ کے سوا تھریس کے اور تمام حصوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

اس درمیان میں سرویا، مونٹی نگرو اور یونان نے بھی متعدد فتوحات حاصل کر لی تھیں، سرویا کی فوجیں سرحد کو عبور کر کے قدیم سرویا میں داخل ہوئیں، کمانووو (Koumanaovo) کے میدان میں ۲۳/ اکتوبر کو ترکوں سے مقابلہ ہوا۔ دو روز تک

---

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۵۹

جنگ جاری رہی، آخر میں ترکوں کو شکست ہوئی، سروی فوجوں نے اسکوب پر قبضہ کر لیا جو ان کی قرون وسطی کی سلطنت کا پایہ تخت تھا، اس کے بعد وہ مقدونیا میں بڑھتی ہوئی مناسر تک پہنچ گئیں، دوسری طرف مونٹی نگرو کی فوجوں نے سقوطری کے زبردست قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یونانیوں کی فتوحات کا بھی یہی حال تھا، وہ بھی قریب ہر معرکہ میں کامیاب رہے، ۸؍نومبر کو یونانی فوجوں نے سالونیکا پر قبضہ کر لیا، مگر ان کی بحری فتوحات زیادہ اہم تھیں، آخر نومبر تک بحر ایجین کے تقریباً تمام عثمانی جزائر پر یونان کا قبضہ ہو گیا تھا ترکی بحریہ کی کمزوری بری فوجوں کی حالت سے بھی زیادہ افسوسناک ثابت ہوئی۔

عثمانی شکست کے اسباب: ترکوں کی ان حیرت انگیز شکستوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ ایورسلے لکھتا ہے:

> "عثمانی فوجوں کی بدنظمی اور ابتری کے منجملہ اور اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ سامان رسد کا انتظام مطلق نہ تھا، تین تین چار چار روز تک فوجوں کا بغیر غذا کے رہ جانا کوئی استثنائی واقعہ نہ تھا بلکہ عموماً ایسا ہی ہوتا تھا، دوسرا سبب یہ تھا کہ یورپ کی اس جنگ میں عثمانی فوجوں میں بڑی تعداد دیہاتی عیسائیوں کی تھی جو پہلی بار جبری طور پر بھرتی کیے گئے تھے، ان کی ہمدردی تمام تر دشمن کے ساتھ تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ ترکی صفوں کے ٹوٹنے کے وقت فوج کا انتشار اور فرار زیادہ تر انہی کے بھاگنے کی وجہ سے ہوتا تھا جو لوگ باقی رہ جاتے تھے، وہ اپنے گھروں کو بھاگ جاتے تھے۔ (۱)

خالدہ ادیب خانم اپنے سوانح میں لکھتی ہیں:

> "بدنظمی کے لحاظ سے جنگ بلقان سے بڑھ کر کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے، حفظان صحت کا کوئی انتظام نہ تھا اور مخصوص مدافعت کے

---

(۱) ص: ۲۶۳

> پیچھے انتظامات کی ابتری نہایت افسوسناک تھی، بھیڑیں گاڑیوں میں بھوکی مرتی تھیں اور آٹا گوداموں میں سڑ رہا تھا، جن سے نصف میل سے کم ہی فاصلہ پر لوگ فاقے سے جان دے رہے تھے، جب ترک پناہ گزین قتل عام سے بھاگ کر سراسیمہ قسطنطنیہ پہنچے، جب باہر سے آنے والوں اور فوج میں ہیضہ پھیلا، جب آبادی کی آبادی مسجدوں کے صحن میں سردی کی شدت سے ٹھٹھرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی تو قسطنطنیہ کی مصیبت کا منظر اتنا ہولناک تھا کہ ناقابل بیان معلوم ہوتا تھا۔"(۱)

یورپ کا پہلا عہد: آغاز جنگ میں دول عظمیٰ نے اعلان کیا تھا کہ خواہ کوئی فریق بھی کامیاب ہو بلقان کی موجودہ حالت برقرار رکھی جائے گی۔ اس اعلان کا سبب یہ تھا کہ انہیں ترکی کی کامیابی کا قوی اندیشہ تھا اور جس طرح ۱۸۹۷ء میں انہوں نے ایک ایسے ہی اعلان سے یونان کی پشت پناہی کی تھی اور ترکوں کو یونانی فتوحات سے دستبردار ہونا پڑا تھا، اسی طرح ریاستہائے بلقان کا تحفظ بھی پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا، لیکن جب خلاف توقع عثمانی فوجوں کو تقریباً ہر معرکہ میں شکست ہوئی اور دشمن حیرت انگیز طور پر کامیاب ہونے لگے تو انہی زبانوں نے جو یہ اعلان کر چکی تھیں اب اس کے خلاف آواز اٹھائی اور یہ کہا جانے لگا کہ بلقانیوں کو ان کی فتوحات سے محروم کر دینا ہرگز قرین انصاف نہیں۔ مسٹر اسکوئتھ، وزیراعظم برطانیہ نے دول عظمیٰ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا: "مشرقی یورپ کے نقشہ کو از سر نو مرتب کرنا ضروری ہے اور فاتحین کو ان ثمرات سے محروم نہیں کرنا چاہیے جو انہیں گراں قیمت پر حاصل ہوئے ہیں"(۲)۔ بقول خالدہ خانم: "یورپ کے اخباروں نے بھی وہ لہجہ اختیار کیا گویا یہ قرون وسطیٰ کی صلیبی جنگ تھی جس میں صلیب ہلال پر غالب آئی۔"

عارضی صلح: دول عظمیٰ کی تحریک پر ۳ دسمبر کو ترکی اور بلغاریا اور سرویا کے درمیان ایک

---

(۱) سوانح خالدہ ادیب خانم (Memories of Khalida Edib) مطبوعہ لندن ص ۳۳۳ (۲) ایضاً ص ۵۰۲

عارضی صلح ہوگئی، یونان اور مونٹی نیگرو سے جنگ جاری رہی، اب تک جنگ کا نتیجہ یہ تھا کہ ترک مقدونیا اور تقریباً تمام تھریس اور اپیرس سے خارج ہو چکے تھے، قسطنطنیہ کے علاوہ یورپ میں صرف ادرنہ، یانینا اور سقوطری پر ان کا قبضہ باقی رہ گیا تھا، لیکن یہ تینوں شہر بھی دشمن کے محاصرہ میں تھے۔

صلح کانفرنس، لندن: ۱۶ دسمبر ۱۹۱۲ء کو لندن میں "صلح کانفرنس" کا اجلاس شروع ہوا، ادرنہ کے مسئلہ پر سب سے زیادہ مشکل پیش آئی اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا باعث ہوا، بلغاریہ نے مستقل صلح کے لیے ادرنہ کے حصول کو ایک لازمی شرط قرار دیا تھا، باب عالی اس پر راضی نہ تھا لیکن جب ۱۷ جنوری ۱۹۱۳ء کو دول عظمیٰ کی طرف سے ایک نوٹ باب عالی میں بھیجا گیا اور اس میں یہ مشورہ دیا گیا کہ ادرنہ ریاستہائے بلقان کے حوالے کر دیا جائے اور جزائر آگیین کا مسئلہ دول عظمیٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے تو صدر اعظم کامل پاشا نے جو انگلستان کا دوست تھا ترکی کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس مشورہ کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی، قریب تھا کہ مجلس وزرا کامل پاشا کی اس تحریک سے متفق ہو کر دول عظمیٰ کے نوٹ کا جواب روانہ کر دے اور ترکی کے قتل نامہ پر خود اس کی مہر ثبت کر دی جائے کیوں کہ ادرنہ سے دست برداری حقیقتاً قسطنطنیہ کی دست برداری کا مقدمہ ہوتی لیکن عین وقت پر ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا جس نے مجلس وزرا کی یادداشت کو جو دول عظمیٰ کے پاس جانے کے لیے مرتب ہو چکی تھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے خود موجودہ وزارت کو خاتمہ کر دیا، اس کے بعد جو وزارت قائم ہوئی اس نے ادرنہ کو حوالہ کرنے سے قطعاً انکار کر دیا جس کے بعد ہی صلح کانفرنس بھی برخاست ہوگئی۔

انقلاب وزارت: یہ انقلاب وزارت اسی بطل حریت کا رہین منت تھا جس نے ۱۹۰۸ء میں ملک کو عبدالحمید کے استبداد سے نجات دلا کر دستوری حکومت قائم کر دی تھی، انور بے طرابلس کی مہم سے فارغ ہو کر قسطنطنیہ پہنچ چکے تھے، اسی خاموشی اور جرأت کے ساتھ جو ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں اس درجہ کامیاب ثابت ہوئی تھی، وہ چند جاں باز دوستوں کو

سے کر دفعۃً ایوانِ وزارت میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر افسرانِ جنگ اور عام پبلک کے دستخط تھے اور اس میں تبدیلِ وزارت یا انکارِ صلح پر زور دیا گیا تھا، فوج کا جو حصہ وزارت کے ہاتھ میں تھا، اسے پہلے ہی کسی بہانہ سے قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا گیا تھا اور جس قدر فوج شہر میں تھی وہ سب قومی جماعت کے ساتھ تھی، جس کی سیادت انور بے کر رہے تھے، وزراء ان حالات سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھے کہ انور بے اندر داخل ہوئے، ناظم پاشا وزیر جنگ کے ایڈی کانگ نے اس جماعت کو روکنے کی کوشش کی اور پستول چلائی، معاً دوسری طرف سے بھی گولی چلی اور ناظم پاشا گر کر وہیں ٹھنڈا ہو گیا، بہت جلد انور بے نے وزارت خانہ پر قبضہ کر لیا، کامل پاشا کو استعفا دینا پڑا، اس کی جگہ محمود شوکت پاشا صدر اعظم مقرر ہوئے۔

استقلالِ البانیا: لندن کانفرنس کے سامنے منجملہ اور اہم مسائل کے ایک مسئلہ استقلالِ البانیا کا بھی تھا، سرویہ کو جو غیر معمولی کامیابی جنگ میں ہوئی تو اس نے بحر ایڈریاٹک کا رخ کرنا چاہا، کیوں کہ اب تک اس کے پاس کوئی بندرگاہ نہ تھی لیکن بحر ایڈریاٹک تک پہنچنے کے لیے سرویا صرف ایک ہی راہ سے جا سکتا تھا۔ یعنی البانیا کی طرف سے، چنانچہ نومبر ۱۹۱۲ء کے آخر میں سروی فوجوں نے الیسیو (Allesio) اور دورازو (Durrazzo) پر قبضہ کر لیا جو البانیا کے ساحل پر واقع تھے، دولِ عظمیٰ نے جس وقت یہ خبر سنی فوراً احتجاج کیا، سب سے زیادہ مخالفت اٹلی اور آسٹریا کی طرف سے ہوئی، کیوں کہ یہی دونوں حکومتیں اپنے کو بحر ایڈریاٹک کا تنہا مالک قرار دیتی تھیں، سرویا کو باضابطہ طور پر متنبہ کر دیا گیا کہ بحر ایڈریاٹک کی کسی بندرگاہ پر قبضہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی لیکن سرویا دولِ عظمیٰ کی مخالفت کے باوجود بڑھتا چلا گیا، اسے امید تھی کہ دولِ عظمیٰ کا اتحاد قائم نہ رہے گا اور کم از کم روس بالآخر اس کا طرفدار ہو جائے گا(۱)، مغربی حکومتوں کے احتجاج کے علاوہ خود اہلِ البانیا میں سرویا کے اس اقدام کے خلاف سخت شورش برپا

---

(۱) شیول ص ۳۷۴

ہوگئی، انھوں نے فورًا ولونا میں ایک مجلس منعقد کر کے سلطنت عثمانیہ سے اپنی کامل آزادی کا اعلان کر دیا، ان کو خطرہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو البانیہ کا بھی وہی حشر ہوگا جو بلقان کے دوسرے عثمانی مقبوضات کا ہونے والا ہے، اس اعلان سے دول عظمیٰ کے ہاتھ اور مضبوط ہوگئے اور انھوں نے لندن کانفرنس میں نہ صرف یہ کہ سرویا کو مجبور کر کے البانی بندرگاہوں سے دست بردار کرایا بلکہ البانیا کا استقلال بھی باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا، البانیا ایک خودمختار ریاست قرار دی گئی جس کے فرماں روا کا انتخاب دول عظمیٰ کے فیصلہ پر رکھا گیا، اس فرماں روا کی مدد کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن کا تقرر طے ہوا، سرحدوں کی تعیین بھی ایک خاص کمیشن کے سپرد کی گئی، کانفرنس دراصل جس مقصد کے لیے منعقد کی گئی تھی وہ تو زیادہ تر بلقان کی فاتحانہ سرمستیوں اور نوجوان ترکوں کی غیرت قومی کے باعث پورا نہ ہو سکا لیکن اس میں اتنا ضرور ہوا کہ البانیا کا استقلال بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا اور دولت عثمانیہ کا ایک اور صوبہ اس کے قبضہ سے نکل کر دول عظمیٰ کے سایۂ عاطفت میں آ گیا۔

اعادۂ جنگ: ترکی انقلاب وزارت کے بعد عارضی صلح کا خاتمہ ہو گیا اور جنگ از سرِ نو شروع کر دی گئی، ۴ر فروری ۱۹۱۳ء کو بلغاری فوجوں نے ادرنہ پر پھر حملہ کیا، اب کی بار پچاس ہزار سروی فوج بھی ان کے ساتھ تھی، اسی روز بولیر کے قریب ترکوں اور بلغاریوں کا مقابلہ ہوا، جس میں ترکوں کو شکست ہوئی اور بولیر کا اہم قلعہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، اس درمیان میں یونانیوں نے بھی لڑائی شروع کر دی تھی، انھوں نے ایک فوج اپائرس روانہ کی اور ۶ر مارچ کو یانینا کے قلعہ پر جو اب تک ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا قبضہ کر لیا، ۱۰ر مارچ کو جزیرۂ ساموس بھی یونانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

سقوط ادرنہ: ۲۶ر مارچ کو ادرنہ کے فوجی دستہ کو بھی تقریبًا پانچ ماہ کے شدید محاصرہ کے بعد ہتھیار ڈال دینے پڑے، اس محاصرہ میں بلغاریوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اور اپنی پوری قوت کے ساتھ بار بار حملہ آور ہوئے تھے لیکن ہر بار انھیں شکستوں کی ایک بڑی

تعداد چھوڑ کر پسپا ہونا پڑتا تھا۔ اب کی بار ان کی کامیابی محض سروی افواج کی مدد سے ہوئی مگر اس کامیابی نے بلغاریا کے لیے ایک نئی دقت پیدا کر دی، جنگ بلقان میں رومانیا نے اب تک کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا تھا، بلغاریہ کی فتوحات کو دیکھ کر اس کے دل میں رشک کا جذبہ پیدا ہوا اور اپنی غیر جانبداری کے معاوضہ میں بلغاریا سے سلسٹریا کے قلعہ کا مطالبہ کیا تاکہ صلح نامہ برلن میں اس کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی تھی اس کی تلافی ہو جائے، یہ معاملہ ابھی فیصل نہیں ہوا تھا کہ ۱۹؍ اپریل ۱۹۱۳ء کو ترکوں اور بلغاریوں کے درمیان بولیر میں عارضی طور پر صلح ہوگئی۔

سقوطری: اس عارضی صلح میں مونٹی نیگرو شریک نہ تھا کیوں کہ شاہ نکولس دول عظمیٰ کی مخالفت کے باوجود سقوطری کے محاصرہ پر قائم تھا اور اسے فتح کرنے سے پہلے کسی صلح کے لیے آمادہ نہ تھا، دول عظمیٰ نے اسے متنبہ کر دیا تھا کہ اگر اس نے قلعہ فتح بھی کر لیا تو بھی اس پر قابض نہ رہنے پائے گا، اس لیے کہ پہلے سے طے ہو چکا ہے کہ یہ شہر البانیا کی جدید خود مختار ریاست میں شامل کر دیا جائے گا، تاہم نکولس نے کچھ پروا نہ کی اور محاصرہ جاری رکھا، مجبور ہو کر روس کے علاوہ تمام دول عظمیٰ نے ایک متحدہ جنگی بیڑا مونٹی نیگرو کے ساحلی علاقہ کی ناکہ بندی کے لیے روانہ کیا۔ یہ بیڑا برطانوی امیر البحر برنی (Burney) کی سرکردگی میں ۴؍ اپریل کو انٹی واری کے سامنے نمودار ہوا، پھر بھی نکولس نے محاصرہ بدستور جاری رکھا، بالآخر ۲۲؍ اپریل کو فاقہ کشی سے تنگ آ کر محصورین نے ہتھیار ڈال دیے، اسعد پاشا ترکی دستے اور باقی ماندہ سامان جنگ کو لے کر شہر سے نکل گیا اور ۲۶؍ اپریل کو مونٹی نیگرو کا ولی عہد شہزادہ ڈانیلو (Danilo) فاتحانہ طور پر اس میں داخل ہوا لیکن مونٹی نیگرو کی یہ فتح چند روزہ ثابت ہوئی، دول عظمیٰ نے شاہ نکولس کو مجبور کیا کہ شہر ان کے حوالہ کر دے، چنانچہ ۴ مئی کو نکولس نے سر ایڈورڈ گرے وزیر خارجہ برطانیہ کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ میں بالکل مجبور ہو کر سقوطری سے دست بردار ہوتا ہوں اور اسے دول عظمیٰ کے ہاتھ میں دیتا ہوں، اس کے بعد بین الاقوامی فوجیں جنگی بیڑے سے اتر کر سقوطری

میں داخل ہو گئیں، اسقوطری کے شہر اور اس کے چاروں طرف چھ میل کے فاصلے تک ایک عارضی حکومت قائم کر دی گئی جس کا صدر امیر البحر برنی مقرر ہوا۔

صلح نامہ لندن، ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء: بونیہ کی عارضی صلح کے بعد لندن کانفرنس کے دوبارہ منعقد کرنے کی تحریک پھر شروع ہوئی اور ریاستہائے بلقان نے دول عظمیٰ کی ثالثانہ وساطت منظور کر لی مگر اپنے لیے یہ حق محفوظ رکھا کہ تھریس اور البانیہ کی سرحدوں نیز جزائر ایجین کے مستقبل کے مسئلہ پر وہ کانفرنس میں بحث و مباحثہ کریں گی۔ دول عظمیٰ نے اپنی وساطت کے لیے یہ شرائط پیش کیں: (۱) یورپ میں ترکی کی جدید سرحد کے لیے اینوس (Enos) جو بحر ایجین پر واقع ہے اور میڈیا (Midia) جو بحر اسود پر واقع ہے، ان دونوں کا درمیانی خط مستقیم بطور حد قرار دیا جائے۔ (۲) جزائر ایجین کا مسئلہ اور جدید البانیہ کی سرحد کی تعیین دول عظمیٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دی جائے۔ (۳) تمام مالی معاملات بشمول تاوان جنگ ایک بین الاقوامی مالی کمیشن کے سپرد کر دیے جائیں۔ نتیجہ یہ شرائط منظور ہوئیں اور لندن میں کانفرنس کے اجلاس پھر شروع ہوئے۔ (۱)

۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو صلح نامہ لندن پر فریقین نے دستخط کر دیے، اس کی رو سے یورپین ترکی کے تمام علاقے باستثنائے البانیہ جو خط اینوس و میڈیا کے مغرب میں واقع تھے، ریاستہائے بلقان کو دے دیے گئے۔ البانیہ کی سرحدوں اور اس کے متعلق تمام دوسرے مسائل کا فیصلہ دول عظمیٰ پر چھوڑ دیا گیا۔ کریٹ کے علاوہ دیگر تمام جزائر ایجین کی قسمت کا فیصلہ بھی دول عظمیٰ ہی پر چھوڑا گیا۔ باب عالی نے کریٹ کا الحاق یونان سے منظور کر لیا، مالی معاملات کا تصفیہ پیرس کے بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کر دیا گیا اور حقوق اختیارات، قومیت اور تجارت کے مسائل کا خصوصی معاہدوں سے طے ہونا قرار پایا۔ (۲)

اتحاد میں افتراق: دول یورپ نے لندن کانفرنس کی کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارک باد دی لیکن خود اتحادیوں کے اندر جو افتراق پیدا ہو رہا تھا اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

---

(۱) ، (۲) ایضاً ص ۵۰۸۔۵۰۹

یہ افتراق مال غنیمت کی تقسیم پر ظاہر ہوا، کریٹ، جزائر اگیین، ایپائرس، تھریس اور مقدونیا جو دولت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے قبضہ میں آ چکے تھے، ان کی تقسیم کا مسئلہ نہایت دشوار تھا اور لندن کانفرنس کے اختتام سے قبل ہی باہمی جنگ کے آثار نمودار ہونے لگے تھے، اتحادی فتح کے نشہ میں سرشار تھے اور ان میں سے ہر ایک مال غنیمت کا سب سے زیادہ حقدار اپنے ہی کو سمجھتا تھا، جنگ سے پہلے سرویا اور بلغاریا کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اس کے رو سے مقدونیا کا ایک چھوٹا سا حصہ سرویا کو ملنا چاہیے تھا، لیکن جنگ میں سروی افواج نے جو خلاف توقع فتوحات مقدونیا میں حاصل کیں، ان کے لحاظ سے سرویا معاہدۂ مذکورہ پر قانع رہنے کے لیے تیار نہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ اتحادیوں کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ ترکوں کے مقابلہ میں اس درجہ کامیاب رہیں گے، یہی سبب تھا کہ مال غنیمت کی تقسیم سے متعلق انھوں نے جنگ سے پہلے کسی خاص معاہدہ کی ضرورت نہ سمجھی، لیکن تعجب یہ ہے کہ لندن کانفرنس میں بھی اس مسئلہ پر توجہ نہیں کی گئی اور گویا اسے تلوار کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا، مقدونیا میں ترکوں سے جو لڑائیاں ہوئیں وہ زیادہ تر سرویا اور یونان کی فوجوں سے ہوئیں، بلغاری فوجیں تھریس میں لڑتی رہیں، چنانچہ مقدونیا کے بیشتر علاقوں پر سرویا اور یونان ہی کا قبضہ تھا، اس بنا پر ان دونوں ریاستوں کا دعویٰ یہ تھا کہ مقدونیا ان ہی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے اور بلغاریہ اپنا حصہ تھریس میں پورا کر لے، بلغاریا اس پر راضی نہ تھا، وہ مقدونیا پر قبضہ رکھنے کے لیے اس وجہ سے مصر تھا کہ اس میں بلغاری آبادی کثرت سے تھی، علاوہ بریں دو تین سو برس سے مقدونیا کے عیسائیوں میں بلغاری قومیت کا جذبہ ابھار رہا تھا، سرویا کی طرف سے یہ کہا جاتا تھا کہ چوں کہ دول عظمیٰ کے فیصلہ کے مطابق البانیا ایک خود مختار ریاست بنا دی گئی ہے، جس سے علاوہ اور نقصانات کے سب سے بڑا نقصان سرویا کو یہ پہنچا کہ اسے ساحل ایڈریاٹک پر کوئی بندرگاہ نہ مل سکی اور دورازو پر قبضہ پانے کے بعد بھی اس سے دست بردار ہونا پڑا، حالانکہ سرویا کا شریک جنگ ہونا دراصل اسی مقصد سے تھا کہ ایڈریاٹک کی کوئی بندرگاہ حاصل

ہو جائے، اس لیے اس کی تلافی صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ مقدونیا میں اسے زیادہ حصہ دیا جائے، علاوہ ان فتوحات کے جو سروی افواج نے مقدونیا میں حاصل کی تھیں، سرویا کی طرف سے ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی تھی کہ تھریس پر جس میں ادرنہ بھی شامل تھا، بلغاریا کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے ریاستہائے بلقان کا توازنِ قوت درہم برہم ہو جائے گا، جس کا اثر زیادہ تر سرویا پر پڑے گا، اس لیے ضرورت ہے کہ توازن کو قائم رکھنے کے لیے سرویا کو بلغاریا سے زیادہ حصہ مقدونیا میں دیا جائے۔

بلغاریا اور یونان کا معاملہ بھی ایسا ہی پیچیدہ تھا، سالونیکا اور مقدونیا کے جنوبی نصف پر یونان کا قبضہ تھا، بلغاریا سالونیکا کو لینے کے لیے اڑا ہوا تھا، چنانچہ "صلح نامۂ لندن" کی تکمیل سے قبل ہی سالونیکا کے مسئلہ پر بلغاریوں اور یونانیوں میں تلواریں کھنچ گئی تھیں، ۲۲ مئی کو بلغاری فوجوں نے یونانی دستوں پر حملہ کر دیا تھا، نیز بلغاری توپچیوں نے ایک یونانی جہاز پر بھی گولہ باری کر دی تھی، لیکن چونکہ لندن کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا، اس لیے اس وقت یہ جنگ زیادہ نہیں بڑھی۔

ایک پیچیدگی رومانیا نے بھی پیدا کر دی تھی، رومانیا جنگ میں تو شریک نہ تھا اور اس لیے مالِ غنیمت کے کسی حصہ کا حق نہ رکھتا تھا، لیکن چونکہ اس کی غیر جانبداری سے اتحادیوں کو بالواسطہ سہولت پہنچی تھی اور انھوں نے بالخصوص بلغاریا نے حیرت انگیز فتوحات حاصل کر کے اپنی طاقت بہ نسبت پہلے کے بہت زیادہ بڑھا لی تھی، اس لیے توازنِ قوت کو برقرار رکھنے کے لیے رومانیا کو بھی کچھ ملنا ضروری تھا، چنانچہ رومانیا نے بلغاریا سے یہ مطالبہ کیا کہ سلستریا کا قلعہ نیز علاقہ دوبروجا کا ایک حصہ جس پر بلغاریہ کا قبضہ تھا، اسے دے دیا جائے، بلغاریا اس وقت دولت علیہ سے جنگ کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر رہا تھا، وہ رومانیا سے لڑائی مول لینے کے لیے تیار نہ تھا، لہٰذا مجبوراً اس نے رومانیا کے مطالبات منظور کر لیے اور مئی ۱۹۱۳ء میں معاہدہ پر دستخط کر کے سلستریا اور دوبروجا کا وہ علاقہ رومانیا کے لیے نامزد کر دیا۔

آغاز جنگ، جون ۱۹۱۳ء: رومانیا سے یوں دب کر صلح کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بلغاریا، مقدونیا کے معاملہ میں زیادہ سخت ہو گیا، یونان سے جو مراسلت اس مسئلہ میں ہو رہی تھی وہ موقوف کر دی گئی اور سرویا کے ساتھ بھی معاملات کچھ زیادہ نہ بڑھے، بلغاریا کو اپنی قوت پر اتنا غرور تھا کہ اس نے حریفوں کی فوجی طاقت کی کچھ پروا نہ کی، اس کا وزیر اعظم گیشوف (M. Gueshoff) صلح کا خواہش مند تھا لیکن وزارت کا بڑا حصہ جنگ پر آمادہ تھا، چنانچہ گیشوف کو استعفا دے کر علاحدہ ہو جانا پڑا، شاہ فرڈیننڈ جو ایک نہایت عیار اور سازشی فرماں روا تھا اس پارٹی کا طرفدار تھا جو جنگ چاہتی تھی، بلغاریا کے سابق حلیفوں کے ساتھ جو فریب اور غداری برتی گئی اس کا ذمہ دار زیادہ تر وہی تھا۔ (۱)

بلغاریا کے طرز عمل سے یونان اور سرویا کو جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ جنگ بالآخر چھڑ کر رہے گی تو ۲؍جون کو انھوں نے آپس میں ایک معاہدۂ اتحاد کر لیا، جس میں رومانیا بھی شریک ہو گیا، حالانکہ وہ اس سے قبل بلغاریا سے سلسٹریا اور دوبروجا کے متعلق صلح کر چکا تھا، چنانچہ جنگ بلقان کے اتحادیوں میں اب جو لڑائی چھڑی اس میں بلغاریا کے مقابل یونان، سرویا اور رومانیا کی ریاستیں تھیں، بعد میں مونٹی نگرو بھی اتحادیوں کے ساتھ ہو گیا۔

جنگِ تقسیم: ۲۹؍جون ۱۹۱۳ء کو آدھی رات کے وقت مقدونیا کی بلغاری فوج نے دفعۃً بغیر کسی اطلاع یا اعلان جنگ کے یونانی اور سروی دستوں پر حملہ کر دیا اور دوسرے روز ایک لاکھ بلغاری فوج اس سروی فوج کے مقابلہ میں جو اس سے قریب تر تھی آگے بڑھی، سروی فوج اس ناگہانی حملہ سے پہلے تو پسپا ہوئی، لیکن یکم جولائی کو مونٹی نگرو کی مدد سے اس نے جم کر مقابلہ کیا اور ۲؍جولائی کو بلغاری فوج کو شکست دے کر اس کی بہت سی توپیں چھین لیں، ۴؍جولائی کو پھر مقابلہ ہوا اور بلغاریا کو پھر شکست ہوئی، ۸؍جولائی کو سروی فوج نے اسٹیب (Istib) پر قبضہ کر لیا اور اب بلغاری پسپا ہو کر اپنی سرحد کی طرف روانہ

---

(۱) ماڑوا اور سٹلے ص ۳۶۵

ہوئے، اس درمیان میں یونانی فوج بھی جس کا مرکز سالونیکا تھا، بلغاری فوج کے مقابلہ کے لیے بڑھی، کلتیش (Kiltich) کے میدان میں جنگ ہوئی اور بلغاری بری طرح ہارے، اس کے بعد متعدد لڑائیاں اور ہوئیں اور ہر ایک میں بلغاریوں کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا، بلغاری فوجوں کے لیے اب صرف اپنی سرحدی راہ کھلی رہ گئی تھی، واپسی میں انھوں نے مقدونیا کی یونانی آبادی پر ہولناک مظالم توڑے، یونانیوں نے بھی آگے بڑھ کر ویسا ہی انتقام لیا(۱) بلغاریوں کو صرف یونان اور سرویا کی فوجوں سے لڑنا نہیں پڑا، ۱۰؍جولائی کو رومانیا بھی جنگ میں شریک ہوگیا اور سلسٹریا پر قبضہ کر کے صوفیا کی طرف بڑھا۔

فتح ادرنہ: بلغاریا کی اس نازک حالت سے ترکوں نے بھی فائدہ اٹھایا، ۱۵؍جولائی کو انور پاشا تھریس میں داخل ہوئے اور ۲۰؍کو آسانی کے ساتھ ادرنہ پر قبضہ کرلیا، اس کے بعد ڈیلوٹیکا اور قرق کلیسہ بھی انھوں نے دوبارہ فتح کر لیے۔

عارضی صلح: جنگ تقسیم صرف ایک ماہ تک جاری رہی لیکن اس قلیل مدت میں بلغاریا کی حالت نہایت نازک ہوگئی، اس کی فوجوں کو ہر معرکہ میں شکست ہوئی، دشمن کی فوجیں ہر طرف سے بڑھتی ہوئی آرہی تھیں، بالآخر اسے مجبور ہوکر دول عظمٰی سے صلح کی درخواست کرنی پڑی، ۳۱؍جولائی کو فریقین ایک عارضی صلح پر راضی ہوئے اور یہ طے پایا کہ بخارسٹ میں ایک صلح کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ریاستہائے بلقان کے نمائندے شریک ہوں لیکن دول عظمٰی کے نمائندے شرکت نہ کریں۔

صلح نامۂ بخارسٹ: بخارسٹ میں صلح کانفرنس کا اجلاس فوراً شروع کر دیا گیا اور اس سرعت کے ساتھ معاملات فیصل ہونے لگے، ۱۰؍اگست ۱۹۱۳ء کو فریقین نے صلح نامہ پر دستخط کر دیے، سب سے زیادہ نقصان بلغاریا کو برداشت کرنا پڑا، جس پر جنگ تقسیم کی تمام تر ذمہ داری عاید ہوتی تھی، اس نے یہ جنگ دراصل مقدونیا پر قبضہ کرنے کے لیے چھیڑی تھی، کانفرنس نے مقدونیا ہی سے اس کو تقریباً کلیۃً محروم کر دیا، مقدونیا یونان اور سرویا

---

(۱) میریٹ ص ۴۴۳

کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، سرویا کو وسطی مقدونیا ملا، جس میں اوکریڈا اور مناستر کو صوبہ اور نووی بازار کا نصف شرقی شامل تھا، اس کا نصف غربی مونٹی نگرو کو دیا گیا، یونان کے حصہ میں اپیرس، جنوبی مقدونیہ، سالونیکا اور مشرق میں دریائے مستا (Mista) تک ساحلی علاقہ آیا جس میں کوالا بھی شامل تھا، رومانیا نے دوبروجا کا ایک بڑا حصہ مع قلعہ سلسٹریہ کے پایا۔

دولت عثمانیہ کے ساتھ کوئی معاہدہ ۲۹ ستمبر تک نہ ہو سکا، ۲۹ ستمبر کو بالآخر باب عالی اور بلغاریہ کے درمیان بھی صلح ہو گئی، تھریس کا بڑا حصہ ترکوں کو واپس مل گیا، اس میں ادرنہ، دیموٹیکا اور قرق کلیسہ کے اہم شہر شامل تھے، یورپ میں دولت علیہ کی کائنات بس اسی قدر اور رہ گئی، باقی سارا علاقہ ریاستہائے بلقان میں تقسیم ہو گیا، بلغاریوں نے اس جنگ میں جو نقصانات برداشت کیے تھے ان کے معاوضہ میں انھیں تھریس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہاتھ آیا جس کا ایک حصہ بحر ایجین کے ساحل پر تو ضرور تھا لیکن اس میں کوئی اہم بندرگاہ نہ تھی، مارڈ ایورسلے اس موقع پر بلغاریہ کے متعلق لکھتا ہے: ”کمینہ غداری اور حد سے زیادہ غرور کا اس سے زیادہ مہلک انتقام کبھی نہیں لیا گیا۔“ (۱)

جنگ کے نتائج: بلقان کی دونوں جنگوں میں اخراجات کا تخمینہ تقریباً (۲۲۵۰۰۰۰۰۰) پونڈ کیا جاتا ہے اور کشتوں اور زخمیوں کی تعداد (۳۴۸۰۰۰) دونوں پہلوؤں میں سب سے زیادہ نقصان بلغاریہ کا ہوا، اس کے (۱۴۰۰۰۰) آدمی مارے گئے اور (۹۰۰۰۰۰۰۰) پونڈ صرف ہوئے، ترکوں کے مقتولوں اور زخمیوں کا شمار (۱۰۰۰۰۰) اور مصارف کا تخمینہ (۸۰۰۰۰۰۰۰) پونڈ تھا، سرویا کا (۷۰۰۰) آدمی اور (۵۰۰۰۰۰۰۰) پونڈ اور یونان جو نتیجہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ فائدہ میں رہا سب سے زیادہ سستا چھوٹا یعنی صرف (۳۰۰۰۰) آدمی اور (۲۵۰۰۰۰۰۰) پونڈ۔

علاقہ اور آبادی کے لحاظ سے نقصان صرف ترکی کا ہوا، جنگ سے پہلے اس کی یورپین آبادی کا تخمینہ (۶۱۳۰۲۰۰) تھا اور اس کا رقبہ (۶۵۳۵۰) مربع میل تھا، جنگ

---

(۱) ص ۴۶۷

کے اختتام پر (۴۳۳۹۲۰۰) آبادی، اس کی حکومت سے نکل گئی اور اس کے قبضہ میں صرف (۱۰۸۸۲) مربع میل اور باقی رہ گئے، مال غنیمت میں سب سے بڑا حصہ یونان کے ہاتھ آیا، یونان کی آبادی پہلے (۲۲۶۶۰۰۰) تھی، اب بڑھ کر (۴۳۶۳۰۰۰) ہوگئی اور اس کا رقبہ (۲۵۰۱۴) مربع میل سے (۴۱۹۳۳) مربع میل تک پہنچ گیا، سرویا کی آبادی پہلے میں لاکھ سے کسی قدر کم تھی، "صلح نامہ بخارسٹ" کے رو سے پینتالیس لاکھ ہوگئی اور رقبہ (۱۸۶۵۰) سے بڑھ کر (۳۳۸۹۱) مربع میل ہوگیا، رومانیا نے اپنی آبادی میں جو پہلے بھی دیا تھا بلقان میں سب سے زیادہ تھی، (۲۸۶۰۰۰) کا اضافہ اور کیا اور اپنی مملکت میں (۲۶۸۷) مربع میل بلغاریا کے مقبوضات سے لے کر ملالئے، بلغاریا کا نفع بقدر (۱۲۵۴۹۰۰) آبادی میں اور (۹۶۶۳) مربع میل توسیع مملکت میں رہا، مونٹی نگرو کی آبادی (۲۵۰۰۰۰) سے بڑھ کر (۴۸۰۰۰۰) تک پہنچ گئی اور اس کا رقبہ (۳۴۷۴) مربع میل سے (۵۶۰۳) مربع میل ہوگیا۔ (۱)

خالدہ ادیب خانم نے اپنے خطبات میں جنگ بلقان کے نتائج اور اثرات پر حسب ذیل روشنی ڈالی ہے۔

(۱) ترکوں کی شکست سے مغربی حکومتوں کے خیالات میں بہت بڑا تغیر واقع ہوا

(الف) روس ترکوں کے ہارنے سے خوش ہوا مگر ان کا اس بری طرح ہارنا اس کی مصلحتوں کے خلاف تھا، جنگ بلقان کے آغاز کے وقت اسوولسکی نے لکھا تھا: "ترکوں کی کامل شکست سے اتحاد میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔" وہ ترکی سلطنت کا خاتمہ بلقان کی ریاستوں کے ہاتھ سے نہیں بلکہ مغربی حکومتوں کے ہاتھ سے چاہتا تھا۔

(ب) بلغاریا والوں کی قابلیت اور تیکھے پن سے بھی روس کو اندیشہ پیدا ہوگیا، اس کی اور فرانس کی نظر عنایت اب سرویا کی طرف زیادہ ہوگئی اور وہی آسٹریا کی سلطنت کا وارث قرار دیا گیا، بلغاریا کی طرف سے شبہ تھا کہ وہ آسٹریا سے ساز باز رکھتا ہے۔

---

(۱) میرٹ ص ۳۶۶

(ج) فرانس اور انگلستان کو ترکی کی تباہی کا یقین ہوگیا، اس کی اہمیت ان کی نظر میں فوجی قوت کی وجہ سے تھی، اب انھیں اس سے مدد ملنے کی امید نہیں رہی اور انھوں نے یہ خیال چھوڑ دیا کہ اس سے بین الاقوامی ریاست کے کھیل میں مہرے کا کام لیں۔

(۲) ترکوں پر اس شکست کے جو اثرات ہوئے وہ اس سے بھی زیادہ گہرے تھے۔

(الف) شکست کی بڑی وجوہ یہ تھیں، کامل پاشا کا ضعف جو بڑھاپے میں پیدا ہوگیا تھا، اس کی خود بینی، اس کا مغرب کی حکومتوں پر آنکھ بند کر کے بھروسا کرنا جس کی وجہ سے اس نے اپنی آزمودہ کار فوج کو منتشر کر دیا، پرانے طرز کے افسروں کی عام نااہلی اور بے تدبیری، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پرانے لوگ سپاہی اور مدبر دونوں کی حیثیت سے بے وقعت ہوگئے۔

(ب) شکست کی مصیبت تو تھی ہی، اس پر طرہ یہ ہوا کہ بلقانیوں نے مسلمانوں کی آبادی کو جو جنگ میں شریک نہ تھی اور جس میں زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے قتل کرنا شروع کیا اور یہ لوگ بھاگ بھاگ کر ترکی میں پناہ لینے لگے، اسیران جنگ کو قتل کرنا، ان کو فاقوں مارنا، ان کے ہاتھ پیر کاٹنا، عام باشندوں کو اذیت پہنچانا اور ان کا خون بہانا، ان سب چیزوں کی ابتدا اس حال کی لڑائی میں بلقانیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں کی۔

(ج) مغرب ان ہولناک مظالم کو چپ چاپ دیکھتا رہا مگر جب بلقان کی ریاستوں نے ایک دوسرے کی عیسائی رعایا کے ساتھ بھی یہی حرکتیں شروع کیں تو مغرب سے مخالفت کی آواز اٹھی، دوسری جنگ بلقان کے بعد کارنیگی نے ایک بین الاقوامی کمیشن تحقیقات کے لیے بھیجا۔

جب ترک عورتوں نے استنبول کے یونی ورسٹی ہال میں جمع ہوکر یورپ کی بادشاہ بیگموں سے اپیل کی تھی کہ انسانی ہمدردی کی خاطر بلقان کی مسلم آبادی کی حمایت کریں تو جواب تک نہیں ملا تھا، ترکوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فریاد سے یہ بے اعتنائی

اور عیسائیوں کو اس حال میں دیکھ کر یہ جوش و خروش مسلمانوں پر بہت برا اثر ہوا۔ مقدونیہ سے ہزارہا مسلمان بھاگ کر اناطولیہ میں آئے تھے اور اپنی مظلومی کی داستان سناتے تھے اس کی وجہ سے اناطولیہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات جو اب تک بہت اچھے تھے بہت خراب ہو گئے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس مصیبت میں سلطنت کی مسلمان رعایا میں باہمی ہمدردی اور محبت بڑھ جاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔ دوسرے ملکوں کے مسلمان بھائیوں کے ہم بے حد احسان مند ہیں، ہندوستان کے مسلمانوں نے ہر ممکن طریقے سے ہمدردی اور ہمدردی کا اظہار کیا مگر سلطنت کے اندر مسلمانوں میں تفریق کا رجحان اور بھی قوی ہو گیا۔

* * *

جنگ عظیم

جنگ بلقان کے بعد نوجوان ترکوں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ اب جہاں تک ممکن ہو ملک کو جنگ کے مصائب سے دور رکھیں۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد ہی سے ترکی پر حملے شروع ہو گئے تھے اور بوسنیا اور ہرزیگووینا کے نکل جانے کے علاوہ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں جو شدید نقصانات برداشت کرنے پڑے اور جن قیمتی مقبوضات سے دست بردار ہونا پڑا ان کی تلافی کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا۔ نوجوان ترکوں نے ملک کی حالت کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا اور اب وہ کسی جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار نہ تھے، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ترکی کے سب سے بڑے اور سب سے قدیم دشمن روس سے بھی مصالحت کرنے کی کوشش کی اور ۱۹۱۴ء میں اس غرض سے ایک اہم وفد یالٹا میں زار کے پاس بھیجا، چنانچہ قسطنطنیہ میں ترکوں اور روسیوں کی ایک متحدہ انجمن بھی قائم ہوئی اور ترکی اخباروں میں یہ بحث ہونے لگی کہ آبنائے باسفورس روسی جہازوں کے لیے کھول دیا جائے، اسی طرح فرانس اور انگلستان سے بھی دوستانہ تعلقات جو طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں کشیدہ ہو گئے تھے دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی، نوجوان ترکوں نے یونان سے بھی مصالحت کرنی چاہی اور ان کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ”یونان کی مسلم ترکی رعایا کو مبادلہ ترکی کی یونانی رعایا سے کر لیا جائے تاکہ مقدونیا میں یونان اور ترکی کی مخالفت کا خاتمہ ہو جائے“(۱) غرض جنگ بلقان کے بعد

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۹۴

نوجوان ترکوں نے وہ سب کچھ کیا جو دوسری حکومتوں کی آویزش سے بچنے کے لیے ضروری تھا اور اگر چند مہینوں کے بعد جنگ عظیم چھڑ نہ گئی ہوتی اور ترکی کو بھی بدرجہ مجبوری اس میں شامل نہ ہو جانا پڑتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ تمام توقعات پوری ہو جائیں جو ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے ساتھ قائم کرلی گئی تھیں۔

جنگ عظیم کی شرکت: اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی، سلطنت عثمانیہ اس میں کسی فریق کا ساتھ دینے کے لیے مطلق آمادہ نہ تھی لیکن بعض ناگزیر اسباب سے مجبور ہو کر اسے کچھ دنوں کے بعد شرکت کرنی پڑی، وہ اسباب حسب ذیل تھے:

(۱) سلطنت عثمانیہ ان پابندیوں سے تنگ آگئی تھی جو مراعات خصوصی (Capitulations) کے پردہ میں یوروپین حکومتوں نے اس پر عاید کر رکھی تھیں، یہ مراعات گذشتہ صدیوں میں سلاطین نے یوروپین باشندوں کو عطا کی تھیں، جن کے رو سے ان باشندوں کو بعض مخصوص عدالتی اور تجارتی حقوق حاصل تھے مثلاً یوروپین باشندوں کو جو سلطنت عثمانیہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے، یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے مقدمات اپنے ہم قوم حکام کے سامنے لے جائیں اور اپنے وطنی قوانین کے مطابق ان کا فیصلہ کرائیں، بشرطیکہ فریقین مقدمہ ایک ہی قوم کے ہوں، ۱۹۲۵ء کے بعد سے یوروپین ممالک کے سفیروں کو اپنے ہم قوم افراد پر دیوانی کے معاملات میں مکمل اختیارات دے دیے گئے تھے، یہاں تک کہ غیر ملکی باشندے اپنی خواہش کے باوجود عثمانی عدالتوں میں اپنے معاملات پیش نہیں کر سکتے تھے، تجارتی مراعات کی وجہ سے ترکوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا تھا، بیرونی تاجر جہاں اور جس طرح چاہتے تھے اپنا کاروبار پھیلا دیتے تھے، وہ عثمانی قانون کے دائرہ سے باہر تھے، ان کے متعدد بنک بھی سلطنت کے مختلف حصوں میں کھلے ہوئے تھے، ان مراعات کے لحاظ سے یوروپین حکومتوں کو اپنے خاص ڈاک خانے قائم کرنے کا بھی حق حاصل تھا اور ان کے ڈاک خانے تمام سلطنت میں پھیلے ہوئے تھے، یہ ڈاک خانے چونکہ عثمانی حکام کی نگرانی سے بالکل آزاد تھے اس لیے ان

کے ذریعہ سے ممنوع اشیاء کی آمد و رفت بلا کسی روک ٹوک کے ہوتی رہتی تھی اور یہ عیسائی رعایا میں باغیانہ خیالات کے پھیلانے کا بھی ایک مستقل ذریعہ تھے۔ نوجوان ترکوں نے سلطان کی مطلق العنانی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد مراعات کے پھندے کو بھی اپنے گلے سے نکال دینا چاہا اور جنگ عظیم کے اعلان کے بعد جب انگلستان اور فرانس کی طرف سے ترکی کے غیر جانبدار رہنے کی خواہش کی گئی تو اس کے معاوضہ میں اتحادیوں کے سامنے مراعات کی منسوخی کا مسئلہ پیش کیا، لیکن اتحادی اس کے لیے تیار نہ ہوئے، وہ ترکی کو اس کی غیر جانبداری کا یہ معاوضہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ نوجوان ترکوں کا اعتدال پسند عنصر اور ملک کی رائے عامہ اتحادیوں کی طرف مائل تھی لیکن جنگ بلقان کے بعد اتحادی ترکی کی فوجی قوت کو حقیر سمجھنے لگے تھے اور باوجود اس کے کہ بلقان کی ریاستوں کو اپنا طرفدار بنانے کے لیے وہ انتہائی کوشش کر رہے تھے، انھوں نے ترکی کو ساتھ لینے کی مطلق پروا نہ کی۔ ان کے اس طرز عمل کی وجہ بقول خالدہ خانم یہ بھی تھی کہ "روس نے جو اتحادیوں میں شریک غالب کی حیثیت رکھتا تھا، لڑائی چھیڑی ہی اس غرض سے تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کر لیے جائیں۔"

(۲) ترکی کو سب سے زیادہ خطرہ روس کی طرف سے تھا، روس کی نگاہیں مدت سے قسطنطنیہ پر لگی ہوئی تھیں اور نوجوان ترک جانتے تھے کہ روس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے انگلستان بے تکلف قسطنطنیہ کو پیش کر دے گا۔ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے متعلق اتحادیوں کی باہمی مفاہمت خواہ ۱۹۱۵ء میں ہوئی جیسا کہ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے یا ۱۹۱۴ء میں جیسا کہ نوجوان ترک سمجھ رہے تھے، اس میں شبہ نہیں کہ ترکی کی جانب سے اتحادیوں کی بے اعتنائی کا اصل سبب یہی مسئلہ تھا، علاوہ بریں نوجوان ترک خوب سمجھتے تھے کہ اگر جنگ میں اتحادیوں کو فتح ہوئی تو روس سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے سے باز نہ رہے گا اور دولت علیہ کے استقلال کے وہ تمام وعدے طاق پر دھرے رہ جائیں گے جو غیر جانبداری کے معاوضہ میں اتحادیوں کی طرف سے کیے جا رہے تھے، اس بنا پر ترکی

کے لیے کوئی چارہ نہ تھا، بجز اس کے کہ اس فریق کا ساتھ دے جو روس کا مخالف ہو۔

(۳) سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت میں اتحادیوں نے ہمیشہ جس متعصبانہ ذہنیت کا ثبوت دیا تھا اور جس طرح علانیہ وہ عیسائیوں کی اقتصادی اور سیاسی برتری کو مسلم اکثریت کے مقابلہ میں قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس نے بھی نوجوان ترکوں کو مخالف فریق کی جانب مائل ہونے پر مجبور کیا، برخلاف اس کے جرمنی سے انھیں اس قسم کی کوئی شکایت نہ تھی، برطانیہ نے جنگ کریمیا کے وقت سے دولت عثمانیہ کے ساتھ جو دوستانہ تعلقات قائم کیے تھے، ۱۹۰۷ء میں ان پر ایک کاری ضرب پڑ چکی تھی اور اس سال برطانیہ اور روس کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس نے اسلامی ممالک کو پہلے سے بھی زیادہ روس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا، ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں حکومت برطانیہ کا رویہ بہت ہی خشک رہا اور جنگ بلقان میں نہ صرف حکومت بلکہ برطانوی قوم بھی ترکوں کی مخالف رہی۔

(۴) نوجوان ترکوں کی ایک باا‌ثر جماعت جس میں زیادہ تر فوج کے افسر تھے، جرمنی سے اتحاد کرنے کی حامی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ جرمنی روس کا مخالف تھا اور روس سلطنت عثمانیہ کا قدیم دشمن تھا، جرمنی بھی ترکی کی حمایت کو اپنے لیے نہایت قیمتی خیال کرتا تھا اور سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ ہی سے باب عالی میں اپنا رسوخ و اقتدار بڑھا رہا تھا، نوجوان ترکوں کے فوجی عنصر پر جرمن عسکریت کا اثر پوری طرح غالب تھا، خصوصاً انور پاشا جو فوجی پارٹی کے رکن اعظم تھے جرمنی کی حمایت میں سب سے زیادہ سرگرم تھے، یہ انھی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ۲/ اگست ۱۹۱۴ء کو جرمنی اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان قسطنطنیہ میں ایک معاہدہ ہو گیا اور بیرون فان وانگن ہائم (Baronvon wangenhem) اور صدر اعظم سعید حلیم پاشا نے اپنی حکومتوں کی طرف سے اس پر دستخط کر دیے، اس معاہدہ سے ظاہر ہے کہ ترک صرف روس کے مقابلہ میں جرمنی کی حمایت چاہتے تھے اور فرانس اور انگلستان کے خلاف کسی مدد کے طالب نہ تھے کیوں کہ

انھوں نے اس وقت تک فرانس یا انگلستان سے جنگ کرنے کا قصد بھی نہیں کیا تھا، چنانچہ صدر اعظم نے جرمنی اور اتحادیوں سے جنگ چھڑ جانے کے بعد بھی اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ جہاں تک انگلستان اور فرانس کا تعلق ہے ترکی غیر جانبدار رہے گا(۱) لیکن یہ معاہدہ بھی خفیہ تھا اور اس کا علم صرف تین آدمیوں کو تھا یعنی انور پاشا (وزیر حرب) طلعت پاشا (وزیر داخلہ) اور سعید پاشا (صدر اعظم) کو، جب مجلس وزرا کو اس کی اطلاع دی گئی تو اعتدال پسند فریق نے اس کی مخالفت کی، یہاں تک کہ بعض نے استعفا دے دیا استعفا دینے والوں میں جاوید بے بھی تھے، جو انجمن اتحاد وترقی کے ایک نہایت ممتاز رکن اور وزیر مال تھے، اس معاہدہ کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ فریقین آسٹریا ہنگری اور سرویا کی موجودہ لڑائی میں بالکل غیر جانبدار رہیں گے، لیکن چونکہ روس کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ سرویا کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا اور ایسی صورت میں جرمنی اپنے سابق معاہدہ کے رو سے مجبور ہوگا کہ آسٹریا ہنگری کی مدد کرے، اس لیے معاہدہ کی دوسری دفعہ یہ رکھی گئی کہ اگر روس نے مداخلت کی اور جرمنی کو آسٹریا ہنگری کا ساتھ دینا پڑا تو ترکی پر بھی یہ ذمہ داری عاید ہوگی، معاہدہ کی چوتھی دفعہ یہ تھی کہ اگر روس نے ترکی مقبوضات پر حملہ کیا تو جرمنی ان کی مدافعت میں مدد دے گا اور اگر ضرورت ہوئی تو اپنی فوجوں سے کام لے گا، جوں ہی جرمنی نے روس کے خلاف اعلان جنگ کیا اس معاہدہ کی دوسری دفعہ ترکی پر عاید ہوگئی اور اسے بھی جرمنی اور آسٹریا ہنگی کا ساتھ دینا پڑا۔

(۵) لیکن ابھی تک فرانس اور انگلستان کے معاملہ میں ترکی نے پوری غیر جانبداری کا ثبوت دیا تھا، اس غیر جانبداری کی شکست خود حکومت برطانیہ کے ہاتھ سے عمل میں آئی، ترکی کے دو جنگی جہاز انگلستان کے ایک کارخانہ میں تعمیر ہو رہے تھے اور جنگ شروع ہونے سے قبل یہ تیار بھی ہوگئے تھے، چنانچہ ترکی بحریہ کے افسر اور جہاز راں ان کو لانے کے لیے انگلستان پہنچ گئے تھے لیکن جب جرمنی نے جنگ کا اعلان کیا تو

---

(۱) ترک اور یورپ از گاستون گیلارڈ (Gaston Gaillard) مطبوعہ لندن ص ۲۹-۳۰

حکومت برطانیہ نے ان جہازوں کو ضبط کر لیا، حالانکہ ان کی قیمت ادا کی جا چکی تھی اور اس وقت تک برطانیہ اور ترکی کے درمیان جنگ نہیں چھڑی تھی، چونکہ ان جہازوں کی قیمت زیادہ تر ترکوں کے چندوں سے فراہم کی گئی تھی، اس لیے ان کی ضبطی سے عوام میں برطانیہ کے خلاف ایک شورش پیدا ہوگئی، اس واقعہ کے بعد ہی جرمنی کے دو جنگی جہاز گوبن (Goeben) اور برسلا (Breslaw) دردانیال پہنچے اور ترکی نے ان دونوں کو فوراً خرید لیا مگر ان کی کمان ابھی تک جرمن بحری افسروں کے ہاتھ میں تھی، اتحادیوں نے باضابطہ طور پر اعلان کر دیا تھا کہ اگر یہ جہاز آبنائے باسفورس سے نکلے تو بلا خیال اس کے کہ ان پر جرمن نشان ہے یا نہیں یا ان کے جہاز راں ترک ہیں انھیں دشمن کا جہاز سمجھا جائے گا، چنانچہ یہی ہوا کہ جب گوبن اور برسلا بحر اسود میں داخل ہوئے تو روسی جہازوں نے ان پر گولہ باری کی، مجبوراً ادھر سے بھی جواب دیا گیا، اس پر ۴ نومبر کو روس نے اور ۵ نومبر کو انگلستان اور فرانس نے ترکی سے اعلان جنگ کر دیا، اسی روز برطانیہ نے جزیرہ سائپرس کو جو ۱۸۷۸ء کے معاہدہ کی رو سے اس کے قبضہ میں تھا باقاعدہ طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، ۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء کو برطانیہ نے مصر پر اپنا محمیہ (Protectorate) قائم کرنے کا بھی اعلان کیا اور خدیو عباس حلمی کے بجائے جو اس وقت قسطنطنیہ میں مقیم تھا اور ترکوں کا ہمدرد ہونے کی وجہ سے تخت سے علاحدہ کیے جانے کا مستحق قرار دیا گیا، سابق خدیو اسماعیل پاشا کے ایک لڑکے شہزادہ حسین کامل کو سلطان مصر کے خطاب سے تخت پر بٹھایا، مصر پر محمیہ قائم کرنے کے لیے چونکہ فرانس اور روس کو راضی رکھنا ضروری تھا اس لیے باہم یہ مفاہمت ہوئی کہ جنگ کے خاتمہ پر برطانیہ روس کو قسطنطنیہ آبنائے باسفورس اور دردانیال پر قبضہ کرنے دے گا اور فرانس کو شام پر۔(۱)

دردانیال کی مہم: جنگ عظیم میں ترکی کی شرکت نے اتحادیوں (برطانیہ، فرانس، روس) کے لیے سخت دشواریاں پیدا کر دیں، جنگ بلقان کی شکستوں کے باوجود ترکوں کی فوجی

---

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۷۷

تربیت اور جواں مردی کا تجربہ انھیں بار بار ہو چکا تھا اور اب جرمنی سے اسلحہ اور دیگر سامان جنگ کی مدد پہنچنے سے ترکی فوجوں کی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا لیکن سب سے زیادہ جو چیز اتحادیوں کے لیے باعث تشویش ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ ترکی نے آبنائے باسفورس اور دردانیال کو غنیم کے جہازوں کے لیے بند کر دیا جس کی وجہ سے برطانیہ اور فرانس کا تعلق روس سے منقطع ہو گیا۔ روس ایک غیر صنعتی ملک تھا اور چند ہی دنوں میں یہ ظاہر ہو گیا کہ جب تک انگلستان اور فرانس کے کارخانوں سے کافی سامان جنگ اسے بہم فراہم نہ ہوتا رہے وہ زیادہ مدت تک جدید طرز کی جنگ کو جاری نہیں رکھ سکتا (۱) صورت حال اب یہ تھی کہ اتحادی دردانیال ورنہ بحری راستہ سے غنیم کا مقابلہ کرنے تصمیم کے عزم و ارادہ پر مجبور ہیں، چنانچہ ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء کو برطانیہ اور فرانس کے جنگی جہازوں نے دردانیال کے بیرونی قلعوں پر گولہ باری شروع کی، نتیجہ یہ تھا کہ یہ جہاز دردانیال میں بحفاظت داخل ہو کر براہ راست قسطنطنیہ پہنچیں اور دارالسلطنت پر قبضہ کر کے ترکی کو ناکارہ کر دیں۔ یہ تجویز مسٹر ونسٹن چرچل برطانوی وزیر بحریہ کے دماغ کی اپج تھی جس سے لارڈ کچنر اور بری جنگ کے بہترین ماہروں کو بھی پورا اتفاق نہ تھا (۲)۔ بہرحال اس مہم میں سخت ناکامی ہوئی اور حملہ آوروں کے متعدد جہاز غرق ہوئے اس کے بعد ۱۸ مارچ تک دشمنوں کے متحدہ جنگی بیڑے نے دردانیال پر دوبارہ حملہ کیا۔ ترکوں نے دردانیال کے قلعوں کو اس طرح مستحکم کیا تھا کہ اتحادی بیڑے کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، اتنا ہی نہیں بلکہ ترکی قلعوں کے گولوں سے اتحادیوں کے تقریباً پچاس ہزار سپاہی ہلاک ہوئے اور ان کے جنگی جہازوں کی ایک بڑی تعداد غرق ہوئی اور بہت سے جہاز بری طرح زخمی ہوئے۔

معرکہ گیلی پولی: ان شکستوں کے بعد اور اتنا نقصان اٹھا کر اتحادیوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ مہم صرف جہازوں کے ذریعہ کامیاب نہیں ہو سکتی، چنانچہ اب برطانیہ اور فرانس کے

---

(۱) شیویل ص ۴۱۳ (۲) ایورسلے ص ۳۷۹

ماہرین حرب نے ایک دوسری تدبیر سوچی، وہ یہ کہ زیادہ زور بری حملہ پر دیا جائے اور بری فوجوں کی مدد سے یہ مہم سر کی جائے یعنی جزیرہ نمائے گیلی پولی کے مغربی اور جنوبی ساحلوں پر فوجیں اتار کر دردانیال کے قلعوں پر پشت کی جانب سے حملہ کیا جائے۔ اس کے لیے بڑی بڑی تیاریاں ہوئیں، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا اور ہندوستان کے بہترین سپاہی بلائے گئے، مئی ۱۹۱۵ء میں اٹلی بھی اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہو گیا اور اس کے فوجی دستے بھی اس مہم کی شرکت کے لیے پہنچے، معلوم ہوتا تھا کہ جنگ کا فیصلہ اسی معرکہ پر مبنی ہے، ۲۵/اپریل کو برطانیہ اور آسٹریلیا اور ہندوستان کی فوجیں ہزاروں جانیں تلف کر کے بمشکل تمام آبنائے گیلی پولی کے یوروپین ساحل پر اتریں اور اسی طرح شدید نقصان اٹھانے کے بعد ایک فرانسیسی فوج آبنائے کے ایشیائی ساحل پر اتری پھر بھی مئی کے آخر تک بجز اس کے کہ حملہ آوروں کے چالیس ہزار آدمی مارے گئے اور کچھ حاصل نہ ہوا(۱)، ایشیائی ساحل پر جو فوج اتری تھی اسے بہت جلد بھاگنا پڑا، اب سارا زور گیلی پولی کے مغربی ساحل پر تھا، گیلی پولی میں ترکی فوجوں کی کمان جرمن جنرل لیمان سانڈرس کے ہاتھ میں تھی، اتحادی فوجوں نے پوری قوت کے ساتھ چار زبردست حملے کیے، پہلا حملہ ۱/مئی سے ۳/مئی تک قائم رہا، دوسرا ۶/مئی سے ۸/مئی تک، تیسرا ۴/جون کو ہوا اور چوتھا ۲۸/جولائی کو، اتحادی فوجیں اری برون کے مقام پر اتریں جو چناق بیر کی پہاڑی کے دامن میں واقع ہے اور وہاں سے چناق کی طرف بڑھنا شروع کیا، چناق بیر کی پہاڑی اس محاذ کی کنجی تھی، مصطفےٰ کمال اس وقت وادی میڈوس میں اپنے دستے کے ساتھ خیمہ زن تھے، جس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اتحادی چناق بیر کی طرف بڑھ رہے ہیں وہ فوراً پہاڑی پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچتے ہی آسٹریلین فوج کے دستہ پر جو بڑھتا ہوا چلا آ رہا تھا گولہ باری شروع کر دی، تمام دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی رہی اور اتحادی فوج پہاڑی کے دو تہائی حصہ تک پہنچ کر رک گئی،

---

(۱) میریٹ ص ۴۹۳

رات میں بھی مصطفیٰ کمال نے گولہ باری جاری رکھی، وہ چاہتے تھے کہ اتحادی فوج کو ہٹا کر ساحل تک بھگا دیں لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی، چناق بیر کی پہاڑی حقیقۃً دردانیال کی کنجی تھی اور دردانیال پر قبضہ کرنا گویا قسطنطنیہ پر قابض ہوجانا تھا، جب فریقین میں سے کوئی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا تو دونوں نے خندقیں کھود کھود کر حفظ وحفاظت کی تدبیریں شروع کیں، چند ہفتے اسی حالت میں گذر گئے اور دونوں فریق اپنی اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اب گرمی زیادہ پڑنے لگی تھی، پانی کا فراہم ہونا دشوار ہو رہا تھا، [illegible] بڑی تیز رہی تھیں اور سپاہیوں میں ہیضہ پھیل رہا تھا، آخر جولائی تک یہ بات واضح ہوئی کہ اتحادی فوج ایک بڑے حملہ کی تیاری کر رہی ہے، اس حملہ کے لیے مصر سے تازہ دم فوجیں اور سامان حرب کی ایک کثیر مقدار لائی جا رہی تھی، مقصد یہ تھا کہ کوجہ چمن کی چوٹی پر قبضہ کر لیا جائے، جو چناق بیر کے شمال میں واقع تھی اور مصطفیٰ کمال کی خندقوں کی زد سے باہر تھی، اس چوٹی پر قابض ہوجانے کے معنی یہ تھے کہ ترکوں کے حملہ سے محفوظ ہو کر دردانیال پر قبضہ ہو جاتا، ایک ہفتہ سے روز رات کو اتحادی فوجیں آ کر خندقوں میں چھپتی جا رہی تھیں، آخر ۶ اگست کی تاریک رات میں حملہ شروع ہوا۔ یہ حملہ تمام سابق حملوں سے زیادہ شدید تھا، اس میں "کچنر آرمی" بھی شامل تھی جو اتحادیوں کی سب سے زیادہ مضبوط فوج سمجھی جاتی تھی، جنگی جہاز الزبتھ اور دوسرے سینکڑوں بڑے بڑے جہاز دوسری طرف سے حملہ آور ہوئے، لیکن عین اس وقت جب اتحادی ہراول فتح کی آخری منزل کے قریب تھا ترکی اور جرمن جہازوں نے الزبتھ اور دوسرے اتحادی جہازوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو غرق کر دیا، البتہ کچنر آرمی ہرون کی چوٹی کی طرف بڑھنے میں کسی قدر کامیاب ہوئی، اتحادی جہازوں نے پھر گولہ باری شروع کی، ترکی فوجوں کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا لیکن آرمی ہرون پر قبضہ کرنا نہایت ضروری تھا، ورنہ اس کے بعد اتحادی الفرزا پر قابض ہو جاتے اور پھر گیلی پولی پر قبضہ کر لینا آسان تھا، اس نازک گھڑی میں ترکی فوجوں نے وطن کی مدافعت میں جیسی جانبازی دکھائی اس کی مثال خود ان کی

تاریخ میں بھی کم ملتی ہے، اتحادی سالار زور آری بجون کی چوٹی پر قبضہ کرنے کے لیے لگا رہے تھے، ترکی فوجوں کے سپہ سالار اعظم جنرل سانڈرس نے اس محاذ کی کمان مصطفیٰ کمال کو دے دی۔ لڑائی کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا، آخرکار اتحادی ہزاروں لاشیں میدان میں چھوڑ کر پسپا ہوئے، اتنی زبردست شکست انھیں اب تک پیش نہ آئی تھی۔ اس معرکہ میں مصطفیٰ کمال کی غیر معمولی فوجی قابلیت کا سکہ تمام دنیا پر بیٹھ گیا۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو سر آئین ہملٹن (Sir Ian Hemilton) سے اتحادی فوجوں کی کمان سر سی سی منرو (Sir C. C. Munro) کو سپرد کی گئی لیکن یہ سپہ سالار بھی حالات کو بہتر بنانے میں ویسا ہی ناکام ثابت ہوا جیسا اس کا پیش رو ہو چکا تھا۔ اتحادی ماہرین حرب کو مجبوراً فیصلہ کرنا پڑا کہ گیلی پولی کی مہم سر نہیں ہو سکتی۔ نومبر میں لارڈ کچنر گیلی پولی آئے مگر وہ بھی اس فیصلہ میں کوئی ترمیم نہ کر سکے، چنانچہ دسمبر کے آخری ہفتہ کی تاریک راتوں میں جبکہ موسم کی شدت اپنے شباب پر تھی اتحادی فوجوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ بھاگنا شروع کیا اور جنوری ۱۹۱۶ء کے پہلے ہفتہ تک تمام فوجیں نکل گئیں۔ اس مہم میں اتحادیوں کے مقتولین اور مجروحین کی تعداد ایک لاکھ بارہ ہزار تھی (۱) ترکوں کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچا، لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ یورپ کا "مرد بیمار" اپنے انتہائی ضعف کی حالت میں بھی کتنی حیرت انگیز طاقت کا مالک ہے۔

ایشیائے کوچک: دوسرے محاذوں پر ترکی فوجوں کو ایسی شاندار کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اعلان جنگ کے بعد فوراً ہی ترکی فوجیں بحر اسود میں روسی جہازوں پر حملہ آور ہوئیں اور اس کے بعد قارص اور تفلس کی طرف بڑھیں، لیکن روس نے ایشیائے کوچک میں ولایت آرمینیا پر حملہ کرکے بایزید، کوپری کوئی، اردہان اور ساری کمیش پر قبضہ کر لیا، ترکوں نے دلیری سے مقابلہ کیا، لیکن آرمینیوں کی غداری کے باعث انھیں ۲۱ اور ۲۲ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پسپا ہونا پڑا (۲)، ۱۹ مئی ۱۹۱۵ء کو وان پر بھی روسیوں کا قبضہ ہو گیا، پھر دوسرے سال،

---

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۸۰ (۲) ترک اور یورپ از گیلاڈ ص ۳۴

ارض روم، موش، بطلس، طرابزون اور ارزنجان بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس طرح جولائی ۱۹۱۶ء تک ارض روم، وان، طرابزون اور بطلس کے صوبوں پر روسی فوجیں قابض ہو گئیں۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۱۵ء کو ترکوں نے تبریز فتح کر لیا تھا، لیکن ان شکستوں کی وجہ سے وہ زیادہ دنوں تک تبریز پر قابض نہ رہ سکے اور ایرانیوں نے پھر اس پر قبضہ کر لیا۔

عراق: عراق میں بھی ترکی فوجوں کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ ۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو انگریزی فوج ایک ہندوستانی پلٹن کے ساتھ شط العرب میں اتری اور ۱۷ر نومبر کو سلیمان کی لڑائی میں کامیاب ہونے کے بعد ۲۲ر نومبر کو بصرہ اور ۵ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو کورنا پر قابض ہو گئی، جو دجلہ اور فرات کے سنگم پر واقع ہے۔ دوسرے سال ۲۹ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو اس نے قوت العمارہ بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے بغداد کی طرف بڑھنے کا قصد کیا، لیکن اس درمیان میں تازہ دم ترکی دستے عراق پہنچ گئے تھے اور انگریزی سپہ سالار جنرل ٹاؤنشنڈ (Townsend) کو بہت زیادہ نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا۔ ترکی فوج نے تعاقب کیا اور جنرل ٹاؤنشنڈ نے قوت العمارہ میں پناہ لی۔ ۵ر دسمبر ۱۹۱۵ء کو ترکوں نے قوت العمارہ کا محاصرہ شروع کیا اور ساڑھے چار مہینے تک محاصرہ جاری رہا۔ آخر مجبور ہو کر ۲۹ر اپریل ۱۹۱۶ء کو جنرل ٹاؤنشنڈ نے ہتھیار ڈال دیے اور وہ مع اپنی فوج کے قید کر لیا گیا۔ وہ قسطنطنیہ لے جا کر نظر بند کر دیا گیا، جہاں اسے ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، بجز اس کے کہ وہ حدود شہر سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی نظر بندی جنگ کے اختتام تک قائم رہی۔ قوت العمارہ کی کامیابی نے عراق میں ترکوں کی سابق شکستوں کی ایک حد تک تلافی کر دی، لیکن اس کے بعد جنرل ماڈ (Maude) نے پھر حملہ کی تیاری شروع کی اور ۲۴ر فروری ۱۹۱۷ء کو انگریز دوبارہ قوت العمارہ پر قابض ہو گئے۔ ترک لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے۔ دوسرا معرکہ بغداد میں پیش آیا اور ۱۱ر مارچ ۱۹۱۷ء کو بغداد بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۹ر مارچ کو انگریزی سپہ سالار نے عراق کے باشندوں کے نام ایک اعلان شائع کیا اور انھیں اطمینان دلایا کہ انگریز ان پر حکومت کرنے کی غرض سے نہیں آئے ہیں

آزاد کرنے کے لیے عراق میں آئے ہیں (۱) اہل عراق کو اس آزادی کا جو تجربہ ہوا اسے وہ کبھی نہ بھولیں گے۔

عرب کی بغاوت: - انگریزوں نے ترکوں کے خلاف سازش کا ایک زبردست جال پھیلا رکھا تھا۔ بغداد کی شکست سے تقریباً ایک سال قبل ۱۰ جون ۱۹۱۶ء کو شریف حسین نے عرب میں ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ۱۴ جون کو مکہ معظمہ اور ۲۷ جولائی کو جدہ پر قبضہ کر لیا۔ کرنل لارنس کی برسوں کی خفیہ کوششیں بار آور ہوئیں۔ حکومت برطانیہ نے عربوں کی سرپرستی فرمائی اور انھیں ترکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے میں پوری مدد دی۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں شریف حسین نے اپنے شاہ حجاز ہونے کا اعلان کیا اور ۱۴ دسمبر کو حکومت برطانیہ نے اس کی مستقل بادشاہت کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا۔ اس کا لڑکا امیر فیصل عربی فوجوں کو لے کر ترکوں کے مقابلہ میں شام کی طرف بڑھا۔ کرنل لارنس اور دوسرے انگریز افسران کے ساتھ تھے۔ شام میں ترکوں کی شکست کا ایک بڑا سبب عربوں کی بغاوت اور ان کا انگریزوں سے مل جانا تھا۔ برطانیہ نے شریف حسین کو اسلحہ اور روپیہ سے خوب مدد دی۔ ایسے نازک وقت میں عربوں کا یہ فعل نہ صرف فوجی حیثیت سے دولت عثمانیہ کے لیے مضر ثابت ہوا بلکہ اس کا اخلاقی اثر بھی برا پڑا۔ چنانچہ "پان اسلامزم" کی تحریک کو جسے دنیائے اسلام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نوجوان ترکوں نے جنگ شروع کرنے کے بعد پھر جاری کر دیا تھا اس سے سخت نقصان پہنچا۔ ترکی کے ساتھ اسلامی دنیا کی ہمدردی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس کا سلطان حرمین شریفین کا خادم بھی تھا۔ اگرچہ خلافت کی بنیاد تمام تر اسی خدمت پر نہ تھی تاہم خلافت جب سے دولت عثمانیہ میں آئی حرمین کی خدمت کا شرف بھی برابر اسے حاصل رہا۔ اب چونکہ مکہ معظمہ پر شریف حسین کا قبضہ تھا اور مدینہ منورہ بھی باغیوں سے گھرا ہوا تھا اس لیے سلطان کی خلافت کا مسئلہ معرض بحث میں آ گیا اور "پان اسلامزم" کی تحریک جو خلافت ہی پر قائم تھی کمزور ہو گئی۔

---

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۸۸

مصر: مصر میں بھی ترکوں کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی، فروری ۱۹۰۵ء میں جمال پاشا نے نہر سویز کو عبور کرنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت تک انگریزوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے فوجی دستے بھی اس محاذ پر منگا لیے تھے، برطانوی اور فرانسیسی جنگی جہاز پہلے سے نہر کی حفاظت کے لیے موجود تھے، اگر ترکوں نے اعلان جنگ کے بعد ہی سویز کو عبور کرنے کی کوشش کی ہوتی تو وہ آسانی سے کامیاب ہو جاتے، لیکن تین ماہ کی تاخیر نے انگریزوں کو مدافعت کا کافی موقع دے دیا اور جمال پاشا کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا، دوسرے سال جولائی میں ترکوں نے مصر پر حملہ کرنے کی پھر کوشش کی لیکن نہر سویز کے قریب رومانی کی جنگ میں انھیں شکست ہوئی، اس کے بعد امیر فیصل کی فوج انگریزی دستوں کے ساتھ شام کی طرف بڑھی، جس کی وجہ سے ترکوں کو مصر کا خیال ترک کر دینا پڑا۔

بالشویک انقلاب مارچ ۱۹۱۷ء: ۱۳/ مارچ ۱۹۱۷ء کو روس میں "بالشویک انقلاب" برپا ہوا اور ۶/ اپریل ۱۹۱۷ء کو امریکہ نے اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کیا، روسی انقلاب سے اتحادیوں کی قوت کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی امریکہ نے کر دی، لیکن یہ انقلاب ترکوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا، انھوں نے ان تمام علاقوں کو جن پر روسی فوجوں کا قبضہ ہو چکا تھا واپس لے لیا اور اس کے بعد خود روسی علاقوں میں بڑھنے کی تیاری شروع کی، چنانچہ انور پاشا ایک فوج لے کر کوہ قاف کے محاذ پر پہنچ گئے۔

شام و فلسطین: یہ وہ زمانہ تھا جب اتحادی فوجیں شام اور فلسطین پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی تھیں، شام میں ترکی فوجوں کی کمان جمال پاشا کے ہاتھ میں تھی جو مصر کے محاذ سے واپس آ چکے تھے، مارچ اور اپریل ۱۹۱۷ء میں انگریزی فوج پوری قوت کے ساتھ غزہ پر حملہ آور ہوئی، لیکن دو ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد بھی آگے نہ بڑھ سکی، اس کے بعد ہی انور پاشا ایک فوج کے ساتھ کوہ قاف کی طرف روانہ ہو گئے، جس کی وجہ سے شام کے محاذ پر ترکوں کی قوت کمزور ہو گئی اور انگریزی فوج آگے بڑھنے لگی، چنانچہ

۳۱/ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو انگریزوں نے بیر شیبہ پر قبضہ کر لیا اور ایک ہی ہفتے کے بعد ۷ نومبر کو غزہ بھی فتح ہو گیا، غزہ کی تسخیر نے شام کا راستہ صاف کر دیا اور انگریزی فوج شام اور فلسطین کے تمام اہم مقامات پر یکے بعد دیگرے قابض ہو گئی، چنانچہ ۹/ دسمبر ۱۹۱۷ء کو یروشلم نے ہتھیار ڈال دیے اور جنرل النبی ایک فاتح کی حیثیت سے بیت المقدس میں داخل ہوا، لیکن اس مقام کا احترام ملحوظ رکھا کہ پیدل داخل ہوا، بیت المقدس کی فتح سے تمام مسیحی یورپ میں مسرت و شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی، صدیوں کی پیہم کوشش کے بعد صلیبی علم اس ارض پاک پر ایک بار پھر لہرانے لگا۔ ستمبر ۱۹۱۸ء میں جنرل النبی (Allenby) عکہ اور حیفہ پر قابض ہو گیا، اس کے بعد ۲۸/ ستمبر کو عربی فوج انگریزی فوج سے آملی اور یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو امیر فیصل اور جنرل النبی دمشق میں داخل ہوئے، ۲/ اکتوبر کو فرانسیسی بیڑہ بیروت کی بندرگاہ میں پہنچا اور دوسرے روز بیروت بھی اتحادیوں کے قبضہ میں آ گیا، پھر ۱۳/ اکتوبر کو طرابلس، ۱۵/ کو حمص اور ۲۶/ اکتوبر کو حلب کا آخری مورچہ بھی اتحادیوں نے فتح کر لیا یعنی اکتوبر ۱۹۱۸ء کے آخر تک حجاز، شام، لبنان اور عراق عرب کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے تسلط میں آ گئے۔

صلح نامہ مدرس: شام ترکی فوجوں کا آخری محاذ تھا، حلب کے معرکے کے بعد ترکوں کی قطعی شکست میں کوئی شبہ باقی نہ رہا، جنگ کے آغاز میں ترکی نے دس لاکھ سے زیادہ فوج میدان میں بھیجی تھی، چار سال کے اندر چار لاکھ ستائیس ہزار سپاہی مارے گئے، چار لاکھ زخمی ہوئے اور ایک لاکھ تیرہ ہزار قید کر لیے گئے یا مفقود الخبر پائے گئے(۱)، مال کا جو نقصان ہوا اس کا اندازہ بھی مشکل ہے، تاہم ترکی نے جو کچھ کر دکھایا، اس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، یورپ کو ترکوں کی فوجی قوت سے اتنی توقع نہ تھی، اتحادی سمجھ رہے تھے کہ چند مہینوں کے اندر ترکی کا خاتمہ کر دیں گے اور اس کے حصے بخرے کر کے آپس میں تقسیم کر لیں گے، اسی وجہ سے انھوں نے دردانیال کے حملہ پر اپنی پوری قوت

---

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۹۳

صرف کرنی تھی اور یہی اس جنگ کا سب سے اہم موڑ تھا، تاہم ترکوں نے جس جرات انگیز سرفروشی کے ساتھ درہ دانیال کو دشمنوں کے حملے سے محفوظ رکھا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، لیکن شام کی پیہم شکستوں کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ ترک جنگ کو جاری نہیں رکھ سکتے، حلب کی جنگ سے تقریباً ایک ہفتہ قبل ۳۰ ستمبر کو بلغاریا نے جو ترکی اور جرمنی کا حلیف تھا، اتحادیوں کے سامنے بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈال دیے تھے اور خود جرمنی بھی میدان جنگ سے علاحدہ ہو رہا تھا، ایسی صورت میں جبکہ اس کے حلیفوں کی قوت بھی بالکل ٹوٹ چکی تھی، ترکی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اتحادیوں سے صلح کی خواہش کرے، صلح کی گفتگو کے لیے رؤف بے وزیر بحریہ، رشاد حکمت بے نائب وزیر خارجہ اور سعد اللہ بے تھرڈ آرمی کے جنرل اسٹاف کے صدر روانہ کیے گئے، ۳۰/اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ترکوں اور اتحادیوں کے درمیان مدرس کے مقام پر عارضی صلح کے شرائط طے ہو گئے اور صلح نامہ پر فریقین نے دستخط کر دیے، اسی درمیان میں انور پاشا، جمال پاشا اور طلعت پاشا نیز انجمن اتحاد و ترقی کے بہت سے ممبر یہ دیکھ کر کہ وہ ملک کو اب کسی طرح بچا نہیں سکتے اور نہ ان شرائط پر راضی ہو سکتے جو اتحادیوں کی طرف سے عاید کی جائیں گی، ترکی سے باہر چلے گئے اور حکومت کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ گئے جو اس نازک وقت میں کسی طرح اس کے اہل نہ تھے، یوں ۱۹۱۸ء میں انجمن اتحاد و ترقی کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے لیڈروں نے ملک سے روپوش ہو کر خود انجمن کے اقتدار کو ہمیشہ کے لیے مٹا ڈالا۔

عارضی صلح کے بعد اتحادی فوجوں نے قسطنطنیہ، جیلشیا اور چناق پر قبضہ کر لیا، ترکی فوجیں یہ سمجھ کر کہ یہ قبضہ عارضی ہے اور صلح نامہ پر دستخط ہونے کے بعد ختم ہو جائے گا منتشر ہو گئیں، لیکن چند ہی ہفتوں کے بعد انھیں معلوم ہو گیا کہ وہ دھوکے میں تھیں، کیونکہ جب اتحادیوں نے یہ دیکھا کہ ترکی کی فوجی قوت ٹوٹ چکی ہے اور تمام ملک میں ابتری پھیلی ہوئی ہے تو ان خفیہ معاہدوں کی تکمیل کا حوصلہ پیدا ہوا جو باہم دوران جنگ میں کیے گئے تھے، پروفیسر ٹوائن بی (Toynbee) نے اپنی کتاب ”ترکی“ میں لکھا ہے

کہ "جس طرح بھوکے بھیڑیے شکار کی تاک میں خیمہ گاہ کے گرد چکر کاٹتے ہیں اسی طرح اتحادی طاقتیں اس فکر میں تھیں کہ موقع پا کر ترکی پر ٹوٹ پڑیں کیوں کہ ترکی قطعاً ایک زرخیز ملک ہے اور شہنشاہیت تنزل میں واقع ہوئی ہے"(۱) وہ خفیہ معاہدے ذیل تھے:

خفیہ معاہدے: پہلا معاہدہ جو "معاہدۂ قسطنطنیہ" کے نام سے مشہور ہے ۱۸ مارچ ۱۹۱۵ء کو برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان ہوا تھا، یہ تمام طور پر قسطنطنیہ، آبنائے باسفورس اور دردانیال سے متعلق تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ روس قسطنطنیہ، باسفورس کے دونوں ساحلوں اور بحیرہ مارمورا اور دردانیال کے مغربی ساحل پر قبضہ کر لے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ قسطنطنیہ کی بندرگاہ تمام دنیا کے تجارتی جہازوں کے لیے کھلی رہے۔ دوسری دفعہ یہ تھی کہ ایران کا نام نہاد ناقابل مداخلت خطہ (Neutral zone) جس کی تصریح ۱۹۰۷ء کے معاہدہ روس و انگلستان میں ہوچکی تھی اور جو تیل کے چشموں کی وجہ سے ایک نہایت قیمتی خطہ تھا، برطانیہ کے حدود اثر میں رکھا جائے۔ تیسری دفعہ کے مطابق یہ طے ہوا کہ مسلمانوں کے مقدس مقامات دولت عثمانیہ سے کاٹ کر ایک خودمختار اسلامی حکومت کو دے دیے جائیں، آخری دفعہ میں روس نے وعدہ کیا کہ اگر ضرورت ہوئی تو دردانیال کے حملہ میں حکومت روس اتحادیوں کی مدد کرے گی۔

دوسرا معاہدہ "لندن کا خفیہ معاہدہ" تھا، جس پر ۲۶ اپریل ۱۹۱۵ء کو اٹلی، فرانس، برطانیہ اور روس کے نمائندوں نے دستخط کیے تھے، یہ معاہدہ اٹلی کو جنگ میں شریک کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا اور اس میں ایشیائی ترکی کی تقسیم کے وقت اٹلی کو بعض خاص علاقے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، مثلاً ادالیہ کا صوبہ اور اس سے متصل بحر روم کے ساحلی علاقہ کا ایک "معقول" حصہ۔

تیسرا "معاہدہ سائکس پیکو" (Sykas Picol Agreement) جس پر ۱۶ مئی ۱۹۱۶ء کو دستخط ہوئے تھے، برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان ہوا تھا اور اس میں

---

(۱) ترکی از آرنلڈ ٹوائن بی (Turkey by Arnold Toynbee) مطبوعہ لندن ۱۹۲۶ء ص ۲۸

سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویزیں مرتب کر لی گئی تھیں۔ اس میں سب سے پہلے عربوں کو دولت علیہ سے باغی کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی اور یہ طے پایا تھا کہ عربوں کی ایک مستقل خود مختار حکومت یا عرب مملکتوں کی ایک وفاقی حکومت قائم کر دی جائے پھر فرانس اور انگلستان کے حلقہ ہائے اثر طے کر لیے گئے تھے اور بعض علاقوں پر قابض ہونے کی اجازت روس کو دے دی گئی تھی، بندرگاہوں اور ریلوے سے متعلق بعض مخصوص حقوق بھی باہم طے کر لیے گئے تھے۔

چونکہ اٹلی اس وقت تک جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ شریک ہو چکا تھا، اس لیے اس نے "معاہدہ سائکس پیکو" کے متعلق فوائد میں بھی شریک ہونے کا مطالبہ کیا اور برطانیہ اور فرانس کو بادل ناخواستہ سلطنت عثمانیہ کی کاغذی تقسیم میں اسے بھی شریک کرنا پڑا، چنانچہ ۱۷ اپریل ۱۹۱۷ء کو انگلستان، فرانس اور اٹلی کے درمیان "سینٹ ژان ماریَن" (St. gean de maurunno) کا معاہدہ طے ہوا، جس میں ایشیائے کوچک کے مغربی علاقوں پر اٹلی کا حلقۂ اثر تسلیم کیا گیا، اس خطہ میں سمرنا بھی شامل تھا، لیکن اس معاہدہ کے قطعی طور پر مکمل ہونے کے لیے روس کے دستخط بھی ضروری تھے اور چونکہ اسی زمانہ میں "بالشویک انقلاب" کے رونما ہو جانے سے روس کی شہنشاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے دستخط حاصل نہ ہو سکے، اس لیے یہ معاہدہ نامکمل رہ گیا اور قانوناً ناقابل نفاذ قرار پایا، "صلح کانفرنس" میں جب انگلستان اور فرانس نے مغربی ایشیائے کوچک اور سمرنا میں یونانیوں کو تسلط دلانا چاہا اور اٹلی نے اس معاہدہ کو پیش کر کے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو معاہدہ کے نامکمل ہونے کا یہی قانونی عذر پیش کیا گیا تھا۔ (۱)

اندرونی حالت: ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جب دول متحدہ نے التوائے جنگ کا اعلان کیا تو ترکوں کو یک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور وہ تقریباً ان تمام شرائط صلح کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے جو اتحادیوں کی طرف سے پیش کی جائیں، وجہ یہ تھی کہ ترکی کی اندرونی حالت

---

(۱) ترکی از نواب علی ص ۷۰-۷۹

اس وقت نہایت درجہ نازک تھی، انجمن اتحاد و ترقی کے لیڈر ملک سے رخصت ہو چکے تھے، کوئی اور منظم پارٹی موجود نہ تھی جو انجمن اتحاد کی جگہ لیتی، حکومت پھر سلطان کے ہاتھ میں آ گئی تھی، اس نے موجودہ پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا مگر نئے انتخابات کا حکم نہیں دیا، حکومت نام کے لیے تو سلطان کے ہاتھ میں تھی مگر اصلی فرماں روائی اتحادیوں کو حاصل تھی جن کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں، التوائے جنگ کے اصولی شرائط یہ تھے کہ دردانیال اور آبنائے باسفورس بالکل آزاد رہیں گے اور اصول قومیت اور خود مختاری کا پورا طرح لحاظ رکھا جائے گا، دفعہ ۷ کی رو سے دول متحدہ کے حدود بھی مقرر کر دیے گئے تھے تاکہ جن صوبوں میں ترکی کی اکثریت ہے ان میں مداخلت نہ کی جائے، دفعہ ۲۴ کے لحاظ سے مذکورہ بالا صوبوں میں اتحادی اسی وقت مداخلت کرنے کے مجاز تھے، جب ترکوں کی طرف سے اتحادیوں کے حقوق پر ناجائز حملہ کیا جائے یا آرمینیا کے علاقے میں فتنہ و فساد رفع کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے لیکن اتحادیوں نے ان شرائط کی خلاف ورزی کی اور بغیر کسی معقول عذر کے قسطنطنیہ، تھریس اور اناطولیہ کے ایک بڑے حصے پر اپنا تسلط قائم کر لیا، ترکوں میں اس وقت صدائے احتجاج بلند کرنے کی بھی طاقت نہ تھی، اتحادیوں نے التوائے جنگ کے ان اصولی شرائط کی تو خلاف ورزی کی لیکن جو دفعات ان کے مفید مطلب اور ترکی کو بالکل بے دست و پا بنا دینے والی تھیں ان پر نہایت شد و مد کے ساتھ عمل درآمد شروع کر دیا، مثلاً ترکی فوجوں کی تخفیف اور سامان حرب کا حوالہ کر دینا، ترک دس سال سے برابر میدان جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے، جس کی وجہ سے بقول خالدہ خانم "ملک کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا،" وہ ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار تھے لیکن انہیں دول متحدہ کے خفیہ معاہدوں کی خبر نہ تھی، جس سے اندازہ ہو جاتا کہ صلح کے لیے انہیں کتنی گراں قیمت ادا کرنی پڑے گی، تاہم عارضی صلح سے قبل ہی ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے اپنی ایک تقریر میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ علاقے جہاں ترکوں کی اکثریت ہے اور دارالسلطنت

قسطنطنیہ ترکی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے گا، اس کے یہ معنی تھے کہ ترکی کو اپنے دوتہائی مقبوضات سے ہاتھ دھونا پڑے گا، جنگ کے خاتمہ پر ترک اس کو بھی غنیمت سمجھتے تھے اور وہ یہ توقع کر رہے تھے کہ آئندہ غیروں کی مداخلت سے محفوظ رہ کر اپنی نئی زندگی کی تشکیل کر سکیں گے، لیکن لائڈ جارج کا یہ اعلان جس میں قسطنطنیہ کو ترکوں کے لیے چھوڑ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، ترکوں کے ساتھ ہمدردی پر مبنی نہ تھا، واقعہ یہ تھا کہ قسطنطنیہ اور دردانیال و آبنائے باسفورس پر معاہدۂ لندن کے مطابق روس کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن جب ۱۹۱۷ء میں "بالشویک انقلاب" برپا ہوا اور حکومت روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو جہاں تک روس کے خفیہ معاہدہ کا تعلق تھا تو وہ معاہدہ کالعدم ہو گیا، اب سوال یہ پیدا ہوا کہ قسطنطنیہ، دردانیال اور آبنائے باسفورس کے علاقوں کا حقدار کون ہے، اس مسئلے کے متعلق اتحادیوں میں اختلاف شروع ہوا، بالآخر انھوں نے یہ سوچا کہ اگر ان علاقوں کو ترکی کے نام نہاد تصرف میں رکھا جائے تو آپس کی نااتفاقی کا خطرہ دور ہو جائے گا، علاوہ بریں امریکہ نے جنگ میں شرکت اس شرط پر کی تھی کہ دوران جنگ کے تمام خفیہ معاہدات منسوخ کر دیے جائیں گے، چوں کہ انگلستان اور فرانس کو اس وقت امریکہ کی مدد کی سخت ضرورت تھی، اس لیے اس شرط کو منظور کر لیا تھا، پریسڈنٹ ولسن نے کہا تھا کہ "جتنے ملک جنگ میں شریک ہیں ان کی نئی تقسیم مدعی ریاستوں کے مطالبات کے اعتبار سے نہیں بلکہ رعایا کے مفاد کے لحاظ سے کی جائے۔" ایک اور موقع پر اس نے کہا تھا: "ہمارا فیصلہ بے لاگ ہوگا، اس میں یہ تفریق نہیں کی جائے گی کہ جن کے ساتھ ہم چاہیں انصاف کریں اور جن کے ساتھ نہ چاہیں نہ کریں، انصاف ایسا ہونا چاہیے جس میں کسی کی رعایت نہ کی جائے، جس کا معیار صرف یہ ہو کہ قوموں کے حقوق میں مساوات برتی جائے۔" خالدہ خانم اس پر تبصرہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں: "پرانے مدبروں میں صرف یہی ایک شخص تھا جس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ نوع انسانی امن کی آرزومند ہے، ان الفاظ میں جو شکسپیر کا سا زور بیان اور انجیل کی سی سادگی رکھتے تھے اس نے اپنے چودہ اصولوں کا اعلان کیا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دس احکام کی طرح پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ اصول بھی یادگار رہیں گے مگر فرق یہ تھا کہ حضرت موسیٰ اپنے احکام کو نافذ کرنے کی قوت رکھتے تھے اور ولسن اس سے محروم تھا، وہ دنیا کی بزم شوریٰ میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح آیا! اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ صلح کی شرطیں انہی پرانے طرز کے مدبروں نے طے کیں۔ یہ بڑے قابل لوگ تھے اور جنگ سے پہلے حب وطن کے جو معنی سمجھے جاتے تھے ان کے لحاظ سے محب وطن بھی تھے مگر سب کے سب اتنے بے بصیرت تھے کہ خدا کی نشانیوں کو جو نور کے حرفوں میں دیوار پر نظر آ رہی تھیں نہیں دیکھ سکے، اتنے بے حس تھے کہ جذبات کی نئی لہروں کو جو جمہور کے دلوں میں ابھر رہی تھیں نہیں سمجھ سکے، اتنے نافہم تھے کہ انھوں نے جنگ عظیم کے بعد بھی یہ سبق نہیں سیکھا کہ جو محب وطن اپنے ملک کی سلامتی چاہتا ہے اسے اپنے ہمسایہ ملکوں میں بھی امن و امان کی فضا پیدا کرنی چاہیے۔ (۱)

کیپٹن ہیرلڈ آرم اسٹرانگ جو عارضی صلح کے زمانہ میں برٹش ہائی کمشنر کے ساتھ قسطنطنیہ میں مقیم تھا، بیان کرتا ہے کہ اس وقت انگریز ترکوں کے سخت مخالف تھے اور ان کے خلاف بڑا شور وغل مچا رہے تھے۔ ہر طرف سے یہی آواز ابھر رہی تھی کہ قسطنطنیہ اور ایا صوفیہ پر مسیحی تسلط پھر قائم کر دیا جائے اور ترکوں کو یورپ سے نکال دیا جائے۔ جو لوگ مذہبی جذبات سے متاثر نہ تھے ان میں بھی جنگ کی پیدا کردہ نفرت کا جذبہ غالب تھا۔ اس بات پر سب کا اتفاق تھا کہ ترکی کا خاتمہ کر دیا جائے اور مسٹر لائڈ جارج اس خیال کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔ (۲)

صلح کانفرنس کی بے پروائی: ۱۸ر جنوری ۱۹۱۹ء کو پیرس میں صلح کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا، لیکن اتحادی یوروپین مسائل کا تصفیہ کرنے میں اس قدر منہمک ہوئے کہ انھیں ترکی کے معاملات کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہوئی، وہ سمجھ رہے تھے کہ ترکی

---

(۱) ترکی میں شرق و مغرب کی کشمکش از خالدہ ادیب خانم ص ۱۱۴-۱۵ (۲) ترکی در نزع از ہیرلڈ آرم اسٹرونگ (Turkey in traval by Harlod armsrong) ص ۱۴

کے معاملات آسانی سے ملتوی کیے جا سکتے ہیں، چنانچہ وہ انہی گتھیوں کے سلجھانے میں الجھے رہے جو ان کے سابق خفیہ معاہدوں سے پیدا ہو گئی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کے مسائل اور زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے اور صلح کانفرنس کے لیے مزید دشواریاں پیش آنے لگیں۔

عدالیہ پر اٹلی کا قبضہ: سب سے پہلے ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب ۲۹ مارچ ۱۹۱۹ء کو اطالوی فوجیں مشرقی اناطولیہ کے ساحل پر عدالیہ میں اتریں اور انگلستان اور فرانس کے احتجاج کے باوجود اس علاقہ پر تیزی کے ساتھ قابض ہونے لگیں، اس احتجاج کے جواب میں اٹلی نے معاہدہ سین ژان دی مارین کا حوالہ دیا، جس کے رو سے سمرنا اور عدالیہ کے علاقہ پر اس کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اٹلی نے عدالیہ پر قبضہ کرنے کے بعد سمرنا کا مطالبہ کرنا شروع کیا، لیکن چونکہ معاہدۂ مذکورہ پر روس کے دستخط نہ ہو سکے تھے، اس لیے انگلستان اور فرانس نے اسے ناقابل نفاذ قرار دیا، اس پر اٹلی کا نمائندہ سانئر آرلینڈو (Signor orlando) "صلح کانفرنس" سے علاحدہ ہو گیا۔

سمرنا پر یونانی قبضہ: آرلینڈو کے یوں چلے جانے سے اتحادیوں اور خصوصاً یونان کو یہ اندیشہ ہوا کہ ممکن ہے اٹلی اتحادیوں کی اجازت کے بغیر ہی سمرنا پر قبضہ کر لے اور معاہدۂ ژان دی مارین کے ناقابل نفاذ ہونے کی پروا نہ کرے۔ صلح کانفرنس میں یونان کا نمائندہ وینزیلوس (وزیر اعظم) تھا، جو لائڈ جارج پر غیر معمولی اثر رکھتا تھا، اس نے اس موقع پر سیکڑوں جھوٹے تار کانفرنس میں پیش کیے، جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سمرنا کے علاقہ میں ترک قتل عام برپا کیے ہوئے ہیں اور اس کے ماتحتوں نے غلط نقشے مرتب کر کے یہ ثابت کرنے کے لیے کانفرنس کے سامنے رکھے کہ سمرنا کے شہر اور علاقہ میں یونانی آبادی ترکوں سے بہت زیادہ ہے(۱)، اتحادیوں نے وینزیلوس کے بیانات کو باور کر لیا اور مسٹر لائڈ جارج، پریسیڈنٹ ولسن اور کلیمنسو کے دستخط سے حکم نافذ ہوا کہ یونانی فوجیں سمرنا پر قبضہ کر لیں، مسٹر ٹوائن بی لکھتے ہیں کہ اتحادیوں کے اس فیصلہ کے اصلی مقصد

---

(۱) ترکی درد زہ میں از آرم اسٹرانگ ص ۸۴

دو تھے، اول یہ کہ یونان کو موقع دیا جائے کہ ایشیائے کوچک میں اپنی قدیم سلطنت کو دوبارہ قائم کرنے کا حوصلہ پورا کرے، دوسرا مقصد یہ تھا کہ اطالوی ناجائز طور پر اس علاقے پر قابض نہ ہو جائیں جس سے بین الاقوامی پیچیدگیوں کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، لیکن وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس علاقے میں ترکوں کی طرف سے نقض امن ہو رہا ہے، جس کے باعث یونانی باشندے اور دوسری اقلیتیں سخت خطرے میں ہیں، لیکن سمرنا پر یونانی قبضے کے متعلق اتحادیوں کا جو کمیشن تحقیق حالات کے لیے مقرر ہوا تھا، اس کی رپورٹ نے اس بیان کی تکذیب کردی۔ یہ رپورٹ ۱۲/ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو پیش کی گئی، اس کا ابتدائی حصہ حسب ذیل تھا۔

> ”تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ عارضی صلح کے بعد سے ولایت ایدین کے عیسائیوں کی حالت قابل اطمینان رہی ہے اور ان کی سلامتی خطرہ میں نہ تھی، اگر سمرنا پر قبضہ کا حکم صلح کانفرنس نے غلط اطلاع کی بنا پر دیا تو اس کی ذمہ داری سب سے پہلے ان اشخاص یا حکومتوں پر عاید ہوتی ہے، جنھوں نے بے پروائی کے ساتھ ایسی اطلاع بہم پہنچائی لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ اس قبضہ کے لیے مطلق کوئی وجہ جواز نہ تھی اور اس سے عارضی صلح کی ان شرائط کی خلاف ورزی واقع ہوئی جو دول متحدہ اور ترکی کے درمیان طے ہوئی تھیں۔“(۱)

سمرنا کا قتل عام: بہرحال ۱۵/ مئی ۱۹۱۹ء کو یونانی فوجیں برطانوی، فرانسیسی اور امریکن جنگی جہازوں کے ساتھ سمرنا پہنچیں اور شہر اور مضافات کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کرنے لگیں، آرم اسٹرانگ لکھتا ہے: ”انھوں نے ساحل پر اترنے کے بعد فوراً ہی قتل عام شروع کر دیا، بندرگاہ کے قریب جو برطانوی جنگی جہاز لنگر انداز تھا اس کے افسروں اور آدمیوں کو حکم تھا کہ بالکل خاموش رہیں، حالانکہ چند ہی گز کے فاصلہ پر یونانی فوجیں

---

(۱) ترکی از ٹوائن بی ص ۷۲

قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے ہوئی تھی ۔۔۔ سمرنا کے بعد یونانی آگے بڑھے، دکانوں میں آگ لگاتے، لوٹ مار کرتے اور عورتوں کی عصمت دری کرتے ہوئے جیسا کہ بلقان کی قومیں جنگ کی حالت میں کرتی ہیں۔"(۱) ٹوائنبی یونانی فوج کے سمرنا میں داخل ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے: "۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہوئی جیسے کوہ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ جنگ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے بعد ایک روز دفعتاً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتل عام شروع ہو گیا، محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لیے گئے، عقبی خطے کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی ندیاں بہہ گئیں، ایک فوجی دیوار کھڑی ہو گئی جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کی بندرگاہوں کو اندرون ملک سے جدا کر کے تجارت کو تباہ کر دیا، لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سڑکیں مسمار کر دی گئیں، ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور جو بچ رہے وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کر لیے گئے یا جلاوطن کر دیے گئے، غرض قتل و غارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔"

وطنی تحریک: ترکوں کا شیرازۂ ملت اس وقت بالکل منتشر ہو رہا تھا، لیکن خودداری اور وطنیت کا جذبہ ابھی فنا نہیں ہوا تھا، یونانیوں کے جواب میں ان کی طرف سے جو رد عمل ہوا اس کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ "اس کا آغاز حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خود جمہور کی طرف سے ہوا، جس میں کسان، پہاڑی لوگ اور عورتیں تک شامل تھیں"، بہت سے فوجی افسر قسطنطنیہ سے بھاگ کر تھریس پہنچے اور انھوں نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنا کر لڑنا شروع کیا، یونانیوں کی فوج اس وقت اسی ہزار سے زیادہ پہنچ چکی تھیں، یہ فوج اب اسی علاقہ تک محدود نہ رہی، جہاں تک کانفرنس نے اجازت دی تھی بلکہ اس نے اور بھی آگے قدم بڑھانے شروع کیے، سمرنا باقاعدہ طور پر یونانی حکومت کا

---

(۱) ترکی درد زہ میں از آرم اسٹرانگ ص ۸۲-۸۳

مرکز قرار دیا گیا۔ یونانی تسلط کی خبر سرعت کے ساتھ تمام ترکی علاقوں میں پھیل گئی، ہر طرف احتجاج کے جلسے کیے گئے اور سارے ملک میں دفعتہ ایک وطنی تحریک کی لہر دوڑ گئی، یہ تحریک عام طور پر مصطفےٰ کمال پاشا کے نام سے منسوب کی جاتی ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ وہی اس کے روح رواں تھے، لیکن یونانیوں کے قتل وغارت کا جو سیلاب سمرنا سے شروع ہو کر تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا اس نے ہر ترک کے دل میں وطن کی حفاظت کا جذبہ مشتعل کر دیا تھا اور سرفروشوں کی جماعت اس سیلاب کو روکنے کے لیے ایک آہنی دیوار کی طرح قائم ہو گئی تھی۔

اس تحریک سے ترکوں کی تاریخ کا جمہوری دور شروع ہوتا ہے، سلطنت نام کے لیے تو ۱۹۲۳ء تک قائم رہی لیکن حقیقتاً ۱۹۱۸ء میں اتحادی طاقتیں اس کا گلا گھونٹ چکی تھیں، ترکی سلطنت فنا ہو گئی، لیکن ترک قوم زندہ تھی، صلح نامہ مدروس کے بعد سے اعلان جمہوریہ تک اس نے وطن کو دشمنوں کی آہنی گرفت سے آزاد کرانے میں جیسے حیرت انگیز ثبات وعزم کی مثال پیش کی، وہ قوموں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، ان کارناموں کی تفصیل آئندہ جلد میں بیان کی گئی ہے۔

☆☆☆

نظامِ حکومت

سلطنت عثمانیہ کے بانی جب اول اول ایشیائے کوچک میں آئے تو ان کی حیثیت ایک خانہ بدوش قوم سے زیادہ نہ تھی، لیکن وہ اپنے اندر شجاعت اور تنظیم کی قوت رکھتے تھے، جو خانہ بدوش قوموں میں فطرت کے تغیرات و حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے خلقی طور پر پائی جاتی ہے۔ ایسی قوموں کی زندگی نہایت باقاعدہ اور منظم ہوتی ہے۔ ان کی تمام نقل و حرکت میں شدید فوجی ضبط پایا جاتا ہے۔ یہ قومیں جب زرعی اور تجارتی آبادیوں کی طرف بڑھتی ہیں تو اپنی اسی تنظیم کی وجہ سے ناقابل مزاحمت ہو جاتی ہیں اور اپنے سے زیادہ متمدن لیکن کم جفاکش قوموں کو شکست دے کر سلطنت قائم کر لیتی ہیں، باوجود اس کے کہ انھیں حکمرانی کا تجربہ پہلے سے نہیں ہوتا، وہ اپنی سابق زندگی کے تجربات سے اس نئی زندگی میں بھی کام لیتی ہیں، وہ اب بھی "راعی" ہوتی ہیں البتہ رعیہ کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

یہی صورت حال عثمانی ترکوں کی تھی، انھوں نے ایشیائے کوچک میں داخل ہو کر ایک سلطنت کی بنیاد رکھی جو تین صدیوں کے اندر دنیا کی وسیع ترین اور سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت ہو گئی، اس کی رعایا میں کرد، البانی، یونانی، ایرانی، عرب، سلاوی اور جرمن ہر قوم کے باشندے شامل تھے، لیکن جو چیز ان ترکوں کو دوسری خانہ بدوش قوموں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی سلطنت کی پائداری ہے، خانہ بدوش قوموں کی حکومت ڈیڑھ دو سو برس سے زیادہ نہیں چلتی، عثمانی ترکوں نے جس سلطنت کی بنا ڈالی وہ

چھ سو سال سے زیادہ قائم رہی اور آج بھی ایک مختصر علاقہ تو جمہوریہ کی شکل میں موجود ہے۔ سلطنت کے اتنی مدت تک قائم رہنے کا باعث محض عثمانیوں کی فطری جنگجوئی نہیں ہے کیوں کہ یہ جوہر تو بعض دوسری قوموں میں بھی پایا جاتا ہے بلکہ اس کا اصلی سبب ان کا حیرت انگیز نظام حکومت ہے، جو اپنے زمانہ میں دنیا کا بہترین نظام سمجھا جاتا تھا۔ اس کے متعلق پروفیسر لی بائر (Lybyer) اپنی محققانہ تالیف "عثمانی نظام سلطنت در عہد سلیمان ذی شان" میں لکھتے ہیں:

> "دنیا میں عثمانی نظام حکومت سے زیادہ دلیرانہ تجربہ اتنے بڑے پیمانہ پر شاید نہیں کیا گیا ہے۔ جو نظریہ اس سے قریب ترین مشابہت رکھتا ہے وہ افلاطون کی جمہوریہ میں پایا جاتا ہے اور جو نظام عملاً اس کی نظیر ہے وہ مصر کا مملوکی نظام ہے، لیکن عثمانی نظام اول الذکر کی اشرافی یونانی حد بندیوں میں محدود نہ تھا اور آخر الذکر کو مغلوب کرکے یہ اس سے زیادہ عرصہ تک قائم رہا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جو پہلے جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتے تھے اور پھر ترقی کرکے صدارت کی کرسی پر پہنچ گئے، لیکن انھوں نے یہ مرتبہ صرف اپنی کوشش سے حاصل کیا نہ کہ کسی ایسے نظام کے سلسلۂ مدارج کے ذریعہ جو انھیں ترقی دینے کے لیے باقاعدہ مرتب کیا گیا ہو۔ کلیسائے روم اب بھی ایک کسان کو تعلیم و تربیت دے کر پوپ بنا سکتا ہے، لیکن اس نے کبھی اپنے امیدواروں کو تقریباً بلا استثنا ایسے خاندانوں سے منتخب نہیں کیا جو ایک مخالف مذہب کے پیرو ہوں، عثمانی نظام عمداً غلاموں کو لیتا تھا اور انھیں سلطنت کی وزارتوں پر مامور کر دیتا تھا، وہ بھیڑوں کی چرواہوں اور کھیتی باڑی کے کام سے چھڑا کر لڑکوں کو لاتا تھا اور انھیں درباری امیر اور شہزادیوں کے شوہر بنا دیتا تھا، وہ ایسے نوجوان

> کو لیاقت جن کے آباؤ اجداد صدیوں سے عیسائی ہوتے اور انھیں سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے حکمران اور ناقابل تسخیر فوجوں کے سپاہی اور جنرل بنا دیتا تھا، جن کی سب سے بڑی خوشی اس میں تھی کہ صلیب کو شکست دے کر ہلال کو سربلند کریں، وہ اپنے نو آموزوں سے کبھی یہ سوال نہیں کرتا تھا کہ ''تمہارا باپ کون تھا''، ''تم کیا جانتے ہو''، یہ بھی نہیں کہ ''تم ہماری زبان بول سکتے ہو؟'' بلکہ وہ ان کے چہروں اور جسموں کو غور سے دیکھنے کے بعد ان سے کہتا تھا: ''تم ایک سپاہی ہو گے اور اگر لیاقت کا ثبوت دو گے تو ایک جنرل ہو جاؤ گے'' یا ''تم ایک عالم و فاضل اور معزز شخص ہو گے اور اگر تمہارے اندر قابلیت موجود ہے تو گورنر اور وزیر اعظم بھی بن جاؤ گے۔''(۱)

ادارۂ حکومت: نظام سلطنت دو بڑے اداروں پر مشتمل تھا، ایک ادارۂ حکومت اور دوسرا ادارۂ اسلامیہ، ادارۂ حکومت میں سلطان، اس کا خاندان، حکومت کے انتظامی افسر، مستقل سوار اور پیدل فوج اور نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد جو مستقل فوج، دربار اور حکومت کے لیے زیر تعلیم رہا کرتی تھی شامل تھی، انہی کے ہاتھوں میں تلوار، قلم اور حکومت کی باگ تھی، یہی پوری سلطنت کا انتظام کرتے تھے۔ البتہ وہ امور جو قانون شرع کے ماتحت تھے شرعی عدالتوں کے سپرد کر دیے گئے تھے اور وہ معاملات جو سلطنت کی غیر مسلم رعایا اور غیر ملکی باشندوں کے جماعتی نظام سے تعلق رکھتے تھے انہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیے گئے تھے، اس ادارہ کی بنیادی خصوصیات یہ تھیں کہ چند مستثنیات کے علاوہ اس کے ارکان وہی لوگ تھے جو عیسائی والدین کی اولاد تھے اور اس کا ہر رکن سلطان کے غلام کی حیثیت سے ادارہ میں داخل ہوتا تھا اور تمام عمر سلطان کا غلام رہتا تھا خواہ وہ

---

(1) The Government of the ottaman Empire in the time of Suleman the magnificent by A. H. Lybyer, P45

ثروت اور اقتدار و عظمت کے کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے۔

داخلہ کا طریقہ: جو لوگ اس ادارہ میں داخل کیے جاتے تھے وہ چار طریقوں سے آتے تھے، ۱- یا وہ جنگ میں گرفتار کیے جاتے تھے، ۲- یا خریدے جاتے تھے، ۳- یا بطور ہدیہ کے بھیجے جاتے تھے، ۴- یا خراج میں حاصل کیے جاتے تھے، پروفیسر لائبر لکھتے ہیں کہ اس ادارہ میں داخل ہونے کے لیے غلامی کے دروازہ سے آنا ضروری تھا اور یہ دروازہ صرف دس سے بیس سال تک کے عیسائی لڑکوں کے لیے کھلا ہوا تھا، بعض مغربی مورخین کا یہ بیان صحیح نہیں کہ عموماً آٹھ سال کے لڑکے لیے جاتے تھے، تحقیق یہ ہے کہ جو چودہ سے اٹھارہ سال تک کے لڑکوں کو ترجیح دی جاتی تھی اور صرف غیر معمولی صورتوں میں بارہ سال سے کم یا بیس سال سے زیادہ کے لڑکے لیے جاتے تھے (۱)، یوروپین مورخین صرف خراجی لڑکوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن پروفیسر موصوف نے ثابت کیا ہے کہ سالانہ بھرتی میں خراجی لڑکوں کی تعداد نصف سے کم ہوتی تھی، سلیمان اعظم کے عہد میں جب یہ نظام مکمل ہو چکا تھا سالانہ بھرتی کا اوسط سات آٹھ ہزار تھا، جس میں خراجی لڑکوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔

خراجی لڑکوں کی بھرتی کا طریقہ جسے ”دوشرمہ“ کہتے تھے، یہ تھا کہ عموماً ہر چار سال کے بعد اور اگر ضرورت ہوئی تو اس سے پہلے بھی عہدہ داروں کی ایک جماعت جو لڑکوں کے پرکھنے میں بہت مہارت رکھتی تھی، حکومت کی طرف سے ان علاقوں میں بھیجی جاتی تھی جہاں سے خراج آتا تھا، سلیمان اعظم کے زمانہ میں پورا جزیرہ نماے بلقان، شمالی ایشیاے کوچک کا مغربی ساحل اور بحر اسود کے جنوبی اور مشرقی سواحل خراجی لڑکے فراہم کرتے تھے، مگر سب سے زیادہ مضبوط اور ہونہار نوجوان البانیہ اور جنوب کی سلافی قوموں سے آتے تھے۔

---

(1) The Government of the ottaman Empire in the time of Suleman the magnificent by A. H. Lybyer, P 48

جو والدین اپنے لڑکوں کو دینا نہیں چاہتے تھے وہ بچپن ہی میں ان کی شادی کر دیتے تھے کیوں کہ ایسے لڑکے نہیں لیے جاتے تھے، دولت مند اشخاص بھرتی کرنے والے افسروں کو کچھ دے دلا کر بھی اپنے لڑکوں کو بچا لیتے تھے، برخلاف اس کے بہت سے والدین خوشی کے ساتھ اپنے لڑکوں کو بھیجنا چاہتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اس طرح یہ لڑکے افلاس کی مصیبت سے نجات پا جائیں گے، اپنی استعداد اور اہلیت کے مطابق اعلیٰ درجہ کی تربیت حاصل کریں گے اور ترقی کر کے بڑی بڑی جگہوں پر پہنچ جائیں گے، پروفیسر لی بائر کا بیان ہے کہ بعض والدین اس طریقہ کو بجائے بار کے رعایت سمجھنے لگے تھے اور ترک ان پر رشک کرتے تھے، کیوں کہ مسلمانوں کے لڑکے اس ادارہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے، اس قاعدہ کی پابندی سے بچنے کے لیے ترک بعض اوقات عیسائیوں کو روپیہ دے کر اس بات پر راضی کر لیتے تھے کہ وہ ان کے لڑکوں کو اپنا بنا کر بھرتی کرادیں۔(۱)

ادارۂ حکومت کا تعلیمی نظام: اپنے وسیع ترین مفہوم میں ادارۂ حکومت ایک مدرسہ تھا جس میں طلبہ تمام عمر کے لیے داخل کیے جاتے تھے، اس مدرسہ میں ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور جسم و دماغ دونوں کی تربیت یکساں توجہ سے ہوتی تھی، البتہ یہ چیز خاص طور پر پیش نظر رہتی تھی کہ یہ مدرسہ دراصل فن جنگ اور فن حکومت کی تعلیم گاہ ہے، طلبہ سخت ضابطوں کے اندر رکھے جاتے تھے، انھیں بتدریج ترقی دی جاتی تھی اور حسب لیاقت انعامات اور اعزازات ملتے رہتے تھے، مدرسہ کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر سخت سزائیں بھی دی جاتی تھیں، دماغی تربیت اگرچہ ایک حد تک سب کو دی جاتی تھی لیکن جو طالب العلم استعداد کے لحاظ سے بہترین ہوتے انھیں مشرقی زبانوں اور اسلامی و عثمانی قوانین کا ایک مشکل نصاب جس میں اخلاقیات اور دینیات دونوں کی تعلیم شامل ہوتی پڑھایا جاتا تھا، پروفیسر لی بائر اس نظام تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

---

(۱) لی بائر، ص ۵۔

> "افلاطون سلطان کے وسیع خاندان کی تعلیم وتربیت دیکھ کر خوش ہوجاتا، گو اس خاندان کی نسل اصلی اس کی طبیعت کو متنفر کردیتی، اسے یہ بات پسند آتی کہ تعلیم عمر بھر جاری رہتی تھی، جسم وذہن کی یکساں احتیاط کے ساتھ تربیت ہوتی تھی، حکمرانوں اور سپاہیوں میں تفریق کی جاتی تھی (اگرچہ یہ تفریق مکمل نہ تھی) یہ لوگ ایک حد تک گھریلو پابندیوں سے آزاد رکھے جاتے تھے، فرد کی ساری زندگی اس نظام کے شدید ضوابط کی پابند ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت دانشمندوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ تو غالباً کبھی معلوم نہ ہوسکے گا کہ عثمانی نظام کے بانی افلاطون کے خیالات سے واقف تھے یا نہیں، لیکن اس کے منصوبہ کو جہاں تک عملاً پورا کرنا ممکن تھا انھوں نے کر دکھایا، بعض حیثیتوں سے انھوں نے افلاطون سے بہتر نظام قائم کیا، مثلاً پے توارث کی بے اعتباریوں کو دور کیا، نظم ونسق کے لیے شخصی اقتدار بہم پہنچایا، توازن قوا کے ذریعہ استقلال وپائیداری کا تحفظ کیا اور اپنے اس نظام کو ایک وسیع سلطنت کے قابل بنادیا۔"(1)

وہ تمام لڑکے جو بھرتی کیے جاتے تھے خواہ مذکورۂ بالا طریقوں میں سے کسی طریقہ سے لائے گئے ہوں، پہلے امتحان کے لیے ماہر افسروں کے سامنے پیش ہوتے تھے جو انھیں استعداد کے لحاظ سے دو مختلف جماعتوں میں تقسیم کردیتے، جسمانی حیثیت اور ذہنی قابلیت کے اعتبار سے جو معیار کے مطابق ثابت ہوتے وہ اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کرلیے جاتے، باقی زیادہ تر جسمانی تربیت کے لیے علاحدہ رکھے جاتے۔

جو امیدوار اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کیے جاتے تھے، ان میں سے کچھ صوبوں کے گورنروں اور دارالسلطنت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے پاس بھیج دیے جاتے تھے اور

---

(1) لی بائر ص ۷۱۔

وہاں ان کی تربیت غالباً اسی طرح ہوتی تھی جس طرح ان امیدواروں کی جو سلطان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان میں سے منتخب ترین جن کی سالانہ تعداد غالباً دو سو یا کبھی بارہ سے پندرہ سو تک ہوتی تھی ادرنہ، غلطہ اور استنبول کے شاہی محلوں میں بھیج دیے جاتے تھے، انھیں تعلیم و تربیت کا ایک سخت نصاب پورا کرنا پڑتا تھا جو چودہ سال میں ختم ہوتا تھا۔ ان کو عربی فارسی کی ادبی تعلیم دی جاتی تھی اور اسی کے ساتھ ورزش، فنون حرب، شہسواری اور کوئی دستکاری بھی سکھائی جاتی تھی۔ انھی میں سے حکومت کے انتظامی شعبہ کے لیے امیدوار چنے جاتے تھے اور عملی تعلیم کی غرض سے قصر سلطانی کی چھوٹی چھوٹی خدمتوں پر مقرر کر دیے جاتے تھے۔ اپنی لیاقت کی وجہ سے جتنا قریب وہ سلطان کی ذات سے ہوتے جاتے تھے اتنی ہی بڑی جگہ انھیں مدت تعلیم پوری کرنے کے بعد ملتی تھی۔ یہ مدت عموماً پچیس سال کی عمر تک پوری ہو جاتی۔ اس وقت ہر امیدوار مدرسہ سے باہر نکل آتا اور حسب لیاقت اسے کوئی بڑا عہدہ دے دیا جاتا۔ یہی لوگ ترقی کر کے شہروں کے گورنر، صوبوں کے والی، فوجوں کے افسر اور سلطنت کے وزیر بن جاتے تھے اور انھی میں سے بعض صدر اعظم کے عہدہ پر بھی فائز ہوتے تھے۔ سلیمان اعظم کا مشہور وزیر ابراہیم تقریباً براہ راست صدر اعظم بنا دیا گیا تھا، لیکن وہ پہلا شخص تھا جس نے ترقی کے قاعدہ کو توڑا اور اسی مثال سے آئندہ بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ انتظامی شعبہ کے لیے انتخاب کرنے کے بعد ان فارغ التحصیل امیدواروں کی اکثریت باضابطہ سوار فوج میں جسے "باب عالی کے سپاہی" کہتے تھے داخل کر دی جاتی تھی۔ ان کو رخصت کرنے کی ایک خاص تقریب ہوا کرتی تھی، ہر امیدوار کو بلا کر سلطان بہ نفس نفیس اس کی تعریف و تحسین کرتا اور اس کی نئی خدمت کے لیے حوصلہ افزائی فرماتا۔ وہ ہر ایک کو ایک زردوزی کا کوٹ اور اپنے خوبصورت گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا عطا کرتا۔ آخر کچھ نقد بھی دیتا۔ یہ نوجوان ان تمام تحائف کو لے کر جو انھوں نے اپنے دوران قیام میں پائے تھے، ایک جلوس کے ساتھ محل کے بڑے پھاٹک تک جاتے اور وہاں گھوڑے پر سوار ہو کر ہمیشہ کے لیے اس مدرسے

رخصت ہو جاتے۔(۱)

دوسری جماعت کے امیدواروں کی تربیت زیادہ تر جسمانی، صنعتی اور فوجی ہوتی تھی اور انھیں ترکی زبان اور اسلامی اصول زبانی سکھائے جاتے تھے، ان کا منتخب حصہ ینی چری بنایا جاتا تھا، پہلے ان کو اناطولیہ کے اندرونی علاقوں میں بھیج دیا جاتا تھا کہ ترکی زبان اور ترکی طرز معاشرت سے واقفیت حاصل کریں اور کھیتوں میں کام کرنے سے ان کے جسم خوب مضبوط ہو جائیں، دو تین سال کے بعد ان کے معائنہ کے لیے قسطنطنیہ سے افسر آتے تھے، اگر وہ ترکی زبان کافی سیکھ چکے ہوتے تھے اور ان کے جسم توانا ہو چکے تھے تو انھیں ترقی دے کر قسطنطنیہ بھیج دیا جاتا تھا، وہاں سے کچھ جہازوں پر کام کرنے کے لیے روانہ کر دیے جاتے، کچھ شاہی محلوں میں باغبان (بوستانجی) مقرر کر دیے جاتے اور کچھ پبلک عمارتوں میں کام پر لگا دیے جاتے، انھیں لکھنا پڑھنا سیکھنے کی اجازت تھی لیکن وہ اس پر مجبور نہیں کیے جاتے، امیدواری کے اس دوسرے درجہ میں کچھ دنوں کام کرنے کے بعد جیسے جیسے وہ تیار ہوتے جاتے انفرادی انتخاب سے ینی چری کے دستوں میں بغرض تعلیم بھیج دیے جاتے، جب فن حرب میں انھیں مہارت حاصل ہو جاتی تو مکمل ینی چری کی حیثیت سے شامل کر لیے جاتے۔

بنیادی اصول: سلطنت عثمانیہ کی قوت اس کے ادارۂ حکومت کے زبردست نظام پر قائم تھی، اس نظام کے خاص اصول یہ تھے، امیدواروں کا عمدہ انتخاب، تعلیم و تربیت کی سخت نگرانی، شدید ضبط و تادیب اور پرجوش مقابلہ، ہر امیدوار اپنی کوشش سے ترقی کر کے اونچے درجہ پر پہنچ سکتا تھا، یہاں تک کہ وہ ایک روز صدر اعظم بھی بن سکتا تھا، ترقی صرف قابلیت پر منحصر تھی، اس کلیہ میں واحد مستثنیٰ شاہی خاندان تھا، اسی ایک صورت میں نسل کا امتیاز تسلیم کیا جاتا تھا یعنی زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے کے لیے عثمان کا جانشین ہونا کافی سمجھا جاتا تھا، جو لڑکے اس نظام میں داخل کیے جاتے تھے انھیں عیسائی مذہب ترک

---

(۱) لی بائر ص ۸۱۔

کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا لیکن اسلامی ماحول کے اثر سے وہ خود بخود برضا ورغبت مسلمان ہو جاتے تھے (۱)۔ اس پورے نظام کا مرکزی اصول یہ تھا کہ اس میں سلطان کی آزاد مسلمان رعایا جس کے والدین مسلمان تھے داخل نہیں ہو سکتی تھی اور ادارہ حکومت صرف عیسائی غلاموں کے لیے مخصوص تھا، ان غلاموں کے لڑکے آزاد مسلمانوں کے طبقہ میں شامل ہو جاتے تھے اور ادارہ حکومت سے خارج سمجھے جاتے تھے، اس اصول کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت کے کام جن لوگوں کو سپرد کیے جائیں ان کا انتخاب محض قابلیت کی بنا پر ہو اور انھیں سخت ضوابط و قواعد کے ماتحت تعلیم دی جائے اور جب وہ اقتدار و حکومت کی ان بلند جگہوں پر پہنچ جائیں جو انھوں نے اپنی لیاقت سے حاصل کی ہوں تو اس وقت کوئی موروثی حکمران طبقہ جو شاہی خاندان کی جگہ لے سکے قائم نہ کر سکیں، لیکن سلیمان کے بعد اس اصول کی بندش ڈھیلی ہو گئی، ارکان حکومت نے سلطان پر دباؤ ڈال کر یہ اجازت حاصل کر لی کہ ان کے لڑکوں کا تقرر ان کی جگہوں پر ہو سکتا ہے، اس کے بعد دوسرے مسلمانوں نے بھی جو سابق عیسائی غلاموں کی اولاد نہیں تھے، فوجی اور ملکی ملازمتوں میں اپنے مساوی حقوق تسلیم کرا لیے، اسی وقت سے نظام حکومت میں زوال شروع ہوا اور سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، یہاں تک کہ نہ وہ یوروپین طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل رہی اور نہ اپنی عیسائی رعایا پر قابو رکھ سکی۔

ارکان ادارہ کے حقوق: ادارہ حکومت کا ہر فرد سلطان کا غلام تھا، خواہ وہ سلطنت کے اونچے سے اونچے عہدہ پر فائز ہو، قلی (غلام) کا لقب اعزاز و امتیاز کا نشان تھا اور سلطان قلی کا احترام ہر جگہ کیا جاتا تھا، تمام ارکان ادارہ کو چند مخصوص مراعات و حقوق حاصل تھے مثلاً وہ ہر قسم کے ٹیکس سے بری تھے اور سلطان کے علاوہ صرف اپنے افسروں اور اپنی عدالتوں کے جواب دہ تھے، سلطان انھیں ضروریات زندگی کی تمام فکروں سے آزاد کر دیتا تھا اور ان میں سے اکثروں کو اتنا کچھ عطا کرتا تھا کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے

---

(۱) لی بار ص ۲۶۔

تھے، سب کو شاہی خزانہ سے تنخواہیں ملا کرتی تھیں، بعض اونچے عہدہ داروں کو بڑی بڑی جاگیریں بھی دی جاتی تھیں، مدت تک اس ادارہ کے ارکان معمولی اسلامی عدالتوں کے ماتحت رہے، لیکن چونکہ ان عدالتوں کے قاضی ادارۂ اسلامیہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے سلطان کے رعایت یافتہ قلی ان کے سامنے اپنے مقدمات لے جانے میں تامل کرتے تھے اور اسے اپنے مرتبہ کے خلاف سمجھتے تھے، چنانچہ بایزید ثانی نے یہ حکم دیا کہ ان تمام لوگوں کے مقدمات جو ادارۂ حکومت سے وابستہ ہوں خود ان کے افسروں کی عدالتوں میں پیش ہوا کریں، اس وقت سے ان کے لیے جداگانہ عدالتیں قائم کردی گئیں۔

سلطان: ادارۂ حکومت کا صدر اعلیٰ سلطان تھا، جہاں تک اس ادارہ کا تعلق تھا اس کے اختیارات کی کوئی حد نہ تھی، وہ اس کے تمام ارکان کی جان و مال کا مالک تھا، اس کے اقتدار کی یہ مطلقیت ادارہ کے لیے بڑی تقویت کا باعث تھی، لیکن اسی میں ایک بڑے خطرہ کا امکان بھی مضمر تھا، چونکہ اس پورے نظام کا مرکز سلطان کی ذات تھی، اس لیے یہ ضروری تھا کہ اسے عمدہ طریقہ پر چلانے کے لیے سلطان میں طاقت کے علاوہ عقل و فہم، تدبیر و سیاست، عدل و انصاف اور رعایا پروری کے اوصاف بھی اعلیٰ درجہ پر پائے جائیں اور ان سب سے زیادہ ضروری وصف ملکۂ حکمرانی کا تھا جو عثمان سے لے کر سلیمان اعظم تک تمام سلاطین میں بدرجۂ غایت پایا جاتا تھا، جب تک مضبوط اشخاص تخت پر آتے رہے نظام سلطنت کی کامیابی حیرت انگیز رہی، جب سے عنان حکومت کمزور آدمیوں کے ہاتھوں میں آنا شروع ہوئی اس نظام کا شیرازہ بھی منتشر ہونے لگا، سلیمان اعظم کے بعد جتنے سلاطین آئے وہ باستثنائے چند سب کے سب اس ملکۂ حکمرانی سے محروم تھے اور یہی اصلی سبب دولت عثمانیہ کے زوال کا تھا، ادارۂ حکومت کے تمام عہدے صرف قابلیت کی بنا پر دیے جاتے تھے لیکن اس ادارہ کا افسر اعلیٰ وراثت کے حق سے مقرر ہوتا تھا، سولہویں صدی عیسوی تک عثمانی شہزادے مختلف صوبوں کے گورنر بنا دیے جاتے تھے اور اس طرح وہ حکمرانی کی تربیت حاصل کرتے تھے مگر جب سے سلیمان اعظم کی محبوب ملکہ

خرم سلطان نے شہزادوں کو محل میں بند رکھ کر تعلیم دینے کا طریقہ جاری کرایا، سلطنت کے آیندہ وارث اس ضروری تربیت سے محروم ہوگئے، ان کی زندگی اب زیادہ تر محل کی دلچسپیوں میں گذرنے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں حکومت کا بارگراں اٹھانے کی اہلیت باقی نہ رہی، سلیم ثانی کے بعد جو آٹھ سلاطین یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے ان میں سے پانچ تو کسی فوجی مہم میں بھی شریک نہ ہوئے، حالانکہ اس سے پہلے سلاطین فوج کی کمان خود کرتے تھے۔

سلطان بظاہر ایک مطلق العنان فرماں روا تھا، لیکن اس کی مطلق العنانی ادارۂ حکومت تک محدود تھی، اس کے باہر شریعت، ملکی قوانین اور قومی رسم ورواج سے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، سلطنت میں چار طرح کے قانون جاری تھے۔

۱-شریعت ۲-قانون یعنی عثمانی سلطانوں کے تحریری فرامین ۳-عادت یا قومی اور ملکی رواج جو قدیم سے چلا آتا تھا اور ۴-عرف یعنی موجودہ سلطان کا "ارادہ" یا فرمان، شریعت کے قوانین سلطان سے بالاتر تھے اور وہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا تھا، اپنے پیشرووں کے بنائے ہوئے آئین ودستور کی پابندی اگرچہ اس کے لیے لازمی نہ تھی، تاہم وہ اتنے مفید اور کارآمد تھے کہ انھیں بالکل ترک نہیں کیا جاسکتا تھا، سلیمان اعظم "قانونی" کے لقب سے مشہور ہے، لیکن اس نے جتنے نئے قانون اور فرمان جاری کیے، ان سے زیادہ پرانے آئین ودستور کو مرتب اور منضبط کیا، قومی رسم ورواج کا لحاظ رکھنا بھی ضروری تھا، کیونکہ ترک اپنے قدیم رواجوں کے شدت سے پابند تھے اور ان میں کسی طرح کی مداخلت گوارا نہیں کرتے تھے۔

لارنپٹ اپنی تاریخ ترکی میں جو انیسویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے، سلطان کی حیثیت کے متعلق بیان کرتا ہے:

> "ترکی کا نظم ونسق اس شاہی حکومت سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، جسے مونٹسکو (Montesquieu) "حکومت شخصی بذریعہ

> قوانین منضبط" سے تعبیر کرتا ہے، بہ نسبت اس حکومت کے جو عام طور پر مطلق العنانی سے مراد لی جاتی ہے یعنی ایسی حکومت جہاں ایک شخص بغیر کسی قانون اور قاعدہ کے اپنی خود پسندی اور تلون مزاجی کے لحاظ سے سب پر حکمرانی کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ ترکی میں قانون کا وجود پایا جاتا ہے بلکہ قانون ہی وہاں سب سے بڑا اور تنہا حاکم ہے، بادشاہ اسی کے ذریعہ اور اسی کے نام سے حکومت کرتا ہے اور اس کو جو اقتدار حاصل ہے وہ اس لیے نہیں دیا گیا تھا کہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے بلکہ اس لیے کہ اہل ملک کے مفاد کا تحفظ کرے جن کا وہ سردار ہے، چنانچہ ترکی میں بادشاہ محض قانون کا محافظ ہے اور وہ تمام لوازم جو اس کے منصب سے متعلق ہیں صرف اس پر مشتمل ہیں کہ قانون کو خود اپنی ذات سے لے کر نیچے تمام اشخاص تک ہر ایک کی زد سے بچائے اور یہ حق محض سلطان کے ساتھ مخصوص نہیں، نبی کریم ﷺ کی مشہور حدیث کے رو سے کہ "قانون کی ہر خلاف ورزی کو روکو" یہی حق سلطان کی ادنیٰ سے ادنیٰ رعایا کو بھی حاصل ہے اور یہ حدیث ترکی میں قانون یا بالفاظ دیگر آئین و دستور کی حفاظت انفرادی طور پر تمام باشندوں کے سپرد کرتی ہے۔"(۱)

قانون کی پاسداری کا اندازہ ایک عجیب و غریب واقعہ سے ہو سکتا ہے، ۱۷۵۵ء میں باب عالی کی عمارت آتش زدگی سے برباد ہو گئی، جب وہ دوبارہ تعمیر کی جانے لگی تو اس خیال سے کہ آئندہ اس قسم کا حادثہ پیش نہ آئے، یہ طے کیا گیا کہ جو مکانات اس سے متصل ہیں ان کو خرید کر منہدم کر دیا جائے اور عمارت کے چاروں طرف

---

(۱) ترکی از جارج لارپنٹ مطبوعہ لندن ۱۸۵۴ء جلد دوم ص ۹۵ Turkey by Sir George Larpent

کافی جگہ چھوڑ دی جائے۔ جن لوگوں کے مکانات باب عالی سے ملے ہوئے تھے وہ سب انہیں فروخت کر دینے پر راضی ہو گئے، مگر ایک بوڑھی عورت اپنا مکان چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئی۔ اس نے کہا کہ اس مکان میں کئی پشتوں سے میرا خاندان رہتا آیا ہے اور میری نگاہوں میں اس کی جو قیمت ہے وہ بڑی سے بڑی رقم سے بھی ادا نہ ہو سکے گی، حکام نے اسے بہت کچھ لالچ دیا، ڈرایا دھمکایا بھی مگر وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئی، مجبوراً اس کا مکان بدستور رہنے دیا گیا، حکومت زبردستی اس پر قبضہ نہ کر سکی، سلطان اپنے تمام اختیارات کے باوجود یہ نہ کر سکا کہ بوڑھیا کو مکان کی قیمت دلوا کر اسے منہدم کرا دیتا(۱) نوشیرواں کے محل اور بوڑھیا کے جھونپڑے کا واقعہ تو ساری دنیا میں مشہور ہے مگر سلطنت عثمانیہ کے متعلق [illegible] فرمانروا کا یہ عدل بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔

سلطان کی ایک نمایاں حیثیت یہ بھی تھی کہ وہ ایک جنگجو قوم کا سردار تھا، قدیم ترک سلاطین فوج کی سادہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ فوج کی کمان خود کرتے تھے اور سپاہیوں کی قوم کے سپہ سالار سمجھے جاتے تھے، ترکوں کا بے چون و چرا احکام سلطانی کی تعمیل کرنا سلطان کی اسی حیثیت کی بنا پر تھا، ترکوں میں ایک خاص خصوصیت نظم و پابندی کی ملتی ہے، چنانچہ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں انقلابات کے شاذ و نادر واقع ہونے کا بڑا سبب یہی قومی خصوصیت ہے، بعض سلاطین تخت سے اتارے گئے اور بعض قتل بھی کر دیے گئے، مگر یہ محض ینی چری کی بغاوت کا نتیجہ تھے یا محل کی سازش کا جس کے تمام عہدہ دار ارکان حکومت سے تعلق رکھتے تھے، یہ عیسائی والدین کی اولاد تھے، ۱۹۰۸ء کے دستوری انقلاب کے علاوہ کوئی عام تحریک کبھی سلطان کے خلاف رونما نہیں ہوئی، نیز یہ واقعہ بھی کم تعجب خیز نہیں کہ باغیوں نے کبھی خاندان عثمان کے علاوہ کسی دوسرے خاندان کے فرد کو تخت پر بٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

ترکوں کو خاندان شاہی سے اپنی راسخ وفاداری کے باوجود تخت کے طریقہ [illegible]

---

(۱) [illegible] جلد اول ص ۲۶۲، ۲۶۳۔

نہیں کرتے، شاہی خاندان سے متعلق ہونا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اور نہ ایسے لوگوں کو مخصوص حقوق یا رعایات حاصل تھیں، سلطان کے بہت سے اعزہ ایک حد تک گمنامی کی زندگی بسر کرتے تھے، شہزادوں اور شہزادیوں کی فہرست شائع کرنے کی سخت ممانعت تھی اور سلطان محمد فاتح نے تو صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ شہزادیوں کی اولاد قوم کے اونچے عہدوں پر مقرر نہیں ہو سکتی۔ (۱)

قانون وراثت: ابتدائی صدیوں میں خاندان شاہی کا قانون وراثت یہ تھا کہ بیٹا باپ کا جانشین ہوتا تھا، بھائی اسی وقت تخت پر بیٹھتا جب سابق سلطان کا کوئی لڑکا اس کی وفات کے وقت موجود نہ ہوتا، چونکہ تعداد ازدواج کی وجہ سے اکثر مختلف ماؤں سے متعدد لڑکے ہوتے تھے اس لیے تاج و تخت کی خاطر ان میں سخت کشمکش ہوتی اور عموماً وہی لڑکا تخت نشین ہوتا تھا جو اپنے بھائیوں کو قتل کرا دیتا تھا، محمد فاتح نے اس دستور کو قانونی شکل دے کر اور بھی مستحکم کر دیا تھا، چنانچہ اس خیال سے کہ سلطنت فتنوں کی آگ سے محفوظ رہے شہزادوں کا قتل جاری رہا، لیکن سلیمان اعظم کے وقت سے بجائے قتل کے شہزادے محل میں نظر بند رکھے جانے لگے، ۱۶۱۷ء میں جب سلطان احمد کا انتقال ہوا تو اس کے تمام لڑکے نو عمر تھے اور کوئی بھی زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے کے قابل نہ تھا، دیوان نے صورت حال کے تقاضے سے قانون وراثت کو بدل دیا اور بجائے اس کے کہ مرحوم سلطان کے کسی لڑکے کو تخت نشین کرتے اس کے بھائی مصطفیٰ کو تخت پر بٹھایا اور اب یہ قانون بنا دیا گیا کہ تخت کا وارث آل عثمان کا وہ شہزادہ ہوگا جو عمر میں سب سے بڑا ہو، چنانچہ اس وقت سے برابر اسی قانون پر عمل درآمد ہوتا رہا اور سلطان احمد کے بعد صرف دو سلاطین ایسے ہوئے جو اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھے: محمد رابع اور عبدالمجید۔

دیوان: سلطان کی مجلس شوریٰ جسے دیوان کہتے تھے مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل تھی:

---

(۱) ترکی یورپ میں از اوڈیسی ایس مطبوعہ لندن ۱۹۰۰ء ص ۱۱۹ (Turkey in Europe by Odyseous)

صدر اعظم اور اس کے ماتحت وزرا، شیخ الاسلام، قاضی عسکر اناطولیہ، قاضی عسکر رومیلیا، بیلر بے اناطولیہ، بیلر بے رومیلیا، آغائے ینی چری، قپودان پاشا یعنی عثمانی امیر البحر، دفتر دار اور نشانجی، یہ سب حکومت کے مختلف شعبوں کے افسر اعلیٰ تھے، دیوان سلطنت کی نہ صرف سب سے بڑی انتظامی مجلس تھا بلکہ عدالت العالیہ بھی تھا، شیخ الاسلام اور دونوں قاضیوں کی شرکت اسی حیثیت سے تھی، اس کا اجلاس رمضان شریف کے علاوہ تمام سال ہفتہ میں چار دن ہوا کرتا تھا، شروع میں سلطان خود اس کی صدارت کرتا تھا، لیکن سلیمان نے یہ طریقہ ترک کردیا، البتہ وہ مجلس کی کارروائی کی نگرانی متصل کمرہ میں ایک جالی دار کھڑکی کے پیچھے بیٹھ کر کیا کرتا تھا، بعد کے سلاطین کو یہ زحمت بھی گوارا نہ ہوئی اور انھوں نے دیوان کا سارا کام صدر اعظم کے سپرد کردیا، چنانچہ اب اس کی صدارت مستقل طور پر وہی کرنے لگا اور بحیثیت نائب سلطان اسے تقریباً تمام ملکی، فوجی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوگئے۔

وزرا: شروع میں صدر اعظم کے ماتحت تین وزیر ہوتے تھے کیا بے، رئیس آفندی اور چاؤش باشی، کیا بے وزیر جنگ اور وزیر داخلہ کی خدمات انجام دیتا تھا اور صدر اعظم کی غیر موجودگی میں اس کا قائم مقام ہوتا تھا، رئیس آفندی جس کا پورا لقب رئیس الکتاب تھا بیک وقت چیف سکریٹری اور وزیر خارجہ دونوں کا منصب رکھتا تھا، چاؤش باشی سلطنت کا میر دربار اور وزیر پولیس تھا۔

دفتر دار اور نشانجی: دفتر دار اور نشانجی سلطنت کی مالیات کے ذمہ دار تھے اور درجہ میں وزرا کے برابر تھے، دفتر دار وزیر مالیات تھا، نشانجی تمام سرکاری کاغذات تیار کرتا تھا اور جس کاغذ پر ضرورت ہوتی، سلطان کا طغرا ثبت کرتا تھا، اس کے ماتحت متعدد عہدہ دار تھے جو حکومت کی ہر کارروائی کی روداد مرتب کرتے تھے۔

بیلر بے: قاضی عسکر کی طرح بیلر بے بھی ابتداءً صرف دو ہوتے تھے، ایک ایشیائی مقبوضات کے لیے اور دوسرا یورپی، لیکن بعد میں ان کی تعداد بڑھادی گئی اور یہ سلطنت

کے صوبوں کے والی یا گورنر جنرل مقرر کر دیے گئے، بیلر بے اپنے صوبہ کے تمام ملکی اور فوجی عہدہ داروں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، صوبے پہلے ایالت کہے جاتے تھے، بعد کو ان کا نام ولایت ہو گیا، ایالتیں ضلعوں میں تقسیم تھیں جن کو سنجق یا لوا کہتے تھے، دونوں کے معنی جھنڈے کے ہیں، ان ضلعوں کے حاکم سنجق بے یا میر لوا کہے جاتے تھے، ہر صوبہ کی ایک مجلس شوریٰ تھی جس کا صدر وہاں کا والی ہوتا تھا، اس مجلس میں ضلعوں کے معزز اشخاص کی ایک تعداد بھی ہوتی تھی جن کو مقامی باشندے اپنے نمایندوں کی حیثیت سے انتخاب کر کے بھیجتے تھے، مقصد یہ تھا کہ ضلع کے انتظام میں وہاں کے لوگوں کو بھی کسی حد تک شریک کیا جائے، نیز یہ کہ جہاں تک ممکن ہو والی کے استبداد کی روک تھام ہوتی رہے۔ ہر صوبہ کی مجلس ایک چھوٹے پیمانہ پر مرکزی حکومت کے دیوان کا مثنیٰ تھی، اس کے ارکان بھی صوبہ کی حکومت کے مختلف شعبوں کے افسر اعلیٰ تھے۔

ینی چری: سلطنت کی طاقت کا دارومدار بہت کچھ اس کے فوجی نظام پر تھا، ینی چری مستقل پیدل فوج تھی، جس کی حیرت انگیز شجاعت اور نظم و ضبط نے تین سو برس تک یوروپین سلطنتوں کو لرزہ براندام رکھا، دولت عثمانیہ کی تمام فتوحات زیادہ تر اسی فوج کے زور بازو کا نتیجہ تھیں، سولھویں صدی عیسوی تک اس میں صرف عیسائی لڑکے بھرتی کیے جاتے تھے، چونکہ وہ نو عمری ہی میں اپنے گھروں سے علاحدہ کر دیے جاتے تھے، اس لیے ان کے دل والدین یا وطن کی محبت سے نا آشنا رہتے اور ان کی ساری توقعات سلطان کی ذات سے وابستہ ہو جاتیں، وہ اس کے غلام ہوتے اور اسی کی بے چون و چرا اطاعت کرنے سے ان کے لیے ترقی کی راہیں کھلتیں، انھیں شادی کرنے کی اجازت نہ تھی، لیکن سلیمان اعظم کے عہد کے آخری حصہ میں ینی چری کے لڑکے بھی اس فوج میں داخل کیے جانے لگے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تجرد کا قانون جو اس فوج کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا، پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا، یہ ایک ایسی بدعت تھی جو بالآخر اس نظام کے لیے مہلک ثابت ہوئی، سلیمان ہی کے عہد میں کچھ مسلمان لڑکے بھی اس میں داخل کر لیے گئے تھے، کبھی

کبھی اس فوج کا کوئی اعلیٰ افسر ایسا بھی ہوتا تھا جس کے والدین عیسائی نہیں بلکہ مسلمان ہوتے، لیکن جیسا کہ پروفیسر لی بائز نے لکھا ہے، یہ سب استثنائی مثالیں تھیں اور ان کا مجموعی اثر بہت ہی کم تھا۔ (۱)

سلیمان کے بعد ینی چری کا نظام برہم ہونے لگا، انھوں نے ۱۵۷۴ء میں مراد ثالث سے یہ رعایت حاصل کر لی کہ ان کے لڑکے بھی ینی چری دستوں میں داخل کیے جا سکتے ہیں، پھر ۱۵۸۲ء میں جب جنگ ایران کے لیے کافی سپاہی فراہم نہ ہو سکے تو عثمان پاشا نے مجبوراً مسلمانوں کو بھی اس فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا، ان بے قاعدگیوں میں جتنی ترقی ہوتی گئی اتنی ہی عیسائی لڑکوں کی بھرتی کم ہوتی گئی، سلطان قلی کو جو مراعات حاصل تھیں، ان کو دیکھ کر ترک کسان بھی اپنے عیسائی ہمسایوں کو راضی کر کے بچے لڑکوں کو عیسائی بنا کر بھرتی کرا دیتے اور بھرتی کرنے والے افسر یا تو دھوکا کھا جاتے یا رشوت لے کر چشم پوشی کر لیتے تھے، اس طرح سترہویں صدی کے وسط سے اس فوج کی ابتدائی نوعیت بالکل بدل گئی تھی، اس کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا گیا، سلیمان کے عہد میں اس کا شمار بارہ سے پندرہ ہزار تک تھا، ۱۶۸۳ء کی مہم ویانا میں یہ تعداد ستر ہزار تک پہنچ گئی تھی، تعداد کے اضافہ کے ساتھ اس فوج کی سرکشی بھی بڑھتی گئی، اپنی طاقت کا احساس اسے شروع سے تھا، لیکن جب تک مضبوط سلاطین تخت نشین رہے انھوں نے اسے قابو میں رکھا، سلیمان کے بعد جب عنان حکومت کمزور ہاتھوں میں آئی اور ینی چری کی تنظیم میں بے عنوانیاں شروع ہوئیں تو اس نے سر اٹھایا اور خود سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گئی، پروفیسر جرمانس لکھتے ہیں:

> "اس مخصوص فوج میں کسی باہر والے کو علاوہ اس صورت کے جب کہ اس میں کوئی خاص خصوصیت ہو شرکت کی اجازت نہ تھی، اگرچہ جاں نثاری افواج اپنی ترکیب کے لحاظ سے مخلوط تھیں، لیکن ان کی

---

(۱) لی بائز ص ۵۰

حلقہ بندی اور رشوت ستانی مستقل تھا، اور سولہویں صدی کے آخر میں وہ بزدلوں اور مسخروں سے بھی جو اپنے کرتبوں سے شاہی جشنوں میں سلطان کی خوشنودی حاصل کرتے تھے ان میں بھرتی کیے جانے لگے۔ اس کے بعد سے تو جاں نثاریوں کی بارکوں میں ہر قسم کے غیر متعلق لوگ داخل ہونے لگے، جس نے اس فوج کی روایتی یکجہتی اور شیرازہ بندی کو صدمہ پہنچایا اور ان کی جو خاص شان تھی اسے مٹا دیا۔ اب یہ لوگ شادیاں کرنے، بارکوں کے باہر رہنے اور امن و امان کے زمانہ میں کوئی نہ کوئی کاروبار بھی کرنے لگے، غرض کہ وہی فوج جس کی بسالت اور ہیبت کی کسی زمانہ میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اب اس کی حیثیت صرف ایک شورش پسند اور شوریدہ پشت انبوہ کثیر کی سی ہو گئی جس سے ملک کے امن و امان کے لیے اندیشہ پیدا ہو چلا، لڑائی کے کام کے تو یہ لوگ بالکل رہے ہی نہیں، اور جب کئی مرتبہ ان کی جدید تنظیم کی کوشش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی تو آخرکار ۱۸۲۶ء میں اس فوج کو بالکل ہی توڑ دیا گیا۔"(۱)

باب عالی کے سپاہی: جس طرح ینی چری سلطنت کی مستقل پیدل فوج تھی، اسی طرح "باب عالی کے سپاہی" مستقل سوار فوج تھی، ادارہ حکومت میں جو عیسائی لڑکے داخل کیے جاتے تھے، ان میں سے کچھ اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کر لیے جاتے تھے، انہی میں سے جو اپنی ذہنی قابلیت کے لحاظ سے بہترین ثابت ہوتے وہ حکومت کے انتظامی شعبہ کے لیے چن لیے جاتے، جو باقی رہ جاتے ان کا بڑا حصہ باضابطہ سوار فوج میں جسے "باب عالی کے سپاہی" کہتے تھے داخل کر دیا جاتا، فوج میں وہی امیدوار لیے جاتے تھے جن پر سلطان کو پورا اعتماد ہوتا، اس کا نظم و ضبط بھی ویسا ہی سخت تھا جیسا ینی چری کا، لیکن سلیمان کے بعد اس میں بھی وہی سب بے عنوانیاں ہونے لگیں جو ینی چری کے نظام میں

---

(۱) "ترکوں کی اسلامی خدمات" از ڈاکٹر جولیس جرمانس، مطبوعہ انجمن اردو پریس اورنگ آباد، ص ۳۱

ہو رہی تھیں، سلطنت کی ان دونوں فوجوں کا شیرازہ ساتھ ساتھ منتشر ہو رہا تھا۔

جاگیری سپاہی: ینی چری اور باب عالی کے سپاہی کے علاوہ ایک جاگیری سوار فوج بھی تھی جو ان دونوں سے زیادہ قدیم تھی، اس کو "سپاہی" کہتے تھے، صوبوں میں قدیم موروثی جاگیرداروں کا ایک حکمراں طبقہ تھا، یہ وہ لوگ تھے جن کے آباواجداد نے سلطانی علم کے نیچے فتوحات حاصل کی تھیں اور اس کے صلہ میں انھیں مفتوحہ علاقوں میں جاگیریں دی گئی تھیں، آمدنی کے لحاظ سے ان جاگیروں کی دو قسمیں تھیں، بڑی جاگیروں کو زعامت اور چھوٹی کو تیمار کہتے تھے، ہر جاگیردار کو سواروں کی ایک معین تعداد لے کر سلطان کی طلب پر جنگ میں شریک ہونا پڑتا تھا، جن کے مصارف وہ جاگیر کی آمدنی سے ادا کرتا تھا، صدیوں تک عثمانی افواج کا بڑا حصہ انہی جاگیری "سپاہیوں" پر مشتمل تھا، سلطنت کے عروج کے زمانہ میں جاگیری سواروں کی تعداد غالباً دو لاکھ سے زیادہ تھی (۱) اس نظام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان سواروں کی ایک فوج صوبوں کی بغاوت فرو کرنے اور بیرونی جنگوں پر روانہ کیے جانے کے لیے ہر وقت تیار رہے اور سلطنت پر کوئی مالی بار بھی نہ پڑنے پائے، فوجی مہموں سے فارغ ہو کر جاگیردار اپنا وقت شکار اور فوجی کھیلوں میں صرف کرتے تھے، جن صوبوں میں ان کی جاگیریں واقع تھیں وہاں کے انتظام میں وہ کوئی حصہ نہ لیتے مگر خود اپنے علاقوں میں وہ خودمختار تھے، وہاں نہ سنجق بے کا حکم چلتا تھا نہ والی کا، صرف فوجی معاملات میں وہ حکومت کے ان عہدہ داروں کی اطاعت کرتے تھے، باقی تمام امور میں وہ بالکل آزاد تھے، سولہویں صدی کے بعد اس جاگیری فوج کا نظم بھی پراگندہ ہونے لگا، مراد ثالث کے عہد میں قصر شاہی کے مقربین کی نگاہیں ان جاگیروں پر پڑنی شروع ہوئیں، زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ انھوں نے "سپاہیوں" کے رجسٹر میں اپنے نوکروں اور غلاموں کے نام لکھوا لیے اور بہت سی بڑی بڑی جاگیریں غلاموں اور خواجہ سراؤں کے قبضہ میں چلی گئیں، ان میں سے اکثر "سپاہی" کے فرائض انجام دینے

---

(۱) لی بار ص ۱۰۴۔

کی مطلق اہلیت نہیں رکھتے تھے، یہ جاگیروں سے دور بیٹھ کر صرف ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ "سپاہیوں" کا ضبط مفقود ہوتا گیا اور اٹھارہویں صدی میں ان کی فوجی اہمیت باقی نہیں رہ گئی، اس درمیان میں حکومت کی طرف سے جب کبھی اصلاحات کی کوشش کی گئی، جاگیرداروں نے ہمیشہ مخالفت کی، بالآخر محمود ثانی نے یہ دیکھ کر کہ ان کی بدنظمی سے سلطنت کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچ رہا ہے، ان کی جاگیریں ضبط کرلیں اور جو حقوق انھیں حاصل تھے وہ سلب کرلیے، یوں دولت عثمانیہ کی اس قدیم فوج کا استیصال بھی ینی چری کی طرح اسی مصلح کے ہاتھ سے عمل میں آیا۔ (۱)

جاگیری "سپاہی" اصلاً مسلمان ہونے کی وجہ سے ادارۂ حکومت سے خارج تھے، ان کا تعلق ادارۂ اسلامیہ سے تھا، لیکن اس فوج کے تمام افسر ادارۂ حکومت میں شامل تھے، یہ عیسائی والدین کی اولاد ہوتے اور سلطان کے غلام کی حیثیت سے اس ادارہ میں داخل کیے جاتے تھے، یہاں فوجی تربیت پانے کے بعد یہ "سپاہیوں" کے افسر بنا کر بھیجے جاتے تھے۔

قپودان پاشا: قپودان پاشا عثمانی امیر البحر تھا، اس کے ماتحت سلطنت کے مستقل بیڑے کے علاوہ جس کا صدر مقام استنبول تھا وہ جاگیری بیڑا بھی تھا جسے بحر ایجین کے ساحلی علاقوں کے بعض نے وہاں کی جاگیروں کے معاوضہ میں فراہم کرتے تھے، ان ساحلی علاقوں میں قپودان پاشا کو وہی اختیارات حاصل تھے جو سلطنت کے دوسرے حصوں میں بیلر بے رکھتے تھے، عثمانی بحریہ کے تمام افسر اور جہاز راں عیسائی والدین کی اولاد اور سلطان کے غلام تھے، ادارۂ حکومت کی حیرت انگیز تربیت نے انھیں ایسا بنا دیا تھا کہ سولہویں صدی میں سارا یورپ ان کے کارناموں سے ہیبت زدہ رہتا تھا، امیر البحروں میں خیر الدین پاشا، حسن پاشا، طورغوت، پیالے، پیری رئیس اور سیدی علی کے نام نہ صرف عثمانی تاریخ بلکہ یورپ کی بحری تاریخ میں بھی ہمیشہ یادگار رہیں گے، انھوں نے

---

(۱) ترکی از لین پول ص ۳۳۳۔

اپنی فتوحات سے سلطنت عثمانیہ کی وسعت میں بہت کچھ اضافہ کیا، بحری فتوحات کے علاوہ ان میں سے بعض نے علمی کارنامے بھی دکھائے مثلاً پیری رئیس نے بحر روم اور بحر ایجین کا ایک نقشہ تیار کیا، جس میں بحری رووں، مختلف مقامات کی گہرائیوں اور بندرگاہوں کے متعلق ضروری معلومات درج کیں، اسی طرح سیدی علی جس کا جہاز باد مخالف کی وجہ سے ہندوستان کے ساحل پر پہنچ گیا تھا، جب خشکی کے راستے سے خراسان، بلوچستان اور ایران ہوتا ہوا ترکی واپس آیا تو اس نے اپنے سفر کی سرگذشت لکھ کر مفید معلومات بہم پہنچائیں، اس کے علاوہ اس نے اصطرلاب کے استعمال پر بھی ایک کتاب لکھی اور ایک دوسری کتاب "محیط" نامی لکھی جس میں ہندوستان کے سمندروں کا حال بیان کیا۔ (۱)

بری فوجوں کی طرح سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت میں بھی سولہویں صدی کے آخر سے زوال شروع ہوا اور وہ روز بروز کمزور ہوتی گئی، اس کی اصلی وجہ ادارہ حکومت کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی تھی، جس نے ہر شعبہ کو صدمہ پہنچایا یعنی یہ ادارہ اب نہ عیسائی لڑکوں کے لیے مخصوص رہا اور نہ فوجی اور ملکی ملازمتوں پر انہی امیدواروں کا تقرر کیا جاتا جو اس ادارہ کی تعلیم و تربیت کا نصاب معیار کے مطابق پورا کر چکے ہوتے، تین سو برس کے بعد سلطان عبدالعزیز خاں نے اپنے شوق تعمیرات کے سلسلہ میں عثمانی بیڑے کی تعمیر پر بھی شاہانہ توجہ کی اور اسے اتنا طاقتور بنا دیا کہ یورپ کے بہترین بیڑوں میں شمار ہونے لگا مگر سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں ان جہازوں کو شاخ زریں سے نکلنے کی بھی نوبت نہیں آئی اور وہ وہیں پڑے پڑے زنگ آلود ہوتے رہے۔

ادارۂ اسلامیہ: ادارۂ اسلامیہ میں سلطنت کے وہ تمام مسلمان شامل تھے، جو ادارۂ حکومت کے باہر تھے اور جو کسی حیثیت سے عام سطح سے بلند تھے، سلطان اس ادارہ کا بھی صدر تھا، دونوں کا بنیادی فرق یہ تھا کہ ادارۂ حکومت کے ارکان تقریباً بلا استثنا عیسائی خاندانوں سے لیے جاتے تھے اور ادارۂ اسلامیہ کے ارکان تمام تر مسلمان خاندانوں کے

---

(۱) ترکوں کی اسلامی خدمات از ڈاکٹر جوہانس ص ۳۲

افراد ہوتے تھے۔ ادارۂ اسلامیہ کا بھی ایک تدریجی نظامِ تعلیم تھا، جماعت علما میں شامل ہونے کے لیے جو اس ادارہ کا حکمراں حصہ تھا، اس کے تعلیمی نظام سے گزرنا ضروری تھا، اس ادارہ کی خاص جماعتیں مدرسین، مفتیوں اور قاضیوں کی تھیں، انھی کے ہاتھوں میں سلطنت کے علوم، مذہب اور قانون کا نظام تھا۔

تعلیمی نظام: تعلیم کا ذوق یوں تو سلاطین عثمانیہ کو شروع ہی سے تھا لیکن محمد فاتح اپنے تمام پیشروؤں سے بڑھ گیا، اسی نے ''سلسلہ علما'' کو قائم کر کے سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی تعلیم و ترقی کا ضابطہ مرتب کیا، مکاتب و مدارس سلطنت کے ہر حصہ میں کثرت سے قائم تھے، یہ مسجدوں سے متعلق ہوتے تھے اور ان کے اخراجات وقف کی آمدنی سے پورے کیے جاتے، مکاتب یعنی ابتدائی اسکولوں میں تعلیم مفت تھی اور اکثر طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام بھی وقف ہی کی آمدنی سے ہوتا تھا، اعلیٰ تعلیم کے مدارس میں بھی طلبہ کو جزوی طور پر امداد دی جاتی تھی، نصاب تعلیم کی تفصیل آیندہ باب میں بیان کی گئی ہے، ان تمام لوگوں کو جو ادارۂ اسلامیہ میں کوئی سرکاری عہدہ چاہتے تھے، کسی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونا لازمی تھا، جب تک وہ زیر تعلیم رہتے انھیں ''سوفتہ'' کہا جاتا، نصاب پورا کرنے کے بعد دانشمند کی سند دی جاتی تھی، ایسے طلبہ کو جو مکاتب کی معلمی یا مساجد کی امامت وغیرہ کے عہدوں پر قناعت کر لیتے یہ سند کافی تھی، لیکن جو مفتی یا قاضی بننے کا حوصلہ رکھتے تھے انھیں قانون کا ایک اعلیٰ نصاب پورا کرنا پڑتا تھا، مفتی اعظم خود ان کا امتحان لیتا تھا اور اگر وہ کامیاب ہوتے تو انھیں ملازمت کی سند دی جاتی تھی، اسی جماعت سے اونچے درجہ کے مدرس بھی مقرر کیے جاتے تھے۔

مفتی: مفتیوں کی جماعت علما میں خاص اہمیت رکھتی تھی، ہر بڑے شہر کے قاضی کے ساتھ ایک مفتی مقرر ہوتا تھا، اس کے علاوہ بگلر بے اور سنجق بے کے ساتھ بھی مفتی ہوا کرتے تھے، وہ مدت العمر کے لیے مقرر کیے جاتے تھے، انھیں خود معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل نہ تھا بلکہ جب کبھی کوئی قاضی بے یا عام آدمی ان سے استفتا کرتا تو ان

کا فرض تھا کہ مذہب حنفی کے مطابق فتوی دیں، عام طور پر تو مفتی کا درجہ قاضی کے بعد تھا مگر قسطنطنیہ میں ایسا نہ تھا جہاں سلطان اور افسران حکومت کو اکثر نہایت اہم معاملات میں فتوی لینے پڑتے تھے، اسی وجہ سے قسطنطنیہ کے مفتی کا درجہ جو مفتی اعظم کہا جاتا تھا، قاضیوں سے بھی بڑھ گیا، محمد ثانی نے اسے شیخ الاسلام کا لقب بھی عطا کیا جو اب اس کا عام لقب ہو گیا، مفتی اعظم اپنی جماعت سے نہیں منتخب ہوتا تھا بلکہ سلطان اسے عموماً قاضیوں میں سے مقرر کرتا تھا، اسے سلطنت کے تمام دوسرے مفتیوں کو مقرر کرنے اور ترقی دینے کا حق حاصل تھا۔

سلیمان نے مفتی اعظم کو علما کا صدر مقرر کیا اور اس حیثیت سے اس کا درجہ حکومت کے تمام عہدہ داروں سے اونچا ہو گیا، بجز اس کے کہ دیوان میں اس کی جگہ صدر اعظم کے بعد تھی، اپنے منصب کی اہمیت کے لحاظ سے وہ قریب سلطان کا ہمسر ہو گیا کیونکہ وہی قانون شریعت کا شارح اور وکیل تھا اور شریعت سلطان سے بلند تر چیز تھی، بایزید ثانی کا معمول تھا کہ مفتی اعظم کے استقبال کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا اور اسے اپنے سے اونچی جگہ بیٹھنے کو دیتا تھا۔ (۱)

سلطان سلیم اور مفتی جمالی کا واقعہ مشہور ہے، سلیم جب مصر کی مہم سے واپس آیا تو اس نے چاہا کہ سلطنت میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کے لیے تمام عیسائیوں کو مسلمان کر لے، خواہ اس میں جبر ہی سے کام لینا پڑے مگر اتنا اہم کام شرعی فتوے کے بغیر ممکن نہ تھا اور شیخ الاسلام جمالی آفندی نے اس بنا پر فتوی دینے سے انکار کر دیا کہ سلطان محمد فاتح نے عیسائی رعایا کو مذہبی آزادی عطا کی تھی اور اس معاہدہ کی پابندی قانون شریعت کے لحاظ سے ضروری تھی، انھوں نے تین بڑھے ینی چری بھی جن کی عمر سو سال سے زیادہ تھی بطور گواہ اس معاہدہ کے ثبوت میں پیش کیے، یہ تینوں محمد فاتح کے علم کے نیچے لڑ چکے تھے مجبوراً سلیم کو یہ خیال ترک کر دینا پڑا، خالدہ خانم اس واقعہ پر تبصرہ

---

(۱) لی بائر ص ۳۰۹۔

کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

> "یہ واقعہ کئی پہلوؤں سے نہایت دلچسپ ہے۔ ایسا [illegible] سلیم کا سا شخص جس نے خدا جانے کتنے وزیروں کو قتل کرا دیا، شیخ الاسلام کے آگے جو قانون اور شریعت کا نمائندہ تھا، مرعوب ہو گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک سلطنت عثمانی کا نظام اور اس کے اصول کتنے سخت تھے۔ سلطان کی شخصیت سے زیادہ قوی تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی آزادی اور تحمل جو بعد کے یورپ میں خاص خصوصیت تھی، وہ اس سلطنت میں موجود تھی۔ گو وہ دل سے چاہتے تھے کہ سارا ملک مسلمان ہو جائے مگر انھوں نے اپنی سلطنت کے اصول کی حفاظت فرض سمجھی۔"(۱)

نظام عدالت: ترکوں کا سب سے اہم ادارہ حکومت سے زیادہ وسیع تھا۔ [illegible] اور شان [illegible] رہا تھا، جو اجتماعی حیثیت سے مرکزی حکومت نے [illegible] دی تھی (Yassal) [illegible] بھی عثمانی نظام عدالت کے ماتحت تھیں۔ ترکیوں کے عدالت میں دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے مقدمات فیصل ہوتے تھے، لیکن چند مذہبوں کے معاملات ان کے فقہی دائرے سے باہر تھے۔ مثلاً سفارتی مراعات اور غیر ملکی باشندوں کے معاملات جنھوں نے سلطنت عثمانیہ میں اپنی نو آبادیاں قائم کر لی تھیں، خود ان کی عدالتوں میں پیش ہوتے تھے۔ عیسائی رعایا کے مقدمات بھی جن کے فریقین عیسائی ہوتے، انہی کی کلیسائی عدالتوں کے سپرد تھے۔ ادارۂ اسلامیہ کے جج یعنی قاضی ان تمام مقدمات کی سماعت کرتے تھے جو قانون شریعت سے متعلق ہوتے اور جن میں دونوں فریق مسلمان یا ایک مسلمان اور دوسرا عیسائی ہوتا۔ علاوہ اس صورت کے کہ مسلمان سلطان قلی یا سید ہوتا۔

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۳۰

قاضی: تقریباً تمام قاضی شہر کے قاضی ہوا کرتے تھے مگر ان کا حلقۂ اختیار گردونواح کے علاقوں کو بھی محیط ہوتا تھا، ججوں کے پانچ خاص طبقے تھے: بڑے درجہ کے ملا، چھوٹے درجہ کے ملا، مفتش، قاضی اور نائب۔ جج کے لیے عام نام قاضی تھا مگر احتراماً لوگ اسے ملا کے لقب سے پکارتے تھے، ایک دوسری تقسیم جغرافیائی بنیاد پر تھی یعنی یورپ اور ایشیا کے قاضی عسکر جو قاضی عسکر رومیلیا اور قاضی عسکر اناطولیہ کہے جاتے تھے، ہر قاضی عسکر کے ساتھ ایک بڑی جماعت ماتحت عہدہ داروں کی ہوتی تھی، سب سے اونچی عدالتیں قاضی عسکر صدر اعظم اور دیوان کی تھیں، علاوہ ان مقدمات کے جو دیوان میں ان کے سامنے پیش ہوتے تھے یا جن کی سماعت دیوان کے ختم ہو جانے پر وہ قصر شاہی کے باب پر کرتے قاضی عسکر دوسرے اوقات میں بھی اپنے گھروں پر عدالت کیا کرتے تھے جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، ان کی اصلی حیثیت فوجی ججوں کی تھی مگر بعد میں ان کے اختیارات وسیع کر دیے گئے، یہاں تک کہ وہ اپنے حلقے کے تمام ججوں کے افسر اعلیٰ بن گئے، دیوان میں ان کا درجہ وزرا کے بعد تھا، لیکن دیوان کے ختم ہونے پر انھیں سب سے پہلے سلطان کی خدمت میں باریابی کا حق حاصل تھا، سلیمان کے عہد تک انھیں جماعت علما پر وہ تمام اختیارات بھی حاصل تھے جو سلیمان نے مفتی اعظم کو تفویض کر دیے۔

صدر اعظم کی عدالت: سلطان کے نمائندے کی حیثیت سے صدر اعظم ادارۂ اسلامیہ کا بھی حقیقی صدر تھا اور اس کی عدالت دیوانی کے تمام مقدمات کے لیے سب سے بڑی عدالت مرافعہ تھی، لیکن وہ صرف عدالت عالیہ ہی نہ تھی بلکہ سلطنت کی دوسری عدالتوں کی طرح عدالت ابتدائی بھی تھی، جہاں امیر و غریب کے چھوٹے بڑے کثیر التعداد مقدمات فیصل ہوتے تھے، عدالت کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا یا تو صدر اعظم خود فیصلے صادر کرتا یا فرصت نہ ہونے کی صورت میں مقدمات کو کسی قاضی عسکر یا دوسرے جج کے سپرد کر دیتا کہ فیصلہ جلد کر دیا جائے، پروفیسر لی بار لکھتے ہیں کہ کم سے کم ایک حیثیت سے عثمانی عدالتیں بہت قابل تعریف تھیں، فریقین مقدمہ کو فیصلہ کے انتظار

کی زحمت بہت کم برداشت کرنی پڑتی تھی، مقدمے فوراً اور صاف و سادہ الفاظ میں فیصل کیے جاتے تھے(۱)، عدالتوں میں مذہب حنفی پر عمل درآمد تھا۔

ملتیں: ادارہ اسلامیہ کے علاوہ سلطنت میں مختلف ملتوں کا بھی جداگانہ انتظام تھا، یہ ملتیں کلیسائی فرائض کے علاوہ پیدائش، اموات، نکاح اور وصیت ناموں کا اندراج کرتی تھیں، اپنے مذہب والوں کے شخصی قانون کے معاملات خود اپنی عدالتوں میں فیصل کرتی تھیں اور اگر فریقین مقدمہ اسی ملت کے ہوتے تو ان کے دیوانی کے مقدمات کا فیصلہ بھی ان کی عدالتوں میں ہوتا، اس کے علاوہ یہ ملتیں اپنے حلقے کے لوگوں سے ٹیکس بھی وصول کرتی تھیں، یہ تمام فرائض جو حقیقۃً فرماں روائی کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ سلطنت عثمانیہ نے صراحت کے ساتھ ملتوں کو تقسیم کر دیے تھے اور ان کی انجام دہی میں خود اپنی فوجوں سے ملتوں کی مدد کرتی تھی، ان میں سب سے اہم ملت روم تھی، جس کے حلقے میں وہ تمام عیسائی رعایا شامل تھی جو شرقی یا یونانی کلیسا کی پیرو تھی، خواہ وہ سلطنت کے کسی حصہ میں آباد ہو اور اس کی مادری زبان کچھ بھی ہو، اس ملت کا قائد اعظم بطریق قسطنطنیہ تھا، جس کو سلطنت عثمانیہ کے عروج کے زمانہ میں اس سے زیادہ اقتدار حاصل تھا جتنا وہ سلطنت بزنطینی نے ایک عہدہ دار کی حیثیت سے رکھتا تھا، ملت روم کے علاوہ چند ملتیں اور بھی تھیں مثلاً ملت ارمنی جو قسطنطنیہ کے گریگوری بطریق کے ماتحت تھی، ملت یہود جس کا افسر ربی اعظم تھا اور رومن کیتھولک عیسائیوں کا فرقہ جو پوپ کے ایک نمائندہ کے ماتحت تھا۔

سلطنت میں ایسے بہت سے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ آباد تھے، جو سلطان کی رعایا نہ تھے بلکہ مغربی طاقتوں مثلاً وینس، فرانس، ہالینڈ اور انگلستان کی رعایا تھے، یہ تجارت کی غرض سے آئے تھے اور یہیں مقیم ہو گئے تھے، انہیں بھی حکومت عثمانیہ کی طرف سے ان کے سفیروں اور قنصلوں کے ماتحت اسی قسم کے اختیارات دے دیے گئے تھے، جس قسم کے ملتوں کو حاصل تھے اور یہ غیر ملکی باشندے بھی عیسائی رعایا کی طرح اپنے معاملات کا انتظام

---

(۱) لین پول ص ۳۲۲

خودہی کرتے تھے، عثمانی ترکوں نے تقریباً کل تجارت عیسائیوں کے ہاتھ میں چھوڑ رکھی تھی۔

انقلابی تبدیلیاں: ادارۂ حکومت کے بنیادی نظام میں جب تک طاقت رہی ان حقوق و مراعات سے سلطنت کو کوئی نقصان نہ پہنچا، لیکن سولھویں صدی کے بعد جب اس ادارہ کے اصول سے بے اعتنائی برتی جانے لگی تو حکومت کے ہر شعبہ میں اختلال کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ سلیمان کے بعد جو شہزادے تخت پر آئے وہ بچپن سے محل میں نظر بند رہنے کے باعث ملکی حکمرانی سے محروم ہو چکے تھے، ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو اتنی بڑی سلطنت کا بار اٹھا سکتے، ان کی نااہلی سے امور مملکت میں حرم کا دخل شروع ہوا، سفارش کردیوں کا دور دورہ ہوا، ملکی اور فوجی عہدے فروخت ہونے لگے اور نظام حکومت کی تمام بنیادیں متزلزل ہو گئیں، یہ اندرونی کمزوریاں بیرونی حملوں کا پیش خیمہ تھیں، چنانچہ سترہویں صدی کے بعد دولت عثمانیہ اپنے مغربی حریفوں سے اکثر جنگوں میں شکست کھاتی رہی اور آسٹریا اور روس سے جو لڑائیاں ہوئیں ان میں متعدد صوبے اس کے ہاتھ سے نکل گئے، محمود ثانی نے یہ دیکھ کر کہ سلطنت پرانی بنیادوں پر جو بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکتی، اس قدیم نظام کو توڑ دیا اور حکومت کے ہر شعبہ میں اصلاحات شروع کیں، ادھر عیسائی رعایا میں بھی ایک نئی تحریک پیدا ہوئی تھی، سترہویں صدی کے آخر میں بہت سے یونانیوں نے تجارت کے ذریعہ مغرب سے راہ پیدا کر لیا تھا، مغربی زبانیں سیکھ لی تھیں اور مغربی علوم و فنون اور سیاسی خیالات سے آشنا ہو گئے تھے، دولت عثمانیہ کو جب یوروپین طاقتوں کے مقابلہ میں شکستیں ہونے لگیں تو عیسائی صوبوں کی طرف سے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ شروع ہوا اور دول عظمیٰ نے ان کی حمایت میں باب عالی پر دباؤ ڈالا کہ ان صوبوں میں اصلاحات جلد سے جلد جاری کر دی جائیں، چنانچہ ۱۸۳۹ء کے خط شریف اور ۱۸۵۶ء کے خط ہمایوں میں ان تمام اصلاحات کا اعلان کر دیا گیا، جن کا مطالبہ دول عظمیٰ نے کیا تھا مگر اس کے بعد بھی عیسائی صوبوں کا مطالبہ خود اختیاری بدستور قائم رہا اور دول عظمیٰ کو بھی یہ اصلاحات ناکافی معلوم

ہوگئیں، اس کے بعد ان طاقتوں کی طرف سے عیسائی صوبوں کی خفیہ اور علانیہ امداد کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے بالآخر ان کو دولت عثمانیہ سے آزاد کرا کر چھوڑا، ان واقعات کی تفصیل گزشتہ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

غرض انیسویں صدی کی ان اصلاحات سے جو ”تنظیمات“ کے نام سے مشہور ہیں، سلطنت عثمانیہ کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا، وہ نظام حکومت جو قدیم سلاطین نے قائم کیا تھا بالکل بدل دیا گیا اور اس کی جگہ مغربی طرز کا جدید نظام قائم کیا گیا: حکومت کے مختلف شعبوں کے لیے وزارتیں قائم ہوئیں اور ہر وزیر اپنے شعبہ کا ذمہ دار قرار دیا گیا، حکومت کے تمام عہدے مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے یکساں طور پر کھول دیے گئے، بڑے بڑے عہدوں یہاں تک کہ وزارتوں اور سفارتوں پر بھی عیسائیوں کا تقرر ہونے لگا، عدالتی نظام میں بھی تبدیلی ہوئی، پہلے صرف شرعی عدالتیں تھیں جن میں قانون شریعت کے مطابق تمام مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے، یہ شیخ الاسلام کے تحت تھیں اور ان میں صرف ایک قاضی یا جج ہوتا تھا، ”تنظیمات“ کے بعد مغربی طرز کی عدالتیں قائم کی گئیں جو وزیر عدل کے زیر نگرانی تھیں، ان عدالتوں میں مختلف مذہبی فرقوں کے بھی جج ہوتے تھے، قدیم شرعی عدالتیں بھی قائم رکھی گئیں مگر اب ان میں وہی مقدمات پیش ہوتے جن کا تعلق وراثت، نکاح و طلاق یا مسلمانوں کے دوسرے شخصی معاملات سے ہوتا، جدید عدالتیں ان ضوابط کا نتیجہ تھیں جو مغربی یورپ کے قانونی ضوابط کے مطابق تیار کیے گئے تھے، چنانچہ ایک ضابطہ تجارت مرتب ہوا جس میں قرض پر روپیہ پر سودی شرط تسلیم کی گئی، حالانکہ قرآن مجید سے اس کی صریح ممانعت ثابت ہے، اسی طرح ایک ضابطہ فوجداری بنایا گیا جس میں قانون شریعت کے تعزیری احکام کے بجائے جرائم کے لیے دوسری سزائیں مقرر کی گئیں، فرانس کے ضابطہ دیوانی کے نمونہ پر ایک ضابطہ دیوانی بھی مدون ہوا اور جدید نظام عدالت اسی کے مطابق قائم کیا گیا، اس ضابطہ کے رو سے عدالت ابتدائی اور عدالت مرافعہ الگ الگ قائم کی گئیں، ان عدالتوں میں عیسائی

اور یہودی جج مسلمان قاضیوں کے ساتھ بیٹھ کر فیصلے کرتے تھے، ان تمام معاملات میں جو صراحت کے ساتھ ضابطہ تجارت یا ضابطہ فوجداری میں مذکور نہ تھے، یہ جدید عدالتیں بھی قانون شریعت ہی کے مطابق فیصلے کرتی تھیں۔

ممالک محروسہ: سلطنت عثمانیہ مندرجہ ذیل اقسام کے ممالک محروسہ پر مشتمل تھی:

۱- آراضی کا وہ حصہ جس کا انتظام باب عالی کی طرف سے براہ راست ہوتا تھا
۲- وہ متعدد علاقے جن کا انتظام مخصوص ضوابط کے ماتحت ہوتا تھا۔
۳- متعدد باج گذار صوبے۔
۴- بعض وابستہ ریاستیں۔

ان کے علاوہ ایک خطہ نزاعی علاقہ کا تھا، جو دونوں فریق کے مسلسل حملوں کی وجہ سے تقریباً ویران رہتا تھا، اس خطہ کی اہمیت سلطنت عثمانیہ کے باشندوں اور حکومت کے نزدیک اس وجہ سے تھی کہ یہیں سے سلطنت کے لیے قیدی غلام فراہم ہوتے تھے، اس خطے کا نام دارالحرب تھا۔

جو علاقے براہ راست زیر حکومت تھے، وہ صوبوں یا سنجقوں میں تقسیم تھے اور ان میں سے ہر سنجق کے محاصل کا ایک علاحدہ قانون نامہ تھا، جس کی بنیاد ان معاہدوں پر تھی جو فتح کے وقت کیے گئے تھے، البانیہ اور کردستان کے بعض پہاڑی علاقے اور صحرائے عرب تقریباً خود مختار تھے، گو نام کے لیے ان کا انتظام باب عالی کی طرف سے ہوتا تھا، ان ملکوں نے اپنی قبائلی تنظیم قائم رکھی تھی اور یہ اپنے موروثی سرداروں کے ماتحت تھے، ان کی فوجی خدمات کے معاوضے میں عثمانی عطیات دیئے گئے تھے، یہ جب چاہتے محصول ادا کرتے اور جب نہ چاہتے نہ ادا کرتے۔

سلطنت کے مرکزی حصہ کی زمینیں تین قسم کی تھیں: ارض عشریہ، ارض خراجیہ اور ارض مملکات۔ ارض عشریہ مسلمانوں کو فتح کے وقت اس شرط پر دی گئی تھی کہ حکومت کو عشر ادا کرتے رہیں گے، ارض خراجیہ فتح کے وقت عیسائیوں کو دی گئی تھی یا ان کے پاس چھوڑ

دی گئی تھی، اس شرط پر کہ دو میں سے کوئی ایک ٹیکس ادا کریں گے یا تو زمین کے معاوضہ میں ایک معین رقم دیتے رہیں یا پیداوار کا ایک حصہ دیں جس کی مقدار زمین کی نوعیت کے لحاظ سے عشر سے نصف تک ہوتی تھی، ارضِ مملکت میں وہ زمینیں شامل تھیں جو کسی کو بطور ملک نہیں دی گئی تھیں بلکہ ان کا مالک خود سلطان تھا، لیکن وہ ان کو صرف ایک جز سے متمتع ہوتا تھا کیونکہ ان کا بڑا حصہ مسجدوں پر وقف کر دیا گیا تھا اور ان مسجدوں سے متعلق جو مدرسے، ہسپتال یا دوسری عمارتیں تھیں ان کے اخراجات بھی اسی وقف سے ادا کیے جاتے تھے، اس کے علاوہ ارضِ مملکت کی بہت سی زمینیں مسلمان "سپاہیوں" کو جاگیر میں دی گئی تھیں، جو اس کے معاوضہ میں فوجی خدمت کے لیے سوار فراہم کرتے تھے، ان حصوں کے نکالنے کے بعد نسبتاً تھوڑی سی زمین جو بچ جاتی تھی وہی سلطان کی ذاتی ملک سمجھی جاتی تھی اور اس کا انتظام سلطان بحیثیت مالک کے ایک خاص طریقہ پر کرتا تھا، ارضِ مملکت کے کاشتکار صرف پٹہ پر زمینیں حاصل کرتے تھے اور مال گذاری نقد یا جنس کی شکل میں مسجد، جاگیردار یا سلطان کو دیتے تھے، یورپ کے تمام مقبوضات ارضِ مملکت خیال کیے جاتے تھے ایشیائے کوچک کا بھی اکثر حصہ ارضِ مملکت تھا، لیکن شام مسوپوٹامیا اور مصر قدیم انتظامات کے تحت تھے اور زیادہ تر ارضِ خراجیہ تھے، عرب اور بصرہ تقریباً تمام تر ارضِ عشریہ تھے، کریمیا جارجیا، منگریلیا اور عرب کے بعض حصے وابستہ (Yassal) علاقے تھے، جو باضابطہ خراج نہیں ادا کرتے تھے، جزیرہ قبرص، ہنگری کے علاقے، رگوسا، ٹرانسلوینیا، مولڈیویا اور ولاچیا باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے اور انھیں اپنا انتظام خود کرنے کی اجازت حاصل تھی، مصر ایک خاص انتظام کے ماتحت تھا، جو مملوکوں کے نظامِ حکومت سے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ ماخوذ تھا، وہاں کا حاکم ایک پاشا ہوتا تھا، جو تین سال کے لیے بابِ عالی سے بھیجا جاتا تھا اور وہاں کے سالانہ محاصل کا بڑا حصہ شاہی خزانہ میں جاتا تھا، حرمین شریفین سے بجائے اس کے کہ کوئی خراج لیا جائے، مصر کے محاصل سے ایک بڑی رقم خود وہاں بھیجی جاتی تھی، شمالی افریقہ کے مقبوضات سے زیادہ تر اقتدار اور بحری مدد حاصل تھی۔ (لی بانر)

تعلیم

جارج لارپنٹ اپنی تاریخ ترکی میں لکھتا ہے

”اسلام کے متعلق اکثر یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ علم کی روشنی پھیلانے کا مخالف ہے اور خصوصا آل عثمان کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قوم مجسم جہالت کی بندہ ہے، دونوں قول مساوی طور پر بے بنیاد ہیں، قرآن کا بغور مطالعہ خلفائے بغداد کے علمی کارنامے ان کی آب و تاب جب کہ یورپ خود قعر جہالت میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ حیرت انگیز تصانیف جن سے عربوں نے اہل یورپ کو مالا مال کر دیا پہلے قول کی ناانصافی ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، دوسرے قول کا جھوٹ بھی اس شخص کے لیے اس سے کم واضح نہیں ہے جس نے ترکی کی حالت غور سے دیکھی ہے، کسی ملک میں تعلیم کی عزت ترکی سے زیادہ نہیں ہے، کسی ملک میں ان لوگوں کا احترام جن کے سپرد تعلیم پھیلانے کی خدمت ہے ترکی سے زیادہ نہیں کیا جاتا، خواجہ (استاد) کا لقب ایک ایسا لقب ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جاتا، خواجہ کی ظاہری حیثیت کیسی ہی حقیر ہو، اس کا شاگرد کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے یہاں تک کہ صدر اعظم بھی ہو جائے تاہم وہ مجمع عام میں بھی اپنے قدیم استاد کے ساتھ ہمیشہ ملاطفت اور احترام کے ساتھ پیش آتا ہے۔“(۱)

---

(۱) ترکی از سر جارج لارپنٹ ج ۱ ص ۱۳۷ (Turkey by Sir George Larpent) مطبوعہ لندن ۱۸۵۴ء

ترکی میں تعلیم کے تین دور نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

۱۔ دینی دور: آغاز سے تنظیمات یعنی ۱۸۳۹ء تک

۲۔ درمیانی دور: تنظیمات سے جمہوریہ کے اعلان تک یعنی ۱۸۳۹ء سے ۱۹۲۳ء تک۔

۳۔ اصلاحات کا دور: ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۷ء تک

۱۔ دینی دور: سلاطین عثمانیہ نے تعلیم کا نظام شروع ہی سے قائم کیا چنانچہ اورخان نے جو اس سلسلہ کا دوسرا فرمانروا تھا ازنیق میں ایک مدرسہ قائم کیا جو سلطنت عثمانیہ کا پہلا مدرسہ تھا۔ اس کے بعد دوسرے سلاطین نے بھی تعلیم پر شاہانہ توجہ کی اور سینکڑوں مدرسے اور دارالعلوم قائم کیے۔ ان کی پوری تفصیل مولانا شبلی نعمانی نے اپنے رسالہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" میں بیان کی ہے۔ ارکوہرٹ (Urquhart) جس نے مشرقی ممالک کے حالات ذاتی تحقیق سے لکھے ہیں بیان کرتا ہے کہ "ترکی میں کوئی سلطان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے پیچھے ایک کالج نہ چھوڑا ہو اور اس پر بیش بہا جائداد وقف نہ کی ہو(۱)۔" جس سلسلہ کو اورخان نے شروع کیا تھا وہ اس کے جانشینوں کے دور میں ترقی کرتے سلطان محمد فاتح کے عہد میں حد کمال کو پہنچ گیا۔ محمد فاتح کا علمی شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ تخت سلطنت پر آنے کے بعد بھی اس نے تحصیل علم کا مشغلہ جاری رکھا۔ ۸۹۵ھ (۱۴۹۰ء) میں اس نے قسطنطنیہ میں ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جس کے تحت آٹھ کالج تھے اور سب کے ساتھ جداگانہ بورڈنگ ہاؤس تھے(۲)۔ شبلی لکھتے ہیں:

> "ترکوں کے پیشوا سلاطین اور خصوصاً اورخان کو اسکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے کا بہت شوق تھا لیکن محمد ثانی سب سے بڑھ گیا۔ اسی نے "سلسلۂ علما" کو قائم کیا اور سلطنت کے منصبوں اور قاضیوں کی

---

(۱) "روح مشرق" از ارکوہرٹ (Spirit of the east by urquhart) بحوالہ رسالہ

(۲) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم از مولانا شبلی نعمانی

تعلیم و ترقی کا ضابطہ مرتب کیا، فاتح قسطنطنیہ خوب جانتا تھا کہ ایک بڑی سلطنت کے پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے علاوہ شجاعت اور فوجی لیاقت کے کچھ اور بھی ضروری ہے، محمد نے جو علوم میں خود بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کے لیے بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عدالت کا نظام درست رکھنے کے لیے قاضیوں کا احترام قائم کرنا ضروری ہے اور ان کا احترام قائم کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں بلکہ سلطنت کے اونچے اور معزز عہدوں پر بھی مامور کیے جائیں، نیز افلاس کی پریشان خاطری سے محفوظ کر دیے جائیں، محمد نے علاوہ ابتدائی مدارس کے جو مکتب کہے جاتے ہیں اور ہر شہر کے ہر محلہ اور ترکی کے تقریباً تمام دیہاتوں میں پائے جاتے ہیں بہت سے بڑے بڑے مدرسے قائم کیے، ان مدرسوں میں دس مختلف مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی، صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعیات، تاریخ، زبان، فصاحت و بلاغت، اقلیدس اور ہیئت، یہ ایک ایسا نصاب تعلیم ہے جس کا موازنہ یقیناً چودھویں صدی کے پیرس اور آکسفورڈ کے نصاب تعلیم سے کیا جا سکتا ہے، جو طلبہ ان سب مضامین میں پوری دستگاہ حاصل کر لیتے تھے، ان کو "دانشمند" کا لقب دیا جاتا تھا اور اس حیثیت سے وہ چھوٹے چھوٹے طالب علموں کو پڑھاتے تھے، دانشمند بغیر مزید تعلیم حاصل کیے کسی ابتدائی مدرسہ کی اعلیٰ مدرسی کا حقدار ہو سکتا تھا، لیکن اس صورت میں وہ علما کی جماعت کا رکن نہیں بن سکتا تھا اور اسے تمام اعلیٰ تعلیمی عہدوں سے محروم ہو جانا پڑتا تھا، جماعت علما کا رکن بننے کے لیے فقہ کے ایک طویل نصاب کو مکمل کرنا پڑتا تھا اور کیے

بعد دیگرے مختلف امتحانات میں کامیابی حاصل کر کے متعدد اسناد لیتے پڑتے تھے ... “(۱)

محمد کے جانشینوں نے اس کی قائم کی ہوئی مثال کے مطابق تعلیم کو خوب پھیلایا ہر سلطان ایک مسجد ضرور تعمیر کرتا اور ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ کا قائم کرنا لازمی تھا، یوں مسجدوں کی تعداد کے ساتھ مدرسوں کی تعداد بھی برابر بڑھتی گئی، لارینٹ کا بیان ہے کہ ۱۷۶۵ء سلطان مصطفیٰ ثالث کے عہد حکومت میں صرف حدود قسطنطنیہ کے اندر دو سو پچھتر مدرسے موجود تھے اور انیسویں صدی کے وسط میں سلطان عبدالمجید خاں کے زمانہ میں یہ تعداد تین سو سے اوپر پہنچ گئی تھی، عبدالمجید خاں کے عہد میں ہر شہر میں کم سے کم ایک مدرسہ موجود تھا، بڑے شہروں مثلاً ادرنہ، بغداد اور قاہرہ میں چالیس چالیس اور پچاس پچاس مدرسے تھے۔ (۲)

ابتدائی مدارس یعنی مکتب سلطنت کے ہر حصہ میں قائم تھے، شہر کا کوئی محلہ یا چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ان سے خالی نہ تھا، مکتبوں کی تعلیم تقریباً مفت تھی، فیس صرف دو پیاستر (قرش) ماہانہ تھی جو گویا مفت کے برابر تھی، نصاب عقائد، اخلاق اور قرآن مجید کی تعلیم پر مشتمل تھا، ان مکتبوں میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، اعداد وشمار سے ثابت ہوتا ہے کہ پچانوے فیصدی مسلمان بچے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ (۳)

سلطان محمد فاتح نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا تھا، اس میں دو نمایاں خامیاں تھیں، پہلی اور بڑی خامی تو یہ تھی کہ مکتب اور مدرسہ (دارالعلوم) کی تعلیم کے درمیان کوئی وسطی نصاب نہ تھا، مکتبوں میں بہت ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی اور مدرسوں میں بہت اعلیٰ، جو بچے مکتبوں کی تعلیم سے فارغ ہو کر اوسط درجہ کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے لیے اس قسم کی کوئی درسگاہ نہ تھی، مدرسوں کا نصاب بہت اونچا تھا، جس کی تکمیل میں پچیس سے تیس سال کی مدت صرف ہو جاتی تھی، یہی وجہ تھی کہ مکتبوں میں تو مسلمان طلبہ کا

---

(۱) کریسی ج ۱ ص ۱۷۱-۱۶۹ (۲) لارینٹ ج ۳ ص ۱۴۳ (۳) ایضاً ص ۱۴۲

اوسط پچانوے فیصدی تھا، لیکن مدرسوں میں ۱۸۵۳ء تک چار فیصدی سے زیادہ نہ ہوسکا تھا(۱) جو طلبہ اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے یا اعلیٰ عہدوں (ملازمت دیوانی) کے لیے تیار ہونا چاہتے تھے وہ اپنے گھروں پر تعلیم حاصل کرتے۔ دوسری تعلیم ایسی تھی کہ زیادہ تر وقت عربی زبان کے سیکھنے اور اس کی صرف و نحو اور اصطلاحات وغیرہ کے یاد کرنے میں صرف ہو جاتا تھا اور ضرورت سے زیادہ زور معقولات اور منطقی موشگافیوں پر دیا جاتا تھا، قوموں کے باہمی تعلقات اور مختلف طرز کی حکومتوں سے طلبہ بالکل بے خبر رہتے۔ تاریخ اور جغرافیہ سے بھی تقریباً ناآشنا تھے۔ ان علوم میں جو کچھ تھوڑی بہت واقفیت ہوتی وہ صرف اپنے ہی ملک تک محدود رہتی۔ تعلیم تمام تر مذہبی اور ادبی تھی اور اس کا تمام ذخیرہ علما کے ہاتھوں میں تھا، وہ اس میں کسی ترمیم یا اصلاح کو گوارا نہ کرتے اور جدید زمانہ کی ضروریات کو تسلیم نہ کرتے تھے۔

۲-دور تنظیمات: یہ حالت آغاز تنظیمات یعنی ۱۸۳۹ء تک قائم رہی اور یہی نظام تعلیم بغیر کسی اصلاح و ترمیم کے تمام سلطنت میں جاری رہا، لیکن جب سلطان عبدالمجید خان تخت پر آئے اور انھوں نے حکومت کے ہر شعبہ میں اصلاحات شروع کیں تو نظام تعلیم میں بھی بعض اہم اصلاحیں کی گئیں۔ ان کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے محسوس کی جا رہی تھی کہ علما اور [illegible] کی جماعت کلی اصلاحات کی مخالف تھی اور چونکہ عوام پر اس جماعت کا اثر بہت زبردست تھا اس لیے سلطنت کے ہر حصہ میں اصلاحات کے خلاف شورش برپا ہو رہی تھی، غرض مارچ ۱۸۴۵ء میں باب عالی نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم عامہ کی اصلاح اور ملک کی روز افزوں ضروریات کا لحاظ کر کے ایک جدید نصاب تعلیم ترتیب دیا جائے۔ اس کمیشن کے ممبر وہی لوگ مقرر کیے گئے جو اپنی لیاقت اور اصلاحات کی حمایت کا قوی ثبوت دے چکے تھے۔ کمیشن نے اگست ۱۸۴۶ء میں اپنی رپورٹ پیش کی، اس رپورٹ کے مطابق تعلیم عامہ کی ایک مستقل مجلس مقرر کی

---

(۱) اوبانی ج ۳ ص ۱۳۰

گئی اور اس کے ماتحت عثمانیہ یونی ورسٹی بطور ایک سرکاری ادارہ کے قائم ہوئی، تعلیم کے تین درجے قرار دئے گئے: (۱) ابتدائی تعلیم جس کے خاص اجزا دینی تھے جو مکتب کے نصاب میں شامل تھے (۲) ثانوی تعلیم جو ایک درمیانی اور نئی چیز تھی (۳) اعلیٰ تعلیم جس کے لیے یہ طے پایا کہ جدید اصول پر از سر نو ترتیب دی جائے، لیکن قدیم نظام تعلیم اور اس کے طلبہ کو جو حقوق و مراعات حاصل تھے، وہ برقرار رکھے گئے، یونی ورسٹی کے لیے ایک نئی عمارت بننے کا حکم ہوا اور ایا صوفیا کے قریب دیب خانہ کے مقام پر جہاں پہلے ینی چری فوجوں کی بارکیں تھیں، اس کا سنگ بنیاد بڑی شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا۔ (۱)

ابتدائی تعلیم: تعلیمی مجلس نے سب سے پہلے ابتدائی مدارس کی اصلاح شروع کی اور پہلا کام یہ کیا کہ ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دیا، اور پیاستر (۲) ماہانہ کی رقم جو پہلے استاد کو دی جاتی تھی، اس کے بجائے اساتذہ کی مستقل تنخواہیں مقرر کر دی گئیں جو مکتبوں کی موقوفہ جائدادوں سے حاصل کی جاتی تھیں، جہاں ان جائدادوں کی آمدنی کافی نہ ہوتی، وہاں حکومت کی طرف سے یہ کمی پوری کر دی جاتی تھی، اس کے بعد یہ قانون جاری کیا گیا کہ تمام مسلمان اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو لے کر جب ان کی عمر چھ سال کی ہو جائے ضلع کی میونسپلٹی کے صدر دفتر میں حاضر ہوں اور ان بچوں کے نام مکتب کے رجسٹر میں درج کرائیں، جو لوگ اپنے بچوں کو مکتب کی تعلیم دلانا نہ چاہتے ان کو یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ انھوں نے گھر پر تعلیم کا معقول انتظام کر لیا ہے، اس حکم پر عمل درآمد کرانے کے لیے ایک قانون یہ بھی بنایا گیا کہ کسی فن کا استاد کسی لڑکے کو اپنے ہاں بطور شاگرد نہ رکھے، جب تک اس لڑکے نے مکتب کی سند حاصل نہ کر لی ہو، ابتدائی مدارس کا نصاب تعلیم تقریباً وہی قائم رکھا گیا جو قدیم طرز کے مکتبوں کا تھا، مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ابتدائی مدارس میں قرآن مجید، ترکی زبان، عربی کا املا، خط اور حساب تقسیم

---

(۱) لاروپٹ ج ۲ ص ۱۲۷-۲۸ (۲) پیاستر جسے ترکی میں قرش یا غرش کہتے ہیں دو آنے کے برابر ہوتا ہے۔

تک پڑھایا جاتا تھا، قدیم مکتبوں میں ترکی زبان کی ریڈریں رائج تھیں، اب خاص طور پر بچوں کے لیے عام فہم ترکی ریڈریں تیار کی گئیں اور تعلیمی مجلس نے تمام ابتدائی مدارس میں انہیں پڑھانے کا حکم دیا۔ صرف قسطنطنیہ میں ان مدارس کی تعداد ۱۸۵۲ء میں (۳۹۲) تھی جن میں (۲۲۷۰۰) لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں (۱) مدت تعلیم زیادہ سے زیادہ پانچ سال تھی لیکن ذہین طالب علم اس سے پہلے ہی نصاب ختم کر کے ترقی کر سکتا تھا۔

ثانوی تعلیم: مکاتب ابتدائیہ کے بعد مکاتب رشدیہ کا درجہ تھا، جن میں ثانوی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کی مدت بھی عموماً چار سال تھی۔ لارپنٹ لکھتا ہے کہ ۱۸۵۱ء میں مکاتب رشدیہ کی تعداد چھ تھی جن میں (۸۷۰) طلبہ زیر تعلیم تھے، چونکہ ان ثانوی مدارس کے قیام کو ابھی بہت تھوڑی مدت گزری تھی، اس لیے طلبہ کی یہ تعداد کافی امید افزا تھی، ابتداء نصاب میں صرف یہ مضامین تھے: عربی صرف و نحو، املا، انشا، اسلامی تاریخ، ترکی تاریخ، عام تاریخ، جغرافیہ، حساب اور علم ہندسہ (جیومٹری) کے کچھ حصے، لیکن مولانا شبلی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں کچھ مضامین بڑھا دیے گئے تھے اور کچھ بدل دیے گئے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ رشدیہ کی مدت تعلیم تین برس کی تھی اور اس میں ترکی املا، مفردات زبان ترکی، نحو ترکی، عقائد اسلام بزبان ترکی، حساب چاروں حصے، فرنچ زبان، عربی زبان، جغرافیہ، اقلیدس، دو لغات تجارت کے اصول اور نقشہ کشی کی تعلیم ہوتی تھی (۲)، رشدیہ میں بھی تعلیم بالکل مفت دی جاتی تھی، مدارس کے اخراجات، اساتذہ کی تنخواہیں، طلبہ کی کتابیں اور آلات، یہ سب چیزیں حکومت کی طرف سے ملتی تھیں۔ (۳)

مولانا شبلی نے ثانوی تعلیم کے دو درجے بیان کیے ہیں، رشدیہ اور اعدادیہ، رشدیہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہمارے یہاں کے مڈل کے برابر یا اس سے کچھ بڑھ کر ہے، رشدیہ کے بعد اعدادیہ کا درجہ بتایا ہے، جس کو انٹرنس کہا جا سکتا ہے، مولانا فرماتے ہیں: ”اس کلاس کے طالب علموں کی مجموعی تعداد ۱۸۹۲ء میں (۵۲۱۵) تھی، اس میں تمام

---

(۱) لارپنٹ ج ۲ ص ۱۵۰ (۲) سفرنامہ روم و مصر و شام (۳) لارپنٹ ج ۲ ص ۱۵۲

اضلاع اور خود پایہ تخت کے مدارس شامل ہیں۔"

اعلیٰ تعلیم: اعلیٰ تعلیم کی اصلاح تعلیمی مجلس کے لیے سب سے زیادہ دشوار تھی کیونکہ علما اس میں کسی تبدیلی کے لیے تیار نہ تھے اور مدرسوں کے نصاب کی اصلاح کے سخت مخالف تھے، بہر حال چونکہ ثانوی مدارس حال ہی میں قائم ہوئے تھے اور طلبہ کو وہاں سے فارغ ہو کر کالج کی تعلیم تک پہنچنے میں تین سال کی مدت درکار تھی، مجلس کو یہ فرصت غنیمت معلوم ہوئی اور اس نے اپنے ہی ارکان میں سے ایک رکن کمال آفندی کو جو اسکولوں کے انسپکٹر جنرل تھے یورپ روانہ کیا تاکہ فرانس، جرمنی اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کا مطالعہ کریں، چنانچہ کمال آفندی کئی مہینے پیرس میں مقیم رہے اور حکومت فرانس نے ان کے لیے تمام ضروری معلومات بہم پہنچائیں، اس درمیان میں تعلیمی مجلس نے خاص خاص مدرسوں کی اصلاح کی کوشش کی، جن میں سے بعض نہایت قدیم زمانہ سے قائم تھے، یہ مدرسے اعدادیہ سے اونچے درجہ کے تھے اور ان میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔

غرض سلطان عبدالمجید خاں کے دور حکومت میں منجملہ اور اصلاحات کے تعلیم کی اصلاح کا کام بھی نہایت سرگرمی سے شروع کیا گیا اور بہت سی مفید اصلاحیں کی گئیں، لیکن ۱۸۵۲ء کے بعد وہ جوش باقی نہیں رہا اور تحریک سست پڑ گئی، چنانچہ جدید یونیورسٹی کی تعمیر بھی ملتوی ہو گئی اور سلطنت کے خاص خاص شہروں میں ثانوی مدارس جو قائم کیے جانے والے تھے وہ بھی قائم نہ ہو سکے پھر بھی اس درمیان میں ایک علمی اور ادبی اکادیمی قائم کر دی گئی تھی، جس کا مقصد بلند معیار کتابوں کی تالیف و ترجمہ کے ذریعہ زبان و ادب کی اصلاح اور تعلیم عامہ کی ترقی تھا۔

جب سلطان عبدالمجید خاں ثانی تخت پر آئے تو تعلیمی ترقی کی رفتار پھر تیز ہونے لگی، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> "سلطان کی تخت نشینی کے وقت مدارس رشدیہ کی تعداد (۹۶) تھی، لیکن اب (۱۸۹۲ء میں) ۳۰۵ ہے، ہر قسم کے نئے مدارس

> جو سلطان کی شانزدہ سالہ حکومت میں قائم ہوئے ان کی تعداد دو ہزار ہے، اسی کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں طالب علموں کی تعداد اس کثرت سے بڑھتی جاتی ہے کہ ترقی تعلیم کی سال ماقبل کی رپورٹ سال مابعد سے کچھ نسبت نہیں رکھتی، پروفیسر ویمبری نے اب سے چند برس پہلے ترکوں کی عام ترقی پر جو لکچر دیا، اس میں مکتب الحقوق (قانونی کالج) کے طالب علموں کی تعداد تین سو بیان کی ہے، لیکن میں جب قسطنطنیہ میں تھا تو اس کالج میں بارہ سو طالب العلم موجود تھے، میں نے زمانہ قیام مصر میں قاہرہ کے مشہور اخبار المؤید میں پڑھا تھا کہ سلطان خان نے جب عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو مصارف تعلیم تین لاکھ پونڈ سالانہ تھے، لیکن اب آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ ہیں، یہ رقم ہمارے یہاں کے ایک کرور بیس لاکھ کے مساوی ہے۔“(۱)

تعلیم کی اس ترقی کے باوجود سلطان عبدالحمید خان کے عہد میں قبائل عرب اس کے فیض سے تقریباً بالکل محروم تھے، اس لیے سلطان نے خاص عربوں کی تعلیم کے لیے ایک کالج اور اس کے ساتھ ایک وسیع بورڈنگ ہاؤس قائم کرنے کا حکم دیا اور حکام و عمال کے نام فرمان صادر کیے کہ حجاز، یمن، دیار بکر، بغداد، طرابلس الغرب، حلب، موصل اور شام سے معزز عرب قبائل کے لڑکے انتخاب کر کے بھیجے جائیں، ان کے تمام مصارف سلطان نے حکومت کی طرف سے دینے منظور کیے، ۱۲، ربیع الاول ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) کو اس کالج کی رسم افتتاح بڑی شان و شوکت کے ساتھ ادا کی گئی، کالج کا نام مکتب العشائر رکھا گیا۔

اسی طرح خاص یتیموں کے لیے بھی سلطان عبدالحمید خان نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا نام دارالشفقہ تھا، ۱۸۹۲ء میں جب مولانا شبلی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا، اس

---

(۱) سفرنامہ

مدرسہ میں ایک ہزار یتیم لڑکے تعلیم پاتے تھے اور سب کے سب بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے، ان کی خوراک، لباس اور تمام ضروری مصارف کا بار سررشتۂ تعلیم پر نہیں بلکہ خود سلطان کی جیب خاص پر تھا۔

تعلیم کی ترقی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں ہر قسم کے مدارس جو صرف قسطنطنیہ میں تھے ان کی مجموعی تعداد پانچ سو تھی، جن میں تیرہ بڑے بڑے کالج تھے(۱)، کالجوں اور اسکولوں میں مندرجہ ذیل زیادہ اہم تھے:

(۱) مکتب حربیہ شاہانہ، اس کو سلطان محمود ثانی نے فرانس کے فوجی کالج کے نمونہ پر ۱۸۳۰ء میں قائم کیا تھا، اس کے اساتذہ زیادہ تر فرانسیسی افسر تھے، تعلیم کی مدت پیدل فوج کے لیے چار سال اور سوار کے لیے پانچ سال تھی، لاویٹ کا بیان ہے کہ ۱۸۵۳ء میں اس کے طالب علموں کی تعداد (۱۲۰) تھی، مکتب حربیہ کے علاوہ جو ایک بہت بڑا کالج تھا قسطنطنیہ، مناستر، بروصہ، دمشق اور بغداد میں فوجی اسکول بھی قائم تھے، جہاں مکتب حربیہ کے لیے طالب علم تیار کیے جاتے تھے ۱۸۹۲ء تک جب مولانا شبلی نے جا کر اسے دیکھا یہ کالج بہت زیادہ ترقی کر گیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ اس میں حربی علوم کے علاوہ طبیعیات، کیمیا، ریاضی اور بالخصوص طب کی تمام شاخوں کی تعلیم اس حد تک ہوتی ہے کہ اسے اصطلاحی تعلیم کے دائرہ سے باہر نہیں کہا جا سکتا، ۱۸۹۲ء میں اس کالج کے ماتحت جس قدر حربی مدارس تھے ان کی تعداد (۴۷) تھی، جن میں (۱۸) اعدادیہ اور (۲۹) رشدیہ تھے، ان میں (۹۴۴۴) طالب علم تعلیم پاتے تھے (۲)، اس کالج کے تفصیلی حالات مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ میں لکھے ہیں۔

(۲) مکتب سلطانی، یہ کالج مکتب حربیہ کے سوا تمام کالجوں سے ممتاز تھا، یہ غلطہ سرائے میں واقع تھا، جہاں زیادہ تر یوروپین تاجر آباد تھے، اس وجہ سے دوسرے کالجوں کی نسبت اس میں عیسائی لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ طالب علموں

---

(۱) سفرنامہ (۲) ایضاً

کی مجموعی تعداد آٹھ سو تھی جن میں زیادہ تر بورڈر رہتے تھے، تمام بورڈروں کی خوراک، کپڑے، بچھونے، کتاب کاغذ وغیرہ کالج کی طرف سے مہیا کیے جاتے تھے، بورڈر سے چالیس پونڈ سالانہ (چھ سو روپیہ) فیس لی جاتی تھی، ایسے طالب علم بھی داخل ہو سکتے تھے جو دو ثلث یا ایک ثلث فیس ادا کر سکتے تھے یا بالکل نہیں ادا کر سکتے تھے، لیکن ان کی تعداد معین تھی، اس قسم کے طلبہ کی بقیہ فیس خود سلطان یا امرائے شہر ادا کرتے تھے، اس لیے خوراک اور لباس وغیرہ کے لحاظ سے ان میں اور ذی مقدور طالب علموں میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا، جو طلبہ بورڈر نہیں تھے، ان کی فیس دس پونڈ سالانہ تھی، تعلیمی حیثیت سے اس کالج کی خصوصیت یہ تھی کہ تمام علوم وفنون فرانسیسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے اور اس وجہ سے اکثر پروفیسر فرانسیسی یا جرمن تھے، ترکی زبان کی تعلیم بھی اعلیٰ درجہ کی دی جاتی تھی، عربی وفارسی کی تعلیم بھی لازمی تھی مگر معیار بلند نہ تھا، یونانی، ارمنی، انگریزی، جرمن، اطالوی اور لاطینی زبانوں کی تعلیم اختیاری تھی، اس کالج کے نصاب تعلیم کے متعلق مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> "ترکی وعربی وفارسی کے علاوہ علم ادب اور قرآن مجید کے جن مضامین کی تعلیم ہوتی ہے وہ یہ ہیں: عقائد، فقہ، اخلاق، تاریخ دولت عثمانیہ، قرأت، تجوید، حدیث وتفسیر لیکن قرأت وحدیث وتفسیر کی تعلیم چوتھے درجہ سے شروع ہوتی ہے اور ہفتہ میں صرف ایک بار ہوتی ہے، فرنچ زبان شروع ہی سے پڑھائی جاتی ہے اور اختتام تعلیم یعنی سات برس تک برابر جاری رہتی ہے۔ نحو، صرف، ادب کے ساتھ اصول انشا نگاری وفن بلاغت اعلیٰ درجہ تک پڑھایا جاتا ہے اور مضامین ذیل کی تعلیم بھی اسی زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ حساب، جبر ومقابلہ، جغرافیہ، ہندسہ، کیمسٹری، علم الحیوانات، طبیعیات، الکٹرسٹی، علم الاصوات، علم طبقات الارض، رسم ہندی، رسم تقلیدی۔

(۳) مکتب ملکیہ، یہ سول سروس کا کالج سلطان عبدالحمید خان ثانی کا قائم کردہ تھا، پہلے اس میں پانچ درجے تھے، تین ادنیٰ اور دو اعلیٰ اور مدت تعلیم کل پانچ سال تھی، لیکن بعد میں دو درجے اور بڑھا دیے گئے، جس سے مدت تعلیم میں بھی دو سال کا اضافہ ہو گیا، اس کالج میں فرانسیسی زبان کے ساتھ یونانی اور ارمنی زبان کی تعلیم بھی لازمی تھی، عربی و فارسی بھی نصاب میں داخل تھی، لیکن لازمی نہ تھی، تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، طبعیات، اقتصادیات، اصول قانون اور تمدن یورپ کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی تھی، اس کالج کے تعلیم یافتہ بڑے بڑے ملکی عہدوں پر مقرر کیے جاتے تھے، ۱۸۹۲ء میں اس کے طلبہ کی تعداد چھ سو سے زیادہ تھی۔

مکتب ملکیہ تو سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں قائم ہوا، لیکن سول سروس یعنی ملازمت دیوانی کی تعلیم کے لیے سلطان محمود ثانی نے بھی دو مدرسے مسجد احمد اور مسجد سلیمان سے متعلق قائم کیے تھے، لامرٹن کا بیان ہے کہ ۱۸۴۳ء میں ان کے طلبہ کی مجموعی تعداد (۳۷۰) تھی، جن میں سے (۲۵۰) پہلے مدرسہ میں تھے اور (۱۲۰) دوسرے میں، نصاب تعلیم یہ تھا: عربی و فارسی صرف و نحو، جغرافیہ، تاریخ، خوشنویسی، اسی قسم کا مدرسہ سلطان محمود کی والدہ نے ۱۸۳۰ء میں قائم کیا تھا، جس کے اخراجات وہ اپنی جیب خاص سے ادا کرتی تھیں، اس مدرسہ کا خاص مقصد حکومت کے لیے اہل کار تیار کرنا تھا، مدت تعلیم چار سال تھی، اس میں بلا امتیاز مذہب ہر فرقہ کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔

(۴) مکتب الحقوق (قانونی کالج) اس میں مضامین ذیل پڑھائے جاتے تھے: فقہ، اصول فقہ، رومن لا، قانون تجارت، اصول محاکمہ، تعزیرات، قانون بحری، سیاست مدن، قوانین سلطنتہائے یورپ، مختصر طور پر قوانین کی ایجاد کی تاریخ اور اس کی عہد بعہد کی ترقیاں، ۱۸۹۲ء میں طالب علموں کی مجموعی تعداد پانسو تھی جن میں چھ سو وُرذر تھے، یہاں کے تعلیم یافتہ منصف اور صدر الصدور وغیرہ کے عہدوں پر مقرر کیے جاتے تھے، مدت تعلیم چار برس تھی۔

(۵) مکتب الہندسہ، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ یہ رڑکی کالج کے مشابہ ہے، مدت تعلیم چھ برس کی تھی۔

(۶) مکتب اللسان، اس میں جرمن، فرانسیسی، یونانی، ارمنی، لاطینی، اطالوی اور روسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔

(۷) مکتب الصناعۃ یعنی ٹیکنیکل اسکول، اس میں حدادی، نجاری وغیرہ سکھائی جاتی تھی، ۱۸۹۲ء میں اس کے طالب العلموں کی تعداد (۲۴۰) تھی اور یہ کل یتیم لڑکے تھے، ان کے مصارف مدرسے کے فنڈ سے ادا ہوتے تھے۔

(۸) مکتب نواب، اس کالج میں وہ طلبہ تعلیم پاتے تھے جو قاضی اور مفتی کے عہدوں کے امیدوار ہوتے، پہلے ان عہدوں کے لیے کسی خاص قسم کی تعلیم میں امتحان دینا مشروط نہ تھا مگر سلطان عبدالحمید خان ثانی کے زمانہ میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ جو شخص اس کالج کا تعلیم یافتہ ہو وہ شرعی منصب پر مامور کیا جاتا تھا، اس کالج میں فقہ کی تعلیم نہایت اعلیٰ معیار پر ہوتی تھی، علوم جدیدہ کی بعض چیزیں بھی نصاب میں داخل کر لی گئی تھیں۔

(۹) مکتب بحریہ، اس میں جہاز رانی کی تعلیم ہوتی تھی۔

(۱۰) مکتب الزراعۃ، یہ ۱۸۵۱ء میں قسطنطنیہ سے قریب سان سٹیفانو کے مقام پر قائم کیا گیا تھا اور اس میں زراعت، نباتات اور جانوروں کے متعلق نظری اور عملی تعلیم دی جاتی تھی، ۱۸۵۳ء میں اس میں (۳۶) طالب علم تھے جن میں سے (۲۳) مسلمان تھے اور (۲۳) مختلف قوموں کے عیسائی۔

جانوروں کے متعلق ایک مخصوص مدرسہ بھی تھا جسے پرشا کے ایک ڈاکٹر نے ۱۸۴۴ء میں قائم کیا تھا۔

(۱۱) مکتب طبیہ، اسے سلطان محمود ثانی نے غلطہ سرائے میں قائم کیا تھا اور اس میں عیسائی اور مسلمان طلبہ دونوں داخل کیے جاتے تھے، تعلیم کچھ فرانسیسی زبان میں دی

جاتی تھی کچھ ترکی زبان میں، اس مدرسہ میں ایک مطبع بھی تھا جہاں سے ایک ماہوار طبی گزٹ فرانسیسی زبان میں نکلتا تھا، ایک ہسپتال اور حیوانات، نباتات اور طبعیات کا ایک ادارہ بھی اس سے متعلق تھا۔

(۱۲) فوجی انجینئروں کے لیے ایک کالج سلطان سلیم ثالث نے قائم کیا تھا، سلطان عبدالمجید خان کے عہد میں اسے از سرِ نو جدید طرز پر منظم کیا گیا اور فوجی انجینئروں کے علاوہ سول انجینئروں اور توپچیوں کو بھی اس میں تعلیم دی جانے لگی، ۱۸۵۲ء میں اس کے طلبہ کی تعداد (۹۰) تھی۔

(۱۳) ایک ٹریننگ کالج اساتذہ کی تعلیم کے لیے بھی تھا، ۱۸۵۳ء میں اس میں ساٹھ طلبہ تھے جن میں سے نصف کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔

چند خاص باتیں: نظامِ تعلیم کی نسبت چند باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

(۱) تقریباً تمام کالجوں اور اسکولوں میں فرانسیسی زبان کی تعلیم لازمی تھی جس کی وجہ سے تعلیم جدید کا ہر طالب علم اس زبان سے آشنا ہو جاتا تھا۔

(۲) تمام بڑے بڑے کالجوں میں طبعیات، کیمیا اور ارضیات وغیرہ کی تعلیم بھی لازمی تھی اور ان علوم کی عملی مشق کرائی جاتی تھی۔

(۳) بجز مکتب سلطانیہ کے جس میں عیسائی طالب علموں کی تعداد زیادہ تھی اور تمام مدارس میں ہر قسم کے علوم و فنون ملکی زبان یعنی ترکی میں پڑھائے جاتے تھے۔

(۴) تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس بھی تھے، جن میں کثرت سے طلبہ رہتے تھے، لیکن اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ وضع، لباس، خوراک، فرنیچر وغیرہ تمام چیزیں ایک سی ہوں تاکہ طالب علموں میں بظاہر فرق مراتب نہ پایا جائے، بورڈنگ ہاؤس کی فیس کے ساتھ کپڑوں کے دام بھی لیے جاتے تھے اور طالب علموں کے کپڑے خود کالج کے اہتمام سے تیار ہوتے تھے۔

(۵) ہر کالج میں غریب طالب علموں کی تعداد بھی معتدبہ ہوتی تھی، لیکن

دولتمند ترکوں کی طرف سے انھیں کافی مدد دی جاتی تھی، مولانا شبلی کے زمانۂ سفر (۱۸۹۲) میں کالجوں کی فیس پچاس پونڈ سالانہ سے کم نہ تھی، صرف مکتب سلطانیہ میں چالیس پونڈ سالانہ تھی، اس وقت اس کالج میں دو سو غریب طالب علم تھے، جن میں سے ڈیڑھ سو کی فیس امرا اور ارکانِ حکومت ادا کرتے تھے اور پچاس کی سلطان اپنی جیب خاص سے دیتے تھے، طلبہ کی ظاہری حالت سے کوئی شخص یہ تمیز نہیں کرسکتا تھا کہ ان میں سے کون غریب اور نادار ہے۔

بعض باتوں کی کمی: اس تعلیمی ترقی کے باوجود بعض چیزوں کی کمی بھی نمایاں تھی، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ کسی کالج بلکہ تمام شہر میں کوئی علمی انجمن ایسی نہ تھی جہاں طالب علموں کو تقریر کرنے کی مشق کرائی جاتی، دوسری کمی یہ تھی کہ کالج اور بڑے بڑے اسکول سب قسطنطنیہ تک محدود تھے، اگرچہ سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کثرت سے مدرسے قائم ہو گئے تھے تاہم وہ عموماً ابتدائیہ اور رشدیہ یعنی اوسط درجے کے مدارس تھے، مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت بیروت، دمشق، حلب اور بیت المقدس میں کوئی مدرسہ ایسا نہ تھا جسے کالج کہا جا سکے، ایک قابل لحاظ بات یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ کے تمام کالج حکومت کی طرف سے تھے، ایک بھی قومی کالج نہ تھا، یہ کمی قابل افسوس ضرور تھی مگر اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے تعلیم کا جو انتظام کیا تھا وہ اس قدر کافی تھا کہ قوم نے اس میں اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

نوجوان ترکوں کی تعلیمی اصلاحات: سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی کے بعد جب حکومت نوجوان ترکوں کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے منجملہ دیگر امور کے تعلیم میں بھی اہم اصلاحات کیں، ترکی میں تعلیم عامہ کا جو نظام آج موجود ہے وہ انہی کا قائم کیا ہوا ہے، دورِ تنظیمات میں تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا: قدیم اور جدید، قدیم یعنی مذہبی مدارس کا انتظام شیخ الاسلام کے ہاتھ میں تھا اور جدید مدارس کے لیے حکومت نے ایک نیا محکمہ معارف کے نام سے قائم کیا تھا، ان مدارس میں مغربی زبانوں اور جدید علوم وفنون

کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، نوجوان ترکوں کے زمانہ میں شیخ الاسلام خیری آفندی نے قدیم مکاتب میں بھی جو مسجدوں سے متعلق تھے جدید طرز تعلیم کو رواج دیا اور جدید طرز کا ایک کالج بھی قایم کیا، جس میں سائنس اور تاریخ کی تعلیم کے لیے بہت قابل اساتذہ مقرر کیے گئے، لیکن یہ کالج زیادہ دنوں قایم نہ رہ سکا اور شیخ الاسلام کے مستعفی ہو جانے کے بعد توڑ دیا گیا، البتہ خیری آفندی نے مکتبوں میں جو اصلاح شروع کی تھی اس کی تکمیل یوں ہوئی کہ حکومت نے ان تمام مکتبوں کو محکمۂ تعلیمات کے سپرد کر دیا اور مذہبی تعلیم کا انتظام بھی حکومت کے ہاتھ میں آ گیا، نوجوان ترکوں نے دس سال کی قلیل مدت میں تعلیم کو جو ترقی دی، اس کا اندازہ خالدہ ادیب خانم کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے:

> "۱۹۰۸ء میں جب حکومت نوجوان ترکوں کے ہاتھ میں آئی تو دو کروڑ تین لاکھ آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ایک فی صدی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں جب وہ حکومت سے علاحدہ ہوئے تو ایک کروڑ چالیس لاکھ کی آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بیس فی صدی تک پہنچ گئی تھی۔"(۱)

اعلیٰ تعلیم کے متعلق خالدہ خانم لکھتی ہیں:

> "قسطنطنیہ کی یونی ورسٹی عہد تنظیمات کے نوجوان ترکوں نے قایم کی مگر عبدالعزیز نے اسے بند کرا دیا، اس کی حکومت کے آخر زمانہ میں دینیات اور سائنس کے شعبے کھول دیے گئے مگر حقیقی معنوں میں یونی ورسٹی اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں نے قایم کی۔ جرمنی سے (۱۹) پروفیسر بلائے گئے جن میں سے بعض علمی دنیا میں شہرت رکھتے تھے، ان کے اسسٹنٹ ترک تھے جنھوں نے جرمن یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی، نوجوان ترکوں کی دس سال کی حکومت میں

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۹۴

> یونیورسٹی کہیں سے کہیں پہنچ گئی، اس کا سب سے زیادہ قابل قدر کام یہ تھا کہ اس نے بہت سی کتابیں شائع کیں جن میں سے اکثر سائنس، تاریخ اور ادب کی کتابوں کے ترجمے تھے، تالیف اور ترجمہ کے لیے ایک باقاعدہ انجمن قائم تھی، جس نے بڑی مفید خدمت انجام دی، تاریخ اکاڈیمی نے عثمانی تاریخ کے متعلق بہت قابل قدر تحقیقات کی۔"

جامعۂ استنبول کی ترقی کا اندازہ اس کے مختلف شعبوں اور ان کے طلبہ کی تعداد سے کیا جاسکتا ہے، جو ۱۹۱۰ء سے متعلق میرز (E.G. Mears) نے اپنی کتاب ماڈرن ٹرکی میں درج کی ہے۔

شعبۂ قانون	(۲۵۰۰)	شعبۂ سیاسیات	(۳۰۰)
شعبۂ دینیات	(۱۲۰)	شعبۂ ادب	(۱۰۰)
شعبۂ نیچرل سائنس	(۹۰)	شعبۂ ریاضیات عالیہ	(۸۰)
شعبۂ انجینئرنگ	(۵۰۰)	شعبۂ طب	(۸۵۰)(۱)

جنگ عظیم کے زمانہ میں بھی نوجوان ترکوں نے تعلیمی ترقی کی کوشش جاری رکھی، چنانچہ ۱۹۱۸ء میں جامعۂ استنبول کی از سر نو تنظیم کی گئی اور طلبہ کے قیام وغیرہ کے متعلق مزید سہولتیں بہم پہنچائی گئیں، اسی زمانہ میں ایک نمایاں ترقی یہ ہوئی کہ لڑکیوں کے لیے بھی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام بڑے پیمانہ پر کیا گیا اور قسطنطنیہ میں پانچ ہائی اسکول لڑکیوں کی تعلیم کے لیے قائم کیے گئے، یہ اسکول جرمن اساتذہ کی نگرانی میں تھے اور ان میں دو ہزار سے زیادہ لڑکیاں پڑھتی تھیں (۲)، اب تک لڑکیوں کے لیے صرف ابتدائی مدارس تھے جن میں دس سال کی عمر تک وہ لڑکوں کے ساتھ تعلیم پاتی تھیں، ان کی ثانوی تعلیم کے لیے صرف چند ہائی اسکول تھے جن میں سے ایک قسطنطنیہ میں تھا اور ایک بیروت میں۔

---

(۱) ماڈرن ٹرکی از میرز ص ۱۲۵ مطبوعہ نیویارک ۱۹۲۴ء (۲) ایضاً ص ۱۲۶

نوجوان ترکوں نے جب سے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی، چند روز بھی امن واطمینان کے میسر نہ آئے کہ پیش نظر اصلاحات کی تکمیل کر سکتے، بیرونی جنگوں کے علاوہ خود ملک کی اندرونی شورشیں اور مخالفتیں قدم بقدم پر حائل ہوتی رہیں، تاہم اپنے مختصر دور حکومت میں انھوں نے تعلیم کو جس قدر ترقی دی وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ تمام ملک میں مغربی نظام تعلیم کو رائج کر دیا، اس وقت تک امریکن کالجوں سے جو ترکی میں تقریباً نصف صدی سے قائم تھے ہزاروں طالب فارغ ہو کر نکل چکے تھے، لیکن ان میں ترکوں کی تعداد تھوڑی تھی، یورپین نظام تعلیم کو اختیار کرنے کا پہلا اہم قدم اس وقت اٹھایا گیا جب ترکی جرمنی کے ساتھ جنگ عظیم میں شریک ہوا، دو ہزار سے زیادہ ترک لڑکے ہائی اسکول اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے جرمن بھیجے گئے جو آج جدید ترکی کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک ممتاز جزو ہیں۔ (۱)

---

(۱) کمالی ترکی اور مشرق وسطی از ڈاکٹر کروگر ص ۸۱ (Kemalist Turkey and the middle east by Dr. Kruger)

عثمانی ترک

(۱)

ادبی، تمدنی اور سیاسی تحریکیں

انیسویں صدی تک دولت عثمانیہ کی تاریخ حقیقتاً اس کے بادشاہوں کی تاریخ تھی، سلطان کی حیثیت ایک راعی کی تھی جس کا فرض رعایا کی نگہداشت اور فلاح و بہبود تھا، قوم کو امورِ مملکت میں کوئی دخل نہ تھا، لیکن جب سلاطین کی کمزوری اور غفلت سے حکومت کے تمام شعبوں میں ابتری پھیلنے لگی اور سلطنت کے باشندے ان حالات سے تنگ آگئے تو ان کے اندر اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا، جس نے رفتہ رفتہ مطالبات کی شکل اختیار کرلی، قدیم نظامِ حکومت فرسودہ ہوچکا تھا اور اس میں قومی بیداری کی اس بڑھتی ہوئی رو کو روکنے کی طاقت نہ تھی، دوسری طرف فرانس میں انقلابی تحریک نے نہ صرف غیر مسلم رعایا بلکہ ترکوں میں بھی حریت کے خیالات پھیلا دیئے تھے۔

عثمانی ترکوں میں مغربی تحریک اول اول فوجی اصلاحات سے شروع ہوئی، یہ تحریک یورپ سے تمدنی تعلقات کی بنا پر نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس کا سبب وہ احساسِ کمتری تھا جو ”صلح نامہ کوچک کینارجی“ (۱۷۷۴ء) کے صدمہ سے عثمانی مدبروں میں پیدا ہوگیا تھا، انھوں نے دیکھا کہ روس نے جسے وہ اب تک ایک حقیر دشمن خیال کرتے تھے، محض مغربی طرز کے اصلاحات جاری کرنے سے میدانِ جنگ میں انھیں شکست دے دی اور انھوں نے اس شکست سے یہ نتیجہ نکالا کہ مغرب کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ خود اسی کے

ہتھیاروں سے کیا جا سکتا ہے، لیکن یورپ کی فوجی طاقت اس کی مضبوط انتظامی، اقتصادی اور مالیاتی بنیادوں پر قائم تھی اور سلطنت عثمانیہ میں یہ بنیادیں روز بروز زیادہ کمزور ہوتی جارہی تھیں، پھر بھی انیسویں صدی کے نصف اول میں سلطان سلیم ثالث اور محمود ثانی نے سب سے زیادہ توجہ عثمانی فوج کو مغربی طرز پر مرتب کرنے میں صرف کی اور اس میں شبہ نہیں کہ جو توقعات اس فوج سے قائم کی گئی تھیں وہ بہت کچھ پوری ہوئیں، ان فوجی اصلاحات کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی افسروں نے ترقی و اصلاحات کی ہر جدید کوشش میں حصہ لینا شروع کیا، اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ فوجی افسر دوسری جماعتوں کی بہ نسبت زیادہ روشن خیال تھے بلکہ وجہ یہ تھی کہ سلطنت عثمانیہ میں ایک صدی تک یہی ایک جماعت ایسی تھی جسے باقاعدہ مغربی تربیت دی گئی تھی اور اس لیے مغربی کلچر (تہذیب و تمدن) کا اثر اسی جماعت پر زیادہ پڑا تھا، سلطان عبدالحمید خان ثانی کے دور استبداد میں بھی فوجی افسروں کی مغربی تعلیم بند نہیں کی گئی، لیکن یہ نوجوان افسر فن حرب کے اصول مغربی زبانوں کے سیکھے بغیر حاصل نہیں کر سکتے تھے اور ان زبانوں کے ذریعہ سے وہ مغربی خیالات سے بھی واقف ہو گئے۔

مغربی خیالات کی اشاعت بالواسطہ جدید نظام تعلیم سے بھی ہوئی، جو تنظیمات کے عہد میں قائم کیا گیا تھا، تنظیمات محض انتظامی، عدالتی اور مالیاتی اصلاحات تک محدود نہ تھیں بلکہ اس سلسلہ میں تعلیم کو ترقی دینے کے لیے جدید طرز کے ابتدائی اور ثانوی مدارس کھولے گئے اور ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی گئی، تعلیمی اصلاحات کا ذکر مفصل طور پر گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے، رفتہ رفتہ قدیم مدرسوں کے حلقہ کے باہر ایک جدید تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو گیا، یوروپین زبانوں خصوصاً فرانسیسی زبان سے بہت سی علمی اور ادبی کتابوں کا ترجمہ ترکی میں کیا گیا اور ترکی ادبی زبان جو مغلق الفاظ، مقفی اور مسجع عبارت اور تشبیہات و استعارات سے گرانبار تھی آسان بنائی جانے لگی، یورپ میں وطنیت اور قومیت کی جو تحریک انیسویں صدی میں پیدا ہو گئی تھی اس نے اب سلطنت عثمانیہ کی طرف

بھی رخ کیا اور ادب و صحافت کے ذریعہ پوری قوم میں پھیل گئی۔

قدیم ادب: قدیم عثمانی ادب زبان و خیالات دونوں لحاظ سے جمہور سے الگ تھا، اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت تھی اور عبارت آرائی اس کی زینت سمجھی جاتی تھی، یہ زیادہ تر ایرانی ادب کے زیر اثر تھا، حسن و عشق کی داستان، گل و بلبل کے افسانے، موسم بہار کی دل کشی اور ان سب کی تہ میں تصوف کی چاشنی، فارسی شاعری کی طرح قدیم عثمانی شاعری کی بھی تقریباً کل کائنات یہی تھی۔ بلند پایہ نثر میں پر تکلف عبارت آرائی اور پیچیدگی پائی جاتی تھی، البتہ واقعہ نگاری میں عثمانیوں کو خاص امتیاز حاصل تھا، خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں:

> "میرے خیال میں عثمانی ترکوں کے ادب کی بہترین صنف سوانح نگاری ہے، پندرھویں صدی سے درباری مورخ برابر ترکی تاریخ قلم بند کرتے رہے، گو ان کی زبان خصوصاً سولھویں صدی کے بعد سے ثقیل ہے مگر ان میں حقیقت پسندی اور واقعہ نگاری کا وصف ایسا ہے کہ ان کی تصنیفات تاریخ کے طالب علم اور آرٹ کے قدر دان دونوں کے لیے بہت بڑی قیمت رکھتی ہیں، وہ اس زمانہ کی زندگی کا ہو بہو مرقع دکھاتے ہیں، جس میں سلاطین، وزراء، امراء اور عوام سب کی تصویریں موجود ہیں، زمانہ انقلاب میں عوام کی جدوجہد کا جیسا مفصل اور مکمل بیان ان سوانح میں ہے میں نے آج تک کسی کتاب میں نہیں دیکھا، تقلید کا ان کے یہاں نام بھی نہیں ہے، خوش قسمتی سے یہ مورخ اور اس زمانہ کے عثمانی اس احساس کمتری سے پاک تھے، جس نے ہمارے ادب اور خیالات پر جھوٹ کا رنگ چڑھا دیا ہے، وہ جو کچھ دیکھتے تھے وہی لکھ دیتے تھے، انھیں اس کی فکر نہیں تھی کہ دوسرے ملکوں کے لوگ کیا کہیں گے۔"(۱)

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۱۶۳

عثمانی ادب کے ذکر میں اڈریٹ لکھتا ہے کہ شاعری کی طرح ابتدائی وقائع نگاری بھی فارسی میں کی جاتی تھی، لیکن بعد میں سلطنت کے حالات ترکی زبان میں لکھے جانے لگے اور درباری مورخوں نے سن وار ترتیب کے ساتھ تمام واقعات آغاز سلطنت سے لے کر اپنے زمانہ تک تفصیل کے ساتھ قلم بند کیے، رنگین اور پر تکلف عبارت کے علاوہ وقائع نگاروں کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں تاریخی تنقید بالکل نہیں ہوتی، واقعات یکے بعد دیگرے تاریخ وار بیان کیے جاتے ہیں اور بظاہر ان میں کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ چھوٹے سے چھوٹے واقعات سے لے کر بڑے سے بڑے واقعات تک سب انتہائی احتیاط اور تاریخی ترتیب کے ساتھ درج کیے گئے ہیں اور مورخ کے لیے ترکی ادب کا یہ حصہ نہایت قیمتی ہے (۱) مورخوں کی دو قسمیں ہیں: وقائع نگار اور سوانح نگار، سوانح نگاروں نے مشرق کے تمام مشاہیر رجال مثلاً بادشاہوں، وزیروں، مفتیوں، عالموں، شاعروں، مغنیوں، مصوروں، طبیبوں وغیرہ کے حالات لکھے ہیں۔ (۲)

قدیم ادب سے متعلق پروفیسر جونیس جرمانس کا بیان ہے:

> ”یہ ادبیات ایک مصنوعی اور خود ساختہ طبقہ کے مذاق کی آئینہ دار تھی اور اس لیے خود بھی مصنوعی تھی۔ شعرا جمہور کے درمیان رہتے سہتے تھے، لیکن جمہور کو شعرا کے دیوانوں میں کوئی جگہ نہ ملتی تھی، ان کے پرشکوہ قصیدوں اور عاشقانہ غزلوں میں تمہیں عام انسانوں، کھیتوں میں کام کرنے والوں، کسی دور دراز میدان جنگ میں خون میں نہا کر مرنے والوں کے جذبات، ان کی امنگیں، ان کے صدمات، ان کی خوشیاں، ان کے غم و الم، ان کے حوصلے، ان میں سے کسی ایک کی بھی صدائے بازگشت نہ سنائی دے گی، اس ادبیات میں کسی قسم کی انفرادیت یا شخصیت تمہیں نظر نہ آئے گی، اس لیے کہ اس نے اپنے

---

(۱) ترکی از اڈریٹ ج ۲ ص ۱۸۸ (۲) ایضاً ص ۱۸۹

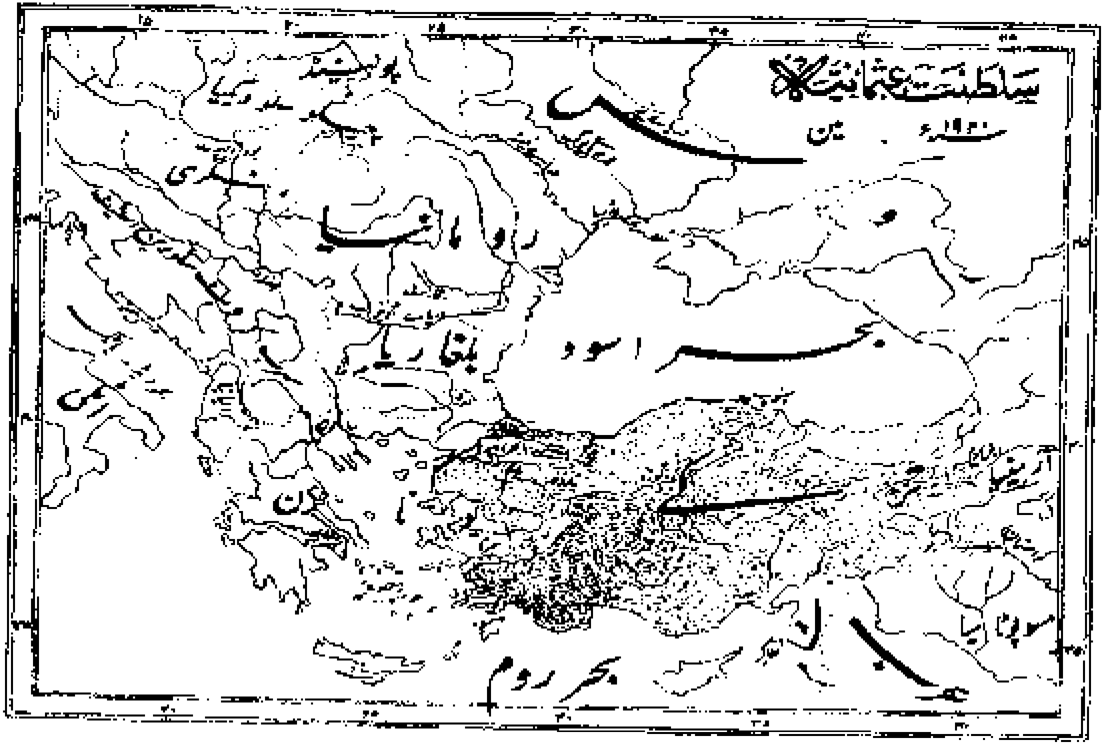
سلطنت عثمانیہ
سنہ ۱۹۲۰ء میں
روس
رومانیا
بلغاریا
بحر اسود
یونان
آرمینیا
سوریا
بحر روم

> سانچے روزمرہ کی معمولی زندگی سے نہیں لیے تھے بلکہ ایک سانچہ پسند کرلیا تھا اور اسی کو ہر موقع پر استعمال کیا جاتا تھا، تمام قدیم ترکی شاعروں کے معشوق ہوبہو ایک سے ہیں اور تمام شعرا کی مثنویوں میں جو جذبات رنج والم بیان کیے گئے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی ذہنی اور خیالی شکستہ دل سے نکلے ہیں۔"(۱)

فطرت پسندانہ شاعری: لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر میں ایسی شاعری سے لوگوں کی طبیعت سیر ہوگئی اور زندگی کی واقعی اور اصلی تصویر کھینچنے کا شوق پیدا ہوا، اس شوق نے انیسویں صدی کی ابتدا میں فطرت پسندانہ شاعری کی بنیاد رکھی اور اس حلقہ کے شاعروں نے اپنے کلام میں ترکی معاشرت کا صحیح نقشہ پیش کیا، بقول خالدہ خانم "انھوں نے ادب کو زندگی کا آئینہ بنادیا اور انسانی فطرت کی مصوری کا حق ادا کردیا۔"

عہد تنظیمات: فطرت پسندانہ شاعری کا دور بہت جلد ختم ہوگیا، انیسویں صدی میں ترکوں میں ایک ذہنی انقلاب رونما ہوا، جو نتیجہ تھا فرانسیسی افکار اور فرانسیسی مذاق شاعری کا چنانچہ ترکی ادب خصوصاً شاعری اپنے خیالات اور طرز ادا کے لحاظ سے فرانسیسی رنگ میں ڈوب گئی، ادب کے ذریعہ فرانس کے سیاسی خیالات بھی پھیلائے جانے لگے، اس عہد کے اہل قلم نے سب سے پہلے "وطن"، "حریت" اور "مشروطیت" (دستوری حکومت) کا اعلان کیا اور اپنی سیاسی اور ادبی تنقیدوں، ناولوں، فلسفیانہ اور عمرانی مقالوں اور مغرب کی ادبی کتابوں کے ترجموں سے ان خیالات کی اشاعت کی، "عہد تنظیمات" کی ممتاز شخصیتیں شناسی، نامق کمال، عبدالحق حامد اور ضیا پاشا ہیں۔

شناسی: شناسی (۱۸۲۶ء تا ۱۸۷۱ء) تنظیمات کے ادب کا بانی اور نوجوان ترکوں کا سیاسی لیڈر تھا، یہ حیرت انگیز قابلیت کا آدمی تھا، سولہ برس کی عمر میں اس نے عربی اور فارسی ادب پر عبور حاصل کرلیا تھا اور "اسے اس عمر میں پوری ترکی لغت زبانی یاد تھی"(۲)

---

(۱) ترکوں کی اسلامی خدمات مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۵۷ (۲) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۱۱۷

اس نے فرانسیسی زبان سیکھنے کے بعد فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس کی استعداد دیکھ کر سلطان عبدالمجید خاں نے اسے مالیات میں مہارت حاصل کرنے کے لیے پیرس بھیج دیا، مگر وہاں بھی وہ اپنی فرصت کے اوقات فلسفہ، سائنس اور ادب کے مطالعہ میں صرف کرتا رہا، اپنے ذوق ادب اور سیرت کی پاکیزگی کی بنا پر وہ تھوڑے ہی دنوں میں پیرس کے علمی حلقہ میں داخل ہو گیا، اور ارنسٹ ریناں (Ernest Renon) لامارتی نے (Lamartine) اور ساسی (Sacy) سے اس کی دوستی ہو گئی، چند سال کے بعد جب وہ ترکی واپس آیا تو صدر اعظم رشید پاشا نے اسے انجمن دانش کا رکن بنا دیا جو ۱۸۵۳ء میں جدید اسکولوں کے لیے نصاب کی کتابیں تیار کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی، اس کے علاوہ وہ مجلس مالیات کا رکن بھی مقرر کیا گیا اور فوج کی مالیات کی نگرانی اس کے سپرد ہوئی، لیکن یہ عہدے اس کے سیاسی خیالات کو بدل نہ سکے، وہ استبداد کا شدید مخالف تھا اور ترکی میں دستوری حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ سلطان عبدالمجید خاں کے خلاف ایک سازش میں بھی شریک تھا مگر سلطان نے اسے معاف کر دیا عبدالمجید خاں کے انتقال کے بعد نئے صدر اعظم عالی پاشا نے جو نوجوان ترکوں کی آئینی تحریک کا مخالف تھا، شناسی کو تمام عہدوں سے برطرف کر دیا۔

شناسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ترکی میں جدید طرز کے اخبار کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۶۰ء میں ”ترجمان احوال“ جاری کیا، اب تک جو چند اخبارات ترکی میں نکلتے تھے وہ سرکاری تھے، ترجمان احوال پہلا غیر سرکاری اخبار تھا، یہ نہ صرف پہلا غیر سرکاری اخبار تھا بلکہ ادب کے جدید اسکول کی پہلی آواز بھی تھا، اس کی اشاعت سے عثمانی ادب اور عثمانی زبان کا ایک نیا دور شروع ہوا، شناسی کا تعلق ترجمان احوال سے صرف چھ مہینے رہا، اس کے بعد وہ اپنے رفیق کار آغا آفندی سے علاحدہ ہو گیا اور اپنا ایک ذاتی اخبار تصویر افکار نکالا، ترجمان احوال کی طرح اس اخبار میں بھی اس کا مقصد یہ تھا کہ ترکوں کی ذہنی زندگی کو جس قدر زیادہ ممکن ہو اہل یورپ کی ذہنی زندگی سے ہم آہنگ

گردے۔ اس نے سیاسی جھگڑوں سے الگ رہنے کی کوشش کی اور اپنی توجہ زیادہ تر سائنٹفک مسائل اور سوشل معاملات پر رکھی اور خاص طور پر زبان کی اصلاح و ترقی اور اسے آسان بنانے کی سعی کرتا رہا(۱)۔ جدید ترکی کے خیالات کی تشکیل اور رائے عامہ کی تربیت میں تصویر افکار کا بڑا حصہ ہے۔ یہ اخبار سوائے عبدالحمید خاں ثانی کے عہد حکومت کے ۱۹۲۵ء تک برابر جاری رہا۔ تصویر افکار میں مشہور فرانسیسی مصنفین کی کتابوں کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے۔ شناسی نے ترکی صرف و نحو پر بھی ایک کتاب لکھی اور ایک ڈراما ''شاعر کی شادی'' کے عنوان سے تصنیف کیا جس میں شاعروں کا خاکہ اڑایا ہے مگر اس کی سب سے عظیم الشان تصنیف ترکی لغت ہے۔ جس میں اس نے ہر لفظ کا ماخذ اور ترکی ادب میں اس کا استعمال دکھایا ہے۔ وہ اس لغت کو ہزار ہزار صفحوں کی چودہ جلدوں میں لکھنا چاہتا تھا مگر عمر نے وفا نہ کی اور صرف تین حرفوں تک لکھ سکا۔

ادب اور زبان کی اصلاح میں شناسی کی سرگرمیوں نے قدامت پرستوں کو اس کا مخالف بنا دیا مگر وہ خلوص اور صداقت کے ساتھ آخر دم تک اپنے کام میں لگا رہا۔ چنانچہ یہ تحریک باوجود مخالفت کے روز بروز بڑھتی گئی اور ادب جدید کی بنیادیں مستحکم ہوتی گئیں۔

نامق کمال: شناسی کے بعد نئے ادب کی رہنمائی نامق کمال (۱۸۴۷ء تا ۱۸۸۸ء) کے ہاتھ میں آئی، وہ ایک زبردست آرٹسٹ، ایک سرگرم مجاہد، ایک کثیر التصانیف اہل قلم اور ایک پرجوش محب وطن تھا۔ اس کے نزدیک آرٹ ملک میں نئے جذبے پیدا کرنے کا ایک ذریعہ تھا اور اس نے یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے اپنے ڈراموں اور ناولوں، اپنی شاعری، اپنی تاریخی تصنیفوں اور تنقیدی مقدموں یہاں تک کہ اپنے خانگی خطوں سے بھی کام لیا(۲)۔ وہ ایک معزز خاندان میں پیدا ہوا تھا اور اوائل عمر میں اس نے سلطنت عثمانیہ

---

(۱) جدید ترکی کی ترقی اس کے پریس کے پیمانے سے، از احمد امین پی ایچ ڈی، مطبوعہ نیویارک ۱۹۱۴ء،
The Development of modern Turkey as measured by its press ص ۳۳-۳۵)
(۲) مقالہ گب پراؤز اور محمد فواد، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۳ ص ۹۵۲ (by ahmad amin Ph.D.)

کے تمام ممالک کی سیاحت کی تھی، رعایا کی غربت وفلاکت اور حکام کی ناانصافیوں اور بے عنوانیوں کے جو مناظر اس نے دیکھے ان کا اثر اس کے دل پر بہت گہرا پڑا اور اس نے اہل وطن کی خدمت اور ان کو موجودہ مصائب سے نجات دلانے کا عزم راسخ کر لیا، اس کی تمام سرگرمیوں کا مرکز وطن ہے، جیسا کہ ڈاکٹر احمد محی الدین نے لکھا ہے: ''عثمانی وطن کا تصور اسی سب سے بڑے ترک محب وطن کی تخلیق ہے۔'' اسی کی خدمت کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، اس کا اعتقاد تھا کہ ''یہی حکومت قوم کی خدمت کا نام ہے۔'' فنون لطیفہ، زبان وادب، سب اسی ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، وہ لکھتا ہے: ''اگر میں اپنی قوم کی اس بہار کو دیکھے بغیر مر جاؤں جس کی امید میں جیتا ہوں تو میرے لوح مزار پر یہ لکھ دینا:

''وطن سوگ میں ہے اور میں بھی سوگ میں ہوں۔''(۱)

وہ نوجوان ترکوں کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا اور دستوری حکومت کا حامی تھا، جب حکومت کی طرف سے سختی شروع ہوئی تو اسے بھی دوسرے مشہور وطن پرستوں کی طرح بھاگنا پڑا، چنانچہ وہ لندن پہنچا اور وہاں ضیا پاشا کی شرکت میں اخبار ''حریت'' نکالتا رہا، چار سال کے بعد جب عام معافی کا اعلان ہوا تو وہ ترکی واپس آ گیا اور بدستور سابق وطن کی خدمت میں مشغول ہو گیا، لندن سے واپسی کے بعد اس نے اپنا ایک ذاتی اخبار ''عبرت'' نکالنا شروع کیا، جس کا اثر قومی تحریک کے پھیلانے میں خاص طور پر پڑا۔

''عبرت'' کی تقلید میں چند اخبارات اور بھی جاری ہوئے مگر ان میں سے بہت کم زیادہ دنوں تک چل سکے، پھر بھی حوصلہ مند نوجوان اخبار نکالنے سے باز نہ آئے، اخبارات کا معیار بلند تھا کیونکہ تعلیم یافتہ طبقے کے بہترین افراد صحافت کا کام کرتے تھے اور یہ پیشہ حب الوطنی میں داخل تھا، لیکن حکومت کی طرف سے پریس پر پابندیاں بھی بڑھتی جاتی تھیں، اخبارات کا معطل کیا جانا روز کی بات ہو گئی تھی، چنانچہ ''عبرت'' بھی کئی

---

(۱) ترکی میں جدید تمدنی تحریک از ڈاکٹر احمد محی الدین پروفیسر زبان ترکی لاہور یونیورسٹی بحوالہ رسالہ جامعہ بابت ماہ جولائی ۱۹۶۷ء

بار بند کر دیا گیا تھا، اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ اخبار نویس بغیر اس کے کہ ان پر باقاعدہ مقدمہ قائم کیا جائے یا انھیں جواب دہی کا موقع دیا جائے، جلا وطن کر دیے جاتے تھے، کبھی انعام و اکرام اور عہدوں کے ذریعے سے انھیں قابو میں لانے کی کوشش کی جاتی تھی مثلاً نامق کمال کو گیلی پولی کا گورنر مقرر کر کے بھیج دیا گیا تھا مگر چند ہی مہینوں کے بعد وہ استعفاد ے کر قسطنطنیہ واپس آ گیا اور پھر اپنا اخبار جاری کیا لیکن ۱۸۷۵ء میں جب اس کا ڈرامہ ”وطن“ اسٹیج پر لایا گیا اور اس سے عوام میں بے حد جوش پیدا ہوا تو نامق کمال کو قبرص (سائپرس) لے جا کر قید کر دیا گیا، کمال کے علاوہ اور تمام مشہور اہل قلم بھی جو عوام میں مقبول تھے قبرص بھیج دیے گئے، سلطان عبدالعزیز خاں کے معزول ہونے پر جب سلطان مراد کے مختصر عہد حکومت میں نوجوان ترکوں کو اقتدار حاصل ہوا تو جلا وطن اخبار نویس سب واپس بلا لیے گئے اور ترکی پریس میں ایک نئی سرگرمی شروع ہوئی۔

وطن کی طرح نامق کمال کو اپنے مذہب اور تمدن سے بھی بے حد محبت تھی، وہ سلطنت عثمانیہ کو پھر ایک عظیم الشان اسلامی طاقت دیکھنا چاہتا تھا، اسلام ہی کا نام لے کر وہ اس ذہنیت کے خلاف جہاد کرتا تھا، جس نے ترکی قوم میں دنیا سے بیزاری اور دنیا سے نفرت کا زہر پھیلا کر اس کے قوائے عمل کو مفلوج کر دیا تھا، اس نے اپنی قوم کو کارزار حیات میں عمل اور جدوجہد کی دعوت دی اور اپنے زور قلم اور جوش کلام سے اس میں ایک نئی روح پھونک دی، وہ مغرب کے علوم و فنون سے بیگانہ نہ تھا، لیکن خود اس کی قوم نے علم و حکمت کے جو خزانے صدیوں میں جمع کیے تھے ان کی قدر و قیمت کو خوب سمجھتا تھا اور ان پر فخر کرتا تھا، اس کے تمام خیالات اسلامی اصولوں اور عثمانی روایتوں سے ماخوذ ہیں، نامق کمال کی تصنیفوں کے دو بنیادی اصول ”حب وطن“ اور ”حقوق انسانی“ کے نظریے ہیں، خالدہ خانم اپنے خطبات میں لکھتی ہیں:

> ”حب وطن اس معنی میں جو آج کل سمجھے جاتے ہیں، اس کا
> خاص موضوع ہے، اس نے جا بجا اپنے ملک کے حال زار کا دلدوز مرقع

> دکھایا ہے، خصوصاً ایک نثر کی کتاب میں جس کا نام "خواب" ہے اور ایک نظم میں جس کا عنوان "واویلا" ہے، اس نے ان خیالات کے اظہار میں انتہائی جوش و خروش سے کام لیا ہے، خواب میں اسے مادر وطن کی تصویر یہ نظر آئی کہ ایک عظیم الشان ہستی زخموں سے چور کفن میں لپٹی ہوئی چلی جا رہی ہے، وہ درد سے بیتاب ہے مگر اپنے بچوں کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہے، "واویلا" میں وہ اپنے مادر وطن سے التجا کرتا ہے کہ اپنے سفید کفن پر سیاہ چادر ڈال لے، ایک ہاتھ کربلا کی طرف اور دوسرا روضۂ رسول ﷺ کی طرف پھیلا کر کھڑی ہو جائے اور بارگاہِ الٰہی میں ان لڑائیوں کی فریاد کرے جو ترکی زمین پر لڑی گئیں اور جن میں سے ایک ایک لڑائی بدر و حنین کے معرکے سے کم نہ تھی، اس نے دکھایا ہے کہ سلطنت کی تاریخ میں ترکوں کا خون کس کس طرح بہایا گیا اور کن کن شہیدوں نے اپنے وطن کی زمین کو اپنے خون سے سینچا۔"(۱)

حقوقِ انسانی کے نظریہ کی حمایت بھی نامق کمال اسی جوش سے کرتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ جو حکومت محکوموں کی رضامندی پر قایم نہ ہو استبدادی حکومت ہے، جس کے خلاف جدوجہد کرنا ہر شخص کا فرض ہے، حقوقِ انسانی کی حفاظت کے لیے وہ جنگ اور ہر قسم کی قربانی کرنے کی تبلیغ کرتا ہے، اس نے اپنے عمل سے اپنے عقیدہ کی سچائی کا ثبوت دیا، اس کی ساری زندگی وطن اور حقوقِ انسانی کے تحفظ کی سعی میں گذری اور اس راہ میں اس نے بارہا جلاوطنی اور قید کی صعوبتیں اٹھائیں، چنانچہ اس کا انتقال بھی جلاوطنی کی حالت میں ایک جزیرے میں ہوا، اگر وہ چاہتا تو آسانی سے وزیر اعظم ہو سکتا تھا مگر وہ آخر دم تک اپنے عقیدہ پر قایم رہا اور سلطنت کے بڑے سے بڑے عہدہ کی ترغیب بھی اسے اپنے اصول سے منحرف نہ کر سکی، حقوقِ انسانی کے خیال کو اس نے ایک نظم میں

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۱۷۷۔

جو "قصیدۂ حریت" کے نام سے مشہور ہے پیش کیا ہے، اس کا خلاصہ خالدہ خانم کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

> "یہ دیکھ کر کہ زمانہ کی روش حق اور ایمان سے منحرف ہو گئی ہے ہم نے عزت اور عظمت کے ساتھ منصب حکومت سے ہاتھ اٹھا لیا، وہ انسان جو انسانیت کے لقب کا مستحق ہے کبھی خلق خدا کی خدمت سے نہیں تھکتا، وہ ہمیشہ ستم کشوں اور مظلوموں کی دستگیری کرتا ہے، ظالموں کا حامی وہی ہوتا ہے، جس کا دل و دماغ شقاوت سے معمور ہو، کتوں کو اسی میں مزہ آتا ہے کہ خونخوار شکاری کے آگے آگے دوڑیں، میرے لیے یہی کافی ہے کہ لوگ کہیں کہ یہ وہ شخص ہے جو اپنے مقصد کی خاطر تکلیف اٹھانے کو وزیر کے منصب بلکہ وزیر اعظم کے مرتبہ سے زیادہ عزت اور مسرت کا باعث سمجھتا ہے۔
>
> پھانسی کی رسی جو موت کا اژدہا ہے، اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے جس میں انسان کو غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا پڑے، خواہ آزادی کا میدان جہنم کا طبقہ ہو، انسان اسے چھوڑنا گوارا نہ کرے گا، تقدیر کے پاس ظلم و جور کے جتنے ہتھیار ہیں وہ لے کر آ جائے اور مجھ پر حملہ کرے، اگر میں خدمت کی راہ اور جنگ کے میدان سے ہٹ جاؤں تو مجھ سے بڑھ کر بزدل دنیا میں کوئی نہ ہوگا، آہ اے آزادی تجھ میں کیا جادو ہے کہ ہم نے سب زنجیروں کو توڑ پھینکا مگر تیری غلامی کا طوق خوشی سے گلے میں ڈال لیا۔" (۱)

عبدالحق حامد: وطن پرستی کے جذبہ کی ترجمانی نامق کمال کے بعد اس کے دوست اور شاگرد عبدالحق حامد نے کی، وہ ایک ممتاز شاعر اور ڈراما نویس تھا، خالدہ خانم فرماتی ہیں کہ

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۱۷۹-۸۰

> "اس کی تصانیف نے ادب جدید کا معیار بہت بلند کر دیا اور ان کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہو جائے تو وہ یقیناً بین الاقوامی شہرت حاصل کر لیں۔"

حامد نے بھی نامق کمال کی طرح ظلم و ناانصافی کے خلاف شدت سے احتجاج کیا، باوجود اس کے کہ اس کی زندگی کا بڑا حصہ سرکاری ملازمت میں گذرا اور وہ بمبئی، میڈرڈ اور لندن میں مدت تک ترکی سفیر کی حیثیت سے رہا، تاہم اپنی کتابوں میں اس نے "سلطان عبدالحمید خان کے استبداد پر خوب خوب چوٹیں کی ہیں۔" (۱)

ضیا پاشا: وطنی تحریک کا ایک اور زبردست حامی ضیا پاشا تھا۔ اس پر فرانسیسی ادب کا بہت اثر تھا اور اس نے روسو اور مولیئر کی کتابوں کا ترجمہ کر کے نیز اپنی ادبی اور سیاسی تنقیدوں سے اس تحریک کو بہت مدد پہنچائی۔ اس نے جلاوطنی کے کئی سال پیرس اور لندن میں گذارے تھے۔ لندن ہی سے اس نے اخبار "حریت" نکالا تھا، جس کی ادارت میں نامق کمال بھی شریک ہو گیا تھا۔ ضیا پاشا قدیم ادب کا ماہر تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس ادب کو ترکوں کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ ادب کو عوام کی زبان اور خیالات کا آئینہ ہونا چاہیے۔ (۲)

ادبیات جدیدہ: سلطان عبدالحمید خان کے عہد سے ترکی ادبیات کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ سلطان نے تنظیمات کے ادب کو دبا دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور بظاہر اسے کامیابی ہوئی، شناسی اور نامق کمال وغیرہ کی کتابوں کی اشاعت بند ہو گئی اور جن الفاظ سے جذبہ وطن پرستی کا اظہار ہوتا تھا وہ لغت سے خارج کر دیے گئے۔ "دستور، آزادی اور وطن" کے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت صرف سرکاری اخباروں کو تھی، دوسروں کے لیے ان الفاظ کا زبان پر لانا بھی جرم تھا اور ممنوع الاشاعت کتابوں کا ایک صفحہ چوری سے پڑھنا بھی بغاوت میں داخل تھا، جس کی پاداش میں لوگ اکثر تمام عمر کے لیے

---

(۱) کشمکش ص ۱۸۱ (۲) مقالہ کوپریلو زادہ محمد فواد، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص ۹۵۱

جلاوطن کر دیے جاتے تھے۔ (۱)

لیکن ان سختیوں کے باوجود بلکہ شاید انہی کی وجہ سے اس عہد میں ایک جدید ادبی حلقہ پیدا ہوا، جس نے اپنے زور قلم سے نہ صرف حمیدی استبداد کی بنیادیں ہلا دیں بلکہ مذہب اور ماضی کی روایات پر بھی یہ سمجھ کر کہ وہ استبداد کی حامی ہیں، شدید حملے کیے، اس حلقہ کی نمایاں خصوصیت اس کی مغرب پسندی تھی، یہ لوگ مغربی سائنس، مغربی عقلیت اور مغربی حریت کے دلدادہ تھے، مذہب اور قدیم روایات ان کے نزدیک تہذیب وتمدن کی راہ میں حائل تھیں، اس لیے وہ ان دونوں کے مخالف تھے۔ انھوں نے ناول اور شاعری کے ذریعہ اپنے خیالات کی اشاعت کی، خالد ضیا اس حلقہ کا ناول نویس تھا، اس کے ناول مغرب کے جدید ناولوں کے طرز پر لکھے جاتے تھے، توفیق فکرت اس جماعت کا سب سے مشہور شاعر تھا، وہ غیر معمولی خصوصیات کا حامل تھا، خالدہ خانم لکھتی ہیں کہ "اس میں اولیاء اللہ کا سا زہد اور ضبط نفس پایا جاتا تھا" مگر باوجود اس کے اسے مذہب میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی، اس کا ذہن وسعت نظر اور تنگی ذہن کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے، اخلاق اور سیرت پر مذہب کے پاکیزہ اثرات اسے دکھائی نہیں دیتے، مغرب کے مادی تمدن کی چمک نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مذہب اور قدیم روایات ترقی کی راہ میں دو سب سے بڑے پتھر ہیں، اس نے ان خیالات کا اظہار اپنی مشہور نظم "تاریخ قدیم" میں کیا ہے، خالدہ خانم اس پر تبصرہ کرتی ہیں:

> "اس میں تمام قدیم روایات اور خصوصاً مذہب پر جنھیں وہ ترقی میں حائل سمجھتا ہے، بڑا حملہ کیا گیا ہے، اس کا اثر اچھا اور برا دونوں طرح کا ہے، سب سے بڑی خرابی اس میں یہی ہے کہ مذہب کے ہر پہلو کی بلا تفریق مخالفت کی گئی ہے اور اسے نوع انسانی کے لیے ایک لعنت قرار دیا گیا ہے، توفیق فکرت کے لیے تو بغیر مذہب کے

---

(۱) کشمکش ص ۱۸۲

بھی پائے جاتے ہیں اور بلند خیالات بھی۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن ہر مذہب اور ہر قوم میں لوگوں کی اخلاقی تعلیم کی حقیقی بنیاد مذہب ہی پر قائم ہے۔ اس لیے جتنا حصہ ضعیف الاعتقادی اور جہالت کا ہے اس کو ختم کیا جانا چاہیے۔ ہاں اس کے مجموعی حیثیت سے مذہب کی عزت اور احترام کرنا چاہیے اور اسی پر نوجوانوں کی اخلاقی تعلیم کی بنیاد رکھنی چاہیے۔ اس سے اس طرح مذہب پر اعتماد ختم ہو جانے سے بد اعتقادی پیدا ہوگی۔ اس کے علاوہ لوگ اپنے ماضی سے قطعی نفرت کرنے لگے۔

اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس نظم میں جو پاکیزہ اور بلند خیالات ہیں، وہ پر زور انداز بیان سے کہے گئے ہیں۔ یہاں تو یقیناً قدرت ہلکے و جمال کا ماحول ہے۔ بین الاقوامی اتحاد کا علمبردار، ہمہ گیر برادری کا داعی، مستقبل انسانی کی ضرورت اور خوبی کا دل سے معترف نظر آتا ہے۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ماضی کی روح مجسم ہو کر نمودار ہوتی ہے۔ یہ ایک خونیں لبادہ اوڑھا ہے جس کے دامن سے خون ٹپک رہا ہے۔ اس کے آنے سے حیات کی موت ہو جاتی ہے اور تمام جس کی نوع انسانی منتظر ہے، نمودار ہوتی ہے۔ تشدد کے خلاف اس سے زیادہ شدید احتجاج شاید ہی کسی زبان کے ادب میں کیا گیا ہے۔

میری آرزو ہے کہ صبح ہو جائے اور ان لوگوں کو جنھوں نے پہاڑ کی اندھیری راتیں خواب غفلت میں گزاری ہیں، حق کا مبارک جلوہ دیکھنا نصیب ہو۔ یہ مہیب پیکر جو اندھیرے میں قدم اٹھائے چلا آرہا ہے تو کون ہے؟ تیرے چہرے سے خوفناکی ٹپک رہی ہے تو وہی ہے جس نے میری قوم کو برباد کر دیا ہے۔

کیا کہا؟ شجاعت؟ جس کی بنا خونریزی اور وحشت پر ہے۔

> فتح! یعنی شہر کے شہر روند ڈالے، فوجیں کی فوجیں کاٹ کر رکھ دیں، قتل و خون، گیر و دار، تباہی، بربادی، پامالی، آتش زنی، غارت گری، رحم کا نام نہیں، آہوں اور آنسوؤں کا اثر نہیں، جہاں تیرا قدم پہنچا آفت آئی، مصیبت آئی، فصلیں برباد، گھاس اور کائی تک معدوم، خاندان تباہ ہو گئے، بستیاں اجڑ گئیں، ہر گھر قبر بنا دیا گیا، چھت معصوم بچوں کے سر پر گرا دی گئی۔"(۱)

توفیق فکرت کا اسلوب بیان تمثیلی ہے، اس کی نظمیں جن میں ظلم و استبداد پر درپردہ چوٹیں ہوتی تھیں، ہفتہ وار اخبار ثروت فنون میں شائع ہوا کرتی تھیں جس کا مدیر خود توفیق فکرت تھا، یہ نظمیں نوجوان ترکوں میں بے حد مقبول ہوئیں، چنانچہ جب ۱۸۹۶ء میں ان کا مجموعہ "رباب شکستہ" کے عنوان سے شائع ہوا تو اس کے تمام نسخے ایک سال کے اندر فروخت ہو گئے، پروفیسر جرمانس لکھتے ہیں کہ "ترکی نظم کی کسی تصنیف کو وہ مقبولیت نصیب نہ ہوئی جو اس مجموعہ کو ہوئی"(۲)، لیکن کتاب کی مقبولیت مصنف کے حق میں مضر ثابت ہوئی، توفیق فکرت گرفتار کر لیا گیا اور ثروت فنون بند کر دیا گیا، رہائی کے بعد اسے امریکی مشن کے رابرٹ کالج میں پروفیسری کی جگہ مل گئی، جہاں وہ بظاہر قومی خدمت سے کنارہ کش ہو کر درس و تدریس میں اپنا وقت گزارنے لگا، "رباب شکستہ" کے بعد اس کی کوئی نظم شائع نہیں ہوئی، لیکن وہ اپنے خیالات کے اظہار سے باز نہ آیا اور اپنے خاص انداز میں متعدد پر جوش نظمیں لکھیں جو شائع تو نہیں ہو سکتی تھیں مگر لوگ ہاتھ سے لکھ کر ان کو زبانی یاد کر لیتے تھے، اس نے نوجوان ترک پارٹی کے لیے ایک "قومی گیت" لکھا، جو حق اور ملت پرستی کے جذبات سے لبریز ہے، اس کی دو بیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

"ہمارا راستہ حق اور ملت کا راستہ ہے...... مبارک ہے حق،
مبارک ہے ہماری پیاری ملت، ظلم کے پاس توپیں ہیں، گولیاں ہیں، قلعے

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۸۹-۸۷ (۲) ترکوں کی اسلامی خدمات ص ۹۱

ہیں، حق کے پاس قلم تھامنے والا بازو، ہار نہ ماننے والا ایمان ہے۔'' (۱)

ادبیات جدیدہ کا دوسرا نہایت ممتاز شاعر محمد عاکف ہے، وہ بھی فکرت کی طرح استبداد کا دشمن اور عدل و انصاف کا حامی ہے، لیکن مذہب اور ماضی کا مخالف نہیں، برخلاف اس کے وہ مذہب کو انسان کی اصلاح کے لیے ضروری خیال کرتا ہے اور ماضی کو کھو دینے سے مستقبل کی تعمیر کو ناممکن سمجھتا ہے۔ اس کا دل اسلام کی محبت اور دنیائے اسلام کی زبوں حالی کے درد سے لبریز ہے، اپنی طویل نظم ''مشرق'' میں لکھتا ہے:

> ''لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق کی اتنے عرصہ تک سیاحت کی، آخر تم نے کیا دیکھا؟ میں کیا بتاؤں کیا دیکھا، میں نے اس سرے سے اس سرے تک ویران بستیاں، بے سری قومیں، ٹوٹے پھوٹے پل، بند نہریں، سنسان سڑکیں دیکھیں، میں نے جھریاں پڑے چہرے، جھکی ہوئی کمریں، فاتر دماغ، بے حس دل، اندھی عقلیں دیکھیں، میں نے ظلم، غلامی، قحط، مفلسی، ریاکاری، قاتل نفرت، برائیاں، طرح طرح کی بیماریاں، جلے ہوئے جنگل، کھنڈر سے چوپٹ، بربریت، بھوکی عورتیں، ننگے ہاتھ پاؤں دیکھے، میں نے بے جماعت کے امام دیکھے، بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا، دن دیکھے جن کا کوئی مقصد نہیں، راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں۔'' (۲)

حیات و کائنات کا ایک نیا تصور: ترکی میں جو ادبی تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی وہ حقیقتاً ایک تمدنی تحریک تھی، جس نے حیات و کائنات کا ایک نیا تصور پیش کیا، عثمانی ترکوں کا تصور کائنات اسلامی تھا مگر استبداد زمانہ سے اس کی اصلی حیثیت میں بہت کچھ فرق پیدا ہو گیا تھا، اسلام نے انسان کو جو منصب کائنات میں عطا کیا تھا، اس پر مستبد حکمرانوں نے قبضہ کر لیا تھا اور یہ قبضہ صدیوں تک قائم رہا، انسان کے لیے صبر و رضا

---

(۱) ترکوں کی اسلامی خدمات ص ۹۲ (۲) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۱۹۲

کے ساتھ اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ترکی میں بھی صورت حالات یہی تھی، لیکن جب داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر استبداد کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو جمہور کے دلوں میں اس منصب کے دوبارہ حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا جسے سلاطین نے اس سے چھین لیا تھا، قدیم نظام حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں، یورپ کے تمدنی تعلقات اور تعلیم جدید نے ایک نئی ذہنیت پیدا کر دی تھی، جو ادب کے ذریعہ ظاہر ہوئی، لیکن گو نیا ادب فرانسیسی رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے، اس کے بنیادی اصول خاص اسلامی ہیں، انسان نے کائنات میں اپنی حیثیت کا پھر احساس کیا، قرآن کریم کے وہ مقامات پھر یاد آنے لگے جہاں انسان کی عظمت کا ذکر کیا گیا ہے، محمد عاکف اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان "انسان" ہے لکھتا ہے:

> "انسان اپنی قدر نہیں پہچانتا۔ وہ تو فرشتوں تک سے بلندتر ہے، اس کے سینہ میں علم پنہاں ہے، اس کے قلب پر وجود باری اپنا پرتو ڈالتا ہے، جسمانی حیثیت سے دیکھو تو ایک ذرا سی چیز ہے، لیکن کارسازی الٰہی کا مقصود یہی ہے اور اس لیے ابدی ہے اور بے قید قدرت اس کی خادم ہے، عالم اشیا اس کا باج گزار ہے، دنیا اس کی مرضی اور اس کے تمکین کی فرمان بردار ہے، یہ کائنات کا تاج ہے۔"(۱)

انسان کی اس بلند حیثیت کا احساس اس کی عقل کی قدر افزائی کا باعث ہوا، مغربی فلسفہ نے تعلیم یافتہ طبقہ پر اثر ڈالا اور ترکی کی جدید ادبی تحریک میں عقلیت کی رو نمایاں طور پر نظر آنے لگی، عثمانی مفکرین نے شروع میں یہاں بھی اسلام ہی کا دامن پکڑا اور بتایا کہ اسلام میں عقل کا درجہ کس قدر بلند ہے مگر بعد میں وہ یورپ کی عقلیت کا شکار ہو گئے، ان کی عقل پرستی یہاں تک بڑھی کہ ان میں سے بعض خود مذہب کی مخالفت کرنے لگے، توفیق فکرت اسی جماعت کا نمایندہ ہے۔

---

(۱) ڈاکٹر احمد محی الدین بحوالہ جامعہ ص ۱۱۰-۱۰۹

عثمانی ترک جب شروع شروع اسلام لے آئے تو ان میں وہی جوش اور جذبۂ عمل پایا جاتا تھا جو ایک نئی قوم میں ہوتا ہے۔ یہ جذبہ سلطنت کی ابتدائی صدیوں میں قائم رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ تمدن کے تعیشات میں گرفتار ہو کر ان کی سپاہیانہ سرگرمی سرد پڑتی گئی۔ دوسری طرف عجمی فلسفہ اور تصوف نے دنیا سے نفرت اور بیزاری کا سبق پڑھایا۔ میدان جنگ میں جب یورپ کے مقابلہ میں شکستوں کا سلسلہ شروع ہوا اور سلطنت کے صوبے یکے بعد دیگرے نکلتے گئے تو یہ بیزاری اور بڑھی۔ اپنی کمزوریوں پر نظر کرنے کے بجائے انھوں نے سارا الزام تقدیر کے سر رکھا۔ استبدادی حکومت میں جمہور کی بے دست و پائی نے عقیدہ و تقدیر کو مزید تقویت پہنچائی۔ کیونکہ ان کے حالات کا بننا بگڑنا حکمرانوں کے رحم و کرم پر موقوف تھا۔ جدید تمدنی تحریک نے اس غلط قسم کی تقدیر پرستی اور دنیا سے نفرت اور بیزاری کے عقیدہ کے خلاف شدت سے آواز بلند کی اور اثبات زندگی کا تصور نہایت بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا۔ اس تصور کے پیش کرنے میں نامق کمال سب سے آگے ہے، اس کی تمام تصنیفیں اثبات زندگی کے جذبہ اور ولولے سے پر ہیں۔ اس نے اپنی قوم کو اسلام کے نام پر عمل کی دعوت دی۔ اس نے بتایا کہ اسلام ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا اور کائنات کی تسخیر جو انسان کو دیگر مخلوقات پر فضیلت بخشتی ہے، بغیر عمل اور جدوجہد کے ممکن نہیں لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کا الٰہی قانون اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر احمد محی الدین لکھتے ہیں:

> ”اس سلسلہ میں بھی ترکی شاعری نے اپنے مقصد کو صحیح طور پر سمجھا اور اس کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے تقدیر پرستی اور غلط معنوں میں خدا پر بھروسہ کرنے کی مخالفت کو اپنا سب سے پہلا مقصد قرار دیا اور دوسرا مقصد سستی اور کاہلی کے خلاف جہاد۔ یہاں بھی ہمیں سرلشکر وہی نامق کمال دکھائی دیتا ہے۔ وہ مضبوط ارادوں والا عملی آدمی جس نے اپنے خیالات کی تمام قوت اس کاہلی اور خدا پر اس غلط بھروسہ

> کے خلاف صرف کردی اور محنت و عمل کے پیغام کی تبلیغ کی۔ جذبہ، فکرت، امین اور عہد جدید کے تقریباً سب شعراء نے اس کی پیروی کی، لیکن اس ضمن میں شاعری کا سب سے عظیم الشان کارنامہ عاکف کا ہے ... وہ سرتاپا مسلمان ہے، اس کا ایمان نہایت مضبوط اور پختہ ہے اور اس کے عقیدہ میں ایک عجیب سادگی اور صفائی ہے، لیکن اس پر بھی اسلامی دنیا کے مصائب اور ترکوں کے تکلیف دہ حالات کا اثر ہے اور باوجود اپنے عقیدہ کے یہ محسوس کرتا ہے کہ خود اسے اور اس کی اسلامی دنیا کو خدا نے چھوڑ دیا ہے۔ اس تکلیف دہ خیال سے اس کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا علاج یہ اس عمل میں ڈھونڈھتا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے یعنی تیسرے باب کی پہلی نظم میں محنت و سعی کا نیا قانون پیش کرتا ہے، نظم کے شروع میں تو تسلیم اور رضائے الٰہی پر قناعت کے جذبات کا اظہار ہے، لیکن آگے چل کر یہ اسلامی اور ترکی دنیا کے تکلیف دہ حالات کا ذکر کرتا ہے اور خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ تیری مدد کہاں ہے، اس پر اس کو یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں جنہیں سن کر یہ خاموش ہو جاتا ہے: "اے نادان! خاموش، دنیا کی گردش کبھی نہیں رکتی، تو کیا سمجھتا ہے، کیا قوانین عالم شکوہ اور شکایت سے معطل ہو سکتے ہیں؟ مدد چاہتا ہے تو اپنے آپ سے مدد کر، جا اور خود اپنی کوشش سے ظلم اور ناانصافی کو دور کر اور دیکھ دنیا کس قدر عزت کے ساتھ اس قانون سعی کی اطاعت کرتی ہے۔"(1)

پریس کی سرگرمی: ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد جب دستوری حکومت قائم ہوئی اور پریس کا احتساب منسوخ کردیا گیا تو عثمانی ادب و صحافت میں لامحدود جوش پیدا ہوا، دفعۃً سیکڑوں کتابیں منظر عام پر آگئیں، تمام ممنوع الاشاعت کتابوں کے تازہ اڈیشن فوراً تیار

---

(1) ص ۱۷-۱۸

کیے جانے لگے، تمثال اور حامد کے ڈرامے پھر اسٹیج پر آئے اور مغرب کی بہت سی عمرانی، فلسفیانہ اور تاریخی کتابوں کے ترجمے ترکی زبان میں کیے گئے، اخباروں اور رسالوں کی تعداد میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہونے لگا، چند ہفتوں کے اندر ترکی روزنامہ اخباروں کی تعداد تین سے پندرہ تک پہنچ گئی، بعض پرجوش اشخاص نے بغیر اس خیال کے کہ ملک میں مانگ ہے بھی یا نہیں، محض یورپ کی تقلید میں ہفتہ وار اخبار اور ماہوار رسالے جاری کر دیے، چنانچہ ''اشتراک'' کے نام سے بھی ایک اشتراکی ہفتہ وار اخبار جاری کیا گیا، حالانکہ ترکوں کو اشتراکی خیالات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ اس وقت ترکی میں اس اخبار کی مانگ تھی، ہر جماعت اپنا خاص اخبار نکالنا چاہتی تھی، تقریباً ایک ہی وقت میں معماروں کیمیا سازوں، موسیقی کے ڈاکٹروں، طبیبوں، وکیلوں ایکٹروں، کاریگروں، سرکاری عہدہ داروں، سابق سیاسی جلاوطنوں، سول سروس اسکول اور یونیورسٹی کے طالب علموں کی جماعتوں سے علاحدہ علاحدہ ہفتہ وار یا ماہوار رسالے جاری ہو گئے(۱)، ان میں سے اکثر جلد ہی بند بھی ہو گئے'' کچھ تو اخبار نکالنے والوں کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اخبارات نے اپنے لب ولہجہ میں ایسی شدت اور بے باکی اختیار کر لی تھی کہ دستوری حکومت کو بھی ان کی روک تھام کے لیے از سر نو پابندیاں عاید کرنا پڑیں۔

رسم الخط کا مسئلہ: نوجوان ترکوں نے اپنے مختصر عہد حکومت میں تعلیم کی اصلاح و ترقی میں جو سرگرمی دکھائی اس کا ذکر ہو چکا ہے، اس دور میں ''ادبیات جدیدہ'' کے حلقہ کا رجحان یہ تھا کہ ترکی کو بالکل مغربی تمدن کے رنگ میں رنگ دیا جائے، چنانچہ عربی فارسی اور علوم مشرقیہ کی بجائے مغربی زبانوں اور مغربی علوم وفنون کی تحصیل پر زور دیا جانے لگا، اعلیٰ طبقے کے لوگوں نے فرانسیسی تہذیب اختیار کر لی، یورپ سے تمدنی تعلقات تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے، اسی سلسلہ میں حسین عابد نے جو توفیق فکرت کے حلقہ کا اخبار نویس اور انشاپرداز تھا لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی تحریک شروع کی اور اس مسئلہ پر اخباروں میں

---

(۱) جدید ترکی از میرز (Mears) ص ۲۵۹

بحث ہونے لگی، اس تجویز کی مخالفت عوام کے علاوہ بعض اہم تعلیم یافتہ جماعتوں نے بھی کی، اتحاد اسلامی کے حامی اس بنا پر مخالف تھے کہ اس سے ترکوں کا تعلق دنیائے اسلام سے منقطع ہو جائے گا۔ اتحاد تورانی کے حامی یہ کہتے تھے کہ ایسا کرنے سے دوسرے ملکوں کے ترکوں سے بھی جو ترکی زبان بولتے ہیں اور عربی حروف میں لکھتے ہیں اور جن کا تمدن کم و بیش ہمارا ہی جیسا ہے تمدنی اتحاد باقی نہ رہ سکے گا۔ قوم پرور جماعت کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ قدیم عثمانی علوم و فنون کا کل سرمایہ عربی اور فارسی زبان میں ہے جسے ترک نہیں کیا جا سکتا، وہ عربی رسم الخط میں بعض تبدیلیوں اور اصلاحات کو مناسب سمجھتے تھے مگر اسے بالکل چھوڑ کر لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کے سخت مخالف تھے۔

تحریک اتحاد عثمانی: نوجوان ترکوں کی سرگرمیوں کے تین خاص رخ تھے: اتحاد عثمانی، اتحاد اسلامی اور اتحاد تورانی۔ انیسویں صدی میں قومیت کا جو سیلاب یورپ سے چلا تھا وہ نہایت سرعت کے ساتھ بڑھتا ہوا سلطنت عثمانیہ کے حدود میں بھی داخل ہو گیا تھا اور مختلف عیسائی قوموں نے حکومت خود اختیاری کے مطالبات شروع کر دیے تھے، مغربی سلطنتیں ان کی حمایت کے لیے کھڑی ہو گئیں، سب سے پہلے یونان نے بغاوت کا اعلان کیا، اس کے بعد دوسرے عیسائی صوبے دول عظمیٰ کی مدد سے یکے بعد دیگرے آزاد ہوتے گئے، یہ صورتِ حال بہت کچھ نظام حکومت کی ابتری کا نتیجہ تھی، چنانچہ نوجوان ترکوں نے مدحت پاشا کی سرکردگی میں اسی کی اصلاح کی کوشش شروع کی اور سلطان کے استبداد اور مطلقیت کو دور کر کے جو در اصل تمام خرابیوں کی جڑ تھی دستوری حکومت قائم کرنی چاہی، قومیت کی تحریک سے وہ بھی متاثر تھے مگر انھوں نے اپنا نصب العین عثمانی قومیت کو بنایا یعنی وہ سلطنت عثمانیہ کے تمام باشندوں کو خواہ وہ کسی نسل یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اس قومیت کے رشتہ میں منسلک کر دینا چاہتے تھے اور پیش نظر دستوری حکومت میں سب کو مساوی حقوق دینا چاہتے تھے، تیس چالیس سال کی جد و جہد کے بعد ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے بالآخر استبداد کو ختم کر کے ملک میں دستوری حکومت قائم کر دی

اور سلطنت کے تمام باشندوں نے بے انتہا جوش مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اس انقلاب میں ترکوں کے علاوہ سلطنت کی تمام دوسری قوموں نے بھی حصہ لیا تھا اور اس کی کامیابی ان سب کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھی، نوجوان ترک سمجھتے تھے کہ عثمانی قومیت کا یہ مضبوط حصار سلطنت کی بقا اور سالمیت کا ضامن ہوگا مگر چند ہی دنوں کے بعد جو سیاسی واقعات رونما ہوئے ان سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ خیال خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، جنگ بلقان کی ضرب نے انھیں اس خواب سے ہمیشہ کے لیے بیدار کر دیا۔

تحریک اتحاد اسلامی: لیکن اس جنگ سے اتحاد اسلامی کی تحریک کو مدد پہنچی اور ترکوں کے ساتھ جو چھ سو برس سے یورپ میں اسلام کی شمع کو روشن کیے ہوئے تھے اور اسے بجھانے کے لیے مسیحی طاقتیں اب آخری کوشش کر رہی تھیں، تمام دنیا کے مسلمانوں کو ہمدردی ہوگئی، بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں نے ان مجاہدین ملت کی بڑی مدد کی اور نقد کے علاوہ ضروریات زندگی کی دیگر اشیا بکثرت روانہ کیں، وہ خود ترکی فوج میں شریک تو نہ ہو سکے مگر ان کے طبی مشن نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کی قیادت میں ترکی جا کر غازیوں کی خدمت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

اتحاد اسلامی کی تحریک حقیقتاً انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوئی تھی، اس کے بانی سید جمال الدین افغانی تھے، وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مغربی تسلط اور غلبہ کو پوری طرح محسوس کیا اور دنیائے اسلام کو اس خطرہ سے آگاہ کر کے دفاع و تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنا اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا۔ اسٹاڈرڈ (Stoddard) نے اپنی مشہور و معروف کتاب "جدید دنیائے اسلام" میں سید موصوف کے جو خیالات نقل کیے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

عیسائی دنیا نسل و قومیت کے اندرونی اختلافات کے باوجود مشرق اور خصوصاً اسلام کے مقابلہ میں متحد ہے اور تمام اسلامی حکومتوں کو برباد کر دینا چاہتی ہے، صلیبی لڑائیاں اب بھی جاری ہیں اور پیٹر راہب (Peter the Hermit) کی روح آج بھی

کارفرما ہے، عیسائی دنیا اب بھی اسلام کے متعلق متعصبانہ نفرت اور حقارت کے جذبات اپنے دل میں رکھتی ہے، اس کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، مثلاً بین الاقوامی قوانین میں مسلمان قومیں عیسائی قوموں کے برابر نہیں سمجھی جاتیں اور نہ ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا جاتا، اسلامی حکومتوں پر جو حملے کیے جاتے ہیں اور ان کی جو ذلتیں ہوتی ہیں ان کا عذر عیسائی حکومتیں یہ پیش کر دیتی ہیں کہ اسلامی حکومتیں ابھی پستی اور جہالت کی حالت میں ہیں لیکن یہی عیسائی حکومتیں اسلامی ممالک کی ہر اصلاحی کوشش کو ہزاروں طریقوں سے روکتی ہیں، یہاں تک کہ اس کے لیے جنگ بھی چھیڑ دیتی ہیں، اسلام سے نفرت کا جذبہ تمام عیسائی قوموں میں موجود ہے اور اس جذبہ کا اثر یہ ہے کہ اسلام کی تباہی کے لیے سب کوشاں ہیں، عیسائی دنیا مسلمانوں کے ہر جذبہ اور حوصلہ کا مضحکہ اڑاتی ہے اور انھیں بہتان وافترا کا نشانہ بناتی ہے، اہل یورپ جس چیز کو اپنے ہاں قوم پروری اور وطن دوستی سے تعبیر کرتے ہیں، اسی کو مشرق میں تعصب کا نام دیتے ہیں اور جسے مغرب میں خودداری، آن بان اور قومی عزت کہتے ہیں اسے مشرق میں جنگ جویانہ وطن پرستی سے موسوم کرتے ہیں، یہ تمام باتیں اسلامی دنیا کے لیے ایک زبردست مدافعانہ اتحاد کی ضرورت کو واضح کرتی ہیں اور اگر اپنے کو تباہی سے بچانا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ مغربی ترقی کے طریقہ کار سیکھے اور یورپ کے طریق کار کے اسرار معلوم کیے جائیں۔ (۱)

سید جمال الدین کا مقصد یہ تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک مرکز پر متحد ہو جائیں ان کو اس سے زیادہ بحث نہ تھی کہ یہ مرکز ترکی میں ہو یا اسلامی دنیا کے کسی اور حصہ میں، لیکن چونکہ ترکی ہی سب سے بڑی اسلامی سلطنت تھی اور مرکز خلافت بھی صدیوں سے وہیں تھا اسی لیے اسی کو تحریک اتحاد اسلامی کا مرکز بنانا مناسب معلوم ہوا، دول یورپ کے ستموں سے سلطنت کے بقیہ حصوں کو محفوظ رکھنے کے لیے سلطان عبدالحمید خاں

---

(۱) جدید دنیائے اسلام از اسٹاڈرڈ، مطبوعہ لندن ۱۹۲۲ء، ص ۵۳-۵۴ (The new world of Islam by L.Stoddard Ph.D.)

نے بھی اس تحریک کو خاص اہمیت دی اور دوسرے اسلامی ممالک میں اسے پھیلانے کی غرض سے سید جمال الدین کو اپنا حامی بنانا چاہا، چنانچہ ان کے پیہم اصرار پر سید موصوف ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ آئے اور سلطان نے اس تحریک کا سررشتہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ قاضی عبدالغفار صاحب اپنی گراں قدر تالیف ''آثار جمال الدین افغانی'' میں لکھتے ہیں:

> ''شیخ خوب جانتے تھے کہ عبدالحمید نے خلافت کی تحریک کو اپنی بہبود کا ایک ذریعہ بنایا ہے اور وہ عبدالحمید کے خیالات و ارادوں سے ناآشنا نہ تھے۔ لیکن جس طرح عبدالحمید ان کی ذات سے اپنے مقاصد پورے کرانا چاہتے تھے، اسی طرح شیخ عبدالحمید کے نام اور وقار سے تحریک اتحاد اسلام کو تقویت پہنچانے کی فکر میں تھے۔''(۱)

بہرحال اتحاد اسلامی کے سفرا قسطنطنیہ سے روس، وسط ایشیا، افغانستان، ہندوستان، جاوا، چین اور افریقہ روانہ کیے گئے۔ دول عظمیٰ میں جو سلطان عبدالحمید خاں کی سیاست کا تختۂ مشق تھیں، خصوصاً برطانیہ، روس اور فرانس میں جن کے فیوض و برکات سے کروڑوں مسلمان مستفید ہو رہے تھے، اس تحریک نے خاصی بے چینی پیدا کر دی، لیکن چند ہی سالوں کے بعد سید جمال الدین کا جو اس تحریک کے روح رواں تھے انتقال ہو گیا اور محض سلطان کا اقتدار اتحاد اسلامی کے لیے ایک جسم بے جان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔

دستوری حکومت کے قائم ہونے کے بعد انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان نے ۱۹۱۱ء میں ایک کانگریس سالونیکا میں منعقد کی اور اس میں طے کیا گیا کہ تمام ممالک اسلامیہ کے مندوبین ہر سال قسطنطنیہ میں مجتمع ہو کر ان مسائل پر بحث کریں جن کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے، اتحاد اسلامی کے سفرا پھر ان سب ملکوں میں بھیجے گئے جہاں کے مسلمان یوروپین حکومتوں کے ماتحت تھے، نیز ان ملکوں میں جہاں مسلمان مغربی تسلط

---

(۱) آثار جمال الدین افغانی مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۲۷۶

سے ابھی آزاد تھے، سنی اور شیعہ کے اختلافات کو دور کرنے کی بھی کوشش کی گئی، چنانچہ ۱۹۱۱ء میں متعدد عثمانی اور ایرانی علما نجف میں جمع ہوئے اور اپنے دستخط سے اس مضمون کا ایک بیان شائع کیا کہ دونوں فرقوں میں کوئی اختلاف نہیں اور دونوں سلطنتوں کے باہمی تعاون اور اشتراک عمل پر زور دیا، اس کے بعد ہی ستمبر ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس اور اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہوگئی، ترکی جو خلافت اور تحریک اتحاد اسلامی کا مرکز تھی اب تمام دنیائے اسلام کی ہمدردی کا مرکز بن گئی، پورا اسلامی پریس اتحاد اسلامی کی ضرورت اور اہمیت کے اعلان میں متفق اللفظ تھا۔

لیکن جس طرح جنگ بلقان سے اتحاد اسلامی خواب پریشان ہوگیا، اسی طرح جنگ عظیم نے اتحاد اسلامی کے تخیل کو درہم برہم کر ڈالا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار کس قدر اطمینان قلب کے ساتھ لکھتا ہے:

> ''۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے اتحاد اسلامی کی کمزوری ظاہر ہوگئی اور قوم پروری کے جذبہ کے زیادہ قوی اثر نے اتحاد اسلامی کے تخیل کو پس پشت ڈال دیا، دول یورپ جن کے مقابلہ میں یہ تحریک جاری کی گئی تھی یعنی انگلستان، فرانس، روس اور بعد میں اطالیہ، ان کو دوران جنگ میں اپنی مسلمان رعایا کی طرف سے وفاداری اور محبت کے بڑے بڑے ثبوت ملے۔''(۱)

لیکن جس خنجر نے اتحاد اسلامی کی تحریک کا خاتمہ کیا وہ حرم کا خنجر تھا، عربوں کی بغاوت برطانوی سیاست کا وہ شاہکار ہے جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے ترک کیوں کر شکایت کر سکتے تھے، ان کی ''وفاداری'' اور ''محبت'' کا تقاضا ہی یہ تھا کہ آقا کی خوشنودی کے لیے ایمان کو بھی قربان کر دیں اور جن بھائیوں کی خدمت کرنا دو سال قبل دین و دنیا کی سعادت خیال کرتے تھے، انہی کے

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، چودہواں ایڈیشن ج ۱۷، ص ۱۸۵

بیٹوں کو انگریزی کولیس سے بچھائی کر دیں۔

ترکی میں "اتحاد اسلامی" کی تحریک سیاسی حیثیت کے علاوہ تمدنی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ اس کا نصب العین یہ تھا کہ ابتدائی عہد اسلام کی خالص اسلامی زندگی اختیار کی جائے اور مغربی تہذیب و معاشرت سے اجتناب کیا جائے۔ اس تحریک کا سب سے بڑا حامی محمد عاکف شاعر تھا۔ اس حلقے سے ایک ہفتہ وار اخبار "سبیل الرشاد" نکلتا تھا جس میں ان خیالات کی اشاعت کی جاتی تھی۔ انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان اس حلقہ والوں کو ان کی قدامت پرستی کی وجہ سے شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے اس رسالے کے جواب میں حکومت کی طرف سے "اسلامک ریویو" نکالا جس کا مدیر انجمن کا ممتاز رکن اور ترکی کا مشہور فاضل گوق الپ ضیا تھا۔ "اسلامک ریویو" کے مقصد سے متعلق خالدہ خانم لکھتی ہیں:

> "یہ رسالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ اس کے ذریعے سے ایک منظم کوشش کی گئی کہ اسلام کی موجودہ حالت میں اصلاح ہو، خصوصاً مذہب کو علم اور معاشرت سے جو تعلق ہے اس کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے۔ اس میں قرآن کا ترکی ترجمہ بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ خود گوق الپ ضیا اسے نہایت ضروری سمجھتا تھا کہ اسلام پر تنقیدی نظر ڈالی جائے اور اس کی حقیقی روح کو پیش نظر رکھ کر مکمل اصلاح و تجدید عمل میں لائی جائے۔"(۱)

اسلام پر "تنقیدی نظر" ڈالنے اور اس کی "حقیقی روح" کو پیش نظر رکھ کر "مکمل اصلاح و تجدید" عمل میں لانے کا اگر یہی نتیجہ ہے جو ترکی جمہوریہ میں دیکھا جا رہا ہے تو شاید "تنقیدی نظر"، "حقیقی روح" اور "مکمل اصلاح" ہر ایک کا مفہوم بدل دینا پڑے گا۔

تحریک اتحاد تورانی: اتحاد تورانی کی تحریک ترکی میں دستوری انقلاب کے بعد گوق الپ ضیا کی سرکردگی میں تمدنی حیثیت سے شروع ہوئی، چنانچہ ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو

---

(۱) کشمکش ص ۹۶-۱۹۵

انجمن "تورک درنیی" قائم کی گئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی قوموں کے ماضی اور حال کا مطالعہ کیا جائے اور ترکی زبان کو آسان اور ایک عملی زبان بنایا جائے (۱)۔ جہاں تک زبان کا تعلق تھا اس کے علمبرداروں نے نہایت سرگرمی سے کام شروع کر دیا اور غیر زبانوں کے تمام الفاظ خارج کیے جانے لگے۔ الپ ضیا نے جو ایک نہایت ممتاز شاعر بھی تھا، اپنی نظموں میں قدیم ترکی الفاظ جو عہد عثمانی سے پہلے وسط ایشیا کے ترکی قبیلوں میں بولے جاتے تھے اور جن کو اس کے ہم عصر ترک بالکل نہیں سمجھتے تھے، کثرت سے بھر دیے، اس سے زبان بجائے آسان ہونے کے حد درجہ مشکل ہو گئی، لیکن آخر الپ ضیا اور اس کے پیرووں کو یہ روش ترک کرنی پڑی اور رفتہ رفتہ اعتدال پیدا ہو گیا۔

اتحاد تورانی کی تحریک حقیقتاً ایک نہایت وسیع تحریک تھی، یہ صرف چند ترک محبان وطن تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے علمبرداروں میں دوسرے ملکوں کے ترک و تاتار بھی شامل تھے۔ اس کا سب سے بڑا لیڈر احمد بے آغا ئف تھا، جو والگا کا تاتاری اور ایک نہایت قابل اخبار نویس تھا۔ اس کا اخبار "تورک یوردو" ترکی تاتاری دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچتا تھا اور رائے عامہ کی تشکیل میں بڑا اثر رکھتا تھا (۲)۔ اسٹاڈرڈ لکھتا ہے کہ احمد بے آغا ئف جیسے لیڈروں کے پیش نظر پوری تورانی دنیا تھی جو فن لینڈ سے منچوریا تک پھیلی ہوئی تھی۔

لیکن ابتداءً ان کی عملی کوششیں ترکی تاتاری گروہ تک محدود تھیں یعنی ترکی کے عثمانی، روس کے تاتار، وسط ایشیا اور ایران کے ترکمان، چونکہ یہ تمام قومیں مسلمان تھیں اس لیے اس تحریک میں نسلی اور مذہبی دونوں رنگ شامل ہو گئے تھے۔ انجمن اتحاد و ترقی کے اکثر لیڈر جو تحریک اتحاد اسلامی کے علمبردار تھے "اتحاد تورانی" کے بھی حامی تھے، وہ دونوں تحریکوں کو ساتھ چلانا چاہتے تھے۔

جنگ بلقان کے بعد اس تحریک کی نسلی حیثیت زیادہ نمایاں ہوئی، نہ صرف یہ ترکوں نے بلقان سے نکل کر اب اپنے قدیم وطن کی طرف نظر ڈالنی شروع کی بلکہ جیسا

---

(۱) کوپرولو زادہ محمد فواد، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۴ ص ۹۵۷ (۲) جدید دنیائے اسلام ص ۱۰۵

کہ ستانارڈ نے لکھا ہے اہل ہنگری اور اہل بلغاریہ کے دلوں میں فاتح سرویوں کے خلاف نفرت کا اتنا شدید جذبہ پیدا ہوا کہ ان دونوں قوموں نے اپنے تورانی الاصل ہونے کا اعلان کردیا اور سرویا اور روس کے سلافی اتحاد کے مقابلہ میں یہ تورانی اتحاد کے تخیل سے دل بہلانے لگے تھے۔ (۱)

قوق الپ ضیا نے ترکوں کے ملک وسعت کی یہ تعریف کی تھی "ہمارا وطن نہ ترکی ہے نہ ترکستان وہ ایک فضا ہے روحانی ہے یعنی توران" (۲)، تورانی تہذیب کا یہ دلفریب تخیل یورپ کے دو مستشرقوں ومبری (Yambery) اور کاہون (Cahun) کا پیدا کیا ہوا تھا، نامق کمال اور عبدالحق حامد نے شدید قوم پروری کے باوجود "دار الاسلام" یعنی اسلامی ترکی ہی کو اپنا وطن سمجھتے رہے، لیکن "اتحاد تورانی" کے حامیوں نے اپنی قبل اسلامی تاریخ پر فخر کرنا شروع کیا، وہ عثمانی عہد کی تہذیب کے سخت مخالف تھے اور اپنے رسالوں میں اس عہد کے عقاید اور خیالات پر آزادی کے ساتھ تنقید کیا کرتے تھے۔

جنگ عظیم کے بعد ترکوں نے اتحاد تورانی کی وسعت کو جو توران کی "فضائے روحانی" میں پھیلی ہوئی تھی بہت کچھ محدود کردیا، وہ روسی قومیں اس دائرہ میں داخل کی گئیں جو ترکی زبان بولتی ہیں، اب اس تحریک میں نسلی تصور کے بجائے لسانی اور قومی تصور کارفرما ہے اور یہ بھی یورپ کی موجودہ قومی تحریکوں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔

---

(۱) جدید دنیائے اسلام ص ۱۳۶ (۲) ایضاً ص ۱۹۲

عثمانی ترک

(۲)

معاشرت، اخلاق وعادات

عثمانی ترکوں کی ابتدائی معاشرت نہایت سادہ تھی، آزادی، مساوات اور سادگی اس کی خاص خصوصیات تھیں جو شاہی محل سے لے کر غریبوں کے جھونپڑوں تک ہر جگہ نظر آتی تھیں، چودھویں صدی کا عرب سیاح ابن بطوطہ سلطان سے ملنے کی غرض سے بروصہ گیا تھا، سلطان کہیں باہر گیا ہوا تھا مگر سلطانہ نے اس سے ملاقات کی اور ملکی معاملات پر اس سے گفتگو کرتی رہی، ابن بطوطہ نے دیکھا کہ ترکی عورتیں آزادی کے ساتھ سڑکوں پر چلتی پھرتی اور خرید وفروخت کرتی ہیں(۱)، مگر جوں جوں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور مختلف قومیں حدود سلطنت میں شامل ہوتی گئیں ترکوں کے تمدن و معاشرت میں بھی تبدیلیاں نظر آنے لگیں، مفتوحہ قوموں نے اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ خالدہ خانم لکھتی ہیں۔

> "استنبول کے فتح ہونے کے بعد ترکی سوسائٹی صاف طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہوگئی، سلطان اور ارکان سلطنت نے بازنطینی طریقے اختیار کیے مثلاً پردہ، عورتوں کے لیے علاحدہ مکان، خواجہ سرا، نہ صرف تعدد ازدواج بلکہ داشتہ رکھنے کی قبیح رسم بھی رائج ہوگئی، اب تک سلطان

---

(۱) ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ص ۳۳۶

> غیر ملکی شہزادیوں سے شادی کیا کرتے تھے اب وہ صرف لونڈیوں سے کرنے لگے، ان کے ہاں کی عورتیں صرف ان کے عیش و آرام کے لیے تھیں، سوسائٹی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔
>
> مگر متوسط طبقے اور ادنیٰ طبقے میں بعض پرانی رسمیں اب تک باقی تھیں، ان کی عورتیں نقاب ڈال کر بے تکلف باہر آتی جاتی تھیں، البتہ انھیں بجز خاص صورتوں کے خاندان کے باہر کے لوگوں سے ملنے کی ممانعت ہوگئی، ان طبقوں کے لوگ لونڈیاں رکھتے تھے مگر داشتہ رکھنے کی یا تعدد ازدواج کی مثالیں بہت کم پائی جاتی تھیں، اگر متوسط درجہ کی کسی ترکی عورت کا شوہر دوسری شادی کر لے تو وہ اس کی زندگی دشوار کر دیتی تھی، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ دونوں بیویاں مل کر اس کی خبر لیتی تھیں، یہ چیزیں بہت تکلیف دہ تھیں اور ان کا اثر بچوں پر بہت برا پڑتا تھا۔
>
> البتہ ماؤں کے حقوق ان سب تغیرات کے باوجود قائم رہے، ماں کی محبت اور عزت دنیا میں عام ہے، مگر ترکوں میں یہ جذبہ بہت ہی گہرا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے اکثر بہوؤں کے لیے بڑی مشکل ہوتی تھی کہ بڑی بی کے انتقال سے پہلے ان کی استبدادی حکومت سے نجات پانا ناممکن تھا۔"(۱)

معاشرت کی سادگی: ارکان سلطنت کے علاوہ، جنھوں نے بازنطینی تکلفات اختیار کر لیے تھے، عام طور پر ترکوں میں معاشرت کی سادگی کئی سو برس تک قائم رہی، شہنشاہ آسٹریا کا سفیر بسبک (Busbecq) جو سلیمان اعظم کے دربار میں ۱۵۵۴ء سے ۱۵۶۲ء تک تھا، اپنے خطوط میں ترکوں کے بعض چشم دید حالات بیان کرتا ہے، چنانچہ ان کے مکانات کی سادگی کے متعلق وہ لکھتا ہے:

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص۳۸-۲۳۷

> "ترکوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اپنی عمارتوں میں وہ شان و شوکت سے پرہیز کرتے ہیں، باتوں پر توجہ کرنا ان کے خیال میں غرور اور خود بینی کی علامت ہے۔ گویا انسان دنیا میں ہمیشہ رہنے کی توقع کرتا ہے، وہ اپنے مکانوں کو ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ ایک مسافر سرائے کو سمجھتا ہے۔ اگر وہ چوروں سے محفوظ ہوں اور گرمی، سردی اور بارش سے بچے رہیں تو انہیں زیادہ تکلفات کی ضرورت نہیں، یہی وجہ ہے کہ پوری ترکی میں تم کو کوئی دولت مند آدمی بھی مشکل سے ایسا ملے گا جس کا مکان عالی شان ہو، عموماً جھونپڑوں میں رہتے ہیں، امرا، خوانین اور عہدہ داروں کے شائق ہیں اور ان کے مکانات وسیع ہوتے ہیں، جن میں انتظام خانہ داری کے لیے کافی گنجائش ہوتی ہے مگر ان مکانوں میں بھی خوب روشن پورٹیکو (برساتی) یا برآمدے نہیں ہوتے اور نہ ان میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو عالی شان و جاذب نظر ہو۔"(۱)

سلیمان اعظم کا عہد سلطنت عثمانیہ کے اوج کمال کا عہد تھا، اس زمانہ میں ترکوں کی یہ سادگی تعجب خیز ہے، مکانات کے علاوہ غذا کی سادگی کا بھی یہی حال تھا، بسبک لکھتا ہے:

> "ترک کھانے پینے میں اتنے کفایت شعار ہیں اور انہیں مزیدار چیزوں کا اس قدر کم شوق ہے کہ اگر روٹی، نمک اور لہسن یا پیاز مل جائے اور ایک قسم کا ترش دودھ جسے وہ یوغورت کہتے ہیں تو پھر ان کو اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اس دودھ کو بہت ٹھنڈے پانی میں ملا کر روٹی کے ٹکڑے اس میں ڈال دیتے ہیں اور بہت گرمی اور پیاس کی حالت میں اسے کھاتے ہیں، ہم نے بھی اکثر شدید گرمی میں اس

---

(۱) بسبک کے ترکی خطوط مطبوعہ لندن ص ۱۱ (Busbecqs Turkish letters)

> سے بہت فائدہ محسوس کیا، یہ غذا نہ صرف خوش ذائقہ اور قابل ہضم ہوتی ہے بلکہ اس میں پیاس بجھانے کی بھی ایک غیر معمولی خاصیت ہوتی ہے، تمام کارواں سراؤں میں جو ترکی سرائیں ہیں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، ترش دودھ اور دوسری قسم کی مزیدار چیزیں کثرت سے فروخت ہوتی ہیں، کیونکہ ترک سفر کی حالت میں گرم کھانے اور گوشت کی ضرورت نہیں محسوس کرتے، ان کے ذائقہ کی چیزیں ترش دودھ، خشک آلو بخارا، شفتالو، سفرجل، انجیر، منقی اور شاہ دانہ ہوتی ہیں، یہ سب چیزیں صاف پانی میں ابال کر مٹی کی بڑی بڑی کشتیوں میں رکھ دی جاتی ہیں، ہر شخص اپنی پسند کی چیز خریدتا ہے اور اس پھل کو روٹی کے ساتھ بطور چاٹ اور چٹنی کے کھالیتا ہے اور کھانے کے بعد بچا ہوا عرق پی جاتا ہے، اس طرح ان کی غذا میں بہت کم صرف ہوتا ہے، اتنا کم کہ شاید ہمارے ملک میں ایک آدمی اپنے کھانے پر جتنا ایک روز میں خرچ کرے گا اس سے کم میں ایک ترک بارہ روز تک کھا سکے گا، ان کی پرتکلف دعوتوں میں بھی عموماً صرف کیک، میٹھا کھانا اور دوسری قسم کی مٹھائیاں ہوتی ہیں اور ان کے علاوہ مختلف قسم کے پلاؤ اور بھیڑ، بکری اور چوزے کا گوشت ہوتا ہے۔"(1)

ایک انگریز خاتون لوی گارنٹ (Lucy m j Garnett) نے ترکوں کی شہری اور دیہاتی زندگی پر ایک نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے، وہ سلطان عبدالحمید خان ثانی کے عہد میں ترکی گئی تھی، اس نے ترکوں کی معاشرت کے جو حالات لکھے ہیں وہ ایک طویل قیام کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں، ترکی مکانوں کے متعلق اس کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

---

(1) بسبک کے ترکی خطوط مطبوعہ لندن ص ۵۲--۵۳ (Busbecas Turkish letters)

عثمانیوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مکانوں کے لیے فطرتاً خوبصورت مقامات پسند کرتے ہیں جہاں درختوں کا سایہ ہو، ٹھنڈے چشمے ہوں اور وسیع میدان ہوں، اسی حسن ذوق کی بنا پر انھوں نے اپنے مکانات ایسی جگہوں پر بنوائے ہیں جو عظمت، شان اور خوبصورتی کے لحاظ سے بے مثل ہیں، ان سات پہاڑیوں کے علاوہ جن پر استنبول مثل روما کے آباد ہے، ترکوں نے باسفورس اور بحیرۂ ایجین کے بہت سے ساحلی مقامات پر مکان بنالیے ہیں، ازمیر میں ان کی آبادی کوہ پیگس (Pagus) کے دامن میں واقع ہے اور بروصہ میں کوہ بتھینین لمپس (Bithynioun Olympus) کے ڈھلوان بازوؤں پر، یہی وجہ ہے کہ ترکی آبادی کی سڑکیں اکثر ڈھلوان ہوتی ہیں اور ساتھ ہی ناہموار بھی، عموماً ان پر پتھر نہیں ہوتے، خشک موسم میں ٹخنوں تک گرد جمی رہتی ہے اور برسات کے زمانہ میں پانی تیزی کے ساتھ بہتا رہتا ہے، لیکن وہ عیسائی اور یہودی حصۂ آبادی سے زیادہ صاف ستھری ہوتی ہیں، جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ صحنوں اور باغیچوں میں کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے زیادہ جگہ ہوتی ہے، کیوں کہ ترکوں کے شہروں کے ہر مکان میں خواہ وہ غریب سے غریب آدمی کا ہو، اگر باغیچہ نہیں تو ایک صحن ضرور ہوتا ہے اور اس میں شہتوت اور چنار وغیرہ کے درخت لگے ہوتے ہیں، ہر مکان دوسرے مکان سے بالکل الگ ہوتا ہے، چنانچہ زمین کا ایک بڑا رقبہ تھوڑی آبادی سے گھر جاتا ہے، ترک کاریگروں اور مزدور پیشہ جماعت کے مکانوں اور اسی پیشہ کے دوسری قوم والوں کے مکانوں میں عموماً یہ فرق ہوتا ہے کہ اول الذکر کے مکانات میں سڑک کی طرف کی کھڑکیوں میں جھلملیاں لگی ہوتی ہیں، متوسط طبقہ کے مکانات زیادہ وسیع ہوتے ہیں، ان کے پیچھے کی طرف صحن اور چمن ہوتا ہے اور سڑک کی طرف دوسری منزل کا حصہ دو فٹ آگے نکلا رہتا ہے، دیواریں عموماً گہرے سرخ رنگ کی ہوتی ہیں، چمن میں اونچے اونچے سرو اور شہتوت کے درخت ہوتے ہیں اور چمن میں مختلف قسم کے پھل کے درختوں کے علاوہ طرح طرح کے پھول اور ترکاریاں ہوتی ہیں، متوسط طبقہ کے مکانوں میں نیچے کے دو کمرے جو سلاملق یا

مردانہ حصے سے تعلق رکھتے ہیں، صاحب خانہ کے لیے ہوتے ہیں، جہاں وہ لوگوں سے ملاقات کرتا ہے، مردانہ کے باقی حصے میں دفتر اور باورچی خانہ وغیرہ ہوتا ہے، اوپر کا حصہ مستورات کے لیے مخصوص ہوتا ہے اور اس میں کوئی مرد نہیں جا سکتا، معمولی آدمیوں کے مکانات جو تعمیر کیے جاتے ہیں، شہر اور دیہات دونوں جگہ عموماً جداگانہ قطعات پر مشتمل ہوتے ہیں، مردانہ حصہ کو سلاملق اور زنانہ کو حرملق یا حرم کہتے ہیں، دونوں کے درمیان ایک غلام گردش ہوتی ہے جسے مابین کہتے ہیں، باسفورس کے ساحل پر بعض قدیم قوناق بالکل لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ (۱)

ترکوں کی معاشرت اور مکانات کی وضع اور ترتیب کی نسبت مولانا شبلی مرحوم اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

> "ترکوں کی معاشرت کا طریقہ نہایت پسندیدہ اور قابل تقلید ہے، امرا اور معزز عہدہ دار ایک طرف معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس صفائی اور خوش سلیقگی سے بسر کرتا ہے، ہمارے ملک میں بڑے بڑے امیروں کو وہ بات نصیب نہیں، میں نے دس ہزار کے تنخواہ سے لے کر دس روپیہ کی آمدنی والوں تک کے مکانات دیکھے ہیں۔ اگرچہ دونوں حالتوں میں نہایت تفاوت تھا اور ہونا چاہیے تھا، تاہم خوش سلیقگی اور ترتیب و صفائی میں برابر تھے۔
>
> ڈرائنگ روم کا قدیم طریقہ یہ تھا اور متوسط حیثیت والوں میں اب بھی جاری ہے کہ دیوار سے متصل قریباً دو ہاتھ چوڑے اور دیوار کے طول کے برابر لمبے چبوترے بنے ہوتے ہیں اور ان پر گدا بچھا ہوتا ہے، اب اگرچہ میز و کرسی کا زیادہ رواج ہے، تاہم چونکہ معزز

---

(۱) شہر اور دیہات کی زندگی از لوسی گارنٹ مطبوعہ لندن ۱۶-۱۷ (Turkish life in town
and countary by Lucy Garnett)

> ترکوں کے ہاں علما اور درویشوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ ایک آدھ کمرہ اس طریقہ پر بھی ضرور مرتب رہتا ہے۔ میں نے عثمان پاشا اور درویش پاشا کے عالیشان مکانوں میں بھی اس وضع کے متعدد کمرے دیکھے۔ زمانہ حال میں یوروپین طرز بہت زیادہ مروج ہے، ترکوں نے اس میں اپنی طرف سے بجا اصلاحیں کی ہیں اور وہ درحقیقت قابل تعریف اصلاحیں ہیں۔ ڈرائنگ روم میں جو اکثر عمدہ دلکش قالین سے آراستہ ہوتا ہے اس سرے سے اس سرے تک سڑک کے طور پر کارپٹ وغیرہ کی ہاتھ ہاتھ بھر چوڑی پٹیاں بچھی ہوتی ہیں۔ کمرے میں جو لوگ آتے جاتے ہیں اسی پر سے گزرتے ہیں، ادھر ادھر پاؤں نہیں رکھ سکتے۔ ترکوں کا فرش اگرچہ خاک آلودہ نہیں ہوتا لیکن اس طریقے سے فرش اور بھی صاف و پاک رہتا ہے۔"

فتح قسطنطنیہ کے بعد اگرچہ ترکوں کی معاشرت میں بہت سے تکلفات داخل ہو گئے تھے، تاہم ان کی فطری سادگی ہر زمانہ میں نمایاں رہی، مولانا فرماتے ہیں۔

> "ترکوں کی معاشرت میں مجھ کو جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ ہے۔ باوجود نفاست پسندی اور عالی دماغی کے فضول شان و شوکت کا نام نہیں، بڑے بڑے وزرا و امرا بازار میں نکلتے ہیں تو معمولی حیثیت سے نکلتے ہیں، میں نے بارہا وزیر اعظم کی سواری دیکھی ہے۔ صرف دو تین سوار ساتھ ہوتے ہیں، سپہ سالار کل علی رضا پاشا کے ساتھ پانچ سوار سے زیادہ نہیں ہوتے، مکانات اور تمام معاشرت کی چیزوں میں بھی سادگی پائی جاتی ہے۔ عثمان پاشا، درویش پاشا، زکی پاشا جس حیثیت اور رتبہ کے لوگ ہیں اس لحاظ سے ان کے مکانات کو کم از کم حیدرآباد کا فلک نما اور بشیر باغ ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ بہت معمولی

> مہدی علی صاحب کی کوٹھی کے برابر بھی نہیں، نوکر چاکر بھی کثرت سے نہیں ہوتے، جیسا ہمارے ہاں کے نواب اور فرضی شاہزادوں کے ہاں دستور ہے۔ حق یہ ہے کہ ترک اس بات پر جہاں تک فخر کریں بجا ہے کہ انھوں نے چھ سو برس تک سلطنت کے سایہ میں پل کر سپاہیانہ پن نہیں چھوڑا، ورنہ عباسی، فاطمی، اموی (اندلس والے) تیموری تو سوا دو دو برس میں اچھے خاصے رنگیلے بن گئے تھے۔"(۱)

حمام: ہر مکان کے ساتھ جو تھوڑی بہت حیثیت بھی رکھتا ہے، حمام کا ہونا ضروری ہے۔ عام حمام جن میں ہر طبقہ کے لوگ جاتے ہیں تمام بڑے بڑے شہروں اور خصوصاً قسطنطنیہ میں بہت کثرت سے بنے ہوئے ہیں، ان کی فیس نہایت معتدل ہوتی ہے، غریبوں کے لیے مسجدوں اور دوسری رفاہی عمارتوں میں حمام بنے ہوئے ہیں، جہاں وہ مفت غسل کر سکتے ہیں جمہوریہ سے پہلے شہروں میں حمام لوگوں کے ملاقات کرنے کی خاص جگہ ہوتے تھے، عورتیں بھی زنانہ حماموں میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں، مردوں کے حمام دن کے علاوہ شام کو بھی کھلے رہتے تھے، حمام کے ذکر میں لوسی گارنٹ لکھتی ہے:

> "مسلمانوں کے نزدیک جسم کی صفائی کا درجہ یقیناً خدا پرستی کے بعد ہی ہے، کیونکہ اس کی تاکید شرع شریف میں آئی ہے، جن امراض میں ان کے عیسائی اور یہودی ہمسایے مبتلا رہتے ہیں، ان میں سے اکثر سے ان کے نسبتاً محفوظ رہنے کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ باقاعدہ پابندی سے غسل کرتے ہیں اور شراب سے عادۃً پرہیز کرتے ہیں۔"(۲)

ترکوں کی پرہیزگاری اور طہارت جسمانی کے متعلق سر ایڈوین پیرس (Sir Edwin Pears) جو اخبار ڈیلی نیوز کے نامہ نگار کی حیثیت سے مدتوں ترکی میں رہ چکا ہے اپنی کتاب "ترکی اور اس کے باشندے" میں لکھتا ہے:

---

(۱) سفرنامۂ روم و مصر و شام (۲) لوسی گارنٹ ص ۳۹

اس کا ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ اسلام نے ان لوگوں
کے جسموں کو ایک پاکیزگی کا تصور بخشا ہے، جس کا اثر روحانی زندگی میں
اس کی اہمیت کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اس وجہ سے کرتا ہوں کہ ان کا
شراب سے پرہیز کرنا منجملہ ان خصوصیات کے ہے جو غیر یورپین
دیہاتیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں، افریقہ میں مسلمانوں کی بڑی
اکثریت ہر قسم کی شراب سے کامل اجتناب کرتی ہے۔ اسلام نے انہیں
جسمانی حیثیت سے بھی ایک صاف ستھری قوم بنا دیا ہے، ان میں
کم سے کم پانچ مرتبہ نماز پڑھنی پڑتی ہے اور ہر نماز سے پہلے دونوں
ہاتھ، پاؤں، کہنیوں تک بازو، اور چہرہ دھونا ضروری ہے۔ اس قاعدہ کی
پابندی اتنی سختی سے کی جاتی ہے کہ اگر پانی میسر نہ آسکے جیسا کہ ریگستان
میں تو اس وقت بجائے وضو کے تیمم کرنا پڑتا ہے، نماز کی جگہ خواہ گھر
میں ہو یا مسجد میں پاک و صاف ہونی ضروری ہے۔ بعض حالتوں کی
نجاست سے پاک کرنے کے لیے پورے غسل کی تعلیم دی گئی
ہے، پیشاب کے بعد استنجا، ہمیشہ اپنے کپڑوں اور جسموں کو صاف ستھرا
رکھنا، ان چیزوں نے ان میں صفائی کی عادت پیدا کر دی ہے، اندرون
ملک میں سفر کرتے ہوئے جہاں کہیں یورپین اثرات مشکل سے داخل
ہوئے ہیں، غریب سے غریب عرب گھر کی غیر معمولی صفائی دیکھ کر
حیرت ہوتی ہے، ان کی مثال کا اثر ان کے عیسائی ہمسایوں پر بھی
ہوا ہے، اگرچہ میں نے اکثر و بیشتر یہ دیکھا ہے کہ عیسائی اپنے مکانوں
کے قریب غلاظت اور گندگی ڈال دیتے ہیں جسے کوئی ترک اپنے مکان
کے قریب گوارا نہ کرے گا، جسمانی صفائی کے معاملہ میں بھی دونوں
میں بڑا فرق ہے، ایک دیہاتی قہوہ خانہ میں جب ایک عیسائی کسان سے

> جب پوچھا گیا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے آیا وہ پسند نہیں کرتا کہ ہاتھ منہ دھو ڈالے تو اس نے جواب دیا کہ "میں کوئی ترک ہوں کہ ہمیشہ اپنے کو دھوتا رہوں؟"۔ انجمن اتحاد و ترقی کے ایک ممتاز رکن نے دعوے کے ساتھ یہ کہا کہ میرے مذہب کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ لازمی طور پر مفید صحت ہے، اس کا دعویٰ مضبوط بنیاد پر قائم ہے۔ معمولی ترک کسان کی صحت بہتر ہوتی ہے، کیونکہ وہ صاف ستھرا رہتا ہے، شراب سے پرہیز کرتا ہے، کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتا ہے اور زیادہ تر کھلی ہوا میں رہتا ہے۔" (۱)

قہوہ خانے: حمام کے علاوہ قہوہ خانے بھی ترکی معاشرت کی ایک خاص چیز ہیں، کوئی شہر یا گاؤں ان سے خالی نہیں، شہروں میں ان کی وہی کثرت ہے جو ہمارے ملک میں پان کی دوکانوں کی، مگر پان کی دوکانیں لوگوں کے ملنے جلنے کی جگہیں نہیں ہوتیں، برخلاف اس کے قہوہ خانوں میں ترک ملاقات کی غرض سے بھی جاتے ہیں، وہاں خانگی معاملات سے لے کر ملکی اور غیر ملکی سیاست تک ہر قسم کی باتیں ہوتی ہیں، عوام کو تبادلۂ خیالات کا موقع قہوہ خانوں سے بہتر کہیں نہیں ملتا۔

جس طرح ہمارے یہاں خاطر تواضع کے لیے پان ایک ضروری چیز ہے، اسی طرح ترکوں کے یہاں قہوہ اور سگریٹ کا پیش کرنا آداب معاشرت کے لوازم میں داخل ہے، لوسی گارنٹ لکھتی ہے کہ اگر آپ کسی دوکان پر کچھ خریدنے جائیں تو وہاں بھی دوکاندار نہایت اخلاق کے ساتھ آپ کے سامنے قہوہ کی پیالی ضرور پیش کرے گا، سوشل اور آفیشل ملاقاتوں کے علاوہ کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے بھی جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو قہوہ اور سگریٹ کا پیش کیا جانا یقینی ہوتا ہے۔ (۲)

---

(۱) ترکی اور اس کے باشندے از سر ایڈون پیرز مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء ص ۳۲-۳۳ (Turkish and its people by Sir Edwin peris)

(۲) لوسی گارنٹ ص ۳۹

شہری زندگی کی ایک خصوصیت: ترکوں کی معاشرت کے متعلق لوی گارنٹ کا مندرجہ ذیل بیان دلچسپی سے خالی نہیں:

> ’’ترکی شہری زندگی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت اس کی انتہائی سنجیدگی اور شائستگی ہے مختلف قوموں کی آمیزش اور پولیس کے سپاہیوں کی کمی کے باوجود سڑکوں پر جھگڑے فساد یا ہنگامے شاذ و نادر ہوتے ہیں جو ہوتے بھی ہیں ان کے ذمہ دار عموماً یونانی، یہودی یا غیر ملکی ملاح ہیں۔ پیدل چلنے والے تنگ سڑکوں میں ایک دوسرے کے لیے نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ راستہ خالی کر دیتے ہیں اور آپس میں سلام کرتے جاتے ہیں، حمال اپنی پیٹھ پر بھاری بوجھ لادے ہوئے یا گاڑی ہانکنے والا برابر ہواردا (بچو بچو) کی صدا لگاتا رہتا ہے اور یہاں وہ اجڈ پن اور وحشیانہ پن بہت کم ملتا ہے جو مغرب کے شہروں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ البتہ امن عامہ کے حالات میں مختلف جگہوں کے لحاظ سے بہت کچھ اختلاف ہے، مثلاً سمرنا میں جو ایشیا میں واقع ہے اور کسی حد تک قسطنطنیہ میں بھی غیر ملکی خواتین کامل حفاظت کے ساتھ سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف جا سکتی ہیں یا باسفورس کے اسٹیمروں پر سفر کر سکتی ہیں، لیکن سالونیکا میں جو یورپ میں واقع ہے، معمولی حالات میں بھی کوئی خاتون بغیر کسی شریف آدمی یا ملازم کو ساتھ لیے ہوئے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرتی، علاوہ فرینک محلہ کی ایک یا دو سڑکوں کے، وجہ یہ ہے کہ ایک طرف البانیوں اور مقدونیا کے دوسرے بے لگام باشندوں کا خطرہ رہتا ہے اور دوسری طرف بڑی بڑی سینگوں والے بھینسوں اور باربرداری کے دوسرے جانوروں کی قطاروں کا جن کو یہودی ہانکتے ہیں اور جن پر بھاری اور بے ڈول بوجھ

> لدے ہوتے ہیں، رات کے وقت امن عامہ کا تحفظ بیکچی کے سپرد کر دیا جاتا ہے، جو ہمارے قدیم چوکیدار کا جواب ہے، وہ لالٹین ہاتھ میں لیے ہوئے آفتاب کے بعد سے صبح تک گشت کرتا رہتا ہے اور بدکاروں کو متنبہ کرنے کی غرض سے اپنے لوہے کی شام لگے ہوئے ڈنڈے سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سڑک کی پٹری کو کھٹکھٹاتا جاتا ہے، نقب زنی کا جرم ترکی میں تقریباً نامعلوم ہے، کیوں کہ اس ملک میں اپنے طویل زمانہ قیام کے دوران میں اس قسم کے جرم کی ایک مثال بھی مجھے یاد نہیں آتی، بہرحال غروب آفتاب کے بعد جو شخص بھی باہر نکلے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک جلتی ہوئی لالٹین لے کے نکلے، اگر کوئی شخص راست بازی کی اس علامت کے بغیر باہر نکلے اور اس وقت پولیس کے گشتی سپاہی کا سامنا ہو جائے یا وہ پولیس کی چوکی کی طرف سے گذرے تو دشواریوں میں گرفتار ہو جانے سے بمشکل بچ سکے گا۔“(۱)

ترکوں کی شائستگی کی شہادت مغرب کے دوسرے مستند اشخاص نے بھی دی ہے، لارپنٹ جس نے ترکی کی تاریخ انیسویں صدی کے وسط میں شائع کی ہے اور جس کی کتاب کی بنیاد سر جیمس پورٹر (Sir James Porter) سفیر برطانیہ متعینہ باب عالی (۱۷۴۷ء تا ۱۷۶۲ء) کے فراہم کردہ مواد پر ہے، لکھتا ہے:

> ڈاکہ، نقب زنی، یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی چیزوں کی چوری بھی ان (ترکوں) کے ہاں مطلق نہیں ہے، امن اور جنگ دونوں زمانوں میں سڑکیں ویسے ہی محفوظ و مامون رہتی ہیں جیسے ان کے مکانات، تمام سلطنت میں خصوصاً شاہراہوں اور بڑی سڑکوں پر ہمیشہ پوری حفاظت اور سلامتی کے ساتھ سفر کیا جا سکتا ہے اور مسافروں

---

(۱) لوسی گارنٹ ص ۴۹

کی کثرت کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ حادثات اتنے کم کیسے ہوتے ہیں، شاید کئی سال میں بھی ایک حادثہ کی نوبت نہیں آتی۔"

"ترک خواہ چوری کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسے ایک ایسا ذلیل فعل سمجھتے ہیں جو فطرت انسانی کے سزاوار نہیں، خواہ وہ حقیقتاً قانون سے ڈرتے ہیں جو بہت سخت نہیں ہے، ان سے نقب زنی یا چوری کی واردات قسطنطنیہ میں شاید ہی کبھی ہوتی ہو، اس شہر میں لوگ سب سے زیادہ بلغاریوں سے ڈرتے ہیں، عموماً چور روسی ہوتے ہیں، تاہم آپ وہاں حفاظت کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور آپ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔"(۱)

پروفیسر میکس مر قسطنطنیہ کے متعلق لکھتے ہیں،

"شہر کی سڑکیں بہت خراب ہیں، کیا گاڑی، کیا ٹرام اور کیا سوار، کسی میں بآسانی سہولت اور روانی نہیں، سڑکوں پر بہت شور ہوتا ہے۔ لوگ عموماً زور سے باتیں کرتے ہیں مگر اس سب کے ساتھ سڑکوں پر جھگڑا فساد شاذ و نادر ہوتا ہے۔ مگر جو چیز سیاح کے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی، وہ سڑکوں پر بدمست عورتوں اور بدمست مردوں کا نہ ہونا ہے اور اگر کہیں کوئی شخص دیکھا بھی جائے گا تو وہ یقینی ترک نہ ہوگا، اس صفت کی قدر اس وقت بڑھ جاتی ہے جس وقت ہم خیال کرتے ہیں کہ ہمارے شہروں میں ہر ایک جھگڑا فساد اور تقریباً ہر ایک ارتکاب جرم کا سبب اگر غور سے دریافت کیا جائے تو یہی شراب خواری ہوگی۔"(۲)

یہاں عام سڑکوں پر ایک اور حیرت انگیز چیز جس سے ایک

---

(۱) لارچیٹ جلد اول ص ۳۱۵-۳۱۶ (۲) "یادات قسطنطنیہ" مؤلفہ مسز جیارجینا میکس مر مترجمہ سید رشید الدین، مطبوعہ مفید عام آگرہ ص ۴۳

> یوروپین سیاح کو اجتناب ہوتا ہے، وہ علانیہ بداخلاقیوں کو نہ پایا جائے؛
>
> بالخصوص ترکی عورت اس صفت سے زیادہ متصف ہیں۔"(1)

حرم کی زندگی: ترکی حرم اور اس کی زندگی کے متعلق موجودہ صدی کے آغاز تک عجیب وغریب غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں، اہل یورپ کے نزدیک حرم وہ حصہ مکان تھا جس میں بے شمار عورتیں رہتی تھیں، اور وہ سب مالک مکان کی بیویاں، داشتہ کنیں یا لونڈیاں تھیں، ان کا کام صرف کھانا پینا اور اپنے آقا کو خوش رکھنا تھا، چہاردیواری سے باہر نکلنے کی انھیں اجازت نہ تھی، اور نہ وہ کسی سے ملاقات کرسکتی تھیں، ان کی حالت قیدیوں سے بہتر نہ تھی۔

لیکن جب ۱۹۰۳ء میں خالد خلیل نے ترکی معاشرت پر اپنی کتاب "ایک ترک کی ڈائری" (The Diary of a Turk) شائع کی تو یہ غلط فہمیاں بہت کچھ دور ہوگئیں، اس کے بعد لوسی گارنٹ کی کتاب شائع ہوئی، یہ چونکہ ایک انگریز خاتون کی لکھی ہوئی تھی جو مدتوں ترکی میں رہ چکی تھی اور حرم کی زندگی سے ذاتی واقفیت رکھتی تھی، اس لیے اس کی روشنی میں اہل مغرب کو اصلی حالات زیادہ وضاحت کے ساتھ معلوم ہوئے، اس میں شبہ نہیں کہ ترکی معاشرت کے بعض پہلوؤں پر لوسی گارنٹ نے خالد خلیل سے زیادہ روشنی ڈالی ہے، خالد خلیل کی کتاب کا ترجمہ محمد حسین خاں صاحب نے اسی زمانہ میں "ترکوں کی معاشرت" کے عنوان سے کردیا تھا، جو ۱۹۰۵ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا، حرم اور اس کی زندگی کے متعلق ہم اس کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں:

> "ترکی میں وہ حصۂ مکان جہاں مستورات رہتی ہیں حرم کہلاتا ہے اور مردوں کے حصہ مکان کو سلاملق کہتے ہیں، جو کہ عام ملاقات کے لیے مخصوص ہوتا ہے، گو مکان کی تمام مستورات کو مجموعی طور پر حرم ہی کہتے ہیں، تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ سب صاحب خانہ کی بیبیاں ہیں، ہر شخص کی زوجہ، والدہ، ہمشیرہ، دختر اور نیز وہ عورتیں

---

(1) "سیاحت قسطنطنیہ" مؤلفہ مسٹر جیاربینا میکس فر مترجمہ سید رشید الدین، مطبوعہ مفید عام آگرہ ص ۲۶

جو شرعاً بلا نقاب اس کے سامنے ہو سکتی ہوں، اس کے حرم میں داخل ہیں۔ ہر خاندان میں مفصلہ ذیل اشخاص کو حرم سرا میں داخل ہونے کی اجازت ہے، صاحب خانہ، اس کے بیٹے، والد، خسر، اور حقیقی بھائی بڑے بڑے شہروں مثل قسطنطنیہ، سمرنا اور ایڈریانوپل میں روشن دماغ طبقہ کے لوگ اپنے دور کے رشتہ داروں کو بھی اندر جانے کی اجازت دے سکتے ہیں اور جو لوگ یورپین رسم و رواج اختیار کرتے ہیں اپنے گہرے دوستوں کو بھی داخل کر سکتے ہیں، لیکن پرانی وضع کے خاندانوں میں جو لوگ آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہیں، صاحب خانہ کا کوئی مرد رشتہ دار تیرہ یا چودہ برس کی عمر کے بعد حرم سرا میں نہیں جانے پاتا، اس سے اور خود صاحب خانہ پر دوسری قابل نکاح لڑکیوں سے شادی ہونا ممکن ہو، یہ پابندیاں متمول اشخاص میں زیادہ تر ہیں، ایسے خاندانوں میں حرم سرا اور مردانہ خانہ میں ایک گھومنے والی الماری کے ذریعہ سے کاروبار عمل میں آتا ہے اور پیالے اور کھانے کے برتن منگائے یا بھیجے جاتے ہیں، یہ الماری اس دیوار میں سوراخ کر کے لگائی جاتی ہے، جو کہ مردانخانہ کو حرم سرا سے جدا کرتی ہے، عورتوں کو مردوں کی نظر سے بچانے کے لیے ایک اور ترکیب یہ کی جاتی ہے کہ حرم سرا کی کھڑکیوں میں جالی لگاتے ہیں، جس کا یہ منشا ہوتا ہے کہ عورتیں تو باہر کی ہر شے اس جالی کے پیچھے سے دیکھ سکتی ہیں لیکن کوئی مرد قریب کی سڑکوں، باغوں اور مکانوں سے انھیں نہیں دیکھ سکتا، جس طرح لڑکوں کو تیرہ چودہ برس کی عمر کے بعد سوائے اپنے ان نہایت ہی قریبی رشتہ داروں کے جن کی میں نے تصریح کی ہے دوسری مستورات کو دیکھنے کی اجازت نہیں، اسی طرح اتنی ہی عمر سے متجاوز ہونے پر لڑکیاں بھی سوائے اپنے

نہایت ہی قریب عزیزوں کے مردوں کے سامنے بلا نقاب کے ہرگز نہیں آسکتیں اور اگر وہ ایسے مدرسوں میں تعلیم پاتی رہی ہیں جہاں کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں شریک ہوں تو وہاں سے علاحدہ کرلی جائیں گی اور اگر زنانہ مدرسوں میں جاتی ہوں تو وہاں جس طرح کہ اور کہیں بھی احتیاط سے منھ چھپا کر جانا لازم ہے۔ یہ ہرگز نہیں خیال کرنا چاہیے کہ انگلستان کی لیڈیوں کی طرح چہروں پر ہلکی نقابیں ڈال کر جاتی ہیں بلکہ عورت کو اس طرح جانا لازم ہے کہ از سرتاپا ایک لانبی فرغل میں جو کہ کسی قدر چادر سے مشابہ ہے، لپٹی ہو۔"

حرم کی زندگی کے متعلق خلیل خالد لکھتے ہیں:

"بہت سے ترکی حرم سراؤں میں زندگی نہایت سادگی سے بسر کی جاتی ہے اور اگر ان خاندانوں کو خارج کردیں جن میں اب تک ایک سے زائد بیبیاں ہیں تو نہایت آرام اور خوشی کے ساتھ شوہر کو جو کامل اختیار و حکومت حاصل ہے وہ زوجہ کے مسلمہ حقوق میں کسی طرح حارج نہیں ہوتی، دوسری جانب زوجہ کی اطاعت شعاری جسے مغربی یورپ کی ترقی یافتہ مستورات اس قدر حقارت سے دیکھتی ہیں، اکثر شوہر کے دل میں اس کے لیے محبت اور عزت زیادہ تر مستحکم کردیتی ہیں جیسا کہ انگلستان میں بعض لوگوں کا خیال ہے، بیبیاں شوہروں کی باندیاں نہیں ہوتیں، حرم سرا کی رہنے والیاں زیادہ تر مکانوں ہی میں رہتی ہیں لیکن کلیۃً مقید نہیں ہوتیں، دو دو تین تین یا زیادہ کی جماعت دوسرے حرم سراؤں میں ملاقات کے لیے جاتی ہیں اور اسی طرح احباب و اعزہ کے حرم سراؤں میں عورتیں ملنے کے لیے آتی جاتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے مجمعوں میں عورتیں ہی عورتیں ہوتی ہیں،

مرد شریک نہیں ہوتے لیکن دوسرے طبقوں کی مستورات کی طرح ان میں سے بعض گانے بجانے اور ساتھیوں کو محظوظ کرتی ہیں۔ ناچنا بھی حال میں شروع ہو گیا ہے لیکن ابھی تک نہایت اعلیٰ موجودہ تہذیب یافتہ خاندانوں تک محدود ہے، پرانی وضع کے لوگوں میں تو جوان مستورات کا دو مردوں کے سامنے ناچنا نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے، شادیوں اور اسی قسم کے دوسرے خوشی کے موقعوں پر صرف ایسی عورتیں ناچ کر مہمانوں کو خوش کرتی ہیں جن کا پیشہ ہی ناچنا گانا ہوتا ہے اور وہ شریف اور ذی عزت نہیں خیال کی جاتی ہیں۔ میرے ابتدائی زمانہ میں بلند آواز سے پڑھنا جس سے اوروں کا دل بہلانے کے لیے نہایت مرغوب خاطر تھا تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد آج کل کی بہ نسبت بہت کم تھی، اس وقت کی بہت زیادہ پڑھی لکھی عورتیں قصے، روایت و داستان یا مذہبی رسالے و اشعار اپنی ساتھیوں کو پڑھ کر سناتی تھیں اور وہ مضامین نہایت توجہ کے ساتھ انہیں سنتی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ صوبجات میں یہ طریقہ تفریح اب تک پایا جاتا ہے۔

ترکی مستورات کو اپنے رتبہ و درجہ کے مطابق مختلف کام کرنے اور فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ایک اوسط درجہ کی خاتون میں جو شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہو، امور خانہ داری کے انصرام کی قابلیت سے بڑھ کر اور کوئی وصف اور خوبیاں نہیں تلاش کی جاتیں، صوبجات میں دیہاتی عورتوں کو علاوہ اپنے حسب حال انتظام خانہ داری کے کھیتوں میں بھی کام کرنا پڑتا ہے، خصوصاً اس وقت جب ان کے بھائی اور شوہر سرکاری احکام کے مطابق فوجی ملازمت پر ہوتے ہیں، خوش حال اشخاص کی لڑکیاں اپنے گھروں کے کاروبار دیکھنے کے علاوہ اپنے

> پرونے میں ان تھک محنت کرتی ہیں اور ہمیشہ کشیدہ کاڑھنے اور سوئی کے دوسرے کاموں میں مشغول رہتی ہیں، بڑے بڑے معززین کی بیٹیوں کو علاوہ دیگر کاموں کے وہ سب چیزیں بھی سیکھنا ہوتی ہیں جن کی کہ ان کی استانی یا معلمہ انھیں تعلیم دیں۔"(۱)

عورتوں کی بیرونی تفریحیں: موجودہ صدی کے اوائل میں جب لوسی گارنٹ نے اپنی کتاب لکھی ہے، حرم کی عورتوں کو اتنی آزادی حاصل ہو گئی تھی کہ وہ سیر و تفریح کے لیے پیدل یا سواری پر باہر جاتی تھیں، دوکانوں پر جا کر خرید و فروخت کرتی تھیں اور غسل کے لیے زنانہ حماموں میں جایا کرتی تھیں، شادی بیاہ اور خاندان کی دوسری تقریبوں کے علاوہ بھی ان کی بیرونی تفریح کے سامان تھے، خصوصاً حمام ایک نہایت دلچسپ چیز تھی۔ یہ گویا ترکی عورتوں کا کلب تھا، یہیں وہ اپنی دوستوں سے ملتی تھیں، نئی ملاقاتیوں سے تعارف پیدا کرتی تھیں اور وقت کی تمام خبریں سنتی تھیں، یہیں وہ شادیوں کے سلسلہ کے غسل اور دوسری خاندانی تقریبات کے غسل کے لیے اپنی لڑکیوں، چھوٹے بچوں اور کنیزوں کو لے کر آتی تھیں، ان کے ساتھ ہر قسم کے پھل اور ناشتہ کی چیزیں ہوتیں اور دن کا بڑا حصہ کھانے پینے اور ہنسی مذاق کی باتوں میں گذار دیتیں، عثمانی عورتیں کھلی ہوا کی بے حد شایق ہیں، قسطنطنیہ کے قریب متعدد دلکش تفریح گاہیں ہیں جہاں عورتوں کو اپنے اس ذوق کی تسکین کے لیے ہر قسم کی سہولت حاصل تھی، اسی طرح صوبوں کے ہر شہر اور قصبہ کے نواح میں بھی ایسے مقامات موجود ہیں جن کے مناظر نہایت خوبصورت ہیں، لوسی گارنٹ لکھتی ہے کہ ناممکن ہے کہ ان مقامات پر جائیے اور عثمانی عورتوں کی ٹولیاں تفریح کرتی ہوئی نظر نہ آئیں، اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شریف ترک کبھی اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ باہر نہیں نکلتے تھے، قدیم خیال کے بعض اعلیٰ عہدہ داروں کے گھروں میں حبشی خواجہ سرا بیرونی دنیا اور خواتین حرم کے درمیان متوسط کا کام

---

(۱) "ترکوں کی معاشرت" ص ۳۷ - ۴۸

دیتے تھے اور جب کبھی یہ خواتین سیر کے لیے باہر نکلتی تھیں تو ان کے ساتھ جاتے تھے، گھر میں یہی خواجہ سرا بچوں کی دیکھ بھال اور کنیزوں کی نگرانی کرتے تھے۔ (۱)

پروفیسر میکس ملر پل غلطہ کے ذکر میں لکھتے ہیں

> ''یہاں عورتیں امید سے زیادہ سڑکوں پر ملتی ہیں جو بلا خوف وخطر پل پر آدمیوں کے مجامع کثیرہ سے مل جل کر چلتی ہیں، ہم ان کے چمکدار سرخ وسفید، نیلے، سبز، قرمزی رنگ کے گوناگوں لباسوں کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں، لیکن ان کی سیاہ آنکھوں کے سوا باریک اور چھنے والی نقاب کی تہوں کے اندر سے ان کے چہروں کی کیفیت بہت کم معلوم ہو سکتی ہے، مشرقی چہروں میں سیاہ آنکھ ایک سب سے اعلیٰ ترین چیز ہے اور اگر ان کے باریک نقابوں کے اندر کوئی شخص ان کے چہروں کو اچھی طرح جانچ کرنا چاہے تو اس کو مایوسی کے سوا کچھ نہیں حاصل ہو سکتا۔'' (۲)

پروفیسر میکس ملر ۱۸۹۶ء میں قسطنطنیہ گئے تھے، یہ سلطان عبدالحمید خاں کا عہد تھا، جو سیاسی استبداد کے علاوہ معاشرت کی سخت پابندیوں کا بھی زمانہ تھا، اس کے باوجود عورتوں کی یہ آزادی قابل لحاظ ہے لیکن اس آزادی کے بھی معین حدود تھے جن سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا تھا مثلاً کوئی خاتون بغیر یشمک (نقاب) کے اپنے مکان کے پیچھے کی سڑک پر بھی نہیں جا سکتی تھی (۳)، ہر عورت امیر ہو یا غریب اور کیسی ہی نیک چلن ہو غروب آفتاب کے ساتھ ہی اپنے مکان واپس چلی جانے پر مجبور تھی (۴)، سلطان عبدالحمید خاں عورتوں کے پردہ کے سخت موید تھے، ہر سال وہ یشمک کے زیادہ دبیز اور فریجہ (برقع) کے زیادہ ڈھیلے ہونے کی نسبت فرمان جاری کرتے تھے، کوئی ترک سڑک پر اپنی عورتوں سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا، ایسا کرنا خلاف قانون تھا اور پولیس فوراً

---

(۱) لوسی گارنٹ ص ۶۴-۶۶ (۲) سیاحت قسطنطنیہ ص ۱۹ (۳) ایضاً ص ۱۹۷ (۴) ایضاً ص ۲۰۱

مداخلت کرلی تھی۔ (۱)

تعدد ازدواج: ترکوں میں تعدد ازدواج کے متعلق لوسی گارنٹ کا بیان ہے کہ مزدور پیشہ طبقہ میں صرف ایک ہی بیوی ہوتی تھی اور دولت مند طبقوں میں بھی ایک سے زیادہ کی مثال شاذ و نادر ملتی تھی، رائے عامہ کی مخالفت کے علاوہ جو ایک سے زیادہ شادی کرنے کو روا نہیں رکھتی، اخراجات کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا تھا، دوسری شادی کے معنی یہ تھے کہ نئی بیوی کے لیے ایک قطعۂ مکان بھی علاحدہ ہونا چاہیے تھا اور کنیزوں کے علاوہ پاندان کا خرچ بھی علاحدہ دینا پڑتا تھا، لونڈیوں کی کثرت کے باوجود ملک میں عورتوں کی بہت فراوانی بھی نہیں تھی اور ہر ماں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کی لڑکی پہلی بیوی بنے، کیونکہ اس کا رتبہ دوسری بیویوں سے مقدم سمجھا جاتا تھا، دوسری شادی کی نوبت عموماً اس وقت آتی تھی جب پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوتی، لیکن ایسا کرنے سے اخراجات بڑھ جاتے تھے اور گھر کی پرسکون فضا درہم برہم ہو جاتی تھی، گارنٹ لکھتی ہے کہ

> ”آج کل زیادہ سے زیادہ دو بیویاں ہوتی ہیں اور اپنے طویل زمانہ قیام میں جو میں نے ملک کے مختلف حصوں میں بسر کیا، صرف ایک بار مجھے ایسے حرم میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔“ (۲)

غلام اور کنیزیں: جب سے سلطنت عثمانیہ میں زوال شروع ہوا اور اسے یورپین طاقتوں کے مقابلہ میں شکستیں ہونے لگیں، ان غلاموں اور کنیزوں کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی گئی، جو میدان جنگ سے لائی جاتی تھی، یہ کمی بردہ فروشی کے بازار سے پوری کی جانے لگی مگر انیسویں صدی میں باب عالی نے بردہ فروشی کو باضابطہ ممنوع قرار دے دیا، جہاں تک غلاموں کا تعلق ہے ان کی خرید و فروخت تو بہت کم ہوگئی اور ان کی جگہ تنخواہ دار ملازم کام کرنے لگے، لیکن کنیزوں کی خریداری موجودہ صدی کی ابتدا تک جاری تھی،

---

(۱) سیاحت قسطنطنیہ ص ۲۰۲ (۲) لوسی گارنٹ ص ۹

کیونکہ حرم کی خدمت کے لیے کنیزوں کا ہونا نہایت ضروری تھا، کوئی آزاد عورت بغیر نقاب ڈالے ہوئے غیر مردوں کے سامنے نہیں جا سکتی تھی، کنیزوں کو اس قسم کی کوئی پابندی نہ تھی، خلاف قانون ہونے کی وجہ سے ان کی خرید و فروخت خفیہ طور پر ہوتی تھی، چھ سے دس برس تک کی لڑکیوں کی مانگ زیادہ رہتی تھی، کیونکہ تعلیم و تربیت دینے کے بعد جب وہ سولہ سترہ سال کی عمر میں پھر فروخت کی جاتی تھیں تو قریباً دس گنی قیمتیں وصول ہو جاتی تھیں، کنیزوں کو ستار اور دف وغیرہ بجانے، رقص کرنے اور کشیدہ کاڑھنے کی تعلیم دی جاتی تھی اور پھر رفتہ رفتہ وہ عثمانی آداب و رسوم سے آشنا کی جاتی تھیں، بڑی ہونے کے بعد گھر کے چھوٹے بڑے کام بھی ان کو سپرد کر دیے جاتے تھے، یہ لڑکیاں حرم میں بہت خوش و خرم رہتی تھیں، انھیں وہی کھانا ملتا تھا جو مالک خود کھاتی تھی اور خواہ وہ کوئی قصور بھی کریں انھیں گھر سے باہر نہیں نکالا جاتا تھا، مالک ان کی خور و پرداخت اور تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار ہوتی تھی، سات سال کی مدت کے بعد کنیز آزادی کی مستحق ہو جاتی تھی اور عموماً اس وقت مالک اسے آزاد کر کے اور کسی بھلے آدمی سے اس کی شادی کر کے رخصت کر دیتی تھی، بڑے بڑے عہدہ داروں کے ہاں کنیزوں کے لیے ماتحت عہدہ داروں میں سے کوئی بر منتخب کیا جاتا تھا اور یہ ماتحت اس نسبت کو خوشی کے ساتھ قبول کر لیتا تھا، کیونکہ اس طرح آقا کے گھر کے ساتھ اس کے تعلقات اور بھی قریبی ہو جاتے تھے۔

بہت سے ترک بہ نسبت آزاد عورتوں کے ان عورتوں سے شادی کرنے کو ترجیح دیتے تھے جو کنیز رہ چکی تھیں، کسی آزاد عورت سے شادی کرنا نوشہ اور اس کے والدین کے لیے بہت مہنگا پڑتا تھا کیونکہ ایسے موقعوں پر تحفہ تحائف اور دعوت مدارات میں حسب رواج بڑے پیمانہ پر خرچ کرنا پڑتا تھا، ترک بالعموم نوعمری میں شادی کرتے ہیں، اس لیے اگر کوئی باپ اپنے رتبہ کی کسی دوشیزہ کے ساتھ اپنے لڑکے کا بیاہ کرنے کی مقدرت نہیں رکھتا تھا تو وہ اس کے لیے کوئی ایسی کنیز خرید لیتا تھا جس کی پرورش اور تربیت کسی بڑی خاتون کی حرم سرا میں ہوئی ہو اور اس صورت میں اس کو زرِ ثمن کے علاوہ اور کچھ دینا

نہیں پڑتا تھا، چونکہ کنیز کی خود کوئی ذاتی حیثیت نہیں ہوتی تھی، اس لیے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے آقا اور اس کے والدین کی مطیع رہے گی اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرے گی۔ ایسی شادیوں میں دوسرا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ بیوی کے عزیز شوہر کے مقابلہ میں اس کی طرفداری کرنے کے لیے موجود نہیں ہوتے تھے، برخلاف اس کے آزاد عورت اپنے حقوق سے پوری طرح باخبر ہوتی تھی اور انہیں بزور منوا سکتی تھی۔ اگر کسی کنیز کے بطن سے آقا کی کوئی اولاد ہو جاتی تو پھر وہ فروخت نہیں کی جا سکتی تھی اور اسے گھر میں رہنے اور بچے کی پرورش کرنے کا حق ہو جاتا تھا، یہ بچہ جائز اولاد سمجھا جاتا تھا اور اگر اس کے باپ کے کوئی اور بیوی بھی ہوتی تھی جو آزاد عورت ہوتی تو اس کی اولاد کے ساتھ ترکہ میں وہ برابر کا شریک ہوتا تھا۔ اگر ایسی کنیز کا مالک اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیتا تھا تو پھر اسے سوسائٹی میں وہ حیثیت اور وہ تمام حقوق و مراعات جو ایک آزاد عثمانی عورت کو حاصل ہوتے تھے مل جاتے تھے۔

لوسی گارنٹ لکھتی ہے کہ ترکی میں کنیزیں بہت سی حیثیتوں سے مغرب کی نوکری ملازماؤں سے بہتر حالت میں ہوتی تھیں، ان کے فرائض بھی کچھ سخت نہ تھے اور فرصت کے اوقات کافی ملتے تھے۔ خاندان کی عورتیں جب سیر و تفریح یا خرید و فروخت کے لیے باہر نکلتی تھیں یا حمام جاتی تھیں تو متعدد کنیزیں بھی ان کے ساتھ جاتیں اور تفریح میں شریک ہوتیں۔ ان تفریحات میں کنیزوں کو شریک کرنے ہی کی وجہ سے زیادہ تر غیر ملک کے لوگوں میں ترکوں کے تعدد ازدواج کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ ترک بالعموم کئی کئی شادیاں کرتے ہیں۔

غلاموں کو آزاد کر دینا ایک بہت نیک کام خیال کیا جاتا تھا اور اکثر ترک مرد اور عورتیں اپنے وصیت ناموں میں یا بستر مرگ پر اپنے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کر دیتی تھیں، جہاں تک ملکی حقوق کا تعلق ہے، غلام آزاد ہو کر فوراً اپنے سابق آقا کے برابر ہو جاتا تھا اور سلطنت کے بڑے سے بڑے عہدہ کا امیدوار ہو سکتا تھا، اسی طرح ایک کنیز

آزاد ہو کر خواہ اس کی شادی کسی عثمانی سے ہوئی ہو یا اسی کے طبقہ کے کسی آزاد شدہ غلام سے، خانم کا لقب حاصل کر لیتی تھی اور ایک آزاد عورت کے تمام حقوق اسے مل جاتے تھے، یہ بھی عام دستور تھا کہ جن میاں بی بی کے اولاد نہیں ہوتی تھی یا جو بیوہ لاولد ہوتی وہ اپنے خریدے ہوئے غلام بچوں اور کنیزوں کو آزاد کر کے متبنیٰ کر لیتی تھی اور انھیں اپنا وارث قرار دیتی تھی۔ (۱)

ترکی میں غلاموں کے ساتھ جیسی نرمی کا سلوک کیا جاتا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے لارپنٹ لکھتا ہے:

> ''اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلام آزاد ہونے سے انکار کر دیتا ہے، یہ آزادی اس کی خدمات کے صلہ میں دی جاتی ہے، پھر وہ اسی گھر میں مستقل طور پر قیام اختیار کر لیتا ہے، جب وہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس سے کوئی محنت کا کام نہیں لیا جاتا، وہ خاندان کا ایک رکن سمجھا جانے لگتا ہے اور اب اس کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ بچوں کو سیر کرانے کے لیے باہر لے جایا کرے یا ان کے ساتھ کھیلا کرے، بچے اسے ''بابا'' کہتے ہیں۔'' (۲)

اخلاق و عادات: ترکوں کے اخلاق و عادات کی سب نے تعریف کی ہے، مولانا شبلی فرماتے ہیں:

> ''کچھ شبہ نہیں کہ ترکوں کے اخلاق نہایت وسیع اور فیاضانہ ہیں، غرور و نخوت، ترفع اور کم بینی، ان میں نام کو نہیں، امیر و غریب، مزدور و عہدہ دار، وضیع و شریف، جاہل و عالم، ہر درجہ کے لوگوں سے مجھ کو سابقہ پڑا، لیکن خوش اخلاقی اور فیاض طبعی میں گویا سب ایک ہی مکتب کے شاگرد اور ایک ہی سانچے کے ڈھلے تھے، غازی عثمان پاشا

---

(۱) لوئی گارنٹ ص ۵۳-۵۸ (۲) لارپنٹ جلد دوم ص ۹۳

جن کو پلونا کے واقعہ نے تمام دنیا میں روشناس کر دیا ہے اور درویش پاشا جن کا پوتا سلطان کی دامادی کا شرف رکھتا ہے۔ اس مرتبے کے لوگ ہیں جیسے ہندوستان میں گورنر جنرل یا کمانڈر انچیف، میں دونوں سے ملا ہوں اور وہ جس تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آئے اس کا اثر اب تک میرے دل میں ہے۔

ایک عام بات ہے کہ بازار میں چلتے چلتے تم جس شخص سے گو وہ کسی رتبہ کا آدمی ہو راستہ پوچھو وہ نہایت مہربانی سے تمہاری طرف متوجہ ہوگا اور تم کو راستہ بتائے گا۔ بعض موقعوں پر مجھ کو نہایت تنگ اور پیچدار گلیوں سے گذرنے کا اتفاق ہوا اور راستہ کے بھول جانے کی وجہ سے دیر تک حیران رہا، اتفاقاً کوئی ترک آ نکلا تو اس نے راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہو لیا اور جہاں مجھ کو جانا تھا وہاں تک پہنچا کر واپس آیا۔

فیاضی اور مہمان نوازی ترکوں کی عام صفت ہے اور نہایت ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی نہایت سیر چشم اور فیاض ہیں یہ عام طریقہ ہے کہ دو چار چشم آشنا کسی ہوٹل یا قہوہ خانہ میں اتفاق سے مل گئے تو قہوہ وغیرہ میں جو کچھ خرچ ہوگا ایک شخص سب کی طرف سے دے دے گا، گویا تمام لوگ اس شخص کے مہمان ہوتے ہیں اور وہ میزبان ہوتا ہے۔"(۱)

مئی ۱۹۰۹ء میں لکھتا ہے:

"اس کی (ترک کی) ایمانداری، راست بازی، فرماں برداری اور پرہیزگاری نے ترکی کے عیسائیوں سے بہت زیادہ تعریف حاصل کی ہے، مجھ سے قسطنطنیہ میں کاروباری آدمیوں نے بارہا کہا کہ جب ہم کو کوئی ایسا کام سپرد کرنا ہوتا ہے، جس میں کامل ایمانداری کی

---

(۱) سفرنامہ

ضرورت ہوتی ہے تو ہمیشہ ہم بجائے کسی یونانی، آرمنی یا یہودی کے کسی ترک کو وہ کام سپرد کر دیتے ہیں۔"(۱)

ترکی عورتوں کے ذکر میں منرو بیان کرتا ہے:

> "ترکی عورتیں طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک جہاں چاہتی ہیں آتی جاتی ہیں، اعلیٰ طبقہ کی عورتوں کے ساتھ خواجہ سرا ہوتے ہیں، متوسط طبقہ کی عورتوں کے ساتھ غلام ہوتے ہیں اور کسان عورتیں تنہا آتی جاتی ہیں، کوئی انہیں چھیڑتا نہیں کیونکہ ترک، عورتوں سے سڑک پر کبھی بات نہیں کرتے یہاں تک کہ خود اپنی بیویوں سے بھی نہیں اور کوئی شخص کسی عورت کو گھورتا نہیں، یہ رواج یورپ کے عیسائی ملکوں تک محدود ہے، عورتیں ایک باریک کپڑے کی نقاب چہرے پر ڈالے رہتی ہیں اور سڑک پر ایک ہلکی سی چھتری لے کر چلتی ہیں تاکہ بدتمیز گھورنے والے فرانسیسی اور دوسرے عیسائیوں کی نظر سے محفوظ رہیں۔"(۲)

مشہور فرانسیسی مصنف الیسے ریکلوس (Elisee Reclus) لکھتا ہے:

> "ترک نہ تو اقتدار نے خراب اور جور و ظلم نے ذلیل نہیں کیا ہے یقیناً ان لوگوں میں سے جو اپنے اوصاف حمیدہ کو مناسب امتزاج سے نہایت محفوظ کرتے ہیں، وہ تمہیں کبھی دھوکا نہیں دیتا، متدین اور ایماندار اور اپنے لوگوں کے ساتھ فولاد کی طرح سچا اور کھرا، نہایت مہمان نواز، باادب لیکن خوشامدی ہرگز نہیں، محتاط، روادار، کریم النفس اور جانوروں پر بہت مہربان۔"

ریکلوس کی مندرجہ بالا رائے نقل کرنے کے بعد منرو کہتا ہے کہ "اس فرانسیسی

---

(۱) ترکی اور ترک، از منرو مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء، ص ۴۴ (Turky and the Turks by w s. manroe)

(۲) ایضاً ص ۲۵

جغرافیہ داں کی رائے کی تصدیق مجھ سے بارہا ان امریکنوں اور انگریزوں نے کی جو قسطنطنیہ میں سالہا سال رہ چکے تھے لیکن مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ اگر میں ترک کی بہترین خوبیاں معلوم کرنا چاہتا ہوں تو ضروری ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں نہیں بلکہ صوبہ جات میں بھی جا کر انہیں دیکھوں۔"(۱)

ترکوں کے اخلاق و عادات کے ذیل میں ڈاریوٹ بیان کرتا ہے:

> "اگر کوئی شخص سڑک پر کسی عورت سے ملتا ہے تو اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے، گویا اس کی طرف دیکھنا ممنوع ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے شرم عورتوں سے بے حد نفرت کرتے ہیں اور ان سے بچتے ہیں۔ اس لیے اگر عیسائیوں میں سے کسی سے ترکوں سے جھگڑا ہو جاتا ہے اور اس عیسائی کی بیوی لڑاکا ہوتی ہے تو وہ اسے ترکوں سے جھگڑنے اور بدزبانی کرنے کے لیے کھڑا کر دیتا ہے اور اس طرح آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔"
>
> کسی ترک کے لیے سب سے بڑی ذلت اور شرم کی بات یہ ہے کہ وہ عورت پر ہاتھ اٹھائے، زیادہ سے زیادہ جرأت جو وہ کر سکتا ہے یہ ہے کہ اس کے لیے سخت اور اہانت آمیز الفاظ استعمال کرے یا پھر وہاں سے چلا جائے۔"
>
> "جوئے کے خیال سے وہ بے حد نفرت کرتے ہیں اور قمار باز کو جو روپیہ کے لیے کھیلتا ہے چور سے بھی برا سمجھتے ہیں، کوئی شخص ان کے نزدیک اس سے زیادہ قابل نفرت نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ کبھی شطرنج یا ڈرافٹ کی بساط کے قریب بھی نہیں جاتے مگر یہ کہ صرف تفریح کے لیے۔"

---

(۱) ترکی اور ترک ص ۲۷

اونچے بلکہ متوسط طبقے کے لوگ بھی رقص کو جہاں تک ان کا تعلق ہے، انسانی وقار کے خلاف سمجھتے ہیں وہ اس فن کو نوع انسانی کے نہایت ادنیٰ افراد کے لیے موزوں خیال کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ کوئی بھی نہیں ناچتا جب تک وہ بدمست یا مجنون نہ ہو۔“

عام طور پر ترک شراب خوری کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور افیون کھانے کی عادت کو بہت ہی ذلیل سمجھتے ہیں، جب وہ کسی بڑے آدمی کی سیرت کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں جس کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ افیون کھاتا ہے تو اسے ”تریاقی“ کہتے ہیں۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جس کا دماغی توازن درست نہیں۔“(۱)

ترکوں پر اسلام کا اثر بیان کرتے ہوئے ایڈون پیرز لکھتا ہے کہ اناطولیہ کے ترکوں میں مذہبی جذبہ بہت گہرا ہوتا ہے اور اس کا مشاہدہ سیاح اور مورخ دونوں نے کیا ہے۔ ترک کسان نماز کا سختی سے پابند ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس اس کے دل میں پوری طرح پیدا ہو جاتا ہے، وہ اپنا دن نماز سے شروع کرتا ہے، چاہے وہ پانچوں وقتوں کی نماز پابندی سے پڑھے نہ پڑھے، لیکن نماز کے الفاظ کی تکرار اس کی سیرت پر ضرور اثر ڈالتی ہے اور یہ اثر رمضان شریف کے روزوں اور دوسرے مذہبی ارکان کی بجاآوری سے اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔(۲)

LIBRARY
Islamic
University
Book No. 212
Town, Lahore

---

(۱) [illegible] جلد اول ص۳۱۹-۳۲۵

(۲) ترکی اور ان کے باشندے ص۴۲

DAULAT-E-USMANIA

VOL. II

Dr. Mohammad Uzair

Darul Musannefin Shibli Academy,
Azamgarh, U.P.

ISBN : 978-93-80104-32-4